ماہنامہ
فروغ اردو
لکھنؤ
مدیر
رحمۃ اللہ علیہ
محمد حسین شمس علوی

جلد (۲۲) شمارہ (۱) رجسٹرڈ نمبر ایل، ڈبلیو / این، پی ۹۳

لائسنس نمبر: ۲۰۹۴۱۶/۲۰،۸،۶۴

دفتر فون: ۲۶۱۳۵

رہائش گاہ: ۲۶۶۵۶

ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۱) مئی ۱۹۷۵ء جلد (۲۲)

ایڈیٹر:-

ڈاکٹر سید رغیب حسین ڈی لٹ صدر شعبۂ فارسی

لکھنؤ یونیورسٹی۔

مدیر:-

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

معاونین:-

۱۔ عبدالقوی دریابادی بی۔اے

۲۔ سعادت علی صدیقی

ترتیب

زر سالانہ اعزازی :- دس روپیہ

عوام سے :- چھ روپیہ

فی پرچہ :- پینسٹھ ۶۵ پیسے

پتہ: ادارہ فروغ اردو

امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

اپنی باتیں

اُردو اکیڈمی اُترپردیش

حکومت اُترپردیش نے اُردو اکیڈمی یو۔ پی کا قیام عوام کے مطالبہ کے پیش نظر اس مقصد سے کیا تھا کہ اُترپردیش اُردو اکیڈمی بچّوں کو ابتدائی اُردو تعلیم کے حصول میں جو دقتیں اور رکاوٹیں ہونگی ان کے استحصال کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی کیونکہ آزاد ہندوستان میں اُردو زبان کا مسئلہ کوئی الجھا ہوا مسئلہ نہیں یہ سب ہی جانتے ہیں کہ مختلف مقامی اور صوبہ جاتی زبانوں میں یہ فخر صرف اُردو زبان ہی کو حاصل ہے کہ مختلف زبان والوں کے درمیان تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہے جو عدالتوں اور کچہریوں میں بھی سمجھی جاتی ہے۔ اخبار سنیما اور ریڈیو کی دنیا میں بھی مقبولیت رکھتی ہے جس کا لٹریچر - - ہندوستانی قوم کے ماضی اور حال کی زندہ تصویر ہے۔ اور جس کی خوبی مستقبل کو شاندار بنا سکتی ہے جس کی دنیا تعلیم یافتہ لوگوں تک محدود نہیں بلکہ غیر تعلیم یافتہ عوام بھی اپنی ضروریات اس سے پوری کرتے ہیں۔ ہندوستان کے باہر بھی یہ زبان مقبولیت حاصل کر چکی ہے اس کی تعمیر اور ترقی میں کسی ایک قوم کا ہاتھ نہیں مذہبی اعتبار سے اس کی تقسیم ایک خام خیالی ہے۔ زبان کے نقطہ نظر سے بول چال کی دنیا میں ایک زبردست اتحاد ہے جو اتحاد بازاروں میں اور عام ضرورت کی جگہوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ مقاصد بالا کی روشنی میں اگر ہم آپ اس کا جائزہ لیں تو کہنا پڑے گا کہ اُترپردیش اکیڈمی نے اس مطالبہ کے حصول کے لئے کچھ بھی کام نہ کیا اور اترپردیش اکیڈمی صرف انعام و اکرام دینے کے چکر میں پھنس کر ادیبوں شاعروں کو اپنا ہمنوا بنانے میں مصروف رہی۔ پنڈت آنند نرائن ملّا جو کہ اُترپردیش اکاڈمی میں صدر کی حیثیت سے مختارِ کل بنے ہوئے ہیں۔ ان سے اس کی توقع رکھنا کہ وہ اُردو زبان کے حقوق حاصل کرنے کے سلسلہ میں کوئی نمایاں رول ادا کر سکیں گے، خام خیالی ہے۔ کیونکہ ان کے ان بلند بانگ دعوؤں کی قلعی کھل چکی ہے جس کا اظہار وہ گذشتہ پارلیمنٹ کے اُمیدوار کی حیثیت سے موہن لال گنج حلقہ ضلع لکھنؤ کے رہنے والوں سے کر چکے تھے۔

اس وقت ان کے ان خوش کن وعدوں پر محبانِ اُردو کو یقین آگیا کہ پنڈت آنند نرائن مُلّا جو وعدے
رہے ہیں ان کو نبھاتے ہوئے اُردو مقدمہ کی پیروی خلوص و محبت کے جذبہ کے تحت انجام دے سکیں گے مگر کامیابی
کامرانی کے بعد جمہوریہ حلقہ کے ووٹروں کی یہ آس بھی پوری نہ ہوسکی کہ وہ اپنے حلقہ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد
ن کا شکریہ ادا کرنے کی زحمت ہی گوارا فرماتے۔ غرضیکہ دوا پنے دورِ صدارت اُتر پردیش اکاڈمی مُلّا صاحب نے اُردو
مقدمہ کی کامیابی کے حصول کے لئے کوئی بھی مفید خدمت انجام نہ دی۔ فروغ اُردو گجرال کمیٹی کی رپورٹ بھی آج
۔ منظرِ عام پر نہ آسکی جس کی ہمنوائی بھی کسی حد تک مُلّا صاحب کی مرہونِ منّت ہے اور اُتر پردیش اکیڈمی
کردار کو بھی صرف اپنی لیڈری اور اجارہ داری تک محدود رکھنے میں ان کا نمایاں رول رہا ہے کیونکہ اُتر پردیش
یڈمی نے اُردو تعلیم، اُردو زبان کے حقوق کے حصول کے سلسلہ میں کوئی مفید خدمت انجام نہ دی بلکہ گردو پیش اس
دارہ کا یہ رہا کہ گروہ بندی اور انعام واکرام کے ذریعہ گٹھ جوڑ کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ اور اقتدار
کرسی برقرار رہے۔ حالانکہ جمہوری دَور میں صدارت بھی ووٹنگ کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔
و غور کرنے کی بات ہے کہ اگر بچّوں کی ابتدائی تعلیم ہی نہ ہوگی اور تعلیم کے حصول کے سلسلہ میں
کوئی معاشی فائدہ نہ ہوگا تو والدین اپنے بچّوں کو ابتدائی تعلیم اُردو زبان میں کیوں دلائیں
ے اور بقول وزیر اعلےٰ اُتر پردیش۔ قافلہ چلتا رہے، حقوق ملتے رہیں گے (کب تک ان طفل تسلیوں
پر عوام قناعت کرتے رہیں گے) پھر بھی اُتر پردیش اکیڈمی خوابِ غفلت میں پڑی ادیبوں،
شاعروں، مستحق اور غیر مستحق میں تمیز کئے بغیر انعام واکرام کے گورکھ دھندے میں پھنسی رہے گی۔

ہم کو خوشی ہے کہ ماہ مئی ۱۹۷۵ء سے آپ کا محبوب ماہنامہ فروغ اُردو بائیسویں
سال میں قدم رکھ رہا ہے یہ سن شعور علامت اس بات کی ہے کہ ہماری جدوجہد زبان اُردو
تیزگامی کے ساتھ کامیاب منزل کی جانب قدم اُٹھا رہی ہے اور یہ ثبوت ہے کہ جلد کامیابی
آپ کا قدم چومے گی نیز قارئین فروغ اُردو سے استدعا ہے کہ اس دَورِ ابتلاء میں جبکہ
متعدد مستند ماہنامہ داغِ مفارقت دے چکے ہیں وہ فروغ اُردو کی بقاء کی خاطر مستعد ہوکر
یہ بیڑا اُٹھائیں کہ آپ کا محبوب ماہنامہ جوکہ معاشی حیثیت سے کمزور بھی ہے اسکو دوام
ہو۔ ہر محبِ اُردو دس دس خریدار مہیّا کرکے ادارۂ فروغ اُردو ہند کی خدمات کو اُجاگر
کرنے میں معاون ہو۔ کیونکہ صرف چھ روپیہ سالانہ کی ادائیگی کسی محبِ اُردو کے
لئے کوئی کٹھن کام نہیں۔

فرقتؔ کی رُوح کے نام

ضیا

موت ہے تیرہ و تاریک فضاؤں کا جمود
زندگی روشن، درخشندہ، شعاعوں کا خروش

موت موہوم سا اک نکتۂ تسکین و قرار
زندگی مضطرب، امواجِ غمِ عشق کا جوش

موت ہے رنگِ تخیل کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی نقشِ حیاتِ ابدی جلوۂ ہوش

موت صحرائے خیالات کی تیرہ وسعت
زندگی نورِ کمالات و مسلسل غمِ کوش

موت بھٹکے ہوئے راہی کی اندھیری منزل
زندگی مسلکِ انسانیت و راہ سروش

موت دراصل ہے محدود تمنائے سکون
زندگی، حسرتِ آزادیٔ محشر بردوش

موت سے جس کو محبت ہے وہ مرجاتا ہے
جینے والوں کا نشاں عرش پہ لہراتا ہے

کیسے پھر آنکھ نہ ہو موت پہ اس کی خوں بار
کیوں نہ ہر فرد کرے رنج و الم کا اظہار

بزمِ ہستی سے ضیاؔ ہو گیا رخصت "فرقتؔ"
چھن گیا قلب سے سرمایۂ تسکین و قرار

ناقدِ وقت کی میت ہے کہ لے بادِ خزاں
جا رہی ہے چمنستانِ تخیل سے بہار

فاضلِ طنز و مزاح، ماہرِ تنقید و نظر
ہے بلند اوجِ ثریا سے بھی جس کا معیار

جس کے ہر لفظ میں بجلی کی تڑپ ہے پنہاں
جس کے افکار میں پوشیدہ ہے فطرت کا نکھار

ایسے انسان زمانے میں کہاں ہوتے ہیں
جن کا دنیائے ادب، اہلِ زباں میں ہو وقار

کیوں نہ ہم پیش کریں اس کو خراجِ تحسین
جو کہ دنیا میں کرے علم کی قوت بیدار

موت اک رسم ہے اور رسم ادا ہوتی ہے
ورنہ فرقتؔ تیری ہستی بھی فنا ہوتی ہے

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی :۔ صدر شعبہ اُردو ڈھاکہ یونیورسٹی

غالبؔ

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

غالبؔ کی زندگی اور ماحول، فکر و فن، یہاں تک کہ ان کے فلسفے اور تصوف پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی لوگ لکھنے سے باز نہ آئیں گے۔ ان لکھنے والوں میں دانا دشمن اور نادان دوست بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور خال خال صاحبان ہوش بھی لیکن دوسرا حالیؔ دور دور تک نظر نہیں آتا جس کا نہ صرف ہمیں بلکہ غالبؔ کو بھی انتظار ہے اور جو واقعی یہ بتا سکے کہ :۔

غالبؔ کون ہے کیا ہے؟

بجنوری، عبداللطیف، اکرام، یگانہ، مہر، سبزواری، مرتضیٰ اور مالک رام وغیرہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ غالبؔ کے تقریباً ایک درجن شارحوں نے کیا کیا جتن نہ کیے لیکن جواب سب کو یہیں ملا :۔

برو، ایں دام برمرغ دگر نہ کہ عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اور یہ شعر تو آپکو بھی یاد ہوگا :۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بتائیے کس کا ہے۔ غالبؔ کا یا حالیؔ کے حیوان ظریف کا؟ اس میں سنجیدہ بات سنجیدگی سے کہی گئی ہے یا مذاق مذاق میں بنام نہاد دانشوروں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

لیکن مقدر کو کیا کہیے، وہ جسے " دبائے عام" میں "مرنا" بھی گوارا نہ ہوا" اب "جینے پر مجبور رہے۔ اپنے یا اپنی شاعری کو زندہ رکھنے کے لئے نہیں" کیوں کہ وہ اپنی اپنی زندگی کی خود ضمانت ہیں بلکہ اپنے شارحوں، ناقدوں اور محققوں کو "شہرت عام اور بقائے دوام" کے دربار میں ایک سیٹ خواہ وہ چونی والی ہی کیوں نہ ہو، دلا دینے کے لئے آرٹسٹ اور فنکار جیسے الفاظ کثرت استعمال سے رسوا نہ ہوگئے ہوتے تو یقین کیجیے میں بھی غالبؔ کو بڑا اور بہت بڑا آرٹسٹ اور فن کار کہہ گذرتا، اور تالیوں کی گونج میں اس کی پذیرائی بھی ہوتی۔ مگر کچھ تو اس خیال سے کہ غالبؔ شناسوں کے ہجوم میں دھکے کون کھائے اور بہت کچھ اس یقین کے پیش نظر کہ غالبؔ جیسے جدت پسند کی تربت پر باسی پھول چڑھانے میں کوئی ندرت نہیں۔ بس اسی قدر کہنے پر اتفاق کروں گا کہ غالبؔ اردو

شاعری کا وہ نتیجہ ہے جس کی دھاڑ کی گونج سے ایک پوری صدی گزر جانے کے بعد بھی "ایشیا کا دل" اور "یورپ کا دماغ" دونوں یکساں طور پر لرزہ براندام ہیں۔

یہ بات آج تک، انتہائی کوشش کے باوجود بھی ہماری سمجھ میں نہ آ سکی کہ "رقیبوں کے سرٹیفکیٹ" پر لوگ اتراتے اور خوش کیوں ہوتے ہیں۔ تحسین ناشناس پر فخر کیوں اور کس دل سے کیا جاتا ہے اور "سخن شناسی" رسوا کیوں ہے؟

شاید اس کی وجہ "ذہنی غلامی" ہو، جس پر توجہ تو بڑی بات ہے جس کے احساس کی صلاحیت تک اب ہم میں نہیں رہی۔ شوق تیری دہائی ہے۔

غالب کی شاعری کے سلسلے میں دو باتیں تھوڑے ہی کہی جانے لگی ہیں۔

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک "مقدس وید" اور دوسری "دیوان غالب" پہلی غلط فہمیوں کا منبع ہے اور دوسری تحریف و سرقہ۔

غالب نے اپنے فارسی کے کلام کو ایک ایسی شرط کے ساتھ "ایزدی کتاب" کہا تھا۔ جس کا پورا ہونا انہونی بات تھی

غالب اگر ایں فن سخن "دیں" بودے
آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

ظاہر ہے کہ فن سخن سب کچھ ہو سکتا ہے مگر "دین" نہیں ہو سکتا، ایسی صورت میں اس کا "ایزدی کتاب" ہونا محال ہے۔ بجنوری نے کوئی نرالا یا نیا انکشاف نہیں کیا ہے۔ محض "شرط" کو ہٹا کر "ایزدی" کو "الہامی" سے بدل دیا ہے۔

پہلی کو میں نے "غلط فہمی کا [illegible]" اس لئے قرار دیا ہے کہ اس کی وجہ سے یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ "غالب اپنے اردو کلام کو فارسی کلام کے مقابلے میں کمتر، فروتر اور حقیر سمجھتے تھے" اور اسکی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہ تھی۔ حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ غالب کو اپنی اردو اور فارسی شاعری، اس حد تک یکساں عزیز تھی کہ ان کے لئے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ممکن نہ ہو سکا۔ ثبوت کے لئے کیا یہ شعر کافی نہیں۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اس ذکر سے حاشا، کسی کی تنقیص مد نظر نہیں، صرف اس بات پر توجہ دلانا مقصود ہے کہ:-

صحت اور قطعیت کے ساتھ اسی وقت گفتگو کی جا سکتی ہے جب مطالعہ براہ راست ہو۔ ٹھنڈے دل اور کھلے دماغ سے کہا جائے۔ اور غالب کی چشم و ابرو کی خفیف سے خفیف جنبش کو بھی یہ سمجھ کر کہ اس میں دم نہیں، بے اعتنائی کا شکار نہ ہونے دیا جائے۔

"غالب پر "گل افشانی گفتار" کی بوچھار کس نے نہیں دیکھی؟ کسے نہیں معلوم کہ غالب کی شاعری کو دیکھنے والوں نے کس کس نظر سے دیکھا اور پرکھنے والوں نے کن کن زاویوں سے پرکھا ہے۔ لیکن کتنے ہیں جو یہ دعویٰ کر سکیں کہ انھوں نے کسی نہ کسی رنگ کی عینک لگائے ادھر ادھر دیکھے بغیر اس کے سارے کلام کو، اس کے حقیقی پس منظر سمیت دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

نوشہ کی موجودگی میں عروس سخن کے شرمانے، بہ

بہکنے اور بل کھانے کی کیفیت براتیوں سے پوچھنا حماقت نہ بھی ہو، کوئی معقول بات نہیں۔ پھر کیوں نہ "نوشہ" ہی سے پوچھ دیکھیں۔

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم "ولی" سمجھتے جو نہ "بادہ خوار ہوتا"

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوی پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

بھرا ہے غالب دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اس کو

اسد کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

لکھتا ہوں اسد سوزش دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

راست می گویم و از راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است

ہر کس و ناکس کے احسان سے بچنے کا، میرے خیال میں سبھی سلیقہ کا ایک طریقہ ہے۔

سی۔ ایم۔ عباس رضوی۔

مجاز اور ترغیبِ آزادی

'ترقی پسند تحریک' اور علی گڑھ کی دنیا' آزادی کی تاریخ میں کبھی بھولی نہیں جا سکتی ہیں۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر جو ہستیاں افق کے دامن پر اُبھریں اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر چھا گئیں۔ ان میں مجاز کا نام نہایت ادب و احترام سے لیا جائے گا۔

مشاہدات بتاتے ہیں کہ جب بھی انسان کے دل پر چوٹ پڑی ہے۔ اُس کے وجود کو غم نے گھیرا ہے۔ آدمی کے جذبات اُبھرے ہیں۔ اور دل کی آہیں چیخ بن کر ہونٹوں تک آ گئی ہیں' اُنھیں آہوں اور آنسوؤں کو سمیٹ کر، انھیں جذبات کو نکھار اور سنوار کر آدمی نے ادب میں سمویا ہے۔ ہندی کے مشہور شاعر سُمترا نندن پنتھ نے اس سلسلہ میں کتنی اچھی بات کہی ہے۔

بیوگی ہوگا پہلا کوی آہ سے اُوپجا ہوگا گیان
بہہ چلی ہوگی کویتا انجان۔

یعنی انسانی جذبات کے اظہار کیلئے شاعری ہی پہلا ذریعہ تھی۔ شاید اسی لئے شیلے نے شعر کو تخیل کی زبان کہا ہے ورڈس ورتھ کے لفظوں میں۔ شعر انسان اور فطرت کا عکس حسین ہے۔ اور کسی اُردو شاعر نے "معجزۂ فن" کی نمود کو خونِ جگر سے تعبیر کیا ہے۔

ان ساری باتوں سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ فنکار کے مشاہدات، تجربات' احساسات، خیالات، نظریات اور تصورات کو اُس کے فن کے ساتھ ایک گہری مناسبت ہوتی ہے۔ ایک ایسی ہی گہری نسبت جیسی چمن اور پھول میں ہے پھول اور خوشبو میں ہے۔

جدید شاعری کے ضمیر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس دور کا جائزہ لینا ہوگا۔ آج کے فنکار نے اپنے کلام میں وہی سب کچھ سمویا ہے۔ جو اس کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔ جو کچھ وہ سن رہا ہے۔ جن باتوں کو وہ محسوس کر رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے غریب اور بھوک کا تماشہ، نڈھال جسم' اُترے ہوئے چہرے اور غمناک آنکھیں۔ وہ سُن رہا ہے لامحدود دلوں کی فریاد و آہ و بکا۔ غریبوں اور مظلوموں کے دلخراش نالے' اُن کے قلب و جگر سے اُٹھتے ہوئے طوفان کا شعور۔ وہ محسوس کر رہا ہے مادیت کے بحران سے ستائے ہوئے معاشرہ کا کرب و انتشار' امیری و غریبی' سرمایہ داری و افلاس کی زبردست

ملش، رنگ ونسل کے امتیازات، انسان پر انسان کا
مدار، ایک کا دوسرے پر ظلم، ایک کا دوسرے کے ساتھ
نوروں جیسا سلوک یہ دیکھ کر شدت جذبات سے
تڑپ اٹھتا ہے۔ یہی سب کچھ مجاز کے یہاں بھی ہے
ان کے کلام میں ذہنی کشمکش، قلبی اضطراب اور روح کی
من ملاحظہ ہو ؎

کوئی نغمہ تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے
جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا!

گو کہ مجاز کو رومان سے بھی گہری وابستگی ہے رومانیت
اکی روح میں رچی بسی ہے وہ فطرت کے رنگین اور شوخ
روں میں کھو جانا چاہتا ہے۔ چشم مخمور کے چھلکتے جام اسے
دعوت دیتے ہیں۔ اور وہ ان کے تقاضوں پر جھک جاتا
لیکن پھر بھی وہ وقت و حالات کی رفتار کو فراموش
ں کرتا زندگی سے فرار اسے پسند نہیں۔ نیا آزنغ پوری
لفظوں میں ــــ

"رومانیت کی روح دنیا سے کبھی ختم نہیں ہو سکتی،
بسی نہ کسی صورت میں ضرور پائی جائے گی۔ اگر ایسا نہ
تا تو عمر خیام کی رباعیاں، شیلے، کیٹس کی نظمیں، شکسپیر کا
یو جیولیٹ، کالی داس کا شکنتلا اور میگھ دوت، در
نظ د غالب کی غزلیات کبھی اس دنیا سے ناپید ہو جاتیں
ست بھی اور حقیقتوں کی طرح ایک زندہ اور ناقابل فراموش
یقت ہے اور دنیا کی ہر زبان عالیہ کا موضوع عموماً محبت
رہا ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ رومانیت زندگی سے فرار کا
ا ہے۔ رومانیت بجائے خود ایک حقیقت زندگی ہے۔
پھر زندگی سے فرار کیا معنی، عصر حاضر کی شاعری خواہ وہ
لابی ہو یا رومانی حقیقتوں کے انمول رتن کے علاوہ کچھ
رہے ہی نہیں۔"

مجاز ایک رومانی شاعر ضرور ہے۔ لیکن اس کا رومان
ڈھنگ کا انوکھا ہے۔ یہ رومان اس کے کلام پر تاریکی کی
ایک ہلکی سی دھند بھی نہیں پڑنے دیتا۔ بلکہ ایک صاف
شفاف روشنی بنتا ہے۔ اپنے معاصرین میں مجاز کا کلام
ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ اس کا اپنا ایک تصور ہے۔ وہ
ہر چیز کو اپنے ڈھنگ سے دیکھتا ہے۔ اور اس سے متاثر
ہوتا ہے۔

مجاز کے دل پر جب کوئی "چوٹ" پڑتی ہے اس
کی زندگی میں "دریچہ" کھلا ہے۔ اس نے جو کچھ بھی دیکھا ہے
بہت غور سے دیکھا ہے۔ جو کچھ بھی سنا کان لگا کر، جو بھی محسوس کیا
ہے شدت سے اور جو بھی اثر قبول کیا ہے بہت گہرائی تک
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ شدت جذبات سے بے تاب
ہو گیا ہے عالم بے قراری میں اس کے منہ سے ایک چیخ نکل
پڑی ہے ؎

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب

سجاد ظہیر کی زبان میں۔
ان کی شاعری زندگی کے حقائق پر اپنی بنیاد رکھتی
ہے۔ یہ رباب کے تاروں کو چھیڑ کر جذبات کے تلاطم خیز
مادے سے اس طلسماتی دنیا کی تعمیر کرتی ہے، جہاں اور نگ
پرے تعصب کے پردے، جہالت کے پردے ہٹنے لگتے ہیں
جہاں با منطق اور باعمل جدوجہد سے وجد و کیف پیدا ہوتا
ہے اور جہاں ذاتی کسرتیں اور رنج و کاوش وسیع تر حقائق
کے اجزا معلوم ہوتے ہیں۔ مجاز صرف رومان پرست نہیں ہے
بلکہ بغاوت کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ ایسے میں مجاز کا سماجی
شعور رومانیت کے تمام پردوں کو چاک کرکے بالکل باہر
نکل آتا ہے۔ اس لئے وہ انسانی ادراک پر کے تعصب و

تاریکی کے بادلوں کو نوچ کر پھینک دینا چاہتا ہے۔ وہ
حرکت اور تغیر کے ساز پر گانا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کا
انداز رومانی ہونے کے باوجود زندگی کے حقائق سے
دست و گریباں ہے۔ ۱؎

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "آوارہ" اور "اندھیری رات
کا مسافر" ایسی نظمیں لکھنے والا اگر بُری صحبتوں میں پڑ کر جام
مے و مینا کا شکار ہو گیا۔ نادان دوستوں نے اُسے صوزآوارہ
بنا دیا لیکن شاید زبان حال سے وہ کہتا رہا ہو۔

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں،

خود کثافت میں مبتلا رہنے کے باوجود مجاز نے اپنے کلام
کو کبھی کثیف نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے عروسِ فن کو نوک
پلک سے سنوارا ہے۔ اور اس کے بھرے دامن پر ہلکا سا
بھی داغ نہیں آنے دیا ہے۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
کے لفظوں میں۔

مجاز ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود ترقی پسندی
کی قابل فخر روایت پر عمل نہ کر سکے۔ اُن کی شاعری میں
نہ تو عریانیت ہے۔ نہ جنسی بے راہ روی۔ نہ ادبی نراجی
وہ ترقی پسند نظریات سے متاثر ہو کر خود آوارہ ہو گئے
لیکن اپنی شاعری کو آوارہ نہیں ہونے دیا۔ ۲؎

مجاز کے کلام میں جہاں شیرینی و رنگینی ہے لطافت
و پاکیزگی ہے وہیں زبردست جوش انقلاب، ترغیب
آزادی اور جذبۂ حریت بھی موجود ہے۔ ایسی جوش
انقلاب نے، ایسی جذبۂ حریت نے مجاز کو ہمیشہ مضطرب
رکھا۔ اُس کے سینے میں ایک آگ دہکتی رہی اور وہ
سلگتا رہا۔ جلتا رہا۔ ایسی مسلسل تپش و اضطراب نے آخرکار
اس کے دل میں وحشت کی جگہ لے لی اور وہ "جگمگاتی
جاگتی سڑکوں پر" ناشاد و ناکارہ" مارا مارا پھرنے لگا۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

شاید مجاز ہی وہ شاعر ہے جس نے اپنے قلبی تاثرات
دلی کیفیات اور ذہنی رجحانات کو اتنے کھلے، صاف
اور جاذب انداز پیش کیا ہے۔ یقینی طور پر "آوارہ" داخلیت
اور خارجیت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اس کا جذبۂ
انقلاب و بغاوت اس نظم میں اپنے انتہائی عروج پر
پہونچ گیا ہے وہ جذبات سے مغلوب ہو گیا ہے۔ اس
کے صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے۔ اس کا دل بے قابو
ہے۔ وہ حیران و پریشان ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ
کیا کرے۔ کہاں جائے؟ اُس کے غم کا مداوا کہاں
ملے گا۔ آخر اس کے درد کا درماں کیا ہے؟ ؎

دل میں اک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں؟
میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں؟
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں؟
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے۔ مجاز نے
دیکھا سرمایہ داری نظام کی بہیمیت و درندگی کو، اس
نے محسوس کیا۔ اپنے ہموطنوں کی محکومی و مجبوری کو،
حکومت کی کھلی ہوئی دست درازیوں کو، مفلسی کے مذاق
کو، انسان پر انسان کے ناجائز دباؤ کو، نئی تہذیب
کے پردے میں کھلی ہوئی لوٹ مار، خوف و غارت گری کو

۱؎ دیباچۂ آہنگ ۔ سجاد ظہیر
۲؎ تعارف تاریخ اردو جدید ایڈیشن۔ شجاعت علی سندیلوی

زان باتوں کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے معذوروں مجبوروں کو للکار کر بغاوت کا علم بلند کر دیا ؎

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں۔۔۔۔

پھر اس کا جوش اور بڑھتا ہے ؎

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا ہے سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں۔۔۔۔

مجاز کے وجود میں ایک نشتر کی سی چبھن، بجلی کی سی چمک اور شعلے کی سی لپک، ہے وہ وطن کی آزادی کے لئے بے چین ہے۔ وہ سماج کے فرسودہ اصولوں کو بدلنے کے لئے بغاوت پر آمادہ ہے۔ سرمایہ داری کے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔ غلامی کی لعنت اس سے برداشت نہیں۔ یہ طوق آہنی اس سے سہا نہیں جاتا۔ ترکی کی مشہور سیاستداں خاتون خالدہ ادیب کی آمد پر مجاز نے جو نظم پیش کی اس میں یہ جذبات کس قدر ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ شاعر کو اپنی حالتِ زار پر کتنی حسرت اور کس قدر افسوس و ملال ملاحظہ ہو ؎

ہاں بتا دے ہم کو بھی اے روح ارباب نیاز
کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ و فنون کا امتیاز
دل پہ کیونکر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز
چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز
تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے
آہ یہ جوہر ہماری دسترس سے دور ہے

وقت گزرتا رہا۔ ذہن کی یہ پیاس بڑھتی رہی۔ آخر آہستہ آہستہ افق عالم پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ دوسری جنگ عظیم کے آثار نمایاں ہوئے۔ تخریب کے سامنے تعمیر نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ ظلم و استبداد کے مضبوط شکنجوں نے امن عالم کی شکستہ عمارت کو نیست و نابود کر ڈالنا چاہا۔ مگر حالات کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی "اندھیری رات کا مسافر" اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ کوئی اس کے عزم کو متزلزل نہ کر سکا۔ ذرا یہ ہمت و حوصلہ بھی ملاحظہ ہو۔ شاعر کن حالات میں منزل کی طرف بڑھ رہا ہے ؎

زمیں چیں بر جبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

پھر حالات نے کروٹ لی۔ سرمایہ دارانہ نظام دم توڑنے لگا۔ دوسری جنگ عظیم ہوئی۔ اور لوگ پوری طرح بیدار ہو گئے۔ محکومی و غلامی کی ہتھکڑیاں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ تاریکی چھٹی اور مدھم مدھم شعاعیں پھوٹیں مجاز نے وقت کی گھڑیوں کو بہت پہلے گن لیا اور یہ پیشنگوئی کر دی کہ "باہزاراں آب و تاب" آفتاب حریت جگمگانے ہی والا ہے ؎

حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
اس طرح لے گا زمانہ موت کا خونی سبق
آسماں پر خاک ہوگی فرق پہ رنگ شفق
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

اسی سلسلے میں "طفلی کا خواب" بھی ملاحظہ ہو۔ شاعر
کے جذبات کس حوصلہ افزا ہیں۔ اُن کی تمنائیں کن بلندیوں
کو چھوتی ہیں ؎

دریائے خشر خیز کی موجوں کو چیر کر
کشتی سمیت دامنِ ساحل میں ہم بھی ہوں

صرف اتنا ہی نہیں ؎

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آبدار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

شاعر آرام وسکون کو حرام قرار دیتا ہے۔ وہ بغاوت،
انقلاب و اضطراب کے لئے بے چین ہو جاتا ہے ؎

سکون خواب ہے بے دست و پا ضعیفی کا
تو اضطراب ہے خود اضطراب پیدا کر

پھر شاعر صاف لفظوں میں کہہ دیتا ہے ؎

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

غلامی کی زنجیر توڑ دینے کیلئے، اس لعنت کے طوق کو
اُتار پھینکنے کے لئے مجاز اپنے ہموطنوں کو آواز پر آواز دیتا
ہے وہ انھیں غیرت دلا کر ان سے پوچھتا ہے ؎

تجھ پہ یہ بارِ غلامی کا گراں ہے کہ نہیں؟
جسم میں خونِ جوانی کا رواں ہے کہ نہیں

پھر جنسِ آزادی کی خواستگاری کو کس انداز میں بیان
کرتا ہے ؎

اور اگر ہے تو آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنسِ آزادئ انسان کے خریدار ہیں ہم

اور پھر یہ جنسِ آزادئ انسان کا خریدار اپنے ہموطنوں
کے اندر جذبۂ انقلاب و حریت کوٹ کوٹ کے بھر دیتا
ہے۔ وہ اپنے ملک والوں کو یہ راز بتاتا ہے کہ اُٹھو
اور کمر باندھ کے تو دیکھو دنیا کی تمام تعبیریں تمھارے
قدموں پہ نثار ہوں گی۔ ذرا شمشیر تو اُٹھاؤ تمام عظمتیں خود
بخود تمھارے قدموں پر اپنا سر جھکا دیں گی ؎

ساقی و رند تیرے ہیں مئے گلفام تیری
اُٹھ کہ آسودہ ہو پھر حسرتِ ناکام تیری
برہمن تیرے ہیں کل ملّتِ اسلام تیری
صبح کاشی تیری، سنگم کی حسیں شام تیری
دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

یہ بند بھی ملاحظہ ہو۔ شمشیر اُٹھانے کے جذبہ کو شاعر
نے کس عروج پر پہونچا دیا ہے۔ وہ ہموطنوں کو گلستاں کے
بدلے ہوئے رنگ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ملک و قوم کی
بیداری کو دکھاتا ہے۔ فضا میں بکھرے ہوئے مظلوموں
کی آہوں کے دھوئیں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جنگ
کے نعروں پر کان لگاتا ہے۔ اور ہر جوان کو یہ نعرے
سنوا کر مائل بہ انقلاب کرتا ہے۔ مجاز میں کس بلا کا جوش
و خروش ہے ؎

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ ہے جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائل جنگ نظر آتا ہے ہر مرد جواں
سرد فتاں بلاکس کا سہارا بن جا
اُٹھ اور افلاکِ بغاوت کا ستارا بن جا

اسی طرح مجاز اپنی نظم "مزدور کا گیت" میں بھی جذبۂ
حریت کو اُبھارتا ہے۔ وہ سماج کے ہاتھوں ستائے ہوئے
نئی تہذیب کے نام پر لوٹے ہوئے۔ سرمایہ داری کے ہاتھ
تباہ و برباد لوگوں کو ایک پیام نو دیتا ہے۔ وہ ا

ندے اور کچلے ہوئے غریبوں کی حسرتوں کو تیز کرتا ہے۔
کھلی ترغیب انقلاب، بغاوت و آزادی دیتا ہے ؎

ں سمت بڑھا دیتے ہیں قدم
ک جاتے ہیں شاہوں کے پرچم
سا دنت ہیں ہم بلونت ہیں ہم
مزدور ہیں ہم۔ مزدور ہیں ہم

یہ جرأت و حوصلہ، یہ ہمت و استقلال بھی ملاحظہ ہو
اعزم کا کوہ گراں بن کر ہر "نظمِ کہن" ڈھا دینے کے لئے
گیا ہے ؎

کیا ہیں کبھی دکھلا دینگے　　ہم نظمِ کہن کو ڈھا دینگے
ارض و سماں کو ہلا دینگے　　مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم
جسم میں طاقت رکھتے ہیں　　سینوں میں حرارت رکھتے ہیں
ہم عزم بغاوت رکھتے ہیں
مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

در آخر میں مجاز صاف کہہ دیتے ہیں ؎

س روز بغاوت کر دینگے　　دنیا میں قیامت کر دینگے
ابوں کو حقیقت کر دینگے　　مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

مجاز ایک جہان نو، کا آرزو مند ہے۔ لیکن وہ آخر
بران کی طرح اپنے "عشق" سے کہیں دور سے چلنے کا تقاضا
میں کرتا۔ وہ ایسی دنیا میں رہنا چاہتا ہے۔ اسی سماج
ں بنتا ہے۔ لیکن اس سماج کو، اس کے نظام کو، یہاں کے
ور طریقے کو، مزدور بدلنا چاہتا ہے وہ ایک نیا نظام لانا
اہتا ہے۔ ایک ایسا نظام جس کے آئین نئے ہوں۔ جس کا
ستور نیا ہو۔ وہ ایک ایسے معاشرے کا متمنی ہے۔ جہاں
لوص و محبت کی فضا ہو۔ نفرت و بیگانگی کی گھٹن نہ ہو۔
ہاں عدل و انصاف ہو۔ جہالت و تاریکی نہ ہو۔ جہاں
نسان کے فکر و نظر پر پہرے نہ بٹھائے گئے ہوں۔ جہاں
چند لوگوں کے ہاتھوں میں تمام انسانوں کی زندگی نہ ہو
انھیں باتوں کے لئے وہ انقلاب چاہتا ہے، بغاوت کے
لئے اکساتا ہے، اور آزادی کی ترغیب دیتا ہے جوانانِ
وطن سے یہ عزم مخاطب ملاحظہ ہو ؎

اے جوانانِ وطن روح جوان ہے تو اٹھو
آنکھ اس محشرِ نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوف بے حرمتی فکر زباں ہے تو اٹھو
پاس ناموس نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو
اٹھو نکارۂ افلاک بجا دو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر

مجاز ماضی کی تہذیب کے نقش و نگار مٹتے دیکھتا ہے اور
کڑھ جاتا ہے۔ وہ فتنوں کو دیکھتا ہے اور اس کے ذہن
میں آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ بے حد جذباتی و انتقامی
بن جاتا ہے ؎

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار دبا دو ان کو
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو ان کو
پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلا دو ان کو
شان شایان وطن ہو یہ بتا دو ان کو
یاد ہے تم کو کن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو

اس طرح مجاز ساری عمر تغیر و انقلاب، بغاوت اور
آزادی کے نغمے گاتا رہا۔ ان نغموں میں جہاں بے پناہ جوش
عزم و حوصلہ ہے لا محدود درد و کرب بھی چھپا ہوا ہے یہ ہی
درد و کرب۔ یہی بے چینی و اضطراب لئے وہ ساری عمر
کروٹیں بدلتا رہا۔ اُسے اپنی فکر نہیں تھی مگر دوسرے
کی حالت زار دیکھ کر وہ ملول ہو جاتا تھا۔ اُسے اپنی
پریشانیوں کی پرواہ نہ تھی لیکن دوسرے کی چاک دامانی

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

غزل

مرزا غالب

(مولانا سید ابوالحسن ادیب مرحوم)

نقش ہے جس کا مرے دل پر کھلا — کاش ہوتا مجھ سے وہ دلبر کھلا

اس کی ہر اک بات دلکش کیوں نہ ہو — ہر ادا جس کی ہے اک نشتر کھلا

جو فرشتوں کی نظر سے تھا نہاں — سامنے وہ یوں پھرے رُخ سر کھلا

کیوں نہ ہو ابرِ نظر کی آنکھ میں — ہر گلِ تر اک پری پیکر کھلا

کوندتی ہیں بجلیاں آنکھوں میں آج — کس کا دیکھا چہرۂ انور کھلا

کس طرح حاصل رہائی اس سے ہو — یہ دلِ مضطر ہے پردہ در کھلا

تو نے کی جس پر نظر مارا اُسے — تیرا جادو چشم جادوگر کھلا

فی الحقیقت وہ غزل ہے اے ادیب
جس کا ہر مصرع ہو اک خنجر کھلا

انصر کریم ایم۔ اے۔ دریابادی :

مولانا عبدالماجد دریابادی
چند ذاتی تاثرات

مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام دُنیائے علم و ادب پر ایک درخشاں ستارے کے مانند روشن ہے دنیائے ادب کے آفتاب کی تشبیہ، قدرے زور دار ضرور ہو سکتی ہے لیکن ستارہ درخشاں کی روشنی زیادہ رُوح پرور اور دل کو موہ کر لینے والی ہو سکتی۔ اگر ہم جانتے ہوں کہ یہ روشنی اس ستارہ کی ہے اور یہ روشنی زمانہ سے ہم تک پہونچ رہی ہے۔ اور یہ بھی دراصل یہ ستارہ تو آفتاب سے بھی روشن تر ہے۔

دُنیا مولانا موصوف کو ایک عالم، ایک مبلغ، ایک دانشور، ایک ادیب کی حیثیت سے گزشتہ ساٹھ سال سے جان رہی ہے۔ لیکن یہ چند سطور ایک ایسے شخص کے قلم سے نکل رہے ہیں جو کئی حیثیت سے کارضرور لیکن جس کو مولانا کو ذاتی طور پر بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملے

بات کہاں سے شروع کروں؟ یہ امر بھی دشوار ہے۔ اپنے بچپن کے اس دور سے جب کہ ہمیں خود بڑے، چھوٹے کی تمیز نہ تھی۔ وہ مولسری یا انار کا درخت جو مولانا کی آبائی حویلی کے باہری آنگن میں لگا تھا جہاں وہ وسط Thirties میں اکثر کو رونق فرما ہوتے تھے۔ یا اُس کے بہت بعد جب کہ بحیثیت ایک طالب علم کے، یعنی مولانا موصوف سے زندگی کا درس لیا کرتا تھا؟

ہاں تو بات اس مولسری کے پیڑ یا انار کی کلیوں سے شروع ہوئی ہے جبکہ خاندان کے ایک چھوٹے سے فرد سے مولانا ہم کلام ہوئے۔

"تمھاری امّی تم کو چاہتی ہیں ؟

"جی! ہاں!"

"اور تمھارے والد؟"

"جی وہ بھی"

"اور تمھارے والد تمھاری امّی کو؟"

"جی چپ رہے۔ آپکو......"

استغفر اللہ! اُن کو شاید اصل الفاظ بھی یاد ہوں اور

راقم الحروف کو سنائی یاد ہے دل آج بھی شرمندہ ہے۔

شام میں مولانا عصر کے بعد باہر بیٹھتے اور آنے جانے والوں کا سلسلہ رہتا۔ عزیز بھی، اور غیر بھی آشنا سا بھی اور اجنبی بھی۔ مولانا کی باتیں کبھی علمی تو کبھی ادبی ہوتیں، لیکن زندگی سے قریب تر۔ وعظ بالکل نہیں۔ لیکن اپنے میں ایک مطلب لئے ہوئے، درس دیتے ہوئے۔ کبھی ایک خاندانی قوال۔ جو آداب محفل سے پوری طرح واقف تھے، آجاتے اور پھر تو لطائف بھی ہوتے۔ اور مزاح بھی لیکن ایسے جو ذوق سلیم کو دوبالا کر دیں اور آپ مسکرا تو دیں لیکن قہقہہ نہ لگائیں۔ کسی کی ہجو تو ذرا کبھی نہ سنتے، اور عالم ادب کا یہ مشہور اور معروف طنز نگار کبھی بھی شخصیت کی بحث میں نہ الجھتے اگر کسی طرف سے ایسی پہل ہوتی بھی تو کسلمندانہ کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔

ٹھنڈا غصہ! اکثر وہ ہم کو تلقین کرتے کہ کبھی نوکروں پر یا اس زمانہ کے سماجی نظام میں، ملازموں پر کبھی سیخ پا نہ ہونا بلکہ ٹھنڈے غصہ سے ان کی تادیب کرو۔ مولانا کو جب غصہ آجاتا، تخلیہ میں وہ ہمیشہ تاسف کرتے ـــــ "ہاں اس مسئلہ کو ٹھنڈے غصہ سے سلجھانا تھا۔"

گرمی کی چھٹیوں میں، خاندان کے سبھی طلبہ دریاباد میں اکٹھے ہوتے جو مولانا سے زیادہ قریب ہوتے ان کو الگ وقت ملتا۔ مضامین لکھ کر دکھاتے۔ انگریزی اور اُردو میں۔ اور دوسرے اخلاقی سبق کے لئے۔ یہ چالیس کی دہائی کا زمانہ ہے جب مولانا سے ہم نے اس قسم کے درس لینا شروع کئے اور آج یہ نئے زمانہ کی بات ہوئی، مولانا موصوف پہلے سے ہی صحت مند قسم کے جنسیاتی اور اخلاقی ادب پڑھنے کی ضرورت محسوس کرتے اور یہ درس اپنی جھجک لگا ہوں سے ہم کو دیتے۔ غرضکہ کوشش یہی رہتی کہ اسکولی کتابوں کے درس کے علاوہ خود ان کو وہ درس بھی بتا دیے جائیں جن سے ہر انسان کو زندگی میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ورزش اور کھیل کود پر بھی زور تھا۔ کچھ تو گھوڑ سواری بھی کرتے اور رات کی محفل میں رسہ کشی کے مقابلے ہوتے۔

مولانا کا قیام اب دریاباد ہی میں تھا لیکن لکھنؤ آنا جانا لگا ہی رہتا۔ صدق تو لکھنؤ سے ہی شائع ہوتا ہے۔ اور پھر ان کا قیام خاتون منزل میں رہتا۔ لکھنؤ میں ان کی مصروفیات دوسرے نوع کی تھیں۔ علمی، مذہبی اور ادبی میٹنگ، ادبا اور دوسروں سے ملاقاتیں وغیرہ۔

ہاں دریاباد سے جب ۱۰ بجے بگھی پر اسٹیشن کے لئے چلتے تو اکثر ہم لوگ ان کے ساتھ ہوتے۔ اسٹیشن دریاباد قصبہ سے دو میل پر واقع ہے۔ اس زمانہ میں سڑک بھی کچی تھی اور ہر دو طرف کھیت تھے، آم کے باغ تھے۔ جو اب بھی ہیں۔ گھوڑا گاڑی خراماں، خراماں۔ دھکے لیتے ہوئے بند راستوں سے گذرتی اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے قرون وسطیٰ کے یورپ میں ہم پہونچ گئے ہوں۔ مولانا کی تعلیم وہاں بھی جاری رہتی۔

اب پچیس برس ادھر جب میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہوں، تو لگتا ہے کہ جیسے فرانسیسی علماء یا انسائیکلو پیڈیا اسی کا دور ہو۔ جب کہ مولانا زندگی کے ہر پہلو پر۔ سائنس۔ ادب، سینما، اور مذہب پر یکساں قدرت سے روشنی ڈالتے رہتے۔ مولانا اپنی عنا یا عبا میں، ایک بڑے انسان کی عظمت اور پاکیزگی میں چھپے ہوئے تھے۔ لیکن خود ان کا زور اپنی کسر نفسی پر تھا اور تحریر

ںے کو "اس نامۂ سیاہ" کے علاوہ اور کسی طرح یاد
ا کرتے۔ اردو ادب کی بات ہو تو ہم کو لفظ "کافی" کے
ا ذہن نشین کرا دیتے۔ ہم "کافی" کو "بہت" کے معنی میں
ے ہیں۔ لیکن اس کا اصلی مفہوم مختلف ہوتا ہے ۔۔۔
نس برائے جنس" قسم کے ادب کے مخالف ضرور رہے لیکن
ں یہ مسئلہ اعراؤ جان ادا کے روپ میں پیش ہوا یا مثنوی
عشق کے، مولانا کھل کر داد دیتے۔

مولانا موصوف کا ذہنی یا علمی
ر، بہت دشوار گزار منزلوں سے گزرا ہے۔ ۔ ۔ ۔ عقلیت
وہ دور جبکہ میل اور اسپنسر، آج کے مارکس یا لینن کے
تراد ف تھے۔ پھر گیتا اور تصوف اور پھر اسلام کا وہ رخ
آج ان کا ہے۔ یہ سفر ہلکان کرنے والا بھی ہوتا ہے اور
شوار گزار بھی۔ لیکن اس سفر میں بھول بھلیاں میں کھو
جانے کے بجائے۔ اپنی اپنی منزلِ مقصود پر پہونچ جانا بھی
"مردِ خدا" کی دلیل ہے وہ ایک فلسفی بھی ہیں اور مذہب
ں تنگدلی اور تعصب کی گنجائش نہیں پاتے نہ عقل اور
مذہب میں کوئی تضاد۔

دکھ اور سکھ، کامیابی اور نامرادی کے دور سے
بھی مولانا موصوف خوب واقف ہیں اور اپنے تجربات سے
ہماری زندگی میں روشنی بھرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے
ہیں۔ اس کو زیادہ پیارہ زبان میں دوسروں کے دکھ
بانٹنا کہتے ہیں۔ ہائے، وہ زندگی کی شام جب راقم الحروف
نے کم عمری میں ہی اپنے والد کو کھو دیا تھا۔ مولانا کا وہ
قول آج ۳۲ سال بعد بھی یاد آتا ہے' جو خدا کا وعدہ
انھوں نے اس وقت یاد دلایا تھا ۔۔۔ خدا کی عنایات
اور محبت تو باپ کی محبت سے سینکڑوں گنا زیادہ ہے"۔

"مرد کبھی نہیں روتے" مولانا نے کبھی اس قسم
کا دعویٰ ذہن نشین نہیں کرایا۔ مولانا کی والدہ اللہ کو
پیاری ہوئیں، ہمشیرہ گئیں، اور بھائی بھی ابھی یعنی چھ
سال پہلے ان کی شریکِ زندگی جو ان کو کتنی محبوب تھیں
وہ اکیلے رہ گئے، لیکن وہ زندگی کے فرائض سے کبھی غافل نہیں
ہوئے۔ اسی طرح اپنے زندگی کے فرائض نبھا رہے ہیں۔

مولانا نے صبح تڑکے دو چار میل گھومنا اپنا معمول بنا لیا
تھا اور اس وقت دو ایک آدمی ان کے رفیق ہوتے۔ صحت
ماشاء اللہ ان کی اچھی رہی۔ سوا بینائی کی کمزوری، اور دانتوں
کی کمزوری کے جس کا ذکر وہ اکثر کرتے کہ شروع کی بے احتیاطی
کی وجہ ہے۔ آج یہ کان سنتے ہیں کہ طبیعت کسلمند رہتی ہے۔
بلڈ پریشر بڑھتا رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دل پھر ان ماضی کے
دھندلکوں میں جھانکنے لگتا ہے۔ جب آپ وہ ہم کو حفظ صحت
کے درس دیتے تھے۔

زندگی کی ناپائیداری، وقت کا بہاؤ، عمر و سال کی
تیز گامی۔ ان سب کا تذکرہ اکثر کرتے۔ اپنی جوانی سالی یاد
کرتے جب وہ ابھی خود پچاس کے لگ بھگ ہوئے۔ سن ۱۸۹۲ء
کی پیدائش۔ آج وہ ماشاء اللہ زندگی کی ۸۳-۸۲ بہاریں
دیکھ چکے ہیں۔ خود راقم الحروف تیزی سے جوانی کی شام پار
کر آیا۔ پتہ نہیں، اب وہ محفلیں کہاں گئیں۔ وہ مولسری کا پیڑ کیسے مرجھا گیا
انار کی کلیاں کیوں بکھر گئیں اور وہ بچپن کے کھیل کود، وہ ہر شام دنگل کشتی
کے مقابلے، وہ درس، وہ صحبت کہاں گئی؟ دیکھنے والے دوسروں کو عمر
رسیدہ، بزرگ اور ضعیف کہتے ہیں۔ لیکن خود انسان محسوس کرتا ہے کہ
یہ سب کل ہی کی تو بات ہے۔ وہ جوانی، وہ شباب، وہ بچپن، دل
چیخ چیخ کر کہتا ہے "ہم تو بالکل نہیں بدلے"۔ لیکن وقت کی پکار کچھ

ضیا فتح آبادی :

جدیدیت اور ساحل مانکپوری

۱۹۰۵ء میں داغ کی وفات کے ساتھ اردو تاریخ کے جس قدیم وطویل باب کا اختتام ہوا۔ اُسے عام طور سے غزلیہ شاعری کا دور کہا جاتا ہے حالی اور اُس کے ہم خیالوں نے اس دور کی شاعری کو زلف و رخ کی شاعری یا بقول جوش میاں کی شاعری کہہ کر متروک و مردود قرار دیا۔ حالی اور اقبال نے ادب کو مقصدی اور شاعری کو مفید اور کارآمد بنانے کی کوشش کی۔ گویہ کہنا کہ غزلیہ شاعری کا دور مقصدیت اور افادیت سے قطعی طور پر عاری اور زندگی سے کوسوں دور تھا۔ حقیقت کو جھٹلانا ہے یہ درست ہے کہ غزلیہ شاعری نوابوں اور رئیسوں کی حویلیوں اور راجاؤں اور بادشاہوں کے محلوں میں داد طلب رہی مگر اس تاریخی واقعوں سے چشم پوشی بھی نہیں کی جاسکتی کہ اس غزلیہ شاعری نے تخلیق پائی عوام کے ذہنوں میں۔ اور شہر کے کوچہ و بازار میں چنانچہ اس شاعری میں ایمائی رنگ بہت گہرا ہے' اور یہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے راست نہ کہہ کر پردے میں کہتی ہے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ حالی اور اقبال کی نگاہوں سے یہ ایمائی کیفیت اور پردے میں کہنے والی بات چھپی ہوئی تھی۔

مگر ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے پیدا ہونے والے سیاسی اور سماجی حالات کی رو میں اتنا بہہ گئے کہ اُن کو ادبی انقلاب لاتے ہی بنی۔ علاوہ ازیں انڈین نیشنل کانگرس نے جس قومیت اور وطنیت کے جذبہ کو اُبھارا اس سے ادبی تخلیقات کو الگ رکھا ہی نہیں جا سکتا تھا ادب میں ایک نئی راہ کی دریافت نے پروپیگنڈے اور نعرہ بازی کو جنم دیا۔ جس کے نتیجہ میں غزلیہ شاعری مصنوعی اور غیر فطری نظر آنے لگی۔ غزل کی جڑیں اتنی گہری اور مضبوط ہو چکی تھیں کہ فوری طور پر اُس میں کوئی نمایاں تبدیلی لانا ممکن نہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ اقبال، جوش اور سیماب نے نظم کو زیادہ وسیع اور کارآمد سمجھا۔ جوش نے تو غزل ہی کو ترک کر دیا۔ لیکن اقبال اور سیماب نے غزل کو تغزل محض سے پاک کرکے ایک ایسا روپ دیا جس سے اس کے ہر شعر میں نظم کی شان پیدا ہوگئی۔ اسی بیچ میں ایک ایسا منظم ادبی قافلہ میدانِ اُردو میں اُترا۔ جس نے اپنے مخصوص سیاسی نظریات و عقائد کی نشر و اشاعت کو ترقی پسندی' ادب برائے زندگی اور انسانیت سے تعبیر کیا انھوں

نے چند شعرا کو چھوڑ کر جن میں میرؔ، نظیرؔ، اور اکبر غالبؔ کے نام خاص طور پر لیے جاتے ہیں۔ باقی تمام شعرا کی تخلیقات کو ادب برائے ادب اور رجعت پسند کہہ کر منسوخ کر دیا۔ ۱۹۳۶ سے ۱۹۴۵ تک یہ گروہ اُردو ادب پر پُوری طرح حاوی رہا۔ آخر وہی ہوا جو ایسی تحریکوں میں عام طور سے ہوا کرتا ہے۔ یعنی دس برس کی قلیل مُدت میں اس گروہ کے تخلیقی سوتے خشک ہو گئے۔ اور ادب میں جمود و سکر کا عالم طاری ہو گیا۔ اس طلسم جمود و سکر کو توڑنے کے لیے چند نوجوان تازہ واردانِ بساطِ ادب کے ذہنوں میں ایک تازہ تحریک نے انگڑائی لی جو آگے چل کر جدیدیت کے نام سے پکاری جانے لگی۔ جدیدیت میں جہاں سماج سے زیادہ اہم فرد ہے وہاں قدیم ادبی و فنی قدروں کے احیا کی تلقین بھی ملتی ہے زبان و بیان کے پیرایوں کی آزادیاں ہیں، متروکات کا ترک ہے، نئے نئے الفاظ کی ترویج ہے اور پُرانے الفاظ کو نئے مفہوم دیئے جاتے ہیں۔ غزلیہ شاعری کی پردے والی بات یعنی ابہام جدیدیت پر حاوی و غالب ہے جدیدیت کا آغاز دراصل اس زمانہ میں ہوا جب برطانیہ کو اپنا سایہ اپنے مقبوضات سے جبراً ہٹا لینا پڑا۔ ہندوستان اور دیگر ملک آزاد اور خود مختار ملک بن گئے۔ مگر اس آزادی اور خود مختاری کے باوجود فرد کی حالت میں کوئی خوش گوار تبدیلی نہیں آئی بلکہ وہ اقتصادی طور سے کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ ترقی پسند ادب میں فرد اور اس کے گوناگوں مسائل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے زندگی کے بدلے اور بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دینا اُس کے بس کی بات تھی ہی نہیں، یہ کام جدیدیت ہی کو کرنا تھا اور اسی نے کیا۔ ان نوجوان تازہ واردانِ ادب میں جو نام اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں محمود سعیدی، بشیر بدر، کرشن اشک، کمار پاشی، ندا فاضلی، راج نرائن، راز اور ساحل مانک پُوری کافی اہم اور نمایاں ہیں۔

دوسرے شعرا کی طرح ساحل کی شاعری کی ابتدا بھی غزل ہی سے ہوئی۔ دورانِ مشق کی غزلوں میں روایات کا لحاظ، زبان و بیان کی صحت اور فنی قیود کی پابندی ضروری ہے۔ ساحل کی ابتدائی غزلوں میں ان تمام لوازمات کا پایا جانا ناگزیر ہے ان کے مجموعہ کلام شش جہت (مطبوعہ نومبر ۱۹۷۳ء) میں شامل غزلوں میں ایک درجن غزلیں ایسی ہیں جن کا تعلق اُن کے زمانہ مشق سے معلوم ہوتا ہے۔ متفرق اشعار میں بعض اشعار اسی زمانہ سے متعلق ہیں۔ اس دور میں اُن کے کلام کا رنگ ذیل کے اشعار سے واضح ہوتا ہے

دھوکا نہ کھائیو نگہِ التفات سے
حُسنِ ہزار حیلہ کی یہ ایک چال ہے

غیر تکلیف اب نہ فرمائیں
دوست کافی ہیں دشمنی کے لئے

مری نگاہ میں چبھتے ہیں ہجر کے کانٹے
جو گل، بہار میں تنہا دکھائی دیتا ہے

چاندنی آہ شبِ فرقت کی
ایک بیوہ کا کفن ہو جیسے

جام کے بعد کرتے ہیں توبہ
بعد توبہ کے جام پیتے ہیں

کیمیا ہے ہماری خاکستر
کشتۂ روزگار ہیں ہم لوگ

یوں دلِ زار دھڑک اُٹھا ہے
بات اس رات کی چھیڑی ہو جیسے

ان کی خاموشی جانِ سخن
ان کا تکلم جیسے راگ

اف وہ دل جس میں کوئی داغ نہیں
ہائے وہ گھر جہاں چراغ نہیں

چشم ساقی سے پی بھی لے ساحل
اس صبوحی میں پاک بادہ ہے

ان شعری تصویروں میں ساحل نے عموماً وہی رنگ بھرے ہیں۔ جن سے اُردو داں طبقوں کی نظریں واقف و شناسا ہیں۔ البتہ کہیں کہیں جہاں اُن کے خون دل کے چھینٹے پڑ گئے ہیں۔ وہاں یہ رنگ تیز اور تیکھے ہو گئے ہیں مگر ان میں ساحل کی انفرادیت کا احساس نہیں جاگتا کیوں کہ وہ فرسودہ پٹی پٹائی راہ ڈگر پر گامزن ہیں۔ ساحل کا اصلی رنگ وہ ہے جہاں کی جدیدیت بدوش غزلوں سے آشکار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جست میں زندانِ روایت کی دیوار پھاند کر وسیع و عریض میدان کی کھلی اور آزاد فضا میں آ گئے ہیں۔ جہاں وہ ہیں، اُن کی ذات ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی تنہائی یعنی مجبوری اور بے چارگی کا احساس ہے اور زندگی کے نہ سلجھنے والے مسائل ہیں جو مجموعی طور پر اس دَور کے فرد کا حصّہ اور المیّہ ہے۔ اب وہ کچھ اس طرح کے اشعار کہتے ہیں۔

مرے وجود پہ چھایا تھا آئینہ بن کر
اک ایسا آئینہ جس میں ترا سراپا تھا

دل میں تمھاری یاد کی آہٹ اُتر گئی
تنہائی کانپتی ہوئی مجھ میں اُتر گئی

اب تو خواہش ہے گیند کی مانند
وہ خلا میں اُچھالتا مجھ کو

ہوٹل، ساحل، سیر سپاٹے
آنکھیں سیکو آگے چل دو

گلی میں زخموں کے ڈھیر پا کر
سڑک کا پتھر دہل گیا ہے

پھر مرا سورج کہیں پر چھپ رہا
پھر مرے مشرق کو مغرب کھا گیا

آج کنواں بھی چیخ اُٹھا ہے
کس نے پتھر مارا تھا

کون جانے کب یہ سورج گر پڑے
بند کر لو گھر کی ساری کھڑکیاں

اک کالا زہریلا کیڑا پتھر پتھر رینگ رہا تھا
جھیل کنارے کھڑا پہاڑ روتے روتے ہوا نڈھال

بیٹھ گیا ہوں دور سے آ کر چاہو تو دیوار گرا دو

عریاں بدن پہ کھول کے زلفیں نشاط کی
کھینچا گیا گلوب پہ نقشہ جمال کا

جدیدیت کا رنگ و آہنگ ان اشعار سے چھلک رہا ہے یہاں استعمال کیے گئے بیشتر الفاظ زمانۂ داغ تک غزلیہ شاعری سے خارج سمجھے جاتے تھے اقبال اور سیماب کی غزلوں میں البتہ کچھ ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو اس سے پہلے غزل میں نہیں کھپائے گئے تھے۔ فراق نے جن ہندی الفاظ کو غزل میں داخل کیا اُن کی نوعیت بالکل الگ ہے اس قسم کے الفاظ وَلی دانشار کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ جدیدیت کا تقاضہ کچھ اور ہی ہے۔

ششِ جہت کی تمام نظمیں جدیدیت کے رنگ کی حامل ہیں۔ اُن میں البیلی شام کیمپ، اشاپ پر، سفر، واپسی اور دائرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ دائرہ میں نیلی گہری نسلوں کو اندھیرے میں اجالے کی امیں بتا کر ساحل کہہ اُٹھتے ہیں۔

یہی وہ زندگی کی چار سمتیں ہیں
جنھیں میں نے لکیروں میں دکھایا ہے

جنھیں ابجد میں لکھا ہے۔

"سفر" میں ساحل نے بے مردپا انسان کی خوش فہمی پر طنز یہ وار کیا ہے۔ "واپسی" میں انھوں نے اپنے مکردہ ماحول کی جو تصویر کھینچی ہے وہ حقائق کی نقاب کشائی کرنے میں کامیاب ہے۔ یہ خوبصورت نظم دہرائی جانے کے قابل ہے۔

دیواریں کالی تھیں
جس پہ مکڑی نے جالے تانے تھے
صوفہ، کرسی، پر دھول جمی تھی
دروازوں کے پردے
کھڑکی کے پردے
گرد میں اُلجھے ٹوٹ رہے تھے
اور اک روزن پر تنکوں کی گھڑی رکھی تھی
فرش جگہ جگہ سے اکھڑا تھا
میز پہ رکھی بوتل کھلی پڑی تھی
ایک پہ رکھے اخباروں کے بنڈل اور رسالے
دھول کی چادر اوڑھے تھے
سگریٹ کے خالی پیکٹ
گندے کپڑے
اک جا کونے میں سطریں کھینچ رہے تھے
اور دو گم سم سوچ رہا تھا
سوچ رہا تھا؟؟؟

یہ سوچ ہی جدیدیت کی چھاپ ہے۔ شعوری لحاظ سے انسان اتنا آگے بڑھ گیا ہے کہ اب وہ محض جذباتی محاکاتی اور منظریاتی شعر و ادب سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اس نے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ لیا ہے کہ اُسے اس کے گھناؤنے پن پر ہنسی آجانا ایک فطری عمل ہے۔ وہ دریا کو سکونِ سطح سے نہیں بلکہ تہہ در تہہ طوفان سے جانچتا ہے۔ ساحل کا فن بھی اسی ابدی محور کے گرد گھومتا ہے۔

جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے کہ جدیدیت فرد اور اس کی آزادی کا ادب ہے یہ ادب ابھی تجربے کے دور میں ہے اس لئے اس ادب میں فنی فرد گذاشتیں تلاش کے لئے بغیر ہی مل جاتی ہیں۔ ساحل بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہیں اور بہت ممکن ہے کہ یہ بھی برمنائے تجربہ ہو۔

بسلسلہ صفحہ ۱۳

پر وہ تڑپ اٹھتا تھا۔ اس نے ہمیشہ دُنیا کے سکون و اطمینان، راحت و آرام کی بات سوچی گو اُسے خود بھی سکون میسّر نہ ہو سکا۔ آج بھی مجاز کا یہ ارمان خون کے آنسو رُلاتا ہے ؎

اب یہ ارماں ہے بدل جائے جہاں کا دستور
ایک ایک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور
ایک ایک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور

اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

مجاز آج ہم میں نہیں ہے مگر اس کی ترغیب نے ہمیں جو جرأت بخشی اس کے کلام نے ہمیں جو حوصلہ عطا کیا، اُس کے پُرجوش نغموں نے ہمارے جذبات کو جس قدر اُبھارا، ہماری حِس کو جتنا تیز کیا۔ اُس کی حرّیت پسندی کی تحریک نے ہمیں آزادی، انقلاب و بغاوت کی شاہراہوں میں جس قدر آگے بڑھایا ہے، ہم کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ افسوس ساری دُنیا کو جستجو و جھنجھوڑ کر جگانے والا خود بہت جلدی ابدی نیند سو گیا —!!

کرامت علی کرامت، مدیر شاخسار

احتشام حسین کے خطوط
کرامت علی کرامت کے نام

میرے نام پروفیسر احتشام حسین کے خطوط قارئین کرام کی نذر کر رہا ہوں۔ یہ خطوط ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۲ء کے درمیان لکھے گئے تھے۔ ان میں سے بعض نجی ہیں اور بعض میں چند اہم ادبی مسائل سے متعلق اظہار خیال بھی کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ خطوط قارئین کرام کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء

محب محترم۔ سلام مسنون

"آپ[1] کے تحفے کے لئے ممنون ہوں۔ ظلمات سے چشمۂ حیواں نکالنا اسی کو کہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ نے ایک ایسے موضوع کی طرف متوجہ کیا ہے جس سے عام بے خبری تھی۔ خود مجھے اعتراف ہے کہ اس تذکرہ میں میرے لئے بہت سی نئی معلومات ہیں۔ امجد نجمی صاحب کا مجموعہ دیکھا تھا۔ پھر ابھی حال میں ایک مختصر سا رسالہ "ہمالہ جاگ اٹھا"[2] میں کچھ شعراء سے شناسائی ہوئی تھی۔ آپ کی مختلف نظمیں ذہن میں تھیں۔ مظہر امام سے واقف تھا۔ ورنہ بالکل ناواقف تھا۔ خاص کر آپ نے انیسویں صدی کے بعض شعراء کا ذکر کیا ہے وہ میرے لئے بالکل نیا ہے آپ نے مقدمہ میں جس شگفتہ انداز میں اڑیسہ کی اردو شاعری کا ذکر کیا ہے وہ خود اپنی جگہ ایک اہم کام ہے مبارکباد قبول فرمائیے موقع ملا تو اس کتاب پر ریڈیو سے تبصرہ کر دوں گا۔ یا پھر کسی رسالہ کے لئے چند سطریں لکھوں گا۔

(احتشام حسین)

۱۶ جولائی ۱۹۶۵ء

محترمی۔ تسلیم

ادھر ادھر رہا اس لئے منی آرڈر[1] کے پہنچنے کی اطلاع بھیجنے میں تاخیر ہو گئی۔ آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ ریاض ان

---

[1] آپ کا تحفہ: شعرائے اڑیسہ کا تذکرہ جسے میں نے ۱۹۶۳ء میں مرتب کیا تھا۔

[2] دراصل احتشام صاحب کا اشارہ ایک مختصر سے رسالے "صدائے ہمالہ" کی طرف ہے۔ جو چینی حملے کے خلاف شعرائے اڑیسہ کی نظموں پر مشتمل تھا۔ انہیں ذہن میں "صدائے ہمالہ" کے بجائے "ہمالہ جاگ اٹھا" محفوظ رہ گیا تھا۔

[1] ۱۹۶۵ء میں الٰہ آباد میں پہلی بار احتشام حسین صاحب سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ سفر کے دوران میرے پیسے گم ہو گئے ہیں انھوں نے اپنے طور پر پچاس روپیہ زبردستی دیئے۔ دہلی لوٹ کر میں نے روپیہ منی آرڈر کر دیئے تھے یہ خط اسکی

...آپ کا کام اعلیٰ پایہ کا ہوگا ہی لیکن مجھے تو آپ میں
...صلاحیتیں غیر معمولی نظر آئیں ان کی طرف سے غافل نہ
...ملاقات مختصر ہی تھی لیکن ایک دوسرے کو پہچانتے تھے
...انی تھی۔ بیگم صاحبہ سے تسلیم و دعا کہیے گا۔ ابھی وھیلر سے
...کا موقع نہیں ملا۔ ذرا حالات معمول پر آ جائیں اور داخلہ
...کی الجھنیں ختم ہوں تو ملوں۔ "شاخسار" کے لئے ضرور کچھ
...ں گا۔ خیر طلب احتشام حسین

... ستمبر ۱۹۶۵ء مکرمی۔ تسلیم

خط ملا۔ "نگار" نے جدید شاعری نمبر بہت اچھا نکالا
...اس کے ساتھ ستر فیصدی مضامین پرانے ہیں میرا مضمون
...ی تقریباً آٹھ نو سال پہلے کا ہے نگار کے "اصنافِ سخن نمبر"
...ں چھپا تھا آپ کا مضمون[2] پھر پڑھا۔ بے حد پسند آیا "شاخسار"
...کا دوسرا نمبر مجھے نہیں ملا۔ افسوس ہے کہ ڈاک سے غائب ہوا
...ھیلر والوں پر رسالوں کی ایسی یورش ہے اور ان کے شرائط سخت
...یسے ہیں کہ معلوم نہیں "شاخسار" اس سے کوئی فائدہ حاصل
...ر سکے گا یا نہیں۔ اسی لئے میں نے ابھی تک وہاں گفتگو نہیں
...ں۔ بہرحال اب پوچھوں گا۔ "شاخسار" کے لئے کچھ ضرور
...ھوں گا۔ اور لوگوں سے لکھواؤں گا۔ بیگم صاحبہ کی خدمت
...ں تسلیم۔ بچی[3] کو پیار۔ امید ہے کہ آپ اب بالکل اچھے ہوں گے

بیوی تسلیم لکھاتی ہیں۔ آپ کا
احتشام حسین

۲۳ مارچ ۱۹۶۷ء محبّ مکرم۔ تسلیم

۱۷ فروری کو رکشے سے جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک
جیپ آ کر ٹکرا گئی۔ بچ گیا۔ کوئی ہڈی بھی نہیں ٹوٹی۔ لیکن
بائیں پیر کے گھٹنے میں سخت تکلیف ہو گئی۔ اندر کے اعصاب
اور رگیں مجروح ہو گئیں۔ اب تک تھوڑی بہت تکلیف ہے
بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کلکتہ پہونچ گئے مجھے شرمندگی
ہے کہ شاخسار کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ ایک مختصر مضمون بہت
جلد بھیجوں گا۔ مجھے تحریک[1] دیکھنے کو نہیں ملتا۔ فاروقی سے
لے کر دیکھوں گا۔ اپنی بیگم صاحبہ کو دعا کہیے گا۔
آپ کا احتشام حسین۔

محبّ[2] محترم۔ تسلیم

مجھے شرمندگی ہے کہ خط کے جواب میں دیر ہوئی۔
اس کا سبب بھی شرمندگی ہی ہے واقعی آپ کے خطوط آئے۔
شاخسار ملتا رہا۔ لیکن توفیق نہ ہوئی کہ چند سطریں لکھ بھیجوں
مضمون نہ سہی رسید ہی سہی۔ میں تو ان لوگوں سے بھی ناخوش
نہیں جو مجھے گالیاں دیتے ہیں اور آپ تو ہمیشہ محبت و احترام
سے یاد کرتے ہیں آپ سے کیوں ناراض ہوں گا؟ "شاخسار"
میں آپ کے انتخابِ قلم دیکھ کر طبیعت خوش ہوتی ہے۔
سائنسی مزاج کے ساتھ ادبی ذوق کی آمیزش نادر چیز ہے۔

... "شاخسار" کلکتہ کی ایجنسی قبول کرنے میں وھیلر والوں سے گفتگو
...نے کے بارے میں لکھ رہے ہیں۔

... میرا مضمون "جدید شاعری اور اس کا پس منظر" جسے میں نے الٰہ آباد میں
...تشام صاحب کو سنایا تھا "نگار پاکستان" کے "جدید شاعری نمبر" میں شائع
...ا۔ اسی خاص نمبر کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

... میری بڑی لڑکی صنوبر سلطانہ۔

[1] اس زمانہ میں "تحریک" میں شمس الرحمان فاروقی صاحب [illegible] ادبی بحث چل رہی تھی [illegible] ام صاحب کی توجہ ان مباحث کی جانب مبذول کرائی
تھی۔ اس کے جواب میں انھوں نے یہ خط لکھا۔

[2] اس خط کی تاریخ تحریر کا پتہ نہ لگ سکا بہرحال یہ خط [illegible] کا ہے۔

وہ آپ کے یہاں موجود ہے نئی شاعری کے مسائل کے مطابق آپ کا نقطۂ نظر افراط و تفریط سے محفوظ رہتا ہے جہاں اختلاف کی گنجائش بھی ہوتی ہے وہاں محض جذباتیت سے نہیں ہوتی یہ بڑی بات ہے کہ نئی شاعری سے متعلق لوگوں نے ایسی انوکھی اور دلچسپ باتیں کہیں ہیں کہ ان کا جواب خاموشی ہے اس لئے نہیں کہ ان سے اختلاف ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یا تو وہ باتیں پیش پیش یا افتادہ ہیں۔ اور کہنے والے کو نئی نظر آ رہی ہیں یا اس لئے کہ ان کا انداز خالص غیر ملکی ہے۔ گو آہستہ آہستہ بادل چھٹ رہے ہیں اور اعتدال ہو رہا ہے، لیکن طرح طرح کے وجوہ سے اختلاف کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے بحث اگر صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے کی جائے تو مفید ہے۔ لیکن جہاں یہ خیال ہو کہ ادبی مسائل کے نتیجہ خیز ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے وہاں اس کی حیثیت چھیڑ چھاڑ کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی۔ ہر شخص دوسروں کو چند گالیاں دیکر اپنے کو غیر جانبدار اور خالص آزاد نقطۂ نظر رکھنے والا ظاہر کر کے مضمون شروع کرتا ہے اور ہر طرح کے ادعار کے باوجود وعظ و پند، فتوے اور اعلان پر اتر آتا ہے بہرحال مجھے یقین ہے کہ آخر کار فتح وقت اور تعلق کی ہوگی۔

احتشام حسین

محب محترم:۔ تسلیم۔

خط ملا تھا۔ حرمت الاکرام اور جمیل مظہری صاحب کے خطوط بھی ملے تھے۔ تعمیل حکم کردی[1]۔ استحقاق غلط نہیں ہے

[1] یہ ایک نہایت تفصیلی مسئلہ ہے جس کا انکشاف کرنا اس وقت میں مناسب نہیں سمجھتا۔ کرامت

سعید عارفی نے آپ کے مجموعہ[1] کی کتابت کا ذکر کیا تھا۔ پھر امتحان میں مصروف ہو گئے۔ اب کہیں چلے گئے ہیں۔ آئیں تو اندازہ ہو کہ طباعت کس منزل میں ہے ایسے مکروہات میں گرفتار ہوں کہ بہت کم کام ہوتا ہے۔ شاہکار میں شاخسارے چیزوں کا انتخاب ہوگا۔ بیگم کرامت سے دعا کہیئے گا۔ بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے یہاں بچی[2] پیدا ہوئی۔ مبارک ہو۔ بیوی بھی خوش ہیں اور مبارکباد دیتی ہیں۔ خدا کرے بہت سی خوشیاں نصیب ہوں۔

اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔ آپ کا

سید احتشام حسین

11-11-71

محب مکرم:۔ تسلیم

خدا کا شکر ہے کہ اس طوفان[3] سے آپ حضرات محفوظ رہے۔ بڑی تکلیف وہ خبریں دیکھیں اور پڑھیں سعید عارفی سے آج ہی آپ کا پیام پہونچا دیا ہے انھوں نے چند دن پہلے سرورق[4] دکھایا تھا۔ آرٹسٹ نے بہت خوا... اور معنی خیز خطوط اور رنگ دیئے ہیں۔ مجھے بہت پسند آیا غالباً ساری کتاب تکمیل کی منزل میں ہے۔ "کتاب" میں آ... خط دیکھا تھا۔ خوشی ہے کہ آپ میرے مضامین میں وزن... مجھے "سطور" نہیں ملا۔ حاصل کر کے پڑھوں گا۔ میں تو آ...

[1] میرا شاعری مجموعہ "شعاعوں کی صلیب"
[2] میری دوسری لڑکی "دُرِ شہوار"
[3] ۱۹۷۱ء کے طوفان کی طرف اشارہ ہے جس میں اڑیسہ کے تقریباً دس ہزار افراد ہلاک ہو گئے تھے۔
[4] "شعاعوں کی صلیب" کے سرورق کے ڈیزائن کے بارے میں ...

شک کرتا ہوں کہ آپ اتنا ادبی کام کے لئے وقت نکال لیتے ہیں
بیگم کرامت بھی کو سلام و دعا کہیے گا۔ میری صحت بھی کچھ بہت اچھی
نہیں رہتی۔ اس وقت تو یہ مختصر خط لکھ رہا ہوں۔ آپ کے
ٹوم کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرکے پھر لکھوں گا۔

آپ کا احتشام حسین

2-3-7.

محترمی کرامت صاحب۔ تسلیم

۲۱ فروری کا خط ملا۔ محرم اور ہولی کی چھٹی ہو گئی اور
سعید عارفی سے ملاقات نہیں ہوئی اس لئے جواب نہ لکھ سکا
شام کو وہ اتفاقاً آگئے۔ تو میں نے انھیں متوجہ کیا اور
برکرتا رہوں گا۔ آج ہی کل میں کسی وقت اسرار کریمی پریس
والوں سے بھی مل لوں گا۔

اُردو اکاڈمی کے کاموں کی تفصیل ابھی کوئی سامنے
نہیں آئی۔ کتابوں کے سلسلے میں کس طرح مدد کریں گے مصنفین
کی اعانت کریں گے یا شائع کرنے والوں کی، ابھی کچھ معلوم
نہیں۔ یہ بھی اندازہ نہیں کہ اُتر پردیش کے باہر کے مصنفین کی
بھی مدد کرنا طے ہوگا۔ یا نہیں۔ صرف ایک میٹنگ ہوئی تھی اگرچہ
کئی گھنٹہ رہی، لیکن کاموں کی نوعیت متعین نہ ہو سکی۔ سب سے
پہلے پرائمری تعلیم کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ یہ بھی دیکھنا
ہے کہ حکومت کس حد تک اکیڈمی کو آزاد چھوڑتی ہے۔ حرمت
الاکرام تو یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ ان کا مجموعہ شائع ہو۔ باتیں
روانشح ہوں گی تو مطلع کر دوں گا۔

آپ تو بہت ہی خیال انگیز مضامین لکھ رہے ہیں۔ غالباً لکھ
چکا ہوں کہ سطور والا مضمون[1] مجھے بے حد پسند آیا۔ آپ نے یہ بالکل
صحیح لکھا ہے کہ نئی شاعری نے جو اپنی دُنیا محدود کر لی ہے۔
وہ نہ تو شاعری کے لئے مُفید ہے اور نہ شعرا کے اس دعوے
کی ترجمان کہ وہ اپنے عصر کی حقیقتوں کے ترجمان ہیں ایک بات
البتہ یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح بہت سے شاعر محض موضوع
کو سامنے رکھ کر موت اور تنہائی اور شہری صنعتی زندگی کی
اُلجھنوں پر نظمیں لکھ رہے ہیں اگر اُسی طرح بغیر سچے احساس
کے زندگی کے اور مسائل پر لکھیں گے تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔"
بہر حال یہ اچھا ہے کہ آپ نے بعض مثبت حقائق کی طرف
متوجہ کیا ہے میں بھی بارہا اس خیال کو پیش کر چکا ہوں۔
شاعر میں آپ کا مضمون دیکھوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ اچھے
ہوں گے۔

احقر
احتشام حسین

30.3.72

عزیز من۔ تسلیم

۲۵ مارچ کا خط ملا۔ ابھی ابھی سعید عارفی سے
گفتگو ہوئی۔ اب پریس بس چھاپنے ہی جا رہا ہے۔ میں بھی مل
کر دباؤ ڈالوں گا۔ واقعی بہت دیر ہو گئی۔ غالباً کاغذ کا
دام بڑھ جانے کی وجہ سے کچھ اور روپیوں کی ضرورت ہوگی
اس کے متعلق تفصیل سے سعید عارفی لکھیں گے۔ خوشی ہے
کہ "شاخسار" کے لکھنؤ میں چھپنے کا انتظام ہو رہا ہے اور
اُمید ہے کہ وقت پر نکلا کرے گا، اُڑیسہ میں بیٹھ کر آپ
اُردو کی ایسی خدمت کر رہے ہیں۔ مبارک باد ہو۔ بیگم کرامت
کو تسلیم۔ اُمید ہے کہ آپ اچھے ہوں گے۔

احقر
احتشام حسین

---

[1] میرا مضمون "جدید شعری رویہ — ساتویں دہائی میں" (مطبوعہ سطور دہلی)

قیوم صادق ہاسن

دکنی ادب کے محققین

اُردو (دکنی) کا پہلا شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ گذرا ہے جس کو منظرِ عام پر لانے میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام اہمیت رکھتا ہے دکنی ادب کے محققین زیادہ نہیں تھا۔ اُن میں سے خاص ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر سید محمد اکبرالدین صدیقی، رفیعہ سلطانہ، حفیظ قتیل وغیرہ۔

ان محققین نے جو کام کیا ہے واقعی اُردو دُنیا کے لئے کارآمد ثابت ہوا لیکن ابھی حال ہی میں (اگست ۱۹۷۳ء) کو ایک کتاب شائع ہوئی ہے دکنی شاعر "سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے" حسینی شاہد، مصنف ہیں جو ۶۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

مطالعہ کرنے کے بعد حاصل کچھ نہیں ہوتا نہ حضرت امین کی تاریخ ولادت نہ وفات کے بارے میں اور نہ اُن کے بزرگوں کے حالات پر اطمینان بخش تبصرہ۔

سید شاہ مرتضیٰ قادری سجادہ نشین گنجی محل سے میری ملاقات ہے وہ اپنی غیر مطبوعہ کتاب "تذکرہ اولیاء" جو تین سال قبل لکھ رہے تھے دکھائی اور کہا تھا کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں مکمل نہیں ہے اور نہ اطمینان بخش"۔ حسینی شاہد نے اُسی مواد کو اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے صفحہ ۱ پر آپ لکھتے ہیں کہ "مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں یوں تو میری کشکول میں بیسیوں صاحبانِ کرم نے کچھ ڈالا ہے لیکن ان میں سید شاہ امام جعفر حسینی سجادہ نشین درگاہ حضرت امین الدین علی اعلیٰ بیجاپور سید شاہ مرتضیٰ قادری سجادہ نشین گنجی محل اور مولوی علیم الدین صاحب تاجر کتب حیدرآباد کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ضروری ہے۔

کشکول کا مواد جو ۶۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ معجونِ مرکب بن کر رہ گیا ہے۔ اپنی اہمیت دکھلاتے ہوئے صاحبِ موصوف نے کسی کو بھی نہیں بخشا۔ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، محمد اکبرالدین صدیقی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اُن ہی حضرات کی کتابوں سے استفادہ کرکے خامیاں کثرت سے نکالی ہیں۔ لیکن خود نے بھی جو پیش کیا ہے۔ اُس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اگر صحیح نہیں ہے تو قرینِ قیاس ضرور ہیں"۔

اس قسم کی تحقیق سے کیا حاصل؟ ڈگری حاصل ہوجاتی ہے اور کیا چاہیے لیکن دکنی ادب کے بارے میں ہم کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔ خاص طور پر شمالی ہند میں ایسے حضرات اپنی دھاک بٹھائے ہیں کہ دکنی ادب کے اہم محقق ہیں اور جو فائدہ حاصل کرنا ہے کر لیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو تحقیق کا نمونہ:۔

ایک صاحب جو بیشتر کے نزدیک دکنی ادب کے محقق اور ادیب ہیں جن کی وہ دوسری معرکۃ الآرا تصنیف میراں جی شمس العشاق چھپی ہے اس سے قبل ایک کتابچہ مغز مرغوب چہار شہادت چھپی تھی۔ وہ بھی مشتبہ ٹھہری۔

ڈاکٹر حسینی شاہد کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"مرتب مغز مرغوب کی قرأت کے مطابق اگر اس سنہ کو ۹۰۴ سمجھا جائے تو میراجی کا سنہ پیدائش ۹۰۴-۳۵ = ۸۶۹ اور سنہ وفات ۸۶۹ + ۹۴ = ۹۶۳ھ قرار پائے گا۔ ۹۶۳ھ میں ۲۵ شوال کو سہ شنبہ کا دن تھا اس لئے یہ سنین بھی درست نہیں ہوسکے میراجی تصانیف اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ملتی ہیں۔ ان کی اُردو تصانیف میں خوش نامہ، خوش نغز اور شہادت الحقیقت قابل ذکر ہیں۔ گلباس اور جلترنگ ناپید ہیں اور مغز مرغوب اور چہار شہادت کا انتساب مشتبہ ہے۔ (ص۱۰)۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ حضرت (امین) کے وصال کی صحیح تاریخ ۲۳ جمادی الاول ۱۰۸۵ھ۔

"حضرت خواجہ نواز کا کلام جو حسب ذیل ہے۔ اکبر الدین صدیقی نے اس گیت کو جانم کے کلام میں شامل کیا ہے (ارشاد نامہ ص۹۹) جو درست نہیں ہے۔

"کتب خانہ درگاہ امین الدین علی اعلیٰ بیجاپور میں فارسی اور دکنی رسائل کا ایک مجموعہ ہے اس مجموعہ کا آٹھواں رسالہ وجودیہ حضرت امین کا ایک ناقص الاول اور ناقص الاوسط نسخہ ہے جس کو ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے "تمثیل نامہ" کے نام سے حضرت بندہ نواز کی تصانیف میں شامل کیا ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس رسالہ کو کس بنیاد پر "تمثیل نامہ" کا نام دیا ہے۔ جب کہ رسالہ ناقص الاول ہے اور کوئی ترقیمہ بھی نہیں ہے۔

"عشق نامہ" یہ رسالہ راقم الحروف کو دستیاب نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اُردو نثر کا آغاز اور ارتقا میں اس کا ذکر کیا ہے۔ جو نمونہ دیا ہے وہ بھی غلط قرأت کی وجہ سے ناقابل فہم ہوگیا ہے۔ (ص۱۴۱)

پروفیسر سروری' فہرست مخطوطات ادارہ جامعہ عثمانیہ رسالہ رموز السالکین پروفیسر سروری نے قیاس آرائی کی ہے کہ غالباً شمس العشاق کے ارشادات کو آمین نے لکھا ہے (ص۳۰۴)

مولوی عبدالحق نے حضرت امین کی تصانیف میں گفتار شاہ امین" کا بھی ذکر کیا ہے لیکن نہ تو اس کے موضوع کے بارے میں کچھ کہا ہے اور نہ نمونہ ہی دیا ہے (ص۳۴۸)

"رسالہ نثر شاہ امین الدین علی اعلیٰ" کو ڈاکٹر زور نے متعارف کرایا ہے ڈاکٹر زور نے محض قیاس سے کام لیکر اس ناقص رسالہ کو حضرت امین سے منسوب کر دیا ہے۔ کسی داخلی اور خارجی شہادت کی عدم موجودگی کی وجہ سے انتساب سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔"

محمد انصاراللہ نظر

پوربی اردو — آغاز و ارتقا

(گذشتہ سے پیوستہ)

سید کلب مصطفٰے صاحب نے ملک محمد جائسی کے کلام کا جائزہ لینے کے بعد اودھی (پوربی) کی خصوصیات اس طور پر بیان کی ہیں۔

۱۔ خالص اودھی کی بول چال میں فعل فاعل کی ضمیر جنس اور تعداد سے مطابقت رکھتا ہے مفعول سے اس وقت بھی مطابق نہیں ہوتا جب فعل متعدی ہو۔ اودھی کا یہ اصول اردو قواعد کے بھی خلاف ہے اودھ کے رہنے والے اردو بولتے وقت عموماً یہی غلطی کرتے ہیں یعنی فعل متعدی استعمال کرتے وقت بھی فعل کی مطابقت مفعول سے نہیں کرتے مثلاً بعض اوقات وہ کہتے ہیں کہ میں نے روٹی کھایا حالانکہ ہونا چاہیے میں نے روٹی کھائی

۲۔ ای (تھ) اور او (سی) کی جگہ برج بھاشا اور کھڑی بولی میں ی (یہ) اور و (وہ) بولا جاتا ہے مثلاً اودھی میں اِہاں، اُہاں اور کھڑی اور برج بھاشا میں یہاں وہاں بولتے ہیں۔

۳۔ 'ہونا' فعل کی شکلوں کے مادے میں جو حرف (ا) پہلے رہتا ہے وہ اب تک اودھ کے کچھ حصوں میں ۔ جائس اور امیٹھی کے آس پاس ۔ بولا جاتا ہے مثلاً رہے کے بجائے اہے کہیں گے شاعر جائسی نے 'رہا' کہا ہے۔

۴۔ کھڑی بولی اور برج بھاشا دونوں میں جو صفات اور تملیکی ضمائر (آ) اور 'او' پر ختم ہوتے ہیں وہ اودھی میں بلا 'آ' یا 'او' کے ہوتے ہیں مثلاً

کھڑی بولی = ایسا ۔ اپنا ۔ تیرا ۔ ہمارا
برج بھاشا = ایسو ۔ اپنو ۔ تیرو ۔ ہمارو
اودھی = ایس، اَس ۔ اپن ۔ تور ۔ ہمار

(ملک محمد جائسی ص۱۸۱ تا ص۱۸۲)

اس موقع پر اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ راقم سطور کے نزدیک اودھی اور اردو مترادف الفاظ ہرگز نہیں ہیں بلکہ اس بحث کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ زبان اردو کے اولین نقوش دیار مشرق میں اُبھرے۔ ان ابتدائی نقوش میں مقامی بولی پوربی کے اثرات کا نمایاں ہونا قدرتی تھا لیکن رفتہ رفتہ عربی اور فارسی کی آمیزش کے ساتھ ساتھ زبان ارتقائی مدارج طے کر آگے بڑھ ر

سے اس سلسلہ میں راقم کا خیال ہے کہ "ہاں" محل و مقام کے معنی میں آتا ہے اس سے پہلے ای (یہ) او (وہ) کہ (کون) جے (جو) تے (اُس) وغیرہ کو ضم کر کے بالترتیب اِہاں (یہاں) اُہاں (وہاں) کہاں جہاں تہاں وغیرہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔

...تا بدلتا گیا۔ چنانچہ داؤد کے عہد سے کبیر کے زمانے
...بان میں کافی نکھار آ چکا تھا۔ کبیر کے بعد سے ترقی کی
...تیز تر ہو گئی چنانچہ گیارھویں صدی ہجری میں عام
...ہے کہ بکٹ کہانی لکھی گئی۔ جسے متفقہ طور پر اُردو کی تصنیف
...یا گیا ہے۔

دسویں صدی ہجری تک جو ادبی نقوش دریافت ہوئے
...ان میں سے بیشتر طویل عشقیہ نظمیں ہیں، جن میں بارہ ماسہ
...کو بعد میں ایک الگ صنف شاعری کی حیثیت حاصل
...کچھ متفرق اشعار دوہوں اور دوہروں کی صورت میں
...ہیں آئے، کبیر کے عہد تک ان میں ردیف کے علاوہ قافیہ کا
...بھی کیا جانے لگا تھا خیال کیا جاسکتا ہے کہ ہم ردیف
...یہ دوہوں کو یکجا کرنے کے سلسلے بالآخر غزل کو وجود
...دگا۔ یہ قیاس اس بنا پر ہے کہ بالکل ابتدائی دَور
...لیں اپنے موضوع کے اعتبار سے روایتی غزلوں سے
مختلف ہیں۔ چنانچہ تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہوگی دوہر
...ہاکر فارسی کے باکمالوں کے لئے تفنن کا ذریعہ بنے اور
...فن ایہام گوئی کے رواج کا باعث ہوا اس طرح کہنا
...کہ یہی ابتدائی ادبی نقوش شمالی ہند میں باقاعدہ
...شاعری کی اصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مغل بادشاہوں کی علمی سرپرستی اور قدرشناسی مسلّم
...ان کی دلچسپی کا مرکز بطور مجموعی فارسی تھی۔ یہی ان کے
عروج میں علمی اور سرکاری زبان رہی۔ البتہ مغلوں کے
...ن نے فارسی کے مقابلے میں مقامی زبانوں کی سرپرستی
...رکھی تھی۔ پروفیسر شیرانی نے لکھا ہے:

"سوریوں کو فارسی سے سخت دشمنی تھی"

(پنجاب میں اُردو مقدمہ ص)

...فیسر اختر اورینوی نے اسی بنا پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

"ان سوریوں کا بہار میں غلبہ تھا۔ شیر شاہ سوری
اور دوسرے پٹھان بہاری بولیوں کے استعمال
و ترقی میں کوشاں ہوں گے۔ اور اس کا لازمی
نتیجہ ریختہ کی ترویج میں ظاہر ہوا ہوگا۔"

(بہار میں اُردو زبان و ادب کا ارتقا ص۱۷)

اورینوی صاحب کے اس خیال کی تائید ایک حد تک پروفیسر
شیرانی کی اس تحریر سے ہوتی ہے کہ:

"ملک محمد جائسی نے شیر شاہ سوری کے نام پر پدماوت
لکھی"؛ (پنجاب میں اُردو ص۱۲۵)

جائسی سے کچھ ہی پہلے قطبن نے پوربی میں ایک طویل عشقیہ
کہانی "مرگاوتی" کے نام سے نظم کی تھی۔ پروفیسر شیرانی نے
ان کی بابت لکھا ہے:

"قطبن ہند سلسلے کا غالباً پہلا شاعر ہے جس نے
جائسی سے بھی ۳۰ سال قبل افسانہ نگاری کی بنیاد
ڈالی"؛ (پنجاب میں اردو ص۱۸۶)

لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ عشقیہ کہانی نظم کرنے کے معاملہ
میں قطبن کو اوّلیت حاصل نہیں، ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھیں
جو روایت ملی تھی اسے اُنھوں نے کامیابی کے ساتھ آگے
بڑھایا۔ مرگاوتی کا سال تصنیف ۹۰۹ھ ہے۔

قطبن کے قریب العہد باکمالوں میں شیخ منجھن کا نام
خصوصیت کے ساتھ اہم ہے جو مدھو مالتی کے مصنف ہیں۔
بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ایک موقع پر ضمناً ان کا
ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"گلشن عشق نصرتی کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔۔۔ تحقیق
سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس سے قبل ہی تحریر
میں آ چکا تھا۔ ایک صاحب شیخ نامی نے اسے ہندی
میں لکھا تھا۔۔۔ اس کا حوالہ ایک دوسری کتاب

مسمٰی قصۂ کنور منوہر و مدمالت' میں ملتا ہے یہ فارسی
مثنوی ہے۔۔۔ سنہ تصنیف ۱۰۵۹ ہجری ہے اسمیں
مصنف نے شیخ منجھن کی ہندی کتاب کا ذکر کیا ہے
اور اپنے قصہ کی بنیاد پر رکھی ہے۔ تیسری کتاب
عاقل خاں رازی عالمگیری کی مثنوی مہر و ماہ ہے جو
۱۰۶۵ھ کی تصنیف ہے" (ملا نصرتی ص۱۹ تا ص۲۰)

چنداین اور مینا ست کی طرح مدھو مالتی بھی پوربی کی ان اہم ترین تصانیف میں سے ہے جنھیں ملک گیر شہرت حاصل ہوئی چنانچہ اس قصہ کا بھی دکنی میں نظم کیا جانا ایسی تاریخی حقیقت ہے جسے زبان اُردو کے ارتقا کی بحثوں میں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے۔ راقم سطور کے نزدیک دکنی اُردو پر زبان دہلوی کے پہونچنے سے پہلے پوربی اپنے اثرات مرتب کر رہی تھی۔ چنانچہ دکنی اور پوربی میں اکثر یک گونہ مماثلت کا احساس ہوتا ہے دونوں میں مقامی آب و رنگ زیادہ ہے اور دونوں کی ادبی روایات بنیادی طور پر ہندوستانی ہیں۔

اکبر کے عہد میں یہ زبان ترقی کر کے دہلی کے علمی حلقوں تک پہنچ چکی تھی چنانچہ لالہ سری رام نے "ملا عبدالمومنین دو پیازہ سے بھی اُردو کے کچھ شعر منسوب کئے ہیں۔ اگرچہ ان شعروں کو ملا صاحب کا کلام تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ پھر بھی یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ بعض مقامات پر پوربی کا اثر بہت نمایاں ہے مثلاً ؎

نہ دو پیازے کی دلداری کرت ہے
مگر صد گونہ ہا خواری کرت ہے
دو پیازہ اب نکس ہنڈیا میں آ کے
ماکھی کے ہاتھ پھنس گئے جالے میں جا کے

اکبر ہی کے زمانہ کے ایک شاعر شیری تخلص کرتے تھے (ایک مدت تک اُردو کے مورخین اُن کا ذکر سعدی کاکوروی کے نام سے کرتے رہے ہیں) پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے اُن کا تعارف کرایا ہے:

"ریختہ کی ایک غزل جو عام طور پر سعدی کے نام سے تذکروں میں ملتی ہے مجھے انجمن ترقی اُردو دہلی کے کتب خانے کے ایک قلمی نسخے (مکتوبہ ۱۰۲۰ھ) میں ملا شیری کے نام پر لکھی نظر آئی۔ ملا شیری پنجاب کے کسی قصبہ یا موضع ککوال کے شیخ زادوں میں سے تھے۔۔۔ اکبر بادشاہ نے۔۔۔ اپنے دربار میں اچھے منصب پر رکھ لیا۔۔۔ سوات کے یوسف زئی افغانوں کی جنگ میں ۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء میں مارا گیا"
(علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد ا ص۸۸م)

غزل مذکور کے چند شعر یہ ہیں ؎

جانا تمھاری' جیو کوں میرے بہت پرتیت ہے
جاں می دہم با خود بیر تن و من جو جیو سمیت ہے
جیو سے کے تمہ (یہ) دکھ دیا تیرا ہموں کہہ کیا
تمہ وہ کیا ہم یہ کیا کیسی بھلی پرتیت ہے

"تم" کی جگہ "تمہ" اگر محض قدیم طرز کتابت کے سبب نہیں تو اسے بھی پوربی کا اثر سمجھنا چاہیئے۔ جہاں اکثر "تمہ" تلفظ کرتے ہیں' اسی طرح "ہموں" (= ہم + ہوں) بمعنی "ہم" کا معاملہ ہے۔

دو میں کی گھبر کر دو روے روے ز خون دل بھرو
پیش سگ کو بیت دھر دھوکا نہ جائے میرہ ہے

۱۔ سید مبارز الدین رفعت نے علی عادل شاہ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی زبان پر اودھی کے "اثرات نمایاں ہیں"۔۔۔ (مقدمہ کلیات شاہی ص۶۹) اس نظر سے اگر دکنی ادبیات کا مطالعہ کیا جائے تو موجودہ مسلمات میں حیرت انگیز حد تک تبدیلیاں واقع ہونگی۔

رو" کی جگہ "روے روے" اور فارسی پر قدرت کے
ف جبر کو "کھبر" نظم کرنا بھی خصوصًا قابل لحاظ ہے۔
اگر یہ غزل سعدی کاکوروی کی نہیں ملا شیری کی ہے
ں میں "پوربی" کے یہ اثرات اس حقیقت کا ثبوت ہیں
ربی کا دائرہ اثر دسویں صدی کے آخر تک بہت
ع ہو چکا تھا۔

رھویں صدی

گیارھویں صدی ہجری میں "ریختہ گوئی" کو خاصا فروغ ہوا، یہ اس
کا ثبوت ہے کہ اُردو ادب فارسی کے باکمالوں کی دلچسپی کا
سبب بننے لگی تھے، اس موقعہ پر لفظ "ریختہ" کے اصطلاحی
ں کے ارتقاء سے متعلق پروفیسر شیرانی نے جو تفصیلی بحث
ہے اس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے:

"ریختن فارسی زبان میں متعدد معنی میں آتا ہے،
اور معنی سے قطع نظر وہ (۱) بنانے، ایجاد کرنے۔
(۲) کسی چیز کو قالب میں ڈھالنے، نئی چیز بنالے
اور (۳) موزوں کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔
ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی
اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے۔۔ ترکیب دے
دیئے جاتے تھے۔۔۔ (دور اکبری کے شیخ سعدی کے)
عہد تک ریختہ کے معنی گیت کے لئے جاتے تھے۔۔۔
کچھ عرصہ بعد ریختہ نے موسیقی سے نکل کر عمومیت حاصل
کرلی۔"
(پنجاب میں اُردو ص۴۵ تا ص۴۸)

نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:

"ریختہ گوئی کہ زبان ہندی با پارسی می آمیزد"
(سفینہ خوشگو ص۱۹)

جملے سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ خوشگو کے نزدیک ہندی
رسی کو مستقل زبانوں کی حیثیت حاصل تھی اور ریختہ ان

دونوں کے مرکب کو کہتے تھے چنانچہ ریختہ میں فارسی کے الفاظ
ترکیبیں، فقرے بھی شامل ہوتے تھے "ہندی" میں یہ سب
اس طور پر نہیں ہوتے تھے۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ
قرآن پاک میں ریختہ اور ہندی کے فرق کی بایں الفاظ کی
نشاندہی کی ہے:

"اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ضروری نہیں
کیوں کہ ہندی ترکیب عربی سے بہت بعید ہے اگر
بعینہ وہی ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں دوسرے
یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی جاتی بلکہ ہندی،
تاکہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"
(بحوالہ پنجاب میں اردو ص۴۷)

یعنی (۱) ہندی ترکیب ریختہ کی ترکیب سے مختلف ہوتی
ہے، ہندی عربی سے "بہت بعید" اور ریختہ اس سے قریب
ہوتی ہے (۲) ریختہ عام فہم نہیں ہوتی، ہندی، عوام الناس
کی زبان ہوتی ہے جسے بے تکلف سمجھا جا سکتا ہے اسطرح
یہ کہنا بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلام جو فارسی کے با
کمالوں کے لئے زیادہ قریب الفہم ہوگا ریختہ ہے نہ کہ
ہندی۔ فضل علی فضلی کے قول کے مطابق ہندی وہ زبان
ہے جسے "عورات و نسا" بھی بآسانی سمجھ سکتی ہیں (کربل کتھا)۔
دہلی عربی اور فارسی کے علماء اور فضلا کا مرجع و مرکز رہا ہے۔
ان میں کم و بیش سب کا لب و لہجہ اور تلفظ عربی اور فارسی
کے مطابق ہوگا۔ بھ، پھ، تھ وغیرہ مخلوط آوازوں کے علاوہ
ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ ٹھیٹھ ہندی آوازوں کے ادا کرنے پر ان
میں سے بیشتر قادر نہ ہوں گے۔ انھوں نے اگر مقامی الفاظ
سیکھ لئے ہوں گے۔ تو بھی اُن کا تلفظ مختلف ہوگا۔ چنانچہ
بابر سے منسوب شعر میں ردتی کو "ردتی" (موتی کے ساتھ)
قافیہ کیا ہے۔ امیر خسرو سے منسوب کلام میں بھی یہ صورت

ملتی ہے چنانچہ مشہور مصرعہ ہے کہ

"ہے گنہ ہم سات عجب رو رتہ ہے"
سا تھ رو تھا

ان سے منسوب کلام کا وہ متن جس میں مقامی آوازیں واضح ہیں تاریخی اور لسانی نقطۂ نظر سے غیر صحیح ہے مثلاً ان کے عہد میں متن کی یہ صورت ممکن ہی نہ تھی کہ

پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اسی قدیم زمانہ میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ لکھا جاسکتا تھا یہ ہے کہ

پر کچ نہ گرا نہ کچ سنوارا

دہلی کے ان باکمالوں کے یہاں عربی اور فارسی لب و لہجہ کی پختگی اور تلفظ کی صحت یقینی تھی۔ البتہ مقامی الفاظ کو معرب یا مفرس کرنے کے سوا ان کے پاس چارہ نہ تھا۔ چنانچہ یہ حضرات اگر مقامی زبان کے کچھ لفظوں کو اپنے اشعار میں جگہ دینا چاہتے تھے تو نتیجہ کے طور پر جو صورت وجود میں آسکتی۔ دہلی ہے جسے بعد میں "ریختہ" کہا گیا یعنی "ہندی یا پارسی آمیختہ"۔ خوشگو کے اس مختصر فقرے سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ریختہ میں ہندی کا جزو کم ہوتا تھا کیونکہ یہ کلام فی الاصل فارسی ہی ہوتا تھا اور یہی صورت فطری بھی تھی۔ دہلی اور دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں زبان اُردو کے جو اولین نقوش ملتے ہیں۔ بیشتر ریختہ ہی میں ہیں۔ اس کے برخلاف دیار مشرق کے علاقوں میں فارسی کا یہ غالب اثر نہیں تھا چنانچہ وہاں "ہندی" وجود میں آئی خسرو کے بعد خیری یا سعدی کا ریختہ ملتا ہے جس کے مقطع میں "ریختہ" کی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

(باقی آئندہ)

خسرو مست اندر ساغرِ معنی ریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

حضرت امیر خسروؒ کے "سات سو سالہ جشن" کے موقع پر ادارہ فروغ اُردو ھند نے طے کیا ہے کہ وہ امسال اس عظیم المرتبت شاعر "طوطیٔ ہند امیر خسرو" کا خاص نمبر قارئین فروغ اُردو کی خدمت میں پیش کرے۔ جو اُن کی شاعری، نثر نگاری، تصوف، علم موسیقی اور دیگر گوناگوں خصوصیات کا حامل ہو، اور اُس کی ترتیب کی خدمت

ڈاکٹر سید رغیب حسین صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

کے سپرد کی گئی ہے۔ جملہ ہندوستان اور بیرون ہند کے نمایندہ ادیبوں۔ شعراء اور فنکاروں سے درخواست ہے کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم شاعر کی خدمت میں اپنا اظہارِ عقیدت پیش کریں۔

شمس علوی

مطبوعات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی معہ قیمت) ۱

۱۔ اجنتا کا چین۔ تہواروں کے پھول۔ قمر لبوانی ۳/-
۲۔ احتشام حسین نمبر (فروغ اردو) سید انصار حسین ناہل ۲۵/-
۳۔ اردو کا ماضی۔ حال اور مستقبل محمد ابراہیم علوی ۳/-
۴۔ آئینہ نظم اردو قمر لبوانی ۳/-
۵۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی روپ نرائن سیتاپوری ساگر ۱/-
۶۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۵/-
۷۔ اردو مہم نمبر۔ فروغ اردو اقبال صدیقی ۳/۵۰
۸۔ الوار اللغات، اردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۵/-
۹۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۵/-
۱۰۔ آئینہ عقل پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری ۴/۵۰
۱۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۱۲۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۳/۵۰
۱۳۔ انارکلی امتیاز علی تاج جدید ایڈیشن ۲/۵۰
۱۴۔ امراؤ جان ادا مرزا رسوا ۵/۵۰
۱۵۔ اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ پروفیسر کلیم الدین احمد ۸/-
۱۶۔ اردو میں تنقید ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۱۷۔ انتخاب قصائد اردو مغیث الدین فریدی ۱/۵۰
۱۸۔ ادب اور نظریہ آل احمد سرور ۷/۵۰
۱۹۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور ۵/۵۰
۲۰۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین احمد ندوی ۷/۵۰
۲۱۔ انتخاب جدید نثر اردو سید احتشام حسین ۴/-
۲۲۔ اقبال مرتبہ فروغ اردو -/۵۰
۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ عبدالماجد دریابادی ۶/۵۰
۲۴۔ البرامکہ اور ان کا عروج و زوال ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے ۳/-
۲۵۔ انتخاب کلام غالب بشیر احمد علوی ۱/۵۰
۲۶۔ ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ۶/۵۰
۲۷۔ انتخاب قصائد و غزلیات فروغ اردو ۵/-
۲۸۔ اب کیا ہے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۳/-
۲۹۔ ادبی خطوط غالب مرزا محمد عسکری ۶/۵۰
۳۰۔ آئینہ نثر اردو سعادت علی صدیقی ۴/۵۰
۳۱۔ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۲/۵۰
۳۲۔ ابو الحجر مجنوں گورکھپوری -/۳۷
۳۳۔ اردو کی کہانی سید احتشام حسین ۲/۵۰
۳۴۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر ۵/۷۵
۳۵۔ ابو الکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد ۰/۷۵
۳۶۔ ارمغان نثر و نظم عبدالاحد خاں خلیل ۳/۷۵
۳۷۔ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اردو ۱/۵۰
۳۸۔ اچھی نظمیں اختر مشتاق -/۷۰
۳۹۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید ایڈیشن غلام احمد فرقت ۲۰/-
۴۰۔ اردو شاعری امیر احمد علوی ۱/۵۰
۴۱۔ غزلیات حافظ صائب غالب فارسی ۲/۵۰
۴۲۔ آخری یادگار نادر شاہ معہ ترجمہ ۱/۵۰
۴۳۔ اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب اعجاز احمد فاروقی ۱/۲۵
۴۴۔ اللہ کے پیارے امیر حسن نورانی -/۵۰
۴۵۔ اسپین کی شہزادی صادق سرد لکھنوی ۴/۵۰
۴۶۔ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اردو ۱/۵۰
۴۷۔ اپنی موج میں آوارہ ۲/۵۰
۴۸۔ انوار جدید خط و کتابت حلیق احمد علوی -/۲۵
۴۹۔ ایک جان تین قالب خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۵۰. اُلفت — خان محبوب طرزی — ۵/۵۰

۵۱. آغازِ سحر — " — ۴/-

۵۲. امین آباد — " — ۴/-

۵۳. انشائے خطوط نویسی حصہ اوّل — منیر احمد علوی — -/۳۵

۵۴. اچھی کہانیاں — " شمس الدین نوری — -/۵۰

۵۵. انشائے خطوط نویسی حصہ دوم — -/۷۵

۵۶. ایجادوں کی باتیں — مصطفےٰ حسن رضوی — ۳/-

۵۷. اچھی کہانیاں حصہ اول — شمس الدین نوری — -/۵۰

۵۸. " حصہ دوم " — -/۵۵

۵۹. " حصہ چہارم " — -/۶۵

۶۰. ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/۵۰

۶۱. اسلامی نظمیں — محمد حسین علوی کشش — ۲/-

۶۲. اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں — عبدالماجد دریابادی — ۳/-

۶۳. اوراقِ گل — اکبر شتاق — ۱/-

(ب)

۶۴. بابائے اردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی — ۶/-

۶۵. بستانِ حرم۔ (جدید نعتیہ کلام) — زائر حرم حمید صدیقی — ۳/-

۶۶. شہید محبت بوٹا سنگھ۔ — خان محبوب طرزی — ۴/-

۶۷. بزم بے تکلف۔ — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴/۵۰

۶۸. بکٹ کہانی۔ — ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۴/۵۰

۶۹. بہادر شاہ ظفر۔ — امیر احمد علوی کاکوروی — ۵/۵۰

۷۰. بہشتی ثمر۔ (حصہ اول دوم) خلاصہ بہشتی زیور — مولانا تھانوی — ۳/۸۰

۷۱. بانیٔ اسلام۔ — علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ — -/۷۵

۷۲. بشریت انبیاء — عبدالماجد دریابادی — ۳/-

(پ)

۷۳. پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۲/۵۰

۷۴. پیاری باتیں — محسن کاکوروی — -/۴۰

۷۵. پھولوں کا انبار (ناول) — منظر سلیم — ۴/۷۵

۷۶. پپیہہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/-

۷۷. پاگل خانہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۳/۲۵

۷۸. پیغام " — طاہر دیال پوری — ۳/-

۷۹. پنجاب میں اردو — حافظ محمود شیرانی — ۶/۵۰

۸۰. پردیسی کے خطوط حصہ اول — مجنوں گورکھپوری — ۴/۵۰

(ت)

۸۱. مختصر تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن) — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۱۲/-

۸۲. تصویر درد معہ تشریحات و ترجمہ — فرید احمد علوی — ۱/-

۸۳. تحریریں مجموعہ مضامین۔ — ڈاکٹر گیان چند — ۵/۵۰

۸۴. تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یاسین — ۳/-

۸۵. تنقیدی تجزیے — کاظم علی خاں — ۴/۵۰

۸۶. تعارف تاریخ اردو جدید ایڈیشن — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۵/-

۸۷. تاجدار مدینہ — اقبال صدیقی — -/۴۰

۸۸. تنقیدی اصول اور نظریے — حامد اللہ افسر — ۵/۵۰

۸۹. تنقید و تحلیل — شبیہ الحسن نونہروی — ۴/۵۰

۹۰. تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) — سید احتشام حسین — ۶/-

۹۱. تنقیدی نظریات جلد اول — " — ۸/-

۹۲. " " جلد دوم — " — ۸/-

۹۳. تنقید اور عملی تنقید — " — ۶/۵۰

۹۴. تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) — آل احمد سرور — ۵/-

۹۵. ترانہائے خیام — ڈاکٹر غیب حسین — ۲/۵۰

۹۶. تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص — محمد حسین کشش — ۲/۹۰

(ٹ)

۹۷. ٹیگور — نادم سیتاپوری — ۳/-
۹۸. ٹھیکرے کی مانگ — صدیقہ بیگم سیوہاری — ۲/-

(ث)

۹۹. ثنائے حبیب و نعتیہ کلام — بہزاد لکھنوی — ۲/۲۵

(ج)

۱۰۰. جان غالب — محمد حسین شمس علوی — ۲/-
۱۰۱ جائزے — انور سیوانی — ۳/-
۱۰۲. جواہرات اسمٰعیل — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰
۱۰۳. جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) — فروغ اردو — ۳/-
۱۰۴ " " نمبر ۲ " — ۳/-
۱۰۵. جوئے رواں۔ مجموعہ کلام۔ — حامد اللہ افسر — ۳/۵۰
۱۰۶. جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) — ڈاکٹر اختر بلگرامی — ۳/۵
۱۰۷. جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) — قیصر تمکین — ۲/۵۰
۱۰۸. جلوے — معین الدین دردائی — ۱/۷۵
۱۰۹. جمیلہ بوا تری (ناول) — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰
۱۱۰. جگر نمبر اول — سید احتشام حسین — ۸/-

(چ)

۱۱۱. چوتھی بہن۔ مجموعہ افسانہ۔ — مسیح الحسن رضوی — ۲/۷۵

(ح)

۱۱۲. حیات فضل الحق — خیرآبادی — ۱/۲۵
۱۱۳. حالی بحیثیت شاعر۔ (جدید ایڈیشن معہ اضافہ) — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱۵/-
۱۱۴. حسرت موہانی — عبدالشکور — ۵/۵۰
۱۱۵. حجاج بن یوسف — برجی زیدن — ۲/۵۰
۱۱۶. حکیم نباتات — وزیر حسان لنکراں — ۴/-
۱۱۷ حبیبۂ غالب — سعادت علی صدیقی — ۲/۵۰

(خ)

۱۱۸. خلاصہ شریف زادہ — مرزا رسوا — ۱/۲۵
۱۱۹. خطبات ماجدی یا سیرت نبوی — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰
۱۲۰. خضر راہ معہ ترجمہ — علامہ اقبال — ۱/-
۱۲۱. خلاصہ روح تنقید — ۱/-
۱۲۲. خلاصہ جواہر العروض — ۱/-
۱۲۳. خبطی (مزاحیہ) — محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی — ۱/۵۰
۱۲۴. خوش بختی کی تلاش — احسن الظفر بی۔ اے — ۳/-
۱۲۵. خلاصہ شعر الہند — حصہ دوم — ۱/-
۱۲۶. خلاصہ المیزان — -/۷۵

(د)

۱۲۷. دلچسپ کہانیاں — مسعود عالم — ۴/-
۱۲۸. دیوان فغانی — ۱/۵۰
۱۲۹. داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی) — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/۵۰
۱۳۰. دہلی کا یادگار مشاعرہ — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۵۰
۱۳۱. دستۂ گل — شبلی نعمانی — -/۴
۱۳۲. دوشیزہ قاف ناول — خان محبوب طرزی — ۵/-
۱۳۳. دلربا — ۳/-
۱۳۴. دلی کا دبستان شاعری معہ اضافہ جدید ایڈیشن — ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۱۵/-
۱۳۵. دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — ۳/۵۰

(ڈ)

۱۳۶. ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر انوار الحسن — ۴/-

(ذ)

۱۳۷. ذوق و جستجو۔ — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۱۵/-

۱۳۸۔ ذوق ادب و شعور۔ پروفیسر احمد حسین ۵/۵۰
۱۳۹۔ ذوق جنون۔ مجموعہ کلام ۔ آل احمد سرور ۶/۵۰

(ر)

۱۴۰۔ روائت اور بغاوت سید احتشام حسین ۷/-
۱۴۱۔ رُباعیات غالب فارسی معہ اُردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی ۴/-
۱۴۲۔ رہبر مضمون نویسی شفاعت علی صدیقی ۲/۵۰
۱۴۳۔ راگنی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/-
۱۴۴۔ رخسار سحر ناول انور کریم قدوائی ۱/۵۰
۱۴۵۔ رفتار سحر " ۳/۵۰
۱۴۶۔ رموز حکمت معہ مقدمہ اُردو محمد شریف ۳/۵۰
۱۴۷۔ ریاض فارسی منتخب کلام فارسی ۳/-

(ز)

۱۴۸۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ) مولانا تھانوی -/۵۰
۱۴۹۔ زنبیلوں کا بادشاہ، حکیم بانا مزاحیہ ناول سید علی عباس حسینی ۳/-

(س)

۱۵۰۔ سلور کنگ آغا حشر کاشمیری ۵/-
۱۵۱۔ سوانح اور خاکے نجم الدین نقوی ۴/-
۱۵۲۔ سرور جہان آبادی ڈاکٹر حکیم چند نیر ۸/-
۱۵۳۔ سرود نو (مجموعہ کلام) پروفیسر اختر قادری ۳/۵۰
۱۵۴۔ سنگ گہر سید احتشام حسین ۴/-
۱۵۵۔ سر سید و احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری سید علی عباس حسینی ۱/۵۰
۱۵۶۔ سرمایہ زبان اُردو جلال لکھنؤی ۵/۵۰
۱۵۷۔ سفر (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/-
۱۵۸۔ سیاحت زمین ناول محمود اعظم فہمی ۱/۵۰
۱۵۹۔ ستاروں سے آگے ناظر کاکوروی ۳/۵۰

۱۶۰۔ سنہرا حلقہ -/۷۵
۱۶۱۔ سر سید احمد خاں انوار الحسن صدیقی ۴/-
۱۶۲۔ سوشل اسٹڈی احمد محسن کاکوروی ۱/۷۵
۱۶۳۔ ساز دل ذکی کاکوروی ۲/۵۰

(ش)

۱۶۴۔ شعر نو تنقیدی مجموعہ ڈاکٹر محمد حسن ۵/۵۰
۱۶۵۔ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) غلام احمد فرقت ۶/۵
۱۶۶۔ شرح سنگ گہر عبد القوی دریابادی ۴/۵۰
۱۶۷۔ شاہ نگین حضرت جی پروفیسر عبد الشکور ۳/-
۱۶۸۔ شرح ادب پارے نثر سعادت علی صدیقی ۴/-
۱۶۹۔ شرح ادب پارے نظم ڈاکٹر محمود الحسن ۴/-
۱۷۰۔ شرح منتخبات فارسی عبد القوی دریابادی ۵/-
۱۷۱۔ شبلی نعمانی انوار الحسن نورانی ۴/-
۱۷۲۔ شرح دیوان غالب جدید ایڈیشن نظم طباطبائی ۷/-
۱۷۳۔ شہری اور سماجی زندگی عبد العلی قدوائی ۷/-
۱۷۴۔ " " -/۸۵
۱۷۵۔ " " -/۹۰
۱۷۶۔ " " -/۹۰
۱۷۷۔ شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ امیر احمد علوی ۳/۵۰
۱۷۸۔ شعر العجم۔ حصہ اول، دوم۔ سوم۔ چہارم۔ پنجم شبلی نعمانی ۴۴/-
۱۷۹۔ شرح نثر امروز ایران احسن الظفر بی اے ۳/-
۱۸۰۔ " " ۳/۵۰
۱۸۱۔ شمع و شعر علامہ اقبال -/۵۰
۱۸۲۔ شرح حکیم نباتات وزیر خاں تنویر مسعود ۱/۲۵
۱۸۳۔ شرح انتخاب قصائد و غزلیات مطابق نصاب بی اے ۷/-
۱۸۴۔ شرح شعر باستان حصہ اول ڈاکٹر انوار الحسن ۳/-
۱۸۵۔ شرح ترانہائے خیام حکیم عبد القوی ۲/-

۱۸۶۔ شرح نصاب فارسی ۵/-
۱۸۷۔ شرح شعر و داستان دوم احسن الظفر ۲/-
۱۸۸۔ شرح گلہائے ادب ۳/-
۱۸۹۔ شرح آئینہ نظم اردو ۳/-
۱۹۰۔ شرح نثر فارسی امروزہ ۳/-
۱۹۱۔ شرح آئینہ نثر اردو خلیل قدوائی ۳/۵۰
۱۹۱۔ شرح غنچہ گل ۲/۵۰
۱۹۲۔ شرح شعر فارسی احسن الظفر ۳/-
۱۹۳۔ شرح ہماری زبان اردو درجہ ۴ خلیل قدوائی ۱/۵۰

(ص)

۱۹۴۔ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۴/۵۰
۱۹۵۔ صحیفۂ محبت۔ مہدی افادی کے خطوط ڈاکٹر محمود الٰہی ۵/۵۰

(ط)

۱۹۶۔ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اردو ۲/-
۱۹۷۔ طالبعلم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے غلام الثقلین -/۲۵
۱۹۸۔ طلسم اسرار۔ (ڈرامہ) مرزا رسوا لکھنوی ۱/۵۰

(ع)

۱۹۹۔ عذرا ناول صالحہ عابد حسین ۶/-
۲۰۰۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) سید احتشام حسین ۵/۵۰
۲۰۱۔ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینہ میں اخلاق حسین عارف ۳/۵۰

(غ)

۲۰۲۔ غالب نام آور نادم سیتاپوری ۵/۵۰
۲۰۳۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر سید امیر حسن نورانی ۶/-
۲۰۴۔ غالب کی تخلیقی تخیل شہید صفی پوری ۸/-
۲۰۵۔ غنچہ و گل سید محمود الحسن رضوی ۴/۵
۲۰۶۔ غالب کے کلام میں الحاق عناصر نادم سیتاپوری ۵/۵۰
۲۰۷۔ غزلی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۲۰۸۔ غزلیات نظیری ۱/۵۰
۲۰۹۔ غزل انسائیکلوپیڈیا جدید ایڈیشن ذکی کاکوروی ۲۵/-

(ف)

۲۱۰۔ فرقتا (نعت) طاہر محسن علوی ۴/۵۰
۲۱۱۔ فن خطابت یعنی استاد تقریر، کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ ۱۲/-
۲۱۲۔ فریدہ خان محبوب طرزی ۱/-
۲۱۳۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادم سیتاپوری ۵/۵۰
۲۱۴۔ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۴/۵۰
۲۱۵۔ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰
۲۱۶۔ فروغ جام مجموعہ کلام تنویر واحدی ۳/۵۰
۲۱۷۔ فغان محسن محسن کاکوروی -/۴۰
۲۱۸۔ فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/-
۲۱۹۔ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۶/۵

(ق)

۲۲۰۔ قدمچے۔ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں۔ غلام احمد فرقت ۵/-
۲۲۱۔ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰
۲۲۲۔ قصائد مومن۔ مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۵/۵۰
۲۲۳۔ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۷/-
۲۲۴۔ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۳/-
۲۲۵۔ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/-
۲۲۶۔ قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر ۲/۱۵
۲۲۷۔ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۳/-

(ک)

۲۲۸۔ کلیات اقبال علامہ اقبال ۸/-
۲۲۹۔ کبیر اور کاہی بدرالدین طیب جی -/۰
۲۳۰۔ کف گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۱/۵۰

(گ)

۲۳۱۔ گاندھی نمبر ۱/-

۲۳۲۔ گلدستہ فارسی — اول دوم — ۱/۹۰
۲۳۳۔ گلزار فارسی — یعنی آمدنامہ جدید — ۰/۷۰
۲۳۴۔ گلہائے ادب — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/-
۲۳۵۔ گاندھی جی کے ساتھ — حامد اللہ افسر — ۱/۵۰

(ل)

۲۳۶۔ لوائح جامی مع مقدمہ — عبدالاحد خاں خلیل — ۱/۵۰
۲۳۷۔ لال قلعہ — مائل ملیح آبادی — ۲/-
۲۳۸۔ لب بام — عادل رشید — ۲/-
۲۳۹۔ لسانیات اور اردو — سید محمود الحسن رضوی — ۴/۵۰

(م)

۲۴۰۔ مرقع اقبال — عصمت فاطمہ علویہ — ۱۲/-
۲۴۱۔ مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو — غلام احمد فرقت — ۸/۵۰
۲۴۲۔ محسن کاکوروی نمبر — ۳/-
۲۴۳۔ مسلمان اور کانگریس — ابوالکلام آزاد — ۳/۵۰
۲۴۴۔ مرثیہ نگاری اور میرانیس — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۴/۵۰
۲۴۵۔ مضامین فرحت — حصہ اول — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۴/۵۰
۲۴۶۔ مضامین فرحت — حصہ دوم — " — ۴/۵۰
۲۴۷۔ ماضی کی کہانیاں — آفتاب اختر ظہری — ۳/-
۲۴۸۔ میرے اسٹیج ڈرامے — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/۵۰
۲۴۹۔ موسم گل — ناول — عادل رشید — ۲/-
۲۵۰۔ مجبور — " — خان محبوب طرزی — ۲/۵۰
۲۵۱۔ مضامین جدیدہ — محمد ہادی — ۱/۲۵
۲۵۲۔ مثنوی سحر حلال — فارسی — معہ مقدمہ — قدرت اللہ بیگ — ۲/۵۰
۲۵۳۔ مطالعہ — ذکی کاکوروی — ۵/-
۲۵۴۔ مولوی نذیر احمد کی کہانیاں — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۲۵
۲۵۵۔ معرکہ روم ویونان — صادق سردھنوی — ۲/-
۲۵۶۔ مثنویات حالی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۳/۵۰
۲۵۷۔ مطالعہ حالی — " — ۵/۵۰
۲۵۸۔ میٹھے بول — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰
۲۵۹۔ مصنوعی چاند — خان محبوب طرزی — ۴/-
۲۶۰۔ مقدمہ شعر و شاعری — مطابق نصاب بی اے۔ حالی — ۱/۵۰
۲۶۱۔ مرثیہ غالب — حالی — ۰/۲۵
۲۶۲۔ مجموعہ کربلا — جرجی زیدان — ۳/۵۰
۲۶۳۔ معمار — مائل ملیح آبادی — ۲/۵۰
۲۶۴۔ مولانا حالی — انوارالحسن صدیقی — ۴/-
۲۶۵۔ انتخاب ساز آزادی یعنی — مرتبہ رشید رضوی
۲۶۷۔ مہاراج بلی — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۲/۵۰
۲۶۸۔ مسٹر بلاکی لڑکی جھونک — خواجہ عزیز الحسن مجذوب — ۰/۷۵
۲۶۹۔ مجذوب اور ان کا کلام — مولانا رضا انصاری — ۱/۵۰
۲۷۰۔ مصباح بلاغت مع مقدمہ اردو — محمد شریف — ۳/-
۲۷۱۔ مطالعہ سودا — ڈاکٹر محمد حسن — ۳/-
۲۷۲۔ مقدمات و مقالات — عبدالاحد خاں — ۵/۵۰
۲۷۳۔ منتخب سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۴/-

(ن)

۲۷۴۔ نثر امروز ایران — ڈاکٹر رغیب حسین — ۳/-
۲۷۵۔ نشاط غالب — وجاہت علی سندیلوی — ۵/-
۲۷۶۔ نقد و انتقاد — اعجاز احمد — ۴/۵۰
۲۷۷۔ نقوش حالی دوم — یعنی حالی نمبر — پروفیسر احمد حسین۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۲۷۸۔ شجاعت علی سندیلوی — ۲۵/-
۲۷۹۔ نغمۂ کوہسار — خان محبوب طرزی — ۲/-
۲۸۰۔ نفحات الانس مع مقدمہ اردو — محمد شریف — ۳/-
۲۸۱۔ نظم سائیکلوپیڈیا — ذکی کاکوروی — ۱۰/-
۲۸۲۔ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی — کبیر احمد جائسی — ۲/۵۰
۲۸۳۔ نسرین و نسترن — ذکی کاکوروی — ۵/-
۲۸۴۔ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ — حامد اللہ افسر — ۳/۵۰

۲۸۵۔ نیا راستہ ناول — خان محبوب طرزی — ۳/۵۰

۲۸۶۔ نوروز ” — مائل ملیح آبادی — ۴/۵۰

۲۸۷۔ نئے اور پُرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ — آل احمد سرور — ۸/۵۰

۲۸۸۔ نقوش و افکار — مجنوں گورکھپوری — ۵/۵۰

۲۸۹۔ نیلم — انتصار حسین — ۳/-

۲۹۰۔ نذیر احمد کی کہانی — فرمعت اللہ بیگ — ۱/۲۵

۲۹۱۔ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی — عبد الاحد خان خلیل — ۵/-

۲۹۲۔ منشی نول کشور نمبر — ۲/۵۰

(و)

۲۹۳ وعدہ فردا — اخگر مشتاق رحیم آبادی — ۱۵/-

(ہ)

۲۹۴۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے — علی عباس حسینی — ۱/-

۲۹۵۔ ہندی کے مسلمان شعرا — امیر حسن نورانی — ۰/۷۵

۲۹۶۔ ہمارا جھنڈا — حامد اللہ افسر — ۱/-

۲۹۷۔ ہندوستان شاہراہ ترقی پر — منظر سلیم — ۱/۵۰

۲۹۸۔ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ ” — ۱/۵۰

۲۹۹۔ ہمارا سماج حصہ ۱ ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی قریا — ۰/۷۰

۳۰۰۔ ” حصہ ۲ ” ” — ۰/۸۵

۳۰۱۔ ” حصہ ۳ ” ” — ۰/۹۰

۳۰۲۔ ” حصہ ۴ ” ” — ۰/۹۰

۳۰۳۔ یادگار غالب — مولانا حالی — ۶/-

۳۰۴۔ یاقوتی ناول — خان محبوب طرزی — ۳/۵۰

۳۰۵۔ یادگار انیس — امیر احمد علوی — ۴/-

ملنے کا پتہ۔ ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۰ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

۱۔ پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲۔ جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

۳۔ اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

۴۔ جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

۵۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

جلد (۲۳) شمارہ (۲) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو/این پی ۱۳

رسلسل نمبر: ۲۰۶۳۱۴/۲۰۸۶۴

دفتر فون: ۲۶۱۳۵

فون رہائش گاہ: ۲۶۶۵۶

ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

چیف ایڈیٹر:

ڈاکٹر سید رغیب حسین صدر شعبۂ فارسی

لکھنؤ یونیورسٹی (ڈی لٹ)

ایڈیٹر:

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

مجلس ادارت:

۱۔ عبدالقوی دریابادی بی۔ اے

۲۔ سعادت علی صدیقی

جلد (۲۳) شمارہ (۲) جون ۱۹۷۵ء

ترتیب

زر سالانہ اعزازی: دس روپیہ

عوام سے: چھ روپیہ

فی پرچہ: پینسٹھ ۶۵ پیسے

پتہ: ادارۂ فروغ اردو

امین آباد پارک لکھنؤ

پبلشر سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس تالاب محل لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو ۳/۵۰ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

اپنی باتیں

ہندوستان کو لسانی بنیاد پر تقسیم کرنے کے بعد اُردو زبان کے علاوہ ہر بڑی زبان کو اس کا حق مل گیا، سرکاری سرپرستی مل گئی۔ لیکن اُردو آج تک اپنے حق سے محروم ہے۔ لہٰذا جن دلائل اور براہین کی بنیاد پر ہندوستان کی لسانی تقسیم کی گئی ہے ہم انھیں دلائل کی بنیاد پر مطالبہ کرتے ہیں کہ جن ریاستوں میں اُردو بولنے والے پندرہ یا بیس صد ہوں ان ریاستوں میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور جس طرح ہندوستان کی ہر بڑی زبان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ اُسے سرکاری سرپرستی حاصل ہونا چاہیئے اسی طرح اُردو کے لئے بھی یہ حق تسلیم کیا جائے اور اس سے کم پر فیصلہ کرنا انصاف کی نظر میں سخت ناانصافی تصور کیا جائے ہو سکتا ہے کہ کوئی نادان ہم پر یہ کہہ کر اعتراض کرے کہ ۱۵ یا ۲۰ فی صد آبادی والی زبان کو دوسری سرکاری زبان نہیں بنایا جاسکتا تو ہم پوچھیں گے ملیالم۔ تلگو۔ بنگالی۔ پنجابی۔ گجراتی۔ مرہٹی اور آسامی زبان بولنے والوں کا ہندوستان کی مجموعی آبادی میں کیا تناسب ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ۱۵ فیصد سے زائد نہیں۔ یہ کیا اندھیر ہے کہ جو لوگ ۱۲ فیصد سے بھی کم ہیں ان کی زبان کو تو سرکار میں پہلا درجہ ملے۔ اور اُردو بولنے والے جو مجموعی اور علاقائی لحاظ سے بھی ۱۵۔ ۲۰ فیصد سے زائد ہوں ان کی زبان کو سرکار میں دوسرا درجہ بھی نہ ملے۔ بہتر یہ ہے کہ اس اندھیر نگری کو ختم کیا جائے اور اُردو کو اُترپردیش۔ بہار۔ کرناٹک مہاراشٹر۔ پنجاب میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیگر قانوناً اور عملاً تسلیم کیا جائے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اُردو زبان کی اہمیت دیگر زبانوں سے مختلف وجوہات کے تحت خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اُردو زبان کا بول بالا، ہند کی تقسیم سے قبل بڑی اہمیت کا

حامل تھا مگر تقسیم ہند کے بعد سیاسی وجوہ کی بناء پر اس زبان کی مخالفت میں اضافہ ہوگیا اور تجربہ بتاتا ہے کہ مخالفت کے باوجود اُردو زبان پہلے سے زائد سنور کر آگے بڑھی۔ اس نے اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے ہر مخالفت کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی وزیراعظم اور صوبہ کے ذمہ داران اور ملک کی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے بھی ایسے بیانات دینے شروع کردیئے جو اُردو زبان کے مخالفوں کا منہ بند کردینے کے لئے کافی اہمیت کے حامل ہیں اس کے علاوہ غیر مسلم شعراء اور ادیب بھی اُردو زبان کی خدمت میں لگ کر اس کی ترقی و ترویج میں پیش پیش نظر آنے لگے، ظاہر ہے جب ہندو، مسلم سکھ۔ عیسائی۔ سب مل کر اُردو کو اس کے صحیح مقام پر پہونچانے اور اس کو جائز اور قانونی حق دلانے کی سعی کرنا شروع کردیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو کا مستقبل ہندوستان میں تاریک ہوکر رہے گا۔ اگر اُردو کے قدردانوں کو اُردو کی صلاحیتیں اور اپنی کوششوں پر اعتماد ہے تو وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اُردو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا میں ترقی کرے گی، بس یقین محکم اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔ اور انھیں جذبات کے تحت ہم اپنے مقاصد میں کامیاب و کامران ہوسکتے ہیں۔

اُردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اُس کے حقوق کی رکھوالی ہم آپ اپنے تعاون میل ملاپ اور بھائی چارگی کے جذبہ کے تحت قدم سے قدم ملاکر ہی حاصل کرسکتے ہیں۔ اُترپردیش اُردو اکاڈمی یا اور سرکاری اداروں کی بے عملی اور خود غرضی اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان افراد میں عمل کا فقدان ہے۔ ان کی غرضیں اپنی خواہشات کی تکمیل میں ممد و معاون ہیں۔ ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ اُردو زبان کے حقوق کو منوانے کے لئے کوئی عملی جد و جہد کرسکیں گے، خام خیالی ہے۔ اس لئے ہر محبِ اُردو کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر اُردو زبان کے حقوق کو حاصل کرنے کی جد و جہد کرے اور پیہم اور مسلسل جد و جہد کرکے اُردو زبان کے لئے آئینی حقوق تسلیم کراکر اپنے قومی و ملی فرض کو پایۂ تکمیل تک پہونچائے۔ اس طرح ہم اپنے دستوری اور قانونی حق کو تسلیم کراسکیں گے۔ اور یہ فتح ہماری آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے بیش بہا تحفہ ہوگی، جو رہتی دنیا تک یاد کی جاتی رہے گی۔

غزل

فیاض الدین احمد خاں ۔ فیاض گوالیاری
چمن منزل، کرنل صاحب کی ڈیوڑھی۔ گوالیار ملے
(مدھیہ پردیش)

ہر شخص کا اترا کے برابر سے نکلنا
ایسے میں اکھرتا ہے ترا گھر سے نکلنا

پتھر سے کوئی موہنی مورت ہی تراشو
مشکل ہے اگر نہر کا پتھر سے نکلنا

میں آؤنگا جھونکوں میں نسیمِ سحری کے
تم بھیس میں خوشبو کے گلِ تر سے نکلنا

ڈوبا ہوا رہتا ہوں تری یاد میں دن رات
تیرے لیئے ہوتا ہے مرا گھر سے نکلنا

الزام نہ آجائے مری تشنہ لبی پر
یوں مئے کا چھلکتے ہوئے ساغر سے نکلنا

غم دل میں گھٹینگے تو چمن کیسے بنے گا
اچھا ہے بخارات سمندر سے نکلنا

ہر موڑ پہ بیٹھے ہیں کئی چور کئی سانپ
تم چاروں طرف دیکھ کے اندر سے نکلنا

کچھ اور بڑھاتا ہے مرے عزمِ سفر کو
راہوں میں ہر اک گام پہ پتھر سے نکلنا

جیسے سطحِ آب پہ مچلی ہوئی کرنیں
دیکھا ہے بہاروں نے ترا گھر سے نکلنا

تم خود ہی گلے مل کے مجھے ختم نہ کر دو
ہر کام تو ممکن نہیں خنجر سے نکلنا

اب تو ترے بازو کا سہارا ملے ساقی
بنتا نہیں میخانے کے اندر سے نکلنا

حالات کو اوڑھے ہوئے راضی برضا ہوں
منظور نہیں پاؤں کا چادر سے نکلنا

اب بھی تو وہی کج کلہی ہے تری فیاض
تانے ہوئے سینہ اسی تیور سے نکلنا

ڈاکٹر صفدر آہ

آہ ڈاکٹر مسیح الزماں

ایسی بہت کم موتیں ہوئی ہیں جن کا صدمہ مجھے مسیح الزماں کی موت کے برابر ہوا ہے۔ سوچتا ہوں تو سچ مچ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی مکروہ خواب دیکھ رہا ہوں حیرت ہے کہ میں از کار رفتہ بوڑھا زندہ بیٹھا ہوں اور عزم، حوصلے اور خدمت ادب سے بھرے ہوئے جوان مسیح الزماں اس دنیا سے جا چکے۔

مسیح الزماں سے میرا تعلق الہ آباد یونیورسٹی کے استاد سے زیادہ اپنے محترم دوست مسعود حسن ادیب کے داماد کی حیثیت سے تھا۔ میں نے انہیں ہمیشہ اپنا حقیقی خویشل سمجھا اور اسی طرح وہ بھی مجھے اپنا بزرگ سمجھتے رہے۔

اُن کی شرافت اور سعادت کا ایک معمولی سا واقعہ یہ ہے کہ ایک بار مجھے معلوم ہوا کہ موٹر سائیکل سے اُن کا حادثہ ہو گیا ہے۔ میں نے فوراً اُن کو ایک تادیبی خط لکھا کہ حضرت اس شیطانی چرخے (موٹر سائیکل) کی سواری فوراً ترک کیجیے۔ اُن کا جواب آیا کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ اور اب موٹر سائیکل پر کبھی نہیں بیٹھوں گا۔ یہاں یہ سوال نہیں کہ اُنھوں نے موٹر سائیکل کی سواری چھوڑ دی یا نہیں۔ بات صرف اُن کی شرافت اور بزرگ داشت کی ہے۔ جس کے پیش نظر اُن کے مرتبہ کے آدمی نے ایک خطاوار بچے کی طرح جواب دیا۔

مسیح الزماں ایک ذی علم خاندان کے ورثے کے ساتھ خود ذی لرٹ، ژرف نگاہ محقق اور مستند عالم تھے یوں تو میرے اور اُن کے ادبی نظریے بیشتر یکساں تھے پھر بھی بعض مسائل میں ان سے صحت اختلاف رائے بھی ہو جاتا تھا۔ ایسے ہر واقع کے بعد کسی غلط فہمی کی جگہ وہ مجھ سے قریب تر ہو جاتے تھے یہ عظیم الشان وصف شاذ ہی آدمیوں میں ملتا ہے۔

عابد سہیل صاحب مدیر رسالہ کتاب نے مسیح الزماں کی یادگار تصنیف اُردو مرثیے کا ارتقا مجھے تبصرے کے لیے بھیجدی۔ کتاب پڑھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ اُردو مرثیے کی تاریخ اتنے نئے اور پُر از معلومات انداز سے آجتک

لکھی گئی تھی خاص کر اس کتاب میں جو باب انیس پر ہے وہ تو بے مثل ہے لیکن خلیق کے متعلق مجھے مسیح الزماں کے نظریئے سے شدید اختلاف تھا۔ میں رنگ انیس کا ماخذ صرف خلیق کے رنگ کو سمجھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ انیس نے اس رنگ کو ترقی دے کر وہاں تک پہونچا دیا جو صنف مرثیہ کا انتہائے عروج تھا۔ لیکن جواہر شناس آج بھی بتا سکتے ہیں کہ اس کا معدن رنگ خلیق ہی ہے۔

یہ بڑی اہم بات تھی جسے تبصرے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے مسیح الزماں کو خط لکھا جس میں کتاب کی خوبیوں کے ساتھ اپنے اختلافات بھی درج کئے تھے۔ خط کا جواب فوراً آیا۔ انھوں نے لکھا کہ آپ اختلافی نکات پر کھل کر بحث کیجئے۔ میں شاکی ہونے کی جگہ شکر گذار ہوں گا۔ تبصرے کے بعد مسیح الزماں کا خط پھر آیا جس میں انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا تھا

مسیح الزماں میں ایک عالم کی متانت اور ایک اسپورٹس مین کا ولولہ دونوں بہ یک وقت موجود تھے جب بنارس ہندو یونیورسٹی میں ان کا تقرر صدر شعبۂ اردو فارسی و عربی کی حیثیت سے ہوا۔ تو غالباً وائس چانسلر نے الٰہ آباد کے ایک پروفیسر سے دریافت کیا کہ تعلیم کے علاوہ کیا اسپورٹس میں بھی مسیح الزماں طالب علموں کی رہنمائی کر سکیں گے۔ پروفیسر صاحب نے جواب دیا کہ کھیل کے میدان میں وہ ہر طالب علم کے پیش پیش ہوں گے۔

ڈاکٹر نیر مسعود نے اپنے تھیسس رجب علی بیگ سرور الٰہ آباد یونیورسٹی میں مسیح الزماں ہی کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔ وہ اپنے تھیسس کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:۔

"ان کی (مسیح الزماں کی) کثیر التعداد مختلف النوع مصروفیتیں دیکھیں (جنھیں دور دراز صوبوں کی ڈراما کمیٹیوں میں ماہر کی حیثیت سے شرکت کرنے سے لے کر یونیورسٹی ڈیلیگیسی کی کبڈی کی صدارت بھی شامل ہیں) مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اس مقابلے میں میری رہ نمائی کے لئے وہ وقت نہ نکال سکیں گے"

ڈاکٹر نیر مسعود کی اس عبارت سے مسیح الزماں کی ایک ایسی ہمہ رنگ شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے جو عالم، فنکار بلکہ اسپورٹس میں کبڈی تک کا ماہر ہے لیکن ساتھ ہی ڈاکٹر نیر مسعود کو اعتراف ہے کہ اگر مسیح الزماں نہ ہوتے تو اس تھیسس میں بہت سی ایسی خوبیاں پیدا نہ ہو سکیں جو اس وقت موجود ہیں۔ وہ اپنے شاگردوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی ان سے کام بھی بے حد سختی سے لیتے تھے۔

بنارس میں وہ تقریباً ڈیڑھ سال رہے۔ لیکن یہاں کی ادبی فضا میں جان ڈال دی۔ بیسیوں ادبی انجمنوں اور مشاعروں سے بنارس جگمگا اٹھا بنارس کے بہت سے مستند ادیبوں نے مجھ سے کہا کہ ایسا ہر دل عزیز اور قابل پروفیسر ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آج تک نہیں آیا یہ بات اس وقت کی ہے جب مسیح الزماں الٰہ آباد یونیورسٹی میں واپس جا چکے تھے۔ مجھے یہ رائے سن کر بڑی خوشی ہوئی۔

ان کے الٰہ آباد جانے کے بعد بھی اگر بنارس میں کوئی ادبی اجتماع ہوتا تھا تو وہ ہمیشہ الٰہ آباد سے بلائے جاتے تھے۔

مجھے ان کے اردو ڈرامے کے نظریے سے سخت اختلاف تھا۔ میں کہتا تھا کہ اردو تو ابھی ڈرامے کی تاریخ پیدائش کا انتظار کر رہی ہے پارسی ناٹک یا اردو اسٹیج کے شور و شغب کو ڈراما کہنا قطعاً غلط ہے۔ مسیح الزماں کی

رائے اس معاملے میں یہ تھی کہ پچھلے برسوں جو بھی ڈرامے ہیں انکی تدوین کر کے اردو ڈرامے کی تاریخ شروع کر دینا چاہیے جو حقیقت اُردو میں پچ بچ ڈرامہ پیدا ہوگا تو وہ اس تاریخ کا اگلا باب بن جائے گا۔

پارسی اسٹیج کا ادب سے محروم ڈراما خورشید علی حاشیہ اور نوٹس کے ساتھ مدون کر کے پہلی بار مسیح الزماں نے شائع کیا۔ ان کی ایک بات بڑی قیمتی تھی کہ کسی کتاب کے ادبی معیار کا تعین نقادوں کا کام ہے۔ محقق یا مدوّن صرف تدوین کرتا ہے۔

میں نے اُن کو لکھا تھا کہ آپ کے ساتھ دو چار مفصل نشستیں ہوں تب ہی ڈرامے کے موضوع پر بات ہو سکے گی۔ لیکن میری ملاقاتیں اُن سے ہمیشہ رواروی میں ہوتیں۔ میں بنارس جا رہا ہوں تو وہ بنارس سے آ رہے ہیں۔ وہ لکھنؤ آ رہے ہیں تو میں لکھنؤ سے جا رہا ہوں وہ بمبئی سے جا رہے تو میں بمبئی پہونچ رہا ہوں۔ غرض میری اُن کی متوقع ملاقات وقت نے نہیں ہونے دی۔

جب مسیح الزماں بنارس سے پھر الہ آباد آئے تو احتشام حسین صدر شعبہ اُردو تھے۔ مسیح الزماں ریڈر اور اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ احتشام حسین کے سانحۂ ارتحال کے بعد مسیح الزماں صدر شعبۂ اردو بنائے گئے۔ ایک ناگفتہ بہ واقع کی وجہ سے اُن کو پھر اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ پر آنا پڑا لیکن یہ طے تھا کہ بہت جلد تقرر کمیٹی ہو گی اور مسیح الزماں کا صدر شعبۂ اُردو ہونا یقینی ہے۔

اس جھگڑے میں سال ڈیڑھ سال نکل گیا جب تقرر کمیٹی کی تاریخ معین ہوئی تھی تو کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آ جاتا تھا۔ آخری بار یہ معلوم ہوا کہ آل احمد سرور اس کمیٹی کے لئے آنے والے ہیں لیکن عین وقت پر عدیم الفرصتی کی وجہ سے وہ بھی نہ آ سکے۔

اور مسیح الزماں کی صاحبزادی شبنم سلمیٰ کا عقد طے ہوا۔ دعوت نامہ مجھے بھی آیا لیکن علالت کی وجہ سے میں بمبئی سے لکھنؤ نہ جا سکا۔ صرف مبارکباد کا تار بھیج دیا۔ شبنم سلمیٰ انگریزی کی ایم۔ اے ہے۔ عقد کے بعد میں نے دولہا میاں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے مسیح الزماں کو خط لکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ علیگڑھ میں ہندی کے لکچرر ہیں۔ انگریزی اور ہندی کا یہ میل مجھے بہت پسند آیا۔ اور میں نے دولہا دولہن کو کامیاب گھریلو اور ادبی زندگی گزارنے کی دعائیں دیں۔ میرا یہ آخری خط مسیح الزماں کے نام تھا۔

اصل میں میں تقرر کمیٹی سے منتظر تھا۔ ایک دن میرے عزیز دوست شکیل جمالی کا خط الہ آباد سے آیا کہ تقرر کمیٹی عنقریب ہونیوالی ہے اور مسیح الزماں کی کامیابی بالکل یقینی ہے۔ میں نے انتہائی خوشی میں ایک پوسٹ کارڈ مسیح الزماں کو بھیجا۔ جس پر صرف حافظ کا یہ مطلع تحریر کیا تھا۔

بیا کہ رایتِ منصور پادشاہ رسید
نوید فتح و بشارت بہ مہر و ماہ رسید

افسوس ہے کہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ موت کسی گوشے میں دبکی کھڑی ہے اور لسان الغیب کو بھی منہ چڑھا رہی ہے۔

اس خط کے چند دنوں کے بعد شکیل جمالی کا ایک اور خط پہونچا جو بجلی بنکر دل پر گرا۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ "مسیح الزماں سخت بیمار ہو گئے ہیں۔ مفصل کیفیت بعد میں لکھوں گا۔" بیماری کی نوعیت خط میں نہیں لکھی تھی لیکن میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے دو ایک خط بیگم مسیح اور بعض دوستوں کو تحریر کئے جواب کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ کتاب نما

دہلی میں یہ منحوس خبر دیکھی کہ مسیح الزماں کا انتقال ہوگیا۔ میں خود دل کا پرانا مریض ہوں۔ بستر پر جو گرا تو دو دن ہوش نہ رہا۔ آخر بمشکل حواس مجتمع کرکے تعزیت کا ایک خط بیگم مسیح کو اور ایک خط مسعود حسن ادیب کو لکھا۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ ان خطوں میں میں نے کیا لکھا۔ چند روز میں مسیح الزماں کے چہلم کا رقعہ آیا۔ اور ایک عظیم عالم، عظیم محقق اور عظیم دوست کی زندگی کی کہانی ختم ہوگئی۔

کیوں مسیح الزماں اگر تم چار چھ مہینے ٹھہر کر مرتے تو تمہارا کیا جاتا الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے مستقل صدر بنکر ہم لوگوں کا دل تو خوش کر دیتے۔ مگر تمہیں جانے کی اتنی جلدی تھی کہ یہ کام بھی چھوڑ دیا۔

مسیح الزماں کی بلند پایہ تصنیفات اور تالیفات درجن بھر سے زیادہ ہیں چند تفصیلی تبصرے کی اس تعزیتی مضمون میں گنجائش نہیں۔ ان تصنیفات میں سب سے اہم اردو مرثیے کا ارتقا ہے۔

میر کے تمام مرثیے اور سلام مسیح الزماں ہی کی دریافت ہیں۔ تعداد میں یہ مرثیے ۴۴ اور سلام ۵ ہیں میر کی مرثیہ نگاری پر ان کی ایک مستقل تصنیف موجود ہے حیات بریلوی کی کلیات میر میں یہ سارے مرثیے اسی تصنیف سے منتقل ہوئے ہیں

یہ بات مسیح الزماں ہی نے دریافت کی کہ دلگیر مرثیہ گو ہندو تھے۔ ان کے مسلمان ہونے کی خبر غلط ہے آخر وقت تک اُن کا نام چھنولال تھا۔ اگر وہ مسلمان ہوگئے ہوتے تو اُن کا ایک اسلامی نام بھی ہوتا۔ لیکن کسی تذکرے یا تاریخ میں اُن کا اسلامی نام موجود نہیں۔ دلگیر اتنے ہی بڑے استاد مرثیہ گو ہیں جتنے بڑے فصیح ضمیر اور خلیق سمجھے جاتے ہیں اس دریافت نے تاریخ مرثیہ میں ایک زریں باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

مسیح الزماں آج نہیں ہیں لیکن اُن کا نام اُردو ادب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور آنے والی نسلیں انھیں احترام سے یاد کریں گی۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

محمد مظفر الحسن

شکیل بدایونی — ایک غزل گو

غزل سب سے زیادہ مردود اور سب سے زیادہ محبوب صنف سخن ہے۔ کہنے والوں نے تو اسے "اردو شاعری کی آبرو" "شاعری کا شاہکار" "شاعری کا عطر" "چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا فن" "موسیقی کا رس" "شاعری کی روح" اور "سب سے زیادہ دلکش پاکیزہ لطیف اور فطری صنف" کہا ہے لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اسے "بے وقت کی راگنی" کہتے ہیں کسی نے "قابل گردن زدنی" کہا ہے تو کوئی "نیم وحشی صنف سخن" کہنے سے نہیں چوکتا۔ ان تمام باتوں سے صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غزل زندگی کی روح ہے اور سرمایہ حیات۔ ورنہ ان طوفانوں کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ یوسف حسین خاں نے شاید غزل کے اسی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ابتدا سے آج تک غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اس کی بنیادوں میں کوئی فرق نہیں آیا جس کے یہ معنی ہیں کہ زمانہ کے سرد و گرم کو برداشت کرنے کی صلاحیت اس میں پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی مختلف اور متضاد حالات سے مطابقت پیدا کر لینا اس صنف کیلئے کوئی دشوار امر نہیں۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "اردو غزل ہندوستانی تہذیب کا ایک نقش لازوال ہے"

غزل دبے عبارت ہے "بازی وز زمان کردن" یا "حکایت از معشوق گفتن" سے لیکن غزل کا دامن اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے میرے خیال میں غزل کے خلاف جو محاذ قائم ہوا اس کی وجہ یہی ہے کہ نئیں و معترض کے دیوانوں نے، "حکایت از معشوق گفتن" کا بڑا ہی سطحی پہلو اپنے پیش نظر رکھا یا پھر یہ محاذ اس لئے قائم ہوا کہ زندگی صرف حکایت از معشوق گفتن ہی کا نام نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہے اور جب کچھ اور ہے تو لازمی ہے کہ وسعت بیان کی تلاش ضرور ہوگی۔ اور غزل کا پیمانہ اس وسعت بیانی کا متحمل نہ ہو سکا۔ اور بقدر شوق تنگنائے غزل نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ تو اپنا اپنا خیال ہے ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ ؎

غزل اور تنگ دامانی کا شکوہ

سلیقہ ہو تو گنجائش بہت ہے

چنانچہ اسی تنگ پیمانہ میں جب لوگوں نے اپنے اپنے ظرف اور اپنے اپنے سلیقہ کے مطابق پنہائی اور وسعت ڈھونڈھی تو اس کی آغوش میں نہ صرف حسن و عشق کی گفتگو ہوئی بلکہ تصوف و فکر اور فلسفہ و حکمت، اور الہیات وغیرہا، تمدن و ثقافت اور سیاسیات نے پناہ پائی اور اسی وقت غزل پہ پھبتی ہوئی نئے انداز سے سامنے آئی کہ

آنکہ بدنام کند صنف غزل را غلط است
ہاں! غزل می شود از صحبت نادان بدنام

غزل کی اس بدنامی اور نیک نامی کا ایک سبب اور ہے اور یہ کہ یہ صنف جس قدر آسان ہے اتنی ہی دشوار بھی، آسان اس لحاظ سے کہ ہر مبتدی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کرتا ہے اور دشوار بایں طور کہ اس صنف میں اپنی انفرادیت قائم کرنا اپنا ایک رنگ و آہنگ اور لب و لہجہ متعین کر لینا بڑا ہی دشوار امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری کی ابتدا سے اگر آج تک صرف صاحب دیوان شعراء کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ہزاروں ہوگی۔ لیکن ان میں بہت کم ایسے شعرا ملینگے۔ جن کی آواز دور سے پہچانی جا سکتی ہو۔

شکیل بدایونی اسی کوچہ کے رہ نوردہیں ان کی زندگی غزل ہے اور ان کی غزل ان کی زندگی۔

میں شکیل دل کا ہوں ترجماں کا ہوں رازداں
مجھے فخر ہے مری شاعری مری زندگی سے جدا نہیں

شکیل کا تاریخی نام غفار احمد ہے، لیکن عام طور سے شکیل احمد کے نام سے مشہور و معروف علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد جمیل احمد قادری ایک بلند پایہ عالم واعظ رطب اللسان اور متبحر عالم دین تھے،

شکیل کا گھریلو ماحول صوفیانہ تھا۔ ابتدائی تعلیم شکیل نے خاندانی روایات کے پیش نظر گھر ہی پر حاصل کی چنانچہ اردو، فارسی، عربی سے اچھی واقفیت ہوگئی، انگریزی تعلیم کا سلسلہ اس کے بعد شروع ہوا، شکیل نے ۱۹۳۶ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، اور اسی زمانہ میں لڑکپن کے عاشقانہ مزاج کی روک تھام کے لئے اُن کی شادی چچا زاد بہن سے کر دی گئی، میٹرک پاس کرنے کے بعد شکیل کا داخلہ مادر درسگاہ علی گڑھ میں ہوگیا۔ ۱۹۳۹ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور گھر کی ساری ذمہ داری ان پر عائد ہوگئی لیکن اس کے باوجود شکیل نے تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۴۲ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد محکمہ سپلائی میں ملازم ہوگئے اور ان کی تقرری دلی ہوگئی، ۱۹۴۶ء میں عروس البلاد بمبئی آئے اور فلمی دنیا سے ایسے منسلک ہوگئے کہ تا دم آخر اسی سے بندھے رہے۔

شکیل کو شعر و شاعری سے ابتدا ہی لگاؤ تھا۔ گھریلو ماحول شاعرانہ تھا والد شاعر تھے اور سوختہ تخلص کرتے تھے چچا اچھے نعت گو تھے، شکیل کے باضابطہ شاعری کی ابتدا ۱۹۳۰ء میں ہوئی جب ان کی عمر صرف ۱۴ سال کی تھی، شکیل نے ابتدا میں اپنے چچا ضیا القادری سے اصلاح لیا، جن کے اثر سے ان کی شاعری میں عارفانہ رنگ در آیا۔ لکھتے ہیں۔

بارک اللہ فیض تعلیم ضیاؔ سے اے شکیل
خود بخود رنگ تغزل عارفانہ ہوگیا

لیکن شکیل کا مزاج ابتدا ہی سے رومان پسند اور رومانی پرور تھا چنانچہ یہ عارفانہ رنگ زیادہ دیر تک اور زیادہ دور تک ان کا ساتھ نہ دے سکا۔ بدایوں کا علمی ماحول جیسے ہی چھوٹا اور علی گڑھ شکیل پہنچے تو لڑکپن کے عاشقانہ مزاج نے اپنی راہ نکال لی علیگڑھ نے شکیل کو رومانی

فطرت میں اضافہ کیا اور حسن پرستی بڑھ گئی۔ اس پر جگر
کی صحبت نے دو آتشہ کا کام کیا، اور حسرت کے تغزل نے
اس کو اور زیادہ نکھارا اور سنوارا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شکیل
کا رنگ تغزل سنور گیا اور ذوق تغزل نکھر گیا، ان کی
شاعری میں جگر اور حسرت کا گہرا رچاؤ ملتا ہے۔ لیکن جب
شکیل دلی آئے تو یہاں مختلف اور متضاد خیالات و
رجحانات ان کے استقبال کے لئے ان کی راہ دیکھ رہے تھے
ایک طرف امر ناتھ ساحر، بے خود، سائل، زار، جیسے قدیم
رنگ کے دلدادگان نغمے چھیڑے ہوئے تھے تو دوسری
طرف زندگی کے نئے تقاضوں کو خوش آمدید کہنے والے اور
نئے زمانہ کا استقبال کرنے والے مجاز، تاجور، جوش، جذبی،
فیض، جیسے پرجوش انقلابی۔ رومانی اور ترقی پسند جدید
شعرا ساز دل پر پر درد نغمہ گا رہے تھے، شکیل کے
پیمانہ فکر و تخیل نے ان کو ان دونوں راہوں سے الگ
دونوں طرز کے ملے جلے رنگ و آہنگ کو اختیار کرنے
پر مجبور کیا۔ کیونکہ اسی میں ان کی انفرادیت کا راز پنہاں
تھا، چنانچہ شکیل نے قدیم و جدید رنگ اور لب و لہجے
خوشگوار امتزاج اور حسرت و جگر کے تاثر سے غزل کی
ایک ایسی راگنی سنائی۔ اور ایسا نغمہ بکھیرا کہ بہت جلد شکیل
کا نام لبوں پر آگیا۔ انھوں نے اپنی ایک الگ راہ بنائی۔
جہاں انقلاب و رومان، قدیم و جدید دونوں آکر مل گئے
اور اس طرح ایک تیسری راہ بنی جو سنگم سے زیادہ حسین اور
خوبصورت ہے کہ اس رنگ میں مختلف رنگوں کی علیحدہ
علیحدہ نشاندہی ممکن نہیں۔ ان کے ایک دیباچہ نگار اکرم
الہ آبادی نے لکھا ہے کہ

"وہ جس قدر رومانی شاعر ہیں اتنے ہی انقلابی اور
سیاسی بھی لیکن وہ انقلاب و سیاست کی بات بھی
ساغر و مینا اور گل و بلبل کی معرفت کرتے ہیں:

خود شکیل نے لکھا ہے کہ ؎

ہے شکیل ایک شاعر فطرت — یہ نہ سمجھو کہ انقلابی ہے

شکیل نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ قطعات
و رباعیات، اور گیت بھی لیکن میں یہاں صرف شکیل کی
غزل گوئی پر ہی روشنی ڈالوں گا۔ تو آئیے شکیل کی ہر غزل
میں غور طرازی کریں اور یہ دیکھیں کہ ان میں کتنی گہرائی
ہے۔

سوز و گداز زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے اور
اس حقیقت کی ترجمانی جس قدر اور جتنی آسانی سے
غزل میں ممکن ہے دوسری صنف میں نہیں، اور غزل میں
سوز و گداز پیدا ہوتا ہے فنکار کی حساس طبیعت سے
عشق و عاشقی اور اس کے رموز حقائق سے وہی واقف
ہو سکتا ہے جس کے دل پر چوٹ لگی ہو اور جو اس بھٹی میں
تپ کر کندن بنا ہو۔ جذبات صادق، حساس طبیعت
اور داغ قلب یہی چیز عشق و عاشقی کی حکایت مرتب
کرتی ہیں اور پھر ان ہی سے سوز و گداز پیدا ہوتا ہے شکیل
ابتدا ہی سے رومان پسند ہیں، طبیعت حساس ہے غم کے
چرکے لگے ہیں، اور ان کا دل بھی لڑکپن میں دھڑکا ہے
جس کی روک تھام کی گئی ہے اس لئے شکیل کی غزلوں
کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں روح تغزل جلوہ گر ملتی
ہے اور سوز و گداز سے پر معلوم ہوتی ہے۔

ان غزلوں میں محبوب کی کج ادائیاں بھی ہیں اور
اس کی ستم رانیاں بھی اس کی کم نگہی بھی ہے اور بے نیازی
بھی شکیل کا محبوب ایک ارضی محبوب ہوتے ہوئے بھی
نہایت ہی پاکیزہ خو اور معصوم صفت ہے۔ شکیل صرف
محبت کے دلدادہ ہیں۔ محبوب کی طرف سے خواہ کوئی جواب

ملے یا نہ ملے، وہ صرف اور صرف محبت کرتے ہیں ایسی محبت
جس میں دور دور تک ہوس کا نام و نشان نہیں ملتا اور
یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی داستان کو سنانا نہیں چاہتے کیونکہ
یہ ڈر ہے کہ ؎

جو جگر کے تھے یہ شعلے تو مجھے بھی پھونک دینگے
مرا قصۂ محبت نہ سنو مری زبانی

وہ نہ اپنی محبت کا اشتہار کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی داستان
کو زبان زد عام و خاص ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن مثل
مشہور ہے کہ مشک اور عشق چھپائے نہیں چھپتے، یہ کہانی
مشہور ہو جاتی ہے لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگتے ہیں تو شکیل
کو حیرت ہوتی ہے ؎

نہ ذکر عنوان نہ حرف مطلب ادھر خموشی ادھر تغافل
تو پھر یہ افسانہ محبت زبان زد خاص و عام کیوں ہے

لیکن شکیل کو شاید اس کی خبر نہیں کہ خموشی ہی خموشی میں
وہ اپنی داستان حیات سنا گئے ہیں وہ محبت میں اس قدر
فنا ہو گئے ہیں کہ نہ تو انھیں مرگ و ہستی کا ہی خیال رہا ہے
اور نہ ہی عرفانی کا ملال، ان کی زندگی اگر عبادت ہے
تو محض محبت سے ؎

نہ خیال رنگ و ہستی نہ ملال عرفانی
مرا مدعا محبت مری آرزو جوانی

اور نہ صرف اتنا ہی نہیں ان کی زندگی کا نقطۂ عروج یہ
ہے ؎ محبت آرزو سعیٔ مسلسل حرف محرومی
متاع زندگی ہیں بس یہی دو چار افسانے

اسی لئے نہ تو انھیں جور حسن کا شکوہ ہے اور نہ ہی درد
ہجر کا صدمہ وہ ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں اور دل
زندہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ غم سے لذت یاب ہو ؎

شکوۂ جور حسن کیوں؟ صدمہ درد ہجر کیا
دل ہے تو دل لگی بھی ہے غم ہے تو زندگی بھی ہے

اور یہی وجہ ہے کہ اس راہ میں حائل تمام مشکلات
کے باوجود محبت سے باز نہیں آتے کیونکہ دل پر قابو ہی
نہیں ہے ؎

تم کو مجھ سے غرض سہارا نہ سمجھیں دل سے مجبور ہوں کہ جس کا
ہے یوں تو کون دو مکاں پہ قابو مگر محبت پہ بس نہیں ہے

اور اس راہ میں وہ اتنی دور جا چکے ہیں کہ وہاں سے واپسی
ناممکن ہے، چنانچہ وہ نہ تو دوری کا شکوہ کرتے ہیں اور
نہ ہجر کا رونا روتے ہیں اس لئے کہ ہجر میں یاد محبوب ہمیشہ
ساتھ رہتی ہے اور وصال میں ہوش و حواس سلب ہو
جاتا ہے احساس ادب اس قدر دامن کش ہوتا ہے کہ
نگاہ تک نہیں اٹھائی جاتی ؎

کیا کہئے شکوہ دوری کا ملنا بھی غضب ہو جاتا ہے
جب سامنے وہ آ جاتے ہیں احساس ادب ہو جاتا ہے

اور نتیجہ یہ ہو جاتا ہے کہ ؎

ان کے حضور لب تو مگر نہ کھل سکے
روداد غم نگاہ سے دوہرا کے رہ گیا

شکیل کے محبوب کی تصویر بھی بڑی پیاری ہے
اس کا سراپا غارت گر ہوش مہلک ایمان ہے

آنکھ ویران رخ افسردہ پریشاں گیسو
یوں بھی اکثر تری تصویر نظر آتی ہے

لیکن یہ تصویر جب بھی سامنے آتی ہے بڑی پرکشش اور
جاذب نظر رہی ہے، کتنے اپنا ایمان کھو بیٹھے ہیں اور
عاقبت خراب، اس لئے آنکھ کی ویرانی، دل کی پریشانی
زلف کی برہمی اور لب کی خاموشی حسن میں چار چاند لگا دیتی
ہے ؎

آنکھ ویران دل پریشان زلف برہم لب خموش
اب تو وہ کچھ اور بھی پیارے نظر آنے لگے

اور جس کا محبوب ان صفات کا حامل ہو گا اس پر بے خودی کا طاری ہونا لازمی ہے اور بے خودی میں انسان کیا کیا کچھ کہہ ڈالے اس کا کسے ہوش ہے۔ شکیل نے بھی بے خودی میں اپنی زندگی کا سارا راز کہہ ڈالا ؂

حال دل احوال غم شرح تمنا عرض شوق
بے خودی میں کہہ گئے افسانہ در افسانہ ہم

پہلے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ شکیل کے یہاں بوالہوسی نشاط کوشی نہیں، ان کا عشق نہایت پاکیزہ، بے حد معصوم ہے اور ایسا عشق یا ایسی محبت محنت کے بالائی درجہ کو چھو لیتی ہے اور وہ صرف محبت نہ رہ کر حقیقت کا عرفان بن جاتی ہے۔ اور ایسی محبت بڑے ہی سخت جان لوگ کرتے ہیں۔ کیوں کہ بظاہر تو یہ آسان معلوم ہوتی ہے لیکن اس راہ میں اتنی مشکلیں سد راہ ہوتی ہیں کہ صبر و ضبط کا پیمانہ عام طور پر چھلک جاتا ہے اور پیمانہ چھلکا اور عشق ہوس میں بدلا اس نے بڑی چابکدستی، ہوشیاری، استقلال عزم، صبر ضبط و تحمل سے کام لینا ہوتا ہے ؂

اک عالم عرفان حقیقت ہے محبت
اک منزل اور اک محبت ہے جنوں کیا

عشق کو دُنیا کھیل نہ سمجھے
کام ہے مشکل نام ہے آسان
دل پہ بیتے لب تک نہ آئے
ہائے محبت کا دستور

شکیل نے محبت کا یہ انداز حسرت و جگر سے سیکھا ہے ان اشعار میں آپ کو دونوں (حسرت و جگر) کی آواز یقیناً سنائی پڑے گی۔

ایک طرف شکیل کا جذبہ صادق ہے اور دوسری طرف محبوب کی ستم ظریفی، وہ شکیل کو اولاً تو دیکھتا بھی نہیں اور اگر دیکھتا بھی ہے تو اس طرح ؂

یوں دیکھتے ہیں جیسے ادھر دیکھتے نہیں
اس لطف بے طلب کی نزاکت نہ پوچھئے

اور اس لطف بے طلب سے شکیل کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ شکیل دبے دبے الفاظ میں اس کی ستم گری کا شکوہ کر بیٹھتے ہیں، چنانچہ پھر وہ روٹھ جاتا ہے تب شکیل بڑے ہی حسین انداز میں اسے مناتے ہیں۔ اور معافی چاہتے ہیں ؂

تمہیں کہہ دیا ستمگر یہ قصور تھا زبان کا
مجھے تم معاف کر دو مرا دل برا نہیں ہے

لیکن جب اس پر وہ راضی نہیں ہوتا تو شکیل سراپا حسرت و یاس کا مجسمہ بن جاتے ہیں اور یاد محبوب کو اپنا وظیفہ بنا کر اپنی زندگی آرام و چین سے کاٹنے کا بہانہ بنا لیتے ہیں ؂

ان کی یاد اُن کی تمنا ان کا غم
کٹ رہی ہے زندگی آرام سے

لیکن وہ انھیں چین سے رہنے ہی کب دینا چاہتا ہے ان کو اس حال میں دیکھ کر مسکراتا ہے مذاق اڑاتا ہے۔ شکیل اس کا برا نہیں مانتے بلکہ انتہائی دھیمی اور نرم لہجہ میں اس کو بتاتے ہیں کہ اب یہ زندگی ان کی اپنی نہ رہی اس لئے انھیں اپنی حالت پر کوئی افسوس نہیں، یہ زندگی تو وقف ہو چکی ہے کس کے لئے اس لئے مسکرانا تمہارا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

میری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

اور جب اس کے باوجود وہ نہیں مانتا تو اسے کہتے ہیں ؂

یوں دیکھئے فریب محبت تمام عمر
میں زندگی کو یاد کروں زندگی مجھے

زندگی کا راز کیا ہے؟ یہ جاننا ہر فنکار نے چاہا ہے

وراپنے اپنے فکر و خیال کے مطابق اس راز کو منکشف
بھی کیا ہے میں نے پھول سے زندگی کا حال دریافت کیا
تو کلی نے ہنس کر انھیں لاجواب کر دیا۔ اقبال کو زندگی
"جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں" نظر آئی اس لئے
انھوں نے اسے "پیمانۂ امروز و فردا" سے کہیں ناپا چکبست
کو زندگی میں عناصر کا ظہور ترتیب ملا اور فانی نے
اسے "دیوانے کا خواب" سمجھا کسی نے "زندہ دلی" کو
زندگی کا نام دے ڈالا شکیل نے بھی زندگی کی نقاب
کشائی کی ہے یہ کیسی ہے اسے دیکھ لیجئے۔

کتنی لطیف، کتنی حسین، کتنی مختصر
اک نو شگفتہ پھول کی نکہت ہے زندگی

اس انداز میں جہاں میر و فانی کے قنوطی لہجے کی بازگشت
سنائی دیتی ہے وہیں شکیل کے یہاں اقبال و جگر کا سا
طنطنہ اور پُر اعتماد لہجہ بھی ملتا ہے۔

زندگانی ہے فقط گرمی رفتار کا نام
منزلیں ساتھ لئے راہ پہ چلتے رہنا

ان[illegible] زندگی غموں سے عبارت ہے یہ زندگی ایک ایسی
[illegible] ہے جس سے مفر ممکن نہیں غم سے جو گھبرا جائے
[illegible]ان ہی کیا، لیکن انسان بہر حال انسان ہے۔
[illegible] مستقل غم اس کے پائے استقلال میں لرزش
پیدا کر دیتے ہیں۔ عام طور پر دو قسم کے انسان ملتے
ہیں ایک وہ جو غم سے شکست کھا جاتے ہیں اور دوسرے
وہ جو غم سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ عام طور سے اردو شعراء
نے غم زندگی کی ایک حقیقت ہے کو تسلیم کیا ہے اور
اس سے عہدہ برا ہونے کی تلقین کی ہے، ہاں یہ ضرور
ہے کہ ان کے راستے الگ الگ ہوتے ہیں غالب نے تو
غم اور زندگی دونوں کو ایک ہی چیز اور ایک ہی سکے

کا دو رخ تسلیم کیا ہے ان کے خیال میں جب تک انسان
زندہ ہے اس کا سامنا ہوتا رہے گا، صرف موت ہی کی
صورت میں اس سے چھٹکارا ممکن ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

شکیل نے بھی غم جھیلا ہے اور اسے پسند کیا ہے اس
لئے کہ غم نہ صرف سکون نواز ہے بلکہ خوشی کا راز بھی غم ہی
ہے۔

غم ہی سکون نواز تھا غم ہی خوشی کا راز تھا
آہ کہ خوش نہ رہ سکے غم سے نجات پا کے ہم

اسی لئے شکیل یہ چاہتے ہیں کہ غم کی دنیا آباد رہے کیونکہ
مفلسی میں ایک جاگیر انسان کے پاس بس یہی رہ جاتی ہے
اگر یہ نہ رہے تو زندگی گزارنی محال ہو جائے۔

غم کی دنیا رہے آباد شکیل
مفلسی میں کوئی جاگیر تو ہے

اور جب کسی نے ان پر طنز کیا تو انھوں نے بھی طنزاً ہی
جواب دیا کہ کیا کریں بھئی دنیا میں خوشی بہت تھی لیکن
مجھی سے غلطی ہو گئی کہ غم کو منتخب کیا۔

ہستی کے طلاطم میں پنہاں تھے عیش و طرب کے دھارے بھی
افسوس ہمیں سے چوک ہوئی اشکوں پہ قناعت کر بیٹھے

لیکن یہ تو ایک انداز تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غم کی حسرت
ہی ہے۔

اس کثرت غم پر بھی مجھے حسرت غم ہے
جو بھر کے چھلک جائے وہ پیمانہ نہیں ہوں

اس کی وجہ یہ ہے کہ

عظمت غم کا تقاضہ ہے کہ غم ظاہر نہ ہو

اس لئے شکیل آنسو نہیں بہاتے، التجا نہیں کرتے، کیوں کہ

خودداری کی موت انھیں پسند نہیں، انھیں ایسی نعمت
پسند نہیں جس کی قیمت غم جیسی چیز سے چکانی پڑے، غم خواہ
جیسا بھی ہو خودداری کا سودا کیوں کیا جائے ؎

خودداریوں کی موت سمجھنا انھیں شکیل
حاصل ہوں نعمتیں جو بڑی التجا کے بعد

طنز و مزاح، واعظ و زاہد پر پھبتی اور غزل کا
عام موضوع رہا ہے شکیل نے بھی اپنی غزلوں سے طنز کے
نشتر چبھوئے ہیں، مزاح کی پھلجھڑی روشن کی ہے۔ اور
زاہد و واعظ کی اچھی خبر لی ہے لیکن شکیل نے عام طور پر
متانت اور سنجیدگی برتی ہے طنز میں تیکھا پن ہے، مزاح
میں شائستگی ہے ابتذال یا پھکڑپن نہیں ہے۔
ملاحظہ ہوں چند اشعار جن میں زاہد و واعظ کی
خبر لی گئی ہے ؎

میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم تری زندگی کنارہ

یوں تو ہیں مشہور دونوں فرق یہ ہے محتسب
میں دلوں پر نقش ہوں تو اشتہاروں میں آیا

پی شوق سے واعظ ارے کیا بات ہے ڈر کی
دوزخ ترے قبضے میں ہے جنت ترے گھر کی

واہ رے زاہد تیری دورنگی دن کو فرشتہ رات کو انسان

یہ کالی کالی گھٹائیں یہ ساون فریب زاہد الٰہی توبہ
وضو میں مصروف ہے بظاہر حقیقتاً ہاتھ مل رہا ہے

"تلاطم اور کنارہ" "دل اور اشتہار" "فرشتہ اور
انسان" "وضو اور ہاتھ ملنا" یہ عام الفاظ ہیں۔ لیکن
ان سے شکیل نے کتنی معنویت پیدا کی ہے۔
غالب نے کہا تھا۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

شکیل نے جنت کی بے عمل زندگی پر طنز کرتے ہوئے کہا
ہے کہ اس جگہ جہاں نہ ذوقِ عمل ہے اور نہ ہی ذوقِ
جنون جو انسان کی فطرت ہیں خواہ وہ جنت ہی کیوں نہ ہو
انھیں جانا پسند نہیں ؎

ذوقِ عمل نہ ذوقِ جنوں ہر طرف سکوں
جنت اگر یہی ہے تو جنت میں جائے کون

چاند کی تسخیر سائنس کی فتح ہو تو انسان کی فتح نہیں اس
پر پھولنا اور غرور کرنا دانشمندی نہیں۔ یہ تو انسانی
تنزل کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان جو کل تک ستاروں
سے آگے دیکھتا تھا اور جس کی منزل چرخِ نیلی فام سے
پرے تھی آج محض چاند تک رسائی حاصل کر کے ہی خوش
ہو جائے، شکیل بڑے حسین انداز میں کہتے ہیں۔

انسان کل تو عرش سے اونچا تھا اے شکیل
آج اتنا گھٹ گیا کہ قمر تک پہونچ گیا

شکیل انسانیت کے علمبردار ہیں ان کے نزدیک حقیقت
بس ایک ہے جس تک سب پہونچنا چاہتے ہیں ان کے
خیال میں مختلف مذاہب ایک ہی حقیقت کے آئینہ دار
ہیں اسی لئے شکیل دیر و حرم کی قید سے لاپرواہ ہیں ان
کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں شکیل
کا مذہب صرف انسانیت ہے ایسی انسانیت جس میں
خلوص ہو جو دیر و حرم کی قید سے ماورا ہو ؎

مرا کفر حاصلِ زہد ہے مرا زہد حاصلِ کفر ہے
مری بندگی ہے وہ بندگی جو رہینِ دیر و حرم نہیں

تابندہ رہے ایمان شکیل اس کو ہی عبادت کہتے ہیں
سجدوں کے لئے کچھ قید نہیں کعبے میں ہو یا بتخانے میں

اسی لئے وہ فکر و ہوش سے ماورا سجدے کا مشورہ دیتے ہیں ؎

وہی ایک سجدہ ہے کارگر جو ہو فکر و ہوش سے ماورا
وہ ہزار سجدے فضول ہیں جو رہیں لغزش یا نہیں

شکیل کا عہد بڑا انقلابی تھا ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی، فیض، مجاز، ساحر، سردار، مخدوم اور جوش، انقلاب کا صور پھونک رہے تھے۔ زندگی میں تبدیلی دکھائی پڑ رہی تھی مزدور بیدار ہو رہے تھے۔ دنیا ایک نئی کروٹ لے چکی تھی زندگی کے نئے نئے تقاضے سامنے تھے، ظاہر ہے کہ شکیل ان سے دامن بچا نہیں سکتے تھے لیکن شکیل نے خود کو اس بہاؤ کے حوالے نہیں کر دیا بلکہ بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے عہد کی زندہ حقیقتوں کو شعروں کے پیکر میں ڈھالا، آزادی کے لئے جد و جہد، آزادی کا ملنا اور آزادی کے بعد داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر نے انھیں بے حد متاثر کیا، ان کا دل اس غم سے کراہ اٹھا۔

قفس سے آ کے چمن میں تو اب یہی دیکھا
بہار کہتے ہیں جس کو خزاں کا نام ہے

گل فسردہ چمن اداس شکیل
یوں بھی اکثر بہار آئی ہے

زندگی کا جو درد ہے، وہ انقلاب آیا تو کیا
ایک دوشیزہ پہ غربت کا شباب آیا تو کیا

تشنۂ انوار ہے ابتک عروس زندگی
بادلوں کی پالکی میں آفتاب آیا تو کیا

اک سمت جشن شادی و ہنگامہ نشاط
اک سمت حشر واہ دو فغاں دیکھتا ہوں میں

بہار آئی چمن میں نکھر ہیں شام و سحر
یہ سوچتا ہوں یہ لطف بہار کیوں نہ ملا

نشاط انتشار عشا دل منانے آیا ہے رسم زنداں
قفس کے نزدیک کچھ دنوں میں شور پرواز سن رہا ہوں

کچھ کو وسعت بہار فرقت دیکھنے والو
کسی نے یہ بھی دیکھا رات بھر تاروں پہ کیا گزری

آزادی کے بعد انسانوں پہ کیا بیتی حالات نے کونسا رخ اختیار کیا، زندگی کس دھارے پر بہی اک تڑپ درد، صدمہ، ملال کیا ہے جو ان اشعار میں نہیں۔

کسی فنکار کو انفرادیت اس کا طرز اظہار اور انداز بیان بخشتا ہے شکیل کا طرز و انداز، لب و لہجہ بالکل منفرد ہے دور سے ان کی آواز پہچانی جا سکتی ہے شکیل کی زبان بہت حسین ہے بے حد شگفتہ اور رس بھری، موسیقی سے پر ترنم رہتی۔ ان کا لب و لہجہ رومانی ہے وہ شاعر فطرت ہیں انقلاب کے گیت بھی گاتے ہیں تو رومان کے پردے میں، شکیل نے اپنی شاعری کو نادر تشبیہات کے استعمال سے دقیع بنا دیا ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار جن سے شکیل کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے

ہے شدت خلوص بھی اک جرم عاشقی
پروانہ جل کے شمع کو بدنام کر گیا

مرکز سے دور ہو کے بایں اختصار عمر
روتی ہے اپنے حال پہ شبنم کبھی کبھی

عظمت غم کا تقاضہ ہے کہ غم ظاہر نہ ہو
روک لے آنسو کہ توہین فغاں ہونے لگی

دونوں ہی بنائے کشش و جذب ہیں لیکن
نغموں کی صدا اور ہے نالوں کی صدا اور

جاتے ہیں دل میں چھوڑ کے وہ جلوۂ خیال
بجھتی ہے شمع دل میں اندھیرا آئے بغیر

یہ خنک خنک ہوائیں یہ جھکی جھکی گھٹائیں
وہ نظر بھی کیا نظر ہے جو سمجھ نہ لے اشارہ

گن تو لیتے ہیں انگلیوں پہ گناہ
رحمتوں کا حساب کون کرے

شکیل کے اپنی شاعرانہ محاسن کو دیکھتے ہوئے ساحر لدھیانوی

نے نہایت مختصر لیکن بڑا جامع تبصرہ کیا ہے لکھتے ہیں۔

"شکیل کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت
بیان کی بے پناہ جاذبیت اور احساس کی شدت
ہے لیکن وہ مبلغ کم اور مغنی زیادہ ہیں ان کی شاعری
ناقد کی زبان نہیں دردمند کا دل ہے مجاہد کے
ہاتھ کی تلوار نہیں فنکار کے فکر کا نشتر ہے"

شکیل اب ہم میں نہیں رہے لیکن ان کے اشعار ہمارے دلوں کو سرور بخشتے رہیں گے، اور اسی دنیائے فانی میں ہمیشہ رہا ہی کون ہے شکیل نے خود ہی کہا ہے۔

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں

بسلسلہ صفحہ ۲۱

شادی مہرالنساء سے ہوتی ہے لیکن یہ تمام واقعات ایک خاص ماحول میں پیش کئے گئے ہیں جسے ہم شاہی ماحول کہہ سکتے ہیں لیکن آزاد نے تصور زماں کا خیال مکمل طور پر نہیں رکھا ہے اس طرح یہ ڈراما اسٹیج کے قابل نہیں کہا جا سکتا البتہ اس میں ڈرامائی خطوط قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اور ڈرامائی خطوط یعنی ابتدا عروج اور انتہا کی راہوں سے گزارنے پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ڈرامہ اکبر کسی حد تک پورا اترتا ہے" لیکن انتہا میں یہ ڈراما اس قدر سرد ہے کہ جیسے آزاد کی گرفت اس مقام پر آکر بالکل ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

مختصر یہ کہ ڈرامہ اکبر آزاد کا ایک اہم شاہکار ہے جسے ادبی اہمیت حاصل ہو سکتی ہے اور اس ڈرامہ کے مطالعہ کے زیر اثر یہ کہنا کچھ غلط نہیں کہ آزاد ہمارے ادب میں ڈراما نگار کی حیثیت سے بھی ایک خاص مقام کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر سیدہ شبیر فاطمہ ایم اے۔ ڈی۔ فل
الہ آباد یونیورسٹی

عربی زبان کی خصوصیات

عربی زبان میں چند خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری زبانوں میں نہیں ہیں۔ عربی ادب کی تاریخ پڑھنے والے کے لئے لازم ہے کہ ان سے فی الجملہ واقفیت حاصل کرلیں، اگرچہ عربی جاننے والا ان باتوں کو خود بھی جانتا ہوگا مگر غالباً ان خصوصیات کی طرف اس کو التفات نہ ہوا ہوگا۔

۱۔ مادّی خصوصیات:۔ یعنی اس کے ہر لفظ کا ایک مادّہ ہوتا ہے جس سے بیشمار الفاظ بنتے ہیں ٹھیک اسی طرح جسطرح ایک دانہ کے اندر ایک بڑا درخت مع شاخ پتوں اور پھل پھول کے نکل آتا ہے۔ یہ مادہ بیشتر تین حروف کا ہوتا ہے، مثلاً ایک سہ حرفی مادہ ر ب ع ہے، اس سے نکلے ہوئے الفاظ دیکھو۔

رَبْعٌ (مصدر، ٹھہرنا، چار بنا دینا)۔ رُبُوعٌ (مصدر، گھس آنا)۔ رَبَّعَ (چوکور بنانا) اَرْبَعَ (چار برس کا ہوا)۔ تَرَبَّعَ (چار زانو بیٹھا)۔ اِرْتَبَعَ (بہار میں چرتا رہا)۔ اِسْتَرْبَعَ (اُبھر)۔ اَلرَّبُعُ (مکان، پلا پلا مرد جو نہ لانبا ہو نہ ناٹا)۔ رُبْعٌ (چوتھائی)۔ الرُّبَعُ (بہار میں پیدا ہونیوالا پہلا بچہ)۔ الرِّبْعُ (چار چار دن پر اونٹوں کو پانی پلانا)۔ الرَّابِعُ (چوتھا)۔ الرَّوَابِعُ (چار چار دن پر پلائے جانے والے اونٹ)۔ رُبَاعٌ (چار چار)۔ اَلرَّبْعَةُ (اوسط قد والا، عطار کا ڈبہ)۔ رَبَاعٌ (بہتر حالت)۔ رَبَاعِيَةٌ (اگلے دو دانتوں کے اغل بغل کے ایک ایک دانت)۔ رُبَاعِی (چار چار والا)۔ رَبِیْعٌ (بہار)۔ رَبِيْعِي (بہار گزارنے کا مکان)۔ رَبِيعَه (ناشتہ دان، باغ، لوہے کا خود)۔ رُوْبَعٌ (کمزور، کمینہ)۔ روبعة (ٹھگنا)۔ اَرْبَعٌ (چار)۔ اَرْبِعَاء (بدھ کا دن)۔

۲۔ صرفی خصوصیت:۔ اس زبان میں واحد و جمع کے صیغوں کے درمیان ایک صیغہ تثنیہ کا بھی ہوتا ہے، اور مذکر کے صیغوں کے ساتھ ساتھ مؤنث کے صیغے بھی الگ ہوتے ہیں، اس طرح اٹھارہ اٹھارہ صیغے بنتے ہیں، لیکن متکلم کے صیغوں میں اختصار کرکے چودہ صیغے آتے ہیں۔

۳۔ نحوی خصوصیت:۔ اس کی عبارت میں ہر لفظ پر اس کی حالت متعین کرنے کے لئے حرکات فتحہ، ضمہ، کسرہ کا ہونا ضروری ہے اسی کو اعراب کہتے ہیں۔ فاعل کو ضمہ، مفعول کو فتحہ، مضاف الیہ کو کسرہ۔

۴۔ ترادف الفاظ:۔ یعنی ایک ایک معنی کے لئے کئی کئی لغات کا موجود ہونا، چنانچہ

ں ہیں :۔

۱۔ شیر کے لئے ۵۰۰ الفاظ
۲۔ سانپ کے لئے ۱۰۰ "
۳۔ اونٹنی " ۲۵۰ "
۴۔ شہد " ۸۰ "
۵۔ شراب " ۱۰۰ "
۶۔ تاریکی " ۵۲ "
۷۔ روشنی " ۲۱ "
۸۔ کنوئیں " ۸۸ "
۹۔ آفتاب " ۳۲ "
۱۰۔ دودھ " ۱۵ "
۱۱۔ بارش " ۶۵ "
۱۲۔ ابر " ۵۰ "
۱۳۔ پانی " ۱۷۵ "
۱۴۔ اونٹ " ۲۰۰ "
۱۵۔ جنگ " ۲۰۰۰ "

نکتہ :۔ مگر یہ یاد رہے کہ ان مترادف لغات کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک ہی مقرر معنوں کے لئے اس کے تمام مترادف الفاظ بھی بولے جاتے ہیں، نہیں، بلکہ مترادفات میں سے ہر لفظ اس کے معنی کی کسی خاص خصوصیت کو الگ کرکے ادا کرتا ہے۔ عربی لغات و مترادفات کا یہ خاص راز ہے کہ ٹھیک ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے کبھی دو لفظ بھی نہیں ہو سکتے۔ مثلاً اگر اونٹنی کے لئے ۲۵۰ الفاظ ہیں تو اس طرح کہ جنس اونٹنی کے لئے ایک لفظ ناقہ ہے پھر اگر وہ حاملہ ہو تو اس کے لئے ایک دوسرا لفظ ہے اگر ایک ماہ کی حاملہ ہے تو اس کے لئے الگ لفظ ہے اور اگر دس ماہ کی حاملہ ہے تو اسکے لئے جداگانہ لفظ ہے۔

۵۔ لغاتِ اضداد :۔ عربی میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ جن کے معنی دو ہیں اور دونوں باہم ضد ہیں مثلاً

مَوْلیٰ آقا بھی اور غلام
بَیْعٌ بیچنا " " خریدنا
نَضْحٌ تشنگی " " سیرابی
جَوْنٌ سفید " " سیاہ
ذَوْبٌ پگھلنا " " جم جانا
قُعُوْدٌ اُٹھنا " " بیٹھنا

۶۔ تعدد معانی :۔ عربی میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی بہت بہت سے ہیں مثلاً۔

۱۔ خَالٌ کے ۲۷ معانی ہیں
۲۔ مَوْلیٰ " ۲۰ " "
۳۔ عَیْنٌ " ۳۵ " "
۴۔ عَجُوْزٌ " ۶۰ " "

۲۰۰ سے زیادہ الفاظ ایسے ہیں جو تین تین معانی رکھتے ہیں
۱۰۰ " " " " چار چار " "
کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں جو پچیس پچیس معانی رکھتے ہیں۔

۷۔ (الف) قلب حروف سے تعدد لغات :۔ آپ کو عربی میں سینکڑوں الفاظ ایسے ملیں گے کہ ان کے مادی حروف کو آگے پیچھے رکھنے سے رنگا رنگ لغات بنجاتے ہیں مثلاً ر ب ع کے مادہ سے ۶ لغات تیار ہوتے ہیں۔ رَبْعٌ (مکان)۔ رُعْبٌ (خوف)۔ عَرَبٌ (فصیح)۔ عَبْرٌ (گذرنا، عبرت لینا)۔ بَعْرٌ (مینگنی)۔ بَرْعٌ (مہارت)۔

ب ق ل کے مادہ سے ۶ لغات تیار ہوتے ہیں بَقْلٌ (ترکاری)۔ بَلْقٌ (چتکبرا)۔ قَلْبٌ (الٹنا)۔ قَبْلٌ (سامنے)۔ لَقَبٌ (نام)۔ لَبْقٌ (نرم کرنا)۔

(ب) قلب حرکات سے تعدد لغات :۔ متعدد الفاظ ایسے ہیں کہ اُن کے مادی حروف پر حرکات بدلتے جائیے تو نئے نئے الفاظ بنتے جائیں گے۔ مثلاً مُلْک

(بادشاہی)۔ مِلْکٌ (قبضہ کی چیز)۔ مَلَکٌ (فرشتہ)۔ مَلِکٌ (بادشاہ)۔

۸۔ **ایجاز و اختصار** :۔ یہ بات مسلّم ہے کہ عربی زبان میں اگر کوئی بات کہی جائے، تو عربی کا جملہ دوسری تمام زبانوں کے جملوں سے چھوٹا ہوگا۔

۹۔ **مختلف اوزان کا مختلف مفاہیم کیلئے خاص ہونا**:۔
عربی میں کچھ اوزان مقرر ہیں کہ اس اوزان کے الفاظ ایک خاص قسم کے معنی پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً
(الف) فُعال کا وزن بیماریوں کے ظاہر کرنے کے لئے متعین ہے مثلاً صُدَاع (دردسر)۔ مُجَادٌ (تپ)۔ زُکامٌ (سردی)۔
(ب) فَعَلان کا وزن کسی نہ کسی حرکت، اضطراب وغیرہ ظاہر کرنے کے لئے مخصوص ہے :۔
فَلَیان (اُبلنا)۔ غَشَیَانٌ (بیہوش ہونا)۔ خلجان (دل دھڑکنا)۔ طَیَران (اُڑنا)۔ جَریان (بہنا)۔

۱۰۔ **سجع کا آسان ہونا** :۔ عربی زبان میں مترادفات کی کثرت کی وجہ سے مقفیٰ اور مسجع عبارت لکھنا سہل ہے۔

۱۱۔ **سہولت تعبیر** :۔ چونکہ عربی میں مترادف لغات کے علاوہ جزئیاتی تفصیل کی بہت کثرت ہے۔ اسلئے بہت دقیق اور مخفی ترین احساس کو بھی آسان اور حاوی الفاظ سے ادا کرنا ممکن اور سہل ہے جیسے ہاتھ کے اجزاء

۱۲۔ **قرآن کی زبان** :۔ چونکہ اللہ تعالےٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے اس لئے زبان عربی کی حفاظت کا وعدہ اسی میں مضمر ہے۔

عبدالمنان۔

ڈرامۂ اکبر پر ایک نظر

آرٹ کا انسانی تہذیب سے گہرا تعلق ہے کسی قوم میں جہاں تہذیب کے پھول کھلتے ہیں وہاں آرٹ کی خوشبو بھی پھیلتی ہے یہ خوشبو قوم کی تہذیب کے گل کدے کو معطر ہی نہیں کرتی بلکہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے کہ یہ قوم اپنی ترقی کی کتنی منزلیں طے کر چکی ہے۔ اس خیال کی روشنی میں جب ہم ڈراما کے آرٹ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہندوستان اور یونان دُنیا کے نقشے میں دو ایسی جگہیں ہیں جہاں تہذیب و تمدن کے پودے کبھی لہلہا رہے تھے اور ان کے گلوں کی خوشبو دُنیا کے ہر حصہ میں پھیل رہی تھی۔ ڈراما کا آرٹ ان ہی دو ملکوں کے بطن سے دو الگ صورتوں میں پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ اس کا رواج دوسرے ملکوں میں ہونے لگا۔

ڈراما اپنی نوعیت کے لحاظ سے فنون لطیفہ میں ایک خاص مزاج اور انداز کا حامل ہے جس ملک میں فکر و فلسفہ کے شجر نہیں اُگتے وہاں فن ڈرامہ کے ثمر بھی نہیں لگتے۔ بقول صفدر آہ ـــــ آج بھی جس ملک میں فکر و فلسفہ نہیں ڈرامے کا آرٹ وہاں زندہ رہتا ہے۔ جہل اور عیش پرستی کے ماحول میں دوسرے فنون لطیفہ پست اور سفلی ہو جاتے ہیں لیکن ڈراما تو اس معاملے میں لاجونتی کا پودا ہے۔ جس کی پتیاں علم و حکمت کا سورج ڈوبتے ہی آپ سے آپ مرجھا جاتی ہیں" اس لئے ڈراما جیسے آرٹ کی پیدائش ایسی سرزمین سے ہونی چاہیئے جو فکر و فلسفہ کے لحاظ سے تاریخ میں ایک خاص مقام رکھتی ہو۔ قدیم تاریخ کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہونا ناگزیر ہے کہ ہندوستان اور یونان نے فلسفہ اور فکر کو آسمان کی جن بلندیوں تک پہونچا دیا ہے اس سے یہ گمان ہونا یقینی امر ہے کہ ڈرامے کا آرٹ ان دو ملکوں میں پہلی بار جلوہ افروز ہوا ہو گا۔ اگرچہ ہندوستان اور یونان کے ڈراموں کا مزاج انداز اور آہنگ بالکل جدا ہے جس میں دونوں ملک کے طریقۂ فکر اور طرز زندگی دو الگ صورتوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ تاہم یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ان دونوں ممالک میں سے کس ملک کی ڈراما نگاری کا فن قدیم تر ہے۔

ڈرامے کے ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ ڈرامہ کی ابتدا سب سے پہلے ہندوستان میں ہوئی اور بھرت منی کا "ناٹیہ شاستر" ڈراما کے آرٹ سے متعلق پہلا شاہکار ہے قدیم ہندوستانی اسٹیج کی شکل، اداکاری اور رقص یہ سارا کچھ بھرت کے ناٹیہ شاستر میں موجود ہے قدیم یونانی ڈرامے کا نقش اول چھٹی ص ق م قبل مسیح میں غیر ترقی یافتہ صورت میں ملتا ہے لیکن ہندوستانی ڈراما اس عہد سے مدتوں قبل اس سطح پر موجود تھا جس کی مکمل تصویر کشی بھرت منی کے ناٹیہ شاستر میں کی گئی ہے۔

مہابھارت کے زمانہ میں ناٹیہ کلا کا رواج واضح طور پر نظر آتا ہے اور بقول صفدر آہ — "ہر ہنر نواز راج میں رنگ شالے بڑے اعلیٰ پیمانہ پر بنے ہوئے تھے — رنگ شالے کا تصور بھرت کے ناٹیہ شاستر ہی سے پیدا ہوا ہے لیکن یہ تیقن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ناٹیہ شاستر کا زمانہ مہابھارت کا زمانہ ہے کیوں کہ ناٹیہ شاستر میں برہما وشنو، مہیش اور چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن کرشن جیسے اہم اوتار کا کہیں نام تک نہیں ملتا۔ اگر ناٹیہ شاستر مہابھارت یا اس کے بعد کی چیز ہوتی تو اسمیں کرشن کا ذکر آنا ضروری تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناٹیہ شاستر مہابھارت سے قدیم کتاب ہے بھرت منی کے ناٹیہ شاستر میں بیان کئے ہوئے واقعات، دیوتاؤں سے بالمشافہ گفتگو کی حکایتیں اور ڈرامائی رنگ وغیرہ اس کی بے انتہا قدامت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں اور عہد قدیم اور جدید کے مورخوں کے خیال کے مطابق بارہ سو قبل مسیح یا اس سے کچھ پہلے کا زمانہ ہے اگر بھرت منی کا ناٹیہ شاستر اس قدر قدیم ہے تو ہندوستانی ڈرامے کا آرٹ بھی اتنا ہی قدیم سمجھا جائے گا۔ ظاہر ہے یونانی ڈرامے کا آرٹ اتنا قدیم نہیں ہے،

اس ضمن میں ویبر کا نظریہ قطعی غلط کہا جا سکتا ہے کہ سکندر کے ساتھ جو یونانی آئے ہوں گے وہ ڈراما کا آرٹ یقیناً لائے ہوں گے اس خیال کے بانی جس قدر ذی علم ہوں لیکن وہ ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ سے ناآشنا ہی تھیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہندوستانی ڈرامے اور یونانی ڈرامے کی مزاج، روح اور شکل وصورت میں آسمان وزمین کا فرق ہے البتہ یورپین ڈرامہ یونانی ڈراموں سے ماخوذ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ یورپین ڈراموں میں ہزار ہا تبدیلیوں کے بعد یونانی ڈرامے کا رنگ موجود ہے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کا قدیم ترین ڈرامہ نگار "ناٹیہ شاستر" کے مصنف بھرت منی کو قرار دیا جا سکتا ہے اسکے علاوہ برہما اور سرسوتی نے بھی ڈرامے لکھے ہیں جو ناپید ہیں اور صرف ان ڈراموں کے نام کسی نہ کسی طور پر باقی ہیں ابتک سنسکرت کے جتنے ڈراموں کا پتہ چل سکا ہے ان کی تعداد کم وبیش پانچ سو ہے لیکن کالی داس بشری ہرس بھوبھوتی بھاش اور اشوگھوش قابل ذکر ہیں۔ ان میں کالیداس کا ڈراما "شکنتلا" نہ صرف یہ کہ سنسکرت ادب میں کلاسکی حیثیت کا مالک ہے بلکہ عالمی ادب میں اس کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اگر دنیا کے تین ڈراموں کو سب سے بہترین ڈراما قرار دیا جائے تو ان میں پہلا شکسپیر کا ہیملٹ دوسرا گوئٹے کا فاؤسٹ اور تیسرا کالیداس کا شکنتلا ہوگا۔

عام طور پر سنسکرت ڈراموں کا موضوع مذہبی ہوا کرتا تھا۔ اور ان ڈراماؤں میں دیوتاؤں کی تعریف کی جاتی تھی۔ لیکن ان میں سنسکرت کی بہترین شاعری ہونے کے باوجود بھی عوام کی تفریح وانبساط کا سامان مہیا نہیں تھا اور نہ ہی عوامی زندگی کی تصویر کشی کی جاتی تھی چونکہ یہ ڈرامے عام طور پر اعلیٰ درجے کے لئے مخصوص ہوا کرتے تھے اس لیے اُن میں عوامی زندگی

صداقت ناپید تھی۔

بہرکیف سنسکرت ڈراما چودہویں صدی تک کسی نہ کسی طور پر زندہ رہ سکا۔ اس کے بعد عوام کے ہاتھوں آ کر اس فنی خالصیت برقرار نہیں رہ سکی کیونکہ عوام کی سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے اب بھرتش کا اثر غالب ہوا اور آج بھی یہ ڈرامے کا فن ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مختلف صورتوں میں موجود ہے مثلاً بنگال میں جترا کی صورت میں، مرہٹی میں تماشا اور مشرقی علاقے کے بعض حصوں میں "نوٹنکی" کی صورت میں انگریزوں کے زمانے میں انہی نوٹنکیوں کی ایک خاص قسم بھی ایجاد ہوئی تھی جسے ہم رہس اور لیلا کہتے ہیں۔ یہ وہ رہس ہے جس کے رسیا واجد علی شاہ تھے۔ اب سے کچھ عرصہ قبل امانت کی "اندرسبھا" کو اردو ڈراما کو نقطۂ آغاز مانا جاتا تھا۔ لیکن مسعود حسن رضوی ادیب اور ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی تحقیقی سرگرمیوں کے نتیجے میں چند ایسے حقائق سامنے آئے جنکی روشنی میں اندرسبھا سے بہت قدیم ڈرامے کا پتہ چلتا ہے عبدالعلیم نامی کا قول ہے کہ اندرسبھا سے تقریباً تین سو سال قبل اردو ڈرامے اسٹیج کئے جاتے تھے ان کا خیال ہے کہ ۱۴۹۸ء میں جب پرتگیز آئے اور سولہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کی سرپرستی میں جب ان کا اقتدار بڑھا تو انھوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور اپنی ثروت کی نمائش کی غرض سے ایک ایسی زبان میں تماشے دکھانا شروع کئے جو دکن سے لیکر شمالی ہندوستان تک بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ لیکن جب انگریزوں نے شکست دیکر اسے ہندوستان سے نکال دیا۔ تو اردو اسٹیج کی یہ روایت ایک طویل مدت کے لئے ختم ہوگئی۔ ممکن ہے نامی صاحب کی یہ دریافت صداقت رکھتی ہو لیکن جب تک اس عہد کے کسی ڈرامہ کا کوئی نمونہ منظر عام پر نہ آ جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ اُردو زبان اس عہد میں اس قابل ہو چکی تھی کہ اس میں ڈرامے پیش کئے جاتے اس وقت تک کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق قابل تسلیم ہے اس لئے کہ انھوں نے واجد علیشاہ کو نہ صرف اُردو کا پہلا ڈرامہ نگار قرار دیا ہے بلکہ ان کا ڈراما "رادھا کنھیا" بھی منظر عام پر لایا ہے۔

اُردو کے پہلے ڈرامے کے بارے میں مختلف ناقدین اور محققین کی مختلف رائے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نامی "راجہ گوپی چند اور جالندھر" کو اُردو کا پہلا ڈراما قرار دیتے ہیں جو ۲۶ نومبر ۱۸۵۳ء گرانٹ روڈ تھیٹر بمبئی میں پہلی بار اسٹیج ہوا تھا پروفیسر ڈاکٹر مسیح الزماں نے "خورشید" کو اُردو کا پہلا ڈراما کہا ہے انھوں نے اس کتاب کو edit بھی کی ہے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ "خورشید" اُردو کا پہلا ڈراما ہے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں وہ بہرام جی خریدوا ؟ زبان کے قول نقل کرتے ہیں۔

اگر خورشید کے اسٹیج کئے جانے کے کچھ دن پہلے اس کمپنی اور اسی ڈائرکٹر کے اہتمام میں ایک اُردو کا ڈراما اسٹیج کیا جا چکا ہوتا تو مرزبان خورشید کے دیباچے میں ہرگز نہ لکھتے کہ زبان ہندوستان میں آج تک کوئی کھیل یا ناٹک لکھا گیا دیکھنے میں نہیں آیا تھا اس لئے تھیٹر کے اس دور میں خورشید کی اوّلیت تسلیم کرنا چاہیے۔

بہرام جی فریدون جی مرزبان اور ڈاکٹر مسیح الزماں کی اس رائے کو تسلیم کرنے میں چند دشوار لاحق ہوتی ہیں۔ پہلی دشواری تو یہ ہے کہ بہرام جی فریدون جی مرزبان کی یہ رائے کہ زبان ہندوستانی آج تک کوئی کھیل یا ناٹک لکھا گیا دیکھنے میں نہیں آیا تھا کسی طرح بھی قابل تسلیم نہیں جبکہ واجد علیشاہ

اور امانت کے ڈرامے ہمارے سامنے موجود ہیں اور باقاعدہ اسٹیج کئے جاچکے ہیں دوسری وجہ یہ کہ "خورشید" ایک ترجمہ ہے تخلیق نہیں۔ یہ گجراتی ڈرامہ کا ترجمہ ہے بہرام جی فریدون جی مرزبان نے ڈرامہ میں تبدیلیاں بھی کیں اور اردو میں منتقل بھی بلاشبہ ڈاکٹر مسیح الزماں نے خورشید کا متن پیش کرکے اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ کیا ہے پھر بھی "خورشید" کو اُردو کا پہلا ڈراما قرار دینا تخلیق اور ترجمہ کے فرق سے انحراف کرنا ہے خورشید کے سن تحریر سے قبل اور بھی ڈرامے دستیاب ہوئے ہیں جس کی نشاندہی جناب اخلاق اثر نے اپنے مقالہ "...... پہلا" میں کی ہے انھوں نے فرمایا ہے "مثال کے طور پر خواجہ احمد فاروقی نے اُردو کا قدیم ترین ڈراما تلاش کیا جو لندن کے مسٹر سائمن ڈگبی کی ملکیت ہے .... یہ ڈرامہ قدیم اُردو نثر کا دلچسپ نمونہ ہے اور اس میں ڈرامے کے ابتدائی اصول بھی کم و بیش ملحوظ رکھے گئے ہیں۔" دوسری جگہ اخلاق اثر صاحب اپنے مقالہ میں فرماتے ہیں "فصیح احمد صدیقی نے اس ڈرامہ کے تعلق سے لکھا ہے کہ مطالعہ سے بے شک یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جدید تحقیق کی روشنی میں اس ڈرامے کو "قدیم ترین" تسلیم کرنا بے جا نہیں" واقعہ تو یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے اسے شرف اولیت حاصل ہوتا ہے"۔ لیکن اخلاق اثر نے اپنے مقالے میں صرف ایک اقتباس پیش کیا ہے اور نہ اپنے خیال کے جواز میں یہ کہا ہے کہ خواجہ احمد فاروقی کی تحقیق نے اس ڈرامے کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے ظاہر ہے کہ جب تک یہ ڈراما منظر عام پر نہیں آجاتا اس وقت تک کوئی صحیح رائے نہیں قائم کی جاسکتی اور اس طرح مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق کو فوقیت دی جاسکتی ہے کیونکہ انھوں نے نہ صرف واجد علی شاہ کو باقاعدہ پہلا ڈراما نگار تسلیم کیا ہے بلکہ ان کا ڈراما "رادھا کنھیا"[1] بھی منظر عام پر پیش کیا ہے۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے "اندر سبھا" کو عوامی اسٹیج کا اہم شاہکار بتایا ہے۔ اندر سبھا فنی نقطہ نظر سے جس قدر کمزور ہو لیکن ادب میں قدیم ڈراما کی حیثیت سے ایک خاص مقام کا حامل ہے جس کی مقبولیت اور شہرت کا ڈنکا پورے ہندوستان میں اپنے عہد میں بج رہا تھا اور اندر سبھا کے اثر سے بہت ساری سبھائیں قائم ہوئیں تھیں جو مختلف علاقوں میں کھیل جا رہی تھیں آج بھی اندر سبھا کی ادبی اہمیت مسلّم ہے اور امانت نے علوئے تخیل، قدرت اظہار، فکر کی بلندی اور شاعرانہ رنگ و آہنگ کا جادو جس انداز سے جگایا ہے اس سے ہر قاری مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پہلی جنگ عظیم تک اُردو ڈراما نگاری پارسی اسٹیج کے زیر سایہ پرورش پاتی رہی۔ بمبئی کے پارسیوں نے وکٹوریہ اور اوریجنل الفریڈ، نیو الفریڈ اور بہت ساری کمپنیاں قائم کیں۔ جو سارے ملک میں دورہ کرکے تماشا دکھاتی تھیں لیکن یہ ناٹک کمپنیاں خاص تجارتی مقاصد کے تحت بنائی گئی تھیں۔ ان کمپنیوں کے لئے خود پارسی اور معمولی قسم کے منشی جو زیر ملازمت تھے، ڈرامے لکھتے تھے لیکن ۱۸۸۰ء کے بعد اُردو کے کچھ باشعور ادیب شاعر بھی ان کمپنیوں سے منسلک ہوکر ڈرامے لکھنے لگے ان میں رونق بنارسی، ظریف، احسن لکھنوی نارائن بیتاب اور آغا حشر کاشمیری کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ اس دور میں اُردو ڈرامے انگریزی اسٹیج پر ہی دکھائے جاتے تاہم پارسی اسٹیج کے ابتدائی دور میں اور ان کے ڈراموں پر اندر سبھا کا اثر غالب رہا۔ لیکن پہلی جنگ کے بعد ملک کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات میں نئے تغیرات رونما ہوئے بقول ڈاکٹر قمر رئیس "

---

[1] سن تصنیف ۱۲۶۹ھ

"ذہنی بیداری اور قدامت پسندی کی آویزش جب ایک نقطۂ عروج پر پہونچی اور جب آزادی اور قومی بہتری کی تحریکیں تعلیم یافتہ سماج میں قوت حاصل کرنے لگیں تو اس کا اثر ناگزیر طور پر ادب پر بھی پڑا۔" اس طرح اردو ڈراما نگاری میں بھی خاطر خواہ تبدیلی واقع ہوئی پھر بھی اس صنف کی ترقی کی راہ میں اسٹیج کی کمی اور رہی سہی دنوں بعد سینما کی مقبولیت سد راہ رہی اور ڈراما ادب کی دوسری اصناف کے دوش بدوش نہیں چل سکا۔ اس دور کے اہم ڈراما نگار امتیاز علی تاج اور عابد حسین ہیں جن کے ڈرامے "انار کلی" اور "پردۂ غفلت" ادبی لحاظ سے افق ڈراما پر درخشاں ستارے کی مانند ہیں۔

پارسی تھیٹر کے زوال کے بعد اردو کی روایت بھی تقریباً ختم ہو گئی جس کا اثر اردو ڈراما پر پڑا لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد جب بعض شہروں میں ریڈیو اسٹیشن کا قیام ہوا تو اردو ڈرامے کو ترقی کا ایک ہموار میدان ملا۔ اس دور میں ریڈیو سے ایکانکی یا ایک ایکٹ کے ڈرامے نشر کیے جانے لگے اسی دور میں اسکولوں اور کالجوں میں بھی ڈرامے کھیلے جانے لگے لیکن اس دور کے ڈراما نگار تصور زماں و مکاں کو ملحوظ خاطر رکھ کر ڈرامے میں زندگی کی ایسی تصاویر پیش کرتے تھے جن میں ہمارے ارد گرد پھیلے حالات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی نے ڈرامے کو شہرت و عظمت کے آسمان تک پہنچا دیا۔ اور انسانی زندگی کی تلخ حقیقتوں کی بے مثال ترجمانی کی۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد چند نئے ڈراما نگاروں کا اضافہ ہوا۔ جن کا شعور بلند ہے اور ڈراما نگاری کی دنیا میں تنوع اور گہرائی پیدا کی ہے ان میں ڈاکٹر محمد حسن، جاوید اقبال اور مرزا ادیب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اردو ڈراما کا ایک انداز اسٹیج اور تھیٹر سے بالکل مختلف ہے جو ادبی کہا جاتا ہے اس انداز کے ڈراما نگاروں میں وہ حضرات ہیں جن کے ڈراما لکھنے کا مقصد خالص ادب کی خدمت ہے اور ان لوگوں نے ادب میں صنف ڈراما کو ایک خاص مقام دینے کی غرض سے قلم اٹھایا تھا۔ ممکن ہے انھیں انگریزی ڈراموں کی ادبی اہمیت کا مکمل اندازہ ہو گیا ہو اور یہ بھی سمجھا ہو کہ ادب کے کاروان کو آگے بڑھانے کے لئے اور اس میں زندگی کے مختلف حالات و کیفیات، خیالات و معتقدات کو سمونے کی غرض سے ڈرامے سے بھی کام لیا جائے کیونکہ ڈراما اپنی نوعیت کے لحاظ سے ناول اور افسانے سے مختلف ہے ناول اور افسانہ میں ناول نگار یا افسانہ نگار کردار کے نظریات و خیالات کی خود بھی نشاندہی کرتا ہے۔ اور مکالموں سے بھی ظاہر ہوتا ہے لیکن ڈراما نگار جن کیفیات کی ترجمانی کرنا چاہتا ہے انھیں کردار کی زبان سے مکالموں کے دائرے میں پیش کرتا ہے کردار کو [illegible] کرنے کے لیے اور اس کی شخصیت نمایاں کرنے کے خیال سے خود دخل نہیں دیتا۔ لیکن ایسے ڈراما نگاروں نے اسٹیج کا خیال قطعی نہیں رکھا۔ جب کہ ڈراما ہمیشہ اسٹیج کا محتاج ہوتا ہے ایسے ڈراما نگاروں کی ادبی حیثیت یقیناً مسلّم ہو گئی لیکن جہاں تک فن اور ہئیت کا تعلق ہے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی اس طرح یہ ڈرامے ادب میں ایک اضافہ تو ضرور قرار دیئے جائیں گے لیکن تکنیکی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت تسلیم کرنا ذرا غور طلب مسئلہ ہوگا۔ ایسے ڈراما نگاروں میں آزاد قابل ذکر ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ اردو ادب میں ادب میں ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں

ان کی حیثیت مورخ کی بھی ہے اور انشا، پرداز کی بھی۔ ناقد کی بھی ہے اور محقق کی بھی۔ شاعر کے روپ میں بھی نمایاں ہیں اور ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے بھی۔ غرض کہ ان کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ ان تمام متذکرہ بالا حیثیتوں کے علاوہ آزاد ہمارے سامنے ایک ڈراما نگار کے روپ میں بھی آتے ہیں آزاد نے پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کی فرمائش پر شکسپیر کا لافانی ڈراما "میکبتھ" کا ترجمہ کیا لیکن تکمیل تک نہیں پہونچا سکے تاہم اس نامکمل ڈراما میں اپنے ذوقِ سلیم کا بہت حد تک مظاہرہ کیا ہوگا۔ اگرچہ آزاد اس ڈرامہ کے ترجمہ کرنے میں وہ رنگ و آہنگ اور وہ اثر تاثیر نہیں پیدا کر سکے ہوں گے جو شکسپیر کے "میکبتھ" میں موجود ہے کیونکہ شکسپیر کے ڈرامے غیر ملکی ہیں جب تک ہم ان کے تمدن، طرز فکر، تعلیم۔ اخلاق اور عشق سے واقف نہیں ہوں گے اس وقت تک ان کا پورا لطف اٹھانا ممکن نہیں تاہم ان کی انشا پردازی اور زبان کی جادوگری یقیناً اثر لائی ہوگی۔ اور اپنی ذہانت اور طبع سلیم کے گل کھلائے ہوں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد خالص مشرقیت کے دلدادہ تھے اس لئے انھوں نے غالباً اقتضائے طبیعت کے حصول کے لئے دوسری صورت یہ نکالی کہ جہانگیر اور نور جہاں کی رنگین اور عشق آموز داستان پر ایک ڈرامہ لکھنا شروع کیا ممکن ہے آزاد کے ذہن میں جہانگیر اور نور جہاں کی شادی سے متعلق واقعات جو تاریخ میں مذکور ہیں، ذہن میں رقص کر رہے ہوں گے اور جہانگیر کے تعیش پسندانہ مزاج اور نور جہاں کی طرف مائل ہونے کی داستان کو الفاظ کے زنداں میں مقید کرنے کا خیال بے چین کر رہا ہوگا کیونکہ جہانگیر اپنی رنگین مزاجی اور شاعرانہ طبیعت کے لحاظ سے ایامِ شہزادگی سے ہی اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا تھا زمانہ ولی عہدی میں مہرالنساء (جو بعد میں نور جہاں بنی) میں اس کی دلچسپی تو ایک حقیقی واقعہ ہے اور دلچسپی میں شدت اور والہانہ پن کا یہ عیاں ثبوت ہے کہ اس نے با اختیار ہونے کے بعد خود کو کامران بنا دیا اور ایک ایسے گل کو زیب گلو کیا جس کی رنگینی کی مثال نہیں اور اس کی خوشبو کی تعریف نہیں۔ یہ رنگینی اور خوشبو جہانگیر کے شعور کی گہرائی میں اتر چکی تھی اور تمام نا ساعد حالات کو مجبور کر کے آخر میں وہ اس گل کو پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شاید یہی خیال آزاد کے ذہن میں ہو اور حسن پرستی کا ایک واقعہ جہانگیر کے نامۂ اعمال میں درج کرنا چاہتے ہوں۔

بہرکیف ان تمام حقیقتوں سے قطع نظر یہاں صرف "ڈرامۂ اکبر" کی روشنی میں آزاد کو ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے دیکھنا ہے کہ وہ ڈراما نگاری کے فن میں کس حد تک کامیاب ہیں۔ اس ضمن میں دو باتیں ملحوظ خاطر رکھنا ہوں گی۔ ڈرامہ کی تکنیک اور ڈرامۂ اکبر کا عہد ڈرامہ اکبر اس عہد کی پیداوار ہے جب تھیٹریکل کمپنیاں مختلف شہروں میں ڈرامے دکھا رہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ڈرامے کا ابتدائی زمانہ تھا جب اس میں ادبی شان نہیں پیدا ہوئی تھی اور نہ فن و ہیئت کے گل و بوٹے کھلے تھے۔ یہ کہنا بجانب ہوگا کہ "ڈرامۂ اکبر" تاریخی حقیقت پر مبنی ایک ایسا ڈراما ہے جسے زبان و بیان کی بلندی، اثر اور واقعات کے تسلسل و تجسس کی وجہ سے ایک مقام تو مل سکتا ہے لیکن فنی نقطۂ نظر سے اسے وہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی جو امتیاز علی تاج کے "انارکلی" اور عابد حسین کے "پردۂ غفلت" اور آغا حشر کے چند ڈراموں کو حاصل ہے پھر بھی ابتدائی دور کی ڈراموں کی روشنی میں آزاد کی ذہانت

سلہ آزاد ... صفحہ ۱۹ [illegible]

ور ڈراما پر ان کی گہری نظر اور ڈرامۂ اکبر کی اہمیت تسلیم کی جاسکتی ہے۔ عشرت رحمانی نے اپنی کتاب "اردو ڈراما تاریخ وتنقید" میں فرمایا ہے۔

"یہ ڈراما ادبی حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن فنی کاریگری اور ڈرامائیت کے لحاظ سے اس کا کوئی مقام نہیں"

ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا یہ خیال ہے کہ ڈرامۂ اکبر آزاد کی وحشت طاری ہونے کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکا وہ فرماتے ہیں ــ "مولانا گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی فرمائش پر شکسپیر کے میکبتھ کا ترجمہ کرنا شروع کیا لیکن ختم نہ کرسکے۔ اس کے بعد اکبر لکھنا شروع کیا لیکن وہ بھی تکمیل کو نہ پہونچا سکے۔ سر عبدالقادر نے ۱۹۰۵ء میں ان کے اقتباسات اپنے رسالہ "مخزن" میں شائع کئے۔ مولانا کے ایک شاگرد سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے اس ڈرامہ (اکبر) کو مکمل کیا" مجھے ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی اس رائے سے مطلق اتفاق نہیں کیونکہ طاہر صاحب نبیرۂ آزاد نے "ڈرامہ اکبر" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ آزاد نے ہی اس ڈراما کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا ہے۔ ممکن ہے وحشت طاری ہونے کی وجہ سے پہلے ادھورا ہوا اور بعد میں تکمیل تک پہنچایا ہو۔ طاہر صاحب فرماتے ہیں "اب اتفاقاً مجھے مولانا کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک پرانا سا کاغذ ملا جس پر انھوں نے آئندہ ڈرامے کے لئے ایکٹ لکھے تھے۔ وہ کاغذ میں نے اپنے بزرگ و محترم جناب سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کی خدمت میں روانہ کردیا۔ ...... اس کے بعد عرصہ تک کسی کو خبر نہ ہوئی کہ ۱۹۰۵ء میں مکرم و معظم شیخ عبدالقادر صاحب نے یہ مختصر ساحصہ مخزن میں چھپواکر طبیعتوں کو بے چین کردیا۔"

نواسے کی قربت کی وجہ سے گمان غالب ہے کہ آزاد ہی نے اس ڈرامہ کو پایہ تکمیل تک پہونچایا ہوگا۔ ان کے شاگرد سید ناصر نذیر صاحب کا اتنا کارنامہ ضرور ہے کہ یہ ڈراما مکمل صورت میں ہمارے سامنے ہے اس حقیقت کو اس انداز سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ہر مصنف کی اپنی زبان ہوتی ہے اور اپنا منفرد لہجہ ہوتا ہے جو کسی بھی طرح دوسرے سے مماثل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آزاد اس معنوں میں زیادہ نیک نام رہے ہیں۔ اردو ادب میں وہ اپنے ایک خاص اور پرکشش انداز بیان اور منفرد لب ولہجہ کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ڈرامہ اکبر کی زبان شروع سے آخر تک ایک ہی سانچے میں ڈھلی لگتی ہے۔ کہیں سے بھی کسی قسم کا جھول نظر نہیں آتا۔ اور نہ ہی واقعات اور کردار کے درمیان غیر مناسب ربط برقرار ہے بلکہ واقعات اور کردار ایک ہی دھاگے میں پروئے نظر آتے ہیں۔

فنی نقطہ نظر سے ڈرامۂ اکبر کا تجزیہ

مکالمہ :۔ ڈرامہ کا ذریعۂ اظہار مکالمہ ہے۔ ڈراما میں مکالمہ اور اس مکالمے کے ایک ایک لفظ کی اہمیت ناول اور افسانے سے زیادہ ہوتی ہے کسی کردار کے داخلی جذبات واحساسات اور باطنی واردات وکیفیات کا اندازہ اس کی زبان سے پیدا شدہ مکالموں سے ہوتا ہے اگرچہ کرداروں کے نظریات وخیالات دراصل ڈراما نگار ہی کے ہوتے ہیں تاہم ڈراما میں کرداروں کی زبان سے مکالمے اس طور پر پیش کرتا ہے کہ وہ ساری چیزیں کرداروں کی اپنی معلوم پڑتی ہیں اور یہاں ڈراما نگار اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے۔

جہاں تک ڈرامۂ اکبر کے مکالموں کا تعلق ہے آزاد

جس حد تک کامیاب ہیں اُسی حد تک ناکامیاب بھی ہو گئے ہیں اس طور پر کہ کرداروں کی زبان سے جو مکالمے کہلوائے ہیں ان میں ڈرامائیت ہے اور کرداروں کے داخلی جذبات و احساسات اور باطنی واردات و کیفیات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور ناکام اس معنوں میں ہیں کہ انھوں نے مکالموں میں بے جا طوالت اور خطابت سے کام لیا ہے۔ اس سے زور داثر میں کمی آئی ہے بعض اوقات تو بے جا طوالت قاری کو اکتا دیتی ہے۔ یہ اکتاہٹ اس کی فنی کمزوری کا بین ثبوت ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر ڈرامۂ اکبر کو اس کے عہد کا خیال رکھتے ہوئے پرکھنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ آزاد نے تھیٹر سے غیر منسلک ہونے کے باوجود بھی ڈرامے فن سے پوری طرح نہیں تو کسی قدر ضرور واقفیت رکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں قلم اٹھا کر جہانگیر اور نورجہاں کے تخیلی اور تاریخی داستان کو الفاظ کے زندان میں مقید کرنے کے لئے اپنی افتادِ طبع کا بڑا کمال دکھایا ہے اُنھوں نے مہرالنسار جہاں گیر، علی قلی اور اکبر کے علاوہ دیگر ضمنی کرداروں کی زبان سے جو مکالمے کہلوائے ہیں ان میں ڈرامائیت یقیناً پائی جاتی ہے اور ان کرداروں کے داخلی جذبات و احساسات اور باطنی واردات و کیفیات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ آزاد نے مکالمہ نگاری سے مکمل طور پر کام لیکر کرداروں کی شخصیت اُجاگر کرنے اور واقعات کے تانے بانے بننے میں کامیابی حاصل نہیں کی ہے بلکہ وہ ہر ایک "جھلک" میں سب سے پہلے خود ایک تعارف پیش کرتے ہیں۔ کرداروں کو کسی خاص مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں ورنہ بت بنے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر بھی اُنھوں نے ڈراما میں فصاحت، بلاغت، شیرینی اور نطافت کا دریا بہایا ہے

مثال کے طور پر جب مینا بازار میں جہاں گیر کی پرکشش نگاہیں اچانک ایک ایسی الہڑ دوشیزہ پر پڑتی ہیں جس نے جوانی کی سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھا ہے اس کی ذات میں وہ سارے محاسن موجود ہیں جن کا ہونا اس کی شخصیت کو محبوب اور پرکشش بنانے کے لئے ضروری تھا۔ وہ عورت کا دلکش روپ ہے سراسر حسن، تمام تر نرمی۔ ہمہ تن عشق اور بے انتہا معصوم۔ وہ تنہا گلاب کا پھول لئے چلی آرہی ہے۔ جہانگیر اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔

جہانگیر:۔ بی لڑکی۔ ذرا ہمارے کبوتر لینا۔ ہم یہ پھول توڑلیں

لڑکی:۔ بہت خوب

جہانگیر:۔ بی لڑکی۔ لایئے میرے کبوتر

لڑکی:۔ حاضر ہے۔

جہانگیر:۔ ہیں۔ ایک کیا ہوا؟

لڑکی:۔ صاحب عالم میں کیا کروں۔ وہ تو اُڑ گیا۔

جہانگیر: ہیں۔ کیوں کر اُڑ گیا۔

لڑکی:۔ صاحب عالم۔ یوں اُڑ گیا (پھر سے دوسری بھی اُڑا دیا)

دوسری جگہ کے مکالمہ کا سین ملاحظہ ہوں:۔ جہانگیر— بی لڑکی۔ تمہارا کیا نام ہے؟

لڑکی— مہرالنساء:۔ جہانگیر— نہیں تم خورشید عالم ہو۔ وہ کون سی مشرق ہے جہاں سے یہ سورج کی کرن نکلی۔

جہانگیر— تم کس کی بیٹی ہو۔

مہرالنسار— ابوالحسن جو حضور کا ناظم بیوتات ہے۔ لونڈی اسی کی بیٹی ہے۔

جہانگیر:۔ نہیں نہیں۔ تم جسے چاہو لونڈی بنالو۔ جسے چاہو غلام بنالو۔

مہرالنسار— حضور کی باتیں میرے سمجھ میں نہیں آتیں۔

جہانگیر:۔ میرے اوسان ٹھکانے نہیں۔ اس کرنے ہے طالع

جو تمہارا غلام ہو۔

مندرجہ بالا مکالموں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آزاد مکالمہ نگاری کے فن کے برتنے میں بہت حد تک کامیاب ہیں

خود کلامی Soliloquy: دل پر گذر کرنے والے حادثات سانحات اور تلاطم کو پیش کرنے کے لئے خود کلامی پائی جاتی ہے۔ خود کلامی کے اتار چڑھاؤ سے باطن میں اٹھنے والی طوفانی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آزاد نے ڈرامہ اکبر میں خود کلامی سے کام لیا ہے جس سے کرداروں کی باطنی نفسیات اور ہیجانات کا پتہ چلتا ہے ڈرامہ اکبر کے کرداروں میں کونسا تلاطم برپا ہے اس کا اندازہ خود کلامی سے ہوتا ہے مثال کے طور پر جہانگیر جو مہرالنساء پر پہلی ملاقات میں فریفتہ ہو چکا ہے اور اس کے حسن کے جادو نے اسے مسحور کر دیا ہے مہرالنساء کو کبوتر پکڑنے دیتا ہے۔ کبوتر اتفاق سے اڑ جاتا ہے۔ جہانگیر اس ادا پر خوش ہوتا ہے اور دل میں کہتا ہے۔

"کبوتر گئے تو بلا سے بات کرنے کو بہانا تو ہاتھ آیا۔ کیا بات کروں میں تو خود بھولا جاتا ہوں۔" دوسری جگہ جہانگیر خود کلام اس وقت ہوتا ہے جب جہانگیر مہرالنساء کے حسن و جمال کی تعریف میں اسے مہرالنساء کی جگہ خورشید عالم کہتا ہے لڑکی چونک پڑتی ہے اس وقت جہانگیر دل میں کہتا ہے "ہائے ابھی لڑکی البیلی ہے لڑکیوں میں بھی نہیں کھیلی ہے۔"

واقعہ طرازی:- ڈراما میں واقعات بیانیہ انداز میں نہیں بلکہ اسٹیج پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اس میں مناظر کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعہ اہم واقعات رونما کئے جائیں۔ واقعات کی پیش کش کرداروں کے مکالموں کے ذریعہ بھی ہوتی ہے اور بیانیہ انداز سے بھی۔ لیکن بیانیہ انداز ڈراما کے لئے مناسب نہیں اس سے ڈرامائیت ختم ہو جاتی ہے اور واقعات تاریخی حیثیت سے بے کیف و خام ہوتے ہیں۔ یہ انداز افسانہ اور ناول میں کامیاب تو کہا جا سکتا لیکن ڈراما کے لئے سم قاتل سے کم نہیں کیوں کہ بقول لطف الرحمان "drama is the story action not by narrative not by narration" ڈرامے میں ایسے واقعات کی کثرت لازمی ہے جو تصادم کو آگے بڑھانے میں مدد و معاون ثابت ہوں لیکن مرکزیت مجروح نہ ہونے پائے۔ اس لئے لازم ہے کہ واقعات اور کرداروں کے درمیان ہم آہنگی ہو۔ آزاد واقعات کی آرائش و زیبائش میں زیادہ تر بیانیہ انداز سے کام لیتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی واقعہ کو اتنا طول کر دیتے ہیں۔ اس کی ڈرامائی روح مفقود ہو جاتی ہے اور قاری ایسا محسوس کرتا ہے کہ ڈراما نگار ڈراما نہیں بلکہ تاریخ لکھ رہا ہے ظاہر ہے کہ یہ انداز ناول اور افسانے میں کسی قدر کامیاب کہا جا سکتا ہے لیکن ڈراما میں قطعی غیر مناسب ہے۔ آزاد کی گرفت یہاں ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور وہ تاریخ نویسی کی طرف زیادہ مائل ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر مہرالنساء کا ملکہ سے مینا بازار میں جہانگیر کی نازیبا حرکت کا اظہار کرنا ملکہ سے نورجہاں کی ماں کا ملنا اور شہزادہ کے چھیڑ چھاڑ کا ذکر کرنا۔ علی قلی کا بنگال جانا۔ علی قلی کا دوبارہ دربار میں آنا۔ زنانی بنس محل کی ڈیوڑھی میں رکھا جانا۔ یہ سارا کچھ آزاد قلم سے نمایاں ہوتا ہے نہ اس میں کردار عمل حصہ لیتے ہیں اور نہ کوئی situation create کیا جاتا ہے

کردار نگاری:- قصہ کی کوئی صنف ہو کردار نگاری ایک لازمی جزو ہے۔ ڈراما چوں کہ کسی کہانی سے وابستہ ہوتا ہے اس میں کسی نہ کسی مرکزی واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے اس لئے اس واقعہ کو دلچسپ اور جاندار

بنانے کے لئے کردار کی تخلیق کی جاتی ہے سامعین اور قارئین کے ذہن پر مذکورہ کہانی کا اثر اس وقت پڑتا ہے جب کردار اپنے کمالات اور جوہروں کو پیش کرتے ہیں ڈرامہ اکبر انتخاب کردار۔ کردار کی داخلی اور خارجی پیش کش ارتقائے کردار اور واقعات کی ہم آہنگی کے اعتبار سے اس حد تک کامیاب نہیں کہا جاسکتا جس حد تک انارکلی کامیاب ہے تاہم چند ایسے بھی کردار ہیں جو حسن کارانہ تاثیر کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مہرالنسار اور جہانگیر جو مرکزی کردار ہیں اپنے کردار و گفتار کی وجہ سے ڈراما میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اگر مہرنسا کے کردار میں جابجا تضاد ہے ایک جگہ وہ بے انتہا معصوم اور باوفا بیوی کے روپ میں نظر آتی ہے اور شیر افگن کی محبت میں اسقدر دھت ہے کہ وہ کسی بھی طرح اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی لیکن قسمت نے اسے شیر افگن کے دامن محبت کے سائے میں رہنے نہیں دیا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جُدا کر دی گئی۔ اس وقت اسے اپنے شوہر کی جُدائی کا بے انتہا غم ہوا لیکن جیوں ہی جہانگیر کے بار بار ار پر نکاح کرتی ہے تیوں ہی وہ اس طرح جہانگیر سے والہانہ محبت کرنے لگتی ہے کہ وہ شیر افگن کی وفاشعاری قربانی اور خلوص کو بالکل بھلا دیتی ہے آزاد فرماتے ہیں —" کوئی شک نہیں کہ نور جہاں حسن و جمال سے لیاقت اور عقل میں یکتا تھی اس نے شہنشاہ کے دل پر اپنا سکہ بٹھا لیا۔ اور وہ سلطنت کا انتظام کیا کہ سب نے مرحبا کہا۔ اس نے دربار کے ڈھنگ کو بدلا اور اس سلیقہ سے بدلا کہ ایران تک دھوم مچ گئی۔"

مہرالنسار ایک باغی سپاہی کی بیوی بچوں والی ہے۔ اس میں آخر کون سے پھول لگتے تھے جس کے بغیر بادشاہ کو چین نہیں تھا چاہیئے تو یہ تھا کہ باغی کی بیوی اور بچے کو قطب الدین[1] کے قتل کی وجہ سے سزا کے طور پر تہہ تیغ کروا دیتا نہ گھر بار کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ شہر بدر کر دیتا اور اگر طبیعت ایسی ہی رحیم و کریم تھی تو بھول گئے ہوتے لیکن برسوں بے چینی کے ساتھ شب فراق میں کروٹیں بدل کر اور ان کے آرام و چین کو بھلا کر دیدار محبوب کی تمنا کرتے رہے اور آخر کار بازی جیت گئے۔ یہ سارا کچھ جہانگیر کی والہانہ محبت اور مہرالنسار کے کنج حسن میں ہمیشہ اس پر رہنے کی خواہش کا نتیجہ تھا مہرالنسار کو بادشاہ سے والہانہ محبت نہیں ہے اور شیر افگن کی موت کے بعد جہانگیر سے بدگمان بھی ہے بلکہ بے باک ہو کر اس وقت بادشاہ کے خلاف لب کشا ہے جب بادشاہ وقت کی مرضی سے سرمو انحراف کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا وہ بادشاہ کی منت و سماجت اور پیغام کو بار ہا ٹھکراتی ہے فطرت کا تقاضہ غم و غصہ ہے جس کا اظہار لب اوقات مہرالنسار کرتی ہے مگر مجبوری اور وقت گذرنا بھی کوئی اثر رکھتا ہے اس پر غضب یہ کہ خود مختار بادشاہ نیچے اور اوپر خدا گویا مہرالنسار ایک ایسے قفس میں اسیر ہے جہاں اسے سانس بھی لینا ہے تو آہستہ اور آہ بھی کرنا ہے تو مسکراہٹ کے ساتھ۔ اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ تاج بن کر شاہ کا ایوان شاہی میں نہ صرف یہ کہ رہتی ہے بلکہ امور سلطنت میں اس قدر حصہ لیتی ہے کہ مغلیہ سلطنت کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

جہانگیر اس ڈرامہ کا دوسرا مرکزی کردار ہے یہ ڈرامہ کا ہیرو ہے اس کی ذات میں شعریت اور مردانگی کے ساتھ گھل مل گئی ہے اس کے نقوش تیکھے اور مزاج وارفتہ ہے وہ

---

[1] قطب الدین

بے حد جذباتی شہزادے کے روپ میں سامنے آتا ہے اور ایک بہادر دوشیزہ کے دام اُلفت میں گرفتار ہو کر اسے حاصل کرنے کی تاک میں اس وقت تک ایک شاعر جواری کی طرح لگا رہتا ہے جب تک مہرالنساء اس کے دل کی ملکہ اور سلطنت مغلیہ کی حکمراں نہیں بنجاتی ہے لیکن اس عزم کے سلسلے میں انھوں نے جو اقدامات کئے ہیں وہ فعال اور متحرک نہیں کہے جاسکتے۔ ہاں اس ڈراما میں سب سے زیادہ فعال کردار علی قلی کا ہے جسے جہانگیر، شیر افگن کا خطاب مرحمت فرماتا ہے۔ اسے اپنی عزت اور بے وفا بیوی عزیز ہے اس کی حمیت کسی طرح یہ گوارا نہیں کرتی کہ اس کے دل کی ملکہ بادشاہ کے محل کی زینت بن جائے اور بادشاہ کی خوشنگوار ہو جائے اس لئے وہ قطب الدین کا باتوں پر بپھر جاتا ہے اور اسے قتل کر دیتا ہے لیکن زمانہ اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑ سکتا بادشاہی حکومت کبھی اسے جینے نہیں دے سکتی تھی اس لئے اسے بھی موت کی گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ آج بھی ان دونوں کا مزار بردوان میں موجود ہے جس پر ایک کتبہ ہے اور قاتل و مقتول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بہر حال ان باتوں سے قطع نظر علی قلی کا کردار جاندار ہے اس میں زندگی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ضمنی کردار ہیں جو تصویر کے رنگوں کو اُبھارنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں مثلاً قطب الدین اکبر۔ راجا مان سنگھ۔ بیگم وغیرہ۔ ان کی تخلیق میں فنکار نے بڑی چابکدستی اور فنکارانہ حسن کا ثبوت دیا ہے۔

تصادم :- ڈراما میں تصادم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے لیکن ڈراما کی کامیابی کا انحصار ڈرامائی تصادم پر ہے خاص طور پر تصادم دو میلانات خیالات۔ نظریات۔ نیکی اور بدی۔ انسان اور تقدیر، فرد اور سماج اور تہذیب و تمدن کے درمیان ہوتا ہے۔ ڈراما میں شدت کو پہلے کے مقابلہ میں زیادہ نمایاں اور اثر انگیز کرنے کے لئے ڈرامائی تصادم سے اس طور پر کام لیا جاتا ہے کہ یہ ابتدا میں نارمل ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے عروج تک پہونچتا ہے جہاں تصادم پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ شدت پیدا ہوتی ہے اور پھر وہاں سے رفتہ رفتہ اُتار کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنا پڑتی ہے کہ ڈرامائی تصادم بہت فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ نیچے اتارا جائے تاکہ تصادم کا عنصر آخری لمحہ تک برقرار رہے۔ تصادم کے ساتھ کشمکش (Mamakie tension) کا ہونا بھی ضروری ہے جب تک تصادم ہو نا کشمکش جاری رہے گی ڈرامہ اکبر میں آزاد نے ڈرامائی تصادم کا خیال رکھا ہے اس ڈرامہ میں کئی جگہوں پر تصادم پایا جاتا ہے مثلاً جہانگیر اور شیر افگن کے درمیان۔ بیگم اور مہرالنساء کے درمیان ــ قطب الدین اور شیر افگن کے درمیان، نظریات و خیالات کے درمیان، نیکی اور بدی کے درمیان وغیرہ،، سارے ڈرامائی تصادم رفتہ رفتہ ×× سنک کی طرف بڑھتے ہیں اور پھر وہاں سے احتیاط کے ساتھ منتہا کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس ڈرامائی تصادم کے پیش کرنے میں آزاد نے بڑی فنی چابکدستی کا ثبوت دیا ہے انھوں نے توازن و اعتدال اور فن کا بھرپور خیال رکھا ہے۔

آزاد نے اس ڈراما میں کسی حد تک تصور زماں کا خیال رکھا ہے۔ مہرالنساء (نورجہاں) اور جہانگیر کے عشق کا واقعہ جس ماحول اور فضا میں پیش کیا گیا ہے وہ اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ حسب حال ہے اکبر کا ایک درباری ماحول ہے جہاں چند افراد دربار سے منسلک نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات وہی ہیں جنھیں ہم نورتن کے ساتھ پکار سکتے ہیں جہانگیر اکبر کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا وارث ہے اور پھر اس کی

خسرو سرمست اندر ساغرِ معنی ریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

حضرت امیر خسروؒ کے "سات سو سالہ جشن" کے موقع پر ادارہ فروغ اردو نے طے کیا ہے کہ وہ امسال اس عظیم المرتبت شاعر "طوطیٔ ہند امیر خسرو" کا خاص نمبر قارئین فروغ اردو کی خدمت میں پیش کرے۔ جو اُن کی شاعری، نثر نگاری، تصوف، علم موسیقی اور دیگر گوناگوں خصوصیات کا حامل ہو، اور اُس کی ترتیب کی خدمت

ڈاکٹر سیّد نغیب حسین صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

کے سپرد کی گئی ہے۔ جملہ ہندوستان اور بیرون ہند کے نمائندہ۔ ادیبوں۔ شعراء اور فن کاروں سے درخواست ہے کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم شاعر کی خدمت میں اپنا اظہارِ عقیدت پیش کریں۔

شمس علوی

خسرو سرمست اندر ساغر معنی ریخت
شیرہ از خمخانہ مستی کہ در شیراز بود

حضرت امیر خسروؒ کے "سات سو سالہ جشن" کے موقع پر ادارہ فروغ اردو ہند نے طے کیا ہے کہ وہ امسال اس عظیم المرتبت شاعر "طوطی ہند امیر خسرو" کا خاص نمبر قارئین فروغ اردو کی خدمت میں پیش کرے۔ جو اُن کی شاعری، نثر نگاری، تصوف، علم موسیقی اور دیگر گوناگوں خصوصیات کا حامل ہو، اور اُس کی ترتیب کی خدمت

ڈاکٹر سید نزیب حسین صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

کے سپرد کی گئی ہے۔ جملہ ہندوستان اور بیرون ہند کے نمایندہ ادیبوں۔ شعراء اور فنکاروں سے درخواست ہے کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم شاعر کی خدمت میں اپنا اظہار عقیدت پیش کریں۔

ملتمس علوی

مطبوعات ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت)

۱۔ ایکتا کا چمن۔ تہواروں کے پھول۔ قمر بھوانی ۳/-
۲۔ احتشام حسین نمبر (فروغ اُردو) سید انصار حسین بابلی ۲۵/-
۳۔ اُردو کا ماضی۔ حال اور مستقبل۔ احمد ابراہیم علوی ۲/-
۴۔ آئینہ نظم اُردو قمر بھوانی ۲/-
۵۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی روپ نرائن شیو پوری ساگر ۱/-
۶۔ اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۵/-
۷۔ اُردو میر نمبر فروغ اُردو اقبال صدیقی ۳/۵۰
۸۔ انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۵/-
۹۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۵/-
۱۰۔ آئینہ عقل پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری ۴/۵۰
۱۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۱۲۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۳/۵۰
۱۳۔ انارکلی امتیاز علی تاج جدید ایڈیشن ۲/۵۰
۱۴۔ امراؤ جان آدا مرزا رسوا ۵/۵۰
۱۵۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ پروفیسر کلیم الدین احمد ۸/-
۱۶۔ اُردو میں تنقید ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۱۷۔ انتخاب قصائد اُردو۔ مغیث الدین فریدی ۱/۵۰
۱۸۔ ادب اور نظریہ آل احمد سرور ۶/-
۱۹۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور ۵/۵۰
۲۰۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین احمد ندوی ۷/۵۰
۲۱۔ انتخاب جدید نثر اُردو سید احتشام حسن ۴/-
۲۲۔ اقبال مرتبہ فروغ اُردو ۰/۵۰
۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ عبدالماجد دریابادی ۶/۵۰
۲۴۔ البرامکہ اور اُن کا عروج و زوال ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے ۳/-
۲۵۔ انتخاب کلام غالب بشیر احمد علوی ۱/۵۰
۲۶۔ ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ۶/۵۰
۲۷۔ انتخاب قصائد و غزلیات فروغ اُردو ۵/-
۲۸۔ ادب کیا ہے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۳/-
۲۹۔ ادبی خطوط غالب۔ مرزا محمد عسکری ۶/۵۰
۳۰۔ آئینہ نثر اُردو سعادت علی صدیقی ۴/۵۰
۳۱۔ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/۵۰
۳۲۔ ابوالعُمر مجنوں گورکھپوری۔ ۰/۳۷
۳۳۔ اُردو کی کہانی سید احتشام حسین ۲/۵۰
۳۴۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر ۵/۷۵
۳۵۔ ابوالکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد ۰/۲۵
۳۶۔ ارمغان نثر و نظم عبدالاحد خان خلیل ۳/۷۵
۳۷۔ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۱/۵۰
۳۸۔ اچھی نظمیں اخگر مشتاق ۰/۶۰
۳۹۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید ایڈیشن غلام احمد فرقت ۲۰/-
۴۰۔ اُردو شاعری امیر احمد علوی ۱/۵۰
۴۱۔ غزلیات حافظ صائب غالب فارسی ۲/۵۰
۴۲۔ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ ۱/۵۰
۴۳۔ اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنیوالی کتاب اعجاز احمد فاروقی ۱/۲۵
۴۴۔ اللہ کے پیارے امیر حسن نورانی ۰/۵۰
۴۵۔ اسپین کی شہزادی صادق سردھنوی ۴/۵۰
۴۶۔ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۱/۵۰
۴۷۔ اپنی سوچ میں آوارہ ۲/۵۰
۴۸۔ انوار جدید خط و کتابت خلیق احمد علوی ۰/۴۵
۴۹۔ ایک جان تین قالب خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۵۰. اُلفت — خان محبوب طرزی — ۵/۵۰
۵۱. آغازِ سحر — ” — ۴/-
۵۲. امین آباد — ” — ۴/-
۵۳. انشائے خطوط نویسی. حصہ اوّل — بشیر احمد علوی — ۳۵/-
۵۴. اچھی کہانیاں — ” — شمس الدین نوری — ۰/۵۰
۵۵. انشائے خطوط نویسی — حصہ دوم — ۰/۷۵
۵۶. ایجادوں کی باتیں — مصطفیٰ حسن رضوی — ۳/-
۵۷. اچھی کہانیاں — حصہ اول — شمس الدین نوری — ۰/۵۰
۵۸. ” — حصہ دوم — ” — ۰/۵۵
۵۹. ” — حصہ چہارم — ” — ۰/۶۵
۶۰. ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/۵۰
۶۱. اسلامی نظمیں — محمد حسین علوی شمس — ۰/۴۵
۶۲. اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں — عبدالماجد دریابادی — ۳/-
۶۳. اوراقِ گل — اظہر مشتاق — ۱/-

(ب)

۶۴. بابائے اُردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی — ۶/-
۶۵. بستانِ حرم۔ (جدید نعتیہ کلام) — زائرِ حرم حمید صدیقی — ۳/-
۶۶. شہید محبت بوٹا سنگھ۔ — خان محبوب طرزی — ۴/-
۶۷. بزمِ بے تکلف۔ — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴/۵۰
۶۸. بکٹ کہانی۔ — ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۴/۵۰
۶۹. بہادر شاہ ظفر۔ — امیر احمد علوی کاکوروی — ۵/۵۰
۷۰. بہشتی ثمر۔ (حصہ اول دوم) خلاصہ بہشتی زیور — مولانا تھانوی — ۳/۸۰
۷۱. بانیِ اسلام۔ — علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اُردو ترجمہ — ۰/۷۵
۷۲. بشریتِ انبیاء — عبدالماجد دریابادی — ۳/-

(پ)

۷۳. پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۲/۵۰
۷۴. پیاری باتیں — محسن کاکوروی — ۰/۴۰
۷۵. پھولوں کا انبار (ناول) — منظر سلیم — ۴/۷۵
۷۶. پپیہ اور پرچھائیں — مجموعہ ڈرامہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/-
۷۷. پاگل خانہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۳/۲۵
۷۸. پیغام — ” — طاہر دیال پوری — ۴/-
۷۹. پنجاب میں اُردو — حافظ محمود شیرانی — ۶/۵۰
۸۰. پردیسی کے خطوط — حصہ اول — مجنوں گورکھپوری — ۴/۵۰

(ت)

۸۱. مختصر تاریخ ادبِ اُردو (فروغ اُردو ایڈیشن) — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۱۲/-
۸۲. تصویر درد معہ تشریحات و ترجمہ — فرید احمد علوی — ۱/-
۸۳. تحریریں مجموعہ مضامین۔ — ڈاکٹر گیان چند — ۵/۵۰
۸۴. تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یاسین — ۳/-
۸۵. تنقیدی تجزیے — کاظم علی خاں — ۴/۵۰
۸۶. تعارف تاریخ اُردو — جدید ایڈیشن — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۵/-
۸۷. تاجدارِ مدینہ — اقبال صدیقی — ۰/۴۰
۸۸. تنقیدی اصول اور نظریے — حامد اللہ افسر — ۵/۵۰
۸۹. تنقید و تحلیل — شبیہ الحسن نونہروی — ۴/۵۰
۹۰. تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) — سید احتشام حسین — ۶/-
۹۱. تنقیدی نظریات — جلد اول — ” — ۸/-
۹۲. ” — ” — جلد دوم — ” — ۸/-
۹۳. تنقید اور عملی تنقید — ” — ۶/۵۰
۹۴. تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) — آل احمد سرور — ۵/-
۹۵. ترانہائے خیام — ڈاکٹر رضیب حسین — ۲/۵۰
۹۶. تعلیمات اسلامی — مکمل چار حصص — محمد حسین شمس — ۲/۹۰

(ٹ)

۹۷۔ ٹیگور — نادم سیتاپوری — ۳/-
۹۸۔ ٹھیکرے کی مانگ — صدیقہ بیگم سیوہاری — ۲/-

(ث)

۹۹۔ ثنائے حبیب و نعتیہ کلام — بہزاد لکھنوی — ۲/۲۵

(ج)

۱۰۰۔ جانِ غالب — محمد حسین شمس علوی — ۲/-
۱۰۱۔ جائزے — انور سیوانی — ۳/-
۱۰۲۔ جواہراتِ اسمٰعیل — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰
۱۰۳۔ جنگ آزادی نمبر ا (۱۸۵۷ء) — فروغ اُردو — ۳/-
۱۰۴۔ " نمبر ۲ — " — ۳/-
۱۰۵۔ جوئے رواں۔ مجموعہ کلام۔ — حامد اللہ افسر — ۳/۵۰
۱۰۶۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اخر بلگرامی — ۳/۵۰
۱۰۷۔ جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین — ۲/۵۰
۱۰۸۔ جلوے — معین الدین دردائی — ۱/۷۵
۱۰۹۔ جمیلہ بوا ٹری (ناول) خان محبوب طرزی — ۴/۵۰
۱۱۰۔ جگر نمبر اول — سید احتشام حسین — ۸/-

(چ)

۱۱۱۔ چوتھی بہن۔ مجموعہ افسانہ۔ مسیح الحسن رضوی — ۲/۷۵

(ح)

۱۱۲۔ حیاتِ فضل الحق — خیرآبادی — ۱/۲۵
۱۱۳۔ حالی بحیثیت شاعر (جدید ایڈیشن معہ اضافہ) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱۵/-
۱۱۴۔ حسرت موہانی — عبدالشکور — ۵/۵۰
۱۱۵۔ حجاج بن یوسف — جرجی زیدان — ۴/۵۰
۱۱۶۔ حکیم نباتات — وزیر خاں لنگراں — ۲/-
۱۱۷۔ حبیبہ غالب — سعادت علی صدیقی — ۲/۵۰

(خ)

۱۱۸۔ خلاصہ شریف زادہ — مرزا رسوا — ۱/۲۵
۱۱۹۔ خطباتِ ماجدی یا سیرت نبوی — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰
۱۲۰۔ خضرِ راہ معہ ترجمہ — علامہ اقبال — ۱/-
۱۲۱۔ خلاصہ روحِ تنقید — ۱/-
۱۲۲۔ خلاصہ جواہر العروض — ۱/-
۱۲۳۔ خبطی (مزاحیہ) محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی — ۱/۵۰
۱۲۴۔ خوش بختی کی تلاش میں — احسن الظفر بی۔ اے — ۳/-
۱۲۵۔ خلاصہ شعرالہند حصہ دوم — ۱/-
۱۲۶۔ خلاصہ المیزان — -/۷۵

(د)

۱۲۷۔ دلچسپ کہانیاں — مسعود عالم — ۴/-
۱۲۸۔ دیوان فغانی — ۱/۵۰
۱۲۹۔ داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی) عبدالاحد خاں خلیل — ۳/۵۰
۱۳۰۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۵۰
۱۳۱۔ دستہ گل — شبلی نعمانی — -/۴
۱۳۲۔ دوشیزہ قاف ناول — خان محبوب طرزی — ۵/-
۱۳۳۔ دلربا — ۳/-
۱۳۴۔ دلی کا دبستان شاعری معہ اضافہ جدید ایڈیشن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۱۵/-
۱۳۵۔ دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — ۳/۵۰

(ڈ)

۱۳۶۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر انوار الحسن — ۴/۰

(ذ)

۱۳۷۔ ذوق و جستجو۔ — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۱۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۳۸۔	ذوق ادب و شعور۔	پروفیسر احمد حسین	۵/۵۰
۱۳۹۔	ذوق جنون۔ مجموعہ کلام۔	آل احمد سرور	۶/۵۰

(ر)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۴۰۔	روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	۷/-
۱۴۱۔	رباعیات غالب فارسی مع اُردو ترجمہ	سید امیر حسن نورانی	۴/-
۱۴۲۔	رہبر مضمون نویسی	شفاعت علی صدیقی	۲/۵۰
۱۴۳۔	راکھی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/-
۱۴۴۔	رخسار سحر ناول	انور کریم قدوائی	۱/۵۰
۱۴۵۔	رفتار سحر	"	۳/۵۰
۱۴۶۔	رموز حکمت مع مقدمہ اُردو	محمد شریف	۳/۵۰
۱۴۷۔	ریاض فارسی	منتخب کلام فارسی	۴/-

(ز)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۴۸۔	زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ)	مولانا تھانوی	-/۵۰
۱۴۹۔	زیتیوں کا بادشاہ، حکیم بابا مزاحیہ ناول	سید علی عباس حسینی	۳/-

(س)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۵۰۔	سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	۴/-
۱۵۱	سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۴/-
۱۵۲۔	سرور جہاں آبادی	ڈاکٹر حکیم چند نیر	۸/-
۱۵۳۔	سرود نو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	۳/۵۰
۱۵۴۔	سنگ گہر	سید احتشام حسین	۴/-
۱۵۵۔	سر سید داحمد پاشا یا کوہ قاف کی پری	سید علی عباس حسینی	۱/۵۰
۱۵۶۔	سرمایہ زبان اُردو	جلال لکھنؤ	۵/۵۰
۱۵۷۔	سفر (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/-
۱۵۸۔	سیاحت زمین ناول	محمود اعظم فہمی	۱/۵۰
۱۵۹۔	ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۳/۵۰
۱۶۰۔	سنہرا حلقہ		-/۷۵
۱۶۱۔	سر سید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	-/۴۰
۱۶۲۔	سوشل اسٹڈی	احمد حسن کاکوروی	۱/۷۵
۱۶۳۔	ساز دل	ذکی کاکوروی	۲/۵۰

(ش)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۶۴۔	شعر و نو تنقیدی مجموعہ	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۵۰
۱۶۵۔	شرح دیوان غالب (مراثیہ)	غلام احمد فرقت	۸/۵۰
۱۶۶۔	شرح سنگ گہر	عبدالقوی دریابادی	۲/۵۰
۱۶۷۔	شاہ غمگین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۱۶۸۔	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۱۶۹۔	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۴/-
۱۷۰۔	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۱۔	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	-/۴۰
۱۷۲۔	شرح دیوان غالب جدید ایڈیشن	نظم طباطبائی	۷/-
۱۷۳۔	شہری اور سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	-/۷۰
۱۷۴۔	"	"	-/۸۵
۱۷۵۔	"	"	-/۹۰
۱۷۶۔	"	"	۱/۹۰
۱۷۷۔	شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ	امیر احمد علوی	۳/۵۰
۱۷۸۔	شعر العجم۔ حصہ اول، دوم۔ سوم۔ چہارم۔ پنجم	شبلی نعمانی	۴۴/-
۱۷۹۔	شرح نثر امروز ایران	احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۸۰۔	"	"	۳/۵۰
۱۸۱۔	شمع و شاعر	علامہ اقبال	-/۵۰
۱۸۲۔	شرح حکیم نباتات وزیر خاں	تنویر مسعود	۱/۲۵
۱۸۳۔	شرح انتخاب قصائد و غزلیات مطابق نصاب بی اے		۷/-
۱۸۴۔	شرح شعرستان حصہ اول	ڈاکٹر انوار الحسن	۳/-
۱۸۵۔	شرح ترانہائے خیام	حکیم عبدالقوی	۲/-

۱۸۶۔ شرح نصاب فارسی ۵/-
۱۸۷۔ شرح شعر و داستان دوم احسن الظفر ۳/-
۱۸۸۔ شرح گلہائے ادب ۳/-
۱۸۹۔ شرح آئینہ نظم اُردو ۳/-
۱۹۰۔ شرح نثر فارسی امروزہ ۳/-
۱۹۱۔ شرح آئینہ نثر اُردو خلیل قدوائی ۳/۵۰
۱۹۱۔ شرح غنچۂ گل ۴/۵۰
۱۹۲۔ شرح شعر فارسی احسن الظفر ۳/-
۱۹۳۔ شرح ہماری زبان اُردو درجہ ۶ خلیل قدوائی ۱/۵۰

(ص)

۱۹۴۔ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۴/۵۰
۱۹۵۔ صحیفۂ محبت۔ مہدی افادی کے خطوط ڈاکٹر محمود الٰہی ۵/۵۰

(ط)

۱۹۶۔ طنزی نمبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اُردو ۲/-
۱۹۷۔ طالبعلم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے غلام الثقلین ۲/۴۰
۱۹۸۔ طلسم اسرار۔ (ڈراما) مرزا رسوا لکھنوی ۱/۵۰

(ع)

۱۹۹۔ عذرا ناول صالحہ عابد حسین ۶/-
۲۰۰۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) سید احتشام حسین ۵/۵۰
۲۰۱۔ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینہ میں اخلاق حسین عارف ۳/۵۰

(غ)

۲۰۲۔ غالب نام آور نادم سیتاپوری ۵/۵۰
۲۰۳۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر سید احتشام نورانی ۶/-
۲۰۴۔ غالب کی تخلیقی تخیل شہید صفی پوری ۸/-
۲۰۵۔ غنچہ و گل سید محمود الحسن لکھنوی ۴/۵۰
۲۰۶۔ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر نادم سیتاپوری ۵/۵۰
۲۰۷۔ غزلی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۲۰۸۔ غزلیات نظیری ۱/۵۰
۲۰۹۔ غزل انسائیکلوپیڈیا جدید ایڈیشن ذکی کاکوروی ۲۵/-

(ف)

۲۱۰۔ فروغی (لغت) طاہر محسن علوی ۴/۵۰
۲۱۱۔ فن خطابت یعنی استاد تقریر کلب مصطفیٰ ایڈووکیٹ ۱۲/-
۲۱۲۔ فریدہ خان محبوب طرزی ۱/-
۲۱۳۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادم سیتاپوری ۵/۵۰
۲۱۴۔ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۴/۵۰
۲۱۵۔ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰
۲۱۶۔ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۳/۵۰
۲۱۷۔ فغان محسن محسن کاکوروی -/۴۰
۲۱۸۔ فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/-
۲۱۹۔ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۶/۵۰

(ق)

۲۲۰۔ قد میچے۔ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں۔ غلام احمد فرقت ۵/-
۲۲۱۔ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰
۲۲۲۔ قصائد مومن۔ مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۵/۵۰
۲۲۳۔ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۷/-
۲۲۴۔ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۳/-
۲۲۵۔ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/-
۲۲۶۔ قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر ۲/۱۵
۲۲۷۔ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۱/-

(ک)

۲۲۸۔ کلیات اقبال علامہ اقبال ۹/-
۲۲۹۔ کبیر اور کابی بدرالدین طیب جی ۱/-
۲۳۰۔ کف گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۱/۵۰

(گ)

۲۳۱۔ گاندھی نمبر ۱/-

۲۳۲۔ گلدستۂ فارسی اول دوم — ۱/۹۰
۲۳۳۔ گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدید — ۰/۸۰
۲۳۴۔ گلہائے ادب — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/-
۲۳۵۔ گاندھی جی کے ساتھ — حامد اللہ افسر — ۱/۵۰

(ل)

۲۳۶۔ لوائح جامی مع مقدمہ — عبدالاحد خاں خلیل — ۱/۵۰
۲۳۷۔ لال قلعہ — مائل ملیح آبادی — ۴/-
۲۳۸۔ لبِ بام — عادل رشید — ۴/-
۲۳۹۔ لسانیات اور اردو — سید محمود الحسن رضوی — ۲/۵۰

(م)

۲۴۰۔ مرقع اقبال — عصمت فاطمہ علویہ — ۱۲/-
۲۴۱۔ مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو — غلام احمد فرقت — ۸/۵۰
۲۴۲۔ محسن کاکوروی نمبر — ۳/-
۲۴۳۔ مسلمان اور کانگریس — ابوالکلام آزاد — ۳/۵۰
۲۴۴۔ مرثیہ نگاری اور میرانیس — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۲/۵۰
۲۴۵۔ مضامین فرحت حصہ اول — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۲/۵۰
۲۴۶۔ مضامین فرحت حصہ دوم — " — ۲/۵۰
۲۴۷۔ ماضی کی کہانیاں — آفتاب اختر تلہری — ۳/-
۲۴۸۔ میرے اسٹیج ڈرامے — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/۵۰
۲۴۹۔ موسم گل ناول — عادل رشید — ۷/-
۲۵۰۔ مجبور " — خان محبوب طرزی — ۲/۵۰
۲۵۱۔ مضامین جدیدہ — محمد ہادی — ۱/۲۵
۲۵۲۔ مثنوی سحر حلال فارسی مع مقدمہ — قدرت اللہ بیگ — ۲/۵۰
۲۵۳۔ مطالعہ — ذکی کاکوروی — ۵/-
۲۵۴۔ مولوی نذیر احمد کی کہانیاں — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۲۵
۲۵۵۔ معرکۂ مردم دیوانان — صادق سردھنوی — ۴/-
۲۵۶۔ مثنویات حالی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۳/۵۰
۲۵۷۔ مطالعۂ حالی — " — ۵/۵۰
۲۵۸۔ میٹھے بول — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۶۰
۲۵۹۔ معصوم سی چاند — خان محبوب طرزی — ۲/-
۲۶۰۔ مقدمۂ شعر و شاعری مطابق نصاب بی اے۔ حالی — ۱/۵۰
۲۶۱۔ مرثیہ غالب — حالی — ۰/۲۵
۲۶۲۔ مجموعۂ کربلا — جرجی زیدان — ۳/۵۰
۲۶۳۔ معمار — مائل ملیح آبادی — ۲/۵۰
۲۶۴۔ مولانا حالی — انوار الحسن صدیقی — ۴/-
۲۶۵۔ انتخاب فسانۂ آزاد — سرشار لکھنوی
۲۶۷۔ مہاراج بلی — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۲/۵۰
۲۶۸۔ مسٹر ملاک نوک جھونک — خواجہ عزیز الحسن مجذوب — ۰/۷۵
۲۶۹۔ مجذوب اور ان کا کلام — مولانا رضا انصاری — ۱/۵۰
۲۷۰۔ مصباح بلاغت مع مقدمہ اردو — محمد شریف — ۳/-
۲۷۱۔ مطالعۂ سودا — ڈاکٹر محمد حسن — ۲/-
۲۷۲۔ مقدمات و مقالات — عبدالاحد خاں — ۵/۵۰
۲۷۳۔ منتخب سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۲/-

(ن)

۲۷۴۔ نثر امروز ایران — ڈاکٹر رغیب حسین — ۳/-
۲۷۵۔ نشاط غالب — وجاہت علی سندیلوی — ۵/-
۲۷۶۔ نقد و انتقاد — اعجاز احمد معجز — ۲/۵۰
۲۷۷۔ نقش حالی دوم یعنی حالی نمبر — پروفیسر احمد حسین۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۲۷۸۔ شجاعت علی سندیلوی — ۲۵/-
۲۷۹۔ نغمۂ کوہسار — خان محبوب طرزی — ۲/-
۲۸۰۔ نفحات الانس مع مقدمہ اردو — محمد شریف — ۳/-
۲۸۱۔ نظم سائیکلوپیڈیا — ذکی کاکوروی — ۱۰/-
۲۸۲۔ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی — کبیر احمد جائسی — ۲/۵۰
۲۸۳۔ نسرین و نسترن — ذکی کاکوروی — ۵/-
۲۸۴۔ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ — حامد اللہ افسر — ۳/۵۰

۲۸۵۔ نیا راستہ ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰	۲۹۵۔ ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۰/۷۵
۲۸۶۔ نوروز ،	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰	۲۹۶۔ ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-
۲۸۷۔ نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ	آل احمد سرور	۸/۵۰	۲۹۷۔ ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۸۸۔ نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۵/۵۰	۲۹۸۔ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ ،		۱/۵۰
۲۸۹۔ نیلم	انتصار حسین	۳/-	۲۹۹۔ ہمارا سماج ملا ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی فریا		۰/۷۰
۲۹۰۔ نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۲۵	۳۰۰۔ ، ۲ ، ،		۰/۸۵
۲۹۱۔ نصاب فارسی	مع مقدمہ فارسی عبدالماجد خان خلیل	۵/-	۳۰۱۔ ، ۳ ، ،		۰/۹۰
			۳۰۲۔ ، ۴ ، ،		۰/۹۰
۲۹۲۔ منشی نول کشور نمبر		۲/۵۰	۳۰۳۔ یادگار غالب	مولانا حالی	۶/-
(و)			۳۰۴۔ یا قوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۹۳۔ وعدۂ فردا	اخگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-	۳۰۵۔ یادگار انیس	امیر احمد علوی	۴/-
(ﮨ)					
۲۹۴۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۴/-			

ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

۱۔ پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲۔ جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

۳۔ اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

۴۔ جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے۔

۵۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ کا نا ضروری ہیں۔

جلد (۲۴) شمارہ رجسٹرڈ نمبر ایل۔ ڈبلیو / این۔ ۹۳
لائسنس نمبر: ۲۰۶۴ ۱۷ / ۲۰، ۵، ۶۴
دفتر فون: ۲۶۱۳۵
فون رہائش گاہ: ۲۶۶۵۶

ادارۂ فروغِ اُردو ہندکا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغِ اُردو لکھنؤ

شمارہ (۱۰) فروری ۱۹۷۶ء جلد ۲۴

زرِ سالانہ اعزازی: دس روپے
عوام سے: چھ روپے
فی پرچہ: ۷۰ پیسے

پتہ: ادارۂ فروغِ اُردو۔ امین آباد پارک لکھنؤ

ترتیب

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغِ اُردو لکھنؤ ۲۳ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

اُردو زبان کا مستقبل اس سلسلہ میں جو سوالات ہمارے دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو پڑھنے والوں کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا جا رہا ہے ان کی اقتصادی اور معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے ہمٰں جہاں اُردو زبان کے حقوق تسلیم بھی کیے گئے ہیں وہاں بھی اِس کا نفاذ نہیں ہوتا تعلیمی ادارے اُردو کی قتل گاہ بنتے جا رہے ہیں گویا آزادی کے بعد اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس کا پڑھنا پڑھانا سب سے بڑا جُرم اور سب سے بڑی غداری ہے اور جس کا ختم کرنا سب سے بڑی دیش بھگتی قدم قدم پر رُکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں اگر حکومت کیطرف سے کوئی ہدایت جاری بھی ہوتی ہے تو اسکا اُلٹا مطلب نکالا جاتا ہے ہمارے صوبہ اُتر پر دیش کے سابق وزیر اعلیٰ شری بھوگن جو بظاھر اُردو زبان سے بڑی گہری دلچسپی لیتے تھے وہ بھی پلیٹ فارم پر اُردو زبان کی ہمہ گیر خصوصیت پر وہ سب کچھ نگ دہل فرمایا کرتے تھے کہ جس کا تصور کرنا مشکل ہی تھا مگر اپنے دور حکومت میں وہ اُردو زبان کی وہ ہمہ گیر خصوصیت کو قانونی شکل دینے سے معذور رہے وزیر ہوا اصلات گورنمنٹ آف انڈیا کی حیثیت سے تو اُنھوں نے یہ وعدے بھی کیے تھے کہ کسی صوبے کو دو لسانی صوبہ بنانے میں بھی کوئی قباحت نہیں اور نظام حکومت میں دو لسانی صوبہ بن جانے کے بعد کوئی دقت اور پریشانی نہیں مگر افسوس وہ اپنے اس عزم اور حوصلہ کی تکمیل اپنے دور حکومت (وزیر اعلیٰ اُتر پر دیش) قانونی حیثیت سے نہ دے سکے۔ اب ہم کو اپنے صوبہ کے وزیر اعلیٰ سُنواٹن دت تیواری سے بڑی توقعات وابستہ ہیں کہ وہ اُردو زبان کی نشو و نما اور اس کی ترقی نیز اُردو زبان پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر معاشی حیثیت سے اُردو زبان کے حق کو قانونی حیثیت سے تسلیم کر کے آئندہ آنے والی نسلوں کے دلوں میں جگہ پیدا کریں تاکہ صحیح طور پر یہ اندازہ ہو سکے کہ نئے وزیر اعلیٰ اُتر پر دیش

اردو زبان کی بقا اور اس کے تحفظ کے علمبردار ہیں یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ زبان حکومتیں نہیں
باتی زبان تو سماج بناتا ہے اور وہی اس کو ترقی دیتا اور بگاڑتا ہے کیوں کہ زبان مختلف تہذیبوں
کے مجموعہ سے مرکب ہے پہلے وہ سماج کے دلوں میں جگہ کرتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقہ پر بڑھتی
ہے آخر کار پورے سماج پر چھا جاتی ہے سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں اسی لئے سیاست سے
الگ رہ کر زبان کی ترقی کے لئے جد وجہد کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جس کو زبان سے لگاؤ ہے
اور اس زبان کو پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہے بقول علامہ اقبال ؎

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

آج تک ہم محبان اُردو منتظر ہیں کہ فروغ اُردو گجرال کمیٹی کی رپورٹ کا کیا حشر ہوا وزیر اعظم
شریمتی اندرا گاندھی کی خدمت میں رپورٹ بھی پیش کر دی گئی اس کے بعد توقع کی جاتی
تھی کہ اس کی رپورٹ جلد منظر عام پر آئے گی اور اس سے معلوم ہوگا کہ آئندہ آنیوالی نسلوں
کی خاطر حکومت کے کیا ارادے اور عزم ہیں کیوں کہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جبتک اُردو
زبان کو معاشی حیثیت سے مستحکم اور مضبوط نہ کیا جائے گا اس وقت تک اُردو زبان
کا پڑھنا اور پڑھانا فعلِ عبث سمجھا جاتا رہے گا اس لئے اس ایمرجنسی دور میں ہم اپنی وزیر اعظم
شریمتی اندرا گاندھی سے درخواست کریں گے کہ وہ فروغ اُردو گجرال کمیٹی کی
رپورٹ کو منظر عام پر لائیں ۔ تاکہ دیش بھگتی کا جذبہ اردو زبان کے پڑھنیوالوں
میں بدرجۂ اتم پیدا ہو اور وہ ہندوستان کے مستقبل کو تابناک بنانے میں کسی قوم
سے پیچھے نہ رہ سکیں ۔ یہ بات اپنی جگہ پر مستحکم ہے کہ جب تک اس زبان کو پڑھنے
کے بعد معاشی حیثیت سے اس زبان کو قانونی شکل نہیں دی جاتی اُس وقت تک
بچوں کے والدین اپنی اولاد کو قربانی کا بکرا نہیں بنا سکتے ۔

فراق

۲۰ نومبر ۷۵ء کو بھوپال میں حضرت علامہ استاذی محویؔ صدیقی لکھنؤی کے انتقال کی خبر سن کر

اک ایسا خواب نظر آیا مجھ کو پچھلی شب — فلک سے ٹوٹ رہے تھے ہزار ہا کوکب
تڑپ کے برق عجب ڈھا رہی تھی قہر و غضب — کھلی جو آنکھ تو ویراں تھا گلستانِ ادب

بوقت صبح کسی نے خبر یہ پھیلا دی
وفات پا گئے علامہ محویؔ صدیقی

خبر یہ سنتے ہی بے کار ہو گیا تھا دماغ — خیال بھی نہ تھا اجڑے گا شاعری کا باغ
اٹھے گا قلب سے اب کس طرح جدائی کا داغ — کسے خبر تھی کہ بجھ جائے گا ادب کا چراغ

وفورِ صدمۂ جانکاہ سے ڈھلک ہی پڑے
کہ اشک آنکھ سے بیساختہ ڈھلک ہی پڑے

نہ ہوش تھا کہ اچانک پڑے گی یہ افتاد — چمن میں آئے گی اس طرح نکہت برباد
اب اس سے بڑھ کے ستم ہو گا کیا ستم ایجاد — جہاں شعر میں ہے شورِ نالہ و فریاد

ہمارا گوہر نایاب ہم سے چھین لیا
اے موت! تو نے یہ اردو پہ کیا ستم ڈھایا

وہ ہستی جو تھی زمانے کی تاجدارِ علوم — وہ ہستی جس کی تھی دنیائے شاعری محکوم
وہ چاند جس پہ تصدق تھی کائنات نجوم — وہ بادشاہِ سخن جس کی ہر طرف تھی دھوم

چمن ہی جس سے چمن تھا وہ باغباں نہ رہا
"ریاضِ اردو" کا افسوس پاسباں نہ رہا

تصورات کا اللہ رے کیف بارِ عالم — تخیلات کے ہر سو اڑا دیئے پرچم
جہانِ شعر پہ رحمت ہے ان کا زورِ قلم — زمانہ کیوں نہ پکار اٹھے "شاعرِ اعظم"

جو پھول باغِ سخن میں کھلا گئے مرحوم
ضیاؔ نہیں مرجھا سکے گی "بادِ سموم"

ضیا ہانی
۳۰ دسمبر ۱۹۷۵ء

پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

پروفیسر احتشام حسین کے انتقال سے ایک سلسلہ ہے اردو کی بڑی بڑی ہستیوں کے اُٹھ جانے کا جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ۲۹ نومبر کو ہمارے ترکش کا آخری تیر، ہماری تہذیب کا سب سے دلکش ترجمان دبستان لکھنؤ کا سب سے نمایاں ادیب اور دانشور، ایک بالغ نظر محقق، ایک دیدہ ور ناقد ایک شریف النفس انسان ہم سے چھین لیا گیا۔ جس کو دنیا عام طور سے مسعود حسن رضوی ادیب کے نام سے یاد کرتی ہے۔

کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی

۲۹ نومبر کی رات کو ۳ بجے میری آنکھ کھل گئی اور پھر کسی طرح نیند نہیں آئی۔ ۳۰ نومبر کو اتوار تھا یونہی کروٹیں لیتا رہا آٹھ بجے لکھنؤ سے ایک دوست کا ٹیلی فون آیا جس سے اس سانحہ عظیم کا علم ہوا اس وقت سے برابر یہی سوچ رہا ہوں کہ اب کون ہے؟ جو ہمیں ہماری غلطیوں پر ٹوکے گا؟ کس سے ہم مشورہ کریں گے؟ حضرت محمد ابن احمد حبیب بغدادی مسند پر بیٹھے تو فرمایا تھا کہ "بڑے نہیں ہیں اس لئے ہم بڑے ہو گئے ہیں"۔ بعینہ یہ حال میرا ہے اب کون ہے جو شعر کی حقیقت اور ماہیت اور ان کی معنوی خوبیوں کو سمجھائیگا کون ہے جو اردو کی تصویر کو تہذیب کے بڑے مرقع میں سجائے گا؟ کون ہے جو اچھی کتاب کے لکھنے یا چھپنے پر اتنا خوش ہوگا؟ کون ہے جو اردو کے نئے اور اچھے اچھے کاموں میں اس طرح خوش ہو ہو کر مبارکباد دے گا؟ کون ہے جو لکھنؤ میں اس طرح لکھنؤ میں "خاطریں" کرے گا کہ کام و دہن اور جان و دل سب ہی لطف و کیف میں ڈوب جائیں؟ یہ وسعت معلومات، یہ بالغ نظری، یہ سخن فہمی، یہ متانت علم یہ نفاست ذوق، یہ وضع داری، یہ وقار، علم کا یہ شوق یہ نکتہ رسی، لکھنؤ سے یہ عشق، یہ کرید، یہ جستجو، اور زبان و ادب کی یہ ادا شناسی اب کہاں ملے گی؟

پروفیسر مسعود حسن رضوی کے اُٹھ جانے کے بعد معلوم

ہوتا ہے کہ ایک فرد نہیں پورا ایک عہد ختم ہو گیا ایک تہذیب سوگوار ہو گئی۔ ایک شہر بے رونق ہو گیا۔ ایک انجمن سونی ہو گئی مجھے ہرگز امید نہیں کہ اب ہمارے یہاں کوئی ایسا جامع حیثیات شخص پیدا ہوگا جو ہماری شاعری یا میر انیس کے موضوع۔ فارسی مرثیہ کی تاریخ۔ شاہان اودھ کے علمی کارناموں یا واجد علی شاہ کے علمی مشاغل پر اس اعتماد اس سنجیدگی اور اس وثوق سے لکھ سکے گا ان کا ہر لمحہ علمی کاموں کیلئے وقف تھا اور انھوں نے اپنے تحقیقی اور علمی کاموں کو وظیفہ زندگی بنا لیا تھا جس میں وہ آخری وقت تک مصروف رہے پچھلی مرتبہ جب ان سے ملاقات ہوئی تو بہت بیمار تھے اُٹھنے بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی لیکن سرہانے پائنتی اور کروٹ میں صرف کتابیں ہی کتابیں تھیں اسی انہماک کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اکیس یا بائیس کتابیں تصنیف و تالیف یا مدون کیں۔ مضامین و مقالات کا تو شمار ہی نہیں۔ اور وہ سب ہماری تاریخ ادب کا بیش قیمت حصہ ہیں اور ان سے اردو کے بہت اہم اور نئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

ان کی تصنیف 'نئی شاعری' کے دس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ شرف اردو کی صرف چند ہی کتابوں کو حاصل ہے ہندوستان اور پاکستان کی کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں ہے جہاں وہ نصاب میں داخل نہ ہو اس کے علاوہ فائز دہلوی۔ لکھنؤ کا شاہی اور عوامی اسٹیج جس پر ان کو ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا تھا' آب حیات کا تنقیدی مطالعہ اردو زبان اور اس کا رسم خط فیض میر مجالس رنگیں۔ جواہر سخن۔ روح انیس شاہکار انیس ـ رزم نامہ انیس۔ متفرقات غالب۔ تذکرۂ نادر۔ فسانۂ عبرت فرہنگ امثال۔ تذکرہ گلشن سخن۔ اندر سبھا۔ واجد علی شاہ اور نگارشات ادیب ان کی وہ اہم یادگار تالیفات یا تصانیف ہیں جنھوں نے اردو کی رہگذر کو روشن کر دیا۔ ان سے اردو کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا ہے اور انھوں نے تاریخ و تہذیب کے ان گوشوں کو منور کر دیا ہے جو اب تک پردۂ خفا میں تھے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی کا انداز و اسلوب مستقبل کا اشارہ یہ ہے اردو نثر کا قافلہ ان کے بتائے ہوئے خطوط پر چلتا رہے گا۔ وہ صحیح لفظ استعمال کرتے تھے اس لیے کہ لفظوں کے نبض شناس تھے عربی جمع سے پرہیز کرتے تھے فارسی کے بجائے اردو قواعد کی پیروی کرتے تھے ہندی لفظوں کو فارسی عربی پر ترجیح دیتے تھے وہ لفظوں کا شجرہ دیکھ کر مضمون نہیں لکھتے تھے بلکہ جو لفظ جہاں سجتا تھا وہاں سجا دیتے تھے ان کے اسلوب میں کھڑی سادگی نہیں ہے بلکہ سادگی اور رنگینی کی خوبصورت آمیزش ہے جو پڑھنے والوں کے دلوں کو موہ لیتی ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضوی صرف بڑے عالم، ادیب مصنف اور دانشور ہی نہیں تھے بڑے دلکش' فراخ دل و دل نواز انسان بھی تھے میرے ساتھ تو وہ سلوک تھا جو آبا اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں جب ان کو صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ادبی اعزاز یا سرٹی فکٹ آف آنر ملا تو غریب خانہ پر قیام فرمایا اور واقعی ان دو دنوں میں یہ معلوم ہوا کہ ساری خیر و برکت میرے حصہ میں آ گئی ہے۔ مسکرا کر فرمایا "بھئی مجھے دہلی میں دو کام ہیں ایک تو آپکی

سید فضل امام رضوی

اُردو شاعری پر ہندو تہذیب اور مذہب کے اثرات

تہذیب اور مذہب کی عمریں پیمانۂ عہد و سال کی رہین منت نہیں، ادوار بٹتے رہتے ہیں۔ تہذیبیں اور مذہب باقی رہتے ہیں، دورِ ماضی کو سمجھنے کیلئے تہذیب کو ہی ایمن بنانا پڑتا ہے اور یہی ہر عہد کے جواہر پاروں کی تلاش کے لئے مشعلِ راہ ہوتی ہے جس کی مدد سے تحلیل و تجربہ کی گتھیاں سلجھتی ہیں کیوں کہ ہر عہد اپنے خزانۂ دانش میں بے شمار تہذیبی اور مذہبی گہر ہائے آبدار چھپائے رہتا ہے اور انھیں بکھرے ہوئے تہذیبی موتیوں میں عکس ہوتا ہے اُردو کے ہزاروں تہداروں پہلوؤں کا۔ انھیں پہلوؤں میں صدیوں کی تصاویر اُبھرنے لگتی ہیں جس سے ایک جیتا جاگتا کلچر ننگا ہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لفظ تہذیب سے مراد کیا ہے؟ اسے ایک دانش ور نے یوں بیان کیا ہے کہ "جب ہم لفظ تہذیب استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی ملک یا قوم کی داخلی یا خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنھیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے وہ دنیا میں پہچانے جاتے ہیں تہذیب قومی زندگی کی ساری جذباتی، روحانی اور مادی امنگوں اور خواہشوں کا احاطہ کرلیتی ہے، اس کو بناتی سنوارتی ہے ایک ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانہ کی ضروریات کا ساتھ دے سکے وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی نے اسے عطا کیا۔

ماضی، حال اور مستقبل اقدارِ حیات (Values of Life) کو پیش کرتے ہیں اور یہ اقدار مشترک ہیں تہذیب و مذاہب سے۔ ہر عہد کو پرکھنے کیلئے تہذیبی سرمایہ کی اشد ضرورت ہے تہذیب کی تشکیل نہ تو کوئی حادثہ ہے اور نہ ہی منصوبہ۔ اسی طرح مذاہب بھی حادثہ تو نہیں۔ لیکن ایک حد تک منصوبہ ضرور ہیں اور یہ دونوں سینکڑوں سال کی ریاضتوں کا ثمرہ ہوتے ہیں۔

خوش قسمتی سے ہندوستان روزِ ازل سے ہی مختلف تہذیب اور مذاہب کی آماجگاہ رہا ہے۔ کول و بھیل کے عہد بھی اپنے عالم تمدن کو پیش کرتے ہیں۔ اس وقت یہاں مذہب کی کوئی شکل متعین

نہیں ہوتی۔ ہندو تہذیب و مذہب کی داغ بیل ہندو ایران اور
عرب تعلقات سے پڑتی ہے۔ اس سے پہلے کی تہذیب اور مذہب
کو ہم "ہندو" کے لفظ سے نہیں مناسبت دے سکتے ہیں کیوں کہ
"ہندو" کا لفظ ساخت کے اعتبار سے عربی اور ایرانی ہے۔
یہ لفظ دراوڑی اور ویدک عہد میں بھی نہیں ملتا ہے۔ چناں چہ
اس مقام پر نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ساحل مالا بار محض
اشیا کی لین دین کا ہی ذریعہ نہیں تھا بلکہ اسی اختلاط سے ایک
نئی تہذیب کا نزول اجلال ہو رہا ہے اور اگر قدیم ایرانی تہذیب
کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ ہندوستان
کی تہذیبی اور مذہبی رسوم ایران تمدن کی علمبردار ہیں۔

زبان و ادب میں تہذیبی تصورات اور اثرات جس طرح
نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کا مطالعہ ایک بڑی دلچسپ چیز ہونے
کے ساتھ ساتھ انتہائی بصیرت افروز بھی ہے اس میں شک
نہیں کہ مختلف ممالک اور اقوام کی تہذیبی اور مذہبی روایات
مختلف النوع ہوتی ہیں۔ لیکن ہر ہر ملک کی تاریخ میں ایسے موقع
آتے رہتے ہیں جب تہذیبیں ٹکراتی ہیں۔ ایک دوسرے سے متاثر
ہوتی ہیں۔ اور عصبیت، کٹر پن، تنگ نظری سے بلند و بالا ہو کر
اپنے علاوہ دوسرے کے یہاں بھی حسن، خوش سلیقگی اور شگفتگی
کے جوہر کا احساس ہونے لگتا ہے۔

چنانچہ تہذیب کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ یہاں
باہمی اشتراک و تعاون ہی کے ذریعہ بزرگ و بار آتے ہیں
مسلمانوں کا سرزمین ہند پر ورود مسعود ایک گلدستے کی نوعیت
سے ہوا۔ جس میں عربی، ایرانی، افغانی، منگولی، تاتاری، ازبک
سبھی اپنے دلفریب اداؤں کے باعث خلد نظر بنے ہوئے تھے
بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق (بابائے اردو) اردو
کی تنظیم و ترتیب میں اگر ہندوؤں کی شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود
میں ہی نہیں آسکتی تھی۔ اُردو زبان و ادب کا یہ سرسبز و شاداب
چمنستان ہر تہذیب کا درخشندہ دار ہے جہاں گلاب و انار کی رعنائیوں
کا بیان ہے۔ وہیں سرسوں کے پھول اور کنول کی رنگینی اور دلکشی
بھی جاذب نظر ہے کیوں کہ جب مسلمان ہندوستان میں وارد
ہوئے تو انھیں یہاں ایسے لوگوں سے وابستگی اختیار کرنی پڑی
جو زبان خیالات، عقائد، رسم و رواج، خورد و نوش، رہن سہن
ہر اعتبار سے مختلف تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد زبان و ادب مذہب
فنونِ لطیفہ، سب پر اثرات نمایاں ہونے لگے اور صوفیائے کرام
و بھگتوں کو منفرد تہذیب و مذہب کا فرق بے معنی نظر آنے لگا۔
رام و رحیم ایک ہی تصور قرار پائے۔ سولہویں اور سترہویں صدی
تک یہ اختلاط اتنا استوار ہو گیا کہ تجزیہ کرنا بھی ایک امر محال ہے
شاعری تہذیب و مذہب کے اثرات سے کب منہ موڑ سکتی

ہے۔ اسلامی تہذیب نے بھی اُس کا خیر مقدم کیا اور زبان و
اُردو تو تخلیق ہی ہے۔ اسی تہذیبی اشتراک و تعاون کی اردو
شعراء بھی اپنے خیالات اور تصورات میں ہندو تہذیب اور مذہب
کے گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آنے لگے یوں تو
بنیادی طور پر اُردو زبان و ادب قریب قریب ہر تہذیبی اور
مذہبی عقائد کا سرچشمہ ہے لیکن ہندو تہذیب اور مذہب کے
گوناگوں پہلوؤں کی عکاسی خاص طور پر نظر آنے لگی اور اسی
بالغ اور پختہ نظر تہذیبی گہوارے کے کچھ ایسے لازوال مرقعے
اس کے وسیع اور دلکش دامن میں آویزاں ہیں جو درحقیقت
اردو زبان کی بقا کے ضامن ہیں۔

فقط ہندو شعراء اور ادباء نے ہی ہندو تہذیب اور
مذہب کو نہیں پیش کیا۔ بلکہ مسلمان شعراء اور ادباء نے بھی

تِ ہندی سے عشق نہ کرنا کفر کے مترادف سمجھا۔ چنانچہ مذہبی پیشواؤں، تہواروں، رسم و رواج اور عقائد کو اس وسیع النظری اور روشن دماغی سے اپنانا ہی اس بات کی بین دلیل ہے کہ ان وسیع المشرب افراد نے صرف قادر الکلام اور مسلم الثبوت شاعر ہونے کے باعث ہولی، دیوالی، بسنت، کرشن جی، رام چندر جی، گرو نانک جی پر اپنے قلم کی جولانی نہیں دکھائی۔ بلکہ ان کے حسنِ کردار، جرأت و حق گوئی، صداقت اور بے لوث خدمات اور خلوص نیت، پُر فریب مناظر کے بھرپور احساس نے قلم کو حرکت کے لیے مجبور کر دیا۔

اُردو شاعری جن حالات میں پروان چڑھی وہ تاریخ کا اہم باستان کارنامہ ہے۔ اس کے مزاج میں ہندو تہذیب کی رسوم اور ہندو مذہب کے عقائد کا گھل میں پڑ جانا عین فطری تھا چنانچہ اردو شاعری روزِ اول سے ہی سبحہ و زنار دونوں کی شیدائی ہو گئی اردو شاعری کے وجود کا انحصار وصل پر ہے۔ لہٰذا ایک ہندی نژاد فارسی شاعر کے اس مصرع پر ایمان لائی

ع یا مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام

صنم و حرم، کعبہ و دیر، مسجد و مندر کے گن گانا اردو شاعری کی سرشت میں داخل ہے۔ واقعات کے پیش نظر اس امر کی وضاحت ببانگ دہل کی جا سکتی ہے کہ اللہ اللہ کرنے میں خواہ تامل ہوا ہو مگر کرشن کرشن کی رٹ لگی رہی۔ امانت کا گراں قدر کارنامہ "اندر سبھا" اور نوابینِ لکھنؤ کے حالات تاریخ کے اوراق میں ابھی محفوظ ہیں۔

ہندوؤں نے اُردو شاعری میں اپنے عقائد کا دل کھول کر پرچار کیا۔ اپنی تہذیب و تمدن کے محاسن بیان فرمائے

یہی نہیں بلکہ مسلمان شعرا نے اپنی بزرگ شخصیتوں کے ساتھ ہندو مذہب کے بزرگوں کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنا کر خلوص خراج عقیدت پیش کیا ہے اور نذرانۂ عقیدت کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے رہا اور اب بھی ہے۔ ہر چھوٹے بڑے شاعر نے خامہ فرسائی کی ہے۔

طوطیٔ ہند حضرت امیر خسرو اردو زبان کے پہلے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں ہندو روایات، تہذیب اور معاشرت سے ان کا خمیر اٹھا تھا۔ اسی لیے ان کے کلام میں ہندو تہذیب کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ ساون کے مہینے میں پپیہے کی الاپ ان کے بھی دل میں کسک پیدا کرتی ہے اور کہنے لگتے ہیں۔ ع

اماں میرے باوا کو بھیجو جی ساون آیا

بسنت امیر خسروؒ کی بڑی مشہور نظم ہے اس میں علم و معرفت کے مسائل ہیں۔ لیکن اس عرفان کے لیے ہندوستانی تہذیب کی امین "رت بسنت" کا سہارا لینا پڑا ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

کپڑے رنگنے سے نہ کچھ ہووت ہے
یا رنگ میں، میں نے تن کو ڈبویا کرے
حضرت خواجہ کے سنگ کھیلے دھمال

نظم بسنت کے محض ایک بند سے اس چیز کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ کس طرح سے اس وقت کے صوفی شعرا نے ہندو مذہب کے عقائد کو اپنایا تھا۔

دکن کے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ نے اپنے کلام میں جا بجا ہندو تہواروں کا ذکر کیا ہے یہی نہیں بلکہ بہت سی تشبیہ و استعارات بھی ہندو تہذیب کی دین ہیں قطب شاہ کے چند اشعار مطالعہ فرمائیں ؎

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا　　تمہیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
نبی صدقہ بسنت کھیلیا قطب　　رنگیلا ہو رہیا تر لوک سارا

بسنت ماس جن چن چنری بنی ہے
جو اُبھر کے لہرا سے آیا بسنت

اردو مثنویاں خاص طور سے ہندو تہذیب اور مذہب کو پیش کرتی ہیں ہر جگہ شادی بیاہ، موت و غم، رہن سہن میں دیومالا کی کتھائیں منظوم ہیں امانت کے اندر سبھا، ہندو دیوتا راجہ اندر کے قصص پر منحصر ہے یہ خالص ہندو مذہب کی بخشی ہوئی تلمیح ہے جو آج اُردو کے روزمرہ اور محاورے میں داخل ہوگئی۔

میر تقی میر کی مثنویاں خصوصاً شعلۂ عشق اور دریائے عشق وغیرہ بھی یہاں کے قدیم قصوں کی طرز پر ہیں۔ جس کے معیار حسن و عشق میں بھی ہندو تہذیب اور مذہب کو دخل ہے۔ میر کی نظم "آصف الدولہ کی ہولی" میرے پیش نظر ہے اس سے اس کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس وقت اُردو کے سرپرست کس درجہ ہندو تہذیب سے متاثر تھے ؎

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہے خورد و پیر
جشن نوروزی اہل ہند سب
ہے یہی تب محو عشرت رہیں گے سب
زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس
عطر مالی سے بھوؤں میں گل کی باس
سوانگ کیا کیا بن کے آئے دیہاں
پھبنکنے کا سوانگ تھا سارا جہاں

اردو شاعری کا یہ دھارا نظیر اکبرآبادی تک آتے آتے ایک دوسرا ہی منظر پیش کر دیتا ہے اُن کی نظمیں گرو نانک ہولی، دیوالی، راکھی، بالپن بانسری بجیا، بانسری، کرشن وغیرہ بہت ہی زیادہ ہندو تہذیب اور مذہب سے متاثر ہیں۔ ان کی نظمیں ہی نہیں نظیر خود بھی ہندو تہذیب کے بے حد دلدادہ نظر آتے ہیں۔

ہندی شاعری میں سور داس کو کرشن لیلا کا اور تلسی داس کو رام لیلا کا شاعر مانا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں شاعروں کی قدر و قیمت سے زیادہ مذہبی عقیدت کی بنا پر اور تعداد سے زیادہ ہے حالاں کہ اُردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی کے کرشن کی بانسری کے جیسے دلکش نغمے پیش کئے ہیں۔ اس نوعیت کے سور داس کے یہاں بھی نہیں ملتے۔ سور داس نے کرشن جی کو عہد طفولیت میں محض بچے کی فہرست میں رکھا ہے لیکن نظیر نے اس نوزائیدہ بچے کو روحانی قوتوں کا حامل ٹھہرایا ہے ان کی ایک نظم "بالپن بانسری بجیا" کے نام سے مشہور ہے۔ پوری نظم مرصع ہے جس میں حقائق و معارف کے دریا کو سمو دیا گیا ہے طوالت کے پیش نظر صرف ایک بند نقل کیا جاتا ہے ؎

ان کو تو بالپن سے نہ تھا کام کچھ ذرا
سنسار کی جو ریت تھی اس کو رکھا بجا
مالک تھے وہ تو آپ انھیں بالپن سے کیا
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

کرشن جی کی بانسری کا یہ اعجاز تھا کہ جب وہ اپنے لب نازک سے چھیڑتے تھے تو بانسری کی دلکش آواز سے بندرابن میں چرنے والی گائیں بھی متحیر ہو کر سننے لگتی تھیں اس واقعہ کو نظیر

لائی قلم نے یوں نظم فرمایا ہے ؎

ں میں نند لال بجاتے تھے جب گھڑی
دھن اسکی سننے کو رہ جائیں سب کھڑی
گلیوں میں جب بجاتے تو وہ اسکی دھن بڑھا
نے لے کے اتنی لہر جہاں کان میں پڑی
سب سننے والے کہہ اٹھے جئے جئے
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

یا

ن کروں میں اب کیا کیا اس مرلی دھر بجیا کی
یوا گنج بھریا کی اور بن بن گئو چرپا کی
گوپال، بہاری، بنواری دکھ بھرنا ہر کریا کی
گردھاری سندر شیام برن اور پنڈ جوگی چھپا کی
یہ لیلا ہے اس نند للن من موہن جسجت چھپا کی
رکھ دھیان سنو ڈنڈوت کرو جے بولو کشن کنہیا کی

انشاء اللہ خاں انشاؔ کو رانی کیتکی کے مصنف کے باعث
جانتے ہیں لیکن ان کی نظم اور زبان اہل برج اور بستی
یں خاصہ کی چیز ہیں۔ غزلوں میں بھی ہندو تہذیب اور مذہب
رے اثرات نمایاں ہیں انشاؔ کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

ے لگائی آکے یہ کیا آگ اے بسنت
سے کہ دل کی آگ اٹھی جاگ اے بسنت
کیف بہار کی اس کو تو دے خبر
موج نسیم کی طرح اڑ لاگ اے بسنت

برگ گہہ دکھائے ہے گہہ ارغوان بسنت
دے ہے ایک تازہ شگوفہ یہاں بسنت

آنکھیں نظر دشت و جبل ندو ہر طرف
ہے آپ کے سال میں یہی اے داستاں بسنت

تاریخ ہندوستان اور اردو ادب میں بہادر شاہ ظفر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ متمکن تخت سلطنت ہیں اور پھر بھی اپنی منفرد تہذیب و ثقافت نہیں پیش کرتے بلکہ وہ دسہرہ، ہولی اور دیوالی کے تہواروں پر اس کی روح شاعری رقص کناں ہو جاتی ہے جذبات پر قابو نہیں رہ جاتا اور عالم وجدان میں ہولی رنگین فضاؤں میں رنگا رنگ شخصیت کا مظہر بن کر اسی طرح گنگنانے لگتا ہے ؎

کیوں موپر رنگ کی مارتا پچکاری
دیکھو کنور جی دوں گی گاری

ہر کہ دست از جاں بشوید ؛ ہرچہ در دل دارد بگوید

اقبال کو لوگ محض ایک فرقہ کا شاعر تصور فرماتے ہیں۔ راجندر ناتھ شیدا نے تو انھیں مستند فرقہ پرست شاعر قرار دیا ہے لیکن سمجھ میں بات نہیں آتی کہ کیوں اور کیسے؟ اقبال حق آگاہ ضرور تھے اور حق آگاہی کے معنی تعصب اور تنگ نظری نہیں۔ اُن کی نظمیں سوامی رام تیرتھ، گرو نانک، رام وغیرہ نغمات ہندی کی بہترین اور اعلیٰ مثال ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎ رام

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند
اس دیس میں ہوئے ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پر ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

رام چندر جی کو امام ہند قرار دینا اس سرزمین پاک پر ہزاروں ہندو تہذیب اور مذہب کے نمائندوں کو ملک سرشت قرار دینا محض زبانی نہیں بلکہ عقیدت کا اثر ہے اور اردو شاعری کو اس اثر پر فخر حاصل ہے۔

گوتم بدھ اور گرو نانک کی مایہ ناز تعلیمات سے کون زبان و ادب روگردانی کر سکتا ہے۔ اردو شاعری میں تو اس تہذیب و معاشرت کا وافر سرمایہ اسی نظریے کا جلوۂ صد رنگ پیش کرتا ہے ؎

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

آہ بدقسمت رہے آواز حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

کوئی بھی زندہ زبان اپنے گرد و پیش میں ہونے والے انقلابات اور تغیرات کو نظرانداز نہیں کر سکتی، کیوں کہ لسانیاتی ترسیل و ابلاغ اسی طرح ہوتا رہتا ہے اور شاعر تو نام ہے ایک باشعور انسان کا، چنانچہ ایک باشعور انسان آنکھیں بند کرکے زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اردو شاعری بھی ہندو تہذیب اور مذہب سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتی۔

شعرا نے اپنے دلی جذبات کو ہندوؤں کی تہذیب اور مذہبی عقائد میں رنگ دیا ہے چنانچہ بیدم وارثی، بابا نظامی

بوالی، وغیرہ جیسے صوفی المشرب بزرگ بھی برسات کے ترانے، پی کہاں کی الاپ، ساون کے مناظر کے ساتھ ساتھ کرشن کی الفت کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

ہولی تن من پھنک رہی ہے دور سکھی گر دھاری ہے
دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہے اور زخم جگر بھی کاری ہے
ہائے اکیلی کھیل رہی ہوں ساتھی ڈوبی ساری ہے
خون حنا رنگ بنا ہے آنکھوں کی پچکاری ہے
(باسط بوالی)

حسرت موہانی کی کاوش بھی اردو شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ انھیں بھی متھرا اور کرشن سے والہانہ عقیدت ہے لیکن سیماب اکبرآبادی کی نظمیں ہندوستان کے ارضی و مقامی رنگ کو بہت ہی صفائی سے پیش کرتی ہیں۔ ہندو تہذیب اور مذہب سے انھیں گہری الفت ہے اور کرشن جی سے ان کی محبت تو ایمان کی حد تک پہونچی ہوئی ہے انھوں نے کرشن گیتا کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"مجھے ہندو مذہب کے قدیم اوتاروں میں صرف کرشن جی سے بڑی عقیدت ہے اس کا سبب تو میرا استادانہ ذوق ہے کہ مجھے شری کرشن جی کی زندگی یکسر رومان اور مطلق محبت نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں پریم اور پریت یعنی عشق و محبت کے جتنے نغمے پھیلے ہیں ان کا سرچشمہ میں شری کرشن کی مشہور تاریخی بانسری ہی کو سمجھتا ہوں۔"

سیماب اکبرآبادی نے گرو نانک اور گوتم بدھ پر بھی خوب نظمیں کہی ہیں۔ دیوالی کے دیپ بھی ان کے نزدیک شمع ہدایت ہیں۔ ان کی نظم "شری کرشن" کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

جمالِ حسن کے کاہ نکھار سے کھیلا
رہا جنونِ عشق کی رنگین بہار سے کھیلا
ہمیروں کی کبھی رسم کی ادا سے نے
گوالہ بن کے کبھی سبزہ زار سے کھیلا
بجا کے بانسری غلموں پہ اپنے جادو کیا
خود اپنی زندگی پر وقار سے کھیلا
بہا دیئے کبھی ٹھوکر سے پریم کے چشمے
کبھی چمن کبھی گنگا کی دھار سے کھیلا

•

وہ بانسری کہاں ہے
کرو تلاش وہ نے جس کا نغمۂ نوخیز
جہانِ کہنہ کی ظلمت میں ہے ابھی ضو خیز
کرو تلاش وہی بانسری نوا جس کی
ہزار فتنے فنا کر کے بھی فنا نہ ہوئی
کرو تلاش وہی بانسری جو متھرا میں
بنی رہے دمِ عیسیٰ کف کنہیا میں
کرو تلاش وہی بانسری کہیں ہو گی
یہیں کہیں تھی ابھی اس کی لے یہیں ہو گی

اسی طرح مولانا ظفر علی خاں ظفر نے بھی گوکل کی بانسری کی گونج کو نظم فرمایا ہے انھیں زیادہ تر افراد صرف اسلامی نظموں کا شاعر جانتے ہیں مندرجہ ذیل اشعار اس بات کی تشریح کر دیتے ہیں کہ وہ محدود ذہنیت کے مالک نہیں تھے۔ ملاحظہ ہوں ؎

اگر کرشن کی تعلیم عام ہو جائے
تو کام فتنہ گروں کا تمام ہو جائے

مٹائیں برہمن و شیخ تفرقے اپنے
زمانہ دونوں کے گھر کا غلام ہو جائے
ہے اس ترانے میں گوکل کی بانسری کی گونج
خدا کرے کہ یہ مقبولِ عام ہو جائے

ظفر علی خاں اپنے ترانے کی مقبولیت کا باعث سری کرشن کی بانسری کی گونج سمجھتے ہیں۔ تعلیماتِ کرشن سے فتنہ گروں کی فتنہ پردازی کا خاتمہ ہو جائے گا یہ انھیں یقینِ کامل ہے۔

میرے سامنے شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنھوں نے اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے ہندو تہذیب اور مذہب کو پیش کیا ہے اور اب تک پیش کر رہے ہیں جوشؔ ملیح آبادی، رنگینؔ، شاہ جہاں آبادی، نظیرؔ، شاہ وحید الدین سلیم پانی پتی، چکبست لکھنوی، جگت موہن لال رواںؔ، دیا شنکر نسیمؔ، اقبالؔ موہانی، حامد اللہ افسرؔ، ثاقب کانپوری، ساغرؔ نظامی، روشؔ صدیقی، شمیمؔ کرہانی، آلِ احمد سرورؔ، بانو رخشِ پرتاب گڑھی، سلام سندیلوی، فراقؔ، وامقؔ جونپوری، ادیبؔ اعظمی، اور شفیقؔ جونپوری، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس ۔ ک ۔ ۔

دگر ادارہ
ارتباط و اختر[illegible]
منت ہے۔ ان کی
پہلوؤں پر نظر ڈالے تو
کی پوری فضا میں اقبال [illegible]
تھے اور انھیں ہر نظریۂ خیال اور [illegible]
اعزاز و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے شخصیت

پیش کیا۔ خواجہ صاحب
"کے عنوان سے
[illegible] فائق کہا۔ خواجہ صاحب
کہ وہ ہر سال خدمتِ خلق اور علم
پر کسی نہ کسی شخص کو خطاب سے نوازتے۔

ڈاکٹر عبدالحق

اقبال ☆
اپنے معاصرین کی نگاہ میں

اقبال ہمارے سب سے بڑے فنکار اور اسرار کائنات
کے رمز شناس فلسفی ہیں ان کا فن دائرہ طلسم زمان ومکان
کے حدود کو توڑ کر جاوداں بن گیا۔ ان کے فکر کی بلندی
و برتری فن کے دلکش اسلوب اظہار سے اس طرح
مربوط ہے کہ فلسفہ و شعر کے حسن امتزاج کی نادر
مثال دنیائے ادب میں بہت مشکل سے ملتی ہے۔ ان کے فکر
فن کا اثر ونفوذ بنی نوع انسان کی لازوال تہذیب کا سوز
ساز اور معیار ومنہاج کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس
تو نام ہے ازاج کا سرچشمہ ان کی دل آویز شخصیت کا رہین
انسان انگیں بر شخصیت کے تنوع ہمہ جہت اور ہمہ گیر
شاعری میں ہندو تہذیب محسوس ہوگا کہ اس وقت ملک
سکی۔ ، د اور مرکزی شخصیت رکھتے۔
شعرا نے اپنے دل جذبات مذہب و مسلک کے لوگ
اور مذہبی عقائد میں رنگ دیا ہے چنانچہ کی یہی دلنوازی

تھی جس نے ان کے دائرہ محبوبیت کو وسیع ترین بنا دیا تھا
اور یہی دائرہ کسی کی سیرت وشخصیت کو ناپنے کا بڑا پیمانہ
قدر ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اقبال کا دور برصغیر
کی تاریخ ساز افراد وافکار کے تلاطم کا دلنشیں مرکب ہے
ہماری تہذیبی تاریخ کے کسی دور میں ایسی بلند و بالا شخصیتوں
کا اجتماع کبھی نہیں ہوا۔ اس اجتماع میں اقبال کی شخصیت مہر
درخشاں کی سی ہے ان کے معاصرین میں شاعر ادیب عالم
صوفی، مصلح، مفکر، قومی رہنما، اور قومی سربراہان مملکت
شامل ہیں۔ ان ہی بزرگوں کی شفقت دوستوں کی محبت
اور عزیزوں کی عقیدت حاصل تھی۔

ان کے معاصرین کی حد بندی میں ماہ وسال کی
دشواریاں حائل ہیں۔ معاصرین کا اطلاق ہم عمروں اور
ایک ہی دور کے ساتھیوں پر ہوتا ہے لیکن پیدائش اور

وفات کی تاریخوں پر سختی سے کار بند ہو کر معاصرین کی فہرست سازی مشکل سے دس بیس سال کا تفاوت درخور اعتنا نہیں جس طرح سرسید، حالی، شبلی کی عمروں میں فرق کے باوجود انھیں معاصر سمجھا جاتا ہے۔ یوں بھی ادب میں اس طرح کی حد بندیاں زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتیں۔ میں نے اپنی آسانی کے لیے چند اشخاص کا انتخاب کیا ہے کیوں کہ اقبال کے معاصرین کی فہرست بہت طویل ہے۔

اقبال کی شاعری کے آغاز کے وقت لاہور کی ادبی فضا پر چند اساتذہ چھائے ہوئے تھے۔ ارشد گورگانی دہلی کے شاہی خاندان کے بزرگ تھے فیروز پور کے سرکاری مدرسے میں فارسی پڑھاتے تھے اقبال نے جب پہلی بار لاہور کے مشاعرے میں یہ مطلع پڑھا۔

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوال و صال کے

لوگ متوجہ ہوئے۔ اقبال نے جب شعر پڑھا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مری عرق انفعال کے

مرزا ارشد یہ شعر سن کر پھڑک اٹھے، بولے میاں اقبال اس عمر میں یہ شعر!

اقبال خاص لب و لہجہ میں ترنم سے شعر پڑھتے تھے اور یہ انداز ترنم اتنا مقبول ہوا کہ لوگ اقبال کے آہنگ کی پیروی کرنے لگے۔ خواجہ دل محمد اکثر اقبال کا آہنگ اختیار کرتے۔ مرزا ارشد گورگانی تحت اللفظ میں پڑھتے تھے اقبال کے آہنگ کی پیروی دیکھ کر انھیں ایک نظم میں کہنا پڑا۔

"نظم اقبال نے ہر اک کو گویا کر دیا"

اقبال کا کلام خاص اہتمام سے مخزن میں شائع ہوتا شیخ عبدالقادر ان کے عزیز دوست تھے وہ تعریفی اور توضیحی نوٹ بھی لگا دیتے انہی کا یہ قول "بانگ درا" کے مقدمہ میں شامل ہے۔

"اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا غالب کو اردو فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا۔ اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

مولانا شبلی اگرچہ اقبال کے معاصر نہیں لیکن ان کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے کہ "جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈ ھ لیں گے۔"

خواجہ حسن نظامی اور اقبال ایک قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اور یہ سلسلہ شروع ہی سے قائم تھا۔ اقبال مزید تعلیم کے لیے ۱۹۰۵ء میں لندن روانہ ہونے سے پہلے دہلی پہونچے اور خواجہ صاحب کی معیت میں سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار پر نغمہ و شعر سے بھر پور التجائے مسافر کے عنوان سے اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ خواجہ صاحب نے اخبار "وکیل" امرتسر میں "ہمارا پردیسی" کے عنوان سے خبر شائع کی اور اقبال کو ہونہار لائق فائق کہا۔ خواجہ صاحب کا مدتوں سے یہ طریقہ تھا کہ وہ ہر سال خدمت خلق اور علم یا خدمت دین کی بنا پر کسی نہ کسی شخص کو خطاب سے نوازتے۔

انھوں نے ۱۹۰۵ء میں اقبال کو سپاسنامہ کے خطاب سے نوازا تھا۔ اقبال کی نظم "ترانۂ ہندی" نے اقبال کی شہرت کو گھر گھر پہونچا دیا تھا۔ اقبال تقریباً تین سال یورپ میں مقیم رہے۔ مختلف احباب سے ملاقاتیں رہیں۔ بعض تعلقات نے نقش دوام اختیار کیا۔ عطیہ فیضی کا نام قابل ذکر ہے۔ انھیں اقبال کو قریب سے دیکھنے کے کئی موقع ملے انھوں نے اپنی ڈائری میں اقبال کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال غیر معمولی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ پراسرار ذہن کے ساتھ خوش گفتاری اور پر مزاح طبیعت پائی تھی۔ اقبال کے پاس علم کا بے پایاں ذخیرہ تھا۔ ان کی یادداشت قابل رشک تھی۔ ان کی تیز نگاہیں راز دو عالم کے منکشف کرتی تھیں۔

اقبال کے فکری استفادہ و استحکام اور اس کی تشکیل و تربیت میں دو اساتذہ خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ مولانا میر حسن کے علاوہ پروفیسر آرنلڈ کی شخصیت اقبال کے لئے مشعل راہ بنی۔ الوداعی نظم میں اقبال نے لکھا ہے ؎

تو کہاں ہے اے کلیم ذرّۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم

پروفیسر موصوف نے اپنے ہونہار شاگرد پر ہمیشہ ناز کرتے اور فخر سے کہتے کہ اقبال اگرچہ میرا شاگرد ہے لیکن میں اس کی تحریروں سے اکتساب فیض کرتا ہوں۔ یورپ سے واپسی پر ان کے کلام و پیغام کا حلقہ اثر روز افزوں تھا۔ منشی محمد دین فوق سیالکوٹی اقبال کے ہم وطن اور ہم راز تھے۔ پہلے پیسہ اخبار میں ملازم تھے بعد میں پنجہ فولاد، نظام، کشمیری میگزین اخبار نکالتے رہے۔ کئی کتابیں لکھی ہیں اقبال کے ایما سے رسالہ طریقت بھی نکالا۔ کشمیری میگزین کے پہلے شمارہ جنوری ۱۹۰۹ء ولایتی چٹھی کے نام سے اقبال کا ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اقبال کو فخر قوم ملت لکھے۔ جب ۱۹۰۸ء میں ۲۷ جولائی کو اقبال لاہور پہونچے۔ تو ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ شیخ گلاب دین خان بہادر محمد شفیع نے اقبال کو خراج تحسین پیش کیا۔ اللہ یار جوگی نے نظم سنائی ؎

کدھر ہے کیف مسرت مجھے سنبھال سنبھال
کہ ہو کے آئے ولایت سے ڈاکٹر اقبال

منشی علی خاں کی دوسری نظم تھی ؎

آمد اقبال سے جشن طرب گھر گھر ہوا
اوج پر آج پھر لاہور کا اختر ہوا

اقبال کی زندگی اور شاعری پر فوق نے ۱۹۰۵ء میں سب سے پہلے تفصیلی مضمون لکھا جس میں ان کے کلام کی واقعیت سوز و گداز فلسفہ و تصوف پر خاص توجہ دی گئی۔

یورپ سے واپسی پر اقبال نے وکالت شروع کی۔ اس وقت لاہور میں مولوی شاہ دین محمد، میاں محمد شفیع، لالہ شادی لال، لالہ لاجپت رائے، میاں فضل حسین ریبنڈرت شیو نرائن شمیم عدالت عالیہ کی رونق سمجھے جاتے تھے۔ ذوالفقار علی خاں، مرزا جلال الدین اور اقبال بار روم میں ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے ان کو اصحاب ثلاثہ کہا جاتا تھا۔ سر جوگیندر سنگھ بھی حلقے میں شامل ہوئے نظم موثر اسی تعلق کا ایک دلچسپ اظہار ہے۔

کیسی پتہ کی بات جوگندر نے کہی
موثر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا علاج

مرزا جلال الدین لکھتے ہیں کہ اقبال جلیل القدر شاعر رفیع المرتبت۔ عالم مرجع خاص و عام تھے۔ بے حد حساس مگر زود

بچ رہتے تھے۔

چہرے کے خد و خال کی موزونیت قد و قامت کا تناسب، جسم کی شاعت اور بشاشت کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہتے۔

جسٹس شاہ دین ہمایوں اقبال کے دوست اور بہی خواہ تھے۔ مخزن اکتوبر ۱۹۰۱ء میں ایک نظم "چمن کی سیر" لکھی تھی۔ جس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اعجاز دیکھو تو سبھی یاں کیا سماں ہے آج
نیرنگ آسمان و زمیں کا بنا ہے آج
اقبال تیری سحر بیانی کہاں ہے آج
ناظر کمان فکر سے مار ایک دو خدنگ

از نغمہ ہائے دلکش ایں چار یار مار
پنجاب خوش نواست ہمایوں دیار مار

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ شاعروں میں ایک حسین نوجوان ناک پر عینک لگائے شلوار اور چاندنی جوتی پہنے اور گریبان کا بٹن کھلا ہوا اسٹیج پر بے نیازی سے کھڑا انتہائی خوش اسلوبی سے ایک مخصوص لے میں نظم خواں ہے۔

"نہیں منہت کش تاب شنیدن"

علی بخش اقبال کا ملازم اور عمر بھر کا رفیق تھا یہ رفاقت اور شیفتگی آخری دم تک باقی رہی۔ اس کی نظر میں اقبال جیسا انسان نہیں دیکھا گیا۔

مولوی ظفر علی خاں اقبال کے قریبی دوست تھے۔ مشہور اخبار "زمیندار" کے مدیر و مالک تھے۔ اقبال کے پرستاروں میں سے تھے ان کی نظر میں اقبال کی قدر و قیمت صرف فلسفی شاعر کی ہی نہیں بلکہ ہر دلعزیز اور برگزیدہ انسان اور بلند پایہ

مفکر کی تھی۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی سے اقبال کے بہت اچھے مراسم تھے۔ اقبال کا ایک گونہ احترام کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اقبال کا معجزہ فکر و فن ایک نئی دنیا کے ممکنات سے بھرپور آگہی بخشتا ہے۔ اقبال ہمیشہ مطالعہ فکر و نظر میں مصروف رہے اس باب میں سید سلیمان ندوی کا نام سر فہرست ہے۔ اقبال نے اسی لئے انھیں علوم اسلامی کے جوئے شیر کا فرہاد کہا ہے۔ ان کی رائے میں اقبال عبقری ذہن کے ساتھ ساتھ ایک نئے علم کلام کے بانی تھے۔ اقبال کے ہم وطن اور ہندوستان میں فارسی شاعری کے آخری روشن چراغ مولانا گرامی اقبال کے گہرے دوست، قدرداں اور سخن شناس تھے اقبال کے بارے میں ان کا یہ شعر ؎

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و بے خبر نتواں گفت

بہت مشہور رہے مطالعہ اقبال میں سید نظیر نیازی کے افادات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اقبال کے سب سے زیادہ خطوط انھیں کے نام ہیں ان کے شہرہ آفاق انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ نیازی نے ہی کیا ہے ان کا خیال ہے کہ اقبال ایسا شاعر جس کا مقابلہ رومی اور گوئٹے سے ہی ہو سکتا ہے وہ شاعر حیات ہے ان کے فلسفیانہ خیالات ان کی فکری تخلیق کی جد و جہد کے نتائج ہیں۔ سیرت اقبال پر سب سے اچھی کتاب عبدالمجید سالک کی "ذکر اقبال" ہے۔ انھوں نے بھی اقبال کو بہت قریب سے دیکھا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ اقبال علوم مغربیہ کے فاضل اجل، انگریزی زبان کے بہترین انشا پرداز اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کے باوجود مغربی تہذیب سے حیرت انگیز طور پر محفوظ تھے،

یہ وہی سالک ہیں جنھوں نے سر کا خطاب ملنے پر ایک طنزیہ نظم لکھی تھی جس کا یہ مصرعہ بہت مشہور ہوا ؂

سرکار کے دربار میں سر ہو گئے اقبال

بیرون ملک کے چند ہم عصر دوستوں کا ذکر بھی سن لیجئے۔ ایران میں اقبال کے پرانے دوست اور مداح سید محیط طبا طبائی اور پروفیسر سعید نفیسی تھے۔ موخر الذکر نے لکھا ہے اس جہاں میں روشنی پھیلانے والا خورشید عظیم الشان شاعر محمد اقبال ہے جو نو سال کے ہندو ایران کے فارسی روایات کا وارث ہے ایران کے ملک الشعرا محمد تقی بہار کا یہ شعر ضرب المثل بن چکا ہے ؂

عصر حاضر خاصہ اقبال گشت
واحدی کز صد ہزاران برگذشت

مشہور مستشرق پروفیسر رینالڈ اے نکلسن اقبال کے گہرے دوست اور پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسرار خودی کے ترجمہ و اشاعت کے ذریعہ اقبال کو یورپ میں متعارف کرایا ان کا بیان ہے کہ اقبال مشرق میں پیدا ہوئے اور تعلیم کی تکمیل مغرب میں کی اس طرح مشرق و مغرب کے اقدار باہم شیر و شکر ہوئے۔

اقبال مولانا شاہ نجیب آبادی کی تصانیف کے بڑے معترف تھے۔ دونوں میں دوستی کے بڑے گہرے روابط تھے مولانا نے اپنے پرچہ "عبرت" میں لکھا ہے کہ بڑا ہی خوش نصیب ہے لاہور کہ اس میں نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کا بہترین سمجھدار اور روشن دماغ شخص اقبال موجود ہے اقبالیات میں عاشق حسین بٹالوی کی تصنیف "اقبال کے آخری دو سال" نادر روزگار کتاب ہے انھوں نے اقبال کو بہت ہی قریب سے دیکھا اور برتا ہے۔ ان کی رائے میں اقبال بنیادی طور پر ایک مفکر، ایک فلسفی اور ایک شاعر ہیں انہیں ایک ہمہ گیر مفکر کی بینائی موجود ہے عبدالرحمان بجنوری کی غالب شناسی سے کون واقف نہیں۔ اسرار و رموز کی اشاعت پر انھوں نے انگریزی میں ایک طویل مضمون رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ" میں لکھا تھا۔ وہ جملے پیش کر رہا ہوں۔ غالب، حالی، اور اقبال ایک مقدس اقانیم ثلاثہ کے ارکان ہیں۔۔۔ اقبال کے ساتھ ادب نوجوانوں کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ اور خود ہی جواں ہو جاتا ہے" اقبال کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ "ابوالاثر حفیظ جالندھری کے" شاہنامہ اسلام کو پسند کرتے تھے حفیظ بھی اقبال کو بڑی پر وقار عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے ان کا یہ شعر خاص معروف ہے ؂

تیرا درس زندگی میرا شریک حال ہے
اے مرے روشن ستارے تو مرا اقبال ہے

سائل راولپنڈی کا یہ شعر بھی خاص توجہ چاہتا ہے؂

اقبال شاعری کا پیمبر ہے بالیقیں
اقبال ایسا دہر میں پیدا ہوا نہیں

فانی اقبال کو نظم نگار شاعر مانتے رہے کیوں کہ ان کے خیالات اقبال کے افکار سے متصادم تھے اقبالیات میں سرزمین دکن کے متقدمین اور ممدوحین کی خدمات شاندار روایات کی حامل ہیں۔ وہاں کی کئی بزرگ اور دلنشین شخصیتوں کے اقبال کا خاص تعلق تھا۔ نواب بھوپال کی دلداری کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ سر راس مسعود سے اقبال کا قلبی تعلق تھا مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، نواب سر اکبر حیدری دولت آصفیہ کے سربراہ نظام دکن، بہادر یار جنگ، مولوی عبدالحق اور مسز

روجنی نائیڈو ریہ اقبال کے پرستاروں میں سے تھے۔ مہاراجہ
نے اپنی ڈائری میں جگہ جگہ اقبال کا ذکر بہت ہی احترام و
فخر کے ساتھ کیا ہے۔ مسز نائیڈو کی شخصیت بڑی ہی پرکشش
در محبوب تھی۔ ان کی شخصیت میں ہندوستان کی مشترک تہذیب
کا خوبصورت ترین امتزاج موجود تھا۔ اقبال نے ۱۹۱۱ء میں
عطیہ فیضی کو چند نظمیں بھیجیں اور لکھا کہ مسز نائیڈو کو بھی دکھا دیں
اقبال نے مقام کا اندازہ مسز نائیڈو کے اس جملے سے لگایئے۔
"میں اپنے بہترین دوست اقبال کو ہندوستانی
نشاۃ الثانیہ کا عظیم ترین شاعر کہتی ہوں۔ اس شعر کے اردو
فارسی کارنامے ہندوستانی قوم کے زبردست رہبر ثابت
ہوں گے۔"

ہمارے ملک کے بڑے اور نامور شاعر ٹیگور، اقبال
کے بہت زیادہ مداح اور قدردان تھے۔ ان گوناگوں تعلقات
کی کیفیت اور نوعیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان کا حلقہ
احباب بہت وسیع تھا۔ اور اس میں ہر زاویۂ خیال کے لوگ
حلقہ بگوش تھے، پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی اقبال کا تعلق
گہری دوستی پر مبنی تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنی مشہور تصنیف۔
"تلاش ہند" میں لکھا ہے کہ اقبال ایک شاعر، ایک عالم
اور فلسفی تھے۔ باوجود اختلاف کے ہم دونوں میں کس قدر اشتراک
خیال ہے اور کتنی آسانی کے ساتھ ان سے نباہ ہوسکتا
ہے میں ان کا اور ان کی شاعری کا مداح تھا اور مجھے بڑی خوشی
ہے کہ وہ مجھے پسند کرتے تھے۔

اقبال پنڈت نہرو سے ذہنی طور پر ان کی شخصیت
سے بڑی قربت محسوس کرتے تھے۔ ان کا ذکر ہمیشہ عزت سے
کرتے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اقبال نے اپنے انسان
کامل کی تکمیل کا ایک پہلو پنڈت نہرو کی شخصیت میں دیکھا تھا۔
یہی پہلو ان کے تصور مملکت کا سب سے پیچیدہ مرحلہ ہے۔
"جاوید نامہ" میں اقبال نے دوسرے افلاک کی سیر کے بعد
"آنسوئے افلاک" کی سیر کا تذکرہ کرتے ہوئے امیر کبیر سید علی
ہمدانی سے تخت و تاج کی اصل غایت پر سوال کیا ہے ان کے
جواب پر مشتمل یہ اشعار پنڈت نہرو کی شخصیت سے منسوب کئے
گئے ہیں۔

شہر گیر و خویش باز اندر ستیز   یا جواں مردی چو صرصر تند خیز
روز صلح از شیوہ ہائے دلبری   روز کیں کشور کشا از قاہری

(اُردو سروس)

ڈاکٹر محفوظ الحسن، ایم اے، پی ایچ ڈی

اُردو کا پہلا سانٹ نویس

مکرمی، تسلیم

عرصہ ہوا، شاعر کا ایک مقالہ "اُردو کا پہلا سانٹ نویس" کے عنوان سے بھیجا تھا۔ مدیر شاعر نے وہ مضمون واپس بھیج دیا کہ انھیں عظیم الدین کے سانٹوں پر ہی اعتراض تھا۔ اُن کی نظر میں عظیم الدین کے سانٹ آزاد نظم کے دائرے میں بھی نہیں آتے تھے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ عظیم الدین کو پہلا سانٹ نویس کیسے مان لیتے۔ ان کے خط کے جواب میں میں نے ایک طویل خط لکھا جس کا لہجہ بے حد تلخ تھا، (جو نہیں ہونا چاہیے تھا) چنانچہ اس خط کے جواب میں مدیر شاعر نے اقرار کیا کہ انھوں نے مقالہ پورا پڑھا نہیں تھا۔ دوسرے میری تحریر کی وجہ سے انھیں تسامح ہوا۔ بعد میں میرے تفصیلی خط کی روشنی میں انھوں نے اقرار کیا کہ عظیم الدین کی نظمیں سانٹ کے پیمانہ پر پوری اترتی ہیں

چنانچہ میں نے دوبارہ انھیں ایک خط لکھا۔ جس کی نقل میرے پاس محفوظ نہیں لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس خط میں میں نے اپنی تلخ کلامی کے لیے معذرت کرتے ہوئے ان کو لکھا تھا کہ جب آپ نے یہ مان لیا کہ عظیم الدین کی نظمیں سانٹ کے پیمانہ پر پوری اُترتی ہیں تو پھر دوسرے لفظوں میں آپ نے یہ تسلیم کر لیا کہ عظیم الدین پہلے سانٹ نویس ہیں، اس لیے کہ پہلے آپ کو ان کی نظموں کے سانٹ ہونے پر ہی شبہ تھا، اس لیے اب یہ مضمون آپ شاعر میں ہی شائع کر دیں تو زیادہ مناسب اور موزوں رہے گا۔ میرے اس خط کے جواب میں اُنھوں نے شاعر کی کئی ماہ کے عدم اشاعت اور شاعر پر کام کی بھاری مضمون کی اطلاع دیتے ہوئے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ "کسی دوسرے رسالہ میں شائع کرا دیں۔"

مقالہ اور مدیر شاعر اور میرے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اس کی نقل اب آپ کے پاس ارسال کر رہا ہوں تاکہ آپ اسے "فروغ اردو" میں شائع کرسکے۔ مجھے شکریہ کا موقع دیں اور ساتھ ہی ساتھ مدیر شاعر کی صحافتی ایمانداری اور ان کی حقیقت بیانی کی داد دیں۔ میں مدیر شاعر کا بے حد ممنون ہوں کہ اُنھوں نے میرے خطوط ٹھنڈے دل سے پڑھے۔

ان پر غور کیا ان کی روشنی میں اپنی قائم کردہ رائے میں تبدیلی کی۔ اور اس کا اعتراف کیا۔ اور بڑی بے باکی سے کام لیا آج کل اگلی شرافت کے یہ نمونے خال خال ہی ملتے ہیں۔

اس خط کو بھی مقالہ کے ساتھ ہی شائع کرنے کی زحمت گوارا کریں گے، اگرچہ مقالہ اور خطوط کافی جگہ لیں گے لیکن یہ ایک ادبی بحث ہے اور اس کا مکمل شائع ہونا ہی اس کی افادیت و اہمیت کو واضح کرے گا۔

اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کے جواب کا شدت سے انتظار رہیگا
جواب کے لئے ٹکٹ منسلک ہے

خیر اندیش
محفوظ

سانٹ اُردو ادب میں بلاشبہ مغربی ادب کی دین ہے۔ اُردو ادب میں اس کی عمر تک بھگ ستر پچھتر سال کی ہے۔ لیکن اس صنف کو کوئی خاص مقبولیت حاصل نہ ہو سکی غالباً اس کی وجہ اُردو کا مشرق پسند مزاج ہے جس نے اس مغربی صنف کو اپنی برادری میں داخل کرنا پسند نہیں کیا" اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اب تک اس کی ابتداء کا راز صیغۂ راز میں ہے۔ بیشتر محققین اُردو ادب نے اس کی ایجاد کا سہرا اختر شیرانی کے سر باندھا ہے اور بعضوں نے اختر جوناگڑھی کو اس کا موجد قرار دیا ہے۔

عبادت بریلوی[1] کا خیال ہے کہ "سانٹ کی ابتداء اختر شیرانی کے ہاتھوں ہوئی تھی آج بھی کبھی کبھی سانٹ لکھے جاتے ہیں لیکن اس صنف میں اختر شیرانی مرحوم ہی کو سب سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔ اختر نے اس کو شروع کیا اور اس کے بعد کوئی اس کو برت نہ سکا۔"

حکیم یوسف[2] حسین مدیر نیرنگ خیال کا خیال ہے کہ "سانٹ حضرت اختر شیرانی کی ایجاد ہے" قیوم[3] نظر کی نظر میں بھی اختر شیرانی ہی اس صنف کے موجد ہیں لکھتے ہیں "ایک بیان کے مطابق اردو میں پہلا سانٹ اگرچہ ن۔م۔ راشد نے لکھا لیکن جو سانٹ شائع شدہ صورت میں آیا وہ اختر شیرانی کا تھا اور یوں اُردو میں سانٹ کے آغاز کا سہرا اختر شیرانی کے سر بندھا"

عزیز[4] تمنائی، ن۔م۔ راشد، عظمت اللہ خاں اور اختر شیرانی تینوں کو اس کا موجد قرار دیتے ہیں کسی کو اولیت نہیں دیتے۔ رقمطراز ہیں، "اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں عظمت اللہ خاں، ن۔م۔ راشد، اور اختر شیرانی نے اس کی طرح ڈالی، ان کے علاوہ میرے علم میں کسی معروف شاعر نے اُردو میں سانٹ نہیں لکھا۔"

ن۔[5] م۔ راشد نے اختر جوناگڑھی کو سانٹ کا موجد قرار دیا ہے اپنی سوانح حیات میں رقمطراز ہیں۔

"اُردو میں سب سے پہلا سانٹ اختر جوناگڑھی نے لکھا تھا۔ دوسرا میں نے جس کا عنوان تھا "زندگی" اور یہ لاہور کے ایک ہفت روزہ اخبار کے پہلے صفحہ پر شائع ہوا تھا اور اس کے بعد ہمایوں (اپریل ۱۹۳۳ء) میں چھپا۔"

۱۔ اعجاز حسین، اردو شاعری کا سماجی پس منظر ص۴۴۳ [illegible]
۲۔ بحوالہ حنیف کیفی، اردو کا پہلا سانٹ، مطبوعہ ہماری زبان ۲۲ مارچ [illegible]
۳۔ عزیز تمنائی۔ اصناف شاعری نمبر نگار ۱۹۷۶ء۔ سانٹ اور اس کا فن۔

خلیل الرحمان اعظمی کو کافی تلاش و جستجو کے باوجود اختر جوناگڑھی کے سانٹ کا سراغ نہ مل سکا چنانچہ انھوں نے بھی اختر شیرانی کے سر ہی اس کی ایجاد کا سہرا باندھ دیا خامہ فرسا ہیں

"ن۔م۔ راشد نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اردو میں پہلا سانٹ اختر جوناگڑھی نے لکھا تھا لیکن یہ سانٹ باوجود تلاش کے نہ مل سکا... اختر شیرانی نے پہلے پہل سانٹ کو اردو میں متعارف کرایا جو نیرنگ خیال اور دوسرے رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔"

حنیف کیفی کی تحقیق و جستجو نے ن۔م۔ راشد کے بیان کی صداقت ڈھونڈھ نکالی۔ اپنے ایک مضمون بعنوان اردو کا پہلا سانٹ مطبوعہ ہماری زبان ۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء میں رقمطراز ہیں۔

"اختر جوناگڑھی کا سانٹ الناظر لکھنؤ، بابت نومبر ۱۹۱۴ء صفحہ ۱۳ پر موجود ہے...... یہ سانٹ اس وقت لکھا جا چکا تھا جب تصدق حسین خالد ۱۳ برس کے اختر شیرانی ۹ سال کے اور ن۔م۔ راشد صرف چار سال کے بچے تھے، پھر اختر جوناگڑھی کا یہ سانٹ ٹھیک ۲۴ سال بعد ان کے مجموعہ کلام لمعات اختر میں ترمیم شدہ صورت میں شائع ہوا یہ سانٹ لمعات اختر میں ص۲۲ پر دیکھا جا سکتا ہے یہ مجموعہ ۱۹۳۸ء میں آگرہ اخبار پریس کی وساطت سے چھپا تھا"

تفصیل بالا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا سب سے پہلا سانٹ اس صدی کی دوسری دہائی میں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا تھا، جو اختر جوناگڑھی کا تھا، اس لحاظ سے اختر جوناگڑھی کو اردو کا پہلا سانٹ نویس قرار دیا جانا چاہیے۔ میں نے اس سلسلے میں مزید تحقیق و جستجو کے لیے جب مشہور مستند محقق عطاء الرحمان کاکوروی سے رجوع کیا تو انھوں نے لکھا کہ

"ن۔م۔ راشد، اختر شیرانی وغیرہ بعد کے شاعر ہیں ان سے قبل اور بہت قبل ڈاکٹر عظیم الدین نے سانٹ کا نمونہ پیش کیا تھا، اور ان کے مجموعہ گل نغمہ میں موجود ہے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اس کے پہل کرنے والے ہیں، اس صدی کی پہلی دہائی میں یہ صنف عالم وجود میں آ چکی تھی۔"

(راقم کے نام ایک خط مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۷۳ء)

عطاء الرحمان صاحب کی صداقت کی تصدیق کے لیے جب میں نے "گل نغمہ" مجموعہ کلام ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ عطاء الرحمان صاحب کا یہ بیان بالکل درست ہے کہ یہ صنف اس صدی کی پہلی دہائی میں وجود میں آ چکی تھی اس لیے کہ گل نغمہ میں جو عکس تحریر شامل ہے اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ عظیم الدین نے اس صدی کی پہلی دہائی میں ہی اس پر طبع آزمائی کی تھی۔ گل نغمہ میں شامل عظیم الدین کا عکس تحریر اس بات کا شاہد ہے کہ رقص بسمل کا سانٹ نمبر ۲ "ہوا ایک دن تو سہہ لون ہے روز ہی برافت" ۲۸ دسمبر ۱۹۰۳ء کو بھی لکھا گیا تھا، اس کے علاوہ ۱۹۰۴ء کا لکھا ہوا ایک سانٹ معاصر میں ۱۹۴۹ء کے ستمبر و اکتوبر کے مشترکہ شمارہ میں بھی شائع ہوا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ سانٹ لکھا گیا تھا اس وقت تصدق حسین خالد دو یا تین برس کے تھے اور اختر شیرانی اور

م۔ راشد کی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی اور اختر جوناگڑھی
کے سانٹ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئے تھے جبکہ عظیم الدین نے
۱۹۱۳ء میں ہی سانٹ پر طبع آزمائی کی تھی، اس لیے یہ
کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عظیم الدین اُردو میں سانٹ کے
موجد ہیں اور اُردو کا پہلا سانٹ نگار ہونے کا شرف
انہیں حاصل ہے۔

اس ضمن میں اس اعتراض کی گنجائش ہے کہ
اختر جوناگڑھی کا سانٹ ۱۹۱۴ء میں شائع ہو چکا تھا
اور عظیم الدین کے سانٹ ۱۹۱۳ء میں لکھے جانے کے
باوجود چھپے نہیں۔ اگر انھیں طباعت کا زیور پہنایا بھی
گیا تو اس صدی کی چوتھی دہائی میں، اس لیے عظیم الدین
کو اوّلیت نہیں دی جا سکتی۔

میرے خیال میں یہ دلیل غیر تشفی بخش ہے اور ناکافی
بھی۔ سائنٹفک تحقیق کا تقاضہ ہے کہ اسباب میں تحقیق
کے پیش نظر ہمیشہ یہ حقیقت ہونی چاہیئے کہ کسی تخلیق کا
عالم وجود میں آنا اور اس کا منظر عام پر آنا یعنی زیور
طباعت پہنا دونوں باتیں ہیں، تقدم میں ہمیشہ اوّل الذکر
کا خیال رکھا جاتا ہے اور رکھا جانا چاہیئے۔ اس لیے یہ
بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ عظیم الدین اردو کے پہلے
پہلے سانٹ نویس ہیں اور اسے مان لینے میں کسی قسم کے
شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ
یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ عظیم الدین نے سانٹ پہلے لکھے لیکن
پہلا سانٹ جو مطبوعہ شکل میں ہمارے سامنے آیا وہ اختر جونا
گڑھی کا تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ اور اس سے عظیم الدین کی
اوّلیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے
کہ اردو کے پہلے سانٹ نویس عظیم الدین ہیں لیکن
پہلا سانٹ جو زیور طباعت سے آراستہ ہوا وہ اختر
جوناگڑھی کا تھا

عظیم الدین نے بکثرت سانٹ لکھے ہیں، اور سانٹ
کے مروجہ دونوں طرزوں پر طبع آزمائی کی ہے اور کامیابی
سے ہمکنار ہوئے ہیں، دونوں مروجہ طرز کے ایک ایک
سانٹ ملاحظہ ہوں،

اطالوی طرز

ہو ایک دن تو سہہ لوں ہے روز ہی یہ آفت
اُلجھن ہے بے بسی ہے نالہ ہے بے دلی ہے
فریاد ہے فغاں ہے ماتم ہے نوحہ گری ہے
تو ہی جو دسترس ہو پھر کیوں اٹھاؤں زحمت
اے مرگ ناگہانی ہے مجھ سے کیا عداوت!
کس کام کی ہماری ناکام زندگی ہے
سب سے ہوں بے تعلق کیا دل گرفتگی ہے!
دن تو گذر رہے ہیں لیکن بصد مصیبت
بیٹھے بٹھائے مجھ کو کیوں اس سے جا ملایا
اے چرخ بے مروت کج رو ستم کے بانی!
دو دن بھی تیرے ہاتھوں میں نے نہ چین پایا
اک قہر ہے بلا ہے یہ دور آسمانی
آخر مجھے مٹایا! آخر مجھے مٹایا!!
ہے ہے مری جوانی! ہے ہے مری جوانی!!

شکسپیرین طرز

۱۔ کیا یہ ہے تیرا ارادہ کہ شب وروز تری
یاد رکھے میری ان نیند بھری آنکھوں کو وا

کیا یہ خواہش ہے تری چین نہ ہو مجھکو کبھی
جلوہ گر کیوں ہے مرے دل میں جو ہے مجھ سے جدا

ہے یہ تصویر کہ ہے روح تری جس کو تو
بھیجتی ہے مرے افعال کی نگرانی کو

یا تو خود آتی ہے بے مہر ستم گر بد خو
تاکہ دیکھے مری راتوں کی پریشانی کو

تجھ کو تو مجھ سے محبت نہیں ہاں اب سمجھا
آہ یہ عشق ہی رکھتا ہے مجھے بے خور و خواب

میرے ارام کا دشمن ہے یہی دل میرا
اس کم بخت کے ہاتھوں میں ہوں اتنا بیتاب

تجھکو واں چین ہے ارام ہے اور راحت ہے
یاد میں تیری یہاں مجھ پہ عجب آفت ہے

دوسرا سانٹ نہ صرف شکسپیرین طرز میں ہے بلکہ شکسپیر کے ہی ایک سانٹ Shall I compare thee کا ترجمہ ہے لیکن شاعر کا کمال یہ ہے کہ یہ سانٹ اس کی اپنی تخلیق معلوم ہوتی ہے اور ترجمہ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

شاعر۔ قصر الادب ۷۸۹

۱۸ راگست ۱۹۹۰ء

مکرمی۔ تسلیم

خط کے ساتھ مضمون ملا۔ شکریہ

قطع نظر اس سے کہ پہلا سانیٹ نگار کون ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ عظیم الدین کی نظمیں سانیٹ کی تعریف میں آتی ہیں یا نہیں۔ جہانتک مجھے علم ہے۔ سانیٹ میں عموماً ۱۴ مصرعے ہوتے ہیں پہلے ایک مصرعا ایک ردیف اور قافیے میں لکھتے ہیں پھر ایک ضرم [illegible] دوسرے ردیف و قافیے میں۔ جب دو باتیں بند اسطرح ہو جاتے ہیں تو ایک مطلع کسی دوسرے ردیف و قافیہ میں لکھ کر نظم ختم کر دیتے ہیں، پوری نظم کسی ایک ہی بحر اور ایک ہی موضوع پر ہوتی ہے۔

عظیم الدین کی نظمیں عام قسم کی آزاد نظمیں ہیں اختر شیرانی اور اختر جونا گڑھی کے سانیٹ کی ساخت پر غور کر لیجئے، پھر کوئی فیصلہ کیجئے۔ اس سلسلے میں دیگر لوگوں سے بھی رائے لے لیجئے۔

مخلص

اعجاز صدیقی

ایس۔ ان۔ سنہا۔ کالج

اورنگ آباد۔ گیا

مکرمی۔ تسلیم

آپ کا خط ملا۔

مضمون کی واپسی کا شکریہ۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آپ جیسا بالغ نظر انسان بھی جانب داری کا شکار ہو گیا۔

آپنے لکھا ہے کہ "عظیم الدین کی نظمیں عام قسم کی آزاد نظمیں ہیں۔ اختر شیرانی اور اختر جونا گڑھی کے سانیٹ کی ساخت پر غور کر لیجئے پھر کوئی فیصلہ کیجئے، اس سلسلے میں دوسرے لوگوں سے بھی رائے لے لیجئے"

غالباً آپ نے مقالہ پڑھا نہیں، عطا الرحمان عطا کاکوی اردو کے مشہور اور مستند محقق ہی نہیں بلند پایہ شاعر بھی ہیں۔ مغربی شاعری اور اس کی مختلف اصناف پر ان کی نظر ہے ان کی نظروں میں عظیم الدین نے سانٹ لکھے ہیں اور ان کا اشارہ انہی

سانٹوں کی طرف ہے جو میں نے بطور ثبوت مقالے
میں پیش کئے ہیں۔ معین احسن جذبی، اردو کے شاعر
اور اُستاد ہیں۔ انگریزی ادب سے واقف ہیں۔
انھوں نے بھی ان سانٹوں کی ساخت پر کوئی اعتراض
نہیں کیا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد انگریزی ادب
کے استاد رہ چکے ہیں۔ انھوں نے گل نغمہ اپنے پر مغز
مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے ان کے خیال میں
بھی عظیم الدین کے سانٹ فنی کسوٹی پر پورے
اترتے ہیں (عظیم الدین شاعری پر پیش کردہ انکی
آرا سے اختلاف ممکن ہے)

آپ نے خود لکھا ہے کہ سانٹ میں ۱۴ مصرعے ہوتے
ہیں۔ کیا ان سانٹوں میں چودہ مصرعے نہیں تھے؟ اگر گل نغمہ
آپ کے پاس ہو تو براہ کرم اس کی ورق گردانی کی زحمت
گوارہ فرمائیں۔

عام طور پر انگریزی ادب میں سانٹوں پیش کش دو
طریقے سے ہوئی ہے۔ ایک اطالوی شاعر پٹرارک سے منسوب
ہے اور دوسرا انگریزی شاعر شکسپیر سے۔ پہلے طرز کے سانٹوں
میں دو حصے ہوتے ہیں پہلا حصہ آٹھ مصرعوں کا ہوتا ہے۔
جسے octave کہتے ہیں اور دوسرا چھ مصرعوں کا جسے
sestet کہتے ہیں، ترتیب قوافی ہر دو حصے کی اس طرح ہوتی ہے۔
پہلا حصہ اب ب ا۔ اب ب ا دوسرا حصہ۔ ج د ہ۔ ج د ہ
یا ج د، ج د، ج د پورے سانٹ کی بحر ایک ہوتی ہے۔

دوسرا طریقہ جو مروج ہے وہ شکسپیرین ہے اسکی ساخت
تین مربع، یا تین قطعات یا تین بند (جو بھی نام دیں) جسے انگریزی
میں quatrains کہتے ہیں اور ایک مطلع جسے انگریزی میں
couplet کہتے ہیں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس طرح ہر چہار مصرعے
(تین مربع، بند یا قطعات اور مطلع) کی ترتیب قوافی حسب ذیل
ہوتی ہے۔

(۱) اب اب (۲) اب اب (۳) اب اب (۴) الف الف

یعنی سکسپیرین طرز میں ہر بند کا پہلا اور تیسرا مصرع ایک قافیہ
وردیف میں اور دوسرا چوتھا مصرع ایک قافیہ و ردیف
میں ہوتا ہے اور کپلٹ کے دونوں مصرعے ایک ہی ردیف
وقافیہ میں ہوتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ

"سانٹ میں عموماً چودہ مصرعے ہوتے ہیں پہلے ایک مصرع
ایک ردیف و قافیہ لکھتے ہیں پھر ایک شعر دوسرے ردیف و
قافیہ میں پھر ایک مصرع پہلے مصرع کے ردیف وقافیہ میں لکھ کر
ایک بند پورا کرتے ہیں جب دو یا تین بند اس طرح ہو جاتے ہیں
تو ایک مطلع کسی دوسری ردیف وقافیہ میں لکھ کر نظم ختم کر دیتے
ہیں۔ پوری نظم کسی ایک ہی بحر اور ایک ہی موضوع پر ہوتی ہے"

ان سطور سے واضح ہوتا ہے کہ سانٹ کا تصور آپ کے
ذہن میں واضح نہیں۔ پھر دو تین بند کی بات بھی خوب رہی۔ اگر
سانٹ میں چودہ مصرع ہوتے ہیں تو پھر تین بند تو ہو سکتے ہیں
دو نہیں، اگر دو بند ہوں گے تو پھر کپلٹ جسے آپ نے مطلع کہا ہے
اس کی نذر درست نہیں رہ جاتی ہے آپ نے اطالوی سکسپیرین طرز
کے سانٹ کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ وضاحت اوپر کی جا چکی ہے
مذکورہ توضیحات کو مد نظر رکھتے ہوئے عظیم الدین کے مندرجہ ذیل
دو سانٹ دیکھیں اور بجائے اس کے کہ میں اختر شیرانی یا اختر
جونا گڑھی کے سانٹ کی ساخت پر غور کروں آپ کو خود
درج ذیل سانٹوں کی ساخت پر غور کرنیکی دعوت دیتا ہوں۔

اطالوی طرز کا سانٹ

ا۔ ہو ایک دن تو سہہ لوں ہے روز ہی یہ آفت
ب۔ اُلجھن ہے بے بسی ہے نالہ ہے بے دلی ہے
ب۔ جز یاد ہے فغاں ہے ماتم ہے سرزنی ہے
ا۔ تو ہی جو دسترس ہو پھر کیوں اٹھاؤں زحمت
ا۔ اے مرگ ناگہانی ہے مجھ سے کیوں عداوت
ب۔ کس کام کی ہماری ناکام زندگی ہے
ب۔ سب سے ہوں بے تعلق کیا دل گرفتگی ہے
ا۔ دن تو گذر رہے ہیں لیکن بصد مُصیبت

ج۔ بیٹھے بٹھائے مجھکو کیوں اس سے جا ملایا
د۔ اے چرخ بے مروت کج روستم کے بانی
ج۔ دو دن بھی تیرے ہاتھوں میں نے نہ چین پایا
د۔ اک قہر ہے بلا ہے یہ دور آسمانی
ج۔ آخر مجھے مٹایا! آخر مجھے مٹایا!!
د۔ ہے ہے مری جوانی! ہے ہے مری جوانی!!

اچھی طرح غور کر لیں کیا یہ نظم سانٹ نہیں ہے؟ کیا اس کی ساخت سانٹ کی نہیں ہے؟ کیا اس میں چودہ مصرعے نہیں ہیں؟ کیا یہ دو حصوں Octave اور Sestet میں منقسم نہیں ہے۔ کیا اسے عام قسم کی آزاد نظم کہا جا سکتا ہے۔

شکسپرین طرز کا ایک سانٹ ملاحظہ ہو

ا۔ کیا یہ ہے تیرا ارادہ کہ شب و روز تری
ب۔ یاد رکھے مری ان نیند بھری آنکھوں کو وا
ا۔ کیا یہ خواہش ہے تری چین نہ ہو مجھکو کبھی
ب۔ جلوہ گر ہے کیوں مرے دل میں جو ہے مجھ سے جدا
ا۔ ہے تصویر کہ ہے روح تری جس کو تو
ب۔ بھیجتی ہے مرے افعال کی نگرانی کو
ا۔ یا تو خود آتی ہے بے مہر ستم گر بد خو
ب۔ تاکہ دیکھے مری راتوں کی پریشانی کو

ا۔ تجھ کو تو مجھ سے محبت نہیں ہاں اب سمجھا
ب۔ آہ یہ عشق ہی رکھتا ہے مجھے بے خور و خواب
ا۔ میرے آرام کا دشمن ہے یہی دل میرا
ب۔ اسی کم بخت کے ہاتھوں میں ہوا اتنا بیتاب

ا۔ تجھکو واں چین ہے آرام ہے اور راحت ہے
ا۔ یاد میں تیری یہاں مجھ پہ عجب آفت ہے

شکسپیرین طرز کے مطابق ہر بندوں کے پہلے اور تیسرے اور دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف ہیں اور کپلٹ یا دوہا یا مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ردیف،
بمبئی میں بہت سے انگریزی داں ہوں گے سانٹ کے سلسلے میں میرے اس بیان کی تصدیق و توثیق آپ کسی بھی انگریزی داں سے کرا سکتے ہیں۔

کیا آپ ان سطور کو شاعر کے صفحات میں جگہ دینے کا جرات مندانہ اقدام کر سکتے ہیں؟　　جواب کیلئے کارڈ حاضر ہے

والسلام
کمترین　　محفوظ

ماھنامہ شاعر؛　　۷ / دسمبر ۱۹۷۵ء

محبی تسلیم

آپ کا طویل خط مل گیا تھا۔ اپنی تکالیف کیوجہ سے خط

پر توجہ نہیں پڑھ سکا تھا۔ آج دوبارہ اسے پڑھا آپ نے بڑی برہمی کا اظہار کیا ہے۔ شکریہ، بغیر کسی برہمی کے بھی خط لکھا جا سکتا تھا۔؟

پُرَاَرکن ساننٹ اور شکسپیرین سانیٹ کی صراحت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ میں نے عظیم الدین کے سانیٹ کی ساخت پر غور کرنے کا ہی مشورہ دیا تھا اور تو کچھ نہیں لکھا تھا میرے پیش نظر سکیپرین سانیٹ ہی کی ساخت تھی، پُرارکن نہیں، اور میں نے عظیم الدین کے ایک ہی سانیٹ پر نظر ڈالی تھی اب جو آپ نے دوبارہ نقل کر کے دو سانیٹ بھیجے ہیں تو ان کے بند الگ الگ کر کے ان پر نظر ڈالی اور ساخت کے اعتبار سے اُنھیں درست پایا آزاد نظم کا تسامح کچھ آپ کی تحریر (کہ آپ نے مصرعے چھوٹے بڑے لکھے تھے کہیں کہیں الفاظ کا اضافہ بھی ہے جیسا کہ اس طویل خط میں یہ مصرع ہے "یہ تصویر تری یا کہ ہے روح تری جس کو کہ تو") اور کچھ پُرارکن ساخت کے آخری حصے کی وجہ سے آزاد نظم کا گمان گزرا آپ نے اچھا کیا کہ میری غلط فہمی کو دور کر دیا۔

اپنے مضمون میں بطور نمونہ آپ نے جو سانیٹ دیئے ہیں اُنھیں یکساں طور پر لکھئے مصرع چھوٹے بڑے معلوم نہ ہوں یہ بھی احتیاط کیجئے کہ کوئی لفظ گھٹے بڑھے نہیں، اور چار چار مصرعوں کے بعد لکیر دے دیجئے سانیٹ کے لکھنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے تاکہ جہاں بھی مضمون چھپے کاتب بھی مصرع یکساں طور پر لکھے اور قاری کو بھی کسی قسم کا تسامح نہ ہو۔

میں اپنی بیماری تکالیف کے علاوہ چند ماہ سے گردے کے درد میں مبتلا ہوں ذاتی ڈاک کے جوابات میں اسلئے تاخیر ہو جاتی ہے۔

مخلص

اعجاز صدیقی

قصر الادب۔ بمبئی

۱۴ نومبر ۱۹۶۵ء

مکرمی۔ تسلیم

آپ کا خط اور مضمون "اُردو کا پہلا سانٹ نویس" مل گیا تھا، میں ڈیڑھ ماہ سے بہت بے سکون ہوں، بیوی کو دل کے دورے پڑے تھے۔ ایک ماہ چار دن سے اسپتال میں ہیں، اور ہنوز ان کی طرف سے اطمینان نہیں ہے لکھنا پڑھنا بہت کم ہو سکا ہے۔

میرے پچھلے خط سے آپ کی غلط فہمی دور ہو گئی، یہ اچھا ہوا، آپنے کسی بھی چھوٹے یا بڑے کی تلخی مجھے گوارا نہیں مضمون واپس کر رہا ہوں تاکہ آپ اسے کسی دوسرے رسالہ میں شائع کرا دیں، شاعر کا حال دگرگوں ہے۔ دو ماہ سے شائع نہیں ہوا ہے۔ بہیں نہایت اہم مقالے پہلے کے جمع ہیں۔ اگر اب "شاعر" مسلسل شائع ہو تو بھی وہ چار پانچ ماہ تک ختم نہ ہوں گے۔ ادبی رسالے تقریباً سبھی ختم ہو گئے ہیں، "کتاب" بند ہو گیا "شبخون" تین ماہ سے نہیں آیا ہے" شاعر کی اشاعت بھی رکی ہوئی ہے صرف "آہنگ" نکل رہا ہے اور بایں وجہ، شاعر پر مضامین نظم و نثر کا زبردست بار ہے۔ ہر ڈاک سے مقالے افسانے آتے ہیں اور نظمیں غزلیں موصول ہوتی ہیں،

اُمید کہ آپ "شاعر" میں اپنے مضمون کے شائع نہ ہونے کا خیال و ملال نہ کریں گے۔

مخلص

اعجاز صدیقی

غزل

پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد فخر دھولیادی

زیر قدم قمر ہے کبھی کہکشاں کبھی — خاموش بیٹھتا نہیں عزمِ جواں کبھی

ہوتی جو دوربیں، نگہِ باغباں کبھی — لٹتا بہار میں نہ میرا آشیاں کبھی

یکساں نہیں رہی روشِ گلستاں کبھی — آئی کبھی بہار تو آئی خزاں کبھی

کیا گل کھلا رہا ہے زمیں پر یہ آدمی — یہ بھی تو سوچ خالقِ کون و مکاں کبھی

گم کردہ راہ ہوتے نہ گر رہبرانِ قوم — منزل سے دور ہوتا نہ یہ کارواں کبھی

ہے دور لامکاں سے، حدودِ نگاہ سے — تجھ کو اسیر کر نہ سکے گا گماں کبھی

کیوں آج وہ خاک بسر اور منفعل ہے؟ — تھا جن کی ٹھوکروں میں یہی خاکداں کبھی

کیا بات ہے لنڈھائے چلا ہے خم پہ خم — اتنا نہ مہرباں تھا پیرِ مغاں کبھی

برسے وہ آگ فخرِ جہاں میں کہ الاماں
آنکھوں سے گریاں ہو سوزِ نہاں کبھی

ادائے حسن کی جوان تصویر

قادر علی انور

جب تیرے گلشنِ حسن پہ جوانی کی بہار آئی ہر تختۂ گل اعضاء کی ہر پالی میں سُرخی کی نکھار آئی۔ تیری مستی طفلی کے سہارے اونچ نیچ اُتار آئی۔ جوانی کے نشیب و فراز کو ساتھ لائی۔ زلف پیچیدہ آئی رنگت گلگوں آئی۔ قامت پہ سرو گھبرایا۔ تیری رفتار کو دیکھ موجیں اپنی چال بھول گئیں۔ اداؤں پہ شمشاد شرمایا۔ آنکھ نشیلی نرگسی آئی۔ ناصیہ روشن کو دیکھ چاند منہ چھپایا۔ زلف و کاکل پر سیاہ بادل شرمایا کہ ہائے دعویٰ بے بنیاد فرمایا۔ جب تو نے ملک مارا ستاروں نے آنکھ جھپکایا۔ سورج کا سر جھکایا۔ تیری آبرو کے ہوتے ہوئے نہ ہلال کا چمکنا راس آیا نہ بجلی کا دمکنا سازگار آیا۔ ع

کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

سپاہی شمشیر بھول جاتے تھے۔ عاشقوں کے سر قتل ہونے کی حسرت میں وبالِ دوش ہو جاتے تھے۔ گردشِ چشم وہ بلا کی کہ گردشِ چرخ اپنی چکر بھول جائے اور تیرے اطراف گھومتا رہ جائے۔ نہ چشموں میں وہ تازگی ہے جو تیری آنکھوں میں ہے نہ حاسد کے دل میں وہ داغ جو تری آنکھوں کی پتلی میں ہے۔ البتہ حاسد کے درون میں اس کا ٹھپہ ہے۔ ہر سوزن کو تیری مژگاں بننے کی حسرت اور عاشقوں کا جگر چھیدنے کا ارمان۔ ان کی ہر حرکت سے تلواروں کو عبرت۔ نظر کی بجلی ــ خدا کی قدرت جسم کے مکان کو چھوڑ کر دل کے ملبے کو عشق کی تیزی سے جلا کر خاکستر کر دے۔ نہ پھر اس میں تاب رہے نہ طاقت۔ پھر کرشمہ دیکھو کہ دل کو یوں ہمیشہ جلتے رہنے کی حسرت۔ ہما کا سایہ تجھ پر ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا۔ لیکن خدا کرے تیرا سایہ اس پر نہ پڑے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سائے کے جلال سے وہ جل مرے اور دنیا کے سر سے بھی نیک بختی اُٹھ جائے۔

کتنے گلابوں کی رنگت کو اکٹھا فرمایا تب جا کے دستِ قدرت نے تیرے گالوں کے لیے رنگ موزوں بنایا۔ خال پر تل قربان تھا۔ اُسے دیکھ ہر کسی کو بدر منیر کا گمان ہوا۔ عاشقوں کا گھر ویران ہوا کتنے عاشقوں نے

خونِ جگر سے سینچا تب جاکے تیری ہتھیلی کی کیاری حنائی ہوئی رنگ میں نازکی ہے نہ غنچے میں تنگ دہانی اور نہ کانٹے میں وہ آب رواں۔ بلکہ نزاکت تیری ذات پر ختم، تنگ دہانی تیرے منہ کیلئے ختم اور تیز کلامی تیری نوک زبان کے لئے موزوں۔ ایک لب سے مسکرا دیا تو گویا تو سرتاپا شیریں مجسم۔ جو تجھے دیکھے اپنے دل کا پہاڑ کھو دے اور کوہکن کہلائے۔ تیری نظرِ عشق کے ماروں کو مجنوں کی طرح صحرا صحرا گھمائے۔ اور تو دنیا کی لیلیٰ دوراں سمجھی جائے آواز تیری سُن کے کوئل خاموش ہو جائے۔ چکور نصف شب اونچی شاخ پر بیٹھے جو دھوپ میں کے چاند سے گفتگو کرنا بند کرکے اُڑ جائے۔ پرندہ پرواز رک جائے۔ ابر رواں ٹھہر جائے۔ وحشی جانور کو وحشت آ جائے۔ دریا کی روانی ماند پڑ جائے۔ غرض لحن داؤدی کا کرشمہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ موسیقار اپنی موسیقی بھول جائے۔ تانسین ہوتا تو اپنا نقد ہنر تحفہ دے جاتا اور اپنے اس عمل پر فخر کرتا۔

چمن میں ہوتے غنچے کی طرح وہ تیرا مسکرانا۔ کبھی کچھ سوچے سمجھے پھول کی طرح مسکرانا۔ کبھی خار کی سی وہ نوک زبان کبھی شبنم کی سی وہ دُرفشانی۔ وہ تیرا چنچل کر چوکڑی بھرنا جیسے دیکھ کر ہرن کا شرمانا۔ کبھی لغزش پا سے پھسل کر گر پڑنا لیکن فوراً سنبھلنا اور گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنا کہ کوئی تو نہ دیکھا۔ وہ گھنٹوں میری خاموشی۔

وہ مہینوں تیری تنہائی۔ وہ تیرے خیالات کی پہنائی اور وہ تیرے آنسوؤں کی گہرائی۔

شام کی پھولی شفق۔ سر بام ہوا میں وہ تیرا لہراتا ہوا سرخ آنچل۔ دل کی دنیا میں کائنات کی سی وسعت چہرے پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی تمتماہٹ۔ بکھرے زلف تمنے والی کالی رات کی علامت۔ مگر گالوں پہ ہونے والی صبح کے آثار نکلنے والے اُمید کے سورج کی چمکاہٹ۔

تاروں بھری رات۔ بکھری چاندنی۔ جب کبھی تو نے رُخ سے آنچل سرکایا چاند سیاہ بادلوں میں جا چھپا کہ اب میری حاجت نہیں رہی۔ ستارے ہیرے ہنسنے کے منتظر۔

پھولوں کی سیج پر۔ رہ رہ کر کنوارے خیالات، جذبات کبھی دل کی دھڑکن کبھی خود پھولوں کی چبھن۔ تنہائی کی وحشت۔ کبھی آنکھ لگی کبھی چشم دل وا ہوئی۔ کبھی پھولوں سے دامن بھرنے کی خوشی کبھی کانٹوں کے کھٹکے کا اندیشہ۔ کبھی خواب دیکھنا کبھی ان خوابوں پر بھروسہ کرنا۔ کبھی ان کے بکھر جانے کا ڈر

صبح ہوئی۔ نسیم کے جھونکوں نے جگایا۔ اُدھر پہاڑ کے پیچھے سے شمع خاور نے منہ دکھایا۔ اُدھر گرم لحاف سرکا کمرے کو نور سے چھلکایا۔ بستر گراں بار ہوا یعنی وہ حسن مجسم نیچے اتر آیا۔ نیند کی مستی۔ قدم ڈگمگایا۔ ستون کا سہارا پایا۔ آنکھیں ملیں۔ داہنے ہاتھ سے دائیں بائیں ہاتھ سے بائیں طرف کی زلفیں ٹھیک کی۔ آنچل کو، جو اب تک صبح کی قدمبوسی کرتا تھا اپنے مقام پر لاکر خزانہائے حسن و جوانی پر پہرا بٹھایا۔ شرابی کی چال اور یہ مست آگے لہراتا ہوا بڑھا۔

دھونے کے لئے منہ پر جو پانی ڈالا صحن میں چھنکا تھا۔ شبنم رات کی گئی۔ صحن کی ہریالی پردوں میں اوس

نمودار ہوئی۔ تازہ دم جو پائی آرائش کی بادام کی تیل کنگھا صابن فیس پاؤڈر فراہم کیا۔ حسن کے آسمان پر چار چاند لگے۔ سولہ سنگار سے فراغت پائی تو گل گشت کی ہوا دل میں سمائی۔

چمن میں سارے سرو شمشاد نے سجدے کئے۔ ہر شاخِ گل نے نذرِ زرِ گل نذر دی۔ گلوں کو گلے لگایا۔ کانٹوں کو ٹھکرایا بلکہ کاٹ کے پھینک دیا۔ نرگس کو آنکھ سے لگایا گلاب کو رخسار سے۔ سوسن کو پیار کیا۔ اپنی زبان سے کلام کیا۔ سنبل کو زلفوں سے ہوا دی۔ پتوں سے تالی بجائی۔ ڈالیوں کے اطراف باہیں ڈالیں۔ کیاریاں سجائیں۔ پانی سے سیراب کیا۔ کالی مٹی سے ہاتھ اُبلق کیا۔ پھر جو دھویا تو چمن کے ہر پودے کی جڑوں کو جا پہونچایا۔ گلچینی شروع کی۔ دامن کو پھولوں سے بھر اور واپس پھرا۔ دل میں خوشی کہ زندگی کے دامن میں فقط پھول ہی پھول ہیں۔ معصوم۔ بے خبر۔ نا پختہ کار۔ سولہ سال نا آزمودہ کار کو کیا پتہ کہ یہ خلافِ قدرت ہے؟ اور کامل زندگی پھولوں کی نزاکت کے ساتھ کانٹوں کی خلش بھی چاہتی ہے۔ اُس کے دامن میں چند کانٹے بھی اکٹھا ہو گئے تھے جو خود پھولوں کو کھٹکتے تھے۔

غزل

▲ اقبال رُدولوی

وقت جو ہوگا تیرے سات
دنیا نے گی ہاتھوں بات

چڑھتے سورج یہ تو بتا
کب جائے گی کالی رات

شعروں میں جو ڈھل نہ سکے
وہ بھی گذرے ہیں صدمات

کیسے نظریئے؟ کیسے اصول؟
سب ہیں اپنی ذات کے سات

دورِ ترقی زندہ باد
اور بڑھے دل کے خدشات

دنیا کیسی زیر و زبر
ہوتی رہتی ہے دن رات

برسوں پھر معتوب رہا
دل نے کہی تھی سچی بات

بجھتے بجھتے اے اقبال
شمع گئی کہہ رازِ حیات

بقیہ صفحہ ۔

مدد سے یہ صفدر کیمپ خریدنا ہے" میں نے عرض کیا: "بڑی خوشی ہے۔ میں ساتھ چلوں گا" پھر فرمایا "دوسرا کام یہ ہے کہ ایک رسالہ کے دفتر میں جانا ہے"! میں نے دست بستہ عرض کیا۔

آپ اور اس دفتر میں! ؟ یہ رسالہ تو آپ کے مذاق کا نہیں ہے" فرمایا نہیں فاروقی صاحب آپ بہت جلدی کر رہے ہیں بتلائے وہ کتنا چھپتا ہے" میں نے عرض کیا" تقریباً ایک لاکھ چھپتا ہوگا" فرمایا "تو حضرت ایک لاکھ لوگوں تک ہمارے حروف اور ہمارے الفاظ تو پہونچتے ہیں یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں ہے"۔

مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ان کی یہ باتیں اور یہ کتابیں ہی ہمارا سب سے بڑا ورثہ ہیں جو ایک نسل سے دوسری نسل اور ایک عہد سے دوسرے عہد تک برابر منتقل ہوتا رہے گا اور جس کو موت کا سرد ہاتھ کبھی نہیں چھو سکے گا۔

حضرت امیر خسروؒ کے "سات سو سالہ جشن" کے موقع پر ادارہ فروغ اُردو ہند نے طے کیا ہے کہ وہ امسال اس عظیم المرتبت شاعر "طوطیٔ ہند امیر خسرو" کا خاص نمبر قارئین فروغ اُردو کی خدمت میں پیش کرے۔ جو اُن کی شاعری، نثر نگاری، تصوف، علم موسیقی اور دیگر گوناگوں خصوصیات کا حامل ہو، اور اُس کی ترتیب کی خدمت

ڈاکٹر لکھنؤ یونیورسٹی

کے سپرد کی گئی ہے۔ جملہ ہندوستان اور بیرون ہند کے نمائندہ ادیبوں۔ شعراء اور فنکاروں سے درخواست ہے کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم شاعر کی خدمت میں اپنا اظہارِ عقیدت پیش کریں۔

شمس علوی

مطبوعات ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت) ۲

۱۔ ایکتا کا چمن۔ تہواروں کے پھول۔ عمر انسوانی ۳/-
۲۔ احتشام حسین نمبر (فروغ اُردو) سید انصار حسین ناہل ۲۵/-
۳۔ اُردو کا ماضی۔ حال اور مستقبل۔ احمد ابراہیم علوی ۳/-
۴۔ آئینہ نظم اُردو عمر انسوانی ۴/-
۵۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی روپ نرائن کھیو پوری ساکر ۱/-
۶۔ اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۵/-
۷۔ اُردو ہم نمبر فروغ اُردو اقبال صدیقی ۳/۵۰
۸۔ انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات
(پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۵/-
۹۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۵/-
۱۰۔ آئینہ عقل پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۴/۵۰
۱۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۱۲۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۳/۵۰
۱۳۔ انارکلی امتیاز علی تاج جدید ایڈیشن ۲/۵۰
۱۴۔ امراؤ جان ادا مرزا رسوا ۵/۵۰
۱۵۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ
پروفیسر کلیم الدین احمد ۸/-
۱۶۔ اُردو میں تنقید ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۱۷۔ انتخاب قصائد اُردو۔ مغیث الدین فریدی ۱/۵۰
۱۸۔ ادب اور نظریہ آل احمد سرور ۶/-
۱۹۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور ۵/۵۰
۲۰۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین احمد ندوی ۷/۵۰
۲۱۔ انتخاب جدید نثر اُردو سید احتشام حسین ۴/-
۲۲۔ اقبال مرثیہ فروغ اُردو ۰/۵۰
۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ عبدالماجد دریابادی ۶/۵۰
۲۴۔ البرامکہ اور ان کا عروج و زوال
ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے ۳/-
۲۵۔ انتخاب کلام غالب بشیر احمد علوی ۱/۵۰
۲۶۔ ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ۶/۵۰
۲۷۔ انتخاب قصائد و غزلیات فروغ اُردو ۵/-
۲۸۔ ادب کیا ہے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۳/-
۲۹۔ ادبی خطوط غالب۔ مرزا محمد عسکری ۶/۵۰
۳۰۔ آئینہ نثر اُردو سعادت علی صدیقی ۴/۵۰
۳۱۔ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/۵۰
۳۲۔ ابوالعلم مجنوں گورکھپوری ۰/۳۷
۳۳۔ اُردو کی کہانی سید احتشام حسین ۲/۵۰
۳۴۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر ۵/۷۵
۳۵۔ ابوالکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد ۰/۲۵
۳۶۔ ارمغان نثر و نظم عبدالاحد خاں خلیل ۳/۷۵
۳۷۔ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۱/۵۰
۳۸۔ اچھی نظمیں اختر مشتاق ۰/۷۰
۳۹۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد
جدید ایڈیشن غلام احمد فرقت ۲۰/-
۴۰۔ اُردو شاعری امیر احمد علوی ۱/۵۰
۴۱۔ غزلیات حافظ صائب غالب فارسی ۲/۵۰
۴۲۔ آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ ۱/۵۰
۴۳۔ اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنیوالی کتاب
اعجاز احمد فاروقی ۱/۲۵
۴۴۔ اللہ کے پیارے امیر حسن نورانی ۰/۵۰
۴۵۔ اسپین کی شہزادی صادق سرحدی لکھنوی ۴/۵۰
۴۶۔ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اُردو ۱/۵۰
۴۷۔ اپنی موت میں آوارہ ۲/۵۰
۴۸۔ انوار جدید خط و کتابت خلیق احمد علوی ۰/۲۵
۴۹۔ ایک جان تین قالب خان محبوب طرزی ۴/۵۰

۵۰. اُلفت — خان محبوب طرزی — ۵/۵۰
۵۱. آغازِ سحر — " — ۴/-
۵۲. امین آباد — " — ۴/-
۵۳. انشائے خطوط نویسی حصہ اول — مشیر احمد علوی کا — ۳۵/-
۵۴. اچھی کہانیاں — " شمس الدین نوری — ۵۰/-
۵۵. انشائے خطوط نویسی حصہ دوم — ۷۵/-
۵۶. ایجادوں کی باتیں — مصطفےٰ حسن رضوی — ۳/-
۵۷. اچھی کہانیاں حصہ اول — شمس الدین نوری — ۵۰/-
۵۸. " حصہ دوم " — ۵۵/-
۵۹. " حصہ چہارم " — ۶۵/-
۶۰. ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/۵۰
۶۱. اسلامی نظمیں — محمد حسین علوی شمسی — ۴۵/-
۶۲. اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں — عبدالماجد دریابادی — ۳/-
۶۳. اوراقِ گل — اخگر مشتاق — ۱/-

(ب)

۶۴. بابائے اردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی — ۶/-
۶۵. بستانِ حرم (جدید نعتیہ کلام) زائرِ حرم حمید صدیقی — ۳/-
۶۶. شہیدِ محبت بوٹا سنگھ — خان محبوب طرزی — ۴/-
۶۷. بزمِ بے تکلف — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴/۵۰
۶۸. بچت کہانی — ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۴/۵۰
۶۹. بہادر شاہ ظفر — امیر احمد علوی کاکوروی — ۵/۵۰
۷۰. بہشتی ثمر (حصہ اول دوم) خلاصہ بہشتی زیور — مولانا تھانوی — ۳/۸۰
۷۱. بانیٔ اسلام — علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ — ۷۵/-
۷۲. بشریتِ انبیاء — عبدالماجد دریابادی — ۳/-

(پ)

۷۳. پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۲/۵۰
۷۴. پیاری باتیں — محسن کاکوروی — ۲/-
۷۵. پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم " — ۴/۷۵
۷۶. پیسہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/-
۷۷. پاگل خانہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۳/۲۵
۷۸. پیغام " — طاہر دیال پوری — ۳/-
۷۹. پنجاب میں اردو — حافظ محمود شیرانی — ۶/۵۰
۸۰. پردیسی کے خطوط حصہ اول — مجنوں گورکھپوری — ۴/۵۰

(ت)

۸۱. مختصر تاریخ ادبِ اردو (فروغِ اردو ایڈیشن) — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۱۲/-
۸۲. تصویرِ درد مع تشریحات و ترجمہ — فرید احمد علوی — ۱/-
۸۳. تحریریں مجموعہ مضامین — ڈاکٹر گیان چند — ۵/۵۰
۸۴. تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یاسین — ۳/-
۸۵. تنقیدی تجزیے — کاظم علی خاں — ۴/۵۰
۸۶. تعارف تاریخ اردو جدید ایڈیشن — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۵/-
۸۷. تاجدارِ مدینہ — اقبال صدیقی — ۴/-
۸۸. تنقیدی اصول اور نظریے — حامد اللہ افسر — ۵/۵۰
۸۹. تنقید و تحلیل — شبیہ الحسن نونہروی — ۴/۵۰
۹۰. تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) — سید احتشام حسین — ۶/-
۹۱. تنقیدی نظریات جلد اول — " — ۸/-
۹۲. " " جلد دوم — " — ۸/-
۹۳. تنقید اور عملی تنقید — " — ۶/۵۰
۹۴. تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) — آل احمد سرور — ۵/-
۹۵. ترانہائے خیام — ڈاکٹر رغیب حسین — ۲/۵۰
۹۶. تعلیماتِ اسلامی مکمل چار حصص — محمد حسین شمسی — ۱/۹۰

(ٹ)

۹۷۔ ٹیگور — نادم سیتاپوری — ۳/-

۹۸۔ ٹھیکرے کی مانگ — صدیقہ بیگم سیوہاری — ۲/-

(ث)

۹۹۔ ثنائے حبیب و نعتیہ کلام — بہزاد لکھنوی — ۲/۲۵

(ج)

۱۰۰۔ جان غالب — محمد حسین شمس علوی — ۲/-

۱۰۱۔ جائزے — انور سیوانی — ۳/-

۱۰۲۔ جواہرات اسمٰعیل — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰

۱۰۳۔ جنگ آزادی نمبرا (۱۸۵۷ء) — فروغ اُردو — ۳/-

۱۰۴۔ ״ ״ نمبر۲ — ۳/-

۱۰۵۔ جوئے رواں۔ مجموعہ کلام۔ — حامداللہ افسر — ۳/۵۰

۱۰۶۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) — ڈاکٹر اختر بلگرامی — ۳/۵۰

۱۰۷۔ جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) — قیصر تمکین — ۲/۵۰

۱۰۸۔ جلوے — معین الدین دردائی — ۱/۷۵

۱۰۹۔ جمیلہ بوائری (ناول) — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰

۱۱۰۔ جگر نمبر اول — سید احتشام حسین — ۸/-

(چ)

۱۱۱۔ چوتھی بہن۔ مجموعہ افسانہ۔ — مسیح الحسن رضوی — ۲/۷۵

(ح)

۱۱۲۔ حیات فضل الحق — خیرآبادی — ۱/۲۵

۱۱۳۔ حالی بحیثیت شاعر (جدید ایڈیشن معہ اضافہ) — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱۵/-

۱۱۴۔ حسرت موہانی — عبدالشکور — ۵/۵۰

۱۱۵۔ حجاج بن یوسف — جرجی زیدان — ۴/۵۰

۱۱۶۔ حکیم نباتات — وزیر خاں لنکراں — ۴/-

۱۱۷۔ حبیبۂ غالب — سعادت علی صدیقی — ۲/۵۰

(خ)

۱۱۸۔ خلاصہ شریف زادہ — مرزا رسوا — ۱/۲۵

۱۱۹۔ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰

۱۲۰۔ خضر راہ معہ ترجمہ — علامہ اقبال — ۱/-

۱۲۱۔ خلاصہ روح تنقید — ۱/-

۱۲۲۔ خلاصہ جواہر العروض — ۱/-

۱۲۳۔ خبطی (مزاحیہ) — محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی — ۱/۵۰

۱۲۴۔ خوش بختی کی تلاش — احسن الظفر بی۔ اے — ۳/-

۱۲۵۔ خلاصہ شعرالہند حصہ دوم — ۱/-

۱۲۶۔ خلاصہ المیزان — -/۷۵

(د)

۱۲۷۔ دلچسپ کہانیاں — مسعود عالم — ۴/-

۱۲۸۔ دیوان فغانی — ۱/۵۰

۱۲۹۔ داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی) — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/۵۰

۱۳۰۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۵۰

۱۳۱۔ دستۂ گل — شبلی نعمانی — -/۴

۱۳۲۔ دو خیرۂ قاف ناول — خان محبوب طرزی — ۵/-

۱۳۳۔ دلربا — ۳/-

۱۳۴۔ دلی کا دبستان شاعری معہ اضافہ جدید ایڈیشن — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۱۵/-

۱۳۵۔ دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — ۲/۵۰

(ڈ)

۱۳۶۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر انوارالحسن — ۴/-

(ذ)

۱۳۷۔ ذوق و جستجو۔ — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۱۵/-

۱۳۸۔ ذوق ادب و شعور — پروفیسر احتشام حسین — ۵/۵۰
۱۳۹۔ ذوقِ جنون۔ مجموعہ کلام — آل احمد سرور — ۶/۵۰

(ر)

۱۴۰۔ روایت اور بغاوت — سید احتشام حسین — ۷/-
۱۴۱۔ رُباعیاتِ غالب فارسی معہ اُردو ترجمہ — سید امیر حسن نورانی — ۳/-
۱۴۲۔ رہبرِ مضمون نویسی — شجاعت علی صدیقی — ۲/۵۰
۱۴۳۔ راکھی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۲/-
۱۴۴۔ رخسارِ سحر ناول — انعر کریم قدوائی — ۱/۵۰
۱۴۵۔ رفتارِ سحر — ۳/۵۰
۱۴۶۔ رموزِ حکمت معہ مقدمہ اُردو — محمد شریف — ۳/۵۰
۱۴۷۔ ریاضِ فارسی — منتخب کلام فارسی — ۳/-

(ز)

۱۴۸۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ) مولانا تھانوی — -/۵۰
۱۴۹۔ زٹلیوں کا بادشاہ، حکیم بانا مزاحیہ ناول — سید علی عباس حسینی — ۳/-

(س)

۱۵۰۔ سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۲/-
۱۵۱۔ سوانح احمد خاں کے — نجم الدین نقوی — ۲/-
۱۵۲۔ سرورِ جہاں آبادی — ڈاکٹر حکیم چند نیّر — ۸/-
۱۵۳۔ سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۳/۵۰
۱۵۴۔ سنگ گہر — سید احتشام حسین — ۴/-
۱۵۵۔ سرسید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰
۱۵۶۔ سرمایہ زبانِ اُردو — جلال لکھنوی — ۵/۵۰
۱۵۷۔ سفر (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/-
۱۵۸۔ سیاحت زمین ناول — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰
۱۵۹۔ ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰
۱۶۰۔ سنہرا حلقہ — ۰/۷۵
۱۶۱۔ سرسید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — ۴/-
۱۶۲۔ سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی — ۱/۷۵
۱۶۳۔ سازِ دل — ذکی کاکوروی — ۲/۵۰

(ش)

۱۶۴۔ شعر و تنقیدی مجموعہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/۵۰
۱۶۵۔ شرح دیوانِ غالب (مزاحیہ) — غلام احمد فرقت — ۸/۵۰
۱۶۶۔ شرح سنگ گہر — عبد القوی دریابادی — ۲/۵۰
۱۶۷۔ شاہ غمگین حضرت جی — پروفیسر عبد الشکور — ۳/-
۱۶۸۔ شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — ۴/-
۱۶۹۔ شرح ادب پارے نظم — ڈاکٹر محمود الحسن — ۴/-
۱۷۰۔ شرح منتخبات فارسی — عبد القوی دریابادی — ۵/-
۱۷۱۔ شبلی نعمانی — انوار الحسن نورانی — ۴/-
۱۷۲۔ شرح دیوانِ غالب جدید ایڈیشن — نظم طباطبائی — ۷/-
۱۷۳۔ شہری اور سماجی زندگی — عبد العلی قدوائی — ۷/-
۱۷۴۔ 〃 — 〃 — -/۸۵
۱۷۵۔ 〃 — 〃 — ۰/۹۰
۱۷۶۔ 〃 — 〃 — ۰/۹۰
۱۷۷۔ شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ — امیر احمد علوی — ۳/۵۰
۱۷۸۔ شعر العجم۔ حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم — شبلی نعمانی — ۲۴/-
۱۷۹۔ شرح خرام و زایران — احسن الظفر بی اے — ۳/-
۱۸۰۔ 〃 — 〃 — ۳/۵۰
۱۸۱۔ شمع و شعر — علامہ اقبال — ۰/۵۰
۱۸۲۔ شرح حکیم نباتات وزیر خاں — نیّر مسعود — ۱/۲۵
۱۸۳۔ شرح انتخاب قصائد و غزلیات مطابق نصاب بی اے — ۷/-
۱۸۴۔ شرح شعر باستان حصہ اول — ڈاکٹر انوار الحسن — ۳/-
۱۸۵۔ شرح ترانہائے خیام — حکیم عبد القوی — ۲/-

۱۸۶۔ شرح نصاب فارسی ۵/-

۱۸۷۔ شرح شعر و باستان دوم احسن الظفر ۴/-

۱۸۸۔ شرح گلہائے ادب ۳/-

۱۸۹۔ شرح آئینہ نظم اردو ۳/-

۱۹۰۔ شرح نثر فارسی امروزہ ۳/-

۱۹۱۔ شرح آئینہ نثر اردو خلیل قدوائی ۳/۵۰

۱۹۱۔ شرح غنچہ گل ۴/۵۰

۱۹۲۔ شرح شعر فارسی احسن الظفر ۳/-

۱۹۳۔ شرح ہماری زبان اردو درجہ ۴ خلیل قدوائی ۱/۵۰

(ص)

۱۹۴۔ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۴/۵۰

۱۹۵۔ صحیفۂ محبت۔ مہدی افادی کے خطوط ڈاکٹر محمود الٰہی ۵/۵۰

(ط)

۱۹۶۔ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اردو ۲/-

۱۹۷۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے غلام الثقلین ۴/۵۰

۱۹۸۔ طلسم اسرار۔ (ڈرامہ) مرزا رسوا لکھنوی ۱/۵

(ع)

۱۹۹۔ عذرا ناول صالحہ عابد حسین ۶/-

۲۰۰۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) سید احتشام حسین ۵/۵۰

۲۰۱۔ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینہ میں اخلاق حسین عارف ۳/۵۰

(غ)

۲۰۲۔ غالب نام آور نادم سیتاپوری ۵/۵۰

۲۰۳۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر سید امیر حسن نورانی ۶/-

۲۰۴۔ غالب کی تخلیقی تخیل شہید صفی پوری ۸/-

۲۰۵۔ غنچہ و گل سید محمود الحسن رضوی ۴/۵۰

۲۰۶۔ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر نادم سیتاپوری ۵/۵۰

۲۰۷۔ غزلی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۰۸۔ غزلیات نظیری ۱/۵۰

۲۰۹۔ غزل انسائیکلوپیڈیا جدید ایڈیشن ذکی کاکوروی ۲۵/-

(ف)

۲۱۰۔ فروغا (نعتیہ) طاہر حسن علوی ۴/۵۰

۲۱۱۔ فن خطابت یعنی استاد تقریر کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ ۱۲/-

۲۱۲۔ فریدہ خان محبوب طرزی ۱/-

۲۱۳۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادم سیتاپوری ۵/۵۰

۲۱۴۔ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۴/۵۰

۲۱۵۔ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۲۱۶۔ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۳/۵۰

۲۱۷۔ فغان محسن محسن کاکوروی -/۴۰

۲۱۸۔ فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/-

۲۱۹۔ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۶/۵

(ق)

۲۲۰۔ قدیچے۔ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں۔ غلام احمد فرقت ۵/-

۲۲۱۔ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰

۲۲۲۔ قصائد مومن۔ مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۵/۵۰

۲۲۳۔ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۷/-

۲۲۴۔ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۴/-

۲۲۵۔ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/-

۲۲۶۔ قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر ۲/۱۵

۲۲۷۔ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۳/-

(ک)

۲۲۸۔ کلیات اقبال علامہ اقبال ۸/-

۲۲۹۔ کبیر اور کاہی بدرالدین طیب جی ۲/-

۲۳۰۔ کف گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۴/۵۰

(گ)

۲۳۱۔ گاندھی نمبر ۲/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۳۱	گلدستۂ فارسی اول دوم		۱/۹۰
۲۳۲	گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدید		۱/-
۲۳۳	گلہائے ادب	عبدالاحد خاں خلیل	۳/-
۲۳۴	گاندھی جی کے ساتھ	حامداللہ افسر	۱/۵۰

(ل)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۳۶	لوائح جامی مع مقدمہ	عبدالاحد خاں خلیل	۱/۵۰
۲۳۷	لال قلعہ	مائل ملیح آبادی	۴/-
۲۳۸	لب بام	عادل رشید	۶/-
۲۳۹	لسانیات اور اردو	سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰

(م)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۴۰	مرقع اقبال	عصمت فاطمہ علویہ	۱۲/-
۲۴۱	مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو	غلام احمد فرقت	۸/۵۰
۲۴۲	محسن کاکوروی نمبر		۳/-
۲۴۳	مسلمان اور کانگریس	ابوالکلام آزاد	۳/۵۰
۲۴۴	مرثیہ نگاری اور میر انیس	ڈاکٹر احسن فاروقی	۴/۵۰
۲۴۵	مضامین فرحت حصہ اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	۴/۵۰
۲۴۶	مضامین فرحت حصہ دوم	"	۴/۵۰
۲۴۷	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۳/-
۲۴۸	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۵۰
۲۴۹	موسم گل ناول	عادل رشید	۷/-
۲۵۰	مجبور "	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۲۵۱	مضامین جدیدہ	محمد ہادی	۱/۲۵
۲۵۲	مثنوی سحر حلال فارسی مع مقدمہ	قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۲۵۳	مطالعہ	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۵۴	مولوی نذیر احمد کی کہانیاں	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۲۵
۲۵۵	معرکۂ روم دیونان	صادق سردھنوی	۶/-
۲۵۶	مثنویات حالی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۳/۵۰
۲۵۷	مطالعہ حالی	"	۵/۵۰
۲۵۸	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۵۰
۲۵۹	مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۶۰	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصاب بی اے۔ حالی	۱/۵۰
۲۶۱	مرثیہ غالب	حالی	۰/۲۵
۲۶۲	مجموعۂ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۶۳	معمار	مائل ملیح آبادی	۲/۵۰
۲۶۴	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	۰/۴۰
۲۶۵	انتخاب فسانۂ آزاد یعنی	سرشار لکھنوی	
۲۶۷	مہاراج بلی	ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۲۶۸	مسٹر ملاکی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	۰/۷۵
۲۶۹	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۲۷۰	مصباح بلاغت مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۳/-
۲۷۱	مطالعۂ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۴/-
۲۷۲	مقدمات و مقالات	عبدالاحد خاں	۵/۵۰
۲۷۳	منتخب سوانح اور رقعے	نجم الدین نقوی	۴/-

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۷۴	نثر امروز ایران	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۲۷۵	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۵/-
۲۷۶	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۲۷۷	نقش حالی دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احمد حسین۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	
۲۷۸	شجاعت علی سندیلوی		۲۵/-
۲۷۹	نغمۂ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۸۰	نغمات الہند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۳/-
۲۸۱	نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۰/-
۲۸۲	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۲۸۳	نسرین و نسترن	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۸۴	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامداللہ افسر	۳/۵۰

۲۸۵۔ نیا راستہ ناول — خان محبوب طرزی — ۳/۵۰

۲۸۶۔ نوروز " — مائل ملیح آبادی — ۴/۵۰

۲۸۷۔ نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ — آل احمد سرور — ۸/۵۰

۲۸۸۔ نقوش و افکار — مجنوں گورکھپوری — ۵/۵۰

۲۸۹۔ نیلم — انتصار حسین — ۳/-

۲۹۰۔ نذیر احمد کی کہانی — فرحت اللہ بیگ — ۱/۲۵

۲۹۱۔ نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی — عبدالاحد خاں خلیل — ۵/-

۲۹۲۔ منشی نول کشور نمبر — ۲/۵۰

(و)

۲۹۳۔ وعدۂ فردا — اخگر مشتاق رحیم آبادی — ۱۵/-

(ہ)

۲۹۴۔ ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے — علی عباس حسینی — ۴/-

۲۹۵۔ ہندی کے مسلمان شعرا — امیر حسن نورانی — ۰/۷۵

۲۹۶۔ ہمارا جھنڈا — حامد اللہ افسر — ۱/-

۲۹۷۔ ہندوستان شاہراہ ترقی پر — منظر سلیم — ۱/۵۰

۲۹۸۔ ہندوستان کا تیسرا منصوبہ " — ۱/۵۰

۲۹۹۔ ہمارا سماج حصہ ۱ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی ثریا " — ۰/۷۰

۳۰۰۔ " حصہ ۲ " " — ۰/۸۵

۳۰۱۔ " حصہ ۳ " " — ۰/۹۰

۳۰۲۔ " حصہ ۴ " " — ۰/۹۰

۳۰۳۔ یادگار غالب — مولانا حالی — ۴/-

۳۰۴۔ یاقوتی ناول — خان محبوب طرزی — ۳/۵۰

۳۰۵۔ یادگار انیس — امیر احمد علوی — ۴/-

خریداران کو ضروری اطلاع

۱۔ پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲۔ جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

۳۔ اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

۴۔ جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

۵۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ کا نا ضروری ہیں۔

جلد ۲۲ شمارہ (۱۱) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو این۔ پی ۹۳

لائسنس نمبر: ۲۰۰۸۷۴/۲۴۱۶ ۲

دفتر فون ۲۶۱۳۵

فون رہائش گاہ: ۲۶۶۵۶

ایڈیٹر:
محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

ادارہ فروغ اردو هند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۱۱) مارچ ۱۹۷۶ء جلد ۲۲

ترتیب

زر سالانہ اعزازی: دس روپیے
عوام سے: آٹھ روپیے
فی پرچہ: ۷۰ پیسے

پتہ:
ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

حمید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

محمد حسین شاہد علوی قاسمی کاکوروی

جب ملک پر غیر ملکی اقتدار تھا اس وقت کے حکمرانوں نے اپنی زبان انگریزی کو سرکاری کاروبار میں ترجیحی درجہ دینے یا ملک کی دوسری زبانوں کو دبانے کیلئے کوئی ایسی کوشش نہیں کی جس سے یہ خیال پیدا ہوتا کہ انگریزی کسی قومی زبان کی جگہ لے رہی ہے اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی مادری زُبانوں سے بے پناہ مُحبت کرنیوالے بھی اپنی مادری زبانوں کے ساتھ انگریزی سے دلچسپی لینے لگے۔ اور صوبوں میں مادری زبانیں جنھیں بعد میں علاقائی لفظ سے بھی یاد کیا گیا انگریزی کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتی رہیں اسی دوران میں ابتدائی درجوں میں انگریزی کے ساتھ ہی ساتھ اُردو پڑھنے والے طلبہ کو ہندی بہ حیثیت دوسری زبان کے پڑھنا پڑتی تھی اور ہندی والوں کو اُردو اسی طرح دوسری ریاستوں میں وہاں کی زبانیں ذریعہ تعلیم تھیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اُردو کو ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں انفرادیت کے ساتھ ایک خاص اہمیت حاصل رہی نیز یہ بھی ایک تاریخی المیہ ہے کہ جب اس ملک کی سرکاری زبان فارسی تھی اُس وقت وہ عوامی زبان نہ تھی جب انگریزی نے سرکاری درجہ حاصل کیا تو وہ بھی عوامی زبان نہ بن سکی اس طرح عوامی زبان اُردو ہمیشہ طالب انصاف بھی رہی۔

غیر منقسم ہندوستان کی بیشتر ریاستوں کی زبان بھی اُردو تھی لیکن آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی تنگ نظر اور تنگ دل سیاستدانوں کے ہاتھوں متحدہ ہندوستان کی اس زبان کو جس نے اپنے جلووں سے مشرق سے مغرب تک کروڑوں انسانوں کے دل جیت لیئے اور جو آج بھی دنیا میں بولی جانے والی عالمگیر زبانوں کے پہلو میں اپنی پوری توانائی سے جلوہ فگن ہے اپنے ہی وطن میں اجنبی بنتا پڑا ہم کو بڑی توقعات تھیں

کہ ہماری وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی اس ایمرجنسی دور میں اُردو زبان کی بقا اور اس کے تحفظ کے لئے فروغ اُردو گجرال کمیٹی کی جدوجہد اور کاوش نیز اس کی رپورٹ کے پیش نظر وہ احکامات صادر کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کریں گی کہ جو تحفظ اُردو کے لئے اشد ضروری ہیں مگر افسوس فروغ اُردو گجرال کمیٹی کی رپورٹ مرتب ہونے کے باوجود آج تک ہماری وزیراعظم خاموش ہیں ہم محبان اُردو کا مطالبہ ہے کہ جلد فروغ اُردو گجرال کمیٹی کی رپورٹ کو منظر عام پر لایا جائے نیز اُردو کی لسانی تاریخی اور ادبی عظمت کا بھی تقاضہ ہے کہ ہر اردو دوست جماعتی اور ذاتی مصلحتوں سے آزاد ہو کر اُردو کی مشترکہ حیثیت کو نہ صرف باقی رکھنے بلکہ اس کی ترقی کے لئے ہر ممکن جدوجہد کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھے اور حکومت ہند سے مطالبہ کرے کہ وہ معاشی حیثیت سے اُردو زبان کے حق کو تسلیم کر کے اپنے فرض کی ادائگی کرے۔

ہم قارئین فروغ اُردو کو مطلع کرنا چاہتے ہیں کہ آئندہ ہمارا شمارہ (اپریل اور مئی ۷۶ء) امیر خسرو نمبر ہوگا جو کہ ڈاکٹر انوار الحسن صدر شعبۂ السنہ شرقیہ لکھنؤ یونیورسٹی کا مرتب کردہ شائع ہوگا اس نمبر کی خصوصیات کا علم اس نمبر کو ملاحظہ فرمانے کے بعد ہی ہو سکے گا اور قارئین فروغ اُردو انشاء اللہ اراکین ادارۂ فروغ اُردو کی اس جدوجہد کو سراہیں گے کہ جو انھوں نے اس نمبر کی تدوین اور اشاعت کے سلسلہ میں انجام دی ہیں اس نمبر کی عام قیمت بارہ روپیہ ہوگی۔ مگر خریداران ماہنامہ "فروغ اُردو" کی خدمت میں یہ نمبر صرف نو روپیہ میں پیش کیا جائے گا جو کہ رجسٹرڈ روانہ ہوگا لہذا جن خریداران کو یہ نمبر منگانا ہو وہ نو روپیہ بذریعہ منی آرڈر ۳۰ اپریل ۷۶ء تک منیجر ماہنامہ فروغ اُردو ۳۷ آمین آباد پارک لکھنؤ کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور جو حضرات ماہنامہ کے لیے پانچ خریدار مہیا کریں گے۔ اسکی خدمت میں یہ عدیم المثال نمبر مفت پیش کیا جائے گا امید ہے کہ محبان اُردو سابقہ روایات کے پیش نظر اراکین ادارہ کو اپنی جدوجہد و کاوش سے زائد سے زائد ممبر مہیا فرما کر ممنون کرم فرمائیں گے تاکہ یہ ادارہ اُردو زبان کی خدمت تندہی اور جانفشانی کے ساتھ اسی طرح کرتا رہے جس طرح اس نے تیئیس سال اس دور انحطاط میں انجام دے اس سے حوصلہ بڑھے گا اور محبان اُردو کے عزم اور جدوجہد کی بھی نشاندہی ہوگی۔

گُل مضمحل ہیں چاند ستارے اُداس ہیں
یہ آج کس کے غم میں نظارے اُداس ہیں

پائی ہے زندگی نے انھیں سے تو روشنی
کیوں آتشِ الم کے شرارے اُداس ہیں

ہر مرحلے میں خندہ بلب دیکھ کر ہمیں
اب خود غمِ حیات کے دھارے اُداس ہیں

ہم تو نگاہِ قہر سے مایوس ہو گئے
لیکن نگاہِ لُطف کے مارے اُداس ہیں

ڈوبا ہے آج کس کا سفینہ خبر نہیں
ہر موج ہے خاموش، کنارے اُداس ہیں

واحدؔ ہماری آنکھوں کو ملتا ہے جن سے نور
وہ زندگی فروز نظارے اُداس ہیں

میر انیس

کسی نے تری طرح سے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں

لگا رہوں مضامین نو کے پھر انبار ؎ خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں ؎ اک پھول مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں

میر انیس کے یہ اشعار اپنے خالق کی شاعرانہ عظمت کی منھ بولتی تصویر ہیں۔ ان اشعار کا ایک ایک لفظ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ میر انیس نے اپنے کلام کے اعجاز سے نہ صرف مرثیہ کو معراج کمال تک پہنچایا بلکہ اُردو شاعری کو بھی وہ وسعت اور جامعیت و گہرائی و گیرائی عطا کی کہ "جنہم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے" کہنے والے عظیم نقاد مولانا حالیؔ کو یہ اعتراف کرنا پڑا۔

شعراء کے حلقے میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو، اور بگڑا گویا مرثیہ خواں مگر میر انیس نے اس قول کو بالکل باطل کر دیا۔ ان کو جس نظر سے ہم دیکھتے ہیں، اس نظر سے بہت کم دیکھا گیا ہے اکثر ذاکر امام حسینؑ سمجھ کر ان کا ادب کیا جاتا ہے بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کو صدق دل سے یا محض اپنے فریق کی پاسداری اور دوسرے فریق کی ضد سے صرف مرثیہ گویوں میں سب سے فائق اور افضل سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت کم ہیں جو مطلق شاعری میں ان کو فی الواقع بے مثل سمجھتے ہیں۔"

مطلق شاعری کے اس بے مثل شاعر کا کلام شاہد ہے کہ میر انیس نہ صرف مرثیہ گو کی حیثیت سے بلکہ شاعر کی حیثیت بھی عظیم اور بے مثل تسلیم کئے گئے ہیں۔ انھوں نے ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے جو مقام حاصل کیا وہ کسی اور شاعر کے حصہ میں نہیں آیا۔ مولانا شبلی نے بالکل صحیح لکھا ہے

"میر انیس کی شاعری کا بڑا کمال یہ ہے کہ باوجود یکہ انھوں نے اُردو شعراء میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں اور سینکڑوں مختلف واقعات لکھنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجہ کے الفاظ استعمال کرنے

بڑے ہیں لیکن ان کے کلام میں غیر فصیح الفاظ بہت کم
پائے جاتے ہیں۔ مضمون کے لحاظ سے جس قسم کے الفاظ
لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے، ویسے ہی الفاظ استعمال
کرنے لگتے ہیں۔ الفاظ نگینے ہیں جو تراش کر انگوٹھی
پر جڑ دیئے گئے ہیں۔"

خود کہتے ہیں ؎

ہے لعل و گہر سے یہ دہن کان جواہر
ہنگام سخن کھلتی ہے دکان جواہر

تاجدار سخن شہنشاہ مراثی میر انیس مقبول مرثیہ گو میر مستحسن
خلیق کے بیٹے، مشہور مثنوی نگار میر حسن کے پوتے، اور
ممتاز ہزل گو میر ضاحک کے پرپوتے تھے ۱۸۰۳ء میں
فیض آباد میں پیدا ہوئے، بچپن فیض آباد میں ہی گذرا
شہر کے ممتاز و مستند عالم میر نجف علی سے درسیات کی
ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ
چلے آئے یہاں مولوی حیدر علی سے عربی کی تعلیم حاصل کی
فنون سپہ گیری اور ورزش کا بھی شوق تھا۔ بانک بنوٹ
کے مشہور استاد میر امیر علی سے بانک بنوٹ کی گھائیاں
سیکھیں اور اتنا چابکدستی اور کمال کے ساتھ کہ

"اگر ان کے ہاتھ میں ایک گز لٹھے کے رومال
میں پیسہ بندھا ہوتا تو وہ دس لکڑی پھینکنے والوں
سے بھی چوٹ نہ کھا سکتے تھے۔"

امجد علی اشہری کے بقول۔

"میر انیس کا قد لانبا چھریرا اور متناسب الاعضا
تھا۔ سر کے بال باریک اور ملائم، چہرہ خوبصورت
دکتابی۔ رنگ کھلا ہوا گندمی۔ آنکھیں بڑی بڑی
خوبصورت جن کی خوش آب سفیدی نرگس کا لطف
دیتی تھی، آنکھوں کے تیور سے غیورانہ حالت ظاہر
ہوتی تھی۔ پتلی کی روشنی بہت تیز تھی۔ مونچھیں بڑی
بڑی افگندہ مو، داڑھی صاف، گردن صراحی
دار، فراز کے معنی ظاہر کرنے والی، سینہ کشادہ اور
عریض مگر زیادہ ابھرا ہوا نہیں، چال نہایت نستعلیق
جو پنجے تلے قدم سے آگے بڑھ جائے۔"

انیس کے گھر کا ماحول زبان و ادب تہذیب و تمدن کا
بہترین نمونہ تھا۔ ان کے والد با کمال مرثیہ گو اور مذہبی
آدمی تھے ان کی والدہ بھی مسائل مذہب اثنا عشری سے
بخوبی واقف تھیں اور فارسی میں خاصا دخل رکھتی تھیں
نماز روزے کی پابند اور نہایت پرہیزگار بی بی تھیں۔
جس بچے کی تعلیم و تربیت ایسے والدین کے آغوش شفقت
میں ہوئی ہو اس کا پابند مذہب ہونا فطری ہے۔ اشہری
کے لفظوں میں میر انیس کو اعلیٰ تربیت کا ابتدائی حصہ جو
اپنی مادر محترم کی تربیت و تادیب سے حاصل ہوا، وہ
خاص قسم کا ہے جو بڑے سے بڑے کالج اور یونیورسٹی کی
تعلیم سے حاصل نہ ہو سکتا۔

انیس کی تربیت و تعلیم نے انھیں انتہائی متین،
سنجیدہ، مہذب، بردبار اور نازک مزاج بنا دیا خودداری
اور عزت نفس ان کی سیرت کے بہت نمایاں خصوصیات
تھے ان کی طبیعت کا فطری میلان انکسار کی طرف تھا اور
وہ خاکساری کو انسان کی اعلیٰ صفت سمجھتے تھے وہ نہایت
وضعدار اور نفاست پسند تھے۔ حباب کی شکل کی چوگوشیا
ٹوپی، نیچا گھیر دار کرتا، ڈھیلی مہری کا سفید پائجامہ گھٹیلا

جوتا پہنتے تھے۔ ہاتھ میں چھڑی اور رومال بھی ضرور ہوتا تھا پروفیسر مسعود حسن رضوی کی تحقیق ہے۔

"میر انیس نہایت خوش آواز تھے اور جتنے خوش آواز تھے اس سے کہیں زیادہ خوش بیان تھے۔ وہ مرثیہ اس طرح پڑھتے تھے کہ کلام کا اثر بدرجہا بڑھ جاتا تھا۔ ایک ایک اشارے سے واقعات کی تصویر کھینچ دیتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ ان کا پڑھنا سُن کر مبہوت و متحیر ہو جاتے تھے۔ عام طور پر مسلم ہے کہ میر انیس کا سا مرثیہ پڑھنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔"

میر انیس کی مجلسوں میں ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا، روساء اور عوام ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ ۱۸۵۶ء تک اُنھوں نے سکون و اطمینان کی زندگی بسر کی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب لکھنؤ میں تباہی و بربادی آئی تو انیس کو بھی مجبوراً مختلف مقامات کا سفر کرنا پڑا۔ وہ عظیم آباد، بنارس حیدرآباد اور الٰہ آباد وغیرہ گئے۔ ہر جگہ ان کا پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ میر انیس نے آخری سفر ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو کیا۔ پنجشنبہ کا دن تھا اور مغرب کا وقت، قمری حساب سے ۷۳ برس اور چند مہینے اور شمسی حساب سے ۷۱ برس کی عمر میں انیس خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کے ہمعصر شاعر اور مشہور مرثیہ گو مرزا دبیر نے تاریخ وفات کہی:

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

انیس نے شاعری اور زبان دانی ورثہ میں پائی تھی، وہ بچپن سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں حزیں تخلص اختیار کیا اور والد ماجد میر خلیق سے اصلاح لینی شروع کی۔ انیس کے بچپن کا عہد آتش و ناسخ کی شاعری کے شباب کا عہد تھا۔ ایکدن میر خلیق اپنے بیٹے کو شیخ ناسخ کے پاس لے گئے اور شاگرد بنانے کی درخواست کی۔ ناسخ نے حزیں سے شعر پڑھنے کو کہا، حزیں نے والد بزرگوار کی اجازت سے یہ شعر پڑھا۔

کھلا باعث یہ اس بیدرد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

ناسخ نے حزیں کے شعر کی بہت تعریف کی اور تخلص بدلنے کی صلاح دی۔ میر خلیق نے ناسخ سے ہی تخلص تجویز کرنے کی فرمائش کی۔ ناسخ نے حزیں کے بجائے انیس تخلص اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اسی دن سے میر ببر علی حزیں سے انیس ہو گئے۔

انیس جس زمانہ میں لکھنؤ آئے تو یہاں ایک طرف آتش و ناسخ کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی تو دوسری طرف میر ضمیر اور میر خلیق، مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ان حالات میں میر انیس نے اکثر رباعیاں، متعدد سلام اور مرثیے کہے اور تحت اللفظ پڑھنے کی مشق شروع کی۔ میر خلیق خاص خاص مجلسوں میں انیس کو بھی اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ ایسی ہی ایک مجلس میں اپنے والد کے حکم پر انیس مرثیہ پڑھنے کی غرض سے منبر پر آئے، چند منٹ کی خاموشی کے بعد ایک رباعی پڑھی۔ پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے ایک غیر معمولی لطف پیدا کیا اور چاروں طرف سے تعریفی کلمات

بلند ہونے لگے۔ پھر انیس نے سلام پڑھا اور ساری محفل کو اپنا گرویدہ کر لیا۔ آخر میں اپنا مرثیہ پڑھا اور اپنی فصاحت اور اعجازِ کلام کا سکّہ جما دیا۔ اس مجلس کے بعد سے ان کی شہرت و مقبولیت میں روزافزوں اضافہ ہونے لگا، ان کی شاعرانہ عظمت و مرتبہ کا اعتراف کیا جانے لگا اور انیس کی یہ دُعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہونے لگی۔

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب
شوق مدّاحیِ شبیر عطا کر یارب

سنگ ہو موم وہ تقریر عطا کر یارب
نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب

جد و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہوں گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ

صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خون برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روز مرّہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی

سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

میر انیس کے احسانات اردو زبان اور اُردو مرثیہ پر بے شمار ہیں اُنھوں نے اِس زبان کو وہ ترقی، وسعت اور جامعیت عطا کی کہ دوسری ترقی یافتہ زبانیں بھی رشک کرنے لگیں۔ اُنھوں نے شستہ و پاکیزہ زبان میں فصاحت و سلاست کے جو دریا بہائے ہیں وہ اُردو کے چمن کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھیں گے۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی میر انیس کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کے کلام میں زبان کا جادو، بیان کا سحر اور فن کا اعجاز ہے اور وہ فصاحت و بلاغت سلاست و روانی، سادگی و پرکاری، تشبیہات و استعارات نازک خیالی و نکتہ آفرینی، روز مرّہ اور محاورہ کا حسین و جمیل مرقع ہے، بندش الفاظ، جدّت ترکیب اور حسنِ صنعت نے اس میں چار چاند لگا دیے ہیں۔"

جذبات نگاری، مرقع نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری کے جیسے اور جتنے بہترین نمونے میر انیس کے کلام میں ملتے ہیں، کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ملیں گے۔

جذبات نگاری میر انیس کی امتیازی خصوصیت ہے اس کے لیے شاعر کا قادرالکلام ہونا ضروری ہے اور انسانی فطرت سے گہری واقفیت بھی لازمی ہے انیس کو یہ قدرت حاصل ہے کہ نازک سے نازک خیال اور لطیف سے لطیف کیفیت کو لفظوں میں ادا کر دیں۔ ایک مثال مُلاحظہ کیجیے حضرت حسین کا قافلہ مدینہ سے روانہ ہو رہا ہے۔ حضرت صغریٰ بیماری کی وجہ سے نہیں جا رہی ہیں۔ ان کی کیفیت کو

انیس نے کتنے درد انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغریٰ ترے قرباں
گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہباں
صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آں
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا
کنبے کیلئے جانوں کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقہ گئی اب نہ کرو گریہ و زاری
اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری
آ آ مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
تپ ہے تمہیں چھاتی سے بھی چمٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو تو تمہیں طاقت گفتار نہیں ہے

منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں انیس کو کمال حاصل ہے۔ انھوں نے صبح کا منظر، شام کا سناٹا، بہار کا جوش گرمی کی شدت، دھوپ کی تپش، لو کی تیزی وغیرہ اس کمال کے ساتھ بیان کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ انھوں نے واقعات کے بیان میں موقع کی مناسبت کا پورا دھیان رکھا ہے اور واقعہ کی جزئیات کو ایسی قدرت کے ساتھ نظم کیا ہے کہ اس واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

پھرتا تھا دم سرد پریشاں کوئی ہو کے
دامن سے ہوا دیتا تھا منھ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لو سے ردا چہرے پہ رکھ کے
رکھ لیتا تھا سر پر کوئی رومال بھگو کے
پڑتے تھے جو چھینٹے تو مزا دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چلو ہی سے پی لیتا تھا پانی

گرمی کی شدت اور دھوپ کی تپش کی ایک اور مثال دیکھئے۔

وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

اسی طرح سیرت نگاری کے جو نمونے میر انیس کے یہاں ملتے ہیں اس سے قبل کسی شاعر کے یہاں موجود نہیں۔ امام حسین کی سیرت نگاری میں میر انیس کو کمال حاصل ہے اخلاقی شاعری کے اعتبار سے بھی انیس کے مرثیوں کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان کے کلام میں بلند اخلاق و کردار کے بے مثال نمونے ملتے ہیں ان کے یہاں وقار اور تمکین کی ایک خاص شان ملتی ہے ابتذال یا چھچھورا پن نہیں پایا جاتا۔ گفتگو اور مکالمے لکھنے میں انیس کا ثانی نہیں۔ فطری مکالمہ نگاری نے انیس کے مرثیوں میں ڈرامائی

کیفیت اور نفسیاتی گہرائی پیدا کر دی ہے۔ مکالموں میں
فطری گفتگو کی کیفیت پیدا کرنے میں انھیں بڑا ملکہ ہے۔
امام حسینؑ اور ان کے اقربا کی گفتگو میں جو فصاحت،
متانت، سنجیدگی، تہذیب اور وقار میر انیس نے برقرار
رکھا ہے اس کا جواب کہیں نہیں ملتا۔

انیس سے قبل اُردو میں رزمیہ شاعری کی بہت
کمی تھی۔ میر ضمیر نے مرثیہ میں اس کا اضافہ ضرور کیا لیکن
میر انیس اس موقع کے ساتھ انصاف کیا اور اسے عروج
بخشا۔ وہ ایک ماہر فن کی طرح رزم کی جملہ جزئیات
کو نمایاں کرتے ہیں پہلوانوں کی ہیبت، رجز کا شور
حریفوں کے داؤں پیچ شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر
اندازی اور شہسواری کی ایسی منظرکشی کرتے ہیں کہ میدان
جنگ کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ انیس کے عہد میں
تلوار اور گھوڑے کی تعریف مرثیہ کا اہم جزو بن گئی تھی
انیس کے مراثی میں تلوار کی مارکاٹ اور گھوڑے کی
خوبصورتی، خوش خرامی، سبک روی اور تیز گامی کا
بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ شمشیر زنی اور شہسواری کی
اصطلاحوں پر عبور رکھنے کے علاوہ ان فنون سے بھی واقف
تھے۔ تلوار کے جوہر دیکھئے۔

چمکی گری اُٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی
خالی گئے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی
ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی
غل تھا یہ کیا ہے آج جو قہر صمد نہیں
ایسا تو رود نیل میں بھی جزر و مد نہیں

ان کی رزمیہ شاعری، ہمارے دلوں میں، عزم و حوصلہ
ہمت و استقلال، حق و صداقت کے لیے مرنے کی تڑپ
مصائب و مشکلات کے موقع پر، صبر و تحمل کے جذبات
پیدا کرتی ہے۔ اخلاقیات اور اعلیٰ جذبات کا جیسا
اور جتنا نادر و نایاب خزانہ انیس کے مرثیوں میں
موجود ہے، اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں
مشکل سے ملے گی۔

مراثی انیس کی طرح ان کے سلام اور رُباعیات
بھی اُردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان اصناف
سخن میں بھی اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ہیں اور
فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، جدت و ندرت
سادگی و پرکاری کے دریا بہائے ہیں۔

ایک سلام کے چند اشعار سنئے۔

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے
زندگی میں تو نہ اک دم خوش کیا ہنس بول کر
آج کیوں روتے ہیں میرے آشنا میرے لیے
ہر نفس آئینہ دل سے یہ آتی ہے صدا
خاک تو ہو جا تو حاصل ہو جلا میرے لیے
خاک کو ہے خاک سے اُلفت تڑپتا ہوں انیس
کربلا کے واسطے میں کربلا میرے لیے

ایک دوسرے سلام کے چند اشعار۔

غم شہ کا جس دم بیاں کر دیا
ان آنکھوں نے دریا رواں کر دیا
گھٹا زور مشق سخن بڑھ گیا
ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا
ترا سنجیوں نے تری اے انیس
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

انیس کی رباعیات گنجینۂ اخلاق و معرفت ہیں، انھوں نے رباعیات میں مذہب کے اساسی اصول بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں زبان و بیان کی انفرادیت و اہمیت کا اندازہ چند مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پر گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

کیا کیا دنیا سے صاحب مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تلک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

پیری آئی غذا رہے لور ہوئے
یاران شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیس
جو مشک سے بال تھے وہ کافور ہوئے

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس
ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رُخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر
میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

انیس نے ایک رُباعی میں کہا تھا۔

وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا
کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

یہ صحیح ہے کہ زندگانی کے سارے جھگڑے اور بکھیڑے آخری سانس کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں انیس تو ختم ہو گئے لیکن انکا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا اور مقبولیت حاصل کرتا رہے گا۔ میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق مولانا حالی جیسے نکتہ رس نقاد کا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔

اُردو کو راج چار سو تیرا ہے
شہروں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

دل کی زباں کا سہارا تھا انیس اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس
دلی جو تھی تو لکھنؤ اس کی بہار دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیس

مفتون کوٹوی

کلامِ ثاقب لکھنوی میں ابدی حقیقتیں

ابدی حقیقتوں سے میری مراد ان عرفانی عقائد و حقائق سے ہے جنھیں آفاقیت و صداقت کی بدولت بقائے دوام کا خلعت حاصل ہو جاتا ہے اور جو زمان و مکان کی حدود میں محدود نہیں ہوتے۔ مہتاب کی چاندنی اور آفتاب کی درخشانی کی طرح وہ دنیا بھر سے اپنے وجود کی افادیت و مقصدیت کا اعتراف کرا لیتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ میں یہ ابدی قدریں ان نقوش کو حاصل ہوتی ہیں جنھیں فن کار اپنے خلوصِ فن کے ساتھ وہ سچائیاں اور بلندیاں بخشتا ہے جن میں عروج و کمال کی گیرائیاں بھی ہوتی ہیں، اور تحریر و مشق کی گہرائیاں بھی۔ ظاہر ہے کہ جگر کاوی اور دماغ سوزی کے بغیر فنکار کو ایسی تخلیقات میسر نہیں آتیں۔ اور یہ مقام اسے اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کی عمر میں کہنگی اور اس کے تجربہ میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ فطری ذہانت و ذکاوت، فنی استعداد و صلاحیت، ساتھ استغراقِ مشق و مہارت، اس میں وہ طرفگی پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے عروجِ فن کے ایسے مظاہر پیش کر سکے جو اربابِ نظر کے لیے دلکشی و دلربائی کا باعث ہوں، ان مظاہر پر قدرت، ابداع و دوامی رنگ آرائی کرکے انھیں غیر فانی بنا دیتی ہے۔ فن کار کو موت آ جاتی ہے لیکن وہ فن پارے موت کی دسترس سے بہت دور ہو جاتے ہیں، ان آئینوں میں آئینہ ساز جھلکتا رہتا ہے جسمانی اور مادی طور پر فن کار چاہے مر جاتا ہے لیکن اس کی تخلیقات اسے ذہنی اور روحانی زندگی عطا کرکے ہمیشہ زندہ رکھتی ہیں۔

دنیائے ادب میں وہی فنکار حیاتِ جاوید پائے ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے قلم سے نقش و نگار بنائے جنھیں ابدی لطافتیں حاصل ہیں اور دوامی صداقتیں۔ جن شعرا نے فنی بلندیوں کے ساتھ حقیقتوں کی نقاب کشائی کی اور انھیں ایسے لفظی پیکروں میں اربابِ بصیرت کے سامنے پیش

کیا جن میں دلکشی ہے، دل آرائی ہے تو وہ اپنے ان مظاہر کے ساتھ آج بھی حیات دوام پائے ہوئے ہیں اور جن کا کلام وقتی کام جوئیوں ہنگامی دلبستگیوں اور عارضی تسلیوں کا حامل تھا۔ انھیں یہ رتبۂ بلند میسر نہ آسکا، حالات کی ناسازگاریاں کسی جوہر کی آب و تاب کو کب تک گمنامی کی تہوں میں دابے رہ سکتی ہیں؟ وقت آتا ہے کہ ان کی جلوہ گری ہوتی ہے اور پھر اُن کی تابانیوں اور درخشانیوں سے نظریں مستفید ہوتی ہیں قدر شناس طبیعتیں خراج تحسین ادا کرتی ہیں اور کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔

ہر ادب ایسی دوامی قدروں کا حامل ہوتا ہے جس شاعر کو خدا نے صحیح وجدان پختہ شعور اور بلند نظر عطا کی ہے وہ اپنے کلام کو ایسے شہ پاروں سے مالا مال کرتا ہے۔ ثابت مرحوم نے ۷۹ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ عمر بھر فنی پختگی اور ادبی مہارت کے ساتھ شعر گوئی کی۔ گرم و سرد زمانہ دیکھے نشیب و فراز عالم سے گذرے۔ عشرت و عسرت، آرام و آلام تہر و مہر، غرض زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے آگاہ و آشنا ہوئے۔ دل عاقبت شناس اور نظر انجام بیں رکھتے تھے۔ تجربہ و مشاہدہ نے اُنھیں جن نتائج پر پہونچایا۔ ان میں ابدی حقیقتیں بھی تھیں اور دوامی قدریں بھی۔ اس لئے اُنھوں نے جو کچھ کہا سوچے سمجھے طریقہ سے کہا۔ شستہ و شائستہ انداز میں کہا خواہ وہ ادب و اخلاق کے مسائل ہوں خواہ حیات و کائنات کے مراحل، دین ہو یا دنیا، موت ہو یا زندگی بڑھاپا ہو یا جوانی، ان کی رائے تلی تلی ہے۔ ان کا بیان سوچا سمجھا ہوا۔ ان کے لہجہ میں متانت ہے، ان کے قلب میں طمانیت، شباب کی رخصت اور پیری کی آمد پر ہراساں نہیں ہوتے، اسی طرح زندگی کو خوشی خوشی رخصت کرتے ہیں اور موت کو جانے پہچانے انداز میں گلے لگاتے ہیں۔ حمد کی ایک رباعی پیش کر رہا ہوں دیکھئے یہ کتنی حقیقتوں سے لبریز ہے اس میں تجزیہ و تجربہ کی کتنی پختگی پائی جاتی ہے۔ شعور و فکر کی کتنی آزمائشوں کے بعد وجدان اس نتیجہ پر پہونچ سکتا ہے۔ ؎

بے اس کے دلائے کوئی کب دیتا ہے
ہر کشتیٔ اُمید وہی کھیتا ہے!
ہم مصلحت اس کی جو سمجھ سکتے نہیں
اپنی کرتا ہے سب کی سُن لیتا ہے

مشاہدہ شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ لفظی پیکروں میں ڈھالا گیا ہے ؎

محنت سے ملول کیوں بشر ہوتا ہے؟
ہر شے میں ریاضت کا اثر ہوتا ہے
تپتا ہے جو آفتاب میں مدت تک
آخر شیریں وہی ثمر ہوتا ہے

راحت طلبی سے نیک نامی نہ رہی
عالم بگڑا، خوش انتظامی نہ رہی
پختہ ہو ریاضت سے تو ہے لطف حیات
خوش ذائقہ کھیل ہوا، خامی نہ رہی

آزاد ہوئے تو شادکامی نہ رہی
گھبرا فکروں نے جب غلامی نہ رہی
کامل جو بشر ہوا، اجل آپہونچی
بوسیدہ ثمر ہوا، جو خامی نہ رہی

فن پاروں کا فن کار کتنے تجربات سے گذرا ہوگا آپ اندازہ کیجئے کہ ؎

پھل پائیں گے جو تخم عمل بو دیں گے
مرقد میں یہ پھول بس کے خوشبو دیں گے
جن کے لئے چھوڑتا ہے مال اے منعم
مرنے پہ وہ مٹی بھی نہ تجھ کو دیں گے

شر جس میں ہے وہ بشر خردمند نہیں
دشمن کیا دوست اس سے خرسند نہیں
اُمیدِ وفائے وعدہ اس سے توبہ
جو شخص کہ اوقات کا پابند نہیں

ضد جس کی ہے خاک بھلا سمجھے گا
جب فہم کی طاقت نہیں کیا سمجھے گا
بے فائدہ ہے بحث، کرو صبر و سکوت
باطل پہ جو ہے اس سے خدا سمجھے گا

ہرگز نہ رہ صدق و صداقت چھوڑو
ہاں کام جو ہیں قابل نفرت چھوڑو
تم میں ہیں اگر سارے زمانے کے عیب
چھٹ جائیں گے سب جھوٹ کی عادت چھوڑو

سرکش اپنہ غرور و غیظ سب بیجا ہے
تو آگ نہ بن کہ خاک کا پتلا ہے
ملنا ہے اسی خاک میں اک دن تجھ کو
آخر کو بڑے بول کا سر نیچا ہے

پیری کے سلسلے میں ان کا سلجھا ہوا لہجہ کتنے واضح خیالات کا حامل ہے۔ ان ابدی حقیقتوں سے کسے مجال انکار ہو سکتا ہے۔؟

پیری میں جوانی کا پلٹنا معلوم
پھیلی ہوئی دھوپ کا سمٹنا معلوم
دیتے ہیں عبث نزع میں شربت احباب
تلخیٔ اجل کا اس سے گھٹنا معلوم

کم ظرف امیری میں بدل جاتے ہیں
اپنے بھی فقیری میں بدل جاتے ہیں
بنواتے ہیں دانت اور آنکھیں بڈھے
اعضا بھی تو پیری میں بدل جاتے ہیں

بڑھاپے کی ضمن ہی میں یہ دیکھئے کہ تصنع کی لا حاصل پردہ کس پر وقار انداز سے پہونچے ہیں ؎

اچھا نہیں انجام ستم گاری کا
انداز نہ سیکھ چرخ زنگاری کا
اچھا نہیں بار بار بالوں میں خضاب
جم جائے نہ پھر رنگ سیہ کاری کا

دنداں ٹوٹے کہ ہائے ٹوٹے موتی
رہزن تھا بڑھاپا چھنے لوٹے موتی

بنوایئے دانت بھی تو کیا ہوتا ہے
سچوں کو پہونچتے نہیں جھوٹے موتی

طفلی و شباب کی رخصت کے بعد اب بڑھاپے سے سازگاری
ان کی حقیقت شناسی اور عاقبت بینی کی ترجمان ہے ۔

طفلی جو گئی دل ہوا تھوڑا میرا
پھر قلب شباب نے بھی توڑا میرا
ممنون بڑھاپے کا ہوں میں تو تا بہ ابد
مرتے مرتے ساتھ نہ چھوڑا میرا

بڑھاپے سے سازگاری کی حد ہے کہ اب اسکی افادیت
کے معترف ہو رہے ہیں ۔

تکلیف اٹھائی حفظ نقصانی سے
سمجھا دشمن کو دوست نادانی سے
ضعف پیری کی قدر کر اب ثابت
تن سے نکلے گی جان آسانی سے

نزع اور موت کے معاملہ میں کیا بصیرت مندانہ
اور کارآگہانہ خیالات رکھتے ہیں ان حقائق سے انکار کی
قطعاً گنجائش بھی نہیں ۔

جب نزع میں موت کا ستارا چمکا
شدبز نفس بھر کے طرار چمکا
آنسو بہہ کر جا نہیں یہ رخ پر
صبح شب زندگی کا تارا چمکا

جو کہہ گئے راہ بر وہی ہوتا ہے
بے کار ہے جھینکنا عبث رونا ہے
کوٹھے میں کھلی ہوا میں سونیوالے
اک دن تجھے بند قبر میں سونا ہے

انسان سے زمین کا شکم بھرنا ہے
ہشیار کہ دور کا سفر کرنا ہے
ہوتا نہیں کیوں غیر کی میت میں شریک؟
آخر تجھ کو بھی ایک دن مرنا ہے

اخلاقی رباعیات میں صرف تین چار رباعیات
پیش کروں گا، جن کی دوامی قدریں عدم حقیقت کا شائبہ
تک نہیں رکھتیں ۔

وہ قابلِ رحم ہیں جو دکھیارے ہیں
دور اپنے وطن سے رنج کے مارے ہیں
انسان کا ذکر کیا کہ حیوان پہ بھی
کھاتے ہیں ترس خدا کے جو پیارے ہیں

رنج و غم دوست سے اگر مضطر ہے
قدر اس کی کرو وہ دل خدا کا گھر ہے
دکھیاروں کے رنج پہ پسیجے نہ اگر
انسان کا دل نہیں ہے وہ پتھر ہے

دنیا میں جو کوئی پھولتا پھلتا ہے
حاسد کف افسوس عبث ملتا ہے

مل جاتی ہے خود بہ خود سزا جرم کے ساتھ
پھلتا ہے کوئی تو اس کا دل جلتا ہے

پابند تعصب جو نہیں حق رو ہے
احباب میں قابل تفاخر وہ ہے
مردی نہیں خون دوسروں کا پینا
غصے کو جو پی جائے بہادر وہ ہے

رباعیات ہمارے ادب میں یادگار بھی سمجھی جاتی ہیں اور فنی لحاظ سے دشوار بھی اس صنف سخن کے تقاضے کامل طور پر ماہران فن ہی ادا کر سکتے ہیں فن کی شرائط دقیقوں کے ساتھ ان میں ادبی حقیقتوں کا اظہار و ابلاغ ثاقب مرحوم کا بڑا زبردست ادبی کارنامہ ہے۔ اب ان کے چند متفرق اشعار ملاحظہ کیجئے۔ جن میں اسی قسم کی دوامی قدریں مکمل آب و تاب کی ساتھ جلوہ گر ہیں"

امتیاز نیک و بد کیا ہو قضا کے سامنے
پس گئے دانے جو آئے آسیا کے سامنے

نیک کی صحبت سے بدطینت کا بیجا ہے غرور
ہم نشیں گل ہو تو کیا افتخار خار ہے

تیز طبعوں کے حضور آتش بیاں بھی دنگ ہیں
شمع ہوتی ہے خموش اکثر ہوا کے سامنے

ہر خوشی کا باغ گلشن میں تباہی ہے مآل
کھل کھلا کر جب ہنسیں کلیاں پریشاں ہو گئیں

حرص بھی اتنی بڑھی جتنی بضاعت بڑھ گئی
شمع بھڑکی اور بھی جا کر ہوا کے سامنے

حسیں مشکل سے ملتے ہیں نہ دل ملتے ہیں مشکل سے
مگر کمیاب ہیں احباب جو ملتے رہیں دل سے

اپنے حق میں بوئے کانٹے پھول کا طالب ہے تو
مزرع عقبیٰ ہے دنیا، خار کا پھل خار ہے

ہو مقابل نور سے ظلمت بھلا کیا تاب ہے؟
کیا وقار راہ زن ہو رہنما کے سامنے

کہتی ہے ہر شے زمانے کی زبان حال سے
کوئی صانع ہے ضرور اس کارخانے کیلئے

لاکھ آندھی زور سے اٹھے مگر پھر خاک ہے
آبرو کیا پائے گی باد صبا کے سامنے

ناقص و کامل برابر ہو کبھی ممکن نہیں
مہ فاضل اور ہے، مہ مقابل اور ہے

ادنیٰ سے فیضیاب ہو اعلیٰ محال ہے
دھبا نہ ابر دھو سکا ماہ منیر کا

عجب کوفت سے کٹتی ہے زندگی افسوس
صدا یہ دے گیا جب سیخ پر کباب آیا

جن کو تو اعضا سمجھتا ہے وہ اعدا ہیں تیرے
پوست کندہ حال کہدیں گے خُدا کے سامنے

بےکسی میں کاتب اعمال بھی رخصت ہوئے
رہ گئے اعمال اپنے ساتھ جانے کے لئے

عیال، اطفال، مال، احباب سب دنیا کے ساتھی تھے
شریک حال بس اعمال اپنے مرتے دم نکلے

قبر میں رکھ کر نہ ٹھہرا کوئی دوست
خاک میں سب کی محبت مل گئی

زیادہ پھولتے ہیں بحر دہر میں کم ظرف
ثبوت ہوگیا پانی پہ جب حباب آیا

رہے جہان میں انسان آن بان کیساتھ
کہ جوہری جو ہیں موتی کی آب دیکھتے ہیں

ہوتا نہیں جب تک کہ رسائی پہ مقدر
پارس تو بڑی چیز ہے پتھر نہیں ملتا

دنیائے دوں بھی رنگ بدلتی ہے دم بدم
عاقل کو یہ حنا کا اشارہ چمن میں ہے

صحبت نیک سے نقصاں نہیں بدکار ہی کو
آتش گل نہ جلائے گی کبھی خاروں کو

روشن دلوں کو اپنی جگہ پر قیام ہے
کب شمع بزم رکھتی ہے باہر لگن سے پاؤں

گراں تر ہیں جو صحبت میں جگہ پر اپنی قائم ہیں
نہ بہتے دیکھا مثل آب دریا، آب گوہر کو

مثالوں کی فراوانی، فن کار کی ہمہ گیری، اور ہمہ دانی پر بھی دلالت کرتی ہے اور اس کے کامل فن ہونے پر بھی اب میں ثابت مرحوم کے کچھ مقاطیع پیش کروں گا۔ ان مقطعوں کی مندرجہ حقیقتوں میں جو ابدیت وآفاقیت ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ ازل سے تا ابد ان کی تابانی یکساں رہی ہے اور یکساں رہے گی۔

ثابت گرے گا آپ ہی اسمیں وہ کور دل
کھودے گا جو کنواں کسی رہگیر کے لیے

کم ظرف سے نہ مانگ کہ ثابت نہ ہو ذلیل
قطرہ بھی نام کو نہیں جام حباب میں

لازمی باتوں میں ثابت انتشار و وہم کیوں؟
موت آنے کیلئے ہے جان جانے کے لئے

ثابت مرحوم کا مولد وطن لکھنؤ تھا۔ ۱۸۷۲ء میں وہیں پیدا ہوئے معاشی ضرورتوں کے تحت دہار سے ۱۸ برس کی عمر یعنی ۱۸۹۰ء میں کوٹہ (راجستھان) آئے۔ یہاں انھوں نے ریاست کے محکمہ عدلیہ میں ملازمت کی، بعد ازاں

وکالت کرنے لگے۔ ریاست سے اُنھیں ادبی وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اور دربار میں ان کی نشست بھی مقرر تھی۔ حیات دبیر، دربار حسین، ان کی گراں قدر تصانیف ہیں۔ انکے عزائی کلام کا مجموعہ صبر جمیل (تاریخی نام۔ برق غم) سے چھپ چکا ہے۔ غیر عزائی کلام کا مطبوعہ مجموعہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ غزلیں اُنھوں نے کہی ہیں اور بہت کہی ہیں۔ شاید دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ۱۹۴۱ء میں کوٹہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہیں سپرد خاک کئے گئے اِنّا للہِ وَاِنّا الیہِ رَاجِعُوْن۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ماہنامہ فروغ اُردو ملکیت کے متعلق رجسٹریشن وقواعد ۱۹۵۶ء کے قاعدہ ۸ کے تحت بیان

۱۔ مقام اشاعت۔	لکھنؤ	
۲۔ نوعیت اشاعت۔	ماہنامہ	
۳۔ نام پرنٹر۔	سید انصار حسین	
قومیت۔	ہندوستانی	
پتہ۔	اقبال منزل مقبرہ عالیہ گولہ گنج لکھنؤ	
۴۔ نام ایڈیٹر۔	محمد حسین شمس علوی	
قومیت۔	ہندوستانی	
پتہ۔	نعمت اللہ بلڈنگ نعمت اللہ روڈ لکھنؤ	
مالک اخبار۔	سید انصار حسین	

میں سید انصار حسین تصدیق کرتا ہوں کہ جو اطلاعات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں

(سید انصار حسین)

ناسخ اور اصلاحِ زبان

اُردو زبان و ادب میں دلّی اور لکھنؤ دو اہم دبستان مانے گئے ہیں۔ آزاد نے ان دونوں دبستانوں پر بڑے ہچے تلے انداز میں یوں حکم لگایا ہے۔

یہ امر کچھ دلّی والوں کے لئے موجب فخر ہے۔ نہ لکھنؤ والوں کے لیے باعث رنجش آخر دلّی بھی ایک دن میں شاہ جہاں آباد نہیں ہو گئی تھی۔ میر تقی اور مرزا رفیع پیدا ہوتے ہی میر اور سودا نہیں ہو گئے۔ جب کلام کا سلسلہ یہاں تک پہونچا تو اس قدر کہنا واجب ہے کہ اس عہد تک شعرائے لکھنؤ ان اُستادوں کے شاگرد تھے جن کا دریائے کمال دلّی کے سرچشمہ سے نکلا تھا۔ اور فضحائے لکھنؤ بھی ہر محاورہ کے لئے دلّی ہی کو فخر سمجھتے تھے۔ کیوں کہ وہ اکثر انھی بزرگوں کے فرزند تھے جنھیں زمانہ کی گردش نے اُڑا کر وہاں پھینک دیا تھا۔ پس شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلّی کی قید و پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دی اور دہی مستند ہوئی۔

اُردو زبان و ادب کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے اُن دبستانوں کی خصوصیات پر مختصراً نظر ڈال لینا از حد ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ان میں امتیاز ہو سکے اور پھر ناسخ کی اصلاحات کا کما حقہ جائزہ لینا مُمکن ہو سکے گا۔

دلّی میں اُردو زبان کی اصلاح میں وضع محاورہ اور روز مرّہ کے علاوہ لفظی کانٹ چھانٹ اور تراش خراش کی طرف خاص طور پر توجہ دی گئی۔ آزاد روز مرّہ پر جان دیتے تھے۔ ان کے نزدیک اس بات کی اہمیت زیادہ تھی کہ محاورہ کہاں تک درست ہے اور روز مرّہ کہاں تک مُستند ہے۔ عوام کی پسند و ناپسند کو وہ معیار خیال کرتے تھے اور اس سے ہٹ کر عجیب و غریب محاوروں اور دور از کار تشبیہوں کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے البتہ انشا پردازی میں اُنھوں نے وہ کمال دکھایا جو دوسروں سے آج تک نہ ہو سکا۔

آزاد کے علاوہ جس شخص نے سب سے زیادہ لفظی

تراش خراش کی طرف کی وہ ہے مرزا مظہر جانِ جاناں
وہ الفاظ کے بادشاہ تو جہ تھے۔ بہت سے الفاظ کو آپ نے
نئی تراش دیکر خوبصورت تر بن شکل میں عوام کے سامنے
پیش کیا۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری میں مرزا مظہر
کا ایک خاص مقام ہے لیکن ان کی اصل خدمت ہم اصلاح
زبان گردانتے ہیں اجمالاً ان کا مقصد اصلاحِ زبان
ہی رہا ہے۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جبکہ لفظی گری کا
بازار گرم تھا۔ مظہر نے بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھا اور
کامیاب رہے۔ انھوں نے ایہام گوئی کے خلاف خاص
طور پر علم بغاوت بلند کیا۔ اس سے قبل ہماری شاعری
میں صنعت ایہام گوئی کا بہت زیادہ استعمال کیا جاتا
تھا۔ اور بھاشا کے الفاظ کی کثرت تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے
ہیں کہ قدیم شعرار جو عہد محمد شاہ کے اکثر ہیں ان کا کلام
عموماً اسی رنگ میں ہے ابتداء میں مظہر کے ہم عصروں
نے بہت مخالفت کی لیکن آخر کار عوام کا مذاق تبدیل
ہونا شروع ہوا۔ اور نئی پود ایک نئے انداز سے نئے لفظی
خزانے لئے ہوئے سامنے آئے۔ مثلاً کد (کبھی)، کنوُ
(کیسی) یا ٹک (ذرا) وغیرہ کی تبدیلی کے ساتھ زبان میں
داخل کئے گئے۔

اور حقیقت یہی ہے کہ نئے الفاظ بہ نسبت قدیم
کے زیادہ صاف، شستہ اور فصیح ہیں ان کی وہ گرانی
اور بوجھل پن دور ہوگیا جس کے سبب ان کی فصاحت
میں خلل پڑتا تھا۔

علامہ شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" میں لکھا
ہے۔ الفاظ بھی فصیح وغیر فصیح ہوتے ہیں ایسے الفاظ جو
زبان زدِ خاص و عام ہوں عموماً فصیح خیال کئے جاتے ہیں
لیکن اس میں شک نہیں کہ ان الفاظ کو رائج کرنے والے
علمار یا شعرار ہی ہوتے ہیں۔ الفاظ کی جانچ پڑتال،
ان کی زیب و زیبائش کا خیال کرنا عوام سے زیادہ
خواص کا کام ہے۔ عوام کے ذوق کو بگاڑنے یا بنانے
میں انہی کا حصّہ ہوتا ہے۔ اور یہ حال ہر زبان وادب
کا ہے۔ علماء اور انشار پرداز اس پر دیسی فرض کو دور
کرنے کی ممکنہ کوشش کرتے ہیں جو عوام کو سہل پسندی
کی وجہ سے زبان کو گھیرے رہتا ہے۔ ایسے الفاظ کی
تنقیح عہد بہ عہد برابر ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ فطری اتفاق
کا تقاضہ بھی ہے چنانچہ فرانس میں ایک باضابطہ اکیڈمی
قائم ہے جس کا مقصد اور مدعا یہ ہے کہ موقع بہ موقع اپنے
لفظی خزانے کی تنقیح کرے۔ الفاظ کے علاوہ زبان میں
نئے نئے محاورے اور ترکیبیں بھی داخل کی جاتی رہی ہیں
ابتدار میں ان پر تجربے کئے جاتے ہیں۔ اگر ان میں فصاحت
ہو اور عوام وخواص کی پسند کی سند حاصل ہو جاتے تو یہ
مستقلاً زبان وادب میں جگہ پا جاتے ہیں۔ نئی نئی ترکیبیں
محاورے اور روزمرّہ کی طرف علمار کا برابر دھیان رہتا
ہے۔ جب نیا لفظ کسی لفظ کی جگہ لیتا ہے تو قدیم لفظ خود
بخود متروک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زبان کی درستی کے بارے
میں مولانا حالی فرماتے ہیں ؎

"اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان
کی صحبت اور ان کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک
بسر کرنا ہے کہ ان کے الفاظ و محاورات بقدر
معتدبہ نہ معلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں لیکن

چوں کہ ایسا موقعہ ملنا ہر شخص کو دشوار ہے اس لیے ضروری ہے کہ شعرائے اہلِ زبان کا کلام جس قدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار پڑھا جائے نہ اس ارادے سے کہ خیالات اور مضامین کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیراؤں میں ادا کرتے ہیں۔ (مقدمہ دیوان حالی ص۱۱۵)

کسی لفظ یا محاورے کی صحت کی بحث میں اہلِ زبان کا حکم آخری سمجھا جاتا ہے۔ اور خصوصاً جب کہ وہ اہلِ زبان مستند عالم و زبان داں تسلیم کیا گیا ہو۔ چنانچہ حوالہ میں ایسے ہی شعرا یا ادباء کا استقلال پیش کیا جاتا ہے جو بذاتِ خود اس فن کے اُستاد ہوں۔ شبلی نے الفاظ کی فصاحت کی یوں تعریف کی ہے۔۔

"لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو۔
الفاظ مانوس نہ ہوں۔ قواعد صرفی کے خلاف نہ
ہوں۔"

ایسی صورت میں ہم اس زبان کی ارادی تشکیل کہیں گے مثال کے طور پر جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے جہاں باضابطہ ترجمہ اور وضع اصطلاحات کا کام کیا جاتا تھا۔ جو نئے نئے علوم و فنون کی صورت میں وقتاً فوقتاً ہمارے سامنے آتے رہتے تھے یہ ایک مستقل ادارہ تھا جہاں بڑے بڑے علماء، ماہرینِ زبان اور اربابِ علم و فضل برابر کام جاری رکھے ہوئے تھے نئے نئے علوم کے لیے الفاظ کی تلاش زندہ قوموں کے لیے ضروری ہے کیوں کہ وہ لفظی درآمد کو قبول نہیں کرتے۔ یہ ذمہ داری اس زبان کے اربابِ علم و فضل کی ہے۔

ہم مرزا مظہر کے بارے میں لکھ چکے ہیں کہ اُردو آپ کی ممنونِ احسان ہے کہ آج اُردوئے معلیٰ کی زبان میں شاعری ہونے لگی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں مظہر کی مخالفت بھی کی گئی ہے لیکن اجتہاد ہی کسی منزل کا پہلا قدم ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ شمالی ہند کے اربابِ کمال کو دکن کی اندھا دھند تقلید کرنے میں جو بات مانع رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ خود صاحبِ طرز تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ دکن سے جو کتابیں آ رہی تھیں ان کی زبان شمالی ہندوستان کی زبان سے قدرے مختلف اور جو تقلید ابتداء میں کی اُس کا اثر یہ ہوا کہ وہ برج بھاشا کی طرف متوجہ ہوئے اس خیال سے کہ دکن والوں نے برج بھاشا میں شاعری کی ہے اور اس کی شہرت اور کشش کا شاید یہی راز ہے۔ اس کا نتیجہ اُلٹا نکلا۔ شمالی ہند کے لوگ ایہام گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے اور دوہوں وغیرہ کے طور پر اُردو میں بھی کلام کہنا شروع کیا۔ یہ بات عہدِ محمد شاہ میں خاص طور پر نوٹ کی جا سکتی ہے۔ لیکن کچھ آگے چل کر ان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ دکنی طرز کی شاعری کے لیے تکلف اور تصنع سے کام لینا پڑ گیا۔ لیکن بہت جلد شمالی ہند کو مرزا مظہر جانِ جاناں جیسا زبان داں مل گیا۔ مظہر نے کوشش اس بات کی کی کہ اپنی روزمرہ کی زبان میں فارسی اجزاء کی آمیزش کر کے شعر لکھنے کا رواج ڈالا۔ جس کی ترقی عہدِ ناسخ تک برابر جاری رہی اور در

اصل ناسخ نے ہی اس کو کمال تک پہونچایا۔ اس بات
کی گواہی اس عہد کے ایک نامور شاعر غلام ہمدانی
مصحفی نے اپنے تذکرۂ ہندی میں یوں دی ہے۔

"درابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و میرزا
وغیرہ کہ عرصہ بیا درہ بود در دار ایہام گویاں
بود اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست
فی الحقیقت نقاشِ اول زبان ریختہ باعتقاد
فقیر مرزاست۔ بعدہ تتبعش دیگراں رسیدہ"۔

غرض مرزا مظہر کی تحریک سے ایک اہم فائدہ یہ ہوا کہ
الفاظ اصلی عربی یا فارسی املا کے مطابق لکھے جانے
لگے۔ بہت سے الفاظ جو اردو میں داخل ہونے کے
بعد اپنی ہیئت یا تلفظ کھو بیٹھے تھے ان کی پھر سے
فارسی انداز پر اصلاح ہوئی مثلاً۔
صحی (صحیح)، دوانہ (دیوانہ)، تسبیں (تسبیح)،
بگانہ (بیگانہ)، تجہ (تیری)، پہ (پر)، واں (وہاں)
یاں (یہاں)، کیدھر (کدھر)، اُدھر (اُدھر)، ستی
(سے)، کبھو (کبھی)، بن (بغیر) وغیرہ۔

مرزا مظہر کی تحریک سے لسانی تبدیلی کے باب
میں الفاظ کے املا کے علاوہ بہت سے الفاظ ہی یکسر
متروک کر دیئے گئے۔ جو برج بھاشا سے دکنی زبان کی
تقلید کی دوڑ میں حاصل کئے تھے مثلاً۔ جگ، نت،
نین، بسرنا، انپڑنا، وغیرہ۔

مذکورہ بالا سطور میں مختصراً زبان کی اہمیت
اور ارتقار کے بارے میں اور خصوصاً مرزا مظہر کی خدمات
کا جائزہ لیا گیا۔ اب کسی قدر تفصیل سے ہم مصلح زبان شیخ
امام بخش ناسخ کی خدمات کا جائزہ لینے کی کوشش
کریں گے۔

شیخ امام بخش ناسخ کا تعلق لکھنؤ اسکول سے ہے
اگر ہم ناسخ سے پہلے کی شاعری پر نظر ڈالیں تو یہ
بات صاف نظر آتی ہے کہ اس میں بھونڈے لفظوں،
بھدی ترکیبوں، اُلجھے فقروں غلط لفظوں نیز پست
خیالات، عامیانہ سوقیانہ لفظوں کی بھرمار تھی۔
زبان کو ایک مصلح اور استادِ فن کی سخت ضرورت تھی
ایسے وقت قدرت نے ناسخ جیسا اُستادِ سخن، مجددِ فن
اور مصلح زبان کی حیثیت سے پیدا کیا۔ ناسخ زبان کا ایسا
لطیف ذوق لے کر پیدا ہوئے تھے جو کسی دوسرے کو اس
وقت نصیب نہ ہو سکا تھا۔ انھوں نے اپنی ایجادوں،
اصلاحوں اور اختراعوں سے زبان اور شاعری میں اتنی
خوبیاں جمع کر دیں جو ان سے پہلے کسی شاعر سے نہ ہوسکا
تھا۔ شمس لکھنوی لکھتے ہیں۔

"..... وہ ایک طرزِ جدید کے موجد اور طرز
قدیم کے ناسخ کہے جاتے ہیں اور کسی چیز کو ایک
نئی صورت بخشنا ہر دل و دماغ کا کام نہیں۔ ایسی
شخصیت صدیوں میں بھی نہیں پیدا ہوتی"۔

ساتھ ہی ذرا ڈاکٹر سید عبداللہ کی حسب ذیل رائے دیکھیے
جو ناسخ کی خدمات کا تقریباً احاطہ کئے ہوئے ہے۔

"ناسخ کا اصل کارنامہ ادبی یہی ہے کہ انھوں
نے ادبی زبان کی تصحیح و توسیع کے لیے کوشش
کی ہے اور شستہ مذاق کی تسکین کے لئے الفاظ کے
ثقل اور گرانی اور حروف کی صوتی خوبیوں کا

توضیحی اصولوں پر خاص زور دیا ہے۔ اس
بارے میں قدیم بلاغت کا فن ان کے سامنے
تھا۔ اسی کی بنیاد پر انھوں نے الفاظ کی فصاحت
اور کلام کی بلاغت کے قاعدے وضع کئے اور
ان کو لکھنؤ کی زبان پر استعمال کرتے ہوئے۔
ذوق سامعہ کی تربیت کے سامان پیدا کئے
یوں اُنھوں نے ایک طرف شاعری کی صحت
لفظی سے پیوند دیا اور دوسری طرف شاعرانہ
ذوق کو ناگوار آوازوں سے بچا کر صوت و نوش
اور لفظ درست کا ربط قائم کیا۔"

یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ کسی بھی زبان
وادب کے شاعر نے اتنی اصلاحیں نہیں کیں جتنی ناسخ
نے زبانِ اُردو میں کی ہیں۔

سب سے پہلا اور اہم کام اُنھوں نے یہ کیا
کہ اُردو کو مستقل زبان بنا دیا اور ان سے پہلے زبان
فارسی کے تابع تھی جس کی وجہ سے کلام میں تعقید و
گنجلک کا اثر نمایاں طور پر جھلکتا تھا۔ ناسخ نے اس
خرابی کو دور کیا اور جملے کی ترتیب اس طرح کی کہ جس
سے جملے میں سلاست اور فصاحت پیدا ہوگئی۔

ناسخ کے بارے میں امداد امام آثر کی حسب ذیل
رائے بڑی اہمیت حاصل کی ہے۔

"اگر جنابِ شیخ کو اصلاحِ زبان کی طرف
توجہ نہ ہوتی تو زبانِ حال کی صورت پیدا نہ
ہوتی۔ ناسخ سے پہلے اُردو زبان اور غزل
دونوں کو ریختہ کہتے تھے اُنھوں نے غالباً سب
سے پہلے زبان اور غزل کو علیٰحدہ علیٰحدہ اُردو
اور غزل کے نام سے رواج دیا۔ سنسکرت کے
ثقیل الفاظ کی جگہ عربی فارسی کے الفاظ داخل
کئے۔ اور بندش میں بھی اساتذہ فارسی کے
نمونوں سے فائدہ اُٹھا کر غزل کی زمینوں
میں تصرف کیا اور موضوع کے اعتبار سے اس
میں وسعت پیدا کی۔ غزل میں عاشقانہ جذبات
کے علاوہ دوسرے مضامین ادا کرنے کی ابتدا
کی۔ تذکیر و تانیث کے قواعد مقرر کئے۔ ردیف
اور قوافی کے اصول بنائے۔ ان تمام امور کو
ملحوظ رکھیں تو ناسخ کو شعرائے لکھنؤ کا اُستاد
کہنا بے جا نہیں ہے"

ناسخ کو بجا طور پر دبستانِ لکھنؤ کا بانی کہا جاتا ہے
اُنھوں نے دہلی اور لکھنؤ کے امتیازات کو متعین کیا۔
اور ان خصوصیات کو اپنی شاعری میں بھی ملحوظ رکھا
اسی لیے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ لکھنویت
سے شاعری کا جو خاص رنگ مراد ہے وہ ناسخ کی تحریک
کا نتیجہ ہے۔

ناسخ کا زیادہ تر کلام غزلوں پر مشتمل ہے اور اُنھوں
نے اصلاح کا کام بھی خاص طور پر غزل کی زبان میں
انجام دیا۔ غزل کا سب سے اہم عنصر عشق ہے چنانچہ
اگر دونوں دبستانوں (دہلی و لکھنؤ) پر نظر ڈالی جائے
تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عشقِ حقیقی ہو یا عشقِ
مجازی دونوں کو موضوعِ شعر بنایا گیا۔ لیکن لکھنؤ کے
معاشرتی اور تمدنی حالات نے عشقِ مجازی کو اس کے

معینہ حدود سے بڑھا کر پوری شاعری پر اس کا تسلط
قائم کیا۔ ناسخ کے پاس ایسے اشعار جن میں حسنِ مطلق
کے مضامین باندھے گئے ہیں نہیں ملیں گے۔ یا اگر کہیں
مل بھی جائے تو یہ محض مروجہ شاعری کے ضابطوں کی
تکمیل کی مجبوری میں کہے گئے ہوں گے۔ اس کے بجائے
محبوب کے سراپا اور حسنِ ظاہری یا اس کے متعلقات
کا بیان کثرت سے موجود ہے۔ مثلاً

بوسے لیتا ہے ترے بالے کی مچھلی اے صنم
ہے ہمارے دل میں عالم، ماہی بے آب کا

کیا ترے کثیف پائیں ہے خوشبو
شبہ ہے نافِ آہوے چین کا

تو اپنے بالے کی مچھلی نہ زلف میں اٹکا
شکارِ شب کو نہ کر زینہار مچھلی کا

پہنے کرتی اگر وہ جالی کی
کرے ہے حلقہ کو ستارہ پیٹ

نقرئی پٹھے کا تو نے ڈالا حباف
ہے سیاہ سارا بدن اور دمِ ماہ سیاہ

اب یہ بات کسی قدر واضح ہوتی ہے کہ لکھنؤ کے شعرا نے
لوازمات و متعلقاتِ حسن کے بیان سے محبوب کی ذات
کا تعین کر دیا ہے۔ فارسی کے زیرِ اثر ابتدا میں اردو
شاعری میں محبوب کی کبھی مذکر کے صیغہ میں مخاطب کیا
ہے تو کبھی مونث کے۔ خود دتی نے فارسی کے زیرِ اثر محبوب
کو مذکر کی صورت میں یوں لکھا ہے کہ

ثنا ہوں خضر سوں دل کے بہ حرفِ تازہ و تر
بہارِ سبزۂ خط ہے بہارِ ناز و ادا

دل کو دنیا ہے ہمارے پیچ و تاب
پیچ تیرے طرۂ طرار کا

اسی انداز کے اشعار اور شعرا کے یہاں بھی مل جاتے ہیں
مثلاً ؏

طور کیا پوچھتے ہو کافر کا
شوق ہے یا لگا ہے سیاہی ہے (آبرو)

کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتل عام کیا (پیام)

اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ شعرائے دہلی نے دکن
کے مخصوص رنگ میں بہت کچھ اصلاح کی۔ اس ضمن میں
شاہ حاتم، سراج الدین خاں آرزو اور مظہر جانجاناں
نے بھی خاص طور پر زبان کی اصلاح میں خاص طور پر
عملی کوشش کی۔ لیکن ان کی کوشش اور محنت اتنی کار
آمد نہیں کہی جا سکتی جتنی کہ حضرت امام بخش ناسخ نے
نہ صرف اصلاح ہی کی بلکہ اس کے اصول بھی مرتب کئے
اور ان اصولوں پر وہ سختی سے کاربند رہے۔

الفاظ کی اصلاح کے سلسلے میں ذیل کی فہرست
سے ناسخ کی کاوشوں کا معتدبہ اندازہ ہو سکتا ہے۔
ہم "کچھ" قدیم الفاظ اور اصلاح شدہ الفاظ (قوسین
میں) پیش کرتے ہیں۔ مثلاً

تئیں (تو)۔ بے صبح سے تا شام (صبح سے شام تک)
پرے (الگ) میں (میں نے)۔ مجھ (مجھ سے)، تجھ بن
(تیرے بغیر)، جن نے (جس نے)، اُن نے (اُس نے)،
لاگا (لگا)۔ بغل بیچ (بغل میں)، کے تئیں (کو)، جائے
ہے (جاتا ہے)، حال سہا (صدمہ سہنا)، پھرے ہے (پھرتا ہے)

حسانات ہیں کہ اُنھیں بھلا یا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے
ہ جب میں پنجرے میں بند تھا تو میری خواہش تھی کہ بنگال
ں رہوں، لیکن میرے دوستوں کو اتنا بھی خیال نہیں آیا
ہ اگر پنجرے میں رکھنا ہی تھا تو بنگال میں رکھتے

مسٹر سدھارت رائے کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ سی آر داس جیسے عظیم لیڈر کے خاندان سے مجھے ان ہی خیالات اور احساسات کی امید تھی۔ اس خاندان کے ہم سب پر بڑے احسانات ہیں۔ سی آر داس کا نام آتے ہی میرے ذہن میں تمام باتیں آجاتی ہیں۔ مسٹر رے سے ملاقات کے بغیر ہی میں ان کی صلاحیتوں اور صفات کو محسوس کرتا تھا اس لیے جب انھوں نے بلایا تو میں کشاں کشاں چلا آیا اور آپ کے درمیان ہوں۔ لکھنؤ کی اردو ایڈیٹرس کانفرنس میں بھی مجھے شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے مسائل اور مشکلات کے کما حقہ، میں واقف ہوں مگر میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ان مشکلات کا دُور کرنا کچھ تو آپ کے ہاتھ میں ہے کچھ حکومت کے۔ ہمیں اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے حرکت کرنا ہے۔ جب ہم حرکت کریں گے تو حکومت انکار نہیں کرسکتی۔

شیخ صاحب نے کہا کہ جہاں تک اُردو کے بارے میں میرے اپنے خیالات ہیں تو سمجھ لیجیے کہ صرف جموں و کشمیر ہی ایسی ریاست ہے جہاں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے یوں پہلے بھی ریاست میں اُردو رابطہ کی زبان تھی لیکن اُردو کو سرکاری درجہ دیتے وقت ہمارے ذہن میں وہ تصورات نہیں تھے جو اُردو سے وابستہ کردیے گئے ہیں۔ یہاں تو ہر چیز مذہب کا روپ دھارن کرلیتی ہے چاہے وہ جان دار ہو یا بے جان۔ حتیٰ کہ رنگ میں بھی سبز رنگ مسلمان اور بھورا رنگ ہندو بن گیا ہے۔

لیکن مسلمان بخوبی جانتا ہے کہ یہ رنگ اور زبانیں مذہب نہیں ہوتیں رنگ و نسل کی بنا پر کسی کو برتری حاصل نہیں ہو سکتی چاہے کوئی کالا ہو یا گورا۔ تلگو بولے یا تامل عربی یا اُردو اللہ کے سامنے صرف اس کا تقویٰ ہی اسے افضلیت بخشے گا۔ اللہ کے سامنے وہی انسان بڑا ہے جو حقوق العباد کا خیال رکھتا ہے مسلمان کبھی تنگ نظریوں میں مبتلا نہیں رہا۔ عرب دنیا میں آئے تو یونان کے فلسفے کو پیش کیا۔ ہندوستان میں مسلمان آئے تو انھوں نے مہا بھارت اور گیتا کا مطالعہ کیا اور پھر اس کو ساری دنیا میں پھیلا دیا اُن کے دلوں میں تنگ نظری نام کو نہ تھی

شیخ عبداللہ نے کہا کہ بدقسمتی سے فرنگیوں نے ہمیں عجیب گورکھ دھندے میں پھنسا دیا۔ اُردو کو مسلمانوں کی زبان اسلام اور مذہب کا رنگ دے دیا۔ حالانکہ اُردو کی آبیاری میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کا ہاتھ ہے۔ اُردو کے بڑے بڑے عالم اور مفکر، ادیب و شاعر ہندوؤں میں گذرے ہیں جنھوں نے اُردو کو معراج کمال تک پہنچایا۔ ان حقوق کے باوجود مسلمانوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ سچ مچ اُردو ہماری ہے۔ اگر اُردو گئی تو ہمارا مذہب ہماری ثقافت اور ہماری روایات ختم ہو جائیں گی اس طرح ہندی اور اُردو کا مسئلہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے ہماری تحریک آزادی کو نقصان ہوا۔ اگر یہ مسئلہ نہ تا تو ہم لوگ اس سے بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے اس تصور اور تخئیل کو

(باقی مضمون صـ۳۲ پر)

قیوم صادق صدر شعبہ اردو، فارسی
گورنمنٹ کالج میلسی

لکھنؤ کی لسانی خدمات

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کی تصنیف "لکھنؤ کی لسانی خدمات" اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم کارنامہ ہے یہ کام صاحب موصوف کے کئی سال کی ذاتی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے۔ فہرست مضامین تین حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ تبصرہ، دوسرا تعارف تیسرا ضمیمہ۔

تبصرہ ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے جس میں مختصراً اردو زبان کی نشو و نما اور اس کی عہد بہ عہد ترقی کا حال بیان کیا ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لیکر لکھنؤ کے عروج تک ہندو مسلم میل جول اور ان کے لسانی ذرائع کا جائزہ اس طرح لیا ہے کہ قاری کسی الجھن میں پڑے بغیر آسانی کے ساتھ زبان کے اس پس منظر کو سمجھ لے۔

تعارف ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اس میں جتنے بھی لکھنوی مصنفین کا ذکر ہے۔ ان کی لسانی خدمات کے متعلق ہر ضروری بات اور ہر جزئی تفصیل دی ہے۔ یہ حصہ بہت اہم ہے اس میں لکھنوی مصنفین نے لغت، اور قواعد اردو پر جو کام کیا ہے اس کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ دریا کو کوزہ میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے ان مصنفین میں زیادہ تر شاعر ہیں لیکن ان حضرات نے نثری خدمت بھی انجام دی ہے اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ لکھنؤ کا دبستان اردو دنیا میں کیا مقام رکھتا ہے کہنا چاہیے کہ مصنف نے اس حصہ میں بہت زیادہ عرق ریزی کی ہے اسمیں آپ کا تعارف انشا، ناسخ، اشک، اسیر، قدر بلگرامی۔ عاشق لکھنوی، امیر مینائی، اشرف، جلال، شفق، رسوا، نظم، عزیز، نیر، جلیل عشرت، منیر، آسی، مرزا محمد عسکری، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، یاس یگانہ، نیاز فتحپوری، اثر لکھنوی، مسعود حسن ادیب مہذب لکھنوی، احتشام حسین اور مسعود حسین سے کرایا۔

اردو کا طالب علم ان ناموں سے واقف ضرور ہوگا۔ لیکن ان کے کارناموں سے غالباً نہیں ہوگا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے۔

ضمیمہ ۳۵ صفحات پر مشتمل ہے اسمیں لکھنوی مصنفین کے ان کارناموں کی گروہ بندی کی ہے اور مختلف ذیلی سرخیوں

کریلو (کیجیو) وغیرہ۔ بدلا کرنا (بدل لینا)، خاک میں رُلجانا
(خاک میں مل جانا)، کسو (کسی)، اور (طرف)، ٹک (ذرا)،
جوں (جس طرح)، با آنکہ (با وجود یکہ)، کبھو (کبھی)، بن
(بغیر)، و لے (مگر، لیکن)، ایدھر (ادھر)، بچارون
(بےچارون)، دیدار پانا (دیدار ہونا)، وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح محاوروں کی کچھ مثالیں مشتے از خروارے
کے طور پر ہم پیش کرتے ہیں تاکہ طوالت گراں نہ گزرے۔
اصلاح شدہ محاورہ قوسین میں دیا گیا ہے۔

قاصد چلانا (قاصد بھیجنا)، بھروسہ پڑنا (بھروسہ ہونا)،
خواب سے جانا (خواب آنا)، کب رُو ہے (کب منہہ ہے)،
اس کے گئے (اس کے جانے کے بعد)، اُن نے (اس نے)،
ولیک (ولیکن)، سُون سون (سُن سُن کر)، خواہ نخواہ
(خواہ مخواہ)، اُٹھے ہے (اٹھتا ہے)، طرح نرگس کے
(نرگس کی طرح)، چھپے ہے (چھپتا ہے)، ہمسایگاں (ہمسائیوں)
نہیں معلوم مجھ پر بھی (نہیں معلوم مجھکو بھی)، سونپ کر
کنج کفس میں (ڈال کر کنج قفس میں) کاڑھنے سیکھا ہے
(کاڑھنا سیکھا ہے) لگن لگا دی (محبت لگا دی)؛
جھوٹے بھی کہا (جھوٹوں بھی کہا) وغیرہ وغیرہ

اصلاح زبان کا کام ویسے تو ولی کے زمانے سے
شروع ہوچکا تھا۔ جسے بتدریج میر و سودا نے بھی آگے
بڑھایا سودا نے اس میں چمک پیدا کی۔ لیکن انھوں نے
باقاعدہ اصلاح زبان کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور ایسے
الفاظ کا بھی زیادہ خیال نہ رکھا جو متروک ہوچکے تھے نتیجہ
کے طور پر ایسے بہت سے الفاظ سودا کے یہاں مل جاتے ہیں
جن کی اصلاح ممکن تھی۔ اس سلسلہ میں حاتم کا نام بھی کافی
اہمیت رکھتا ہے جنھوں نے اصلاح زبان کی شعوری کوشش
کی۔ لیکن سودا کی طرح انھوں نے بھی متروکات کی سختی سے
پابندی نہیں کی۔ عام طور پر میر و سودا کی زبان کو مستند
مانا جاتا ہے۔

جن اساتذہ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اصلاح
زبان کی توجہ کی انھوں نے باضابطہ اصلاح زبان کے
کوئی اصول مرتب نہیں کئے۔ صرف ناسخ کی ہی شخصیت ایسی
نظر آتی ہے جنھوں نے اس کے اصول مرتب کئے۔ مثال کے طور
پر ناسخ نے فصاحت کے تین معیار مقرر کئے ہیں،

۱۔ تنافر نہ ہو
۲۔ غرابت نہ ہو
۳۔ تعقید نہ ہو

ساتھ ہی ناسخ نے اس امر کو بھی لازمی قرار دیا کہ لغات صحت
کے ساتھ استعمال کیجائے اور اس بات کا خیال بھی رکھا جائے
کہ نیز زبان کے حروف کسی طرح بھی دبنے نہ پائیں۔ لیکن ساتھ
ہی انھوں نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ ہندی زبان کے حروف
دب سکتے ہیں۔ نیز یہ پابندی بھی لگا دی کہ قافیے کے اصول
سب برتے جائیں۔ بندش چست ہو، حشو و زوائد کا دخل نہ ہو
ذم اور ابتذال کا پہلو شعر میں نہ نکلے۔ ناسخ نے انہی اصولوں
کو برتا اور اپنے شاگردوں کو بھی انہی اصولوں پر چلنے کی
سختی سے تاکید کی۔

اصلاح زبان کے باب میں ناسخ سے جو کمی رہ گئی اُسے
شاگردوں نے پوری کر دکھائی، جن میں وزیر، مرزا محمد رضا
خاں برق، علی اوسط رشک، مرزا حاتم علی بیگ مہر۔
سید محمد اسماعیل حسن تحیر، امداد علی بحر، ضامن علی جلال
اسد علی خاں قلق، آغا حسن امانت، اور محسن کاکوروی کے
نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اُردو ایڈیٹرس کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں شیخ عبداللہ اور وزیراعلیٰ مغربی بنگال کے اُردو زبان کی توسیع اور اشاعت کے لئے

زرّیں خیالات

کلکتہ کسی بھی زبان کی ترقی اور بقا کا انحصار اس زبان سے محبت کرنیوالوں پر ہے زبانیں حکومت کے رحم و کرم پر زندہ نہیں رہتیں بلکہ اہل زبان کی قربانیو سے ان کی آبیاری ہوتی ہے۔ اس لئے ہر اُردو دوست کو یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ اپنی پیاری زبان کے لئے کتنی قربانی دے سکتا ہے اس کے ساتھ ہی روزی کے ساتھ زبان کا رشتہ بھی اس کی بقا اور ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔

بنگال کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے سدھارت شنکر رائے جیسا وزیراعلیٰ ملا ہے اُردو کسی فرقے یا مذہب کی زبان نہیں یہ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ اس کی ترقی میں بلا تفریق مذہب ہندو۔ مسلمان اور سکھ سب کا ہاتھ ہے۔ اُردو قومی یکجہتی کا نشان ہے ان خیالات کا اظہار شیخ صاحب نے آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں کیا۔

وزیراعلیٰ جموں و کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے کہا کہ ۴۰ سال کے بعد آپ کے شہر میں آیا ہوں آپ کے شہر اور بنگال کے یہاں دن کے ساتھ میرا تاثر کچھ اور رہے۔ میں نے ہمیشہ یہاں کے لوگوں میں ایک زندگی دیکھی۔ مگر آج خاموشی دیکھ رہا ہوں نہ جانے آپ لوگ۔ بدل گئے ہیں یا میں، حالانکہ وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب ہے بازاروں میں وہی ہنگامے، ٹریفک میں وہی حالت میں تو سمجھتا تھا کہ ان ۲۵ برسوں کے دوران کچھ تبدیلی آئی ہوگی مگر پہلا تاثر یہی ہوا کہ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

شیخ صاحب نے کہا کہ ہماری زندگی میں انقلاب لایا ہے جنگ آزادی میں جو کردار بنگال نے ادا کیا ہے وہ نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے، وہ تاثر ہمارے دل سے نہیں مٹ سکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ بنگال کے لیڈروں کی خدمات اور قربانیاں کسی بھی ہندوستانی کے دل سے نہیں مٹ سکتیں۔ یہی جذبہ مجھے بار بار بنگال دیکھنے پر مجبور کرتا ہے اور اس جذبہ کے تحت انتہائی معذور ہونے کے باوجود میں منتظمین کی دعوت پر چلا آیا۔ آپ نے کہا کہ غلام ہندوستان پر بنگالیوں کے اتنے

مکرمی۔ تسلیم

میرے والد محترم جناب رحمت الٰہی برق صدیقی اعظمی صاحب نے شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کے کلام کو منظوم مکالمہ کی شکل دینے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اب تک موصوف کی چھبیس غزلوں کو مکالمہ کی شکل دی جا چکی ہے۔ اس سلسلے کا ایک مکالمہ آپ کے موقر رسالہ "فروغ اردو" میں برائے اشاعت بھیج رہا ہوں امید کہ آپ اسے اپنی آئندہ اشاعت میں شامل کر کے شکریہ کا موقع بہم پہنچائینگے نیز اس کاوش سے متعلق اپنی گرانقدر رائے سے بھی مطلع فرمائیں گے۔ جواب کے لئے ٹکٹ ارسال خدمت ہے۔

فقط والسلام　　　خیر اندیش

احمد علی برقی ایم۔ اے

محلہ باز بہادر شہر اعظم گڈھ

علامہ اقبال سے عالمِ خیال میں منظوم مکالمہ

محبت

از

رحمت الٰہی برقؔ صدیقی اعظمی محلہ باز بہادر شہر اعظم گڈھ

گفتۂ برقؔ اعظمی

بتا مجھ کو اے غیرتِ فخرِ رازی
شہید محبت ہے کافر کہ غازی

گفتۂ اقبالؒ

شہید محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی

برقؔ

حقیقی محبت ہے وہ یا مجازی
"سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی"

اقبالؒ

وہ کچھ اور شے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی

برقؔ

محبت سے خالی ہیں جو علم و حکمت
تو پھر اُن میں کیا جوہر امتیازی

اقبالؒ

یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی

برقؔ

محبت ہے کیا شے بتا دے یہ مجھ کو
کہ کھیلی ہے تو نے محبت کی بازی

اقبالؒ

نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوبِ سلطاں
محبت ہے آزادی و بے نیازی

برقؔ

تیرا فقر بہتر ہے یا بادشاہی
ہے دونوں میں حاصل کسے سرفرازی

اقبالؒ

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

بسلسلہ صفحہ ۲۷

مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی یہ مسلمانوں کی زبان نہیں۔ مگر اس میں خاطرخواہ کامیابی نہ ہوسکی۔

بدقسمتی سے ملک تقسیم ہوگیا اور اردو کو فرقہ وارانہ رنگ دینے والے اپنا بوریا بستر گول کرکے یہاں سے چلے گئے۔ مگر اپنے پیچھے اردو کی تئیں نفرت اور بداعتمادی کا تاثر چھوڑ گئے اُس وقت ایک طبقہ محسوس کرتا تھا کہ پاکستان میں اردو اس کا جائز مقام مل جائے گا مگر وہاں بنگلہ اور پنجابی کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا اور اردو کے خلاف تحریکیں چلیں پھر کہنا پڑا کہ

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ کہتا ہے مسلمان ہوں میں

اردو کو نہ ہندوستان میں جگہ ملی نہ پاکستان میں مگر ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہمارا دعویٰ صحیح ثابت ہوا۔ ہم پہلے ہی سے کہتے چلے آرہے تھے کہ اردو ہمارا مشترکہ سرمایہ ہے آپ نے کہا کہ ہم آزاد تو ہوگئے لیکن ہمارا ذہن آزاد نہیں ہوا ہمارے سوچنے کا ڈھنگ وہی ہے ہمارا جسم تو آزاد ہوگیا مگر ہمارا دماغ ابھی ابھی غلام ہندوستان میں پڑا ہے جو قوم زمانہ کا ساتھ نہیں دیتی زمانہ اُسے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ تقسیم کے بعد بھی کچھ ایسا ہی ہوا حالانکہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں نے انگریزوں کا بائیکاٹ کرکے جو نقصان اٹھایا تھا یعنی دوسری قوموں سے ہم ۵۰ سال پیچھے ہوگئے تھے اور سرسید آگے بڑھے تو بڑی رکاوٹوں کے بعد مسلمان نئی زندگی شروع کرسکے۔

کے تحت جیسے زبان، لسانیات، صوتیات، رسم خط اور
حروف تہجی، قواعد، معانی بیان اور بدیع، عروض،
لغت امثال، قدامت پرستی و جدت پسندی کا جائزہ
لیا ہے۔ اس جائزے میں علم زبان کی تمام قدیم فروعات
سے علاوہ جدید لسانیات کی جھلک بھی پیش کی ہے۔

اس کتاب میں جتنے ادیبوں کا ذکر ہے ان میں
اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جنھوں نے لغت پر کسی نہ کسی
حیثیت سے ضرور کام کیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنوی مصنفین
نے لغت پر جو کام کیا ہے وہ انفرادی اور اجتماعی دونوں
حیثیتوں سے بڑی حد تک مکمل ہے اور ان کے مرتب کئے
ہوئے بعض لغات جیسے امیر اللغات اور نور اللغات
وغیرہ اردو لغت نویسی کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ
رہیں گے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے یہ بالکل درست
لکھا ہے کہ "لکھنؤ دبستان کا قیام کسی اور حیثیت سے
نہ سہی زبان و بیان کے لحاظ سے اردو کی تاریخ کا
ایک شاندار واقعہ ہے اس دور میں زبان کو نکھار کر اور طرز
بیان کو سنوار کر ادب کا ایک ایسا پاکیزہ حصار قائم کر دیا
گیا ہے جس کی مثال پیش کرنا دشوار ہے۔

یہ کتاب بشمول حصہ کتابیات و اشاریہ ۱۷۶
صفحات پر مشتمل ہے قیمت صرف ۱۲ روپیہ۔ پبلشر ڈاکٹر
حامد اللہ ندوی ریسرچ آفیسر مہاتما گاندھی میموریل
ریسرچ سنٹر مہاتما گاندھی میموریل بلڈنگ بمبئی۔

"لکھنؤ کی لسانی خدمات" کا مصنف مدراسی ہے
لیکن جس عرق ریزی سے انھی خدمات اس کتاب کو
لکھنے میں صرف کی ہیں کوئی لکھنوی بھی نہیں کر سکتا اور
آج تک کسی نے کیا بھی نہیں اس لئے صاحب موصوف
مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یہ کتاب اساتذہ، طلبہ اور عام قاری سب کے
لئے ناگزیر ہے۔

نئی کتابیں نئے رسالے

بجھتے چراغ

تبصرہ کیلئے ہر کتاب کے دو نسخہ آنا ضروری ہیں

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی کی تصنیف "بجھتے چراغ"
دکنی ادب پر مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ۳۴ مضامین شامل
ہیں یہ تمام مضامین برصغیر ہند و پاک کے مختلف رسائل
مثلاً سب رس (حیدرآباد) شیرازہ (کشمیر) نوائے ادب
(بمبئی) فکر و نظر (علی گڑھ) تحریر (دہلی) اردو (کراچی)
قومی زبان (کراچی) اردو نامہ (کراچی) اور نقوش
(لاہور) ہندوستانی زبان (بمبئی) میں شائع ہو چکے ہیں
کوئی مضمون غیر مطبوعہ نہیں ہے۔

صدیقی صاحب نے ان مضامین کو کتابی شکل دے کر
بہت بڑا کام کیا ہے۔ اس کتاب سے دکنی ادب کی تاریخ
کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ دکنی ادب کو پڑھنے والا
ان مضامین کو دیکھے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

صاحب موصوف نے نام بھی بڑا اچھا انتخاب کیا ہے۔ یہ نام آئندہ نسل کے لیے تازیانہ ہے اگر ان بجھتے چراغ کی لو تیز کرنے کی کوشش جاری نہیں رہی تو واقعی یہ بجھ جائینگے

یہ ایسے مضامین ہیں جو تاریخ ادب میں ہمیشہ قائم رہیں گے دکنی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں مصنف کو دور دراز کا سفر بھی کرنا پڑا اور اُس مواد کو دکنی ادب کی تاریخ بدلنے میں ممد و معاون ثابت کیا۔ اگر تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو درگاہوں کے مجاور اُن کاغذات کو نقارہ سینکنے کے لیے جلا بھی دیتے ہوتے۔ مصنف نے دکنی ادب کی تحقیق و جستجو میں تن من دھن کی بازی لگا دی ہے۔

آج دکنی ادب کے فروغ میں اور اُس کے ماہرین میں جس کا نام سب سے زیادہ اہم ہے وہ پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی کا ہے۔ دکنی ادب کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو آپ کے نام کے بغیر ادھوری رہے گی تیرہ برس تک آپ نے ماہنامہ سب رس ہر ماہ پابندی سے نکالا۔ رسالے میں دکنی مضامین خود بھی لکھتے اور دوسروں سے بھی لکھواتے اگر صاحب موصوف ۲۷ کتابوں کے مصنف نہ بھی ہوتے تو صرف ماہنامہ سب رس کے ایڈیٹر کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہتے۔ آپ کی ۲۷ کتابوں میں تقریباً سب ہی دکنی ادب پھیلا ہوا ہے۔

بجھتے چراغ کے عنوانات ملاحظہ ہو کیا یہ بجھ سکتے ہیں؟

۱۔ کلام حضرت خواجہ بندہ نواز و حضرت برہان الدین جانم۔ (۲) اصحاب سلسلہ بندہ نواز کی علمی خدمات (۳) مرثیہ حضرت برہان الدین جانم (۴) کلام خلفائے حضرت برہان الدین جانم (۵) سہیلا۔ رحمان شاہ (۶) کتبہ امین درگاہ بیجاپور (۷) محمود گاواں کی صوفیانہ زندگی (۸) نصرتی (۹) وجہی (۱۰) محمد شاہ حامی (۱۱) طبعی (۱۲) لیلیٰ مجنوں (۱۳) برہان بیجاپوری (۱۴) جان محمد محری (۱۵) فراقی بیجاپوری (۱۶) بیجاپور کے چند شعرا اور ان کا کلام۔ (۱۷) بیجاپور کے چند مرثیہ گو شعرا (۱۸) مثنوی شمع و پروانہ (۱۹) شاہ صادق کا ایک نایاب دیوان (۲۰) دکنی مثنویاں (۲۱) آصف جاہ اول و ثانی کی شعر و ادب کی سرپرستی (۲۲) عہد آصفی کی مثنویاں (۲۳) شام غریباں (لچھمی نرائن شفیق)

"بجھتے چراغ" اساتذہ طلبہ و عام قاری سب کے لیے بیحد مفید کتاب ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی کتاب "نئے اور پُرانے چراغ" میں ماضی کے چند نقوش ملتے ہیں تو پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی کی کتاب "بجھتے چراغ" میں ماضی ہی ملتا ہے ماضی کے بغیر ہم حال اور مستقبل کو نہیں سنوار سکتے اس لیے اس کا بڑھنا ناگزیر ہو جاتا ہے

کتاب مصنف کے گھر کے پتہ پر یعنی چار قندیل آغا پورہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے۔

پروفیسر قیوم صادق
صدر شعبہ اُردو فارسی گورنمنٹ فرسٹ
گریڈ کالج یم۔ بیدر (کرناٹک)

خسرو ِمست اندر ساغرِ معنی ریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود
ماہنامہ فروغِ اُردو لکھنؤ
کا
امیر خسرو
طوطیٔ ہند
نمبر
حضرت امیر خسروؒ کے "سات سو سالہ جشن" کے موقع پر ادارہ فروغ اُردو نے طے کیا ہے کہ وہ امسال اس عظیم المرتبت شاعر "طوطیٔ ہند امیر خسرو" کا خاص نمبر قارئین فروغِ اُردو کی خدمت میں پیش کرے۔ جو اُن کی شاعری، نثر نگاری، تصوّف، علم موسیقی اور دیگر گوناگوں خصوصیات کا حامل ہو، اور اُس کی ترتیب کی خدمت
ڈاکٹر
لکھنؤ یونیورسٹی
کے سپرد کی گئی ہے۔ جملہ ہندوستان اور بیرون ہند کے نمائندہ ادیبوں۔ شعرا اور فنکاروں سے درخواست ہے کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم شاعر کی خدمت میں اپنا اظہارِ عقیدت پیش کریں۔
متمنّی
شمش علوی

مطبوعات ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع قیمت) ۲

۱۔ یکتا کا چمن۔ تہواروں کے پھول۔ — ثمر بسوانی — ۳/-

۲۔ احتشام حسین نمبر (فروغ اُردو) — سید انصار حسین ناہل — ۲۵/

۳۔ اُردو کا ماضی۔ حال اور مستقبل۔ — احمد ابراہیم علوی — ۳/

۴۔ آئینہ نظم اُردو — ثمر بسوانی — ۴/

۵۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی — روپ نرائن شیوپوری ساگر — ۱/-

۶۔ اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر — ڈاکٹر محمود الحسن رضوی — ۱۵/-

۷۔ اُردو سہم نمبر فروغ اُردو — اقبال صدیقی — ۳/۵۰

۸۔ انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) — پروفیسر سید احتشام حسین — ۵/-

۹۔ ادبی تاثرات۔ — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۵/-

۱۰۔ آئینہ عقل — پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری — ۴/۵۰

۱۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۵/۵۰

۱۲۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۳/۵۰

۱۳۔ انارکلی امتیاز علی تاج جدید ایڈیشن — ۲/۵۰

۱۴۔ امراؤ جان آدا — مرزا رسوا — ۵/۵۰

۱۵۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۸/-

۱۶۔ اُردو میں تنقید — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۵/۵۰

۱۷۔ انتخاب قصائد اُردو۔ — مغیث الدین فریدی — ۱/۵۰

۱۸۔ ادب اور نظریہ — آل احمد سرور — ۷/۵۰

۱۹۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور — ۵/۵۰

۲۰۔ ادبی نقوش۔ — شاہ معین احمد ندوی — ۷/۵۰

۲۱۔ انتخاب جدید نثر اُردو — سید احتشام حسین — ۴/-

۲۲۔ اقبال — مرثیہ فروغ اُردو — ۰/۵۰

۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ — عبدالماجد دریابادی — ۴/۵۰

۲۴۔ البرامکہ اور ان کا عروج و زوال — ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے — ۳/-

۲۵۔ انتخاب کلام غالب — بشیر احمد علوی — ۱/۵۰

۲۶۔ ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن — ۶/۵۰

۲۷۔ انتخاب قصائد و غزلیات — فروغ اُردو — ۵/-

۲۸۔ اب کیا ہے — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/-

۲۹۔ ادبی خطوط غالب۔ — مرزا محمد عسکری — ۶/۵۰

۳۰۔ آئینہ نثر اُردو — سعادت علی صدیقی — ۴/۵۰

۳۱۔ ایک نادر روزنامچہ۔ — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۲/۵۰

۳۲۔ ابوالمظفر — مجنوں گورکھپوری — ۰/۳۷

۳۳۔ اُردو کی کہانی — سید احتشام حسین — ۲/۵۰

۳۴۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر — ۵/۷۵

۳۵۔ ابوالکلام آزاد (نظم) — جگن ناتھ آزاد — ۰/۲۵

۳۶۔ ارمغان نثر و نظم — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/۷۵

۳۷۔ افسانہ نمبر — مرتبہ فروغ اُردو — ۱/۵۰

۳۸۔ اچھی نظمیں — اختر مشتاق — ۰/۷۰

۳۹۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید ایڈیشن — غلام احمد فرقت — ۲۰/-

۴۰۔ اُردو شاعری — امیر احمد علوی — ۱/۵۰

۴۱۔ غزلیات حافظ صائب — غالب فارسی — ۲/۵۰

۴۲۔ آخری یادگار نادر شاہ معہ ترجمہ — ۱/۵۰

۴۳۔ اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنیوالی کتاب — اعجاز احمد فاروقی — ۱/۲۵

۴۴۔ اللہ کے پیارے — امیر حسن نورانی — ۰/۵۰

۴۵۔ اسپین کی شہزادی — صادق سردھنوی — ۴/۵۰

۴۶۔ ادبی معرکہ نمبر — مرتبہ فروغ اُردو — ۱/۵۰

۴۷۔ اپنی موج میں — آوارہ — ۲/۵۰

۴۸۔ انوار جدید خط و کتابت — حلیق احمد علوی — ۰/۴۵

۴۹۔ ایک جان تین قالب — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰

۵۰. اُلفت — خان محبوب طرزی — ۵/۵۰

۵۱. آغازِ سحر — ″ — ۴/-

۵۲. امین آباد — ″ — ۴/-

۵۳. انشائے خطوط نویسی۔ حصہ اوّل — مشیر احمد علوی — ۳۵/-

۵۴. اچھی کہانیاں — ″ — شمس الدین نوری — ۵/:

۵۵. انشائے خطوط نویسی حصہ دوم — ۷۵/-

۵۶. اجداد کی باتیں — مصطفےٰ حسن رضوی — ۳/-

۵۷. اچھی کہانیاں حصہ اول — شمس الدین نوری — ۵۰/-

۵۸. ″ حصہ دوم ″ — ۵۵/-

۵۹. ″ حصہ چہارم ″ — ۶۵/-

۶۰. ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/۵۰

۶۱. اسلامی نظمیں — محمد حسین علوی کشتی — ۴/۵۰

۶۲. اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں — عبدالماجد دریابادی — ۳/-

۶۳. اوراقِ گل — اصغر متاق — ۱/-

(ب)

۶۴. بابائے اُردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی — ۶/-

۶۵. بستانِ حرم۔ (جدید نعتیہ کلام) زائرِ حرم حمید صدیقی — ۳/-

۶۶. شہیدِ محبت بوٹا سنگھ۔ — خان محبوب طرزی — ۴/-

۶۷. بزمِ بے تکلف۔ — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴/۵۰

۶۸. بکٹ کہانی۔ — ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۴/۵۰

۶۹. بہادر شاہ ظفر۔ — امیر احمد علوی کاکوروی — ۵/۵۰

۷۰. بہشتی ثمر۔ (حصہ اول دوم) خلاصہ بہشتی زیور — مولانا تھانوی — ۳/۸۰

۷۱. بانیِ اسلام۔ — علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اُردو ترجمہ — ۷۵/-

۷۲. بشریتِ انبیاء — عبدالماجد دریابادی — ۳/-

(پ)

۷۳. پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۲/۵۰

۷۴. پیاری باتیں — محسن کاکوروی — ۲/-

۷۵. پھولوں کا انبار (ناول) منظر سلیم — ۴/۷۵

۷۶. پیسہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/-

۷۷. پاگل خانہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۳/۲۵

۷۸. پیغام ″ — طاہر دیال پوری — ۳/-

۷۹. پنجاب میں اُردو — حافظ محمود شیرانی — ۶/۵۰

۸۰. پردیسی کے خطوط حصہ اول مجنوں گورکھپوری — ۲/۵۰

(ت)

۸۱. مختصر تاریخ ادبِ اُردو (فروغِ اُردو ایڈیشن) — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۱۲/-

۸۲. تصویرِ درد مع تشریحات و ترجمہ فرید احمد علوی — ۱/-

۸۳. تحریریں مجموعہ مضامین۔ — ڈاکٹر گیان چند — ۵/۵۰

۸۴. تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یاسین — ۳/-

۸۵. تنقیدی تجزیئے — کاظم علی خاں — ۴/۵۰

۸۶. تعارف تاریخ اُردو — جدید ایڈیشن — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۵/-

۸۷. تاجدارِ مدینہ — اقبال صدیقی — ۲۰/-

۸۸. تنقیدی اصول اور نظریے — حامد اللہ افسر — ۵/۵۰

۸۹. تنقید و تحلیل — شبیہ الحسن نونہروی — ۴/۵۰

۹۰. تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) سید احتشام حسین — ۴/-

۹۱. تنقیدی نظریات جلد اول ″ — ۸/-

۹۲. ″ ″ جلد دوم ″ — ۸/-

۹۳. تنقید اور عملی تنقید ″ — ۶/۵۰

۹۴. تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن) — آلِ احمد سرور — ۵/-

۹۵. ترانہائے خیام — ڈاکٹر رضیب حسین — ۲/۵۰

۹۶. تعلیماتِ اسلامی مکمل چار حصص — محمد حسین کشتی — ۲/۹۰

(ٹ)

۹۷۔ ٹیگور — نادم سیتاپوری — ۳/-
۹۸۔ ٹھیکرے کی مانگ — صدیقہ بیگم سیوہاری — ۲/-

(ث)

۹۹۔ ثنائے حبیب و نعتیہ کلام — بہزاد لکھنوی — ۲/۲۵

(ج)

۱۰۰۔ جان غالب — محمد حسین شمس علوی — ۲/-
۱۰۱ جائزے — انور سیوانی — ۳/-
۱۰۲۔ جواہرات اسمٰعیل — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰
۱۰۳۔ جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) — فروغ اُردو — ۳/-
۱۰۴ " نمبر ۲ " — ۳/-
۱۰۵۔ جوئے رواں۔ مجموعہ کلام۔ — حامد اللہ افسر — ۳/۵۰
۱۰۶۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) — ڈاکٹر اختر بلگرامی — ۳/۵۰
۱۰۷۔ جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) — قیصر تمکین — ۲/۵۰
۱۰۸۔ جلوے — معین الدین دردائی — ۱/۷۵
۱۰۹۔ جمیلہ بوا تری (ناول) — خان محبوب طرزی — ۲/۵۰
۱۱۰۔ جگر نمبر اول — سید احتشام حسین — ۸/-

(چ)

۱۱۱۔ چوتھی بہن۔ مجموعہ افسانہ۔ — مسیح الحسن رضوی — ۲/۷۵

(ح)

۱۱۲۔ حیات فضل الحق — خیرآبادی — ۱/۲۵
۱۱۳۔ حالی بحیثیت شاعر (جدید ایڈیشن معہ اضافہ) — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱۵/-
۱۱۴۔ حسرت موہانی — عبدالشکور — ۵/۵۰
۱۱۵۔ حجاج بن یوسف — جرجی زیدان — ۲/۵۰
۱۱۶۔ حکیم نباتات — وزیر خاں لشکراں — ۴/-
۱۱۷۔ حبیبۂ غالب — سعادت علی صدیقی — ۲/۵۰

(خ)

۱۱۸۔ خلاصہ شریف زادہ — مرزا رسوا — ۱/۲۵
۱۱۹۔ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰
۱۲۰۔ خضر راہ معہ ترجمہ — علامہ اقبال — ۱/-
۱۲۱۔ خلاصہ روح تنقید — ۱/-
۱۲۲۔ خلاصہ جواہر العروض — ۱/-
۱۲۳۔ خبطی (مزاحیہ) — محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی — ۱/۵۰
۱۲۴۔ خوش بختی کی تلاش میں — احسن الظفر بی۔ اے — ۳/-
۱۲۵۔ خلاصہ شعر الہند — حصہ دوم — ۱/-
۱۲۶۔ خلاصہ المیزان — -/۷۵

(د)

۱۲۷۔ دلچسپ کہانیاں — مسعود عالم — ۴/-
۱۲۸۔ دیوان فغانی — ۱/۵۰
۱۲۹۔ داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی) — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/۵۰
۱۳۰۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۵۰
۱۳۱۔ دستہ گل — شبلی نعمانی — -/۴
۱۳۲۔ دوشیزہ قاف ناول — خان محبوب طرزی — ۵/-
۱۳۳۔ دلربا — ۳/-
۱۳۴۔ دلی کا دبستان شاعری معہ اضافہ جدید ایڈیشن — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۱۵/-
۱۳۵۔ دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — ۳/۵۰

(ڈ)

۱۳۶۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر انوار الحسن — ۴/-

(ذ)

۱۳۷۔ ذوق و جستجو۔ — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۱۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۳۸	ذوق ادب و شعور	پروفیسر احتشام حسین	۵/۵۰
۱۳۹	ذوق جنون۔ مجموعہ کلام	آل احمد سرور	۶/۵۰

(ر)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۴۰	روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	۷/-
۱۴۱	رُباعیات غالب فارسی معہ اُردو ترجمہ	سید امیر حسن نورانی	۴/-
۱۴۲	رہبر مضمون نویسی	شفاعت علی صدیقی	۲/۵۰
۱۴۳	راکھی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/-
۱۴۴	رخسار سحر ناول	انور کریم قدوائی	۱/۵۰
۱۴۵	رفتار سحر	"	۳/۵۰
۱۴۶	رموز حکمت معہ مقدمہ اُردو	محمد شریف	۳/۵۰
۱۴۷	ریاض فارسی	منتخب کلام فارسی	۳/-

(ز)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۴۸	زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ)	مولانا تھانوی	-/۵۰
۱۴۹	زمینیوں کا بادشاہ، حکیم بانا مزاحیہ ناول	سید علی عباس حسینی	۳/-

(س)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۵۰	سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	-/۴
۱۵۱	سوانح احمد خاکے	نجم الدین نقوی	۴/-
۱۵۲	سرور جہاں آبادی	ڈاکٹر حکیم چند نیر	۸/-
۱۵۳	سرود نو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	۳/۵۰
۱۵۴	سنگ گہر	سید احتشام حسین	۴/-
۱۵۵	سر سید داحمد پاشا یا کوہ قاف کی پری	سید علی عباس حسینی	۱/۵۰
۱۵۶	سرمایہ زبان اُردو	جلال لکھنوی	۵/۵۰
۱۵۷	سفر (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/-
۱۵۸	سیاحت زمین ناول	محمود اعظم فہمی	۱/۵۰
۱۵۹	ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۳/۵۰
۱۶۰	سنہرا حلقہ		-/۷۵
۱۶۱	سر سید احمد خاں	انوار الحسن صدیقی	-/۴۰
۱۶۲	سوشل اسٹڈی	احمد محسن کاکوروی	۱/۷۵
۱۶۳	ساز دل	ذکی کاکوروی	۲/۵۰

(ش)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۶۴	شعر نو تنقیدی مجموعہ	ڈاکٹر محمد حسن	۵/۵۰
۱۶۵	شرح دیوان غالب (مزاحیہ)	غلام احمد فرقت	۸/۵۰
۱۶۶	شرح سنگ گہر	عبدالقوی دریابادی	۴/۵۰
۱۶۷	شاہ غمگین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۱۶۸	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۱۶۹	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۴/-
۱۷۰	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۱	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	-/۴۰
۱۷۲	شرح دیوان غالب جدید ایڈیشن	نظم طباطبائی	۷/-
۱۷۳	شہری اور سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	-/۷۰
۱۷۴	"	"	-/۸۵
۱۷۵	"	"	-/۹۰
۱۷۶	"	"	۱/۹۰
۱۷۷	شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ	امیر احمد علوی	۳/۵۰
۱۷۸	شعر العجم۔ حصہ اول، دوم۔ سوم۔ چہارم۔ پنجم	شبلی نعمانی	۲۴/-
۱۷۹	شرح خرام وزرا ایران	احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۸۰	"	"	۳/۵۰
۱۸۱	شمع و شعر	علامہ اقبال	-/۵۰
۱۸۲	شرح حکیم نباتات وزیر خاں	نیر مسعود	۱/۲۵
۱۸۳	شرح انتخاب قصائد و غزلیات	مطابق نصاب بی اے	۷/-
۱۸۴	شرح شعرباستان حصہ اول	ڈاکٹر انوار الحسن	۳/-
۱۸۵	شرح ترانہائے خیام	حکیم عبدالقوی	۲/-

۱۸۶۔ شرح نصاب فارسی — ۵/-
۱۸۷۔ شرح شعرو باستان دوم احسن الظفر — ۲/-
۱۸۸۔ شرح گلہائے ادب — ۳/-
۱۸۹۔ شرح آئینہ نظم اُردو — ۳/-
۱۹۰۔ شرح نثر فارسی امروزہ — ۳/-
۱۹۱۔ شرح آئینہ نثر اُردو خلیل قدوائی — ۳/۵۰
۱۹۱۔ شرح غنچۂ گل — ۴/۵۰
۱۹۳۔ شرح شعر فارسی احسن الظفر — ۳/-
۱۹۴۔ شرح ہماری زبان اُردو درجہ ۴ خلیل قدوائی — ۱/۵۰

(ص)

۱۹۵۔ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت — ۴/۵۰
۱۹۵۔ صحیفۂ محبت۔ مہدی افادی کے خطوط ڈاکٹر محمود الٰہی — ۵/۵۰

(ط)

۱۹۶۔ طنزی محبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اُردو — ۲/-
۱۹۷۔ طالبعلم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیئے غلام الثقلین — ۲/۵۰
۱۹۸۔ طلسم اسرار۔ (ڈرامہ) مرزا رسوا لکھنوی — ۱/۵۰

(ع)

۱۹۹۔ عذرا ناول صالحہ عابد حسین — ۶/-
۲۰۰۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) سید احتشام حسین — ۵/۵۰
۲۰۱۔ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینہ میں اخلاق حسین عارف — ۳/۵۰

(غ)

۲۰۲۔ غالب نام آور نادم سیتاپوری — ۵/۵۰
۲۰۳۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر سید امیر حسن نورانی — ۶/-
۲۰۴۔ غالب کی تخلیقی تخئیل شہید صفی پوری — ۸/-
۲۰۵۔ غنچۂ گل سید محمود الحسن رضوی — ۴/۵۰
۲۰۶۔ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر نادم سیتاپوری — ۵/۵۰
۲۰۷۔ غزالی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی — ۴/۵۰

۲۰۸۔ غزلیات نظیری — ۱/۵۰
۲۰۹۔ غزل انسائیکلوپیڈیا جدید ایڈیشن ذکی کاکوروی — ۲۵/-

(ف)

۲۱۰۔ فروغ (نعت) طاہر محسن علوی — ۴/۵۰
۲۱۱۔ فن خطابت یعنی استاد تقریر۔ کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ — ۱۲/-
۲۱۲۔ فریدہ خان محبوب طرزی — ۱/-
۲۱۳۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادم سیتاپوری — ۵/۵۰
۲۱۴۔ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی — ۴/۵۰
۲۱۵۔ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی — ۳/۵۰
۲۱۶۔ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی — ۳/۵۰
۲۱۷۔ فغان محسن محسن کاکوروی — ۰/۴۰
۲۱۸۔ فارسی آموز مشیر احمد علوی — ۱/-
۲۱۹۔ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد — ۶/۵۰

(ق)

۲۲۰۔ قدمچے۔ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں۔ غلام احمد فرقت — ۵/-
۲۲۱۔ قصائد ظہیر فاریابی — ۱/۵۰
۲۲۲۔ قصائد مومن۔ مع شرح ظہیر احمد صدیقی — ۵/۵۰
۲۲۳۔ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین — ۷/-
۲۲۴۔ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی — ۳/-
۲۲۵۔ قصائد قاآنی (فارسی) — ۱/-
۲۲۶۔ قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر — ۴/۱۵
۲۲۷۔ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی — ۳/-

(ک)

۲۲۸۔ کلیات اقبال علامہ اقبال — ۸/-
۲۲۹۔ کیسر ادکا ہی بدرالدین طیب جی — ۲/-
۲۳۰۔ کف گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت — ۴/۵۰

(گ)

۲۳۱۔ گاندھی نمبر — ۲/-

۲۳۲۔ گلدستہ فارسی — اول دوم — ۱/۹۰
۲۳۳۔ گلزار فارسی — یعنی آمدنامہ جدید — -/۶۰
۲۳۴۔ گلہائے ادب — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/-
۲۳۵۔ گاندھی جی کے ساتھ — حامد اللہ افسر — ۱/۵۰

(ل)

۲۳۶۔ لوائح جامی مع مقدمہ — عبدالاحد خاں خلیل — ۱/۵۰
۲۳۷۔ لال قلعہ — مائل ملیح آبادی — ۶/-
۲۳۸۔ لب بام — عادل رشید — ۶/-
۲۳۹۔ لسانیات اور اُردو — سید محمود الحسن رضوی — ۴/۵۰

(م)

۲۴۰۔ مرقع اقبال — عصمت فاطمہ علویہ — ۱۲/-
۲۴۱۔ مزاحیہ شرح دیوان غالب اُردو — غلام احمد فرقت — ۸/۵۰
۲۴۲۔ محسن کاکوروی نمبر — ۳/-
۲۴۳۔ مسلمان اور کانگریس — ابوالکلام آزاد — ۳/۵۰
۲۴۴۔ مرثیہ نگاری اور میرانیس — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۴/۵۰
۲۴۵۔ مضامین فرحت — حصہ اول — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۴/۵۰
۲۴۶۔ مضامین فرحت — حصہ دوم — " — ۴/۵۰
۲۴۷۔ ماضی کی کہانیاں — آفتاب اختر تلہری — ۳/-
۲۴۸۔ میرے اسٹیج ڈرامے — ڈاکٹر محمد حسن — ۵/۵۰
۲۴۹۔ موسم گل — ناول — عادل رشید — ۷/-
۲۵۰۔ مجبور — " — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰
۲۵۱۔ مضامین جدیدہ — محمد ہادی — ۱/۲۵
۲۵۲۔ مثنوی سحر حلال فارسی — مع مقدمہ — قدرت اللہ بیگ — ۲/۵۰
۲۵۳۔ مطالعہ — ذکی کاکوروی — ۵/-
۲۵۴۔ مولوی نذیر احمد کی کہانیاں — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۲۵
۲۵۵۔ معرکہ روم — دلیونان — صادق سردھنوی — ۶/-
۲۵۶۔ مثنویات حالی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۳/۵۰
۲۵۷۔ مطالعہ حالی — " — ۵/۵۰

۲۵۸۔ میٹھے بول — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰
۲۵۹۔ مصنوعی چاند — خان محبوب طرزی — ۲/-
۲۶۰۔ مقدمہ شعر و شاعری — مطابق نصاب بی اے۔ حالی — ۱/۵۰
۲۶۱۔ مرثیہ غالب — حالی — ۲/-
۲۶۲۔ مجموعہ کربلا — جرجی زیدان — ۴/۵۰
۲۶۳۔ معمار — مائل ملیح آبادی — -/۶۰
۲۶۴۔ مولانا حالی — انوار الحسن صدیقی — ۴/-
۲۶۵۔ انتخاب فسانۂ آزاد یعنی — سرشار لکھنوی
۲۶۶۔ مہاراج علی — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۲/۵۰
۲۶۸۔ مسٹر بلاکی نوک جھونک — خواجہ عزیز الحسن مجذوب — ۱/۷۵
۲۶۹۔ مجذوب اور اُن کا کلام — مولانا رضا انصاری — ۱/۵۰
۲۷۰۔ مصباح بلاغت مع مقدمہ اُردو — محمد شریف — ۳/-
۲۷۱۔ مطالعہ سودا — ڈاکٹر محمد حسن — ۴/-
۲۷۲۔ مقدمات و مقالات — عبدالاحد خاں — ۵/۵۰
۲۷۳۔ منتخب سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۴/-

(ن)

۲۷۴۔ نثر امروز ایران — ڈاکٹر رغیب حسین — ۳/-
۲۷۵۔ نشاط غالب — وجاہت علی سندیلوی — ۵/-
۲۷۶۔ نقد و انتقاد — اعجاز احمد معجز — ۲/۵۰
۲۷۷۔ نقش حالی دوم — یعنی حالی نمبر
پروفیسر احمد حسین۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی
۲۷۸۔ شجاعت علی سندیلوی — ۲۵/-
۲۷۹۔ نغمہ کوہسار — خان محبوب طرزی — ۲/-
۲۸۰۔ نعمات الہند مع مقدمہ اُردو — محمد شریف — ۴/-
۲۸۱۔ نظم سائیکلوپیڈیا — ذکی کاکوروی — ۱۰/-
۲۸۲۔ نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی —
کبیر احمد جائسی — ۱/۵۰
۲۸۳۔ نسرین و نسترن — ذکی کاکوروی — ۵/-
۲۸۴۔ نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ — حامد اللہ افسر — ۳/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۸۵	نیا راستہ ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۸۶	نوروز	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۸۷	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدید	آل احمد سرور	۸/۵۰
۲۸۸	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۵/۵۰
۲۸۹	نیلم	انتصار حسین	۳/-
۲۹۰	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۲۵
۲۹۱	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۵/-
۲۹۲	منشی نول کشور نمبر		۲/۵۰

(و)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۹۳	وعدۂ فردا	اخگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-

(ہ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۹۴	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۴/-
۲۹۵	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۰/۷۵
۲۹۶	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-
۲۹۷	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۹۸	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	"	۱/۵۰
۲۹۹	ہمارا سماج ۱	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی قریشی	۰/۷۰
۳۰۰	" ۲	"	۰/۸۵
۳۰۱	" ۳	"	۰/۹۰
۳۰۲	" ۴	"	۰/۹۰
۳۰۳	یادگار غالب	مولانا حالی	۴/-
۳۰۴	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳۰۵	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۴/-

ملنے کا پتہ:- ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

۱۔ یہ پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲۔ جس کا بحت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

۳۔ اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

۴۔ جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

۵۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

جلد (۲۳) شمارہ ۵ ( ) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو/این۔ پی ۹۳

لائسنس نمبر: ۶۴، ۸، ۲۰/۱۷ ۳۰۶۴

دفتر فون: ۲۶۱۳۵

فون رہائش گاہ: ۲۶۶۵۷

ادارۂ فروغِ اردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغِ اردو لکھنؤ

ایڈیٹر:
محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

مجلسِ ادارت:

۱۔ عبد القوی دریابادی بی۔ اے

۲۔ سعادت علی صدیقی

شمارہ (۲-...) جولائی جون ۱۹۷۶ء جلد (۲۳)

زرِ سالانہ اعزازی: دس روپے

عوام سے: آٹھ روپے

فی پرچہ: ۷۰ پیسے

پتہ۔
ادارہ فروغِ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

ترتیب

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ لکھنؤ میں چھپواکر دفتر فروغِ اردو لکھنؤ۔ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

محمد حسین فہمی علوی قاسمی کاکوروی

ہم برابر اس بات پر زور دیتے رہتے ہیں کہ ہندوستان میں اصولاً اردو کے لیے ہر طرح کے حقوق تقاریر اور کتابوں میں درج نظر آتے ہیں ہندوستان کی وزیر اعظم اندرا گاندھی بھی اپنی تقاریر میں اُردو زبان کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیر مقبولیت کا اظہار فرماتی رہتی ہیں اس کے علاوہ ہمارے صوبہ اُترپردیش کے سابق وزیر اعلیٰ کملاپتی ترپاٹھی بھی زور دار الفاظ میں اُردو زبان کی ہمہ گیر قوت اور اس کی دستوری حیثیت کے متعلق بہانگ دہل فرماتے رہتے ہیں کہ اُردو والے ہم پر بھروسہ کریں کہ جتنی محبت اُن کے دل میں اُردو کیلئے ہے اتنی ہی ہمارے دل میں بھی ہے ہم سب لوگ اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں اور ہم اس کے لیے اگر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو وہ کوئی احسان نہیں ہوتا یہ ہی نہیں بلکہ یہ بھی فرمایا کہ آپ راستہ بتاتے رہیئے اور مشورہ پر اطمینان رکھیئے کہ ہم سے اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کیلئے جو کچھ ہو سکے گا وہ کرینگے مگر اُردو والوں کی بدقسمتی کہ پنڈت جی نے ریلوے محکمہ کے اندر جس کی زمام حکومت اُن کے ہاتھ میں ہے اُردو کی بیخ کنی اور ہندی زبان کی اہمیت کیلئے جو کچھ کیا اور کر رہے ہیں یہ اسکا بیّن ثبوت ہے کہ انکو اردو زبان سے کتنی محبت ہے غرضکہ ادارۂ فروغ اُردو ہند ۱۹۵۴ء سے مسلسل اسی جدوجہد میں مصروف ہے کہ دیس نکالی زبان کو ہر وہ حقوق حاصل ہوں کہ جو ۱۹۴۷ء سے قبل حاصل تھے مگر ابتک مکمل طور پر اس سلسلہ میں کامیابی نہ حاصل ہو سکی شریمتی اندرا گاندھی گورنمنٹ نے فروغ اُردو گجرال کمیٹی بھی قائم کی جس نے ہر صوبہ میں محبان اُردو کو جمع کر کے اُن کے بیانات لئے اور جو اس زبان کے

دستوری حقوق کے سلسلہ میں شکایات تھیں وہ سنیں مگر افسوس آج پانچ سال کا عرصہ ہو رہا ہے اپنے فیصلہ کو محفوظ رکھا اور گجرال کمیٹی کی وہ تک و دو جو اس نے زبان اُردو کے حق کو دستوری حق کے دلانے کے سلسلہ میں انجام دی تھیں گمنامی کے غار میں دفن ہو گئیں ہم محبان اُردو ڈنکے کی چوٹ پر یہ مانگ کرنے پر حق بجانب ہیں کہ اگر اس کمیٹی نے بھی محبان اُردو کی تمناؤں اور آرزؤں کی تکمیل حسب دلخواہ نہ کی تو اس کا انجام آنیوالی نسلوں کیلئے اُن کے عزائم اور ارادوں میں ضرور انقلاب لاکر رہے گا۔ اور اس کے نتائج بھیانک ہوں گے۔ اس لیے ہم اُردو والوں کی دلی خواہش ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی کی گورنمنٹ اردو زبان اور اس کے دستوری اور قانونی حقوق کو بلا کسی پس و پیش کے آئینی طور پر منظور کر کے آنیوالی نسلوں کو مطمئن کر دے۔

ارا کین ادارۂ فروغ ہند کو بڑی خوشی ہے کہ طوطئ ہند امیر خسروؒ
عوام اور خواص میں شرف قبولیت سے نوازا گیا ہند اور پاکستان
علمی اور ادبی حلقوں نے اس کو بہت پسند کیا اور اپنی رائیوں
کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے یہ کہا ہند اور پاکستان
معیار کے مطابق کوئی بھی امیر خسرو نمبر نہ شائع
ہم قارئین فروغ اُردو کے شکر گذار ہیں کہ
انھوں نے ارا کین ادارہ کو اس قابل بتایا
یہ گرانقدر نمبر عوام میں پیش کرسکا

خرد کا تذکرہ بھی باعثِ الزام ہوتا ہے
محبت میں فقط دیوانگی کا کام ہوتا ہے

قدم بوسی کو جھک جائے کسی چہرے پہ گر کجا[...]
نگاہِ شوق کا ہر مرحلہ بدنام ہوتا ہے

یہ رندانِ بلاکش اور توبہ اے معاذ اللہ
یہی وہ لفظ ہے اکثر جو غرقِ جام ہوتا ہے

سبھی کو دولتِ عرفانِ میخانہ نہیں ملتی
مگر ذکرِ شراب و جام و مینا عام ہوتا ہے

بسر ہوتی ہے جن کی عمر تکمیلِ محبت میں
زمینوں آسمانوں میں انھیں کا نام ہوتا ہے

چبھن سینے میں اشک آنکھوں میں ہیں لب پر داستاں
کسی سے دل لگانے کا یہی انجام ہوتا ہے

جنونِ شوق ہم کو آج اس منزل پہ لے آیا
ہمارا ذکر فرزانوں میں صبح و شام ہوتا ہے

باعجازِ مشیت کارفرمائی محبت کی
نزولِ شعر اشرف روکشِ الہام ہوتا ہے

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

ادیبِ نکتہ داں

جان رسکن نے اپنے ایک خطبہ میں کتابوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ اگر آپ کو کسی بادشاہ کے رو برو نہ بٹھایا جائے بلکہ صرف پردے کے پیچھے سے اُس کی آواز سنائی دے تب بھی اُس آواز کو فردوس گوش اور اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھیں گے تو پھر آپ اچھی کتابیں پڑھنے میں دلچسپی اور فخر کیوں محسوس نہیں کرتے جہاں کارڈ بورڈ کی آڑ میں چھپ کر عظیم مصنفین آپ سے محوِ گفتگو رہتے ہیں

میں نے اپنے دور کے زبردست محقق، مبصر، ناقد اور شاعر پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کو بھی پہلے پہل کارڈ بورڈ کی آڑ سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اور چوں کہ اللہ پر ایمان بالغیب رکھنے کا عادی ہوں لہٰذا غائبانہ طور پر مسعود صاحب کا عقیدت مند بننے میں نہ تکلف ہوا نہ ہچکچاہٹ۔ مسعود صاحب کی شخصیت کے یوں تو کئی پہلو ہیں لیکن جس چیز نے سب سے پہلے مجھے متاثر کیا وہ ان کی شرافت و نیک نفسی، وضع داری اور متانت و سنجیدگی ہے۔ علی جواد صاحب زیدی نے اس امر پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"آپ کے گرد علم و ادب و تحقیق کے علاوہ متانت و سنجیدگی کا ایک ایسا حلقہ بن گیا ہے جس کے اندر داخل ہونا مشکل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی نے بھی آپ کو بہت قریب سے نہیں دیکھا ہے آپ جہاں بھی رہتے ہیں آپ کا رکھ رکھاؤ بآواز بلند یہ اعلان کرتا رہتا ہے کہ:۔

بے ادب پا منہ ایں جا کہ عجب درگاہ ہست[1]!

اس متانت اور سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ کا سبب افتادِ مزاج کے علاوہ ان کی زندگی کے حالات و واقعات بھی ہیں جیسا کہ خود مسعود صاحب نے بیان فرمایا ہے:۔

"تندرستی کی بے التفاتیاں اور دردِ سر کی عنایتیں جو ۱۹۱۰ء سے میرے شاملِ حال ہیں، انھوں نے میری قوتِ عمل کو مضمحل اور جوشِ عمل کو افسردہ کر دیا۔ مجھ کو دنیا کے شور و شر سے الگ رہ کر سکوت اور سکون کی زندگی بسر کرنا پڑی اور اپنے

---

[1] صدر شعبہ اردو و فارسی، ایم۔ ڈی۔ کالج۔ پریل، بمبئی ۱۲

[1] آپ سے ملئے۔ مکتبہ شاہدرہ دہلی۔ پہلا اڈیشن ۱۹۰۳ء۔ صفحہ ۸۷

دائرہ عمل کو ادبیات کے حلقے میں محدود کردینا پڑا۔" ۱؎

بعض حضرات متانت و سنجیدگی، کم سخنی و کم آمیزی کو کبر و نخوت اور ناک کٹرے پن کا مترادف سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے بعض صورتوں میں ایسا بھی ہو لیکن کم از کم مسعود صاحب کے لیے ایسی بات سوچنا بھی گناہ ہے۔ وہ اپنے اہلِ خاندان احباب، صاحبانِ علم و فن خصوصاً طلبہ سے نہایت ہی خندہ پیشانی سے ملتے اور گفتگو فرماتے تھے یہ خصوصیت آخر دم تک باقی رہی۔ اس ضمن میں مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب کی روایت ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:۔

"اسی ۱۹۷۵ء میں ان کی تینوں بہوؤں کے یہاں بچیاں ہوئیں جن کے نام انھوں نے خود رکھے تھے۔ ان میں سے کسی بچی کو لے کر کوئی ان کے سامنے سے گزرتا تو وہ کراہتے کراہتے رک جاتے:

ارے کیا یہ فرزانہ ہے؟ اسے ہمارے پاس لاؤ۔

واہ واہ، یہ تو ابھی ابھی چوڑیاں پہنے ہے۔

کیا یہ دُردانہ ہے۔؟ ادھر لاؤ۔ یہ تو خوب ہنستی ہے۔ ہنسو بیٹی ہنسو۔

یہ ریحانہ ہے؟ یہاں لاؤ۔ ارے، ارے رونے کیوں لگیں۔؟" ۲؎

جس زمانہ میں راقم الحروف علامہ آرزو لکھنوی مرحوم و مغفور کے بارے میں تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا، کئی بار لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا اور قبلہ مسعود صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ پہلی بار میرا تعارف میرے محترم خلد آشیاں بزرگ جناب سید علی عباس حسینی صاحب نے کرایا۔ انھوں نے مسعود صاحب سے کہا:۔

یہ مجاہد حسین حسینی صاحب، حضرت آثر لکھنوی کے شاگرد ہیں اور علامہ آرزو لکھنوی پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ آپ سے ملاقات کے متمنی تھے۔

مسعود صاحب کا چہرہ کھل اٹھا۔

ناچیز سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے:

کیا ہم بھی ریسرچ کا حصہ ہیں۔؟ اس جملہ پر حسینی صاحب ہنس پڑے۔ پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے فرمایا۔

جب کوئی طالب علم ریسرچ کرتا ہے تو بہت خوشی ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور کے غلط تعلیمی نظام میں بے چارہ کم از کم ایک شاعر یا ادیب کو تو غور سے پڑھتا ہے۔

۱۹۶۳ء میں جب مسعود صاحب سے آخری بار ملاقات و رخصت ہوتے وقت میں نے اُن سے کہا:

"میرے استاد پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی صاحب فرماتے ہیں کہ تم جب بھی لکھنؤ جاتے ہو تو وہاں ریسرچ کا کام نہیں کرتے بلکہ شاعروں اور ادبی جلسوں میں شرکت کر کے چلے آتے ہو۔ لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ میری ڈائری میں چند کلمے تحریر فرما دیں تاکہ انھیں بطور سند پیش کرسکوں۔

۱؎ ہماری شاعری (ضمیمہ)۔ نظامی پریس لکھنؤ۔ طبع نہم ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۸۶

۲؎ دیکھیے مضمون بعنوان "چراغِ صبح" مشمولہ ہفتہ وار "ہماری زبان" دہلی (مسعود حسن رضوی ادیب نمبر) ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء و یکم جنوری ۱۹۷۶ء صفحہ ۹

۱؎ یہ ملاقات ۲۸ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ادبستان، دین دیال روڈ لکھنؤ میں ہوئی۔

قبلہ مسعود صاحب نے فوراً اپنے دست مبارک سے اپنے
یہ دو اشعار میری ڈائری لکھ دیئے تھے ؎

جذب دل کا بے نیازی سے اثر بڑھتا گیا
میں ہٹا جس جس طرف عالم ادھر بڑھتا گیا
کچھ عجب حالت ہے راہ منزل مقصود کی
جتنا جتنا میں بڑھا میرا سفر بڑھتا گیا[۱]

میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کی۔ حضور ریسرچ بھی منظوم ہے فرمایا۔ شعور سخن فہمی کے بغیر ایک ادبی محقق بننا ممکن نہیں۔"

مسعود صاحب اگرچہ اتنے مشہور و معروف انسان اور مستند محقق تھے لیکن اُن میں ایک سچے طالبعلم کی شان پائی جاتی تھی۔ نہ بے جا تفاخر اور نہ خود نمائی اور نہ خود ستائی بلکہ سراپا انکسار تھے۔ ان کی کتاب "ہماری شاعری" کو ادبی دنیا میں جو قدر و منزلت حاصل ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے لیکن اس کتاب کے آغاز میں "ہدیہ ارادت" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"میں اپنے ادبی ریاض کے ان تازہ تر پھول کو خلوص و عقیدت کے ہاتھوں سے سعدی، اسٹیونسن اور آزاد کے نام پر نثار کرتا ہوں جن کی تحریروں کی شگفتہ متانت، سنجیدہ ظرافت، سادہ رنگینی، پُرکار سادگی نے خضر راہ اور شمع ہدایت بنکر میرے ذوق ادب کی رہنمائی کی ہے۔ کیا عجب ہے کہ ان ناموں کی برکت سے قبول عام کی ہوا ان پھولوں کو سدا بہار کر دے۔"[۱]

مسعود صاحب کا کتب خانہ بھی ایک بیش بہا ذخیرۂ علم و حکمت تھا۔ خصوصیت کے ساتھ قلمی مخطوطات بے شمار اور نادر تھے۔ مراثی، میر انیس، واجد علی شاہ، ڈراما اور داستانوں پر ایک استنادی حیثیت کے مالک تھے۔ اُردو کا کوئی محقق مسعود صاحب سے رجوع کئے بغیر اور ان کی کتابوں سے استفادہ کئے بغیر اپنی تحقیق کو مکمل نہ سمجھتا تھا لیکن خود مسعود صاحب کسی ادبی موضوع پر قلم اٹھاتے وقت تلاش و جستجو کو عار نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرثیہ کے مصنف کا پتہ لگانے کیلئے اخبار میں اعلان کرتے ہیں:۔

استفسار

"اس مرثیہ کا مصنف کون ہے جس کا مطلع ہے ؎

کھولا علم جو خسرو زریں کلاہ نے

جن صاحبوں کے پاس یہ مرثیہ موجود ہو وہ اس کا آخری بند تحریر کرکے راقم کو مرہون منت فرمائیں۔"[۱]

یوں تو تحقیق کے دوران مسعود صاحب ہمیشہ مستند حوالوں سے کام لیتے تھے لیکن بعض اوقات اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے وہ ذاتی واقعات و مشاہدات کے حوالے بھی پیش کر دیتے تھے مثلاً ایک معترض کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

دس برس تک ایک ہی سرکار میں ملازم رہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ (میر شبیر علی) انیس کو میر حسن کے بیٹوں کے صحیح حالات معلوم ہوں۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ میں اپنے جن رفقائے کار کے ساتھ دس برس سے بہت زیادہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ملازم رہا ان کے بیٹوں کی صحیح تعداد اور ان سب کے نام مجھکو

۱؎ یہ قطعہ "ہماری شاعری" (مصنفہ جناب مسعود حسن رضوی ادیب) میں بھی بطور ضمیمہ شامل ہے۔

۱؎ ہماری زبان علی گڑھ، بابت یکم اگست ۱۹۶۳ء ص ۱۰۔

معلوم نہیں ہیں، شاید ہر شخص کا تجربہ یہی ہوگا۔ [1]

مسعود صاحب کا ایک انداز تحقیق یہ بھی تھا کہ وہ (بعض بخیل اور احساس کمتری کے شکار محققین کے برخلاف) کسی موضوع پر کتاب لکھتے وقت اپنی رفتار تحقیق اور طریقۂ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے، باخبر حضرات سے طالب معاونت ہوتے تھے۔ ہمارے موجودہ محققین کو اس مثال سے سبق لینا چاہیئے۔ دیکھئے اپنی ایک زیر تصنیف کتاب کا تعارف کس طرح پیش کرتے ہیں۔

"اودھ کے آخری تاجدار و سلطان عالم واجد علی شاہ کی نجی زندگی، انکے علمی و ادبی مشاغل، اور انکی سرپرستی علوم و فنون پر ایک کتاب لکھنے کی غرض سے میں مدت تک مواد فراہم کرتا رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں انکی کثیر التعداد تصنیفات و تالیفات کی تلاش اور حصول کی کوشش کرتا اور انکے مضامین و مطالب کی تفصیل لکھتا رہا ہوں۔ امید ہے کہ میری زیر تصنیف کتاب مستقبل قریب میں سامنے آجائے گی۔

واجد علی شاہ کی جو کتابیں دستیاب ہو چکی ہیں اور میرے کتب خانے میں موجود ہیں ان کی فہرست ذیل میں درج کر کے امیدوار ہوں کہ ان کے علاوہ اور کتابیں جن صاحبوں کے علم میں ہوں وہ مہربانی کر کے ان کے نام اور پتہ سے مجھ کو براہ راست یا بذریعہ ہماری زبان مطلع کر کے شکرگزار فرمائیں۔" [2]

اگرچہ مسعود صاحب ایک بلند پایہ ناقد ادب بھی تھے لیکن وہ نقد ادب کی بہ نسبت تحقیق ادب کو زیادہ اہم سمجھتے تھے۔ ثبوت میں اُن کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے:۔

"چند مستثنیات کو چھوڑ کر ہمارے نام برآوردہ ادیبوں کا میلان اس وقت تحقیق کی طرف بہت کم اور تنقید کی طرف بہت زیادہ ہے، ادبی تحقیق کا جان کاہ کام کوہ کندن و کاہ برآوردن کا صحیح مصداق ہے۔ میں نے اس دشوار گزار وادی کی خاک چھان کر برسوں کی محنت میں "اندر سبھا" اور اس کے مصنف کے صحیح حالات پیش کر دیئے ہیں۔ [1]

وہ علم کے سچے شیدائی، منصف مزاج اور فیاض انسان تھے لوگ کہتے ہیں کہ وہ کتابوں کو جان سے بڑھ کر چاہتے تھے اور ہر کس و ناکس کو ان کے کتب خانے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی لیکن اگر کسی شخص میں ذرا بھی طلب صادق ہوتی تو وہ اس کو بہ نفس نفیس اپنے کتب خانے میں لیجاتے اور نایاب و نادر کتابوں کی نشاندہی فرماتے تھے۔ مجھ ایسے کم سواد و کم مایہ طالب علم پر بھی ان کی نگاہ کرم ہمیشہ رہی۔ مثلاً مجھے علامہ آسی لکھنوی کے رسالہ "نظام اُردو" کی ضرورت تھی (جس پر مسعود صاحب نے بڑے عالمانہ حواشی لکھے ہیں)۔ موصوف نے نہ صرف یہ کہ یہ رسالہ مجھے عاریتاً عنایت فرمایا بلکہ اس کو نقل کرنے کی اجازت بھی دی۔ میں نے موصوف سے اس رسالہ کو اپنے پاس کچھ روز اور رکھنے کی اجازت مانگی تو آپ نے جواباً تحریر فرمایا:۔

عزیزم:

آپ کا کارڈ ملا۔ نظام اردو کو نقل کرنے کیلئے آپ ۱۵ اگست تک اس کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

خیر اندیش، سید مسعود حسن رضوی [2]

---

[1] ہماری زبان (علی گڑھ) بابت ۱۸ مارچ ۱۹۶۷ء ص ۳

[2] ہماری زبان (علی گڑھ) بابت ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۷ء ص ۶

[1] لکھنؤ کا عوامی اسٹیج (امانت اور اندر سبھا) طبع دوم نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص ۱۲/۱۳

[2] مکتوب بنام راقم مضمون محررہ ۳۱ جولائی ۱۹۶۳ء از لکھنؤ۔

موصوف جب بھی کوئی اچھا ادبی کام دیکھتے انتہائی خلوص
شفقت کے ساتھ اس کی تعریف و تحسین فرماتے۔ اس
سے نئے لکھنے والوں کی بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے۔
پروفیسر فصیح احمد صدیقی صاحب، موجودہ زمانہ کے
یک بالغ نظر اور صائب الرائے ناقد ہیں اور خاص طور
انھوں نے اُردو میں "یک بابی" ڈراموں کا مطالعہ
ڑی دقت نظر اور تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انکا مقالہ
ئی جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور اس سلسلہ کی پہلی
جلد (اُردو کا پہلا یک بابی ڈرامہ) پر یو۔ پی اردو اکیڈمی
ے انعام بھی مل چکا ہے۔ جب صدیقی صاحب نے اپنی
ذکورہ کتابیں مسعود صاحب کی خدمت میں بھجوائیں
و موصوف نے، صدیقی صاحب کو اپنی رائے حسب
یل الفاظ میں لکھی :-

"ادبستان"۔ دین دیال روڈ، لکھنؤ۔ ۳
۲۰ جون ۱۹۷۳ء

عزیز محترم۔
آپ کی تالیف "اردو یک بابی ڈراما" کے سلسلے
کی پہلی دو کتابیں موصول ہوئیں۔ شکر گزار ہوں۔
آپ نے اپنے موضوع کیلئے مواد کی فراہمی میں جو
محنت کی ہے اس نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ آپکی
تحقیق سامنے آنے سے پہلے کسی کو گمان بھی نہ ہوگا کہ
۱۹۴۷ء تک اُردو میں یک بابی ڈرامے اتنی بڑی تعداد
میں لکھے جا چکے تھے آپ نے اس عام خیال کو غلط ثابت
کر دیا ہے کہ اُردو کا دامن ڈراموں سے تقریب قریب
خالی ہے۔

پہلی کتاب میں بعض نام غلط درج ہو گئے ہیں مثلاً
ص۲۲ پر برہان الملک سعادت علی خاں کا نام سعادت علی خاں
اور ص۲۶ پر غازی الدین حیدر کا نام غیاث الدین حیدر
اور ص۵۵ پر سید آغا حسن امانت لکھنوی کا نام سید امانت علی
رکھ دیا گیا ہے۔
مجھے یقین ہے کہ اس سلسلہ میں بقیہ دونوں کتابوں
کے سامنے آجانے کے بعد اُردو ڈرامے کے بارے میں
پھیلی ہوئی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔
میں مدت سے کتابوں پر تبصرے اور رائے چھوڑ
چکا ہوں۔ اسّی سال کا سن ہو گیا، ساری زندگی تحقیقی
کاموں کی نذر کر چکا۔ اب اپنے زیر تکمیل کاموں کے سوا
لکھنا اپنے وقت کے قلیل سرمائے کا اسراف معلوم ہوتا
ہے لیکن آپ کی محبت اور خلوص نے یہ چند سطریں لکھنے
پر مجبور کر دیا۔

"اُردو کا پہلا یکبابی ڈراما" کو میں نے زیادہ
دلچسپی سے پڑھا۔ اس میں آپ نے کئی جگہ "لکھنؤ
کا شاہی اسٹیج" کا حوالہ دیا ہے۔ اس کتاب پر
بہت اچھے اچھے تبصرے لکھے جا چکے ہیں۔ اس
وقت "مسلم یونیورسٹی گزٹ" مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۸
میرے سامنے ہے۔ اس میں جو تبصرہ شائع ہوا ہے
اس کے چند جملے نقل کئے جاتے ہیں :-
"لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ہمارے عہد کا سب سے
اہم بالشان واقعہ ہے۔ تحقیقی کارنامے کی حیثیت
سے دورِ حاضر کی ادبی تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔"
"تحقیق و تنقید کا کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب

مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔"

"یہ کتاب تحقیق و کاوش کا ایک محیر العقول کارنامہ ہے۔"

اسی طرح کے متعدد تبصرے ، ہندوستان اور پاکستان میں شائع کئے گئے لیکن آپ کی یہ کتاب پڑھ کر محسوس ہوا کہ میری محنت اب وصول ہوئی

خدا آپ کو خوش رکھے اور آپ عرصے تک اپنی زبان کی خدمت کرتے رہیں۔ والسلام

خیر اندیش

سید مسعود حسن رضوی [1]

جس طرح مسعود صاحب نے نوجوان محققین ادب کی شفیقانہ حوصلہ افزائی فرمائی اسی طرح نئی نسل کے بہت سے محققین نے بھی انتہائی عزت و احترام کے ساتھ ان سے کسب فیض کا اعتراف کیا۔ طوالت کے پیش نظر صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ موصوف کے لائق فرزند ڈاکٹر نیّر مسعود رضوی لکھتے ہیں :۔

"آپ کا شکریہ ادا کرنے کا مقدور میں اپنے میں نہیں پاتا۔ آپ کے فیوض و برکات میرے سارے وجود کو محیط ہیں اور انہیں گنانے کی کوشش کرنا گویا ان کو محدود کرنا ہے۔ روز مرہ کی گفتگو میں آپ جو دقیق علمی اور ادبی نکات بیان کر دیتے ہیں ان کا اثر میری بدتوفیقی کے باوجود زبردستی میری ذہنی تربیت پر پڑا ہے۔" [2]

میرے دیرینہ کرم فرما اور قبلہ مسعود صاحب کے خویش مرحوم ڈاکٹر سید مسیح الزماں (سابق ریڈر شعبہ اُردو الہ آباد یونیورسٹی) نے حسب ذیل الفاظ میں اظہار امتنان کیا ہے :۔

"جب مجھے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے قریب ہونے کا موقع ملا تو مرثیے سے ان کے شغف ، ان کے تحقیقی مزاج اور گفتگو نے مجھے اس صنف کے گہرے مطالعے کی طرف مائل کیا اور ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے مجھے مرثیے کے بہت سے رموز سے آگاہی ہوئی۔" [3]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو کے استاد اور جواں سال محقق ڈاکٹر اطہر پرویز رقمطراز ہیں۔

"گزشتہ سال چھٹیوں میں مجھے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ موصوف نے میرے کام کو بغور دیکھا اس کی ترتیب کے سلسلے میں مجھے بعض قیمتی مشورے دیے اور مجھے چند اچھے نسخے دکھائے اور اس کی اجازت بھی دی کہ "فسانۂ عجائب" کے اس اڈیشن کو ان کے نام نامی سے معنون کروں۔" [4]

---

[1] یہ مکتوب پروفیسر سید لقیؔ کی اجازت سے نقل کیا گیا ہے۔ ح۔ ح

[2] رجب علی بیگ سرور ، حیات اور کارنامے ، پہلی اشاعت ۱۹۶۷ (انتساب)

[3] اردو مرثیے کا ارتقا۔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ پہلی اشاعت ۱۹۶۸ء (دیباچہ) ص ۱۰

[4] فسانۂ عجائب (ترتیب) بار اول۔ جون ۱۹۶۹ء (عرض مرتب) ص ۱۱

مضمون کے اختتام پر مسعود صاحب مرحوم و مغفور سے تعلق رکھنے والے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ علامہ آرزو لکھنوی جس زمانہ میں اپنی عالمانہ کتاب نظام اُردو کی تصنیف میں منہمک تھے اُن کے بیشتر شب و روز مسعود صاحب کے دولت کدے پر ہی گذرتے تھے۔ آگے چل کر یہ کتاب مسعود صاحب کے حواشی کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ کتاب کے نام کے بارے میں علامہ آرزو لکھتے ہیں:۔

"کتاب کو اُردو کے سب سے بڑے سرپرست
اعلیٰ حضرت ہزاگزالٹڈ ہائینس میر عثمان علیخاں
بہادر با لقابہ شہریار دکن خلد اللہ ملکہ کی طرف
نسبت دیکر "نظام اُردو" کے نام سے موسوم
کردیا" [1]

بعض لوگوں نے مشہور کر دیا کہ آرزو نے نظام اُردو کا پہلا نسخہ ایک قصیدے کے ساتھ نظام حیدرآباد کے پاس بھجوایا تھا اس کے صلہ میں حضور نظام نے کچھ رقم بھی دی تھی۔ راقم الحروف کے استفسار پر مسعود صاحب نے تحریر فرمایا تھا:۔

"جہانتک میرے علم میں ہے' یہ روایت قطعاً بے بنیاد ہے
یہ تو ٹھیک ہے کہ حضرت آرزو نے کتاب کا نام نظام حیدرآباد
کے نام پر رکھا تھا لیکن قصیدہ کہنے یا صلہ پانیکی روایت مرحوم
پر محض ایک غلط الزام ہے۔ آرزو نے سوا رسولؐ اور اہلبیت
رسولؐ اور کسی کی مدح صلہ کی لالچ میں کبھی نہیں کی" [2]

(بسلسلہ صفحہ ۱۸)

خاص طور پر غزل میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان تبدیلیوں سے سالک صاحب متاثر نہیں ہیں۔ یہ ان کا ارادی فعل ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ اپنی شاعری کو اساتذہ قدیم کے معیار کی شاعری رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً آج کل کے شعر و ادب میں "روح عصر" کو برترین مقام دیا جاتا ہے۔ مگر روح عصر سالک صاحب کے کلام میں مفقود ہے۔

دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان کے مجموعۂ کلام میں ایک غزل شامل ہے جس کی ردیف قافیہ "آستاں مزاجی" "کہکشاں مزاجی" ہے میں سمجھتا ہوں کہ جناب سالک نے سنگلاخ زمین میں غزل کہہ کر اپنی قادرالکلامی کی مثال پیش کی ہے۔ یہ ایک پرانی روایت چلی آرہی ہے کہ اساتذہ قدیم اپنی قادرالکلامی ثابت کرنے کیلئے سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ بعض نے تو غیر ثقہ موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس غزل میں مضامین اپنی جگہ قابل ستائش ہیں۔ تراکیب لفظی بھی حسین و دلکش ہیں مگر ان میں غرابت ہے۔ اور غرابت لفظی ہمیشہ عیب مانی گئی ہے

میں اپنی اس خامہ فرسائی کو یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ اپنی بے بضاعتی کے باعث میں "آشوب آگہی" کے بہت سے محاسن پر روشنی نہیں ڈال سکا۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلاَّ بَاللّٰہ

اُردو پڑھیئے
اُردو لکھیئے
اُردو بولیئے

---

[1] نظام اُردو طبع اوّل مطبوعہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ (دیباچہ) ص ب

[2] مکتوب بنام پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی۔ محررہ ۱۲ جنوری ۱۹۶۱ء از لکھنؤ۔

ل۔ احمد۔ اکبرآبادی
لطیف الدین احمد (متولد آگرہ۔ دسمبر ۱۸۹۵ء)

"آشوب آگہی" پر ایک طائرانہ نظر

"آشوب آگہی" سید رفیع الدین احمد سالک رحمانی کا مجموعہ کلام ہے۔ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اسکا شاعر ایک ایسی جامع شخصیت کا مالک ہے جس میں شعر و فلسفہ اپنے پورے حسین امتزاج اور کامل رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ رحمانی صاحب ان شخصیتوں میں ہیں جن کے لیے شاعری ذریعہ عزت نہیں ہے بلکہ محفل شعر کو ان کی وجاہت اور علمی بصیرت سے عزت ہے۔ رحمانی صاحب کو قریب سے دیکھنے والے اور اُن کے اشتغال اور مصروفیتوں سے واقفیت رکھنے والے بمشکل یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ شعر کی طرف کس وقت متوجہ ہوں گے یا دوسرے الفاظ میں شعر کس وقت ان کو اپنا معمول بناتا ہوگا۔ اور اُن کا ذہن کس وقت اتنی یکسوئی کر سکتا ہوگا جب وہ اس مادی دنیا سے اتنی بلندی پر پہونچ سکیں جہاں ان پر شعر کا نزول یا انکشاف ہو سکے جو ایک سچے شعر کی تخلیق کے لیے ضروری ہے۔ ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر رہ کر تو یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی عالم ان پر ایسا طاری ہو سکتا ہوگا لیکن سنی سنٹرل وقف بورڈ کی ذمہ داریوں کے ساتھ تو میرا یقین ہے کہ اگر کوئی میر و غالب مومن و اقبال بھی ہو تو چند روز ہی میں اپنی ساری شاعرانہ صلاحیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ فیض قافیہ نہیں بلکہ فیض ازل ہے جو سالک رحمانی صاحب سے ایسے شعر کہوا لیتا ہے وہ بھی دو چار، دس میں نہیں بلکہ اتنے کہ اُن کا انتخاب مشکل ہے۔

زندگی وقفۂ موہوم سہی شوخ تو ہے
کتنی رنگین تھی آدم کی خطا الا اللہ

نکہتوں کا قافلہ جائے تو اب جائے کہاں
شاخ گل نا آشنا برگ و شجر نا آشنا

ایک دیوانہ چلا جاتا ہے کیوں بے سنگ و خشت
عشق کے آداب سے کیا ہے نگر نا آشنا

ابھی تو جھک کے ستاروں کو دیکھ سکتے ہیں
کہو حیات سے کچھ اور تیز گام چلے

تمھاری یاد کبھی اس طرح بھی آئی ہے
کہ جیسے عطر سے بوجھل عروس شام چلے

کہیں سے کوئی نکل آئے اس اندھیرے میں
جو آشنا نہیں ممکن ہے اجنبی ہی سہی

وہ روشنی ہے کہ آنکھیں ابھی کھل نہیں سکتیں — سکوں ملے جو نظر کو تو تیرگی ہی سہی
جھک جائیں کاش تیری عنایت کے بوجھ سے — دست طلب یہ آج جو ہم نے اٹھائے ہیں
گل چاک پیرہن بھی تبسم شعار بھی — دیوانگی کا نام ہے شاید بہار بھی
یہ تابش جمال ہے یا تابش خیال — تیری طرح حسین ہے ترا انتظار بھی
وہم حق و اندیشۂ باطل سے گذر جا — منزل بھی اگر آئے تو منزل سے گذر جا
کتنے چراغ دیر و حرم میں جلا دیے — ایک شمع آرزو جو بجھی تھی بجھی رہی

ان اشعار کو نقل کرنے کا صرف یہ مقصد نہیں ہے کہ میں اپنی پسند کے کچھ شعر پیش کر رہا ہوں بلکہ یہ ظاہر ہے چاہتا ہوں کہ ان میں انفرادیت ہے تقلید کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ ان میں ایک دکھے ہوئے دل کی آہ بھی ہے جس کے بغیر کسی کو شاعر نہیں کہا جا سکتا اور عقل و دانش کی وہ گہرائی بھی جس کے بغیر شاعری جزویست از پیغمبری کا مقولہ کسی شعر پر صادق نہیں آتا۔ فکر و فن کا وہ امتزاج اور اظہار و بیان کا وہ سلیقہ اور قدرت ہے جس کے بغیر کسی شعر پر شعر کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔

نقد و انتقاد میرا موضوع نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ جب بھی اس کلام کو کسوٹی پر کسا جائے گا تو یہ مزا خالص ی نکلے گا۔ یہ ضرور ہے کہ پست و بلند اور پسند ناپسند سے کسی شاعر کا کلام مستثنیٰ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مجھے امید ہے کہ آشوب آگہی اہل دل اور اہل خرد دونوں کا رفیق خلوت و جلوت ثابت ہوگا اور داد تحسین کا مستحق قرار دیا جائے گا۔

میکش اکبرآبادی

"آشوب آگہی" جناب رفیع الدین صاحب رحمانی تخلص بہ سالک کا مجموعہ کلام ہے یہ میں کہنا چاہوں گا کہ شعر و سخن کے باب میں میرا اظہار خیال کرنا ایک ناروا سارت ہے۔ کیونکہ میں خود شاعر نہیں ہوں۔ لیکن بعض الات میں مجھے یہ ناروا جسارت کئی بار کرنا پڑی ہے مگر ں کے ساتھ ارباب و فکر و نظر سے معذرت بھی کرتا ہوں۔

اصل موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے میں ان سطروں ے قاری کی توجہ ایک خاص نکتہ پر مبذول کراؤں گا۔ اور وہ نکتہ ہے کہ عزیز گرامی مخمور اکبرآبادی کا یہ قول میری نظر میں نہایت دقیع ہے کہ کسی کتاب پر پیش لفظ یا تعارف لکھنا فی المعنی قاری کی ذہانت کی اہانت کرنے کے مترادف ہے یہ نظریہ شعری مجموعہ پر از بس صادق آتا ہے اس بنا پر کہ مختلف طبائع کو مختلف شعر پسند ہوتے ہیں کسی کو ایک شعر پسند آتا ہے وہی شعر دوسرے کو مطلق متحرک نہیں کرتا۔

"آشوب آگہی" میں تقریباً ساٹھ غزلیں شامل ہیں جنکی

ترتیب نہ تو ردیف وار ہے اور نہ ان پر تاریخ تصنیف
رقم ہے۔ کتاب پر پہلی اور سرسری نظر ڈالتے ہی کلام سالک
کی گوناگوں خصوصیات بیک آن جاذب نظر و خیال بن
جاتی ہیں۔ اور ہر خصوصیت مقدم ہونیکا دعویٰ کرتی ہے
لیکن ان میں کس کو مقدم سمجھا جائے اور کس کو مؤخر۔ میرے
لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ بہر صورت میں سب سے پہلے
جناب سالک کی کہنہ مشقی کا ذکر کروں گا جو نو مشق شاعر
کے کلام میں ہونا ناممکن بات ہے۔ لیکن یہ مجموعہ اتنا مختصر
ہے کہ لامحالہ قیاس سے کام لینا پڑ رہا ہے کہ غالباً موصوف
نے کلیات شائع کرنے کے مقابلے میں اس کا انتخاب
شائع کرنے کو ترجیح دی۔

اس مجموعہ کے اکثر اشعار پڑھ کر گمان ہوتا ہے
کہ موصوف کے سروش غیبی نے وہ شعر ڈھلی ڈھلائی
صورت میں ان کے ذہن پر نازل کر دیے تھے۔ الفاظ کی
نشست اور مصرعوں کا دروبست حیرت ناک حد تک
استادانہ ہے۔ اور اسی کے ساتھ موصوف کی علمی قابلیت
و وسعت کا قاطع ثبوت بہم پہونچ جاتا ہے۔ اگر زیادہ نہیں
تو موصوف درس نظامیہ کے فاضل اجل ضرور ہیں۔

میں اس عقیدے کا ہوں کہ الفاظ میں جنس ناجنس
ہوتے ہیں اور ان کے اندر روح معانی ہوتی ہے اس بنا پر
زبان کا استعمال بجائے خود ایک فن بن جاتا ہے جو ہر کس
و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ ایسی وضاحت زبان
و سلاست بیان جو جناب سالک کے کلام کا وصف اولیٰ
ہے ایک ماہر زبان ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

میں یہ بھی بہ شدت مانتا ہوں کہ صناعت ادب
جس فن سے عبارت ہے وہ حسن بیان سے وجود میں آتی
ہے۔ موضوع سے صناعت ادب کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔
میں نے کسی تبصرے میں پڑھا تھا کہ شاعر کے سامنے الفاظ
ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں یہ بات جناب سالک
کی زباندانی کے باب میں کہی جائے تو مطلق کوئی مبالغہ
نہ ہوگا۔

فصاحت و سلاست جناب سالک کے کلام کا وصف
اولیٰ ہے جو ایک ماہر زبان ہی کا نصیب ہوتا ہے۔ میں ان
کے حسن بیان اور قادر الکلامی کو ایک پرزور میدانی ندی
کی مانند سمجھتا ہوں جس کے دھارے میں موجیں اٹھنا تو در
کنار رہا۔ کوئی لہر پیدا ہوتی بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ایک
پرسکون و پر وقار بہاؤ ہے۔ اور بس۔ اس پر میں اور بھی
اضافہ کروں گا کہ جناب سالک نے اپنے کلام میں فصاحت
و سلاست کے دریا بہا دیے ہیں۔ اور میرا یہ بھی دعویٰ ہے
کہ ان کے کسی شعر کا کوئی بھی لفظ ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا
موزوں لفظ رکھ دینا کسی کے لیے آسان نہ ہوگا۔

ان تمام شعری محاسن کے ساتھ جو اوپر کی سطروں
میں بیان کیے گئے ہیں ان کے کلام میں اور بھی شعری محاسن
ایسے ہیں جو شعر میں مہر لگا دیتے ہیں مثلاً نازک خیالی اور
حسن تشبیہات وغیرہ۔ نزاکت خیال و حسن تشبیہ کے بغیر
حسن بیان کی تکمیل ہو نہیں سکتی ہے۔ اور نازک خیالی کا حسین
ترین اظہار جب ہی ہو سکتا ہے جب تشبیہات سبک اور
نادر ہوں۔

الحاصل اس ہیچ مدان کے خیال میں جناب سالک کے
شعری کلام کے یہ محاسن انھیں صناع ادب کے رتبے پر فائز

ے کیلئے کافی سے زیادہ سفارش ہے۔

میری نظر میں جناب سالک کی شاعری فکری نوعیت
ہے اور متصوفانہ موضوعات کے اظہار میں اس کا بیان
رنے پر سہاگے کا کام دیتا ہے ذکر اور فکر صوفیار کی ایک
وم عام اصطلاح ہے۔ اس لئے میں یہ مراد لیتا ہوں کہ ذکر کے
فکر مستلزم ہے۔ موصوف کے کلام میں ذکر و فکر غالب
الکل کا درجہ رکھتا ہے اور شاید ذکر و فکر میں ان کا یہ
پاک ہی اس بات کا ذمہ دار ہو کہ "مکروہات زندگی"
ن کی شاعری میں جگہ نہیں پا سکے۔ بنا بریں میں یہ نتیجہ
لتا ہوں کہ صاحب موصوف وحدت الوجود کے عقیدے
ار بند ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اس خیال کی تائید
شوب آگہی" کے تمام نہیں تو اکثر شعروں سے ہو جاتی
ہے۔

فارسی اور اُردو شاعری کے تمول کا راز متصوفانہ
ضوعات کی کثرت اور ندرت کے اندر ہے۔ متصوفانہ
ضوعات کی کثرت اور ندرت جناب سالک کے کلام
برملا نظر آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ متصوفانہ خضوع
شوع نے ان کو بھی اپنے قبضہ میں لے لیا ہے کیوں کہ
ن کی شاعری سرمدی رازوں سے مالا مال ہے۔
مذکورہ بالا اشاروں کو ذہن میں رکھئے اور مندرجہ
یل اشعار پہ غور فرمائیں۔

ں اگر قلب و جگر سوزِ یقیں سے محروم
رمیٔ فکر و نظر ایک خطاء الا اللہ

رفعت ماہ و ثریا پہ رسائی بے سود
بر سر کار رہے جب زعم انا الا اللہ

زیست ایک موجۂ گرداب فنا تھی لیکن
چشم ساقی نے دیا جام بقا الا اللہ

یہ اس مجموعہ کی پہلی غزل کے شعر ہیں جس کی ردیف الا اللہ
ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب ردیف الا اللہ ہو تو اس غزل
میں متصوفانہ موضوعات کے سوا اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے
مقصد کہنے کا یہ ہے کہ یہ پوری غزل اسی رنگ میں کہی گئی اور
ہر شعر ایسی معیار کا ہے جیسے یہ تین شعر ہیں۔
پہلے دونوں شعروں کا مفہوم صاف اور سادہ ہے
یعنی قلب و جگر اگر سوزِ یقین سے محروم ہوں تو گرمی فکر و
نظر بے معنی سی بات ہے۔ یا انسان اگر اپنی انا پر فتح نہ
پا سکے تو اس کا ماہ و ثریا پہ پہونچ جانا یکسر بے سود ہوگا
تیسرے شعر کا مفہوم میرے ناقص خیال میں بہت وسیع
و عمیق ہے۔ صوفیاء کے مسلک میں پہلی منزل فنا فی الذات
کی ہے۔ دوسری فنا فی الشیخ کی تیسری فناء فی الرسول کی
اور چوتھی فنا فی اللہ کی۔ مگر یہ بھی آخری منزل نہیں ہے
اس کے بعد ایک اور منزل آتی ہے جسے بقا باللہ کہا جاتا
ہے۔ جناب سالک نے یہ شعر اسی مقام سے کہا اور بڑے
شاعرانہ پیرائے میں کہا ہے کہ موجوداتِ عالم کی ہر شے
گرداب فنا میں مبتلا ہے۔ مگر ہمیں اس کا غم کیوں ہو۔
ہمیں تو چشم ساقی نے جام بقا پلا دیا ہے۔
مندرجہ ذیل شعر کو پڑھئے اور اس کی وسعت معنی
میں کھو جائیے۔ بجھ گئے ہیں چراغ راہوں کے ۔۔۔۔۔
دے رہا ہے مگر کوئی آواز۔

اب مندرجہ ذیل اشعار پر نظر ڈالئے۔
نمودِ دیر و حرم ہے سراب فکر و نظر
مکاں بن نہیں سکتا ہے، لامکاں کے لیے

کسکو دیکھوں کس کو ڈھونڈوں اے دل عرفاں طلب
خود حریم ناز ہوں خود ہوں میں حریم ناز میں

ہر ایک سمت حقیقت کی جلوہ ریزی ہے
کوئی یہ ہم کو بتائے کہ ہے مجاز کہاں

اس قدر سمجھا ہوں اب تک راز عرفان یقین
کفر جب حد سے بڑھا سالک تو ایماں ہو گیا

ہم کو تسلیم نکو نامی صحن کعبہ
کس کی تابانی افسوں ہے صنم خانے میں

یہ دلفریبی یہ دلربائی نظر کی جنت نظر کا دھوکا
حجاب رنگیں ہے دل کا پردہ حجاب لیکن کہاں نہیں ہے

دیکھا آپ نے جناب سالک کس مقام پر سے بات کر رہے ہیں۔ وہاں سے جہاں سارے پردے برطرف ہو جاتے ہیں وہ اپنی ذات میں حریم ناز بھی ہیں اور حریم ناز کے اندر داخل بھی۔ ہر طرف تو حقیقت کو آشکار دیکھتے اور حیراں ہو جاتے ہیں کہ مجاز کس کو کہیں کفر کامل ہو جاتا ہے تو ان کی نظر میں ایمان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اور صحن کعبہ کا تقدس تسلیم مگر صنم خانے میں کس کی تابانی کا افسوں چھایا ہوا ہے اور یہ کہ ساری دلفریبیاں اور دلربائیاں جو نظر کی جنت ہیں وہ نظر کا دھوکہ بھی ہیں۔ اس لیے کہ حجاب تو دل کا پردہ ہے۔ ہر چند کہ حجاب ہر جگہ یا ہر بات میں ہے۔

حکمائے اسلام نے اس عالم موجودات کو حجاب اندر حجاب کہا ہے جناب سالک نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی کچھ کہا ہے لیکن وہ لطافت راز کہ مدعی بن کر شور منصور کو بے نیاز شعور بھی سمجھتے ہیں فرماتے ہیں:۔

ہم سے پوچھے کوئی لطافت راز غور منصور بے شعور نیاز

سطور بالا میں ایک شعر نقل کیا گیا ہے جس میں جناب سالک نے زیست کو موجۂ گرداب فنا کہا ہے لیکن وہ اس زندگی کی بزم کی روح رواں ہونے پر فخر بھی کرتے ہیں

سالک ہمارے دم سے رہی رونق حیات
ہم بزم کائنات کے روح رواں رہے

وہ غم عشق کو زندگی بنا کر حیات جاوداں پالینا چاہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:۔

کیوں زندگی اسیر سرود و فغاں رہے
غم تو نگار زیست ہے وہ جاوداں رہے

فلاسفۂ دہر نے انسان کی زندگی کی گوناگوں تعبیریں کی ہیں جناب سالک نے زندگی کی تعبیر مندرجہ ذیل اشعار میں کی ہے اور اس طرح زندگی پر اور گردش لیل و نہار پر مظفر و منصور ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔

تمام فکر و تجسس ہے زندگی سالک
وہ زندگی ہی نہیں ہے جو بیقرار نہیں

رواں رواں لیے جاتی ہے زندگی سالک
کہیں قیام نہیں ہے کہیں مقام نہیں

ہم آج بھی ہیں گرم رو عرصۂ حیات
وہ زور شور گردش ایام کیا ہوا

میرے اندازے میں جناب سالک صوفی تو ہیں، زندہ دل بھی ہیں ان کے کلام میں تغزل کی عمدہ مثالیں بھی ملتی ہیں اور ان کا تغزل قافیہ پیمائی نہیں الہامی ہے۔ شاعری کی جان نازک خیالی اور حسن تشبیہات میں ہوتی ہے۔ ذیل میں چند شعر منقول ہیں پڑھیے اور لطف اندوز ہو جیے:۔

گلزار بن گیا ہے جہاں خوش خم
کس آتش الم سے گذر کر ہم آئے ہیں

ب بات تھی جو تشنۂ معنی ہی رہ گئی
ب یاد ہے جو آج بھی دل سے لگائے ہیں

تمہاری یاد کبھی اس طرح بھی آئی ہے
کہ جیسے عطر سے بوجھل عروس شام چلے
ل رقص شباب و سرود شعر و شراب
نگار صبح چرائے طلسم شام چلے

ں دھڑکنے لگا ہے گلشن کا
اک کلی اور مسکرائی ہے
ت جسم مرمریں کی قسم
چاندنی عطر میں نہائی ہے
کتنے آنسو لیے ہوں دامن میں
عمر بھر کی یہی کمائی ہے

غم کی آہ نہ ہو جائے وہ ہنسی کیا ہے
جو درد بن کے نہ تڑپائے وہ خوشی کیا ہے

دت دل ہے بزم منور غم نے ایسی شمع جلائی
رت جلوہ اللہ اللہ چشم تماشہ تاب نہ لائی

غزلانہ رنگ کی دو پوری غزلیں بھی نقل کر رہا ہوں
ر آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ ان کو پڑھ کر کیف و انبساط
اوان حاصل کیجیے۔

اج نکہت گل آج برہم ہے مگر کیوں ہے
تلاطم خیز موج قطرہ شبنم ہے مگر کیوں ہے
اروں سال سے فطرت ہے مصروف خود آرائی
پراگندہ ابھی تک زلف عالم ہے مگر کیوں ہے
راز آفرینش راز بن کر رہ نہیں پایا
شعور آدمیت پھر بھی مبہم ہے مگر کیوں ہے
حیات افروز ایک پیغام ہم لائے تھے دنیا میں
ہماری زندگی اب شور ماتم ہے مگر کیوں ہے
شکست جام و مینا سے ہے میخانہ میں ہنگامہ
شکست ساز دل تقدیر آدم ہے مگر کیوں ہے
ہم اہل دل ہیں عالم کے حقائق ہم پہ روشن ہیں
خرد کو اعتبار ساغر جم ہے مگر کیوں ہے
وہ دھڑکن جس سے تھی احساس میں فن کی گرمی سالک
وہ دھڑکن زندگی کی آج مدھم ہے مگر کیوں ہے

دیگر

رنگ بہاراں حسن نظر تک — لالہ و گل بھی خون جگر تک
چند ہی لمحے کتنے مشکل — آخر شب سے نور سحر تک
پرتو خور سے ماہ درخشاں — میری ہستی تیری نظر تک
سوزش غم ہے زیست کی رونق — گرمی محفل رقص شرر تک
کیسے کیسے عالم گذرے — ذوق نظر سے کیف نظر تک
کون و مکاں کا ذکر ہی کیا ہے — راز مشیت عزم بشر تک

اپنا اپنا ظرف ہے سالک
حیرت جلوہ تاب نظر تک

مقطع سے پہلے کا شعر بے نیاز تحسین ہے۔ اس شعر میں جناب سالک نے تلقین فرمائی ہے کہ عزم انسانی مشیت الٰہی کو بدل سکتا ہے[1]

نئی روشنی کی کرنیں پھوٹیں تو ہمارے ناقدین نے ایک شاعر کے کلام سے اس کا پیغام اور اس میں مقامی رنگ بھی تلاش کرنا شروع کیا۔ مگر میری ناقص رائے میں شاعر کا منصب شعر کہنا ہے قومی اصلاح اس کا منصب نہیں ہے۔

[1] اس بے نیازی تحسین کو پاگل پن کہتے ہیں! (ر۔ ل)

اس کے باوجود میں مانتا ہوں کہ شاعر جس قدر عالی مرتبت ہوگا زندگی کے متعلق اس کے عقائد و عوامل بھی اتنے ہی ارفع اور معیاری ہوں گے۔ اور وہ فطرتاً اپنے اخلاقی اصول کو دوسروں میں بھی دیکھنا پسند کرے گا اور یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ پڑھنے والا ہر کتاب سے کچھ نہ کچھ اخذ قبول کرتا ہے اس کو اگر شاعر کا پیغام کہا جائے تو مضائقہ کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ جناب سالک کے کلام میں ایسا سامان فرداً ضروری اور اصول اخلاق کی تعلیم کافی سے زیادہ ہے خصوصیت کے ساتھ اس پہلو کو ظاہر کرنے کیلئے ذیل میں ایک پوری غزل نقل کر رہا ہوں

گلشن رنگ و بو میں تو حاصل صد بہار بن
غنچۂ نو بہار بن، لالہ کہسار بن
حسن جمال یار بھی پرتو عشق ہے مگر
لذت عشق کے لیے حسن جمال یار بن
تیرا سکون موت ہے تیری تڑپ ہے زندگی
جہد عمل کی روح بن روح کا اضطرار بن
تیری حیات مستعار خاک بسر ہوئی تو کیا
شعلۂ التہاب بن آتش بے قرار بن
تیری حیات اک پیام حسن کے التفات کا
تجھ کو قسم حیات کی حسن کا اعتبار بن
کہتا تھا بزم ہوش میں سالک حق شناس کل
عشق کا غمگسار بن حسن کا رازدار بن

اس غزل کے محاسن کے بیان سے میرا قلم عاجز ہے۔

جہاں تک مقامی رنگ کا تعلق ہے جناب سالک کے کلام میں مقصود فانہ اشعار کے سوا دو چار ہی شعر ایسے ملتے ہیں جن کو اس تقسیم میں رکھا جا سکے۔

شاعر جن اوصاف کو برتر مقام دیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ وہی اوصاف دوسروں میں بھی ہوں۔ اس لیے میرا یہ خیال کا ہوں کہ جناب سالک کرداری بلندی کو معیار انسانیت سمجھتے ہیں مگر یہ بھی جانتے ہیں کہ واقعی بلند کردار آدمی ہر روز پیدا نہیں ہوتا۔ اس شعر پر غور فرمایئے۔

زمانہ جستجو میں رات دن بیتاب رہتا ہے
کہیں صدیوں میں کوئی صاحب کردار آتا ہے

جناب سالک کا مطمع نظر بہت بلند ہے وہ خود داری و خود اعتمادی کو حاصل انسانیت سمجھتے ہیں۔ اور مجھے اور آپ کو بھی اسی بلندی پر لے جانا چاہتے ہیں یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

قید سے چھوٹ کے اڑنے کی تمنا کیسی
اس اسیری ہی میں ایک عالم پرواز بنا

وہم حق و اندیشۂ باطل سے گذر جا
منزل بھی اگر آئے تو منزل سے گذر جا

معلوم نہ ہو راز غم زیست کسی کو
ہنستا ہوا رنگینیٔ محفل سے گذر جا

ساحل کی تمنا ہے تیرے ذوق کی پستی
پروردۂ طوفاں ہے تو ساحل سے گذر جا

یہ کیوں ہے ستاروں کی تجلی سے تحیر
سالک ہے تو حسن مہ کامل سے گذر جا

خاتمہ کلام پر مجھے دو باتوں کا اضافہ اور کرنا ہے پہلی بات یہ کہ جناب سالک کی شاعری میری نظر میں اس صدی کے ربع اول کے دور کی ہے گذشتہ نصف صدی میں اردو شاعری

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مصنف ڈاکٹر اے جاوید
مترجم ۔ ڈاکٹر ۔ م ، م ، حسن

ہمہ جہتی مفکّر ۔ امیر خسرو

ہندوستان کے عظیم صوفی محب وطن اور شاعر
سرو کی پیدائش ۱۲۵۳ء میں پٹیالی میں ہوئی تھی ان کے
ر سیف الدین ترکی النسل تھے جو بلخ سے ہندوستان آکر
س گئے تھے ۔ خسرو کو اپنے ہندوستانی ہونے پر جتنا فخر تھا
ی النسل ہونے کا فخر اس سے کم نہ تھا ، وہ بڑی شان
ے کہتے ہیں کہ میں ترک ہوں ۔

خسرو کے والد ان پڑھ لیکن تلوار کے دھنی تھے ، وہ
مانہ بھی قلم سے زیادہ سیف کی اہمیت کا تھا ، ہندوستان
نے کے بعد انھوں نے اپنی بہادری اور شجاعت کا سکہ
ما دیا ، خاندانی اثرات نے ساتھ دیا اور سماج میں قدر و
منزلت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے ، اُن کی شادی بھی معزز
گھرانے میں ہوئی ، نتیجے کے طور پر زمیندارانہ ٹھاٹھ کے ساتھ
ندگی گزارنے لگے ، اس ماحول میں خسرو پیدا ہوئے اور
پروان چڑھے ،

خسرو ابھی آٹھ ہی سال کے تھے کہ باپ کا سایہ
رسے اٹھ گیا ، آٹھ سال کے کمسن بچے کے لیے یہ صدمہ زبردست
تھا اس حادثہ نے حساس اور نرم دل خسرو کو اور بھی حساس
بنا دیا ، خسرو کی ، پرورش کی ذمہ داری اب ان کے دادا
کے سر تھی ، دادا نے خسرو کو اس لاڈ پیار سے پالا کہ انھیں
باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی ۔ خسرو کو بھی اپنے دادا
سے بیحد اُنسیت ہو گئی تھی ۔ لیکن دادا آخر کار دادا تھا ۔
پوتے کا ساتھ کب تک دیتے ۔ جلد ہی وہ بھی مالک حقیقی
سے جا ملے ۔ اب خسرو کو اپنی یتیمی کا احساس ہوا ۔ ان کے دل
کو گہرا صدمہ پہونچا ۔ جس کا اظہار انھوں نے ایک مرثیہ میں
کیا ہے ۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خسرو کو اپنے
دادا سے کتنا پیار اور کتنی محبت تھی ، اور ان کی نظروں میں ان
کی کتنی عزت تھی ، خسرو کی والدہ حیات تھیں انھوں نے
اپنا سارا پیار خسرو پر نچھاور کر دیا ۔ خسرو بچپن سے ہی بیحد
ذہین تھے ، بچپن سے ہی خوبصورتی کے دلدادہ تھے پڑھنے
کا شوق بھی بچپن سے ہی تھا انھوں نے فارسی کی اس
زمانہ کی شاعری کا مطالعہ کیا اور اچھی چیزوں کا اثر بھی
قبول کیا ، کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں موجود کسی بھی

فارسی دیوان کو خسرو نے نہیں چھوڑا، اپنا ایک منفرد رنگ اور انداز بیان اختیار کرنے سے پہلے خسرو نے فارسی کے اساتذہ سخن کے رنگ کی تقلید کی ہے، ان کے ابتدائی کلام میں یہ اثرات باسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ مشہور ہے خسرو نے کم عمری میں ہی شاعری شروع کر دی تھی وہ جاگیردارانہ ماحول میں بڑے ہوئے ان کے چاروں طرف شعراء موسیقار اور عالموں کا جمگھٹ رہا کرتا تھا جن سے خسرو کو بہت کچھ سیکھنے سمجھنے اور متاثر ہونے کا موقع ملا۔ اس ماحول نے خسرو کی ذہانت کو چمکانے میں سونے۔۔۔ پر سہاگہ کا کام کیا۔ خسرو بڑے ہنس مکھ اور ظریف تھے، اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے خسرو کسی بھی محفل میں بہت جلد اپنا مقام بنا لیتے تھے۔ اس کے نتیجے میں سماج کے ہر طبقہ کے ساتھ گوشت اور ناخن کا سا رشتہ قائم کر لینے میں کامیاب ہوئے اور اس طرح معاشرے اور سماج کے ہر طبقہ اور ہر فرد کو قریب سے دیکھنے کا موقع انھیں ملا۔

خسرو کی شاعری کے متنوع ہونے کی ایک خاص وجہ تو یہی ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی کی مختلف شکلوں اور رویوں کا بہت نزدیک سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی رنگا رنگ تصویر کشی کی ہے، اسکے علاوہ اس عہد کے سیاسی حالات بھی ان کے تجربات میں اضافہ کا سبب ہوئے انھوں نے اپنی زندگی میں سات بادشاہوں کو دیکھا اور ان میں سے کئی ایک کے ساتھ ان کا قریبی تعلق رہا۔ ان درباروں سے منسلک علماء و مشاہیر سے بھی خسرو کا قریبی تعلق رہا اور یہ تعلق بلاشبہ خسرو کے علم و تجربات کے لیے بیحد مفید ثابت ہوا، ان سات بادشاہوں میں سے ۵ کے دربار سے خسرو باضابطہ منسلک رہے، اور ان درباروں سے ان کو بیحد عزت و افتخار ملا، خسرو نے اپنے قصیدوں میں ان کا ذکر کیا ہے۔

سنہ ۱۲۷۲ء میں خسرو حضرت محبوب الہی نظام الدین اولیاء کے حلقہ رشد و ہدایت میں داخل ہوئے اور ان کے بیحد قریب ہو گئے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ اس تعلق کی بنا پر خسرو کی زندگی میں زبردست تبدیلی آئی جس کا اثر ان کی تخلیقات پر بھی اترا، اس کی وجہ سے خسرو کی زندگی اور ان کی تخلیقات میں روحانی موڑ آیا۔ اس زمانے میں تصوف کا دور دورہ تھا حضرت محبوب الہی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو کر خسرو نے تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اس میں اپنے تخیل سے جلوہ صد رنگ پیش کئے۔

خسرو اپنے عہد کے بہترین سبک میں شاعری کی، فارسی کی اعلا شاعرانہ صلاحیت کی بنا وجہ سے طوطی ہند کہلائے، ان کی شاعری میں سادگی اور شیرینیت ہے، اس کے علاوہ خسرو کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی تصویر اپنی شاعری میں کھینچ دی ہے، اس طرح خسرو کی شاعری میں ان کے عہد کی تاریخ صاف طور پر جھلکتی ہے، ان کی تخلیقات ایک لحاظ سے اس عہد کا آئینہ ہیں۔

کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ خسرو عظیم موسیقی داں بھی تھے اپنے زمانہ کی موسیقی کی محفلوں کی جان تھے ان کے کامیاب موسیقار ہونے کے بہترے قصے آج بھی مشہور رہیں اور زبان زد مخلوق ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خسرو نے ستار کی ایجاد کی تھی۔ کچھ لوگ قوالی کی ایجاد کا سہرا بھی خسرو ہی کے

سرباندھتے ہیں، علم موسیقی سے واقفیت نے جہاں خسرو
کا شمار موسیقاروں کی صف میں کرا دیا ہیں، ان کی شاعری
میں اس کی وجہ سے موسیقیت کا عنصر خود بخود داخل ہو گیا،
موسیقیت اور نغمگی خسرو کی شاعری کی جان ہے، آج بھی
خسرو کا کلام قوالوں کے منہ سے سن کر لوگ سر دھنے بغیر
نہیں رہتے۔

خسرو طبعاً سیلانی اور سیاحت پسند واقع ہوئے تھے
اُن کی شاعری کا تنوع اور تجربات کے حقیقی ہونے کی
اہم وجہ اُن کی سیر و سیاحت بھی ہے۔ وہ بنگال گئے ہوئے
تھے کہ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کے وصال کی خبر
غم انگیز ملی۔ خسرو الٹے پاؤں واپس آگئے۔ اپنے مرشد سے
بچھڑ کر اور ان کو کھو کر خسرو بے حد ملول اور رنجیدہ تھے۔
کہا جاتا ہے کہ مرشد کے وصال کے غم میں اُنھوں نے اپنا سب
کچھ راہ خدا میں لٹا دیا تھا دربار سے علیحدگی اختیار کر لی۔
اور رات دن غمگین رہنے لگے، خسرو کو حضرت محبوب الٰہی
کے وصال کا اتنا اثر تھا کہ خسرو محبوب الٰہی کے انتقال
کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے وہ اس غم کو زیادہ
دنوں تک برداشت نہ کر سکے۔ اور ۱۳۲۵ء میں محبوب حقیقی
سے جا ملے۔

خسرو تو چلے گئے لیکن ادبیات کا ایک عظیم و نادر ذخیرہ
بطور ترکہ چھوڑ گئے، تصوف، موسیقی اور ادب میں مشغول اللہ
کھوئے رہنے کے باوجود خسرو نے دیوان کی ترتیب میں غفلت
نہیں برتی، یہی وجہ ہے کہ خسرو کا قیمتی سرمایہ آج بآسانی
دستیاب ہے۔ خسرو نے اپنی زندگی میں ہی اپنی تخلیقات
قلمبند کرائیں۔ ان کی بہتیری نقلیں ہوئیں۔ اور ان کی باقاعدہ
جلد بندی ہوئی۔ خسرو ان خوش نصیبوں میں تھے جنکی شہرت
و عظمت و مقبولیت ان کی زندگی میں ہی بام عروج پر پہنچ
چکی تھی، اس میں کچھ ان کی ذہانت کچھ ان کی طوالت عمر کا
دخل رہا ہوگا بہر حال چونکہ وہ اپنے زمانے میں ہی کافی مشہور
اور مقبول ہو گئے تھے اس لیے ان کی شاعری کی قدر کی گئی
اور خسرو کے علاوہ دوسرے بہت سارے لوگوں نے انکے
کلام کی تدوین و ترتیب کے فرائض انجام دیئے۔

ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج خسرو کے
پانچ دیوان، تاریخ سے متعلق ان کی تخلیقات، ان کی فارسی
اور ہندی شاعری کے مجموعہ کی تعداد تقریباً ۹۹ تک پہنچتی ہے
جو سب کی سب دستیاب ہیں، ان تخلیقات میں شاعری کے
علاوہ نثری نمونے بھی موجود ہیں جن سے نثر پر ان کی
دسترس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ خسرو کا پہلا دیوان ۱۶ سے ۱۹ برس
کی عمر تک کے کلام پر مشتمل ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے
باقاعدہ قسم کی شاعری کتنی کم عمری میں شروع کر دی تھی۔

خسرو ہمہ جہتی شخصیت کے مالک تھے ان کی ایک
بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے فارسی شاعری کو ہندی
رنگ میں رنگ کر اسے بالکل نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ فارسی
شعر و ادب کو ان کا یہ عظیم عطیہ ہے جس کے لیے وہ ہمیشہ
یاد کیے جاتے رہیں گے۔ اُنھوں نے دو تہذیبی روایات
کو ایک دوسرے میں ملا کر ان کے امتزاج سے ایک حسین
و دلکش گنگا جمنی رنگ پیش کیا ہے۔

عزیز الحسن خاں کمال (بکیوری ضلع اٹاوہ)

دو بدن ایک رُوح

حضرت ابوالحسن امیر خسرو دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کو اس برِ عظیم کے اولیاء اللہ۔ درویش و شعراءِ کرام حضرات کی صف میں وہ اولیت حاصل ہے جو کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آپ وقت کے درویش بھی تھے اور اہل علم بھی تھے۔ علم و قابلیت کیلئے مُصلح اعظم حضرت شیخ سعدیؒ کو اس بات پر ناز تھا کہ اُن کے ہمعصروں میں حضرت امیر خسرو جیسا پختہ کار اہلِ قلم موجود ہے۔ جبکہ حضرت سعدیؒ کے زمانہ پیری میں حضرت امیر خسرو بالکل نوجوان تھے۔ اس اعتبار سے حضرت امیر خسرو کو بہت بڑی عظمت حاصل ہے سب سے پہلے اس برِ عظیم میں اُردو یعنی ہندوستانی زبان کا سنگ بنیاد رکھا۔ اسی بزرگ کی وجہ سے اُردو زبان اس برِ عظیم میں پھولی پھلی۔ اور اردو زبان نے ہزاروں برس کی پُرانی زبانوں کو شیرینی لطافت اور بلاغت کے اعتبار سے پیچھے چھوڑ دیا۔

۱۲۵۵ء میں شاہان غلامان کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے بعد ان کا نام ابُوالحسن رکھا گیا لیکن آپ کا اصل نام "امیر خسرو" کے تخلص میں دب گیا۔ چنانچہ دنیا میں آپ امیر خسرو ہی کے نام سے مشہور ہوئے۔

باپ کے انتقال کے بعد حضرت امیر خسرو کی تعلیم و تربیت آپ کے نانا نواب عماد الملک کی زیرِ نگرانی ہوتی رہی۔ نانا نے اپنے نواسہ کو فقہ، حدیث، منطق اور دیگر علوم میں اچھی طرح سے تعلیم دلائی۔ شعر و شاعری سے آپکو فطری لگاؤ تھا۔ آپ بچپن ہی سے بے تکان شعر کہتے تھے اور اپنے بڑے بھائی اعز الدین سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی نے آپ کو دیکھا بے حد خوش ہوئے اور فرمایا "تمہاری چمکتی ہوئی پیشانی سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہمارے آفتاب ولایت کی شعاعیں اسے اور بھی چمکا دے گی"۔ حضرت محبوب الٰہی کے اس ارشاد کے بعد امیر خسرو حضرت کے مریدوں کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔

حضرت محبوبِ الٰہی کی نظروں میں امیر خسرو کی کس قدر قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک

روز حضرت محبوب الٰہی نے آپ سے ارشاد فرمایا کہ اے
ترک (حضرت محبت سے امیر خسرو کو ترک نام سے یاد
کیا کرتے تھے) سب سے تنگ آجاتا ہوں یہاں تک کہ
اپنے آپ سے بھی، مگر تجھ سے کبھی تنگ نہیں ہوتا۔ یہ محبت
تھی امیر خسرو سے حضرت محبوب الٰہی کو۔

حضرت امیر خسرو کی زندگی کے سنہرے واقعات
عالم فانی کو ایک درس و نصیحت بنے ہوئے ہیں امیر خسرو
نے حضرت محبوب الٰہی کی شان میں ایک قصیدہ کہا جب
آپ نے حضرت کو یہ قصیدہ سُنایا تو حضرت نے خوش
ہوکر فرمایا "مانگ خسرو کیا مانگتا ہے"۔ امیر خسرو نے عرض
کیا "حضرت کلام میں شیرینی اور درد چاہتا ہوں"۔
سبحان اللہ مانگنے والے نے کیا مانگا لذت و درد دھن
دولت مال متاع نہیں یہ تھی شان شاعر اعظم جناب حضرت
امیر خسرو رحمتہ اللہ کی۔

امیر خسرو کو حضرت سے اس بلا کا عشق تھا کہ آپ
اوّل تو حضرت سے جدا ہی نہیں ہوتے تھے اور اگر ہوتے
تھے تو رات دن بے چین رہتے تھے۔ جب امیر خسرو کو یہ معلوم
ہوا کہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی دنیا سے پردہ
کرگئے امیر خسرو اس وقت بنگال میں تھے دردناک خبر کو
سنتے ہی آپ بنگال سے دیوانہ وار، پاگلوں کی طرح
روتے دوڑتے دہلی آئے سر کے بال کٹوا دیئے اور مزار
اقدس پر آکر گر پڑے روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے
کہ کیسا اندھیرا ہے کہ آفتاب زمین کے اندر چھپ جائے۔
اور اس کی شعاعیں سر پٹکتی پھریں۔ سارا مال و زر فقیروں
کو تقسیم کردیا اور سیاہ کپڑے پہن کر مزار اقدس پر آن بیٹھے
اور دنیا سے بالکل کنارہ کش ہوگئے۔

ایک دن وہ آیا کہ محبوب الٰہی کی وفات کے بعد چھ ماہ
۱۸ شوال ۷۲۵ھ کو حضرت امیر خسرو اس دنیا سے کنارہ کرکے
اپنے پیر و مرشد سے جاملے۔ حضرت محبوب الٰہی کو حضرت امیر
خسرو سے کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا
ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو شخصوں کے
دفن کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہوتی تو میں دوسرے
کو اپنے ساتھ دفن کرنے کیلئے اپنے ترک کی وصیت کرتا۔ حضرت
محبوب الٰہی حضرت امیر خسرو سے اکثر یہ فرمایا کرتے تھے تیری
زندگی ہماری زندگی کے ساتھ وابستہ ہے جب ہم نہیں رہیں
گے تو تو بھی اپنے آپ کو دنیا میں نہ سمجھنا" چنانچہ ایسا ہی
ہوا۔

حضرت امیر خسرو درویش کامل ہونے کیساتھ ساتھ بہت
بڑے اہل قلم تھے آپ کی ننانوے (۹۹) کے قریب مختلف تصانیف
تھیں جن میں سے بہت سی ناپید ہیں آپ کے اشعار کی تعداد
پانچ لاکھ سے زیادہ ہے آپ خاص قسم کے گیتوں کے موجد
ہیں۔ جن کو ہندوستانی لٹریچر میں بلند ترین مرتبہ حاصل ہے
اس برعظیم میں آپ ہی نے سب سے پہلے اردو زبان
کی داغ بیل ڈالی۔ فن موسیقی کے بھی آپ بہت بڑے ماہر تھے ستار
کو آپ ہی کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔ موسیقی کی اکثر راگ راگنیاں
آپ نے ایجاد فرمائی ہیں آپ نے ۷۲ سال کی عمر میں غیاث
الدین بلبن سے لیکر محمد شاہ تغلق کے عہد تک گیارہ سلطنتیں
دیکھیں۔ جن میں سے سات بادشاہوں کی مصاحبت میں آپ
خود رہے۔ حضرت نے وفات کے وقت اپنے پیچھے تین بیٹے
ایک بیٹی چھوڑی تھی۔

محمد عبداللطیف عارف

وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ

ہمارا مقصدِ زندگی

یہ عنوان "ہمارا مقصد زندگی" اگرچہ بظاہر خشک اور غیر دلچسپ نظر آتا ہے عقل و بینش کی عینک لگا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ عنوان کارآمد اور مفید پند و نصائح کا خزانہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان مسائل کو حل کر رہا ہے۔ جیسیں آج کل کے روشن خیال حضرات مختلف قسم کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر اپنے ایمان کو معرض خطر میں ڈال رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس کی وجہ صرف دین و مذہب سے بُعدیت اور احکام دینیہ سے لاعلمیت ہے ورنہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری دینی اور دنیاوی فلاح و بہبودی کے لیے دو کتابیں چھوڑ رکھی ہیں پہلی کتاب کلام اللہ اور دوسری کتاب حدیث ہے یہ دو کتابیں ایسی ہیں جو ماضی حال اور مستقبل کے تمام شبہات کو دور کرتے ہوئے انسانی مقصد زندگی پر ایسی مفصل روشنی ڈالتی ہیں کہ روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے اور جس سے دنیا و آخرت کی آسائش و آرام بھی حاصل ہوتا ہے۔

قرآن پاک کی تلاوت کیجئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسانی مقصد تخلیق کے متعلق خدائے تعالٰے نے بابانگ دہل اپنا یہ اظہار خیال کیا ہے کہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" یعنی انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت اور پرستش میں لگا رہے کوئی بھی مخلوق ہو اس کا مقصد تخلیق خود اس کی امتیازی فطرت یا خصوصیت کی ترقی و تکمیل ہے۔ آم کا کمال یہی ہے کہ بہتر سے بہتر آم کے اعلٰی صفات اس میں نمایاں ہوں۔ گھوڑے کا کمال اس کی فرسی صفات کی ترقی ہے اسی طرح آدمی کا کمال بھی انسانیت کی خصوصی و امتیازی فطرت کی ترقی و تکمیل کا نام ہے کھانے پینے اور رہنے سہنے اور جنسی خواہشات میں دوسرے جانوروں سے آگے نکل جانا مقصود نہیں ہے۔ جیسا کہ آج کل کے روشن خیال حضرات حصول دولت خواہ حرام طریقے سے ہو یا حلال طریقہ سے اور عیش و عشرت کے اسباب کی فراہمی کو

اپنا مقصد حیات سمجھتے ہیں اور مصرعہ :۔ بابر بہ عیش کوش
کہ عالم دوبارہ نیست کے پیش نظر اپنی ساری زندگی
لہو لعب میں ضائع کر دیتے ہیں

خدا کا شکر ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کے
لقب سے نوازا گیا ہے۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ نے انسان
کی پیدائش کا ملائکہ میں اعلان فرماکر جب انکو سجدہ
کرنیکا حکم صادر فرمایا اور انسان کی خاص خصوصیت
یہ بتائی کہ اس کے اندر "نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي"
میں نے خود اپنی روح پھونکی ہے اور اسے ایسے علوم
بتائے ہیں جنھیں تم نہیں جانتے علاوہ ازیں کل کائنات
میں اس کے خاص مقام کا یوں تعین فرمایا کہ میں اسے
زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں مندرجہ بالا خدائی
ارشاد کو مد نظر رکھتے ہوئے غور فرمائیں جو کسی کا خلیفہ
ہوگا تو اُس کے اندر کیا کیا صفتیں ہونی چاہئیں ؟ بس
یہی کہ اس خلیفہ بنانے والے کی خوشنودی مرضی اور مشیت
کے تابع رہے بلکہ اس میں اپنے کو فنا کر دینا اپنا فرض
منصبی سمجھے۔ یہی چیز عبادت، بندگی یا سرافگندی ہے۔
اسلام کے معنی بھی ایسی کامل سپردگی کے ہیں کہ بندہ خود کو
مالک کے حوالے اس طرح کر دے کہ مالک کی مرضی و
مشیت کے ساتھ پوری پوری موافقت ہو۔ عبدیت
کی اسی خصوصیت کو حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ
نے اپنے مواعظ میں جابجا ذیل کی اس مثالی حکایت سے
واضح فرمایا ہے :۔

"ایک شخص نے ایک غلام خریدا۔ خریدنے کے بعد
دریافت کیا کہ تمہارا نام کیا ہے ؟ اس نے جواب دیا کہ
حضور آج سے تو وہی نام ہے جس سے آپ پکاریں دریافت
کیا کہ کھایا کیا کرتے ہو ؟ کہا حضور آج سے کھانا بھی وہی
ہے جو آپ کھلائیں۔ دریافت کیا پہنا کیا کرتے ہو؟ کہا
آج سے پوشاک بھی وہی ہے جو آپ پہنائیں۔ پس معلوم
ہوگیا کہ عبدیت میں اپنی خودی کو فنا کر دینا ضروری ہے
آقا کمبل اڑھائیں گے تو کمبل اوڑھنا پڑے گا۔ دوشالہ
اڑھائیں گے تو دوشالہ اوڑھنا پڑے گا۔ گھی دودھ کھلائیں
گے تو گھی دودھ کھانا پڑے گا۔ بھوکا رکھیں گے تو بھوکا
رہنا پڑے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رزق و معاش
کی اسبابی فکر و تدبیر ترک کر کے اپاہجوں کی طرح گھر
بیٹھ جائے اور خود سے بھوک کو دعوت دے یا آسمان
سے خوان یغما کے اترنے کا انتظار کرے بلکہ ہمارے اندر
کسب و اختیار کی جو صفت ودیعت فرمائی ہے اس سے
کام لینا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ہی طلب رزق کی کوششوں
اور تدبیروں میں خلافت کی امانت سپرد کرنے والے خدا
کی مرضی اور منشا کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا ایک
طرف اگر صنعت و حرفت، زراعت تجارت، مزدوری
اور ملازمت وغیرہ معاشی اسباب میں ہمارے اختیار کو
کلی آزادی بخشی گئی ہے دوسری طرف ان اسباب کی
بعض صورتوں میں حلال و حرام جائز و ناجائز کی کچھ
شرعی پابندیاں عائد کی ہیں۔ ان کو بھی پیش نظر رکھنا
پڑے گا۔ ایسا نہ ہو وہ قادر مطلق مولیٰ ناراض ہو جائے۔
ان آزادیوں اور پابندیوں کو ساتھ ساتھ لیکر چلنے میں اگر
کبھی ہم کو بھوکا رہنا پڑے تو یہ سمجھنا درست ہوگا کہ ہمارا
پروردگار ہمارے بھوکا رہنے میں کوئی پرورشی مصلحت

کے تحت بھوکا رکھنا چاہتا ہے جس طرح طبیب کسی مریض کو
بعض اوقات بھوکا رہنے کی ہدایت کرتا ہے اگر اسی
آزادی اور پابندی کے تحت ہفت اقلیم کی سلطنت
مل جائے تو اس کو اپنا کارنامہ نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کو
بھی اپنے رب کا مشفقانہ عطیہ سمجھنا چاہیئے۔

اسلامی کتابوں کے مطالعہ سے یہ امر پایہ ثبوت
کو پہنچ چکا ہے کہ انسان کی انسانیت جب خود اس کے
خالق کی پھونکی ہوئی روحانیت اور اس کی عطا کی ہوئی
خلافت میں منحصر ہے تو لازماً اس روحانیت اور خلافت کا
پروان چڑھنا بھی اسی پروردگار کی بنائی اور بتائی ہوئی
راہ معیشت پر چلنے چلانے میں منحصر ہے جس نے اس کے
اندر خود روح پھونکی اور اس کے سر پر خلافت کا تاج پہنایا
غور کیجیے خدا کی ایک صفت ربوبیت ہے اور اس کے مقابل
ہماری صفت عبودیت ہے اور یہ صفت عبودیت جب تک
مکمل نہ ہوگی تو خلافت کی امانت وبال دوش بنجائیگی
اور ایک بات غور طلب ہے کہ جب خدائے تعالیٰ نے
انسان کی پیدائش کا مقصد عبادت وعبدیت قرار دیا
ہے اور یہ بھی صاف صاف اپنے بندوں کو بتا دیا کہ تمہارے
پیدا کرنے کی غرض رزق ومعاش کے مسائل حل کرانا نہیں
ہے بلکہ ہم نے تو صرف تم کو غلامی کے لیے انتخاب کیا ہے تاکہ
تم ہماری طرف سے زمین میں جانشین بنکر ہمارے احکامات
صادر کرو۔ رزق کیلئے تم مت گھبراؤ ہم نے ساری مخلوق کی
روزی کا ذمہ لیا ہے اور ہم ہی سب کو روزی پہنچانیوالے ہیں
اس کے برعکس ہم مسلمانوں کا غلط طریقہ کار دیکھیئے کہ روزی
کے معاملہ میں ہمارا اعتماد کامل خدائے تعالیٰ کی طرف سے

بالکل اٹھ چکا ہے ہم اپنی تدبیروں اور کوششوں پر بڑا ناز
کرتے ہیں اور اپنی کامیابیوں کو اپنی کوششوں کا ثمرہ سمجھتے
ہیں اگر کبھی ناکامی ہوئی تو اپنی تدبیروں اور کوششوں
کی خامیاں نکال کر اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں اس کے علاوہ
اپنے اعمال و افعال سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں
کہ دنیاوی زندگی اگرچہ مختصر ہے تاہم یہ عیش وعشرت کا
مقام ہے آرزوؤں اور تمناؤں کے پورا کرنے کی جگہ
ہے۔ بریں عقل ودانش بباید گریست۔

اس دنیا کی انفرادی زندگی خواہ وہ عمر نوحؑ تک بھی
پہونچ جائے اسے ایک دن فنا ہوکر رہنا ہے اس کے
بعد ہم کو جس نئی زندگی اور نئی دنیا میں داخل ہونا ہے۔
وہ تو کروڑوں اور عربوں سال باقی رہنے والی نہیں بلکہ
قطعاً غیر فانی اور لامتناہی ہے۔ دنیوی زندگی کے
متعلق خدائے تعالیٰ نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو
بتایا کہ اے محمدؐ کہہ دیجیئے کہ متاع دنیا تھوڑی ہے دنیا
کی زندگی دھوکہ ہے۔ دنیا کی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ
نہیں ہے اور آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے
اسلامی معاشیات پر خامہ فرسائی کرنیوالے بڑی دھوم
دھام سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب
انسان کیلئے پیدا کیا گیا ہے یہاں تک کہ زمین اور آسمان
میں جو کچھ بھی ہے وہ انسان کی خدمت کیلئے ہے مگر یہ بھول
جاتے ہیں کہ انسان بھی خدا کی مخلوق ہے اس کی تخلیق کی
کیا غرض ہے؟ ذرا قرآنی آیات کا مطالعہ کریں تو پتہ چلے
گا کہ خود انسان خدا اور آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو اسے
چاہیئے کہ دنیا کی چھوٹی اور بڑی چیز کو اس طرح استعمال

کرے جس سے خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح و نجات حاصل ہو۔

پس ایسے ارشادات الٰہیہ کے پیش نظر ہمیں چاہیے کہ دنیا کی اس مختصر سی زندگی کو آخرت کی کھیتی بنائیں اور متاعِ آخرت کے لیے نیک اعمال کی زادِ رہ جمع کریں۔ در حقیقت یہی خدا کی مرضی اور خوشنودی ہے اور یہی خدا کی بندگی ہے علاوہ ازیں شریعت نے انسانیت کا یہ بھی مفہوم سمجھایا ہے کہ انسان وہی ہے جس کے ہاتھوں اور زبان سے کسی کو تکلیف نہ پہونچے اور اس کے آڑے وقتوں میں ہاتھ بٹائے اور غریبوں یتیموں اور بیکسوں اور اداروں کے دکھ درد میں شریک ہو کر اسے دور کرنے میں حتی الامکان کوشش کرے پس معلوم ہوا کہ قومی فلاح و بہبودی خواہ وہ شفا خانے کی صورت میں ہو خواہ علوم دینی اور دنیوی کی اشاعت و ترویج کے لیے کتب خانے کی شکل میں ہو خواہ یتیم خانہ بنا کر یتیموں کی پرورش کی جائے خواہ اسکول و مدارس کی بنیاد ڈال کر لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم دلائی جائے اور خواہ پردہ نشین بیواؤں کے لیے ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں حصول معاش کیلئے صنعت و حرفت سکھائی جائے اسی طرح اور دیگر قومی فلاح و بہبودی کے کام ہیں جو عبدیت کے زریں کارنامے ہیں۔ اور آخرت کی بہترین زادِ راہ ہیں بشرطیکہ اس میں بھی خدا اور رسول کی رضا جوئی پیش نظر ہو ورنہ ذاتی مفاد اور ریاکاری سے خسرانِ عظیم اٹھانا پڑے گا۔

بہرکیف اگر ہم دنیا و آخرت میں سکون و سلامتی کی زندگی چاہتے ہیں تو اس قادرِ مطلق کی عبدیت قبول کریں جس نے ہم کو اسی کام کے لیے انتخاب کیا ہے اس کے اصول اور طریقہ صرف یہی ہے کہ جب ہم دنیا یا آخرت کا کوئی کام کریں تو سب سے پہلے یہ سوچیں کہ آیا یہ کام خدا کی مرضی کے موافق ہے یا مخالف؟ اگر موافق ہے تو دل و جان سے انجام تک پہونچائیں اگر مخالف ہے تو خدا کے غضب و قہر کا تصور کرتے ہوئے اس سے ایسے بھاگیں جیسے انسان سانپ کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔ پس وہی ہمارا مقصدِ زندگی ہے۔

وما علینا الا البلاغ۔

مصنف اچاریہ برہسپتی
مترجم ڈاکٹر م۔ م۔ حسن

خسرو ایک عظیم ہندوستانی ذہن

حضرت امیر خسرو کا نام زبان پر آتے ہی "خیال" گانے والے کہتے ہیں کہ "خیال" کے موجد امیر خسرو تھے، تو قوال قوالی کی ایجاد کا سہرا ان ہی کے سر باندھتے ہیں، ستار بجانے والے ماہرین کی رائے ہے کہ ستار حضرت امیر کی ایجاد ہے اور طبلہ پر تھاپ دینے والے بھی امیر کو ہی طبلہ کا موجد مانتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ تاریخ سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں، اسی لئے قابل معافی ہیں، لیکن جب ڈاکٹر نارائن مینن جیسے لوگ یہ کہتے ہیں کہ امیر خسرو ایران سے ہندوستان آئے اور بارہویں صدی عیسوی (؟) میں علاؤ الدین خلجی کے دربار کو رونق بخشی تو میرے جیسے لوگ متحیر رہ جاتے ہیں۔

جو لوگ امیر خسرو سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ امیر خسرو کے والد بھلے ہی ترکی ہوں لیکن ان کی والدہ خالص برج، ہندوستانی عورت تھیں، جن کے بطن سے ایٹہ ضلع کے پٹیالی نامی گاؤں میں امیر خسرو کی پیدائش ہوئی تھی، خسرو کی مادری زبان ہندی پدری زبان ترکی، مذہبی زبان عربی اور سرکاری زبان فارسی تھی وہ اپنی مادری زبان ہندی کے زبردست عاشق تھے۔

امیر خسرو نے ۱۳۱۹ء میں "نہ سپہر" لکھی اس وقت ان کی عمر تقریباً ۶۹ سال کی تھی، اس مثنوی میں مذکورہ تفصیل کی روشنی میں امیر خسرو کی تصویر کشی زیادہ موزوں اور مناسب ہوگی۔

خسرو کی نظروں میں ہندوستان کا کونہ کونہ علم وفن کا مرکز ہے۔ ہندوستانی ادباء اور علماء مختلف زبانوں کا صحیح تلفظ کر سکتے ہیں، علم و سائنس کی تلاش میں دور دراز سے بیرونی لوگ مدت مدید سے ہندوستان آتے رہے ہیں، ریاضی کی ایجاد کا سہرا ہندوستان کے سر ہے اس لحاظ سے پوری دنیا ہندوستان کی احسان مند ہے شطرنج کی ابتدا ہندوستان میں ہوئی، ہندوستانی علم ریاضی اور ہندی پنچ تنتر اور ہندوستانی ایجاد شطرنج نے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔

خسرو کے خیال میں ہندوستان پوری دنیا میں بہترین ملک ہے۔ یہاں کی آب و ہوا، یہاں کے پرندے اور پھل پھول بے نظیر ہیں، خطہ ارض پر ہندوستان جنت نظیر ہے اس لیے اول اول حضرت آدم نے جنت سے ہندوستان کی سرزمین ہی کو رونق بخشی، ہندوستانی پرندہ مور طائر بہشت ہے۔

ایسے خالص عاشق ہند میں اگر کوئی شخص پاکستانی نظریات کی تلاش کرے تو وہ قابل رحم ہے، خسرو کے خیال میں ہندوستانی برہمن ارسطو کے قانون کی دھجیاں اڑا سکتے ہیں، منطق فلسفہ و اخلاق میں یہ کامل ہیں، علم نجوم میں رومی اور یونانی عالم برہمنوں کے مقابلے میں کم سواد ہیں، لوگوں (مسلمانوں) نے ان سے حصول علم کی کوشش نہیں کی اس لیے ان پر حسرت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کوشش کی اور ان لوگوں نے مجھے اپنا احسان مند بنایا یہ لوگ خدا کو نرگن و نراکار[1] مانتے ہیں

ایسے علم کے رسیا اور برہمن بھگت کو اگر اورنگ زیب کے عہد کا فقیر اللہ کینہ پرور کہے اور انھیں عیاری سے گوپال نایک کو شکست دینے والا کہے تو تعجب ہونا ہی چاہیے۔

"مثنوی عشقیہ" میں امیر خسرو کا کہنا ہے کہ فارسی کے مقابلے میں ہندی کسی لحاظ سے بھی کم نہیں ہے جو نہیں سمجھتے وہ ناداں ہیں، ہندی تو عربی جیسی ہے کیونکہ ان دونوں میں کوئی زبان بھی ملی جلی نہیں ہے۔ ذخیرۂ الفاظ اور خیالات کے نقطۂ نظر سے بھی ہندی کم نہیں ہے۔ ہندی میں بہت سے ایسا الفاظ ہیں جو گو مختصر ہیں لیکن مضمون میں کافی وسعت اور گہرائی کے حامل ہیں، وہ قطرے میں سمندر کی طاقت رکھنے والے ہیں، جن لوگوں نے ہندوستان کی گنگا کو نہیں دیکھا ہے جو لوگ ہندی کی اہمیت سے واقفیت نہیں رکھتے وہ نیل اور دجلہ پر فخر کر سکتے ہیں، جنھوں نے صرف بلبل کے حسن کو دیکھنا سیکھا ہے وہ ہندوستان کے طوطے کی اہمیت کو کیا سمجھ سکتے ہیں، میں ان تینوں زبانوں (ہندی، فارسی، عربی) کو جانتا ہوں اس لیے ایسا کہہ رہا ہوں،

شیخ نظام الدین چشتی کی پیدائش بدایوں میں ہوئی تھی وہ بھی ہندی زبان میں شعر و شاعری کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتے تھے، ان کی درگاہ میں بھی خاص خاص موقعوں پر خسرو کی کچھ غزلیں گائی جاتی ہیں "اے ماں رنگ ہے" "موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے نظام پیا" جیسی تخلیقات میں برج کا رنگ صاف نمایاں ہے تو "بہت کٹھن ہے ڈگر پن گھٹ کی" پر پنگھٹ لیلا، کا اثر ظاہر ہے۔ "عرب پار توری بسنت مناؤں" بسنت پنچمی کے موقع پر گایا جاتا ہے، یعنی بسنت خسرو کے ذریعہ چشتی سلسلہ تک پہونچ گیا ہے۔ "چھاپ تلک سب چھینی رے مون سے نیناں ملا کے" میں خارجی تعلقات کا ترک ہے تو "میں نظام سے نینا لگا۔ آئی رے" میں محبوب کی لگن ہے یہ محبوب خالص ہندوستانی ہے،

"نہ سپہر" میں امیر خسرو نے کہا ہے کہ ہندوستانی موسیقی اس قدر پُر اثر ہے کہ ہرن جیسے جانور بھی غیر شعوری

[1] میں نے نرگن اور نراکار کا لفظ جیوں کا توں اس لیے رہنے دیا کہ اس سے خدا کے بارے میں اُن کے تصور کا علم ہو"

طور پر، اس سے متاثر ہوکر خود کو صیاد کے حوالے کر دیتے
ہیں، ہندوستانی موسیقی دنیا کے تمام ممالک کی موسیقی
کے مقابلے میں آگے ہے، بہت سارے غیر ملکی ہندوستانی
موسیقی سیکھنے کیلئے ہندوستان آئے لیکن وہ ہندوستانی
موسیقی پر مکمل عبور حاصل نہ کر سکے۔

ہندوستانی موسیقی کے زبردست عاشق امیر خسرو
نے ہندوستانی موسیقی کے بارے میں ان خیالات کا
اظہار اپنی عمر کے آخری حصے میں کیا ہے۔ ان حالات میں
اگر کوئی یہ کہنے کی جرأت کرے کہ انھوں نے ہندوستانی
موسیقی کی زبان میں کوئی تبدیلی پیدا کی تو اسے یہی کہا جائے
گا کہ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

۴۴ سال کی عمر سے ۴۹ سال کی عمر تک امیر خسرو
شہزادہ محمد کی خدمت میں ملتان رہے، جہاں مشہور صوفی
صوفی شیخ بہاؤالدین کی روایت کا اثر وہاں کے دربار
پر بھی تھا، شیخ ذکریا کے لڑکے شیخ فدوہ کا اسوہ شہزادہ محمد کو
حاصل تھا۔ جو خود ہی ماہر موسیقی اور نغمی تھے، شہزادہ
محمد سماع کا دلدادہ تھا، اور اس کی محفل سماع میں شیخ
فدوہ پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، ملتان
میں ہی غالباً امیر خسرو کو ایرانی موسیقی کے اصولوں سے
واقفیت ہوئی

کیقباد اور اس کے والد بغرا خان کی صلح کا تذکرہ۔
خسرو نے اپنی تصنیف قرآن السعدین" میں کیا ہے اس میں
میں خسرو نے کہا ہے کہ "مجھے ایرانی موسیقی کے چار اصولوں

ملے مصنف نے دس سہاس کا لفظ استعمال کیا ہے، م ح ملے مصنف
نے ناچنے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ م ح

بارہ پردون اور..... کا علم ہے" اس وقت خسرو کی عمر
۴۷ سال تھی۔

کیقباد کے زمانے میں پورے ملک سے ہندوستانی
فنکار دلی پہونچنے لگے تھے، ان کی معیت میں خسرو ان سے
اچھی طرح مستفید ہوئے۔

"فتوحہ" اور "نصرت خاتون" جیسی مغنّیہ اور محمد شاہ
جنگی جیسے مغنی اور طبلہ کے ماہر جلال الدین خلجی کے دربار سے
وابستہ تھے، جن کے ساتھ امیر خسرو کا قریبی تعلق تھا۔

علاؤالدین خلجی کے زمانے میں گجرات کی "پرواز"
نامی ذات کے بہتیرے لوگ دلی جا کر بس گئے تھے۔ شیخ
فریدالدین کے عرس کے موقع پر ہونیوالی محفل سماع میں
ہندوستان کے مختلف صوبوں کے بے شمار مغنی شریک
ہوتے تھے۔

۱۳۰۷ء میں علاؤالدین خلجی کے بیٹے خضر خاں کا
عقد دیول دیوی کے ساتھ ہوا، اس موقع پر جنوب
کے بھی بہت سارے فنکار دلی پہونچے، غالباً اس موقع
پر گوپال نایک بھی دلی آئے اور علاؤالدین کے دربار
میں ان کی عزت افزائی ہوئی

گوپال نایک ایک مشہور پربندھ[1] گار تھے وینکٹ
مرکھی نے انھیں چتر دنڈی فرقہ کا موجد بتایا ہے الاپ
ٹھائے، گیت اور پربندھ، ان چار ستونوں کا موسیقی
کا سرا گوپال نایک نے باندھا، شالی ہند میں الاپ
ٹھائے اور گیت کے لفظ تو جیوں کے توں ہیں لیکن
پربندھ کا ترجمہ بندش ہو گیا ہے؛

ملے پربندھ۔ موسیقی کی ایک قسم ہے،

ظاہر ہے کہ گوپال نایک ایرانی موسیقی کے ماہر نہ تھے اسی طرح خسرو کو ہندوستانی علم موسیقی کا کوئی علم نہ تھا لہٰذا دونوں نے مل کر راگوں کی تقسیم کے لیے ایک ایسا طریقہ کار اپنایا جس میں ایرانی اور ہندوستانی دونوں ہی طرح کے راگوں کی تقسیم و تفریق کی جا سکے۔

امیر خسرو کے انتقال سے صرف بارہ سال پہلے یہ طریقہ جنوبی ہند میں رائج ہو چکا تھا جس میں "میل"[1] پدھتی کہلائی، اور شمالی ہند میں "سنستھان پدھتی" اور یہی آج کی ٹھاٹھ ہے۔ ہندوستانی علم موسیقی میں امیر خسرو کی یہی امتزاجی کوشش کافی اہمیت کی حامل ہے۔

ابوالفضل نے امیر خسرو کو قوال اور ترانہ کا موجد کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کام انھوں نے "سمیتی" اور "تاتار" کی مدد سے کیا۔ سمیتی کا مطلب بھارتیہ گیوں کی گوشٹھی ہے "ترانہ" "نیگت" کی ہی ایک قسم ہے اور "قول" ایک خاص پربندھ (بندش) کا نام ہے

امیر خسرو سے بہت پہلے قاضی حمید الدین ناگوری کے قوال محمود کی کافی شہرت تھی، شمس الدین التمش کے دربار میں اس نے قوالی گا کر قاضیوں کا منہ بند کر دیا تھا، اس زمانہ میں شیخ معین الدین چشتی اجمیریؒ بھی زندہ تھے لہٰذا امیر خسرو کو قوالی کا موجد نہیں مانا جا سکتا ہے۔

دلی کے کسی بھی بادشاہ کے دربار میں کسی ستار بجانے والے کا تذکرہ نہیں ملتا، امیر خسرو کی تخلیقات میں بھی کہیں ستار کا تذکرہ نہیں ہے شہنشاہ شاہ عالم نے نوادرات شاہی (۱۷۹۸) میں ستار کا موجد نعمت خاں سدا رنگ کے بیٹے بھائی خسرو خاں کو بتایا ہے جس نے محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں ستار ایجاد کیا۔ اس کا یہ نام تو اور بھی بعد میں رکھا گیا، "معدن الموسیقار" (۱۸۴۵) کے مصنف محمد کرم امام نے خسرو خاں کو غلطی سے امیر خسرو لکھ دیا۔

محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک کسی طبلہ بجانے والے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ طبلہ کی ایجاد اس زمانے کے بعد اور بہت بعد دلی میں ہوئی ہے۔

بہت ساری چیزوں کی ایجاد و آغاز کا غلط سہرا باندھنے کی ذمہ داری محمد کرم امام پر عائد ہوتی ہے جن کی علم تاریخ سے واقفیت نہیں کے برابر ہے۔

خسرو کے ہاتھوں گوپال نایک کی عیارانہ شکست کا قصہ "نغمات رنگ زیب" کے مصنف فقیر اللہ کے تخیل ... پرواز ہے اسی طرح گوپال نایک کے ہاتھوں خسرو کی شکست کی کہانی جو داسو دیو شاستری نے بیان کی ہے وہ فقیر اللہ کی من گھڑت کہانی کا رد عمل ہے،

بابا فرید الدین گنج شکر کے دو پوتے خواجہ محمد امام اور خواجہ محمد موسیٰ موسیقی کے ماہر اور رسیا بڑے مصنف اور خوش گو تھے یہ دونوں امیر خسرو کے استاد بھائی تھے۔ اور ان کی تعلیم و تربیت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے زیر سایہ ہوئی تھی۔

خسرو نے راگوں کی جو تقسیم کی اسے دربار میں قبولیت بخشی گئی، لیکن ماہرین کا ایک بہت بڑا طبقہ ناخوش بھی تھا کیونکہ راگوں کی اس نئی تقسیم کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے سنگیت رتناکر، جیسی اہم تصنیف پردہ گمنامی میں جا پڑی اور ہندوستانی

---

[1] میرے خیال میں اس کا ترجمہ "ملا جلا طریقہ" یا "مندہ راگ" ہونا چاہیے
[2] اس لفظ کا ترجمہ لغت میں بھی نہیں ہے

علم راگ اپنے ماضی سے بالکل کٹ گیا۔

دلی دربار، وجے نگر دربار، اور بھی دربار میں خسرو گے ان راگوں کو جب اندر پرست فرقہ کے نام کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہو گئی تب ویدوں سے متعلق "گرام مورچھنا پدھتی" کی حقیقت اور اہمیت جاننے والے خال خال ہی رہ گئے

رامپوری روایات کے ماہرین کے مطابق موجودہ "بھیرو" کو اول راگ کی حیثیت عطا کرنیوالے امیر خسرو ہیں، اگرچہ اس راگ میں مستعمل سُر کسی بھی لحاظ سے اصل یا صحیح سُر نہیں ہیں، سولہویں صدی عیسوی سے اس راگ کا سُر جنوبی ہند کی راگوں کی تعلیم کی بھی بنیاد بن گئیں،

"ایمن" عربی لفظ ہے جس کے معنی سلامتی[1] کے ہوتے ہیں۔ رات کی ابتدا ہوتے ہی شمالی ہند کے گویئے ایمن گایا کرتے ہیں اسے پرتھم ٹھاٹھ کہا جاتا ہے، اگرچہ اس راگ کے سُر بھی کسی طریقہ کے اصل یا صحیح سُر نہیں ہیں۔ یہ راگ امیر خسرو کی دین کہا جاتا ہے جونپور صوفی گویئے خود کو امیر خسرو کی روایات کا نمائندہ بتاتے تھے مغل شہنشاہ بابر کے ایک امیر شیخ گھورن مشہور گویئے تھے ان کے شاگرد شیخ ادھن تھے شیخ ادھن کے شاگرد ذبجھو نے ۱۵۷۵ء میں اکبری دربار کے تمام ماہرین کو مقابلے کے لیے للکارا تھا۔ "منتخب التواریخ" میں اکبری دربار کے مشہور تاریخ داں ملا بدایونی نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] مصنف نے "منگل" کا لفظ استعمال کیا ہے' م، ح

صابر سنبھلی ایم، اے

مومن کی بسیار دانی

؎ کیونکر نہ غم ہو خلق کو مومن کی مرگ کا
تھا سب کو اُس کی ذات سراپا ہنر سے فیض

ادب نثری ہو یا شعری انسانی جذبات یا احساسات خیالات افکار اور تجربات کا اظہار رہے۔ اس کو تفصیل سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شخص یا فرد کے احساسات و وار دات قلبی یا اُس کے ذہنی خیالات بشمول افکار و تجربات کا خوش کن اور مستحسن انداز میں ابلاغ یا دلکش پیرایہ بیان میں ادا کرنے کا نام ہی ادب ہے۔ بشرطیکہ اُس کا کوئی انسانی مصرف بھی ہو یعنی مقصدیت سے خالی نہ ہو مقصدیت ہر طرح کی ہو سکتی ہے۔ دل کو سرور یا سکون بخشنے سے لیکر زندگی کے بڑے سے بڑے مسئلہ کا حل بھی اس میں شامل ہے۔

کسی زبان کے ادب میں مذکورہ بالا کیفیات میں سے کسی کی فراوانی ہوتی ہے یا موضوعات اظہار میں سے کسی کی کثرت ہوتی ہے یہ اُس زبان اور اُس کے بولنے والوں کے مزاج، ماحول، خارجی اثرات، داخلی خصوصیات وراثت، زبان کے سرچشموں اور بولنے والوں کے تمدن۔ تہذیب، رسم و رواج، مذہب عقائد، روایات، ذہنی و طبعی رجحانات، ور ضروریات زندگی پر منحصر ہے اور کبھی کبھی اظہار کے موضوعات وقت اور زمانے کے اثرات سے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک زبان جس کا ادبی موضوع اظہار کسی وقت مذہب رہا ہو بعد کو کسی وقت عشق بھی اُس کی جگہ لے سکتا ہے۔ اور کبھی وقت کے تقاضوں کے زیر اثر اخلاق یا فلسفہ وغیرہ کی بھی اختراط ہو سکتی ہے علیٰ ہٰذ القیاس۔

اُردو شاعری کا سرچشمہ چونکہ فارسی شاعری ہے۔ اس لیے اس کی عشقیہ روایات کا اردو میں آجانا ناگزیر تھا۔ دوسرے یہ مذہبی بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ اس لیے ایک وقت ایسا آیا کہ اس میں مذہب کا عنصر اگرچہ غالب تو نہ آ سکا لیکن اُس کا جزو لاینفک ضرور بن گیا۔ اور اب تک اُردو شاعری کی تلمیحات اور استعارے اُس کے غماز ہیں۔ لیکن اولاً ایرانی شاعری سرچشمہ ہونے کی وجہ سے

ثانیاً کبھی اپنے ملک کی خوشحالی کے سبب عیش و عشرت کی فراوانی اور کبھی معاشی بدحالی کے سبب اخلاقی پستی اور تنزل کے باعث عشق ہر دور میں کثرت سے اسکا موضوع اظہار رہا۔ چنانچہ اردو شاعری کا بڑا حصہ غزل کے دواوین کی شکل میں پایا جاتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وقت کے تقاضوں عصری ماحول کے زیر اثر اس میں دوسری چیزیں بھی شامل ہوتی رہیں اور غزل کلیتہً اور اصلاً اپنے لغوی معنوں کے حصار میں محصور نہ رہ سکی

مختصراً اتنا عرض کر دینے کے بعد کہ ادب کے موضوعات مختلف بھی ہوسکتے ہیں اور بدل بھی سکتے ہیں اب ہم "می آئیم برسر مطلب" کے مطابق نفس مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

ہندی شعرا کے سلسلے میں برج بھاشا کے ایک مشہور و معروف شاعر ہوئے ہیں نہاری لال یا بہاری داس المعروف بہ بہاری۔ ان کے دوہوں کا ایک مجموعہ بہاری ست سئی کے نام سے مشہور ہے جس پر ان کی شہرت کا دار و مدار ہے۔ اسمیں کل ملاکر سات سو انیس دوہے اور سورٹھے ہیں جو ہزاروں دوہوں اور سورٹھوں کا انتخاب ہیں۔ گویا بہاری ست سئی مرزا غالب کے دیوان ریختہ کی طرح ایک انتخاب ہے بلاشبہ یہ مجموعہ برج بھاشا شاعری کے سلسلہ کا شاہکار ہے۔ جس کی تقریباً پچاس سے اوپر ٹیکائیں (شرحیں) اور تنقیدیں لکھی جا چکی ہیں۔ جن میں سے ایک فارسی زبان میں بھی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر میں یہ بات مشترک پائی جاتی ہے کہ شارحین اور ناقدین ست سئی نے بہاری کی بسیار دانی बहुज्ञता پر بہت زور دیا ہے۔ ہندی کے اس لفظ کا ترجمہ کثیر دانی یا وافر دانی بھی کیا جاسکتا ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ قابل غور ہے۔ بہاری عہد شاہجہاں کے شاعر ہیں ان سے قبل بھی برج اور اودھی میں (جن کو ہندی ناقدین ادب اور مورخین ادب پر بنائے مصالح چند ہندی ادب میں ہی شمار کرتے ہیں) بہت سے شاعر ہو چکے ہیں اور اُن کے بعد برج اور جدید ہندی کے شعرا کی تعداد بلا مبالغہ ہزاروں تک پہونچ چکی ہوگی لیکن ہندی ادب کے کسی تاریخ یا تذکرہ میں اس سلسلے کے کسی شاعر کی بسیار دانی پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا بہاری کی بسیار دانی پر دیا گیا ہے۔ یہ بات تعجب سے خالی نہیں اس سے صرف دو ہی نتیجے مرتب ہوسکتے ہیں کہ یا تو بہاری کے ماقبل اور مابعد کے شعرا شاعری کے علاوہ دوسرے علوم سے بیگانہ محض تھے۔ یا ان کو اگر دوسرے علوم کی کچھ واقفیت تھی بھی تو وہ اُس کے شعری اظہار پر قادر نہ تھے۔ ایک تیسری ناقابل قبول توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شعرا ما سوائے بہاری نے اس پر توجہ دینا ہی ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اس توجیہ کو عذر لنگ سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

بہر کیف اصل سبب جو بھی رہا ہو ہمیں اس سے غرض نہیں اس کے اسباب و علل میں سر کھپانا ہندی ناقدین ادب کا کام ہے۔ ہمیں تو یہاں صرف ایک بات کہنا ہے۔ کہ اُردو شعرا کے سلسلہ میں ایسے شعرا کی کمی نہیں جن کے اشعار میں متعدد علوم و فنون کا اظہار ہوا ہے۔ بلاشبہ اگر ابتداء تا امروز اردو شعرا کے دواوین کا اس غرض سے مطالعہ کیا جائے تو شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر بہاری جیسی نہیں تو اُن سے کچھ کم وافر دانی اردو کے ہر صاحب دیوان شاعر میں مل سکتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ غزل کا تنوع اور اس کی

گارنگی باوجود اس کے محدود میدان ہونے کے اس کے متقاضی
ہی ہیں۔ ناقدین ادب اگر اس طرف توجہ فرمائیں تو قابل قدر
کام ہو سکتا ہے۔ اور اس کی ایک صورت یہ بھی ممکن ہے
کہ تحقیق کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا جائے یہ چیز کام
کرنے کیلئے قوی محرک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ غزل کے دواوین
کے علاوہ اردو قصائد پر بھی اگر اس روشنی میں نظر ڈالیں تو
ان کی تمہیدوں میں بالخصوص اور دوسرے اجزاء میں بالعموم
علوم و فنون کے ایسے بیش بہا اور نادر جواہر دستیاب ہوںگے
جن سے اہل نظر کی آنکھوں کو مزید بصیرت حاصل ہوگی صرف
یہی نہیں اصناف سخن پر کچھ موقوف نہیں بلکہ ان کے علاوہ دیگر
اصناف سخن میں بھی جگہ جگہ ایسی بہت سی چیزیں مل سکتی ہیں۔

اس مختصر مضمون میں تمام اردو شعرا کا جائزہ لینا مقصود
نہیں اور نہ ایسا ممکن ہی ہے اس لیے یہاں اُردو کے صرف
ایک شاعر حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی کے غزلوں کے دیوان
پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے صنف غزل میں علوم و فنون کے
بیان میں اُردو تو کیا فارسی میں بھی (انوری ابیوردی کے علاوہ
مومن کی نظیر نہیں ملتی۔ (اُن کے قصائد اور مثنویوں کا تجزیہ
انشاءاللہ بعد میں آئے گا۔)

مومن کو میں نے اس لیے منتخب کیا ہے کہ مومن اور
بہاری میں علاوہ بسیار دانی کے دیگر اور بھی کئی خصوصیات
میں مماثلت تامہ پائی جاتی ہے۔ اور بلا شبہ مومن کسی میدان
میں برج بھاشا کے اس قابل فخر شاعر کے شانہ بشانہ نظر
آتے ہیں تو کہیں اگر پیچھے رہ گئے ہیں تو دوسری جگہ سبقت بھی
لے گئے ہیں میرا مقصد ان دونوں عظیم شعراء کی شاعری کا تقابل
ہے جس کی یہ پہلی قسط تصور کی جاسکتی ہے۔

بہاری اور مومن کے تقابل سے قبل یہ عرض کر دینا
ضروری سمجھتا ہوں کہ ان دونوں بزرگوں کی شاعری میں بسیار
دانی کی بحث کے دوران ایک بات ذہن میں رکھنا ضروری
ہے کہ مومن غزل کے شاعر تھے اور انھوں نے غزل کہتے وقت
اس بات کی کوشش کی ہے کہ غزل اپنے لغوی اور اصطلاحی
دونوں معنوں میں غزل ہی رہے۔ اس کے برخلاف بہاری
کسی ایک موضوع کے پابند نہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا
اور محسوس کیا یا جس کی ضرورت سمجھی اس کو بغیر کسی روک
ٹوک کے کہہ دیا اس طرح اُن کی شاعری میں متعدد علوم کا
آجانا ناگزیر ہے۔ مگر مومن کی شاعری میں اور خصوصاً غزل
میں دیگر علوم کا اظہار ہو، نا تعجب کی بات بھی ہے اور اُن کی
چابک دستی کا ثبوت بھی جنھوں نے اپنی واردات قلبی کے سچے بیانات
میں غزل کی روایت سے انحراف نہ کرتے ہوئے بھی مختلف فنون
کو غزل کے مضامین میں اس طرح سمو دیا ہے کہ وہ بے جوڑ پیوند
نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ بیشتر اس کے اجزا بن گئے ہیں۔ نہیں کہا
جاسکتا کہ اس طرح اور نہ جانے کتنے علوم جن کا وہ اظہار کرنا
چاہتے تھے تغزل کی محدود فضا میں نہ سما سکنے کی وجہ سے اُن
کے دل اور دماغ میں ہی ناکام حسرتوں کی طرح دم توڑ گئے
ہوں گے۔

میرے سامنے اس وقت ست سئی کی دقیع تنقید "بہاری
ست سئی دیگیانک سمیکشا" (بہاری ست سئی۔ سائنٹفک
تنقید) مصنفہ ڈاکٹر گنپت چندر گپت ہے۔ جس میں انھوں نے
"بہاری ست سئی۔ بودھک پکش" (بہاری ست سئی۔ عقلی پہلو)
عنوان کے تحت اس مضمون پر مختصر بحث کی ہے۔ انھوں نے
ست سئی میں عقلی پہلو کو جن دس عنوانات پر تقسیم کیا ہے وہ

یہ ہیں۔

۱ فلسفہ ۲ مذہب ۳ سیاست ۴ نجوم ۵ طب ۶ علم الاخلاق ۷ علم الشعر ۸ علم شہوانی ۹ علم ہندسہ ۱۰ علم صنعت اوران تمام علوم کے تحت کل ملاکر ۱۱۴ دوہے اور ۲۰۰ سوانگے مثال میں پیش کئے ہیں ۔ فلسفہ زندگی سے متعلق بہاری کے خیالات پر الگ سے عنوانات قائم کر کے انھوں نے مفصل بحث کی ہے ۔ جس میں انھوں نے ۵۱ دوہے اور ایک سو اٹھا ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ ڈاکٹر لکھن لال شرما نے قسمردہ بالا عنوانات کے علاوہ ایک عنوان سائنس اور بڑھا دیا ہے ۔ مگر انھوں نے اس کی مثال میں ایک تو وہی دوہا پیش کیا ہے جس کو ڈاکٹر گنپت چندر نے علم صنعت کے تحت پیش کیا ہے اوراس کے علاوہ انھوں نے ایک دوہا اور بھی پیش کیا ہے جس کی تفصیل آگے اپنے موقع پر آئیگی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ موتمن پیش کردہ بالا عنوانات کے تحت کس حد تک علوم وفنون کا اظہار اپنی غزلوں میں کر سکے ہیں۔ تقابل ڈاکٹر گنپت چندر گپت کی ترتیب سے ہی کیا جائے گا۔

۱ فلسفہ اور فلسفہ زندگی :۔

ڈاکٹر گنپت چندر گپت صاحب نے بہاری ست سے ۱۱۱ دوہے اور ۲۰۰ سوانگے مثالاً پیش فرمائے ہیں جن سے بہاری کی فلسفہ دانی کا وافر ثبوت ملتا ہے ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب مذکور نے کمال احتیاط اور دیانت سے یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ بہاری نے اس قسم کے مباحث سے پہلوتہی کی ہے ۔ اور ساتھ ہی انھوں نے بطور ثبوت ست سئی میں بیان ہوئے فلسفہ زندگی کے مسائل میں بہاری کی تضاد بیانی کو بھی واضح کر دیا ہے اس کے باوجود بھی ہم بہاری کی فلسفیانہ معلومات سے انکار نہیں کر سکتے یہ الگ بات ہے کہ بہاری کے دوہے کسی حد تک ہی فلسفیانہ ہیں ۔ بعض بعض جگہ تو شرح کرتے وقت دوہے کو توڑ مروڑ کر فلسفہ کے قالب میں ڈھالنے کی سعی لاحاصل کی جاتی ہے ۔ اگر ہم بھی ایسا ہی کریں تو موتمن کے دیوان میں فلسفیانہ اشعار تلاش کرنے میں ہمیں مایوسی نہ ہوگی جیسے ؎

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی
ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے یا

؎ کرہ خاک ہے گردش سے تپش میں میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں بھی آزاد رہا

لیکن ایسی توڑ مروڑ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتی ۔ ہم نہایت ایمان داری سے اعتراف کرتے ہیں کہ موتمن کی غزلوں میں فلسفیانہ اشعار کا فقدان ہے ۔ اوراس سلسلہ میں وہ یقیناً بہاری سے پیچھے ہیں لیکن اس سے موتمن کی فلسفہ سے عدم واقفیت کا ثبوت ہرگز نہیں نکلتا ۔ یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ موتمن غزل کہہ رہے تھے اگر ان کی غزلیں فلسفیانہ اشعار سے خالی ہیں تو اس کو اُن کی عدم فلسفہ دانی کی دلیل قرار دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ موتمن بڑے فاضل شخص، تھے عربی کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے ۔ اور عربی کی درسی کتب میں زمانہ کتب فلسفہ کی سمولیت رہی ہے اُن کی فہم وذہانت بھی اس غضب کی تھی کہ اگر انھوں نے فلسفہ کی تعلیم باقاعدہ نہ بھی حاصل کی ہوتی تب بھی اُن کا رسا اور ذکا ذہن فلسفیانہ نکات

از خود پیدا کرسکتا تھا۔

فلسفیانہ اشعار نہ کہنے کی وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اردو غزل گوئی میں فلسفیانہ اشعار کی ابتدا باقاعدہ طور پر مرزا غالب نے کی جس کو اس زمانے میں قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھا گیا۔ مومن چونکہ ان کے ہمعصر تھے۔ اس لئے یہ تعجب نہیں کہ اسی وجہ سے مومن نے اپنی غزلوں میں فلسفہ کو جگہ نہ دی ہو۔ پھر بھی ہم کو یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ پیش نظر تقابل میں بہاری، مومن سے آگے ہیں۔

۲۔ مذہب:-

ڈاکٹر صاحب مذکور نے بہاری کی مذہبی معلومات کے اظہار کی خاطر دو دوہے پیش فرماتے ہیں پہلے کا مفہوم ہے۔

"ذکر، تسبیح، تشقہ، وغیرہ سے کوئی کام سرانجام کو نہیں پہنچتا۔ اگر دل میں خامی ہے تو کیرتن وغیرہ میں اس (دل) کا ناچنا یا وجد کرنا فضول ہے۔ خدا تو سچائی سے ہی ملتا ہے"

اور دوسرے دوہے کا مفہوم ہے

"لوگ اپنے اپنے عقائد میں الجھ کر ان کی تائید اور حمایت میں فضول شور وغل کرتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ تمام ہی لوگ مختلف قوانین اور اطوار سے ایک ہی نند کشور (کرشن جی) کی سیوا کرتے ہیں یا ان کو پوجتے ہیں"

ان دوہوں کے علاوہ ست سئی میں بہاری کی مذہبی معلومات کے مظہر اور بھی بہت سے دوہے ہیں جن میں سناتن ہندو دھرم کے بہت سے مسلمات، مذہبی تلمیحات اور مذہبی اشارے موجود ہیں بھگتی کے دوہے اس قبیل کے ہیں جن کی تعداد خاص ہے لیکن ان میں سے تقریباً آدھے دوہے کرشن جی کے مناقب اور مناجات میں لکھے گئے ہیں۔ ان سب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہاری کی مذہبی معلومات سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر اس چیز کا پھر بھی کسی حد تک فقدان محسوس ہوتا ہے جس کو مذہب کی عمیق اور وسیع معلومات کہا جاسکے۔ تلمیحوں اور اشاریوں میں گہرائی کے بجائے عمومیت پائی جاتی ہے۔

اس موضوع کو لیکر مومن کا مطالعہ کیجئے تو ایک سے ایک عمدہ حقیقت کا بیان ان کے یہاں ملے گا۔ وہ صرف اوپری باتیں نہیں کرتے بلکہ ان کو پڑھ کر ہمیں مومن کی مذہبی معلومات کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ منتخب اشعار کو ہم دو ہی عنوانات کے تحت درج کرتے ہیں۔

(الف) علم القرآن:-

ع ذکر شراب و حور کلام خدا میں دیکھ
مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

شراب اور حور کا ذکر کلام الہی میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مومن کا مطالعہ قرآن کافی گہرا ہے ان کی غزلوں میں اور بھی متعدد مقامات پر قرآنی مضامین سے استفادہ کیا گیا ہے

ع جلتا ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے
مومن غضب ہے لذت آتش فزائے داغ

ارشاد باری تعالیٰ ہے كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ۔ پارہ ۵ رکوع ۵۔ آیت ۵۶ (جب کبھی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کے سوا اور کھالیں انھیں بدل دیں گے کہ عذاب کا مزہ لیں)

مومن نے مذکورہ شعر میں اسی آیت کے مضمون سے استفادہ کیا ہے

ع واعظ بتوں کو خلد میں لیجائیں گے کہیں
ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

کافروں کا قرآن میں جگہ جگہ عذاب الیم سے ڈرایا گیا ہے اور اُن کا ٹھکانا دوزخ فرمایا گیا ہے۔ "وعدہ" سے وعید بھی مراد لے سکتے ہیں۔ یقیناً شاعر کے ذہن میں اس آیت کا مفہوم بھی ضرور رہا ہوگا۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ج أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ٥ (تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ تیار رکھی ہے کافروں کے لیے پارہ ۱ رکوع ۳ آیت ۲۴) اور مصرع اولیٰ میں آئے لفظ "بتوں" کے سننے سے ذہن میں فطری طور پر پتھر کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

دست قاصد کاٹے کیوں ثابت ہے کیا
دزدیٔ مضمون مرے طومار سے

قرآن میں ہے" وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا أَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ " (اور جو مرد یا عورت چور ہو تو اُن کا ہاتھ کاٹو اُن کے کیے کا بدلہ اللہ کی طرف سے سزا پارہ ۶ رکوع ۱۰ آیتہ ۳۸)

چوری کی قرآنی سزا قطع ید ہے یہاں یہی مضمون شاعر کے پیش نظر ہے۔

دیت میں روز جزا لے رہیں گے قاتل کو
ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

اسلامی قوانین میں خون کا بدلہ خون ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى (اے ایمان والو تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں اُن کے خون کا بدلہ لو۔ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت پارہ ۲ رکوع ۶ آیتہ ۱۷۸)

اور مومن نے اپنی عاشقانہ طبیعت کی بدولت اس مضمون سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ عاشق کا خون ناحق ہوتا ہے اس لئے ہم آزاد کے بدلے آزاد مصداق اپنے قاتل یعنی معشوق کو ہی خون بہا میں لے لیں گے گویا اس طرح ہماری جان کے جانے میں بھی نقصان کا سودا نہیں ہے اس شعر کے علاوہ بھی مومن نے دیت کے لفظ کو استعمال کیا ہے۔

(ب) علم الحدیث :-

زمانہ مہدیِ موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے کہیو تم سلام پاک حضرت کا

حضرت کا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام حضرت امام مہدی کو۔ رسول اللہ کی ایک حدیث میں یہ مذکور ہو رہے۔

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ
آکے مری نعش پہ وہ رو گیا

بُرا ہے عشق کا انجام یارب
بچانا فتنہ آخر زماں سے

دونوں شعروں میں ایک ایک حدیث کا مفہوم نظم ہے

(ج) عام مذہبیت :

جب تو چلے جنازہ عاشق کے ساتھ ساتھ
پھر کون وارثوں کے سنے اذان عام کو

وہی مذہب ہے اپنا بھی جو قیس و کوہکن کا تھا
نئی راہ اختراع ہے کب بھلا مومن نے بدعت

؎ غرلق گریہ خوہیں سہا نہ کر مومن
لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سُرخ

؎ دربان کو کم نے دینے پہ میرے نہ کیجیے قتل
ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

؎ اُس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

میرا خیال ہے کہ مومن کی مذہبی معلومات کا ثبوت دینے کیلئے اتنے اشعار ہی کافی ہیں ورنہ اگر ایسے اشعار جن میں صرف کوئی مذہبی لفظ تلمیح یا کوئی اشاریہ ہو کو جمع کیا جائے تو مومن کا ایک چھوٹا سا انتخاب دیوان تیار ہو جائے گا۔ اُن کی مذہبی معلومات کا اظہار کرنے والے اور اشعار دیوان مومن مرتبہ و مشرحہ جناب پروفیسر ضیا احمد صاحب بدایونی کے مقدمے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اکثر مقطعوں میں بھی مذہبی جھلکیاں موجود ہیں۔

سیاست :۔

بہاری درباری شاعر تھے۔ اس لئے اُن کی سیاسی معلومات کم نہ تھی۔ دوسرے اُس وقت کا ہندوستان سیاسی جنگوں کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ اس لیے اُن کے دوہوں میں سیاست کے مضامین ملنا تعجب کی بات نہیں ہو سکتی۔ چونکہ بہاری کے فن کے اظہار کا سبب بھی درباری انعام ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مرزا راجہ جے سنگھ اُن کے ہر دوہے پر ایک اشرفی انعام دیا کرتے تھے۔ اور راجہ جے سنگھ کی وفات کے بعد جب بہاری کی قدر دانی میں کمی آگئی تو انھوں نے شاعری ہی ترک کر دی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی معاملات میں اُن کا دلچسپی لینا ناگزیر تھا۔ اُن کی سیاسی معلومات جس دوہے سے ثابت کی جاتی ہے اُس کا مفہوم یہ ہے۔

"دو بادشاہوں کی (ایک مملکت پر) حکومت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے اسمیں رعایا کی تکالیف اور پریشانیوں میں اضافہ ہونا ہی چاہئیے۔ بالکل اس طرح جیسے کہ ماوس کی رات میں سورج اور چاند (جو علی الترتیب دن اور رات کے بادشاہ ہیں) کے ایک جگہ ہونے پر (دن کے وقت بھی) عالم میں اور زیادہ اندھیرا (یعنی سورج گرہن) ہو جاتا ہے"

اس دوہے سے شاعر کی معمولی سوجھ بوجھ کے علاوہ علم و نجوم کی واقفیت کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس ایک دوہے میں سیاست اور نجوم کی واقفیت کے ساتھ ساتھ بے پناہ ادبیت بھی پائی جاتی ہے۔ قابل غور یہ ہے کہ شاعر نے ایک سیاسی مسئلہ کو علم نجوم کی تشبیہ سے ثابت کیا ہے۔ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے یہ دوہا ستسئی کے عمدہ دوہوں میں سے ایک ہے۔

دوسرا دوہا جو جناب ڈاکٹر گنپت چندر گنپت صاحب نے پیش کیا ہے اُس کا مفہوم یہ ہے۔

"شباب کے ہوشیار بادشاہ نے ان یعنی پستانوں دل اور آنکھوں کو اپنا معاون سمجھ کر ان میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔"

سمجھ میں نہیں آسکا کہ فاضل نقاد نے اس دوہے کو سیاست کے ذیل میں کیوں جگہ دی ہے جبکہ اس سے شاعر کی سیاسی بصیرت پر کسی طور روشنی نہیں پڑتی۔

ایک لفظ زیت (راجایا بادشاہ) کے کرجانے یا محض معاونین میں اضافہ کرنے کی بات سے وہ ہے کو سیاسی نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ دوہا حسن خوباں ۲۳۱۱ کا عمدہ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔

بہاری کے مقابلے میں مومن کا دیوان اس قسم کے اشعار سے خالی نظر آتا ہے۔ توڑ مروڑ کر ثابت کر دینا الگ بات ہے۔ لیکن واضح طور پر سیاسی معلومات کا مظہر کوئی شعر اُن کے دیوان غزلیات میں نہیں ہے۔

اور اُس کے دو واضح سبب معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل تو مومن کو دربار سے کوئی وابستگی نہیں تھی جو وہ اُس پر توجہ دیتے دوم یہ کہ انھیں سیاست یا اس قسم کی دوسری چیزوں کے مقابلہ میں مذہب سے ہی زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ ایک کٹر قسم کے مذہبی انسان تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غزل کے رندانہ اشعار میں بھی مذہبی معلومات کے بیش بہا موتی لٹائے ہیں اور کاریگری کی بات یہ ہے کہ یہ مذہبیت غزل جیسی عشقیہ صنف میں کبھی بے جوڑ نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ اُس کا جزو بن گئی ہے۔ رہی نجوم دانی اُس کا ذکر آگے آتا ہے۔

نجوم:

بلاشبہ بہاری کی نجوم کی واقفیت بہت اچھی ہے جس کے ثبوت میں ایک دوہا اور ایک سوا تھا ہی کافی ہیں۔ اُن کے مفاہیم علی الترتیب حسب ذیل ہیں۔

"معشوق کی آنکھوں میں لگا کاجل گویا زحل ہے اور اُس کی آنکھیں گویا برج حوت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ زحل برج حوت میں آگیا ہے (چونکہ اس ساعت میں مولود طفل بادشاہ بنتا ہے) اس لیے اس نیک ساعت میں پیدا ہونیوالی محبت بادشاہ بن کر مملکت جسم پر کیوں نہ حکومت کرے اور کیوں نہ اُس کا لطف اٹھائے" اور "معشوق کا چہرہ قمر کے مثل ہے۔ اُس کی پیشانی پر لگا ہوا رولی کا نقطہ مریخ ہے۔ اور زعفران کا آڑھا ٹیکا مشتری ہے۔ ان تینوں نے ایک ہی برج میں جمع ہو کر جہان عالم کو پُر آب کر دیا ہے (علم نجوم کا مفروضہ ہے کہ قمر مریخ اور مشتری کے ایک برج میں جمع ہونے کا نتیجہ کثرت باراں ہے)

شاعر کی علم نجوم کی گہری معلومات کے علاوہ اُس کی فن کاری کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے ایک خشک دقیق اور خواب آور مضمون کو اُس نے جس انداز سے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے ایک قادر الکلام شاعر ہی ایسا کر سکتا ہے ان دو مثالوں کے علاوہ ست سئی میں اور دو ہے بھی بہاری کی نجوم دانی کے موید ہیں جن میں سے ایک کا مفہوم سیاست کے موضوع کے تحت بیان ہو چکا اور اسی طرح کچھ دیگر بھی

اس موضوع پر مومن کے بھی کئی شعر ملتے ہیں اور ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیونکہ انھیں رمل اور نجوم میں خاص مہارت تھی۔ از روئے حساب لوگوں سے جو پیشینگوئی وہ کیا کرتے تھے عموماً صحیح نکلتی تھیں یہاں تک کہ اپنا سنہ وفات بھی انھوں نے استخراج کر لیا تھا۔ جو صحیح ثابت ہوا رمل اور نجوم کے علوم کی تحصیل انھوں نے باقاعدہ کی تھی۔ اپنی نجوم دانی کے سلسلے میں کہتے ہیں۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

[illegible]

مطبوعات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی معہ جدید قیمت مئی سنہ ۱۹۷۶ء)

(ا)

۱۔ امیر خسرو نمبر — فروغ اردو — ۱۲/-
۲۔ ادبی جائزے — سعادت علی صدیقی — ۸/-
۳۔ ایکتا کا چمن، تہواروں کے پھول۔ — ثمر لبسوانی — ۳/-
۴۔ احتشام حسین نمبر (فروغ اردو) — سید انصار حسین ماہلی — ۲۵/-
۵۔ اردو کا ماضی، حال اور مستقبل۔ — احمد ابراہیم علوی — ۳/-
۶۔ آئینہ نظم اردو — ثمر لبسوانی — ۴/-
۷۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی — روپ نرائن شیو پوری شاکر — ۱/-
۸۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر — ڈاکٹر محمود الحسن رضوی — ۱۶/-
۹۔ اردو ہم نمبر، فروغ اردو — اقبال صدیقی — ۳/۵۰
۱۰۔ انوار اللغات اردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) — پروفیسر احتشام حسین — ۴/-
۱۱۔ ادبی تاثرات۔ — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/-
۱۲۔ آئینہ عقل — پروفیسر نکہت شاہجہانپوری — ۴/۵۰
۱۳۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۲/۵۰
۱۴۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/۵۰
۱۵۔ انارکلی، امتیاز علی تاج (جدید ایڈیشن) — ۲/۷۵
۱۶۔ امراؤ جان ادا — مرزا رسوا — ۵/۵۰
۱۷۔ اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۱۰/-
۱۸۔ اردو میں تنقید — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۶/-
۱۹۔ انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی — ۱/۵۰
۲۰۔ ادب اور نظریہ — آل احمد سرور — ۸/-
۲۱۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم — عبد الشکور — ۷/-
۲۲۔ ادبی نقوش، — شاہ معین الدین ندوی — ۸/۰
۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں — عبد الماجد دریابادی — ۸/-
۲۴۔ انتخاب جدید نثر اردو — سید احتشام حسین — ۴/۵۰
۲۵۔ اقبال — مرثیہ — فروغ اردو — -/۵۰
۲۶۔ البرامکہ اور ان کا عروج، و زوال — ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے — ۳/-
۲۷۔ انتخاب کلام غالب — بشیر احمد علوی — ۱/۵۰
۲۸۔ ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن — ۷/۵۰
۲۹۔ انتخاب قصائد و غزلیات — فروغ اردو جدید ایڈیشن — ۶/-
۳۰۔ ادب کیا ہے — ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۳/۵۰
۳۱۔ ادبی خطوط غالب — مرزا محمد عسکری — ۷/-
۳۲۔ آئینہ نثر اردو — سعادت علی صدیقی — ۴/۵۰
۳۳۔ ایک نادر روزنامچہ — ڈاکٹر انوار الحسن ہاشمی — ۲/۵۰
۳۴۔ ابو الخمر — مجنوں گورکھپوری — -/۵۰
۳۵۔ اردو کی کہانی — سید احتشام حسین — ۲/۵۰
۳۶۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر — " — ۵/۴۵
۳۷۔ ابو الکلام آزاد (نظم) — جگناتھ آزاد — -/۲۵
۳۸۔ ارمغان نثر و نظم — عبد الاحد خان خلیل — ۴/۷۵
۳۹۔ افسانہ نمبر — مرتبہ فروغ اردو — ۱/۵۰
۴۰۔ اچھی نظمیں — اخگر مشتاق — -/۷۰
۴۱۔ اردو ادب میں طنز و مزاح — جدید ایڈیشن — کامل دو جلد، غلام احمد فرقت — ۲۵/-
۴۲۔ اردو شاعری — امیر احمد علوی — ۲/-
۴۳۔ غزلیات حافظ صائب — غالب فارسی — ۳/-
۴۴۔ آخری یادگار — نادر شاہ — معہ ترجمہ — ۲/-
۴۵۔ اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنیوالی کتاب — اعجاز احمد فاروقی — ۱/۲۵
۴۶۔ اللہ کے پیارے — امیر حسن نورانی — -/۵۰
۴۷۔ اسپین کی شہزادی۔ — صادق سردھنوی — ۴/۵۰
۴۸۔ ادبی معرکہ نمبر — مرتبہ فروغ اردو — ۱/۵۰

۴۹- اپنی موج میں — ادارہ — ۲/۵۰

۵۰- انوار جدید خط و کتابت — خلیق احمد علوی — -/۵۰

۵۱- ایک جان تین قالب — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰

۵۲- اُلفت — ″ — ۵/۵۰

۵۳- آغازِ سحر — ″ — ۴/-

۵۴- امین آباد — ″ — ۴/-

۵۵- انشائے خطوط نویسی حصہ اوّل — مشیر احمد علوی — -/۴۰

۵۶- اچھی کہانیاں — شمس الدین نوری — -/۵۰

۵۷- انشائے خطوط نویسی حصہ دوم — -/۷۵

۵۸- ایجادوں کی باتیں — مصطفےٰ احسن رضوی — ۳/-

۵۹- اچھی کہانیاں حصہ اوّل — شمس الدین نوری — -/۵۰

۶۰- ″ حصہ دوم ″ — -/۵۵

۶۱- ″ حصہ چہارم ″ — -/۶۵

۶۲- ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۴/۵۰

۶۳- اسلامی نظمیں — محمد حسین علوی شمسی — -/۴۵

۶۴- اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰

۶۵- اوراقِ گل — اختر مشتاق — ۱/-

(ب)

۶۶- بابائے اردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی — ۲/-

۶۷- بستانِ حرم (جدید نعتیہ کلام) — زائر حرم حمید صدیقی — ۳/-

۶۸- شہید محبت بوٹا سنگھ — خان محبوب طرزی — ۴/-

۶۹- بزمِ بے تکلف — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴/۵۰

۷۰- بحث کہانی — ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۵/-

۷۱- بہادر شاہ ظفر — امیر احمد علوی کاکوروی — ۲/۵۰

۷۲- بہشتی ثمر (حصہ اوّل و دوم) خلاصۂ بہشتی زیور — مولانا تھانوی — ۳/۸۰

۷۳- بانیِ اسلام — علامہ محی الدین عیادی کی تاریخ کا اردو ترجمہ — -/۷۵

۷۴- بشریتِ انبیاء — عبدالماجد دریابادی — -/۴۰

(پ)

۷۵- پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۳/-

۷۶- پیاری باتیں — محسن کاکوروی — -/۴۰

۷۷- پھولوں کے انبار (ناول) — منظر سلیم — ۴/۷۵

۷۸- پیسہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۴/-

۷۹- پاگل خانہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۳/۲۵

۸۰- پیغام — طاہر دیاپوری — ۳/-

۸۱- پنجاب میں اردو — حافظ محمود شیرانی — ۸/-

۸۲- پردیسی کے خطوط (حصہ اوّل) — مجنوں گورکھپوری — ۵/-

(ت)

۸۳- مختصر تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن) — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۱۲/-

۸۴- تصویرِ درد معہ تشریحات و ترجمہ — فرید احمد علوی — ۱/-

۸۵- تحریریں مجموعہ مضامین — ڈاکٹر گیان چند — ۷/-

۸۶- تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یاسین — ۳/-

۸۷- تنقیدی تجزیے — کاظم علی خاں — ۵/-

۸۸- تعارف تاریخ اردو ترمیم شدہ جدید ایڈیشن — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۷/-

۸۹- تاجدارِ مدینہ — اقبال صدیقی — -/۴۰

۹۰- تنقیدی اصول اور نظریے — حامد اللہ افسر — ۲/۵۰

۹۱- تنقید و تحلیل — شبیہ الحسن نونہروی — ۱/۵۰

۹۲- تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) — سید احتشام حسین — ۷/-

۹۳- تنقیدی نظریات جلد اوّل سید احتشام حسین ۱۰/-
۹۴- ” ” جلد دوم ” ۱۰/-
۹۵- تنقیدی اور عملی تنقید ” ۴/-
۹۶- تنقیدی اشارے (جدید اڈیشن) آل احمد سرور ۵/-
۹۷- ترانہائے خیام ڈاکٹر غیب حسین ۳/-
۹۸- تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص محمد حسین شمس ۳/-
۹۹- تصویر درد مع ترجمہ علامہ اقبال ۱/-

(ٹ)

۱۰۰- ٹیگور نادم سیتاپوری ۳/-
۱۰۱- ٹھیکرے کی مانگ صدیقہ بیگم سیوہاروی ۲/-

(ث)

۱۰۲- ثنائے حبیب و نعتیہ کلام بہزاد لکھنوی ۲/۲۵

(ج)

۱۰۳- جان غالب محمد حسین شمس علوی ۳/-
۱۰۴- جائزے انور سیوانی ۳/-
۱۰۵- جواہرات اسمٰعیل ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱/۵۰
۱۰۶- جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغ اُردو ۳/-
۱۰۷- ” ” نمبر ۲ ” ” ۳/-
۱۰۸- جوئے رواں مجموعہ کلام حامد اللہ افسر ۳/۵۰
۱۰۹- جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اثر بلگرامی ۳/۵۰
۱۱۰- جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین ۲/۵۰
۱۱۱- جلوے معین الدین دردائی ۲/-
۱۱۲- جمیلہ لوہائری (ناول) خان محبوب طرزی ۴/۵۰
۱۱۳- جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۸/-

(چ)

۱۱۴- چوتھی بہن، مجموعہ افسانہ مسیح الحسن رضوی ۳/-

(ح)

۱۱۵- حیات فضل الحق خیر آبادی ۱/۵۰
۱۱۶- حالی بحیثیت شاعر (جدید ایڈیشن معہ اضافہ) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۲/-
۱۱۷- حسرت موہانی عبدالشکور ۴/-
۱۱۸- حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰
۱۱۹- حکیم نباتات وزیر خاں لنکراں ۲/-
۱۲۰- حبشہ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۲۱- خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال ۱/-
۱۲۲- خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبدالماجد دریابادی ۳/۵۰
۱۲۳- خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال ۱/-
۱۲۴- خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/۲۵
۱۲۵- خلاصہ روح تنقید ۱/-
۱۲۶- خلاصہ جواہر العروض ۱/-
۱۲۷- خبطی مزاحیہ محمد علی واحد معہ مقدمہ شوکت تھانوی ۱/۵۰
۱۲۸- خوش بختی کی تلاش احسن الظفر بی اے ۳/-
۱۲۹- خلاصہ شعر الہند حصہ دوم ۱/-
۱۳۰- خلاصہ المیزان -/۷۵

(د)

۱۳۱- دیوان آبرو ڈاکٹر محمد حسن ۴/-
۱۳۲- دلچسپ کہانیاں مسعود عالم ۳/۵۰

۱۳۳۔ دیوان فغانی ۱/۵۰

۱۳۴۔ داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی) عبدالاحد خاں خلیل ۳/۵۰

۱۳۵۔ دلی کا یادگار مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۵۰

۱۳۶۔ دستہ گل شبلی نعمانی -/۴۰

۱۳۷۔ دوشیزہ قاف (ناول) خان محبوب طرزی ۵/-

۱۳۸۔ دلربا " " ۳/-

۱۳۹۔ دلی کا دبستان شاعری (معہ اضافہ جدید ایڈیشن)

۱۴۰۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱۲/-

۱۴۱۔ دھنک رنگیں ذکی کاکوروی ۳/۵۰

(ڈ)

۱۴۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ڈاکٹر نورالحسن -/۴۰

(ذ)

۱۴۳۔ ذوق و جستجو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۶/-

۱۴۴۔ ذوق ادب و شعور سید احتشام حسین ۶/۵۰

۱۴۵۔ ذوق و جنون، مجموعہ کلام آل احمد سرور ۸/-

(ر)

۱۴۶۔ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۷/۵۰

۱۴۷۔ رباعیات غالب فارسی مع اردو ترجمہ سید احمد حسن نورانی ۲/-

۱۴۸۔ رہبر مضمون نویسی شفاعت علی صدیقی ۳/-

۱۴۹۔ راکھی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی -/۵۰

۱۵۰۔ رخسار سحر (ناول) انور کریم قدوائی ۱/۵۰

۱۵۱۔ رفتار وحشی محمود آبادی ۳/۵۰

۱۵۲۔ رموز حکمت معہ مقدمہ اردو محمد شریف ۳/۵۰

۱۵۳۔ ریاض فارسی منتخب کلام فارسی ۳/-

۱۵۴۔ ریختہ ولی ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/-

(ز)

۱۵۵۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ) مولانا تھانوی -/۵۰

۱۵۶۔ زینٹوں کا بادشاہ، حکیم بانا مزاحیہ ناول سید علی عباس حسینی ۳/-

(س)

۱۵۷۔ سلور کنگ آغا حشر کاشمیری ۲/۵۰

۱۵۸۔ سوانح اور خاکے نجم الدین نقوی ۲/-

۱۵۹۔ سرور جہاں آبادی ڈاکٹر حکیم چند نیر ۸/-

۱۶۰۔ سرود نو (مجموعہ کلام) پروفیسر اختر قادری ۳/۵۰

۱۶۱۔ سنگ گہر سید احتشام حسین ۴/-

۱۶۲۔ سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری سید علی عباس حسینی ۱/۵۰

۱۶۳۔ سرمایہ زبان اردو جلال لکھنوی ۷/۵۰

۱۶۴۔ سفر (ناول) مائل ملیح آبادی ۲/-

۱۶۵۔ سیاحت زمین (ناول) محمود اعظم فہمی ۱/۵۰

۱۶۶۔ ستاروں سے آگے ناظر کاکوروی ۳/۵۰

۱۶۷۔ سنہرا حلقہ -/۷۵

۱۶۸۔ سر سید احمد خاں انوار الحسن صدیقی -/۴۰

۱۶۹۔ سوشل اسٹڈی احمد محسن کاکوروی ۱/۷۵

۱۷۰۔ ساز دل ذکی کاکوروی ۲/۵۰

(ش)

۱۷۱۔ شعر نو تنقیدی مجموعہ ڈاکٹر محمد حسن ۶/۵۰

۱۷۲۔ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) غلام احمد فرقت ۸/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۷۲-	شرح سنگ گہر	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۳-	شاہ غمگین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۱۷۴-	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۱۷۵-	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۴/-
۱۷۶-	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۷-	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	۴/-
۱۷۸-	شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن)	نظم طباطبائی	۷/۵۰
۱۷۹-	شہری اور سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	۰/۸۰
۱۸۰-	" "	"	۹۵/
۱۸۱-	" "	"	۴/-
۱۸۲-	" "	"	۱/-
۱۸۳-	شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ	امیر احمد علوی	۳/۵۰
۱۸۴-	شعر العجم، حصہ اول۔ دوم، سوم، چہارم، پنجم	شبلی نعمانی	۴۴/-
۱۸۵-	شرح نثر امروز ایران	احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۸۶-	شرح امروز ایران	"	۳/۵۰
۱۸۷-	شمع و شعر	علامہ اقبال	-/۵۰
۱۸۸-	شرح حکیم نباتات وزیر خاں	نیر مسعود	۱/۲۵
۱۸۹-	شرح انتخاب قصائد و غزلیات	[illegible]	۴/-
۱۹۰-	شرح شعر بوستان حصہ اول	ڈاکٹر انوار الحسن	۳/-
۱۹۱-	شرح آئینہ ہائے خیام	حکیم عبدالقوی	۲/-
۱۹۲-	شرح مفتاح العربیہ	عبدالقوی دریابادی	۱/۵۰
۱۹۳-	شرح نصاب فارسی		۵/-
۱۹۴-	شرح شعر بوستان دوم	احسن الظفر	۳/-
۱۹۵-	شرح گلہائے ادب		۳/-
۱۹۶-	شرح آئینہ نظم اردو		۳/-
۱۹۷-	شرح نثر فارسی امروزہ		۳/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۹۸-	شرح آئینہ نثر اردو	خلیل قدوائی	۳/۵۰
۱۹۹-	شرح غنچہ و گل		۵/-
۲۰۰-	شرح شعر فارسی کلاسیک	احسن الظفر	۳/-
۲۰۱-	شرح ہماری زبان اردو درجہ ۶ - ۷ - ۸ درجہ تک	خلیل قدوائی	۲/-

(ص)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۲-	صید و ہدف (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۵/۰
۲۰۳-	صحیفہ محبت مہدی افادی کے خطوط	ڈاکٹر محمود الٰہی	۶/-

(ط)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۴-	طنزی نمبر (خان محبوب طرزی)	مرتبہ فروغ اردو	۳/-
۲۰۵-	طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے	غلام الثقلین	-/۲۵
۲۰۶-	طلسم اسرار (ڈرامہ)	مرزا رسوا لکھنوی	۱/۵۰

(ع)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۷-	عذرا (ناول)	صالحہ عابد حسین	۶/-
۲۰۸-	عکس اور آئینہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	سید احتشام حسین	۶/۵۰
۲۰۹-	عبدالماجد دریابادی نمبر		۹/-

(غ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۱۰-	غالب کا تنقیدی شعور	اخلاق حسین عارف	۴/-
۲۱۱-	غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۶/-
۲۱۲-	غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر	سید امیر حسن نورانی	۶/-
۲۱۳-	غالب کی تخلیقی تخیل	شہید صفی پوری	۸/-
۲۱۴-	غنچہ و گل	سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۱۵	غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	نادم سیتاپوری	۶/-
۲۱۶	عشرتی دروازہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۱۷	غزلیات نظیری		۱/۵۰
۲۱۸	غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید ایڈیشن)	ذکی کاکوروی	۲۵/-

(ف)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۱۹	فروغ رفعت	طاہر محسن علوی	۴/۵۰
۲۲۰	فن خطابت یعنی استاد تقریر	کلب مصطفےٰ اینڈ کمپنی	۱۵/-
۲۲۱	فریدہ	خان محبوب طرزی	۱/-
۲۲۲	فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی	نادم سیتاپوری	۷/-
۲۲۳	فلسفۂ اقبال	عبدالقوی دریابادی	۴/۵۰
۲۲۴	فلسفی ابن رشد	مائل ملیح آبادی	۳/۵۰
۲۲۵	فروغ جام مجموعہ کلام	نشور واحدی	۴/-
۲۲۶	فغان محسن	محسن کاکوروی	۴/-
۲۲۷	فارسی آموز	مشیر احمد علوی	۱/-
۲۲۸	فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۷/-

(ق)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۲۹	قدیم جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں	غلام احمد فرقت	۶/-
۲۳۰	قصائد ظہیر فاریابی		۲/-
۲۳۱	قصائد مومن۔ مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	۶/۵۰
۲۳۲	قطرے سے گہر ہونے تک	صالحہ عابد حسین	۷/-
۲۳۳	قصص و مسائل	عبدالماجد دریابادی	۳/-
۲۳۴	قصائد قاآنی (فارسی)		۱/-
۲۳۵	قومی ادب نثر و نظم	حامد اللہ افسر	۴/-
۲۳۶	قیامت صغریٰ (سائنسی ناول)	خان محبوب طرزی	۳/-

(ک)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۳۷	کلیات اقبال	علامہ اقبال	۸/-
۲۳۸	کیسر اور کاہی	بدرالدین طیب جی	۳/-
۲۳۹	کف گل فروش (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۴/۵۰

(گ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۴۰	گاندھی نمبر		۲/-
۲۴۱	گلدستۂ فارسی اول و دوم	محمد غوث بیگ سیفی	۲/۲۵
۲۴۲	گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدید		-/۷۰
۲۴۳	گلہائے ادب	عبدالاحد خاں خلیل	۳/-
۲۴۴	گاندھی جی کے ساتھ	حامد اللہ افسر	۱/۵۰

(ل)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۴۵	لوائح جامی مع مقدمہ	عبدالاحد خاں خلیل	۱/۵۰
۲۴۶	لال قلعہ	مائل ملیح آبادی	۶/-
۲۴۷	لب بام	عادل رشید	۶/-
۲۴۸	لسانیات اور اردو	سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰

(م)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۴۹	مرقع اقبال	عصمت فاطمہ علویہ	۱۲/-
۲۵۰	مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو	غلام احمد فرقت	۸/۵۰
۲۵۱	محسن کاکوروی نمبر		۳/۵۰
۲۵۲	مسلمان اور کانگریس	ابوالکلام آزاد	۳/۵۰
۲۵۳	مرثیہ نگاری اور میر انیس	ڈاکٹر احسن فاروقی	۵/-
۲۵۴	مضامین فرحت حصہ اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	۵/-
۲۵۵	" " حصہ دوم	" "	۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۵۶	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر ظہیری	۳/-
۲۵۷	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۲۵۸	موسم گل (ناول)	عادل رشید	۷/-
۲۵۹	مجبور	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۲۶۰	مضامین جدید	محمد ہادی	۱/۲۵
۲۶۱	مثنوی سحر حلال فارسی	معہ مقدمہ قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۲۶۲	مطالعہ	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۶۳	مولوی نذیر احمد کی کہانیاں	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۲۶۴	معرکہ روم دیونان	صادق سردھنوی	۴/-
۲۶۵	مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۲۶۶	مطالعہ ماذ		۹/-
۲۶۷	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
۲۶۸	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/۵
۲۶۹	معصوم چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۷۰	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نقابی، اے حالی	۲/۵۰
۲۷۱	مرثیہ غالب	حالی	-/۲۵
۲۷۲	محو بہ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۷۳	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۷۴	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	۴/-
۲۷۵	انتخاب فسانۂ آزاد یعنی	سرشار لکھنوی	
۲۷۶	جہارا چ بلی	ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۲۷۷	مسز ملا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	-/۷۵
۲۷۸	مجذوب اور اُن کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۲۷۹	مصباح بلاغت معہ مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۲۸۰	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۲۸۱	مقدمات و مقالات	عبدالاحد خاں خلیل	۵/۵۰
۲۸۲	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۴/-
۲۸۳	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۸۴	نثر امروز ایران	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۲۸۵	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۹/-
۲۸۶	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۲۸۷	نقش حالی دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
۲۸۸	شجاعت علی سندیلوی		۳۴/-
۲۸۹	نغمۂ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۹۰	لمعات المند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۳/-
۲۹۱	نظم سائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۰/-
۲۹۲	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۲۹۳	نسرین و نسترن	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۹۴	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۲۹۵	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۲۹۶	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبدالماجد دریابادی	
	نوائے سرور جہاں آبادی	ڈاکٹر حکم چند نیر	۷/۵
۲۹۷	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۹۸	نوروز	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۹۹	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدید	آل احمد سرور	۱۴/-
۳۰۰	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۶/۵۰
۳۰۱	نیلم	انتصار حسین	۳/-
۳۰۲	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۳۰۴	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۵/-
۳۰۵	منشی نولکشور جیسر		۲/۵۰
	(و)		
۳۰۶	وعدہ فردا	اختر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-
	(ہ)		
۳۰۷	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۵/-
۳۰۸	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۱/۲۵
۳۰۹	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۳۱۰	ہندوستان [illegible] اور تہذیب	[illegible]	۱/۸۰
۳۱۱	ہندوستان [illegible]		۱/۵۰
۳۱۲	ہمارا سماج حصہ ۱	[illegible]	-/۸۰
۳۱۳	,, حصہ ۲	,,	-/۹۵
۳۱۴	,, حصہ ۳	,,	۱/-
۳۱۵	,, حصہ ۴	,,	۱/-
۳۱۶	یادگار غالب	مولانا حالی	۶/-
۳۱۷	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳۱۸	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۴/-

ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ (امین آباد پارک لکھنؤ)

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کیساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی، ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

جلد (۲۴) ——— شمارہ (۴)
رجسٹرڈ نمبر ایل، ڈبلیو / این۔ پی ۹۳
فون دفتر: ۲۶۱۳۲۵
فون رہائش گاہ ۲۶۶۵۶

ادارۂ فروغِ اُردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

فروغِ اُردو

ایڈیٹر:
محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

مجلس ادارت:
۱۔ عبدالقوی دریابادی بی۔ اے
۲۔ سعادت علی صدیقی

شرح سالانہ اعزازی: دس روپئے
عوام سے: آٹھ روپیہ
فی پرچہ: ۷۰ پیسہ

پتہ:
ادارہ فروغِ اُردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

شمارہ (۴) جلد (۲۴)

ترتیب

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغِ اُردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

اپنی باتیں

اُردو ایک عالمگیر زبان ہے اس کا شدید مخالف بھی انکار نہیں کرسکتا کہ اس زبان نے ملک کو ایک طاقت بخشی سرشار دیا نذر آتش نگم، چکبست حالی سرسید نے اُردو زبان کی جو خدمات انجام دیں وہ اپنی جگہ ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہیں وہ زمانہ ایسا تھا جب انگریز ہر سمت انگریزی زبان اور انگریزی تہذیب مسلط کرنا چاہتا تھا ہندو اور مسلمان نے جتنی اُردو خدمت کی اس کی بھی ایک تاریخ ہے اور اس کا سب سے سنہرا باب حب الوطنی اور تحفظ وطن کا تصور ہے ہماری تمنا اور خواہش ہے۔ یہ زبان پوری طرح پھلے اور پھولے اس کی راہ میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہو بڑے بھائی کی خواہش ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے چھوٹوں پر محبت کا ہاتھ رکھے اُن کے جذبات کو سمجھے اور ان کی زبان کو بھی سمجھے اس ملک میں اکثریت اور اقلیت کی حقیقت دو بھائیوں جیسی ہے جو وطنی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ آپس کی غلط فہمی اور بدگمانی کو عمل کے ذریعہ مشترکہ طور پر دور کیا جائے اور اُردو کو لسانی مسئلہ کی حیثیت سے حل کیا جائے میری رائے میں اس سلسلہ میں دو راستے ہیں ایک راستہ یہ ہے کہ سرکاری طور پر حکومت اپنے وعدوں کو وفا کرے اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ خود اُردو والے احساس کمتری سے باہر نکل کر اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور اُردو تعلیم کا عام بندوبست کرتے ہوئے اسکولوں اور کالجوں میں اُردو داخلہ مہم میں حصہ لیں فی زمانہ اُردو زبان کی ترویج اور اشاعت میں جو دشواریاں

پیش کر رہی ہیں وہ آپسی مناقشات کے باعث۔ ذمہ داران کمیٹی اسکول اور کالج اس پر متفق ہیں کہ ہمارے کالجوں اور اسکولوں میں اُردو زبان کی تعلیم ہو مگر ذمہ داران حکومت کے وہ ناعاقبت اندیش کارندے جن کے دلوں میں اُردو زبان کا فروغ اور اُس کی اہمیت اس لیے کھٹک رہی ہے کہ کہیں یہ زبان دُوسری زبان کی حیثیت نہ اختیار کرلے روڑے اٹکا رہے ہیں کہ اس زبان کو فروغ نہ حاصل ہوسکے اُتر پردیش کے بہت سے اسکول اور کالج کے ذمہ داران اس کے کوشاں ہیں کہ ہمارے اسکول اور کالجوں میں باقاعدہ اُردو تعلیم کا انتظام ہو مگر رکاوٹیں پیش کرکے اردو مہم میں رخنہ اندازی کی جارہی ہے۔ تازہ ترین مثال یہ بھی ہے کہ سلطانپور (یوپی) میں ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ دستخطوں سے حکومت سے اپیل کی گئی ذمہ داران حکومت کو توجہ دلائی گئی وفود اور درخواستوں کے ذریعہ استدعا کی گئی مگر کسی کو اتنا احساس نہیں ہوا کہ وہ متفقہ اپیل کو سنے اور اپنے اختیارات کے تحت باقاعدہ اُردو تعلیم کے اجراء کا بندوبست کرے اسلئے ہم محبان اُردو کا فرض ہے کہ وہ متفقہ جدو جہد کے ذریعہ اُردو مہم کے ذریعہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مستقبل کو روشن کرنے کی جدو جہد میں لگے رہیں انشا اللہ اُن کو اپنے عزم اور استقلال کے ذریعہ اپنے مقاصد میں ضرور کامیابی ہوگی۔

محترمی شمس علوی صاحب آداب،

مہو کے پتہ پر "فروغ اردو" برابر مل رہا ہے۔ شکریہ سروس کے سلسلہ میں آج کل دیواس میں ہوں۔ مہو آتا جاتا ہوں۔ عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ "فروغ اردو" میں کوئی کلام بھیجوں۔ مگر مصروفیات کی بناپر ایسا نہیں کر سکا۔ آج خیال آیا تو ارادہ کر ہی لیا اور دو غزلیں بیاض سے نقل کر ڈالیں۔ جو بھیج رہا ہوں، اگر رسالہ کے معیار پر اترے تو شائع فرماکر حوصلہ افزائی کریں۔ ویسے ۱۹۵۵ء ۱۹۵۶ء میں فروغ اردو میں میری دو ایک غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس دوران رسالہ چھوٹے سائز پر نکلتا تھا۔ بہرحال غزلیں حاضر ہیں۔ غزلوں کی رسید سے مناسب ہو تو اس پتہ پر مطلع کریں

فقط منان صدیقی مہوی

غزل

منّان صدّیقی مہوی

(مقیم دیواس ایم۔پی)

میرا وجود مجھ سے ہی باہر لگا مجھے
جو شخص بلا خلوص کا پیکر لگا مجھے

اپنا لیا ہے مجھ کو غم کائنات نے
سینے سے اپنے تو بھی ستمگر لگا مجھے

دنیا سے جب موازنہ میں نے کیا کبھی
اپنا ہی دل زیادہ تونگر لگا مجھے

محسوس کر سکا نہ جو انسانیت کی چیخ
سینے میں اُسکے دل نہیں پتھر لگا مجھے

دل کیا بجھا کہ ایک اندھیرا سا چھا گیا
تاریک ہر حیات کا منظر لگا مجھے

حق کی پکار سینۂ باطل میں دب گئی
میرے ضمیر دار و رسن پہ لگا مجھے

کب سے سمٹ رہا ہوں میں خود اپنی ذات میں
احساس زیست آ ذرا ٹھوکر لگا مجھے

کیا کیا وہ دے رہا ہے خبر واقعات کی
یہ دور حادثوں کا پیمبر لگا مجھے

دیکھا ہے جب بھی میں نے نگاہِ عمیق سے
ہر قطرۂ حقیر سمندر لگا مجھے

عمر رواں کے جانے کا احساس جب ہوا
ایک ایک لمحہ وقت کا گوہر لگا مجھے

بہتر لے ہے آفتاب تو چندلے ہے ماہتاب
یہ آسماں تو نور کی چادر لگا مجھے

جدت پرست ہے نہ قدامت پرست ہے
منّان اِک عجیب سخنور لگا مجھے

مثنوی اکبر علیخاں اکبر

از قاضی عبدالودود

اکبر علیخاں، اکبر خلف فتح علیخاں، جہاندار شاہ ولیعہد شاہ عالم کے ماموں تھے اور ان کے ساتھ ہی دہلی سے لکھنؤ گئے تھے۔ جہاندار شاہ کی وفات بنارس میں واقع ہوئی تو یہ لکھنؤ میں اقامت پذیر ہوگئے اور وہاں سے آصف الدولہ کی وفات کے بعد حیدرآباد گئے[1]۔ مثنوی ذیل انھوں نے مرض الموت میں ایک دو روز قبل از وفات[2]") کہی تھی۔ مجمع الانتخاب، مصنفہ کمال دہلوی (نسخۂ ایشیاٹک سوسائٹی لندن) سے نقل کی جاتی ہے۔

واضح رہے کہ نشان زدہ الفاظ اصل کے مطابق ہیں:

کہوں میں حال دل کس سے الٰہی　　پڑی ہے جو مرے اوپر تباہی
نو بس ہے مرا کوئی نہ ہمدرد　　پڑا ہر لحظہ بھرتا ہوں دم سرد
یہاں تک دکھ پہ دکھ یا رب سہوں میں　　نہ یارا ہے کہ اب چپکا رہوں میں
کروں ہوں اب بیاں میں وہ حکایت　　کہ ہے جس میں زمانہ کی شکایت
یعنی جانتے ہیں خاص اور عام　　کہ ہے اک شہر جس کا لکھنؤ نام

ثنا اسکی کروں میں اب بیاں کیا　　عجب زیر فلک ہے سیر کی جا
مرے والد میاں فتح علی خاں　　وہاں رہتے تھے بہر باعزت و شاں
بہت خوش دل تھے واں پہ مال و زر سے　　بہت آسودہ تھے یہ اپنے گھر سے
یہ نواب آصف الدولہ وہاں کا　　وزیر اعظم ہندوستاں تھا
بہت حشمت تھی اور جاہ و حشم تھا　　غرض کوئی بات کا اس کو نہ غم تھا
وہ سب کچھ شہر واں آباد ایسا　　تھا آگے شاہجہاں آباد جیسا
وہاں رہتے تھے جتنے خاص اور عام　　نہ لیتا تھا کوئی افلاس کا نام
تھے اپنے حال میں سب شاد و خرم　　کسی شے کا کسی کو کچھ نہ تھا غم
وہاں تھے جو میاں الماس ذیشاں　　توسل ان سے بس والد کو تھا واں
کہ مالک تھے یہ سارے ان کے گھر کے　　سپاہ و ملک و مال و سیم و زر کے
خدا نے اسقدر بخشا تھا واں اوج　　یہ تھے سرتاج جتنی ان کی تھی فوج
غرض ہر طرح کا تھا ان کو مقدور　　یہ اپنے حال میں رہتے تھے مسرور
سدا ان کے تئیں عیش و طرب تھا　　یہ کچھ واں روز و شب بس فضل رب تھا
بس اس میں آصف الدولہ نے رحلت　　جو ہی کی دو ہیں آئی سر پہ آفت
تہ و بالا ہوا وہ ملک سارا　　دخیل اس میں ہوا آ کر نصاریٰ
یہ ویراں آہ ہندوستاں ہوا سب　　جہاں سارا فرنگستاں ہوا سب
غرض عمدہ تھے وہ جتنے [illegible]　　[illegible]

---

[1] اکبر کی موت ۱۲۱۸ھ میں ہوئی، کمال کی کہی ہوئی تاریخ یہ ہے: "باب [illegible] ت میں جا ہو کے داخل" (مجمع الانتخاب)۔
[2] یہ مجمع میں ایک جگہ مرقوم ہے، دوسری جگہ یہ ہے: "بحالت بیماری شدید... بدم واپسیں گفتہ..."

معطل سب کہ واں رہنے لگے آہ / لگے تب لینے واں سے ایک اک راہ
غرض اپنی کہوں میں تم سے کیا بات / معطل محض واں کٹتی تھی اوقات
مقرر تھی جو واں والد کی جاگیر / لگی آمد میں اس کی ہونے تاخیر
ارادہ دل میں والد کے ہوا تب / سفر ملک دکن کا کیجیے اب
غرض آب و خورش سے سب ہیں مجبور / کسی کا یاں نہیں چلتا ہے مقدور
فلک نے وہ ہیں بس اک بار واں سے / اٹھایا یعنی بس اپنے مکاں سے
بچھڑ کر اپنے بیگانوں سے ہے ہے / لگا کر وانے صدہا منزلیں طے
ہوئی خویش و برادر سے جدائی / بلا لاکھوں طرح کی پیش آئی
غرض لاچار ہو کر سب سے رخصت / چلے رکھ دل پر اپنے داغ فرقت
بیاں احوال ان کا کیا کروں میں / لکھوں تو سیکڑوں دفتر بھروں میں
غرض کر اس طرح قطع منازل / ہوئے اس شہر میں آ یاں سے داخل
کی نورالملک سے آکر ملاقات / انھوں نے بھی بہت سی کی عنایات
ضیافت وہ ہیں سب لشکر کی بھی / مدارات اور تواضع خوب سی کی
نظام الملک سے جا کر ملایا / خطاب و منصب و خلعت دلایا
وہیں پھر صوبہ داری یاں کی ہو شاد / کری نواب نے والد کو امداد
توجہ کی تلطف اور عنایات / کہ دی اس شہر کی ان کو نظامت
ارسطو جاہ سے بھی کی ملاقات / انھوں نے بھی بہت سی کی مدارات
یہاں بخشش کے تھے خرد و کلاں سب / ملایا سب کو ان کو آخرش تب
مگر قسمت کا ابھی کچھ اپنے ہے پھیر / کہ اب تک کام میں جو ہے لگی دیر
ہوئی علیحدہ سب [illegible] / مری والد کی یاں پہلے تو یک چند

خدا کے فضل سے بعد از کئی ماہ / شفا پائی بحق حضرت شاہ
بیاں اپنا کروں احوال یاں سے / سنو اے دوستو تم گوش جاں سے
کہ بعد اک سال کے مجھ کو بھی آخر / ہوا درد شکم چند کچھ سا ظاہر
دوا نے کی کسی کی کچھ نہ تاثیر / موافق فہم کے کی سب نے تدبیر
کسی نے میرے تئیں مسہل پلایا / کسی نے آ کے اطریفل کھلایا
نہ کچھ حاصل ہوا پر اس دوا سے / شفا ہوئی نہ مجھ کو اس بلا سے
دوائیں کرتے کرتے ہو گیا تنگ / رکھا چھاتی پہ آخر صبر کا سنگ
غرض لاچار ہو کر سب دوا سے / یہ میں نے عرض کی اپنے خدا سے
بدن میں ہے رہی اتنا بھی طاقت / تو دے مولیٰ مجھے اس سے افاقت
نہ ہوتا فائدہ ہے اب دوا سے / نہ چھٹتا ہوں میں اس رنج و بلا سے
جو کچھ مرضی تری ہے وہ ہی بہتر / رضا تیری مجھے ہے سب سے خوشتر
دوا موقوف کر دی سب کی میں نے / لگا اس کی رضا پر بس میں رہنے
تو اسہال بواسیری ہے مجھ کو / لگے دست آنے دن میں آٹھ سو سو
رہی طاقت نہ اٹھنے بیٹھنے کی / نہ چلنے پھرنے کی نہ لیٹنے کی
یہ سن والد نے کی مجھ کو نصیحت / نہیں تم کو ابھی ہے ہوئی فرصت
دوا موقوف کوئی کرتا ہے بیمار / طبیعت پر کوئی رکھتا ہے بیار
خدا کے فضل سے ہوتی شفا ہے / بہت سے اس مرض کی یاں دوا ہے
نظر اپنے خدا اوپر رکھو تم / نہ اس کا غم الم ہرگز کرو تم
حکیم اک آپ اب تجویز کیجے / کہ اس کی بھی دوا دس روز کیجے
شفا ہوتی ہے اب فضل خدا سے / دعا مانگو علی مرتضیٰ سے
غرض اک منگیے قطب الدین صاحب / کہ ہیں اس فن میں وہ یاں سب سے غالب
انھیں بھیج آدمی میں نے بلایا / سب اپنا درد و دکھ ان کو سنایا
انھوں نے دیکھی میری نبض کر غور / لکھا تشخیص کر نسخہ وہیں اور
خدا پر رکھ نظر پیتا ہوں اس کو / تفاوت کچھ نہیں پر اس سے مجھ کو
ادا کر کے دوگانہ شکر کا میں / کہوں [illegible] یا الٰہ رب الشفا میں
شفا دے جلد مجھ کو تو شفا دے / مرے اس درد کی جلدی دوا دے
کہ تو شافی مطلق بے گماں ہے / الٰہی وصف تیرا بے بیاں ہے
مرا کوئی نہیں تیرے سوا ہے / ترا دونوں جہاں میں آسرا ہے
ثنا تیری کروں قدرت کہاں ہے / میں ہوں کیا اللہ کیا میری زباں ہے
یہی اکبر کی تجھ سے التجا ہے / مرے خالق یہی مری دعا ہے

(باقی مضمون صفحہ)

از مختار الدین احمد

کتاب خانۂ مانچسٹر کے بعض مخطوطات

جون ریلینڈ لائبریری مانچسٹر میں عربی و فارسی کی قلمی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ موجود ہے اور ان کی تفصیلی فہرستیں شائع بھی ہو چکی ہیں۔ وہاں مجھے اس بات کی اطلاع ملی کہ اُردو کی بھی کچھ قلمی کتابیں یہاں موجود ہیں جو عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہیں۔ میں نے پہلی فرصت میں ان کتابوں کو جو تعداد میں ۸ ہیں منگوایا دیکھا اس میں دو مجموعے خاص طور پر پسند آئے جن میں دو فارسی کے کچھ رقعات ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ذخیرے کی کچھ اہم کتابوں کا بہت مختصر طور پر ذکر کروں فارسی کے مخطوطات میں حسب ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ کلیاتِ مرزا زین الدین خاں عشقؔ دہلوی[1] (نظم و فارسی ۲۱۰) یہ بڑی تقطیع پر ۱۳۱۹ اوراق کا بہت ضخیم کلیات ہے۔ یہ نسخہ خود مصنف نے وارن ہیسٹنگ گورنر جنرل کو پیش کیا گیا جیسا کہ سر ولیم پرنس کی تحریر سے جو اس نسخے پر ثبت ہے معلوم ہوتا ہے۔ ایک بہت دلچسپ بات یہ ہے کہ تقریباً ہر غزل کے ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس موقع پر، کب اور کس مشاعرے کیلئے یہ غزل لکھی گئی ہے۔

ایک غزل ہے "صبح گاہ طلب" ورق ۱۹۱۲ الف اسکے متعلق لکھا ہے "در مشاعرۂ نواب علی ابراہیم خاں خلیل ۱۱۹۵ھ"۔

ایک غزل ہے جس کی ردیف "ہمہ شب" ہے اس کے متعلق یہ صراحت موجود ہے: "غزل" ہمہ شب' در عظیم آباد بر حسب فرمائش شاہ رکن الدین سلمہ در ۱۱۹۱ھ"۔ ورق ۱۹۲ ب۔ علی ابراہیم خاں تذکرۂ گلزار ابراہیم کے مؤلف ہیں اور شاہ رکن الدین سے ان کی مراد حضرت عشقؔ عظیم آبادی ہیں۔ اسی طرح عظیم آباد، دہلی اور دوسرے مقامات کے بہت سے مشاعروں کے متعلق اطلاعیں ملتی ہیں اور اس کلیات پر کبھی کام کیا گیا تو بہت سے نئے معلومات حاصل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ دیوان مبتلا و عشق زمانہ کتابت تقریباً ۱۱۷۷ء (فارسی: ۲۱۹)

---

[1] ان کا مختصر حال اور کچھ اردو اشعار تذکرۂ مسرت افزا میں ملیں گے ص۱۴۳ و ص۱۴۴ مرتبہ جناب قاضی عبدالودود صاحب۔

۳۔ دیوان سراج الدین حسین زمانۂ کتابت تقریباً ۱۸۱۵ء
(فارسی: ۲۸۰)

۴۔ راحۃ الافراس مصنفۂ آنندرام مخلص دہلوی متوفی ۱۱۶۴ھ
(فارسی: ۱۳۷)

۵۔ تذکرۂ ہمیشہ بہار مرتبۂ اخلاص تقریباً ۱۸۳۰ء
(فارسی: ۳۲۳)

۶۔ تذکرۂ لامعلوم تقریباً ۱۸۵۰ء (فارسی: ۳۲۸)

۷۔ دیوان حشمت تقریباً ۱۸۵۰ء (فارسی: ۴۲۱)
اوراق ۳۴، ناقص الآخر۔ یہ نسخہ ہملٹن کے کتب خانہ کا ہے وہاں اس کا نام نمبر ۵۳۸ تھا۔

۸۔ مطار الکرم فی شرح طور الکلم از انشاء اللہ خاں انشا دہلوی (فارسی: ۶۱۲)
یہ انشا کی نادر تصنیف ہے اور حال ہی میں [illegible] راقم کا ارادہ اس پر ایک مفصل مضمون لکھنے کا ہے۔

۹۔ نکات غالب مصنفہ مرزا غالب دہلوی صفحات ۱۹ مسطورہ (فارسی: ۶۱۴)
سرورق: رسالہ لغات فارسی تعریف اسد اللہ خاں غالب معروف بہ مرزا نوشہ مسمیٰ نکات غالب۔ اس پر اغلاط کی تصحیح کسی اور قلم سے موجود ہے اور مجھے شبہہ ہے کہ خود مرزا کے قلم کی تصحیحات ہیں۔ یہ نسخہ ہملٹن کے کتب خانہ کا ہے۔ تعجب نہیں کہ خود مرزا نے تصحیح کرکے یہ نسخہ ہملٹن کو بھیجا ہو۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ جو ۱۸۶۷ء میں چھپا تھا پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ذکر غالب ص ۱۷، طبع سوم۔

۱۰۔ قصیدہ در مدح ملکۂ انگلستان و ہندوستان مصنفۂ مرزا غالب (فارسی: ۶۱۳) سرورق پر یہ عبارت درج ہے: قصیدہ برگزیدہ در مدح ملکۂ معظمۂ انگلستان خلد اللہ ملکہ (کذا) بالعدل والاحسان، یہ قصیدہ وہی ہے خمار یافت، روزگار یافت جو دستنبو طبع اول کی ابتدا میں چھ صفحوں میں درج ہے اس قصیدے کے بعد دستنبو شروع ہو جاتی ہے۔ اس نسخے میں بھی ترمیمیں اور اصلاحیں ہیں اور غالباً یہ خط غالب ہے یہ نسخہ بھی کرنیل ہملٹن کے کتب خانے کا ہے اور تعجب نہیں جو مرزا نے خود اسے بھیجا ہو۔

اب فارسی مخطوطات کے بعد اردو کی قلمی کتابوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ دیوان ولی (ہندوستانی: ۲۷) سلیمان جاہ اور ہملٹن کے کتب خانوں میں یہ نسخہ رہ چکا ہے، اوراق ۷۵، مکتوبہ میر نیاز علی بہ بیست و ہشتم محرم الحرام ۱۲۲۳ھ بروز یکشنبہ۔ سلیمان جاہ کی سرخ مستطیل مہر ہے جس میں ۱۲۴۴ھ کے اعداد منقوش ہیں ان کے کتب خانے میں یہ کتاب غالباً ماہ رمضان ۱۲۳۷ھ کو پہونچی۔
محمد علی شاہ کی بھی موجود ہے اور جائزہ نہم ربیع الاول ۱۲۶۲ھ کا۔

۲۔ کلیات جرأت (ہندوستانی: ۲۵) مکتوبہ بیست و ہفتم ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ ابتدائی آخری اوراق پر کسی نے "غزل ولی عہد بہادر" کے عنوان سے ظفر کی متعدد غزلیں نقل کی ہیں یہ نسخہ بھی کرنل ہملٹن کے کتب خانہ کا ہے۔

۳۔ کلیات سودا مکتوبہ ۱۱۸۱ھ (ہندوستانی: ۱۷)

۴۔ کلیات سودا (ہندوستانی : ۳۴)
۵۔ دیوان ناسخ مکتوبہ ۱۸۴۳ء (ہندوستانی ۲۶)
۶۔ مثنوی بحر الحقیقت از مولوی محمد حسن نوشتہ غلام محمد خاں ۱۲۵۶ھ (ہندوستانی : ۲۹)
۷۔ ہزلیات جعفر زٹلی مکتوبہ ۱۸۷۶ء (ہندوستانی ۳۰:۲)
۸۔ قصہ چندر بدن (منظوم) از مقیمی مکتوبہ ۱۸۰۰ء (ہندوستانی : ۳۴)
۹۔ رقعات و مکتوبات وغیرہ از میر جعفر زٹلی مکتوبہ ۱۸۶۰ء (ہندوستانی : ۱۸)
۱۰۔ ترجمہ بھگوت پران مکتوبہ ۱۸۰۰ء (ہندوستانی : ۱۰)
۱۱۔ تواریخ آگرہ منثور مکتوبہ ۱۸۳۵ء (ہندوستانی : ۳۰)
۱۲۔ اصول النغمات فن موسیقی مکتوبہ ۱۸۰۰ء (ہندوستانی ۲۰)
۱۳۔ قصہ کامروپ منظوم از تحسین مکتوبہ ۱۸۰۰ء (ہندوستانی : ۳۲)
۱۴۔ سندر سنگار منظوم مصنفہ شاہ علی گجراتی ؟ مکتوبہ ۱۷۱۹ء (ہندوستانی : ۲۶)
۱۵۔ عمارات دہلی مکتوبہ ۱۸۵۶ء (ہندوستانی : ۳۷)
۱۶۔ حالات کمال صاحب ترمذی شاہ اور سلطان محمد تغلق (ہندوستانی : ۳۹)
۱۷۔ فرس نامہ سعادت یار خاں رنگین مکتوبہ ۱۸۴۱ء (ہندوستانی : ۴۰)
۱۸۔ صنم کدۂ چین سید حسین شاہ حقیقت مکتوبہ ۱۸۶۱ء (ہندوستانی : ۴۱)
۱۹۔ راگ مالا مصتود مکتوبہ ماۃ ۱۸ (ہندوستانی : ۴۲)
۲۰۔ بارہ ماسا کاظم علی جواں مکتوبہ ۱۸۰۲ء (ہندوستانی : ۴۴)

ادبی جائزے مشاہیرِ ادب کی نظر میں

● ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی

ادبی جائزے سعادت علی صدیقی اُستاد شعبہ اردو گاندھی میموریل ڈگری کالج سنبھل کے کچھ تحقیقی مضامین اور چند ریڈیو تقریروں کا مجموعہ ہے۔ پہلے پانچ مضامین تو غالب سے متعلق ہیں جن میں سے دو میں غالب کے بعض اشعار کے اختلافاتِ متن کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ تیسرے مضمون میں غالب کی یادگاریں قائم کرنے کے سلسلہ میں اب تک کوششیں کی گئی ہیں ان کا ایک جائزہ لیا گیا ہے یہ مضامین اور بقیہ دو جو غالب کے حادثۂ اسیری اور سفرِ کلکتہ سے متعلق ہیں بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ اندازِ بیان بھی صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ بقیہ مضامین میں منیر شکوہ آبادی اور بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے حالات پیش کئے ہیں۔ یہ دونوں مضامین ان کے تحقیقی موضوع کا حصہ معلوم ہوتے ہیں جو زندانی ادب کے سلسلہ میں بحیثیت ایک ریسرچ اسکالر کے کر رہے ہیں۔ ایک مضمون میں اُردو کے ایک قدیم رسالہ مرقعِ عالم کا بیان ہے جو ہردوئی سے آخر انیسویں صدی میں حکیم محمد علی طبیب نکالتے تھے اور یہ اپنے زمانہ میں ایک مشہور و معروف ادبی رسالہ تھا۔ بقیہ مضامین جو مرثیہ کے ارتقا ، چکبست اور اقبال کے سلسلہ میں ہیں ریڈیائی تقریریں ہیں مجموعی حیثیت سے یہ تمام مضامین جس کاوش سے لکھے گئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سعادت علی صاحب اسی طرح اگر محنت سے لکھتے رہے تو اردو تحقیق میں ایک مقام حاصل کرلیں گے۔" (آکاش وانی سے براڈکاسٹ)

● ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صدر شعبۂ اُردو دلّی یونیورسٹی دہلی۔

ادبی جائزے سعادت علی صدیقی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک کے مشہور جرائد میں شائع ہوکر اہلِ ادب سے خراجِ تحسین لے چکے ہیں سعادت ایک خاموش اور سنجیدہ انسان ہیں۔ استاد اور ادیب دونوں حیثیت سے ان کو خاموشی سے کام میں مصروف پایا ہے۔ وہ ادب کی زندہ اور اخلاقی قدروں کے قائل ہیں۔ انھوں نے شہرت یا ناموری کیلئے اپنے آپ کو کسی 'ازم' سے وابستہ نہیں کیا۔

مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ انھوں نے کسی مشہور اور معروف شخصیت کے مقدمہ یا تعارف کا سہارا لیے بغیر کتاب

کو شائع کیا ہے، امید ہے کہ زبان اور ادب سے ان کی محبت داد و ستائش سے بیگانہ ہو کر تحسین سخن فہم کو ہی اپنا صلہ خیال کرے گی۔ اچھی کتابت اور طباعت کے فقدان کے دور میں اس قدر صاف اور ستھری کتاب کا شائع ہونا مغتنم ہے۔"

● پروفیسر عتیق احمد صدیقی نائب شیخ الجامعہ، جامعہ اردو علی گڑھ

"ادبی جائزے کے بارے میں صحیح رائے تو محقق اور نقاد حضرات ہی دے سکتے ہیں۔ میں ان دونوں میں سے ایک بھی حیثیت کا حامل نہیں، لیکن ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان مضامین میں خاصی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا گیا ہے غالب پر تو کئی مضامین یکجا ہو گئے ہیں اور اس طرح ان کی شاعری کو اور ان کی ذات کو سمجھنے کا کافی مواد اس میں جمع ہو گیا ہے تدوین کا کام کرنیوالوں کیلئے غالب کے بعض اشعار میں اختلافات متن کی دلچسپ مثالیں بہم ہوئی ہیں اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس کاوش سے یہ تمام مواد اکٹھا کیا گیا ہوگا۔ غالب پر ان مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے گیرائی پر گہرائی کو ترجیح دی ہے اور تفہیم غالب کے چھوٹے اور بظاہر غیر اہم پہلوؤں کو لیکر ان پر توجہ صرف کی ہے۔ تفہیم ادب میں اسی انداز کار کی ضرورت بھی ہوتی ہے تاکہ باتیں محض سرسری اور سطحی نہ ہو کر رہ جائیں۔

جگر، چکبست اور اقبال ہمارے وہ نمائندہ شاعر ہیں جن پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ابھی تو بہت کچھ لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔ یہ مضامین ان شعراء کے مطالعہ میں اضافہ ثابت ہوں گے۔"

● جناب محمد عثمان غنی سب ایڈیٹر قومی آواز لکھنؤ۔

سعادت علی صدیقی صاحب کا شمار اردو کے ان معلموں میں ہے جو اردو کی خدمت کو فرض عین سمجھتے ہیں۔ یہ ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے اگرچہ انکے مضامین مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن ان کو پہلی مرتبہ یکجا کیا گیا ہے۔ ان سے قبل صدیقی صاحب مرزا غالب کی قید کی سرگزشت اور اس زمانہ میں انکے کہے ہوئے مشہور ترتیب بند حبسیہ سے متعلق ایک مختصر سی کتاب شائع کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ۱۳ مضامین میں سے پانچ مرزا غالب سے متعلق ہیں جن میں ایک غالب کا حادثہ اسیری بھی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صدیقی صاحب کو غالب سے خصوصی دلچسپی ہے۔ مرزا پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن تحقیق تنقید اور ان کے اشعار کی تشریح کے لیے دروازے برابر کھلتے جا رہے ہیں سعادت صدیقی صاحب نے بھی غالب کے بارے میں نئے تحقیقی نظریات کو یکجا کرنے اور ان سے معنی اخذ کرنے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ غالب کے علاوہ جگر چکبست اور اقبال پر ایک ایک مضمون ہے ایک مضمون مرثیہ کے ارتقا کے بارے میں ہے اور ایک ایک مضمون منیر اور ظفر کے بارے میں ہے۔

سعادت صاحب نثر سادہ لکھتے ہیں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے گریز کرتے ہیں پیش لفظ میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس میں بعض مضامین ان کی طالب علمی کے زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں۔

صدیقی صاحب معلم ہیں اردو تنقید ایک مدت سے معلموں کے تصرف میں رہی ہے الا ماشاءاللہ انکے مضامین میں بھی معلمانہ رنگ لیے طریق فکر کا غلبہ ہوتا ہے لیکن انکے مضامین دلچسپ کارآمد اور قابل مطالعہ ہیں۔" قیمت آٹھ روپیے ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

صابر سنبھلی ایم، اے

مومن کی بسیار دانی

(دوسری قسط)

ان کی غزلوں کے دیوان میں ایسے متعدد اشعار ہیں جو اُن کی نجوم دانی کا پتہ دیتے ہیں چند یہ ہیں۔

سے صبحدم آنے کو تقاضہ کر گواہی دے ہے
رجعت قہقری چرخ و قمر آخر شب

سے اے زہرہ چہرہ دشمن منحوس کو نہ دیکھ
تارے بہیں گے خون کے اس فتح باب میں

دو نحس اور سعد سیاروں کا باہم مقابل ہونا کثرت باراں کی نشانی ہے۔ قابل داد یہ چیز ہے کہ نجوم کے اہم مسئلہ کے بیان میں بھی تغزّل کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

سے تم نکلے بہر سیر تو نکلے گا مہر بھی
ہو وے گا اجتماع شب ماہتاب میں

سے ہوں غضب سے اُس کے سرگرم فغان شعلہ زن
جل گیا جی احتراق زہرہ کی تاثیر سے

اہل تنجیم کی اصلاح میں کسی سیارے کا شعاع مہر کے پیچھے چھپ جانا احتراق کہلاتا ہے مومن نے اپنے طالع کو زہرہ تسلیم کر کے احتراق خورشید کی وجہ سے اس کا اثر زائل ہونا تصوّر کیا ہے

سے کیوں نہ مجھ سے رم وہ مہوش اب زیادہ تر کرے
بدگماں ہے سبعہ سیارہ کی تسخیر سے

اس شعر سے عملیات کی معلومات کا اشارہ بھی ملتا ہے۔

سے قران انجم و سیارہ برج آبی میں
ڈبوئے گی مری چشم ستارہ بار مجھے

بروج سرطان، عقرب اور حوت کو آبی تسلیم کیا جاتا ہے اور ان بروج میں سے کسی ایک میں دو یا زائد سیاروں کا قران کثرت باراں کی علامت ہے۔ شاعر نے اپنی آنکھوں کو برج آبی اور اشکوں کو انجم تصوّر کر کے یہ حکم نافذ کیا ہے۔

ان چند اشعار کے مطالعہ سے مومن کی نجوم دانی کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ ایک جگہ علم رمل کی معلومات کا بھی ہلکا سا اشارہ ملتا ہے۔

سے ہم کسی نشانہ بیں سے پوچھیں گے سبب آشفتگی کا کل کا
علم طلب ۔

بہاری کی علم طلب کی معلومات کے ثبوت میں صرف ایک ہی دو ہا پیش کیا جاتا ہے۔ جس کا مفہوم حسب ذیل ہے۔

۔۔لے ہیرو اس ضائع ہوتے ہوئے نگینہ (ہیروئن) کی حفاظت کر کے عالم میں نیک نامی حاصل کر۔ چل اُس ہجر کی سخت تپ سے جلتی ہوئی ہیروئن کو اس سوزش سے نجات دینے کے لیے اُسے سُدرشن (ایک خاص قسم کا چو[illegible] یا سیننا۔ چہرے کا دیدار) کی دوائی مرحمت کرے۔

اس دوہے میں لفظ سدرسن دو مفہومین ہے جس کے صریح معنی دیدار کے ہیں۔ اگر اس کے معنی کسی دوائی کے لیے جائیں تو بہاری کی طبی معلومات کا ماحصل یہ ہوا کہ سدرشن دکھلانے سے بخار سے نجات ملتی ہے۔ اگر یہی علم طب ہے تو وائے علم طب۔ گویا ایک شخص جو یہ جانتا ہے کہ کنین کی گولی بخار میں اور اناسین کی ٹکیا زکام میں مفید ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُسکو ایلوپیتھی کا ڈاکٹر نہ تسلیم کر لیا جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ذمہ دار اور فاضل نقاد ایسے ایسے بچر استدلال پیش کرتے ہیں جن پر خندہ بھی آتا ہے اور گریہ بھی۔ ہاں بہاری نے دوہا جس انداز سے کہا ہے اُس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ شعریت میں بہاری کا درجہ کہیں پست نہیں ہے۔

بہاری کے مقابلے میں مومن کو دیکھیے۔ طب کے متعلق اُن کا علم بہاری سے کسی طور کم نہیں۔ اس فن میں اُن کی قابلیت کا اظہار اُن کے متعدد اشعار سے ہوتا ہے۔ اور اگر اُن کے اشعار اس کی غمازی نہ بھی کریں تب بھی اُن کی طبی معلومات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لفظ "حکیم" اُن کے نام کا ضروری جزو ہے۔ تذکروں سے اُن کی باقاعدہ تحصیل طب اور حکیم غلام حیدر خاں و غلام حسن خاں سے اس فن میں شاگردی در ساتھ ہی نسخہ نویسی کا بھی پتہ چلتا ہے (بحوالہ مقدمہ دیوان مومن مرتبہ پروفیسر ضیا احمد بدایونی) چند اشعار پیش ہیں۔

؎ گلوئے خامہ میں سرمہ مداد دودِ دل ہے
مگر لکھنا ہے وصف خاتمہ جلد رسالت کا

علم طب کی مسلمہ حقیقت ہے کہ سرمہ کھانے سے قوت گویائی متاثر ہو جاتی ہے۔ دوسرے سرمہ کے لیے دود دل کا استعارہ بھی حکمت سے خالی نہیں۔

؎ رقیبوں پر ہوئی کیا آج فرمائش جواہر کی
کہ ہیرا عاشق خط زمرد فام لیتا ہے

یہ بھی طب کے مسلمہ اصول سے ہے کہ ہیرا کھانا موت کا سبب ہوتا ہے اور معشوق کے زمرد گوں خط کی رعایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے نے ہیرے کا صرف نام ہی نہیں سنا بلکہ اُس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔

ہیرا کھانے سے موت اس طرح واقع ہوتی ہے کہ قلب جگر کٹ کٹ کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اُس کو مومن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

؎ الماس ریزہ تھا رے آنسو کے ضبط سے
ہے پاش پاش سب جگر اور لخت لخت دل

ان چند اشعار کے علاوہ ایسے اشعار جن میں کسی طبی اصطلاح کا ذکر ملتا ہے متعدد ہیں نمونے کے طور پر کچھ یہاں نقل ہوتے ہیں

؎ کس کو بھلا خلل یرقاں کا ہے اے طبیب
پھولی ہے باغ عشق کی یاں آن کر بسنت

بسنت میں سرسوں کے پھولوں کی زردی مریض یرقاں کی آنکھوں کی زردی سے مشابہ ہوتی ہے۔

؎ کابوس رہیں بتاتے مجھے واں تو رشک ہے
کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں

سہ نالہ رشک نہ ہو باعث دردِ سر مرگ
غیر کے سر پہ لگاتا ہے وہ صندل گھس کے

اس شعر میں علمِ طب کے دو اشارے موجود ہیں ۱۔ عالمِ احتضار میں مریض کے سر میں درد ہوتا ہے ۲۔ سر درد کی حالت میں صندل گھس کر لگانا نافع درد ہے۔

سہ کھلائے نہ سرمہ کیوں گو سالہ کو
مجل سامری چشم پر فن سے ہے

علم الاخلاق: عربی اور فارسی ادب کی طرح اخلاق سنسکرت شاعری اور افسانوی ادب کا بھی خاص موضوع رہا ہے۔ اور سنسکرت کے زوال کے بعد ملک میں بولی جانیوالی ہرا ں اور اپبھرنشوں کے ادب بھی اخلاقی جواہر پاروں سے مالا مال رہے۔ گویا اخلاق ہندوستانی ادب کا خاص موضوع رہا ہے۔ اودھی اور برج زبانوں کو یہ چیز ورثہ میں ملی۔ بہاری کے ماقبل اور مابعد کے شعراء بھی اپنی شاعری میں برابر اخلاق کی تبلیغ کرتے رہے اور ایک حد تک اس چیز کو ادب کا مقصد تسلیم کیا جاتا رہا۔

بہاری کا زورِ قلم زیادہ تر ہجر و وصال، طنز و ظرافت اور مناظرِ فطرت پر صرف ہوا ہے۔ لیکن ایسے دوہوں کی بھی کمی نہیں جن میں اخلاقی مسائل کو موضوعِ اظہار بنایا گیا ہے۔ ہجر و وصال، طنز و ظرافت اور مناظرِ فطرت کی طرح ہی اخلاق بھی اُن کی شاعری کا موضوع ہے۔ ڈاکٹر گنپت چندر گپت نے دو دوہے ثبوت میں پیش کئے ہیں جن کے مفاہیم علی الترتیب حسب ذیل ہیں۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ طبیعت کی شگفتگی نہ تو کم ہو اور نہ دوست پژمردہ اور مضمحل ہوں تو شفقت سے مرض (چکنائی ہوئی) طبیعت پر برائیوں (غرور، غصہ، طمع وغیرہ) کی گرد نہ جمنے دو۔ کیونکہ اس سے یہ ناصاف اور آلودہ ہو جائے گی۔ جس کی وجہ سے صفائی اور روغنیت دونوں ختم ہو جائیں گی۔ ۱۸۱ ص

"اپنے اپنے وقت پر سب خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی شکل بھی بدصورت نہیں ہوتی یہ تو صرف ذوقِ طبیعت کی بات ہے کہ جس سے طبیعت کو زیادہ وابستگی ہوتی ہے اُس کی طرف اتنی ہی کشش ہوتی ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا ان دوہوں کے علاوہ ستسئی میں اور بھی بہت سے دوہے ہیں جن سے اخلاق کی تعلیم ملتی ہے اول تو یہ بہاری کا خاص رنگ ہی ہے دوسرے اُنھوں نے روایات کا نباہ کرنے کی غرض سے بھی اس موضوع کو اپنی فکر سے مزید جلا بخشی ہے۔

مومن کی غزلوں میں اخلاق کا فقدان ہے جس کی وجہ ایک تو اُردو شاعری کی روایات ہیں اخلاق کو اُردو غزل میں قدیم سے ہی کوئی نمایاں مقام نہیں ملا۔ البتہ متاخرین نے زمانہ کے اقتضا اور ماحول کے زیرِ اثر اسکو بھی اپنے موضوعات میں شامل کر لیتا تھا۔ مومن اگرچہ مقلد سے زیادہ مجتہد ہیں لیکن اُن کا اجتہاد تغزل کے ارد گرد ہی منحصر ہے۔ دوسرے مومن زندگی بھر اخلاق کی تعلیم دینے والی ہستیوں واعظ اور ناصح سے ذہنی طور پر دست بگریباں رہے۔ انھوں نے اخلاق کے ان مبلغین کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ سخت سے سخت طنز اور تنقید کے حربے جو وہ استعمال کر سکتے تھے کرتے رہے ۔۔۔۔

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شب فراق
ناصح کو بھی لے آؤ کہ افسانہ خواں نہیں

کس صنم کو چھڑا دیا واعظ
لے خدا تجھ سے انتقام مرا

سوچنے کی بات ہے کہ جب ناصح اور واعظ اسی وجہ سے
ور دعتاب تھے کہ اخلاق کی تعلیم دینا اُن کا نصب العین
تھا تو پھر مومن خود واعظ و ناصح بننا کیسے گوارا کر لیتے۔
س لیے قصداً تو اُنھوں نے اخلاق کو اپنے اشعار میں نظم
یا نہیں ہے۔ لیکن غیر ارادی طور پر وہ ایسے اشعار کہہ
ئے ہیں جن میں ہمیں اخلاقی تعلیم کی جھلکیاں نظر آجاتی
یں۔ اگرچہ ان اشعار کو صریح طور پر پند و موعظت سے
بیر نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ مومن زاہد خشک تھے بھی
یں مگر پھر بھی اُن میں اخلاقی تعلیم کا عنصر کسی نہ کسی حد تک
جود ہے۔

ملنے کو خاک ہی میں تجلیوں کا مال ہے
دیکھو تو ہے کسی کو بھی غنچے کے زر سے فیض

مومن تم اور عشق بتاں اے پیر و مرشد خیر ہو
یہ ذکر اور منھ آپکا صاحب خدا کا نام لو

مومن ہوا رقیب حذر اے صنم پرست
ایسے سے ڈریئے جس کو خدا کا بھی ڈر نہ ہو

م الشعر: بہاری کی علم شعر یا کاوے شاستر کی
معلومات کے ثبوت میں ڈاکٹر گنپت چندر
ت نے جو دوہا پیش فرمایا ہے اُس کا مفہوم ملاحظہ ہو

"دلالہ ہیروئن سے کہتی ہے کہ اے رفیقہ گوآ (گایوں
کو چرانے والے) چوپال سے اُٹھ گئے ہیں۔ اور راستے پر
گرد چھائی ہوئی ہے۔ چل یہی شام کا وقت محبوب کے ساتھ
سیر کرنے کیلئے مناسب ہے۔"

اس دوہے میں ایک لفظ "سیل" بروزن "غیر" آیا
ہے جس کا ترجمہ ہم نے سیر ہی کیا ہے۔ اگر اس لفظ کو لفظ
"شیل" (بہ معنی کوہ) کا تدبھو سمجھا جائے تو آخری حصہ کا
مفہوم "چل محبوب کے ساتھ پہاڑی پر ملاقات کا یہی عمدہ
وقت ہے" ہوگا

اس دوہے پر ہم نے مختلف زاویہ ہائے نظر سے غور کیا
لیکن یہ کسی طرح نہ سمجھ سکے کہ اس سے شاعر کی علم الشعر کی
معلومات کا اظہار کس طرح ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے
حصے میں آتے ہوئے الفاظ "چل، بلی، ال" کے صوتی آہنگ
سنجھوکھے، مندھیا" اور "گوپ، گورج، گیل" میں تجنیس
کی خوش صوتی سے فاضل نقاد نے ایسا نتیجہ اخذ کیا ہے۔
یا ممکن ہے اس دوہے کا کسی خاص پہلو سے مطالعہ کرنے
اور اُس پر غور کرنے سے ایسا نتیجہ نکلتا ہو۔ مگر وہ پہلو ہماری
نظروں سے ابھی تک پوشیدہ ہے۔

رہا بہاری کا عالم علم الشعر ہونا۔ اس سے کسی کو کب
انکار ہو سکتا ہے۔ بہاری ہوں یا مومن دونوں چوٹی کے
شاعر تھے پھر بھلا کس طرح ممکن ہے کہ وہ علم شعر سے جاہل
محض ہوں گے۔ ستسئی کے دوہوں کی ماترائیں اور سیتیاں
ہی اُن کے پنگل کے عالم ہونیکا کافی ثبوت ہیں۔ مومن کی
غزلوں کی بحریں اور ان کے اوزان بھی اُن کے فن عروض
پر مہارت کی بین دلیل ہیں۔ اس بحث میں زیادہ پڑنا وقت

کی اضاعت ہے۔ اس لیے اُس کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔ بہر حال دونوں ہی اُستاد شاعر تھے۔

علم شہوانی: بہاری محبت کے شاعر ہیں اور محبت کے دونوں پہلوؤں وصل اور ہجر میں اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ خوب اور بہت خوب ہے بلکہ ہندی شعراء کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ ستسئی میں وصل محبوب و محب کے متعلق دوہوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہاں وصل و ہجر اور فطرت کی منظر نگاری وہ چیزیں ہیں جن میں بہاری کی شاعری اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ وہ دوہے جن میں محبت کرنیوالے دو جسموں کا میل دکھایا گیا ہے وہ آج بھی نوجوانوں کے دلی جذبات کی سچی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن بہاری کبھی کبھی ماحول کے زیر اثر متانت اور شائستگی کی حدود سے آگے بھی بڑھ گئے ہیں اور ایسے ہی دوہے شہوانیت کے مظہر ہیں مگر اس میں اُن کو قصوروار نہ ٹھہرا کر ماحول کو ہی قصوروار ٹھہرانا زیادہ مناسب ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ اُن کے بہت سے دوہے وصل محبوب کی کیفیات کے سچے ترجمان ہیں۔ ڈاکٹر گنپت چندر گپت نے جو دوہا پیش کیا ہے اُس کا مفہوم یہ ہے۔

"دو چاہنے والوں کے وصل سے اُن کے حسن میں نکھار آجاتا ہے۔ اُس وقت باہم ہنسنا، سسکی لینا ایک دوسرے کے اعضاء کی مالش کرنا (دبانا یا رگڑنا) جھپٹ کر لپٹ جانا وغیرہ ایسی کیفیات ہیں جن کا لطف نجات کے لطف سے بھی افضل ہے۔ عیاش طبائع کے لئے اصل نجات تو یہی ہے۔ اس نجات کے روبرو دیگر اشیاء یہاں تک کہ بیش قیمت موتی بھی ہیچ ہیں۔"

بہاری ستسئی میں ایسے دوہے متعدد ہیں۔ لیکن اُن کو کسی علم یا فن کا مظہر ماننا باعث صد ننگ و عار ہے۔ شہوانیت کے بیان کو علم یا فن تصور کرنا بھی علم و فن کی توہین ہے۔ اور کسی بھی دور میں طائفہ شرفا کیلئے ایسے بیانات [illegible] نہیں رہے۔ اگر محبوب سے چھیڑ چھاڑ کو جبراً کوئی فن تسلیم ہی کرنا پڑے تو ہم حکیم مومن خان مومن دہلوی کے دیوان غزلیات پر بھی ایک نظر ڈالے لیتے ہیں۔

مومن دبستان دہلی کے مسلم الثبوت اُستاد تھے اول تو اس قسم کے بیانات طائفہ شرفا کے ہی شعرائے دہلی کی نظروں میں بھی مبتذل ہی تھے۔ اُن کی شاعری کا مقصد نوجوانوں کے شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنا نہیں تھا۔ دوسرے مومن کی تمام زندگی ہجر معشوق میں جلتے ہوئے ہی کٹی اس لئے اُن کے یہاں وصل کا لطف اور اُس کی کیفیات تلاش کرنا بھی فضول ہے مومن کے یہاں لطف وصل کی بجائے محرومی وصل ہے۔

؎ وصل کی بات کب بن آئی تھی
دل سے دفتر بنائے لوگوں نے

وہ کہاں پاس سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

؎ ملے شب وصل غیر بھی کافی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

اب رہا دوسروں کے وصل کا بیان تو مومن اس معاملے میں کافی سخت واقع ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی غزلوں میں اپنی ہی واردات قلب کو نظم کیا ہے۔ اور ایک سوختہ دل انسان کو دوسرے کا عیش اچھا ہی کب معلوم ہوتا ہے جو اس

بیان اُس کو مرغوب ہو اور وہ بھی رقیب روسیاہ کا۔ مومن کے ساتھ بھی المیہ ہے وہ اگر کبھی مراد کو پہونچے بھی تو بھی اس طرح کہ ؎

محبت میں ایک رات کی وہ تنگ آگئے
طول امل سے قصہ مرا مختصر ہوا

؎ وصل کی شب شام سے میں سو گیا
جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

پھر بھی بہاری کے وصل محبوب کے اشعار کے مقابلے میں ہم دیوان مومن سے معاملہ بندی کے کافی اشعار پیش کر سکتے ہیں جن میں وصل محبوب جیسا ہی لطف پنہاں ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ فحاشی بھی نہیں ہے۔ معاملہ بندی کے مومن استاد ہیں۔ چند شعر یہ ہیں

؎ محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

؎ گر پھر بھی اشک آئیں تو جانوں کہ عشق ہے
حقہ کا منہ سے غیر کی جانب دھواں چھوڑ

؎ کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

؎ چین جبیں کو دیکھ کر دل بستہ تر ہوا
کیسی کشود کار کشاد نقاب میں

؎ بیوفائی کا عدو کی ہے گلہ
لطف بیگانہ ستاتے ہیں مجھے

یا غزل ۴۸ کے اشعار

؎ کیسے مجھ سے بگڑتے تم اللہ اکبر رات کو
ذبح ہی کرتے جو ہوتا پاس خنجر رات کو

؎ بوئے گل کا اے نسیم صبح اب کس کو دماغ
ساتھ سویا ہے ہمارے وہ گل پیرہن رات کو

؎ کود کر گھر میں تو پہونچا سنتے ہی ...
دم نکل جاتا تھا کھٹکے سے برابر رات کو

اور اس اعتراف کے ساتھ ہم اگلا موضوع زیر بحث لاتے ہیں کہ مومن کے کلام میں شہوانیت یا فحاشی جیسی چیز کا قطعی فقدان ہے اور بلاشبہ یہی اساتذہ دہلی کا طرۂ امتیاز ہے۔

علم الہندسہ: ستسئی میں علم الہندسہ یا علم الحساب کی معلومات کا مظہر صرف ایک شعر ہے۔ جس کا مفہوم حسب ذیل ہے۔

"سب کہتے ہیں کہ بندی (صفر) کے اضافے سے عدد کی قیمت دس گنا ہو جاتی ہے۔ لیکن عورت کی پیشانی پر بندی لگانے سے اُس کے حسن میں شمار اور اندازہ سے زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔"

عورت کی پیشانی کی بندی سے اُس کی حسن افزائی کس حد تک ہوتی ہے۔ اس کا اس سے بہتر پیرایۂ بیان تصور میں نہیں آتا۔ بلاشبہ یہ ستسئی کا عمدہ دوہا ہے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ اس سے شاعر کو اپنا حساب دانی کا اظہار ہرگز مقصود نہیں تھا۔ یہ ناقدین کی موشگافی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ بہاری کو اگر علم حساب کا مظاہرہ ہی مقصود تھا تو وہ اُس کا اظہار ... اس مسئلہ سے کرتے "کہ عدد پر صفر لگانے سے اُس کی قیمت دس گنا ہو جاتی ہے" جس کو ایک دوسری جماعت کا طالب علم بھی بخوبی سمجھتا ہے۔ یقیناً ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ اور نہ

شاعر کا مقصد ہی اس دوہے کی تخلیق سے وہ تھا جو اب سمجھا جاتا ہے یا جس کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

موہن ریاضی کے بہت بڑے عالم تھے۔ پروفیسر ضیا احمد بدایونی مقدمہ دیوان مومن کے صفحہ ۲۵ پر سید ناصر حبیب صاحب دہلوی نبیرہ مومن دہلوی کے ایک خط کے حوالے سے ارقام فرماتے ہیں کہ "خواجہ محمد نصیر کے سوا اس (ریاضی) میں کوئی اُن کا ہم پلہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ مومن فن نجوم اور رمل کے بھی بڑے عالم تھے اور یہ حقیقت ہے کہ بغیر ریاضی کے اِن علوم اور خاص کر نجوم سے واقفیت کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ ہاں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُنکے دیوان میں علم الحساب کے مسائل نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ غزل میں ایسے مسائل بیان کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ شعر و شاعری اور خاص کر غزل میں دیگر علوم کی گنجائش تو نکل سکتی ہے لیکن علم حساب کی نہیں۔ مومن غزل کے اندر رہ کر اُس کے تمام تر قیود کی پابندیوں کے باوجود جتنا کچھ غیر متعلق کہہ گئے اُس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے سے ممکن نہ ہو سکا اور اگر ہمیں اُن کے اشعار میں ہی علم الحساب میں اُن کی مشاقی دیکھنے کا اصرار ہو تو براہ راست تو ایسا ممکن نہیں ہے لیکن ہمیں چاہیئے کہ اُن کے اُن اشعار کو پڑھ لیں جن میں انہوں نے تاریخ گوئی کا سہارا لیکر بعض احباب کے اسماء کے معمے لکھے ہیں۔ کیونکہ علم حساب جہاں اپنے میں ایک الگ علم ہے وہاں تاریخ گوئی کا ایک ضروری جزو بھی ہے۔

علم صنعت یا سائنس: اس بحث کو ہم نے دو ناموں سے اس لیے معنون کیا ہے کرستسئی کے ناقدین نے اس کا الگ الگ دو ناموں سے ہی ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ کی بحث میں سب سے مشہور دوہا وہ ہے جس میں انسان اور فوارے کے پانی کی مماثلت دکھائی گئی ہے۔ دوہے کا مفہوم اس طرح ہے۔

"انسان اور فوارے کے پانی کی حالت ایک جیسی ہی ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں جتنے نیچے ہو کر چلتے ہیں اُتنے ہی بلند ہو جاتے ہیں"

انسان کے حق میں بہاری کا دوہا بالکل درست ہے اور مفید اخلاق بھی۔ لیکن یہاں ہم نے جس لفظ کا ترجمہ فوارہ کیا ہے وہ لفظ اصل میں "نل" ہے۔ جس کے نل اور فوارہ دونوں معنی مراد لینے پر بھی دوہے کی اصل منشا کو پہونچنا مشکل ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ نل یا فوارہ کا پانی نیچا ہو کر چلنے سے بلند کس طرح ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنے فاضل دوست جناب اوم پرکاش شرما پر آرتھی جو اچھے ادیب اور شاعر اور ہندی و سنسکرت کے عالم ہیں سے بھی اس موضوع پر گفتگو کی اُنھوں نے نل سے کمل کی شاخ مراد لی۔ اُن کے خیال کے مطابق اچانک پانی کے بلند ہونے پر کمل کا پھول سطح آب سے نیچا رہ جاتا ہے۔ اور پھر وہ دھیرے دھیرے پانی کی سطح پر آتا ہے گویا وہ پانی کی سطح سے جس قدر پست رہ جاتا ہے اُس کے بلند ہونے کا اُسی قدر امکان رہتا ہے یہ نکتہ کسی حد تک قرین قیاس تو ہے مگر ایسا تسلیم کرنے پر اس دوہے سے بہاری کی سائنس دانی یا صنعت سے واقفیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ یہ صرف ایک اخلاقی دوہا ہو کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر مکھن لال شرما نے بہاری کی سائنس دانی پر

ثبوت میں جو دوہا پیش کیا ہے اسمیں یہ بات کہی گئی ہے کہ جس طرح قطب نما کی سوئی ہمیشہ شمال کی طرف رہتی ہے اور دوسری طرف گھما دینے پر بھی اسی طرح اس کا رخ شمال کی سمت ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح محبوبہ کی نظر بھی ہمیشہ عاشق پر ہی رہتی ہے۔ (ملحوظ رہے کہ ہندوستان کی قدیم شاعری میں اظہار عشق اور ابتدائے عشق عورت کیجانب سے ہی ہے اس لیے محبت کرنے والے عورت اور مرد کو علی الترتیب نائکا اور نائک کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے)۔

اس دوہے میں بہاری نے قطب نما کے بجائے لفظ قبلہ نما استعمال کیا ہے۔ دیکھیے مومن نے غزل میں لفظ قبلہ نما کس خوبی سے کھپایا ہے۔

جوں قبلہ نما گرچہ تڑپتے ہی کٹی عمر
پر منہ سوئے دیر صنم آرا نہ کریں گے

میرا قلق بھی قبلہ نما سے نہیں ہے کم
باور نہیں تجھے تو ذرا منہ کو موڑ دیکھ

قبلہ نما یا قطب نما کی سوئی کا شمال کیجانب گھومنا مسلم لیکن اس سے بھی زیادہ باریکی اور لطف قبلہ نما کی سوئی کے اضطراب کے بیان میں ہے۔

قبلہ نما کے علاوہ مومن کے دیوان میں اور بھی ایسے اشعار موجود ہیں جن کو موجودہ زمانے کی اصطلاح میں سائنسی معلومات کا مظہر کہہ سکتے ہیں۔

آتش سینہ تفسیدہ کو میں کیا روؤں
اشک جاذب کرہ آب کے مائل نہ ہوا

(طبیعات)

یاں یہ ٹھہری ہے کہ اب بیڑی پہنانی چاہیے
انکو مقناطیس کی جو کھٹ لگانی چاہیے (طبیعات)

کیا باتیں بناتا ہے کیا جان جلاتا ہے
پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا (کیمیا)

سیماب وار مر گئے ضبط قلق سے ہم
کیا قہر ہے طبیعت مائل کو تھامنا (کیمیا)

یہاں ہم بہاری کے دو دوہوں کا ذکر اور ضروری سمجھتے ہیں جن کا ذکر .... کا ڈاکٹر گنپت چندر گپت نے نہیں کیا ہے۔ لیکن ہمیں خیال آتا ہے کہ یہ دوہے ہم نے کسی تنقید میں بہاری کی بسیار دانی کی تائید میں دیکھے ضرور ہیں۔ ان سے بہاری کی علم مصوری کی واقفیت کا ثبوت ملتا ہے۔ پہلے دوہے کا مفہوم ہے

"وہی ہوشیار رادھا جی میری دنیوی مشکلات کو حل کریں جن کے جسم کا نہری عکس پڑنے سے کرشن جی کا سانولا رنگ سبزی مائل ہو جاتا ہے"

اور دوسرے دوہے کا مفہوم ہے

"بانسری پر کرشن جی کے سرخ ہونٹ رکھنے پر ان کی سرخی اور آنکھوں کا پیلا عکس پڑنے سے سبز رنگ کے بانس کی بانسری میں قوس و قزح کے رنگ نمایاں ہو جاتے ہیں"

دونوں دوہوں سے بہاری کی رنگ آمیزی اور مصوری کی معلومات کی تائید ہوتی ہے لیکن ان تمام تقابل میں ایک بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ بہاری ہوں یا مومن یا کوئی دوسرا شاعر اس کی شاعری اس حالت میں زندہ رہ سکتی ہے جبکہ وہ شعریت کی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ جبراً علوم و فنون کا اشعار میں ٹھونس کر اپنی قابلیت جتانا بیجا

تک کہ وہ شاعری کے بجائے معلومات عامہ کا دفتر بن جائے
شاعر اور شاعری دونوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ مطلب
یہ ہے کہ بہآری اور موؔمن دونوں ہی اُستاد شاعر تھے لیکن
یاد رکھنا چاہیئے کہ اپنی شاعری میں وہ اپنی تمام معلومات اور
اپنے تمام علوم و فنون کا اظہار نہیں کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں
اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاعری میں کسی دقیق مسئلہ یا
معلومات افزا چیز کا بیان اُسی حد تک ہی مناسب ہے کہ
اُس سے شعر کی شعریت اور ادبیت ختم نہ ہو۔ اس لیے ان
دونوں ہی بزرگ شعراء کی معلوٗمات صرف اتنی ہی تصور نہ
کی جائے جتنی اُن کے کلام سے ہویدا ہے۔ یہی بات موٗمن
میں بہت خوب اور قابل تعریف ہے کہ اُنھوں نے اُردو
شعراء میں سب سے زیادہ غیر متعلق مضامین غزل میں بیان کئے
مگر اس کے باوصف غزل کی روایات سے انحراف نہ کیا۔
اور غزل کو لغوی معنی میں بھی غزل ہی رکھنے کی کوشش
کی۔ اس میں شاعر کو کس قدر جانکاہی سے کام لینا پڑا ہوگا
اس کا اندازہ وہ شعراء حضرات ہی کر سکتے ہیں جن کو کبھی کوئی
غیر متعلق مضموٗن اس شرط پر نظم کرنا پڑا ہو کہ مضمون کی مغائرت
بھی محسوس نہ ہو۔ اور ہرگز ہرگز موٗمن کا مقصد ایسے اشعار سے
اپنی علمیت کا اظہار کرنا بھی نہیں تھا بلکہ حقیقت صرف یہ ہے
کہ جب ظرف تا بلب پُر ہو تو معمولی تحریک سے ہی لبریز ہو
جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ بہآری
کا میدان وسیع اور موؔمن کا محدود ہے۔ بہآری کھل کر شاعری
کر رہے تھے۔ جبکہ موؔمن صرف غزل کہہ رہے تھے۔ اسلیے بہآری
کیلئے علوم و فنون کا اظہار نسبتاً آسان تھا اور موٗمن کے لیے
مشکل۔ مگر اس کو موؔمن کی قادر الکلامی ہی کہا جائیگا کہ غزل
کو اُس کی حدود میں قائم رکھتے ہوئے اور اُس کی روایات
کا صرف احترام کرتے ہوئے بلکہ غزل میں مکمل طور سے بھی
تغزل کی آمیزش کر کے بھی اُنھوں نے نئے نئے اظہار
کے مواقع نکال ہی لیے۔ پھر بھی کتنی باتیں ایسی تھیں جو وہ
جانتے تھے اور بیان نہ کر سکے۔ موٗمن کا علم و فضل مسلم
لیکن یہ چیز شاعری کی دنیا میں اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی
خود شاعر ہونا اور اظہار بیان پر قادر ہونا۔ گویا اہمیت اس
بات کی نہیں ہے کہ شاعر کا مبلغ علم کتنا ہے بلکہ زیادہ اہم
بات یہ ہے کہ وہ اپنی معلومات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے
پر کس حد تک۔ اور کتنے حسن کے ساتھ قادر ہے۔ لہذا تعریف یا
اہمیت اس کی ہوئی کہ جو کچھ کہا گیا وہ غیر موزوں اور غیر متعلق
تو نہیں ہے۔ اور بس یہیں اگر موؔمن کا پلڑا اتنا جھک جاتا ہے
کہ اُن کی خداداد قابلیت اور اہلیت کی گرانباری کو تسلیم کیے
بغیر چارہ نہیں رہتا۔

بسیار دانی کے موضوع کو لیکر یہاں تک تو صرف علوم
و فنون کی اُن فروعات کا بیان ہوا جو موؔمن اور بہآری میں
قریب قریب مشترک آتی ہیں۔ یا بہآری کے یہاں موجود ہیں
لیکن موؔمن کے یہاں نہیں ہیں۔ مگر اب کچھ ایسی چیزیں باقی
رہ جاتی ہیں جو بہآری نے بیان نہیں کیں یا اگر بہآری نے
اُن کا بیان کیا بھی ہے تو وہ بیان اس قدر غیر واضح ہے
کہ ناقدین نے اُن کو زیر بحث لانا مناسب نہیں سمجھا مگر موٗمن
نے اپنے اشعار میں اُن کو بڑے حسن اور خوبی کے ساتھ پیش
کیا ہے چند اشعار بغیر کسی تشریح و تبصرہ کے عنوان وار درج
کیے جاتے ہیں۔

موسمیات:

؎ دیکھ کر یہ مجمع امڈا کیا ہی ابرِ اشکِ آہ
حلقۂ اغیار اُس کے گرد مہ کا ہالہ تھا

ہیئت:

؎ کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

؎ نہ دینا بوسہ پا گو فلک جھکتا زمیں پر ہے
کہ یہ اتنا زمیں کے نیچے ہے جتنا زمیں پر ہے

تاریخ:

؎ دیکھئے انجام کیا ہو مومنِ صورت پرست
شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

اور اس کے علاوہ متعدد تلمیحات بھی اُنکے عالمِ تاریخ ہونیکی موید ہیں

خوشنویسی:

؎ کیا یہ مطلب ہے کہ برعکس وفا ہوگی جفا
جو تمہارے عہد نامے میں خطِ معکوس ہے

نفسیات:

؎ منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

؎ کس طرح بزم میں وہ آنکھ چرائے مجھ سے
دل کو کھو کر یہ ڈرا تھا کہ میں غافل نہ ہوا

؎ مجھ سے تعریف ہے صبر و سکونِ غیر کی...
کس نے خود مجھ کو تڑپتے پیشِ در دکھلا دیا

عاشق سے مت بیاں کر قتلِ عدو کا مژدہ
پیغام مرگ ہے یہ، یار تک نہ پہونچا

؎ محوِ حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں
بلبلِ تصویر کو کیا [illegible]

معلوماتِ عامہ:

؎ وہ بدگماں ہوا جو کہیں شعر میں مرے
ذکرِ بتانِ خلخ و نوشاد آگیا (جغرافیہ)

؎ بس کہ میں سارے برس روتا رہا غم میں ترے
جیٹھ اور بیساکھ کا بھی چاند ساون ہوگیا

؎ یہ کاہ رُبا سے بھی ہیں کم اے کششِ دل
مذکور کچھ ایسا پسِ چلمن ہے ہمارا

؎ دشمن سگِ کوچہ نہ ہوا سرخوشی آہو چشم کا
نادم ہوں کہ کب گرگ پائے نامہ بریں باندھ کر

یہاں تک تو بیان ہوا مومن کی اُن معلومات اور علوم و فنون کی واقفیت کا جن کا اظہار اُن کے غزل کے اشعار سے ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ کسی آئندہ صحبت میں قصائد اور مثنویات مومن کی شاہانہ شان رکھنے والے قصرِ دلستان کی پچیکاری میں جڑے علمی جواہرات کی نمائش بھی کی جائے گی۔ لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے مومن کا علم و فضل ان ہی احاطوں میں محدود نہیں وہ یا کوئی بھی اپنے تمام علوم و فنون کا اظہار نہ شاعری میں کرتا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ مومن کی علمیت کے بارے میں ہمیں اس کے علاوہ دیگر ذرائع سے اور بھی بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ اشعار میں آئی ہوئی سیکڑوں تلمیحات، اُن کے علم و فضل کا پتہ دیتی ہیں۔ معمیات میں سے معمائے[۳] اور کچھ دیگر تاریخی مادے جو انھوں نے استخراج کئے ہیں اُن کے مشاق تاریخ گو ہونے کے بیّن ثبوت ہیں۔ شطرنج کے کھیل کو بھی اگر فنون میں شمار کیا جائے تو اُس میں بھی وہ یگانۂ روزگار تھے۔ دیوان مومن مرتبہ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے مقدمے سے اُنکی موسیقی میں مہارت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ پروفیسر صاحب

مکان

ابوالوقار علیم صدیقی

مکان تو آپ نے بہت دیکھے ہوں گے چھوٹے بھی بڑے بھی ـــــ لق و دق صحرا ایسے اور تنگ و تاریک کوٹھری جیسے ـــ مکان تو وہ بھی ہوتے ہیں جنھیں ہم او با "دولت خانہ" کہہ دیتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ "غریب خانہ" سے بھی بدتر ہوتے ہیں ـــ مکانوں کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جسے اس کے مکین بڑے انداز سے "محل" کہتے ہیں۔ یہ بات وے دیگر کہ ان حضرات کے اس ارشادِ گرامی کے بعد ہم اور آپ تاریخ کے صفحات کو اس جستجو میں پلٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ شاید کسی بادشاہ کا، اور اگر وہ بھی نہ سہی تو کسی رجواڑے کا یہ بھی نہ ہو تو کسی امیرِ سلطنت کا محل ہی، اس انداز کا مل جائے تاکہ ہم اور آپ اُن حضرات کے اس محل نما دعوے کو بیک جنبشِ لب رد نہ کر سکیں لیکن ایسے موقعہ پر ہماری اور آپ کی جستجو رائیگاں ہی جاتی ہے۔ اور پھر مجبوراً ہمیں اُن کے ارشادِ گرامی کے اقرار میں سرِ تسلیم خم ہی کرنا پڑتا ہے۔

بمبئی میں مکانوں کی ایک قسم اتنی مختصر ہوتی ہے جنھیں وہاں کی زبان میں "کھولی" کہتے ہیں ـــ اسی کھولی میں لوگ رہتے بھی ہیں اور سوتے بھی ـــ لیٹتے بھی ہیں اور بیٹھتے بھی ـــ پھر اس پر مزید طرہ یہ کہ افزائشِ نسل سے مایوس بھی نہیں ہوتے۔ اب یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ آپ بے مقصد باتوں میں سر کھپا ئیں اور موضوعِ سخن کو کہیں سے کہیں پہنچا ئیں۔

دہلی میں کچھ مکانات اس قسم کے بھی ہوتے ہیں مثلاً جب ہم دہلی آئے نہیں، بلکہ بھجوائے گئے تو ہمیں بھی اور انسانوں کی طرح ایک مکان کی ضرورت محسوس ہوئی اور ہمارا یہ احساس، بخدا، محض فطرتِ بشری کے تحت تھا۔ ورنہ کیا وجہ تھی کہ بے مقصد ہم ایک چھوٹے سے مکان کے لیے اس طرح حیران و پریشان ہوں کہ دوسروں کو ہماری پریشانی سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ ملے۔ لیکن صاحب ہم یہ تو کر نہیں سکتے تھے کہ حضرت ڈارون کے مولویت : علی کی طرح کسی غار یا پیڑ کو اپنا جائے مسکن تصور کر لیتے ـــ ہم بہرحال انسان ہیں اور پھر حضرت انسان کو یہ دعویٰ، ازل سے رہا ہے اور ابد تک رہے گا کہ وہ اشرف المخلوق ہے چنانچہ اوروں کیلئے بنا ہے یہ بات، غرور و تکبر کی غمازی ہو

لیکن ہمارے لیے فخر کا باعث ــــ یہ بات دوسری ہے کہ یہی فخر کی تہمت ہمیں دھکے بھی کھلاتی ہے اور گالم گلوچ سے بھی دوچار کراتی ہے لیکن ؎

یاں وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اتار دے

چنانچہ فطرت بشری کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہم نے اپنی اس دیرینہ خواہش کو مکان کے دلالوں کے ہاتھ میں دیدیا۔ اور پھر صاحب ان دلالوں نے محض ہم کو مکان ٹائپ کی چیزوں کو دکھانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہماری ناچیز معلومات میں بھی مستقل اضافہ کرتے رہے۔

سب سے پہلے جس مکان کا ہمیں دیدار ہوا اس کیلئے ہمارے دلال صاحب نے فرمایا "تین کمرے ہیں، باورچی خانہ غسلخانہ اور پاخانہ ساتھ میں ــــ" کرایہ صرف ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار رہی بات پگڑی کی تو آپ تو خود ہی جانتے ہوں گے کہ پگڑی یہاں کے افراد کی مختصر سی زندگی کا سب سے بڑا پہلو بن چکی ہے۔ ویسے یہ پگڑی ہماری روایتی سلیمانی ٹوپی سے کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں، سلیمانی ٹوپی میں یہ کرامت تھی کہ ادھر آپ کے سر مبارک کی زینت بنی اور ادھر ہر کام آپ کی مرضی کے مطابق اس انداز میں ہونے لگا کہ پاس پڑوس والوں کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ باتیں ہیں اس دور کی جب حضرت انسان اپنا کام سو پچاس خرچ کرکے نکال لیا کرتے تھے لیکن اب تو معاملہ، لاکھوں سے نیچا ہوتا ہی نہیں، اسی لیے اس لاکھوں کی ہیر پھیر کو چھپانے کے لیے، سلیمانی ٹوپی ناکافی ثابت ہوئی اور پھر ضرورت ایجاد کی ماں کے تحت، پگڑی کی ایجاد ہوئی اور یہ بھی قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ پگڑی ایجاد کی ان لوگوں نے جنکی پگڑی سر بازار اچھل چکی ہے لیکن پگڑی لینے اور دینے والے حضرات کو اس سے کیا غرض کہ پگڑی سر بازار اچھلی کہ محفل ان کو اپنے کام سے کام بقول شاعر

؎ اچھلی جو پگڑی اور بھی بے باک ہوگئے

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دلال صاحب مکان دکھانے لے چلے اور راستہ بھر ہم، بوسیدہ کوٹھریوں اور تنگ و تاریک مکانوں پر حقارت بھری نظر ڈالتے رہے اور دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہوتے رہے کہ اب ہمارے پاس بھی اس اجنبی شہر میں ایک ایسا مکان ہوگا جس میں تین کمرے ہوں گے اور غسل خانہ۔ پاخانہ، باورچی خانہ بھی ساتھ ہوگا۔ لیکن جب اس مکان کی زیارت فرمائی تو ہم، ہوشمندی اور بے ہوشی کی درمیانی کسی کیفیت سے دوچار تھے۔ کیونکہ مکان کی مکانیت محض ایک کمرہ تک محدود تھی اور کمرہ بھی اللہ نظر بد سے بچائے۔ اس قدر تاریک کہ ہمیں دلال صاحب کی بصارت پر دھوکا ہوا کہ کہیں وہ حضرت ہمیں "چمگادڑ" یا الو سمجھ کر تو نہیں پکڑ لائے

کمرہ تھا تو بوسیدہ اور تاریک مگر اس کی چھت کی دھنیاں اور شہتیریں، رکوع کے انداز میں، زمین کی سمت خاموشی سے مائل پرواز تھیں، اسی کمرہ کے ایک کونے میں ایک کرم خوردہ بالٹی رکھی تھی، یہ تھا غسل خانہ اور اسی کے برابر ایک پتلی سی نالی، یہ تھا استنجا خانہ ہم نے بڑی ہمت کرکے حواس یکجا کئے اور دلال صاحب سے عرض کیا۔

"حضور وہ تین کمرے کہاں ہیں ــــ؟"

بڑے انداز سے کھسیائے نہیں بلکہ مسکرائے اور پھر یوں گویا ہوئے۔

"جی ، ایک یہ سونے اور بیٹھنے کا کمرہ اور یہ غسل خانہ اور
پاخانہ ۔" کیا خوب ، گویا ان کے حساب سے پتلی سی نالی اور
ٹوٹی ہوئی بالٹی رکھنے کی جگہ ایک ایک کمرہ کی حیثیت رکھتی
تھیں ۔

ہم اس مکان سے بھاگ تو آئے لیکن بخدا دل شکستہ
نہیں بلکہ خوش خوش کہ اللہ نے بچایا اس برے وقت سے
جب اس مکان کو کرایہ پر لینے کے بعد ہمارا بھی شمار چمگادڑ
اور اسی قسم کے دوسرے حشرات الارض میں ہونے لگتا۔
ممکن ہے آپ نے بھی اس قسم کے مکانات بذات خود
دیکھے بھی ہوں گے اور دوسروں کی زبانی ان کی عبرتناک
داستان بھی سنی ہوگی تو حضور ایک ذرا آپ کو زحمت ہوگی
لیکن گذارش ہے کہ اس مکان کی بھی زیارت فرما لیجئے اور
یہ محض میرا خیال نہیں بلکہ دعویٰ ہے کہ اس مکان کی زیارت
کے بعد آپ حیران و ششدر کم ہوں گے اور سجدہ شکر
خوب خوب بجائیں گے کہ اس بیسویں صدی میں بھی آپ کو
ماضی کا ایک غار نما مکان دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ۔
یہ مکان جو اس وقت میری گفتگو کا موضوع اور آپ
کی توجہ کا مرکز بن رہا ہے میرے دوست کا نہیں بلکہ میرے
دوستوں کا ہے ۔ ٹھہریئے ۔ آپ کی حیرانی بڑھنے سے پہلے ہی
میں لفظ "دوستوں" کی تشریح کئے دیتا ہوں فی الحال اس
مکان کے قابض تین افراد ہیں دو مرد اور ایک عورت ۔
گو کہ ہیں تو یہ صرف تین ہی اور فیملی پلاننگ کا نعرہ بھی یہی
ہے "دو یا تین بس" لیکن یہ حضرات اپنے مکان کا دروازہ
اور کھڑکیاں ہر کس و ناکس کیلئے اس انداز سے وا کئے رہتے
گویا سہ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

ان حضرات کا ہر ایک سے یہی اصرار رہتا ہے "تشریف
لائیے اور اگر قوت برداشت غیر معمولی ہو تو اس مکان میں
ٹھہرنے کی زحمت بھی فرمائیے ۔"
پچھلے ہفتہ ہمیں بھی اس عجیب و غریب مکان کی زیارت
کا شرف نصیب ہوا اور وہ دن اور آج کا دن کہ سوتے سوتے
عموماً ایسے جملہ دہراتا ہوں "نکالو مجھے اس مکان سے" "اللہ
بچائے برے وقت سے" وغیرہ وغیرہ ۔
یہ بھی کچھ عجیب اتفاق تھا کہ گئے تھے اپنے بیمار
دوست کی عیادت کرنے اور واپس ہوئے تو اس انداز
سے گویا کہ ہم خود بیمار ہیں ۔ اب ذرا اس مکان اور اس کے
مکینوں سے تفصیلی تعارف فرمائیے ۔
باہر سے آواز دی
"جمال صاحب"
اندر کے کسی گوشے سے آواز آئی
"تشریف لائیے"
اندر داخل ہوئے اور اندر بھی وہ اندر جس کا اندر یا
سب ایک ، حیران و پریشان ادھر ادھر نظر دوڑائی تو
سامان تو بے شمار نظر آیا لیکن انسان نما کوئی چیز نظر نہ آئی
ہم اس پریشانی میں کھڑے ہی تھے کہ ایک آواز نے مخاطب
کرنے کی کوشش کی
"سلام علیکم"
آواز کی سمت بے ساختگی میں گھومنے کی کوشش کی تو
سر ایک پڑے سے ٹکرایا اور ہم سر سہلانے بھی نہ پائے تھے کہ
اسی پڑے پر سے آواز آئی ۔
"اخاہ آپ ہیں"

اب ہم نے سوچا کہ پہلے سلام والی آواز کا تعاقب کیا جائے اور صاحب آواز کو ڈھونڈا جائے۔ جستجو ان معنوں میں زائد نہ کرنی پڑی کہ کمرے کی وسعت، تنگیٔ داماں سے بہت قریب تھی لیکن اس کے باوجود سامان سے اٹے نک سے صاحب آواز کو ڈھونڈھ نکالنا یہ کچھ ہمارا ہی کام تھا۔ اگر نہ اس جگہ آپ ہوتے تو بخدا "اللہ ھو" کا نعرہ مار کر، کمرہ کے باہر چست لگاتے نظر آتے اور پھر شاید کبھی بھی ادھر کا رخ نہ کرتے۔ لیکن دہلی آنیکے بعد ہم کو، مکان بھی کباڑیوں کے محلہ میں ملا ہے اس لیے کاٹھ کباڑ سے گوہر مقصود ڈھونڈھنے کا آرٹ اب کچھ کچھ ہم کو بھی آ گیا ہے اور اسی آرٹ کے طفیل ہم نے سلام علیکم کا نعرہ بلند کرنیوالے حضرت کو ڈھونڈھ ہی نکالا۔ یہ ہمارے وہی دوست تھے جن کی عیادت کیلئے ہم بہ نفس نفیس حاضر ہوئے تھے۔

"کہیے مزاج تو اچھے ہیں" یہ کہہ کر ہاتھ ملانے کی خاطر ہمارے ان دوست نے اپنی کرسی سے جو ذرا جنبش کی تو کچھ تو سامان کے گرنیکی گڑگڑاہٹ اور کچھ ہمارے حلق سے گھبراہٹ میں نکلی ہوئی بے تکی آوازوں نے وہ تال سر پیدا کیا کہ ہمیں بے ساختہ وہ دعائیں یاد آنے لگیں جو دافع بلیات کے طور پر ہمیں یاد کرائی گئی تھیں اور جن کو ہم نے ایسے ہی آڑے وقتوں کے لیے اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا تھا۔

ابھی اس کیفیت سے دوچار ہی تھے کہ ایک دم سے "یا علی" کا نعرہ بلند ہوا۔ گھبرا کر جو پلٹے تو پڑے پر ہمارے بیمار دوست کے تندرست بھائی نظر آئے۔ وہ حضرت بڑی بے تکلفی سے اپنے کپڑوں سے کافی حد تک بے نیاز ہو کر کثرت سے کسرت کر رہے تھے۔ ہمیں گھورتا دیکھ کر وہ کچھ کھسیائے اور دھم سے نیچے کو د آئے۔ تولیہ سے بدن پونچھتے ہوئے جلدی جلدی کپڑے پہننے لگے۔ کپڑے پہننے کے بعد ان حضرت نے ایک ہانک لگائی "آ جاؤ۔"

ہم تو مقام حیرت میں نہیں بلکہ گوشۂ حیرت میں پھنسے ہوئے تھے ہی، اس لیے اس آ جاؤ کی آواز کا رد عمل معلوم کرنے کے لیے ہر گوشہ پر چوکس نگاہ دوڑانا شروع کر دی کہ خدا معلوم کس خانہ سے کون نکل آئے۔ اتنے میں چق اُٹھی اور ہمارے دونوں دوستوں کی بہن صاحبہ اندر تشریف لائیں۔

"آداب۔" یہ کہہ کر بڑے شپے تلے انداز میں ہم سے کتراتی ہوئی اور تمام چیزوں سے دامن بچاتی ہوئی کونے کی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئیں

"کیا پئیں گے آپ۔"

"پیوں گا تو بعد میں پہلے یہ بتائیے کہ آپ تھیں کہاں؟"

"کہیں نہیں ذرا باہر ٹہلنے لگی تھی کیوں کہ اندر بھیا کسرت کر رہے تھے۔"

"کیا خوب۔" ہم نے اخلاقاً ہنستے ہوئے کہا، "گویا ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔"

"معاف کیجیے ابھی آپ سمجھ نہیں پائے۔ دو تلواریں تو کیا تین تلواریں اس میان میں رہتی ہیں لیکن ایک دوسرے کی موجودگی میں جوہر دکھانے کی اجازت نہیں۔"

"اماں چھوڑو ان باتوں کو۔" ہمارے بیمار دوست نے ہمیں ٹوکا۔ "یہ بتاؤ کہ آنا کیسے ہوا۔"

"سنا تھا تمھاری طبیعت خراب ہے بس دیکھنے چلے آئے۔"

"ہاں بس خراب تھی اب تو ٹھیک ہے۔ ویسے ابھی

ابھی اُوپر سے آیا ہوں۔" اُن کے اُوپر سے آنے پر مجھے سخت
تشویش ہوئی میں نے گھبرا کر پوچھا "نصیب دشمن کیا طبیعت
اس قدر خراب تھی کہ اُوپر تک جانے کی نوبت آ گئی تھی۔"
ہمارے اس ملال پر دو قہقہے اور ایک قہقہہ اس زور سے
پڑے کہ ہم گھبرا گئے اور گھبرانا ان معنوں میں زائد تھا کہ اس
عمر کو پہونچنے کے باوجود ہم، فن عیادت سے صحیح طور پر واقف
نہ تھے۔ ڈرے اس لیے کہ کہیں کوئی غلط جملہ ایسا تو نہیں نکل گیا
جس سے ان حضرات کی دلشکنی ہوئی ہو۔ ہماری گھبراہٹ
سے تھوڑی دیر لطف اندوز ہونے کے بعد بہن صاحبہ نے
بڑے حاکمانہ انداز سے بھائیوں کو ڈانٹا اور مجھے ڈھارس
دینے کے طور پر کہنے لگیں۔
"آپ بھی کہاں ان لوگوں کے چکر میں پڑ گئے۔ آیئے آپ کو
مکان کی سیر کرائیں۔" ہم نے اس جملہ پر دل ہی دل میں شکر ادا کیا
کہ چلو بلا ٹلی۔ مکان کی سیر کے بعد فوراً معذرت کر کے رخصت
کی اجازت لیں گے۔
لیجیے صاحب مکان کی سیر اس انداز سے کرائی جانے لگی۔
یہ تینوں تختے پلنگ کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں
اور جب ضرورت نہیں ہوتی تو اُنھیں کھڑا کر دیا جاتا ہے
جیسا کہ آپ نے تھرڈ کلاس کے تھری ٹائر میں دیکھا ہوگا۔ یہ
اسٹول بظاہر تو ایک اسٹول ہی نظر آتا ہے لیکن ایک ذرا
اُوپر کا پٹرا ہٹایئے تو پھر دیکھیے کیا سے کیا ہو جاتا ہے یعنی
اسٹول سے کموڈ اور استعمال کرنے کے بعد پھر پٹرا رکھ دیا۔
اسی اسٹول پر ہم اور آپ جیسے مسلمانوں سے کہا جاتا ہے۔
"تشریف رکھیے۔"
سامنے جو پردہ پڑا ہے اس کو ہٹایئے تو باورچی خانہ
دکھائی دے گا، جس کی وسعت الماری کے ایک خانہ تک
محدود ہے۔ یہ حضرات کھانا بھی اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں
کیوں کہ اُن کا خیال ہے ہوٹل کا کھانا مہنگا اور بدمزہ ہوتا ہے
یہ بوتل جو سامنے کھونٹی پر ٹنگی ہے اور جس میں ایک
لمبی سی نلی بھی لگی ہے۔ ایسی ہی بوتل آپ نے اسپتالوں میں
دیکھی ہوگی۔ مریض کے خون یا گلوکوز چڑھانے میں استعمال
ہوتی لیکن یہاں اس کی نوعیت دوسری ہے۔ جاڑے
اور بارش کی راتوں میں، یہی بوتل، ان حضرات کیلئے بڑے
کام کی چیز وگرنہ ایک سجاوٹ کی چیز تو ہے ہی۔ جاڑے اور
بارش کی راتوں میں یہ حضرات خود تو مکان سے نکلنے سے مجبور ہوتے
ہیں لیکن پانی کا بے جا استعمال اُنھیں کچھ نہ کچھ نکالنے پر مجبور
کر دیتا ہے۔ سچ پوچھیے تو ایسے نازک وقت میں بوتل اُنکے
لیے ایک نعمت۔ لیٹے لیٹے کچھ سے فراغت حاصل کی اور جس
طرح خون یا گلوکوز نلی سے بہہ کر مریض کے جسم میں داخل
ہوتا ہے اور اسے توانائی بخشتا ہے اسی طرح اس نلی سے
کچھ بہہ کر باہر پیڑوں میں اس انداز سے جاتا ہے کہ یہ حضرات
دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ ؎

تب جا کے ہر اک گل کہیں شاداب ہوا ہے۔

کون جانے ان حضرات کا یہ دعویٰ صحیح ہی ہو ____
چھوڑیئے ہمیں اس سے کیا مطلب" ہم تو محض اس مکان کی
سیر کو آئے ہیں ہمیں اس سے کیا غرض کہ چمن کا جلوہ کسی کی
رنگین نوائی کا باعث ہے یا پھر ان حضرات کی جدت روانی کا
کا سبب۔
چھت پر آپ کو ایک پنکھا بھی نظر آئے گا۔ لیکن ایک
نئی قسم کا، جس کا ایک "پر" اگر سیدھا ہے تو دوسرا زلف۔

(باقی مضمون صفحہ ۳۲ پر)

میں کون ہوں کیا ہوں؟ اقبال

شیخ حبیب اللہ

سرزمین ہند و پاک میں اقبال غریب الغربا ہیں۔ انھیں کوئی جانتا ہی نہیں اُن پر ریسرچ و تحقیق ہوتا ہی نہیں۔ ہماری کم نگاہی کا یہ عالم! بایں ہمہ ہمارے نوجوان اہل قلم علامہ اقبال کو تختۂ مشق ظلم و ستم بنائے ہوئے ہیں۔ اُن کے چند اشعار کا مطالعہ کرکے رائے زنی کرتے [illegible] ہیں کہ اقبال نطشہ و دیگر یوروپی فیلسوفوں سے متاثر تھے۔ اور بہت سے شعرا کہتے ہیں کہ اقبال شاعر تھے ہی نہیں۔ کیوں کہ انھوں نے زن قحبہ سے متعلق عشق و محبت کی شاعری [illegible] کی۔

اقبال کو معلوم نہیں ہم نے کیا [illegible]۔ اقبال اس عالم کاخ و کو میں واحد منفرد اور یکتا [illegible]۔ اُن کے کلام میں رشد و عقل کی نورانی قندیل ہے۔ [illegible] کا تمام ہے آفاق گیر تخیل ہے، صاعقہ پاشی ہے، قلندر [illegible] کا شرار معنوی ہے، دانش و حکمت کے موتی ہیں، معرکۂ [illegible] بانگ لاتخف کی تفسیر ہے اور عدیم المثال معنی [illegible] اور سحر بیزی شاعری حقیقی ہے۔ اقبال کی زبانی خود اُن کی رائے سنیے۔ علامہ اقبال ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں :-

"شفیع کے نام آپ نے جو مکتوب تحریر فرمایا ہے۔ اس سے مجھے یہ معلوم کرکے بے حد مسرت ہوئی کہ اسرار خودی کا ترجمہ انگلستان میں قبول حاصل کر رہا ہے۔ لیکن انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نطشہ کے خیالات میں پایا جاتا ہے دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ [illegible]" والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحب مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ اُس نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے اگر اُسے اُن کی صحیح تاریخ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشو و ارتقا کے متعلق اُس کا زاویۂ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا۔

"وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے غلط مبحث کرکے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ زمانہ ہے جب نہ تو

نٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہونچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گزری تھیں۔ یہ مضمون "انڈین انٹی کیوری" میں شائع ہوا اور جب ۱۹۰۸ء میں میں نے ایرانی الہیات پر کتاب لکھی تو اس مضمون کو اس میں شامل کر لیا گیا"

اقبال فرماتے ہیں :۔

پیر میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوان فرنگ
سست رفتار بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

اعجاز ہے کسی کا یا گردش زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحر فرنگیانہ

علامہ دوران قیام یوروپ وہاں کے گندہ خواص وعوام اور مخرب اخلاق اصحاب علم و دانش کے خیالات سے بیزار تھے۔ یوروپیوں کے تخیل کی پرواز پست وقبیح تھی۔ اور آپ اس کا برملا اظہار بھی کرتے تھے ؎

فرنگ میں کوئی دن اور میں ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

میخانۂ یوروپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

اسی لیے اقبال کی ہدایت ہے کہ ؎

گرچہ ہے دل کشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بام دانہ ودام سے گزر

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا

ہم اہل یوروپ سے اہلیت وفضیلت فکر میں کم نہیں، بشرطیکہ ذوق وشوق کے جام سے اپنی ذات میں شورش کدۂ مستی کار پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ یوروپ تو وہ [illegible] گاہ ہے جہاں ابلیس تیار کئے جاتے ہیں ؎

تری حریف ہے یارب سیاست افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

افرنگ زدوں پر اقبال کو ترس آتا تھا ؎

ہوئی نہ بندۂ مومن فسونئ افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک

اہل یوروپ، مویئر، کارلائل، روڈویل، لین پول، نولڈکی، براؤن نے علوم عربی اور فارسی حاصل کرنے میں اپنی زندگی بھر دیں اور اسلام پر کتابیں لکھیں اور نور [illegible] [illegible] سے منور ہوئے مگر ہم ہیں کہ یوروپی مخرب اخلاق [illegible] ادب پر دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہیں۔ علامہ اقبال [illegible] کہا ہے کہ افرنگیوں کا شیدائی ہو کر مجھے ملا تو کیا ملا؟ خو[illegible] کی خوں چکانی [illegible] اس خرابی بسیار نے خود میری ہستی کو [illegible] بنا ڈالا۔

بہ افرنگی بتاں دل باختم من
ز تاب دیریاں بگداختم من

چناں از خویشتن بیگانہ بود[illegible]
چو دیدم خویش را نشناختم من

اتنا ہی نہیں۔ یوروپی علم وادب، ان کے فلسفیات او[ر] فنون اور ان کے مشاہیر علم و نظر کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ میری تمام کاوشیں تضیع اوقات ثابت ہوئیں۔ میری زندگی میں ایسا عالم بے کیف کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔

(باقی آئندہ)

مختار شمیم

ریاست ٹونک کے کتبخانے، اخبارات اور رسائل

ایک سرسری جائزہ

ریاست ٹونک کے کتب خانہ اکثر شاہی ملکیت تھے۔ ریاست کا پہلا کتب خانہ نواب وزیرالدولہ کا تھا۔ جو دراصل نواب امیر خاں اور ان کے متعلقین کی جمع کردہ کتب پر مشتمل تھا۔ نواب وزیرالدولہ نے اسے نئے سرے سے منظم کیا اور اس میں بہت سی کتابوں کا اضافہ بھی کیا۔ اس کتبخانہ میں ۱۰،۱۲ ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں جن میں ۸،۷ قلمی نسخے بھی شامل ہیں[1]۔

نواب وزیرالدولہ کے بعد یہ کتب خانہ نواب محمد علی خاں کے ورثہ میں آیا۔ انھوں نے اس کو اپنے ساتھ بنارس منتقل کر لیا۔ چونکہ نواب موصوف خود بھی صاحب قلم تھے۔ اور ادب نواز تھے اس لیے انھوں نے بہت سے قلمی نسخوں کا اس ذخیرہ میں اضافہ کیا۔ اور کثیر سرمایہ کتابوں کی فراہمی میں ذاتی طور پر صرف کیا۔ غیر ممالک سے بھی نادر کتابوں کے حصول میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس کتب خانہ میں تقریباً ۲ ہزار سے زیادہ کتابیں اور تین ہزار سے زیادہ مخطوطات تھے۔ اس کتب خانہ میں بیشتر کتب عربی و فارسی کی تھیں جو منطق فلسفہ اور دیگر علوم پر مشتمل تھیں۔

نواب محمد علی خاں کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ ان کے صاحبزادے عبدالرحیم خاں کی ملکیت میں آیا۔ انھوں نے اسے بنارس سے واپس ٹونک منتقل کیا۔ صاحبزادہ عبدالرحیم خاں کے بعد نواب سعادت علیخاں نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور بعد میں اس کو دو حصوں پر منقسم کر دیا گیا۔ ایک حصہ جس سے عام لوگ بھی مستفید ہو سکتے تھے۔ کتب خانہ سعیدیہ کہلایا اور دوسرا حصہ ادارۂ تحقیق علوم مشرقیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس قلمی نسخے اور مخطوطات زیادہ تعداد میں ہیں۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد جب ٹونک تشریف لائے تو ان کی تمام تر دلچسپی کا مرکز یہی کتب خانہ تھا۔ اس میں بعض نادر کتابوں کے ذخیرہ کو دیکھ کر ان کو بڑی حیرت اور مسرت ہوئی تھی۔ لہذا ان کی منشا پر حکومت ہند نے انڈین نیشنل لائبریری

---

[1] معارف ص ۴۳۳

کے لیے ٹونک اس کتاب خانے کی بیش قیمت و کمیاب کتابوں کے ایک بڑے حصہ کو خرید لیا[1]۔

بہر صورت مذکورہ دونوں کتب خانے اب بھی اپنے باقی سرمائے کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے نگراں ... محمد عمران خاں صاحب (سعیدیہ لائبریری) اور صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب (Oriental Research Library) ہیں۔ قدیم کتب خانوں میں ان دونوں مشہور کتب خانوں کے علاوہ عدالت شرعیہ کی ملکیت میں سرکاری کتب خانہ تھا۔ کئی ذاتی کتب خانے بھی تھے جن میں قابل ذکر کتب خانہ مختار الدولہ، کتب خانہ دیوان شمس الدین، کتب خانہ محمود شیرانی اور سرد ینج میں سید احمد مرتضیٰ نظر کا کتب خانہ یہ تمام ذاتی کتب خانے امتداد زمانہ کی نظر ہو چکے ہیں البتہ موجودہ دور میں اسکولوں، کالجوں اور میونسپل لائبریریوں کے علاوہ منظور الحسن برکاتی و قاضی الاسلام صاحبان — منظور الاسلام صاحب، حبیب صاحب وغیرہ کے ذاتی کتب خانے ہیں۔ سید احمد مرتضیٰ نظر صاحب کا بہترین کتب خانہ تقسیم پاکستان کے سبب لٹ پٹ گیا۔ چند قلمی نسخے اور کتابیں میرے پاس یادگار رہ گئی ہیں۔ نظر مرحوم کے بھانجے ملک محمد عبدالحی (سید جالبی کے متعلقین میں سے تھے) قائم کردہ سرد ینج میں دینی کتب خانہ ہے۔ فی زمانہ اسکولوں، کالجوں اور میونسپل لائبریریوں میں عربی، فارسی اور اردو کی کتابوں کی تعداد قابل ذکر نہیں ہے تاہم جتنی بھی ہیں دل و نگاہ کی تقویت کا باعث ہیں۔

اخبارات و رسائل:۔ ریاست میں اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت کی ابتدا ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔ یہ زمانہ نواب ابراہیم علی خاں کا تھا۔ اُس وقت سے موجودہ دور تک مختلف اخبارات کا اجرا ہوا جن میں قابل ذکر حسب ذیل ہیں۔

امین الاخبار:۔ نواب ابراہیم علی خاں المتخلص بہ خلیل کی تجویز پر ۱۸۸۴ء میں امین الاخبار کا اجراء عمل میں لایا گیا۔ اس اخبار کے نائب سید محمد نائب بخشی اور مہتمم سیف الدین تھے۔ کچھ ہی روز بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔

حدیقۃ الاخبار:۔ یہ اخبار یکم جنوری ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا تھا اور شاہی پریس "مطبع محمدی" میں چھپتا تھا۔ یہ ہفت روزہ تھا اور غالب علی خاں کی ملکیت میں تھا۔

نوبہار:۔ یہ ماہنامہ خالص شعر و سخن کے مواد پر مشتمل تھا۔ یہ بھی غالب علی خاں ہی کی ملک تھا۔ تاریخ اجراء یکم مئی ۱۸۸۵ء ہے ایک سال تک جاری رہنے کے بعد یہ ماہنامہ بند ہو گیا

سفیر ٹونک: اس اخبار کے مالک بھی غالب علی خاں تھے۔ ۴ جولائی ۱۸۸۷ء کو محمدی پریس میں پہلا شمارہ چھپ کر شائع ہوا۔ لیکن جلد ہی بند ہو گیا

"ہفتہ جنگ":۔ نواب سعادت علی صاحب کے عہد میں محکمۂ اطلاعات کے زیر سرپرستی ۱۹۴۰ء میں ہفتہ جنگ کے نام سے ایک ہفت روزہ نکلنا شروع ہوا۔ اس اخبار میں سرکاری اعلانات، خبریں اور خاص طور سے دوسری جنگ عظیم کی خبروں کو بڑے ...

---
[1] بربان ص ۴۰

اہتمام سے شائع کیا جاتا تھا۔ بلا شبہ یہ اخبار ٹونک کے عوام
ں سیاسی شعور کی بیداری کا پتہ دیتا ہے۔

ہادی: یہ دو روزہ اخبار دراصل "انجمن رعایائے ٹونک" کا
آرگن تھا۔ جو ۱۹۴۶ء میں عمر حیات خاں کے زیرِ
ادارت جاری ہوا تھا۔

مہدی: چونکہ "ہادی" چند روز بعد ہی بند ہو گیا تھا۔
اس لیے انجمن رعایائے ٹونک "نے اخبار کی پھر
ضرورت محسوس کی۔ اور دوبارہ مہدی کے نام سے اخبار جاری
کیا۔ لیکن بالآخر حشر وہی ہوا جو ہادی، کا ہوا تھا۔ اس اخبار
کے ایڈیٹر سید محمد علی بی۔ اے تھے۔

عہدِ جدید: ۱۹۴۷ء میں جاری ہوا اور کچھ ہی دنوں بعد
انضمام ریاست کے ساتھ یہ ہفتہ وار اخبار
بند کر دیا گیا۔ اس کے مدیر ماسٹر سید حامد حسین بی اے تھے۔

اسلام: ٹونک سے ۱۹۴۹ء میں خنداں اجمیری نے جاری کیا
لیکن صرف تین اشاعتوں تک اس کی زندگی رہی

مشعل: خنداں صاحب ہی کی زیرِ ادارت "مشعل" ٹونک
کے مطلعِ صحافت پر نمودار ہوا۔ یہ بھی پندرہ روزہ
اخبار تھا اور حنفا پریس ٹونک میں چھپتا تھا۔ چند اشاعتوں کے
بعد دم توڑ دیا۔

جھلک: پندرہ روزہ "جھلک" کے نام سے خنداں اجمیری
۸ صفحات کا اخبار شائع کر رہے ہیں لیکن اشاعت
میں پابندی کی جائے۔ یہ شاید ممکن نہ ہوگا۔

ان اخبارات کے علاوہ ریاست کے گزیٹیر کا ذکر بھی
ضروری ہے۔ یہ گزٹ ۱۹۲۲ء سے پہلے صرف اردو رسم الخط میں
شائع ہوتا تھا لیکن بعد میں اردو کے ساتھ ہی انگریزی اور
ہندی زبان میں چھپنے لگا۔ آزادیِ ہند کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔

نادم سیتاپوری نے احسن مارہروی کے رسالہ "ریاضِ
سخن" کو بھی ٹونک سے نکلنے والا پرچہ بتایا ہے[1]۔ ان کا یہ خیال
صحیح نہیں ہے۔ "ریاضِ سخن" علی گڑھ سے نکلتا تھا اور نواب
صاحب ٹونک سے مالی امداد اور احسن پر ان کی کرم فرمائیوں
کے نتیجہ میں "ریاضِ سخن" سے "ریاضِ خلیل" نام کر دیا گیا۔

آخر میں ٹونک کا پرگنہ سرونج کے ادبی قلمی ماہناموں
کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ آزادی سے پہلے سعادت ہائی اسکول
سرونج کے ایک طالب علم نے اپنے ذاتی شوق و کاوش کی
بدولت ایک قلمی ماہنامہ کا اجرا کیا۔ اسکول کے طلبہ اور
اساتذہ کی تخلیقات کا اختصار احمد خود ہی ترتیب دیتے اور
خود ہی کتابت کر کے انھیں رسالہ کی شکل دیتے۔ مگر کچھ دنوں
بعد اختصار احمد مزید تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ چلے گئے
اور پرچہ بند ہو گیا۔

غالباً ۱۹۵۸ء میں توفیق محمد خاں جواد نے اسی طرح کا ایک
قلمی ماہنامہ جاری کیا جو اپنے مواد، معیار اور حسنِ کتابت کے
لحاظ سے تشنگانِ ادب کی پیاس بجھانے کیلئے ایک اچھا
ذریعہ ثابت ہوا۔ دو سال کے بعد یہ بھی بند کر دیا گیا۔

حالانکہ موجودہ زمانے میں اردو کے رسائل و اخبارات
کی کمی نہیں ہے۔ کمی ہے تو صرف قارئین کی۔ ٹونک اور سرونج
میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبی ذوق و شوق کو جلا دی
جائے اور معیاری ادبی رسائل کے پڑھنے والے سامنے آئیں
سرونج میں اپنے ذوق کی تسکین کے لیے زمانہ طالب علمی میں
راقم السطور نے ۱۹۶۳ء میں ایک قلمی ماہنامہ "راہی

---

[1] اردو ادب علی گڑھ ص ۷۰

کا اجرا کیا۔ شکر ہے کہ سروغ بھوپال اور ٹونک میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی اور حوصلہ افزائی کی گئی۔ تین سال کے بعد یہ ماہنامہ بھی بند کر دیا گیا۔

ریاست کے ان اخبارات اور رسائل کا سرسری جائزہ لینے پر صحافی اور ادبی حرارت کا احساس ہوتا ہے، کہ جو ادب کی راہوں کو ہموار کرنے میں مدد معاون ثابت ہوئے۔

بسلسلہ صفحہ ۲۶

پنیچال کی طرح بل کھائے ہوئے۔ جب یہی پنکھا چال دکھاتا ہے تو مرغ بسمل کی ناتوانی یاد آتی ہے اور ساتھ ہی ڈر کا بھی لگا رہتا ہے کہ

ہر قدم پڑ رہے ہیں ، یاں رہ گیا واں رہ گیا

اس پنکھے کے برابر، ایک کونے میں دیوار پر نہیں بلکہ چھت پر ایک ٹیلی ویژن بھی فٹ ہے جس سے لطف اندوز یہ حضرات بیٹھ کر تو ہو نہیں سکتے اس لیے مجبوراً لیٹے لیٹے ہی نظارہ جمال سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

غرضکہ موجودہ دور کی آرائش و آسائش کی تقریباً ہر چیز اس وسعت بھرا مکان میں ایک نئے انداز سے نظر آئے گی لیکن ہماری قوت برداشت نے، اتنی ہی سیر کے بعد کچھ ایسا جواب دیا کہ راہ فرار ہی میں مفر نظر آئی اور ہم باہر بھی پڑھتے ہوئے بھاگے۔

؎ شامت اعمال کی ہر قسم ہے سر پر سوار۔

(بسلسلہ صفحہ ۲۱)

میخانہ درد کے حوالہ سے رقم طراز ہیں نظیر بین باز نے (جو اس زمانہ میں موسیقی کا بڑا استاد تھا) اُن کے انتقال پر بین اٹھا رکھدی تھی۔ کہ اب دلّی میں کوئی اس کا قدردان نہیں رہا۔ بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ فن عملیات میں بھی دخل تھا۔"

یہ ہے مومن کی بسیار دانی کی ہلکی سی جھلک جو اُنکے دیوان غزلیات کے سرسری مطالعہ کے نتیجہ میں پیش کر دیگئی ہے اس سے مومن کی بسیار دانی کے علاوہ اس خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ مومن کا میدان شاعری تنگ اور محدود ہے ہماری اور مومن کا دیگر خصوصیات میں تقابل انشاء اللہ آئندہ پیش کیا جائیگا۔

بسلسلہ صفحہ ۶

جو رکھنا ہے تو کر صحت عنایت	اٹھالے ورنہ دنیا سے سلامت
غرض ہر طرح اب اے میرے مولیٰ	تری مرضی جو کچھ ہے وہ ہے اولیٰ

اکبر نے بقول کمال دو شعر "عنقریب مرگ" اسے بھیجے تھے یہ بھی ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

تصور ترا مجھ کو اے جان ہوگا	فقط تیرے ملنے کا ارمان ہوگا
رہا تاب دوری کی مطلق نہیں ہے	کوئی دم کا اکبر یہ مہمان ہوگا

اکبر کا مزید احوال و کلام کسی دوسرے موقع پر پیش ہوگا۔

خسرو سرمست اندر ساغرِ معنی ریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود
ماہنامہ فروغِ اردو لکھنؤ
حضرت امیر خسروؒ کے "سات سو سالہ جشن" کے موقع پر ادارہ فروغِ اردو نے طے کیا ہے کہ وہ امسال اس عظیم المرتبت شاعر "طوطیٔ ہند امیر خسرو" کا خاص نمبر قارئین فروغِ اردو کی خدمت میں پیش کرے۔ جو اُن کی شاعری، نثر نگاری، تصوف، علم موسیقی اور دیگر گوناگوں خصوصیات کا حامل ہو، اور اُس کی ترتیب کی خدمت
ڈاکٹر
لکھنؤ یونیورسٹی
کے سپرد کی گئی ہے۔ جملہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کے نمائندہ ادیبوں۔ شعراء اور فنکاروں سے درخواست ہے کہ وہ ہندوستان کے اس عظیم شاعر کی خدمت میں اپنا اظہارِ عقیدت پیش کریں۔
منتش علوی

مطبوعات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی معہ قیمت)

۱۔ الیکتا کا چمن۔ تہواروں کے پھول۔ قمر بسوانی ۳/-
۲۔ احتشام حسین نمبر (فروغ اردو) سید انصار حسین ناہل ۲۵/-
۳۔ اردو کا ماضی۔ حال اور مستقبل۔ احمد ابراہیم علوی ۳/-
۴۔ آئینہ نظم اردو قمر بسوانی ۳/-
۵۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی روپ نرائن شیوپوری ساگر ۱/-
۶۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ڈاکٹر محمود الحسن رضوی ۱۵/-
۷۔ اردو ہم نمبر فروغ اردو اقبال صدیقی ۳/۵۰
۸۔ انوار اللغات اردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) پروفیسر سید احتشام حسین ۵/-
۹۔ ادبی تاثرات۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۵/-
۱۰۔ آئینہ عقل پروفیسر نکہت شاہجہانپوری ۵۰/۔
۱۱۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۱۲۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۳/۵۰
۱۳۔ انارکلی امتیاز علی تاج جدید ایڈیشن ۲/۵۰
۱۴۔ امراؤ جان ادا مرزا رسوا ۵/۵۰
۱۵۔ اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ پروفیسر کلیم الدین احمد ۸/-
۱۶۔ اردو میں تنقید ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/۵۰
۱۷۔ انتخاب قصائد اردو۔ مغیث الدین فریدی ۱/۵۰
۱۸۔ ادب اور نظریہ آل احمد سرور ۴/-
۱۹۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبدالشکور ۵/۵۰
۲۰۔ ادبی نقوش۔ شاہ معین احمد ندوی ۷/۵۰
۲۱۔ انتخاب جدید نثر اردو سید احتشام حسین ۴/-
۲۲۔ اقبال مرتبہ فروغ اردو ۰/۵۰
۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ عبدالماجد دریابادی ۲/۵۰
۲۴۔ البرامکہ اور ان کا عروج و زوال ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے ۳/-
۲۵۔ انتخاب کلام غالب بشیر احمد علوی ۱/۵۰
۲۶۔ ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ۶/۵۰
۲۷۔ انتخاب قصائد و غزلیات فروغ اردو ۵/-
۲۸۔ اب کیا ہے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۳/-
۲۹۔ ادبی خطوط غالب۔ مرزا محمد عسکری ۶/۵۰
۳۰۔ آئینہ نثر اردو سعادت علی صدیقی ۴/۵۰
۳۱۔ ایک نادر روزنامچہ۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/۵۰
۳۲۔ ابوالخیر مجنوں گورکھپوری ۰/۳۷
۳۳۔ اردو کی کہانی سید احتشام حسین ۲/۵۰
۳۴۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر ۵/۷۵
۳۵۔ ابوالکلام آزاد (نظم) جگن ناتھ آزاد ۰/۲۵
۳۶۔ ارمغان نثر و نظم عبدالاحد خاں خلیل ۳/۷۵
۳۷۔ افسانہ نمبر مرتبہ فروغ اردو ۱/۵۰
۳۸۔ اچھی نظمیں اختر مشتاق ۰/۷۵
۳۹۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید ایڈیشن غلام احمد فرقت ۲۰/-
۴۰۔ اردو شاعری امیر احمد علوی ۱/۵۰
۴۱۔ غزلیات حافظ صائب غالب فارسی ۲/۵۰
۴۲۔ آخری یادگار نادر شاہ معہ ترجمہ ۱/۵۰
۴۳۔ اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنیوالی کتاب اعجاز احمد فاروقی ۱/۲۵
۴۴۔ اللہ کے پیارے امیر حسن نورانی ۰/۵۰
۴۵۔ اسپین کی شہزادی صادق سردھنوی ۴/۵۰
۴۶۔ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اردو ۱/۵۰
۴۷۔ اپنی موج میں آوارہ ۲/۵۰
۴۸۔ انوار جدید خط و کتابت خلیق احمد علوی ۰/۲۵
۴۹۔ ایک جان تین قالب خان محبوب طرزی ۴/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۵۰.	اُلفت	خان محبوب طرزی	۵/۵۰
۵۱.	آغازِ سحر	"	۴/-
۵۲.	ابن آباد	"	۴/-
۵۳.	انشائے خطوط نویسی۔ حصہ اوّل	مشیر احمد علوی	۳۵/-
۵۴.	اچھی کہانیاں	" شمس الدین نوری	۰/۵۰
۵۵.	انشائے خطوط نویسی حصہ دوم		۰/۷۵
۵۶.	ایجادوں کی باتیں	مصطفےٰ حسن رضوی	۳/-
۵۷.	اچھی کہانیاں حصہ اول	شمس الدین نوری	۰/۵۰
۵۸.	" حصہ دوم	"	۰/۵۵
۵۹.	" حصہ چہارم	"	۰/۶۵
۶۰.	ادب کا مقصد	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۳/۵۰
۶۱.	اسلامی نظمیں	محمد حسین علوی شمس	۰/۴۵
۶۲.	اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں	عبدالماجد دریابادی	۳/-
۶۳.	اوراقِ گل	اصغر مشتاق	۱/-

(ب)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۶۴.	بابائے اُردو عبدالحق	عبداللطیف اعظمی	۶/-
۶۵.	بستانِ حرم۔ (جدید نعتیہ کلام)	از مرحوم حمید صدیقی	۳/-
۶۶.	شہید محبت بوٹا سنگھ۔	خان محبوب طرزی	۴/-
۶۷.	بزمِ بے تکلف۔	ڈاکٹر سید عابد حسین	۴/۵۰
۶۸.	بگٹ کہانی۔	ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۴/۵۰
۶۹.	بہادر شاہ ظفر۔	امیر احمد علوی کاکوروی	۵/۵۰
۷۰.	بہشتی ثمر۔ (حصہ اول دوم) خلاصہ بہشتی زیور	مولانا تھانوی	۳/۸۰
۷۱.	بانیِ اسلام۔	علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اُردو ترجمہ	۰/۷۵
۷۲.	بشریتِ انبیاء	عبدالماجد دریابادی	۳/-

(پ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۷۳.	پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۲/۵۰
۷۴.	پیاری باتیں	محسن کاکوروی	۲/-
۷۵.	پھولوں کا انبار (ناول)	منظر سلیم	۴/۷۵
۷۶.	پیسہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ	ڈاکٹر محمد حسن	۵/-
۷۷.	پاگل خانہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۳/۲۵
۷۸.	پیغام "	طاہر دیال پوری	۴/-
۷۹.	پنجاب میں اُردو	حافظ محمود شیرانی	۹/۵۰
۸۰.	پردیسی کے خطوط حصہ اول	مجنوں گورکھپوری	۴/۵۰

(ت)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۸۱.	مختصر تاریخ ادبِ اُردو (فروغ اُردو ایڈیشن)	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۱۲/-
۸۲.	تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ	فرید احمد علوی	۱/-
۸۳.	تحریریں مجموعہ مضامین۔	ڈاکٹر گیان چند	۵/۵۰
۸۴.	تاریخی جائزے	ڈاکٹر محمد یاسین	۳/-
۸۵.	تنقیدی تجزیے	کاظم علی خاں	۴/۵۰
۸۶.	تعارف تاریخ اُردو جدید ایڈیشن	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۵/-
۸۷.	تاجدارِ مدینہ	اقبال صدیقی	۰/۴۰
۸۸.	تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر	۵/۵۰
۸۹.	تنقید و تحلیل	شبیہ الحسن نونہروی	۴/۵۰
۹۰.	تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن)	سید احتشام حسین	۹/-
۹۱.	تنقیدی نظریات جلد اول	"	۸/-
۹۲.	" " جلد دوم	"	۸/-
۹۳.	تنقید اور عملی تنقید	"	۹/۵۰
۹۴.	تنقیدی اشارے (جدید ایڈیشن)	آل احمد سرور	۵/-
۹۵.	ترانہائے خیام	ڈاکٹر رغیب حسین	۲/۵۰
۹۶.	تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص	محمد حسین شمس	۲/۹۰

(ٹ)

۹۷۔ ٹیگور — نادم سیتاپوری — ۳/-
۹۸۔ ٹھیکرے کی مانگ — صدیقہ بیگم سیوہاری — ۲/-

(ث)

۹۹۔ ثنائے حبیب و نعتیہ کلام — بہزاد لکھنوی — ۲/۲۵

(ج)

۱۰۰۔ جان غالب — محمد حسین شمس علوی — ۲/-
۱۰۱۔ جائزے — انور سیوانی — ۳/-
۱۰۲۔ جواہرات اسمٰعیل — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱/۵۰
۱۰۳۔ جنگ آزادی نمبرا (۱۸۵۷ء) — فروغ اردو — ۳/-
۱۰۴۔ " نمبر۲ — ۳/-
۱۰۵۔ جوئے رواں۔ مجموعہ کلام۔ — حامد اللہ افسر — ۳/۵۰
۱۰۶۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر احمد بلگرامی — ۳/۵۰
۱۰۷۔ جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین — ۲/۵۰
۱۰۸۔ جلوے — معین الدین دردائی — ۱/۷۵
۱۰۹۔ جمیلہ بوائری (ناول) خان محبوب طرزی — ۲/۵۰
۱۱۰۔ جگر نمبر اول — سید احتشام حسین — ۸/-

(چ)

۱۱۱۔ چوتھی بہن۔ مجموعہ افسانہ۔ — مسیح الحسن رضوی — ۲/۷۵

(ح)

۱۱۲۔ حیات فضل الحق — خیر آبادی — ۱/۲۵
۱۱۳۔ حالی بحیثیت شاعر (جدید ایڈیشن معہ اضافہ) — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۱۵/-
۱۱۴۔ حسرت موہانی — عبدالشکور — ۵/۵۰
۱۱۵۔ حجاج بن یوسف — جرجی زیدان — ۲/۵۰
۱۱۶۔ حکیم نباتات — وزیر خاں لنگراں — ۲/-
۱۱۷۔ حیثیت غالب — سعادت علی صدیقی — ۲/۵۰

(خ)

۱۱۸۔ خلاصہ شریف زادہ — مرزا رسوا — ۱/۲۵
۱۱۹۔ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰
۱۲۰۔ خضر راہ معہ ترجمہ — علامہ اقبال — ۱/-
۱۲۱۔ خلاصہ روح تنقید — ۱/-
۱۲۲۔ خلاصہ جواہر العروض — ۱/-
۱۲۳۔ خطی (مزاحیہ) — محمد علی واحدی معہ مقدمہ شوکت تھانوی — ۱/۵۰
۱۲۴۔ خوش بختی کی تلاش — احسن الظفر بی۔ اے — ۳/-
۱۲۵۔ خلاصہ شعر الہند — حصہ دوم — ۱/-
۱۲۶۔ خلاصہ المیزان — -/۷۵

(د)

۱۲۷۔ دلچسپ کہانیاں — مسعود عالم — ۴/-
۱۲۸۔ دیوان فغانی — ۱/۵۰
۱۲۹۔ داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی) — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/۵۰
۱۳۰۔ دہلی کا یادگار مشاعرہ — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۱/۵۰
۱۳۱۔ دستہ گل — شبلی نعمانی — -/۴۰
۱۳۲۔ دوشیزہ قاف ناول — خان محبوب طرزی — ۵/-
۱۳۳۔ دلربا — ۳/-
۱۳۴۔ دلی کا دبستان شاعری معہ اضافہ جدید ایڈیشن — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۱۵/-
۱۳۵۔ دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — ۳/۵۰

(ڈ)

۱۳۶۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر انوار الحسن — ۲/۴۰

(ذ)

۱۳۷۔ ذوق و جستجو۔ — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۱۵/-

۱۳۸۔ ذوق ادب و شعور۔ پروفیسر احمد حسین ۵/۵۰

۱۳۹۔ ذوق جنون۔ مجموعہ کلام۔ آل احمد سرور ۶/۵۰

(ر)

۱۴۰۔ روایت اور بغاوت سید احتشام حسین ۷/-

۱۴۱۔ رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ سید امیر حسن نورانی ۳/-

۱۴۲۔ رہبر مضمون نویسی شفاعت علی صدیقی ۲/۵۰

۱۴۳۔ راکھی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۴/-

۱۴۴۔ رخسار سحر ناول انور کریم قدوائی ۱/۵۰

۱۴۵۔ رفتار سحر ۳/۵۰

۱۴۶۔ رموز حکمت معہ مقدمہ اردو محمد شریف ۳/۵۰

۱۴۷۔ ریاض فارسی منتخب کلام فارسی ۳/-

(ز)

۱۴۸۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ) مولانا تھانوی ۱/۵۰

۱۴۹۔ زمینوں کا بادشاہ، حکیم بانا مزاحیہ ناول سید علی عباس حسینی ۳/-

(س)

۱۵۰۔ سلور رنگ آغا حشر کاشمیری ۴/-

۱۵۱۔ سوانح احمد خاں نجم الدین نقوی ۴/-

۱۵۲۔ سرور جہاں آبادی ڈاکٹر حکیم چند نیر ۸/-

۱۵۳۔ سرود نو (مجموعہ کلام) پروفیسر اختر قادری ۳/۵۰

۱۵۴۔ سنگ گہر سید احتشام حسین ۴/-

۱۵۵۔ سر سید داحمد پاشا یا کوہ قاف کی پری سید علی عباس حسینی ۱/۵۰

۱۵۶۔ سرمایہ زبان اردو جلال لکھنؤ ۵/۵۰

۱۵۷۔ سفر (ناول) رائل ملیح آبادی ۴/-

۱۵۸۔ سیاحت زمین ناول محمود اعظم فہمی ۱/۵۰

۱۵۹۔ ستاروں سے آگے ناظر کاکوروی ۳/۵۰

۱۶۰۔ سنہرا حلقہ ۰/۷۵

۱۶۱۔ سر سید احمد خاں انوار الحسن صدیقی ۰/۴۰

۱۶۲۔ سوشل اسٹیڈی احمد محسن کاکوروی ۱/۷۵

۱۶۳۔ ساز دل ذکی کاکوروی ۲/۵۰

(ش)

۱۶۴۔ شعر تو تنقیدی مجموعہ ڈاکٹر محمد حسن ۵/۵۰

۱۶۵۔ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) غلام احمد فرقت ۸/۵۰

۱۶۶۔ شرح سنگ گہر عبد القوی دریابادی ۲/۵۰

۱۶۷۔ شاہ غمگین حضرت جی پروفیسر عبد الشکور ۳/-

۱۶۸۔ شرح ادب پارے نثر سعادت علی صدیقی ۲/-

۱۶۹۔ شرح ادب پارے نظم ڈاکٹر محمود الحسن ۲/-

۱۷۰۔ شرح منتخبات فارسی عبد القوی دریابادی ۵/-

۱۷۱۔ شبلی نعمانی انوار الحسن نورانی ۰/۴۰

۱۷۲۔ شرح دیوان غالب جدید ایڈیشن عظم طباطبائی ۷/-

۱۷۳۔ شہری اور سماجی زندگی عبد المعنی قدوائی ۰/۷۰

۱۷۴۔ " " ۰/۸۵

۱۷۵۔ " " ۰/۹۰

۱۷۶۔ " " ۱/۹۰

۱۷۷۔ شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ امیر احمد علوی ۳/۵۰

۱۷۸۔ شعر العجم۔ حصہ اول، دوم۔ سوم۔ چہارم۔ پنجم شبلی نعمانی ۴۴/-

۱۷۹۔ شرح نثر امروز ایران احسن الظفر بی اے ۳/-

۱۸۰۔ " " " ۳/۵۰

۱۸۱۔ شمع دشعر علامہ اقبال ۰/۵۰

۱۸۲۔ شرح حکیم نباتات وزیر خاں تنویر مسعود ۱/۲۵

۱۸۳۔ شرح انتخاب قصائد و غزلیات مطابق نصاب بی اے ۷/-

۱۸۴۔ شرح شعرماستان حصہ اول ڈاکٹر انوار الحسن ۳/-

۱۸۵۔ شرح ترانہائے خیام حکیم عبد القوی ۲/-

۱۸۶۔ شرح نصاب فارسی ۵/-

۱۸۷۔ شرح شعر و داستان دوم احسن الظفر ۳/-

۱۸۸۔ شرح گلہائے ادب ۳/-

۱۸۹۔ شرح آئینہ نظم اُردو ۳/-

۱۹۰۔ شرح نثر فارسی امروزہ ۳/-

۱۹۱۔ شرح آئینہ نثر اُردو خلیل قدوائی ۳/۵۰

۱۹۱۔ شرح غنچہ گل ۲/۵۰

۱۹۲۔ شرح شعر فارسی احسن الظفر ۳/-

[illegible]۔ شرح ہماری زبان اُردو درجہ ۶ خلیل قدوائی ۱/۵۰

(ص)

۱۹۴۔ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۲/۵۰

۱۹۵۔ صحیفۂ محبت۔ مہدی افادی کے خطوط ڈاکٹر محمود الٰہی ۵/۵۰

(ط)

۱۹۶۔ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی) مرتبہ فروغ اُردو ۲/-

۱۹۷۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے غلام الثقلین ۰/۲۵

۱۹۸۔ طلسم اسرار (ڈرامہ) مرزا رسوا لکھنوی ۱/۵۰

(ع)

۱۹۹۔ عذرا ناول صالحہ عابد حسین ۶/-

۲۰۰۔ عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) سید احتشام حسین ۵/۵۰

۲۰۱۔ غالب کا تنقیدی شعور مکتوبات کے آئینہ میں اخلاق حسین عارف ۳/۵۰

(غ)

۲۰۲۔ غالب نام آور نادم سیتاپوری ۵/۵۰

۲۰۳۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر سید امیر حسن نورانی ۶/-

۲۰۴۔ غالب کی تخلیقی تخئیل شہید صفی پوری ۸/-

۲۰۵۔ غنچہ و گل سید محمود الحسن رضوی ۴/۵۰

۲۰۶۔ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر نادم سیتاپوری ۵/۵۰

۲۰۷۔ غزالی دردانہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰

۲۰۸۔ غزلیات نظیری ۱/۵۰

۲۰۹۔ غزل انسائیکلوپیڈیا جدید ایڈیشن ذکی کاکوروی ۲۵/-

(ف)

۲۱۰۔ فروق (لغت) طاہر محسن علوی ۴/۵۰

۲۱۱۔ فن خطابت یعنی استاد تقریر، کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ ۱۲/-

۲۱۲۔ فریدہ خان محبوب طرزی ۱/-

۲۱۳۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادم سیتاپوری ۵/۵

۲۱۴۔ فلسفۂ اقبال عبدالقوی دریابادی ۴/۵۰

۲۱۵۔ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۲۱۶۔ فروغ جام مجموعہ کلام تنویر واحدی ۳/۵۰

۲۱۷۔ فغان محسن محسن کاکوروی ۰/۴۰

۲۱۸۔ فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/-

۲۱۹۔ فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد ۹/۵

(ق)

۲۲۰۔ قدیچے۔ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں۔ غلام احمد فرقت ۵/-

۲۲۱۔ قصائد ظہیر فاریابی ۱/۵۰

۲۲۲۔ قصائد مومن۔ مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۵/۵۰

۲۲۳۔ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۷/-

۲۲۴۔ قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۳/-

۲۲۵۔ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/-

۲۲۶۔ قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر ۴/۱۵

۲۲۷۔ قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) خان محبوب طرزی ۳/-

(ک)

۲۲۸۔ کلیات اقبال علامہ اقبال ۸/-

۲۲۹۔ کیسر اور کاہی بدرالدین طیب جی ۲/-

۲۳۰۔ کف گلفروش (مزاحیہ مضامین) غلام احمد فرقت ۴/۵۰

(گ)

۲۳۱۔ گاندھی نامہ ۲/-

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۲۳۲	گلدستہ فارسی	اول دوم		۱/۹۰
۲۳۳	گلزار فارسی	یعنی آمدنامہ جدید		/۷۰
۲۳۴	گلہائے ادب		عبدالاحد خاں خلیل	۳/-
۲۳۵	گاندھی جی کے ساتھ		حامد اللہ افسر	۱/۵۰

(ل)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۲۳۶	لوائح جامی مع مقدمہ		عبدالاحد خاں خلیل	۱/۵۰
۲۳۷	لال قلعہ		مائل ملیح آبادی	۶/-
۲۳۸	لب بام		عادل رشید	۶/-
۲۳۹	لسانیات اور اردو		سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰

(م)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۲۴۰	مرقع اقبال		عصمت فاطمہ علویہ	۱۲/-
۲۴۱	مرآۃ الشرح دیوان غالب اردو		غلام احمد فرقت	۸/۵۰
۲۴۲	محسن کاکوروی نمبر			۳/-
۲۴۳	مسلمان اور کانگریس		ابوالکلام آزاد	۳/۵۰
۲۴۴	مرثیہ نگاری اور میر انیس		ڈاکٹر احسن فاروقی	۴/۵۰
۲۴۵	مضامین فرحت	حصہ اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	۴/۵۰
۲۴۶	مضامین فرحت	حصہ دوم	"	۴/۵۰
۲۴۷	ماضی کی کہانیاں		آفتاب اختر تلہری	۳/-
۲۴۸	میرے اسٹیج ڈرامے		ڈاکٹر محمد حسن	۵/۵۰
۲۴۹	موسم گل	ناول	عادل رشید	۷/-
۲۵۰	مجبور	"	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۲۵۱	مضامین جدیدہ		محمد ہادی	۱/۲۵
۲۵۲	مثنوی سحر حلال فارسی	مع مقدمہ	قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۲۵۳	مطالعہ		ذکی کاکوروی	۵/-
۲۵۴	مولوی نذیر احمد کی کہانیاں		مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۲۵
۲۵۵	معرکہ روم و یونان		صادق سردھنوی	۶/-
۲۵۶	مثنویات حالی		ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۳/۵۰
۲۵۷	مطالعہ حالی		"	۵/۵۰
۲۵۸	میٹھے بول		ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۵۰
۲۵۹	مصنوعی چاند		خان محبوب طرزی	۴/-
۲۶۰	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصاب بی اے	حالی	۱/۵۰
۲۶۱	مرثیہ غالب		حالی	۰/۲۵
۲۶۲	مجموعہ کربلا		جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۶۳	معمار		مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۶۴	مولانا حالی		انوار الحسن صدیقی	۴/-
۲۶۵	انتخاب فسانہ آزاد یعنی		سرشار لکھنوی	
۲۶۷	بہار آج بلی		ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۲۶۸	مسٹر ملاکی نوک جھونک		خواجہ عزیز الحسن مجذوب	۰/۷۵
۲۶۹	مجذوب اور ان کا کلام		مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۲۷۰	مصباح بلاغت مع مقدمہ	اردو	محمد شریف	۳/-
۲۷۱	مطالعہ سودا		ڈاکٹر محمد حسن	۴/-
۲۷۲	مقدمات و مقالات		عبدالاحد خاں	۵/۵۰
۲۷۳	منتخب سوانح اور رفقائے		نجم الدین نقوی	۴/-

(ن)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۲۷۴	نثر امروز ایران		ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۲۷۵	نشاط غالب		وجاہت علی سندیلوی	۵/-
۲۷۶	نقد و انتقاد		اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۲۷۷	نقش حالی دوم	یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
۲۷۸	شجاعت علی سندیلوی			۲۵/-
۲۷۹	نغمہ کوہسار		خان محبوب طرزی	۲/-
۲۸۰	نفحات الہند مع مقدمہ۔ اردو		محمد شریف	۳/-
۲۸۱	نظم سائیکلوپیڈیا		ذکی کاکوروی	۱۰/-
۲۸۲	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی		کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۲۸۳	نسرین و نسترن		ذکی کاکوروی	۵/-
۲۸۴	نقدس تنقیدی مضامین کا مجموعہ		حامد اللہ افسر	۳/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۸۵	نیا راستہ ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۸۶	نوروز	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۸۷	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ	آل احمد سرور	۸/۵۰
۲۸۸	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۵/۵۰
۲۸۹	نیلم	انتصار حسین	۳/-
۲۹۰	نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۲۵
۲۹۱	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۵/-
۲۹۲	منشی نول کشور نمبر		۱/۵۰
	(و)		
۲۹۳	وعدۂ فردا	اخگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-
	(ہ)		
۲۹۴	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۴/-
۲۹۵	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۰/۷۵
۲۹۶	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-
۲۹۷	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۹۸	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ	”	۱/۵۰
۲۹۹	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفٰے حسن علوی ثریا	۰/۷۰
۳۰۰	” ” حصہ ۲	” ”	۰/۸۵
۳۰۱	” ” حصہ ۳	” ”	۰/۹۰
۳۰۲	” ” حصہ ۴	” ”	۰/۹۰
۳۰۳	یادگار غالب	مولانا حالی	۶/-
۳۰۴	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳۰۵	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۴/-

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

۱۔ پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

۲۔ جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

۳۔ اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

۴۔ جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

۵۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ٹکٹ کا نا ضروری ہیں۔

(۲۴) شمارہ (۵) اِدارۂ فروغ اُردو ھند کا ترجمان

رجسٹریشن نمبر ایل، ڈبلیو/این۔ پی ۹۳

ٹیلیفون: ۲۶۱۳۸
رہائش گاہ ۲۶۶۵۶

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

فروغ اُردو لکھنؤ

ایڈیٹر:
محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوری

مدیران معاون:
۱۔ عبد القوی دریابادی بی، اے
۲۔ سعادت علی صدیقی

شمارہ (۵۔۶) اکتوبر و ستمبر ۱۹۷۶ جلد (۲۴)

ترتیب

سالانہ اعزازی دس روپیہ
عوام سے: آٹھ روپیہ
فی پرچہ: ۷۰ پیسہ

ادارہ فروغ اردو ۳۳ آمین اباد پارک لکھنؤ

نصار حسین نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۳ آمین اباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

اپنی باتیں

یاد رکھئے اُردو کے فنا کرنے والے نہ صرف اُردو زبان و تہذیب و تمدن قومی یکجہتی و ہم آہنگی کے مجرم ہیں بلکہ وہ اپنے تمدن اور اخلاق و محبت کے سب سے بڑے قاتل کیوں کہ اُردو زبان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک امریکہ ، روس ۔ برطانیہ اور عرب ممالک میں اُردو بولی جاتی ہے اور اردو اخبارات و جرائد بھی شائع ہوتے ہیں مثال کے طور پر برطانیہ سے جو سب سے پہلا اُردو روزنامہ شائع ہوا اس کا نام اُردو ٹائمس ہے اس کو ہندو پاک کے اس طبقہ کے لئے نکالا گیا ہے جو برطانیہ میں آباد ہے میں خود جب پاکستان گذشتہ مئی ۱۹۷۶ء میں گیا تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ ہندو پاک کے افراد میں میل ملاپ کیلئے اُردو زبان کی مٹھاس ہی ایک ایسی کشش رکھتی ہے کہ جس سے اقوام عالم کے اندر اتحاد اور اخوت کا وہ جذبہ بیدار ہوجاتا ہے کہ جس کا تصور مشکل ہے اسلئے میری رائے یہ ہے کہ حالات سے متاثر اور مایوس و ہراساں نہ ہونا چاہئے اور نہ اُردو زبان کی ترویج و اشاعت کی جدوجہد سے غافل کیوں کہ اگر ایک طرف اُردو کے ساتھ سوتیلے پن کا برتاؤ کیا جاتا رہے تو دوسری جانب اس کا مستقبل تابناک اور اس کے حالات امید افزا کیونکہ اب تو کانگریس ۔ انجمن ترقی اردو

ادارۂ فروغ اردو اور ہر صوبہ کی اردو اکیڈمیاں اردو زبان کے حق اور اس کی قانونی اہمیت کو منوانے کے لئے جدو جہد میں مصروف ہیں ہم کو افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ آج تک باوجود وعدہ وعید کے فروغ اردو گجرال کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر نہ آسکی گورنمنٹ آف انڈیا کے وزیر تعلیم کی توجہ جب بھی اس رپورٹ کی اشاعت کی جانب مبذول کرائی گئی تو انھوں نے صرف یہ ہی غیر تشفی جواب دیدیا کہ حالات کی نزاکت ابھی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ رپورٹ کی اشاعت کی جائے وقت آنے پر گورنمنٹ آف انڈیا رپورٹ منظر عام پر لے آئے گی۔
بدقسمتی ہے ہماری ہر جماعت کی تنظیم کی کہ وہ متحدہ طور پر مطالبہ نہیں کرپاتی کہ کسی نہ کسی طرح جلد از جلد فروغ اردو گجرال کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر لاکر اس کی سفارشات کو قانونی شکل دے دی جائے ارباب حکومت کو میں یقین دلا دینا چاہتا ہوں کہ جب تک اردو زبان کے حق کو معاشی نظام سے وابستہ کرکے قانونی شکل نہ دی جائے گی اس وقت تک اردو زبان دشمنان اردو کے لئے ایک کھلونا بنی رہے گی اور محبان اردو کو بھی اپنی آنے والی نسلوں کے مستقبل کے خطرہ کے پیش نظر اردو زبان کے فروغ میں پس و پیش رہے گا۔

اس لئے ارباب حل و عقد محبان اردو کا فرض ہے کہ وہ متحد ہو کر شریمتی اندرا گاندھی سے مطالبہ کریں کہ وہ جلد از جلد اردو زبان کو قانونی اور آئینی شکل دے کر محبان اردو کے دلوں کو جیتیں اور جس طرح وہ اپنے احکامات کا نفاذ آرڈیننس کے ذریعہ کراتی رہتی ہیں اردو زبان کے لئے ہی ایک آرڈیننس جاری کرا دیں تو پھر یہ گتھی ہمیشہ کے لئے سلجھ جائے۔

محترمی شمس علوی صاحب، تسلیم، "خسرو نمبر" زیرِ مطالعہ رہا۔
اس معیاری صحیفے کی اشاعت پہ دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ تمام شمولات امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔ معلوماتی مضامین، تجزیات اور معنوی خوبیوں سے آراستہ اس خصوصی اشاعت کے لیے آپ لائقِ صد تحسین ہیں۔

عرصہ سے "فروغ اردو" کی بزمِ نگارش میں شرکت کا ارادہ تھا۔ دو غیر مطبوعہ تخلیقات ارسال خدمت ہیں۔ شائع فرما کر ممنون فرمائیں اشاعت کے متعلق اپنے فیصلے سے، ملفوف جوابی کارڈ کے ذریعہ مطلع فرمائیں نیز جن شماروں میں یہ تخلیقات شائع ہوں اُن کی ایک کاپی مجھے ضرور ارسال فرمائیں
(شکریہ)

نوٹ: علیحدہ ڈاک سے، اپنی نظموں کا انتخاب بعنوان "انکاس" پیشِ خدمت کر رہا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

منتظرِ جواب
تمکین

غزل

تمکین الرحمان

روز افزوں ہیں غلط فہمی کے مبہم دائرے
کس طرح طے ہوں گے آخر دو دلوں کے فاصلے

ریگ زارِ زندگی میں ہم بھٹکتے ہی رہے
اور صحیفوں میں رہے ہیں بند سارے فلسفے

میرے دل کے زخم گویا شاعری کے پھول ہیں
کر نہ دیں برباد ان کو، وقت کے یہ زلزلے

ہاتھ اپنے یونہی ملتا رہ گیا بوڑھا درخت
ہو گئے نظروں سے اوجھل تازگی کے قافلے

ذہن کھویا ہے اندھیری وادیوں میں خواب کی
ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں سامنے سب مسئلے

اپنے احساسات پہ قابو رہا تمکین مجھے
میں نے اپنے آپ کے خود ہی کیے ہیں تجزیئے

بچوں کا شاعر

نجم الحسن انجم ادیب ایم، اے

بچو تم نے ابتدائی جماعتوں میں مختلف نظمیں "بچہ اور جگنو" "کوشش کیے جاؤ" "خدا کی تعریف" "ہماری گائے" وغیرہ نظمیں پڑھی ہوں گی۔ ہاں اگر تمہیں کوئی نظم یاد نہ آ رہی ہو تو "ہماری گائے" والی نظم سنو۔

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں جس نے پلائیں دودھ کی نہریں

خاک کو اس نے سبزہ بنایا
سبزے کو پھر گائے نے کھایا

اس نظم کے لکھنے والے شاعر کا نام مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی۔ آؤ اس شاعر سے متعلق کچھ معلومات حاصل کریں۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی ۱۲ نومبر ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے آپ کا وطن میرٹھ تھا سب سے پہلے آپ نے قرآن مجید پڑھا اور اس کے بعد عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد در بدر ٹھوکریں نصیب ہوئیں۔ ۱۸۶۰ء میں آپ نے محکمۂ تعلیم میں ملازمت حاصل کرلی اور ترقی کرتے کرتے ہیڈ مولوی بنے۔

آپ سب سے خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اور شاگردوں کو عزیز سمجھتے تھے اور دوسرے لوگ بھی آپ کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے سب سے پہلے بچوں کیلئے نظمیں لکھیں اور "بچوں کا ادب" پیش کرنے میں آپ کو کمال حاصل تھا آپ نے اُردو ریڈریں بھی لکھیں تھیں جو ہندوستان بھر کے مختلف صوبوں کے نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ آپ نے کئی کہانیاں بچوں کے لیے لکھیں اور دوسری زبانوں کی کہانیوں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ معمولی معمولی عنوانات پر بھی آپ نے اعلیٰ نظمیں کہی تھیں۔ آپ کی اخلاقی تعلیمی۔ سماجی، ادبی اور نیچرل نظمیں اپنا جواب آپ ہیں۔

۱۹۱۱ء میں آپ کے کلام کا مجموعہ شایع ہوا تھا اور آپ کی ۴۵ نظموں کا مجموعہ ۱۸۸۰ء میں "ریزۂ جواہر" کے نام سے شایع ہوا تھا۔ جن میں انگریزی سے ترجمہ کردہ نظمیں

بھی تھیں۔ جیسے "کیڑا" "قوت کی گھڑی" "فادر ولیم" "حب وطن"
"انسان کی خام خیالی" وغیرہ وغیرہ

نظم "کیڑا" انگریزی شاعری DAVIS.W.H
کی نظم WORMS CONTEMPT کا ترجمہ ہے جس
کے دو چار شعر درج ذیل ہیں۔

تم اس کیڑے کو دیکھو لگاتار — تمہاری راہ میں ہے گرم رفتار
راہ میں دن کاٹتا ہے — سویرے اٹھ کے شبنم چاٹتا ہے

نظم "حب وطن" COLSIDGE کی نظم PATRIOTISM
کا ترجمہ ہے۔

اس دیارِ غریب میں آکر — سرد خطے میں پرورش پاکر
رہی شکر شکن وہ خوش گفتار — باعث طول عمر آخر کار
اس کے زریں زمرد میں پر و بال
کبھو رے کبھو رے سے ہو گئے ہیں لال

"گائے کے دودھ سے بچے جوان بوڑھے سبھی فیضیاب
ہوتے ہیں گائے کی معصومیت کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے

کل جو گھاس ہری تھی بن میں — دودھ بنی وہ گائے کے تھن میں
کیا ہی غریب اور کیسی پیاری — صبح ہوئی جنگل کو سدھاری
پانی ہی پی کر چارہ چر کر
شام کو آئی اپنے گھر پر

"شیر کو" جنگل کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس سے متعلق
مولانا یوں لکھتے ہیں ؎

اے شیر تیرے تن پہ طاقت کا پوستین
شاہی کے حق میں کوئی بھی ساجھی تیرا نہیں
حق نے تجھے عطا کیا ہے تجھے زور بے خلل
فولاد کی رگیں ہیں تو دل ہے ترا اٹل

"ریل" سے متعلق کتنی اچھی نظم آپ نے لکھی ہے۔ جس میں ملک
کے مختلف انسانوں کا ملاپ اور "ریل" کی صحیح عکاسی کی ہے

حیواں ہے نہ وہ انساں جن ہے نہ وہ پری ہے
سینے میں اس کے ہر دم اک آگ سی بھری ہے
کھا پی کے آگ پانی چنگھاڑ مارتی ہے
سر سے دھواں اڑا کر غصہ اتارتی ہے
اتر سے لے دکن تک پورب سے لے پچھاں تک
سب ایک کر دیا ہے پہنچی ہے وہ جہاں تک

انگریزی شاعر کی نظم THE EVENING STAR
کا بہترین ترجمہ کیا ہے۔

ارے چھوٹے چھوٹے تارو — کہ چمک دمک رہے ہو
ہمیں دیکھ کر نہ ہوئے — مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسماں پر — جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس سے روشن — کہ کسی نے جڑ دیئے ہیں
گہر اور لعل گویا

آپ کا انداز بیان صاف ستھرا ہے زبان پاکیزہ اور
سلیس ہے مسلسل محنت اور لگاتار کوشش سے انسان کو
جو کامیابی نصیب ہو سکتی ہے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل — تو گھس جائے بے شبہ پتھر کی سل
رہو گے اگر تم یونہی مستقل — تو اک دن نتیجہ بھی جائیگا مل
کیے جاؤ کوشش مرے دوستو

مولانا اسمٰعیل کا انتقال ۷۲ سال کی عمر میں بمقام میرٹھ
یکم نومبر ۱۹۱۷ء میں ہوا۔

ریڈر و صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج بنگلور ۱
۹، مارچ ۱۹۶۹

پروفیسر سید مبارز الدین رفعتؔ کا

ایک غیر مطبوعہ خط

اور ــــــــ رائے

ریڈر و صدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج بنگلور ۱ ۹، مارچ ۱۹۶۹ء

محبّی واحد پریمی صاحب :. تسلیم

آپ کے کلام کا مجموعہ "گلِ نو" اور اس کے بعد آپ کا کرم نامہ، دونوں میرے میسور کے پتہ سے لوٹ کر، بنگلور کے نئے پتہ پر ملے۔ آپ کی یاد آوری، کرم گستری اور عنایت کا سپاس گزار ہوں۔

تعلیمی سال کا اختتام ہے، امتحانوں کا قرب ہے، فرصت کم نصیب ہے، اس کے باوجود بڑے اشتیاق کے ساتھ میں نے آپ کے مجموعہ کلام کا انتخاب پڑھ ڈالا۔ اس سے پہلے مختلف رسالوں میں آپ کی غزلیں پڑھ چکا تھا، اور ایک خوشگوار تاثر آپ کی شاعری کے بارے میں رکھتا تھا اب آپ کے کلام کا انتخاب پڑھنے کا موقع ملا وہ خوشگوار تاثر اور بھی نکھرا ہو گیا، ذیل میں اس تاثر کا دھندلا سا عکس آپ کی خدمت میں حاضر کر رہا ہوں، زمانے کی مکروہات نے ذرا دامن چھوڑا تو انشاء اللہ بشرطیکہ حیات اس تاثر کو بطور شرح کیسا تھ لکھ کر حاضر کروں گا۔

امید کہ آپ ہر طرح بخیر ہوں، زیادہ : کرم بادہ،

والسلام : آپ کا
مبارز الدین رفعت

. . . .

میں نے جناب واحد پریمی صاحب کے کلام کا انتخاب "گلِ نو" پڑھا۔ اردو کے ادبی رسالوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے واحد پریمی صاحب کا نام اجنبی اور غیر مانوس نہیں، میں بھی رسالوں میں ان کی غزلیں پڑھتا آیا تھا، اور ان سے اس حیثیت سے متعارف تھا۔ "گلِ نو" میں اکٹھی ان کی پچاس سے اوپر غزلیں پڑھ کر تب خوشی

ہوگیا۔ آج کل جدید غزل گو شعراء نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اور جو باتیں وہ غزل میں بیاں کر رہے ہیں وہ مجھ جیسے قدیم ادب کے رسیا اور شیدائی کی ناقص فہم سے بالا ہی نہیں ناپسندیدہ بھی ہیں بڑی مسرت اور خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ واحد پریمی صاحب نے غزل کے قدیم اقدار کو باقی رکھتے ہوئے تازہ اور شگفتہ مضامین پیش کئے ہیں۔ بادۂ نو اور ساغر کہن غالباً ایسے ہی کلام کو کہتے ہیں۔ (جاری)

جناب واحد پریمی صاحب کے کلام میں تازگی ہے شگفتگی ہے، انداز بیاں میں تہذیب ہے، سائستگی ہے، جیسا کہ محترم ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب نے لکھا ہے واحد پریمی کے کلام کی نمایاں خصوصیت، ان کا انداز تخاطب ہے جس میں بلا کا درد ہے، اور جو بڑا دلکش اور پُراثر ہے، ترنم بھی بلا کا ہے کہ انھوں نے بڑی پُرترنم بحریں انتخاب کی ہیں۔

واحد پریمی صاحب نے یہ بہت اچھا کیا کہ اگلوں کی طرح اپنا سب رطب و یابس کلام چھاپ نہ دیا، بلکہ غالب کے چند جزو کے دیوان میں ہر جگہ سے ایک شعر شور انگیز نکلتا ہے، اسی طرح "گل نو" کے اکثر کسی نہ کسی تڑپانے یا چونکانے والے شعر سے خالی نہیں۔

یہ چند شعر ملاحظہ فرمایئے، اور اس جواں سال اور جواں فکر شاعر کے تخیل کی رعنائی کی داد دیجئے

نہ پوچھئے کہ شب ہجر ہم پہ کیا گذری
تمام رات جلے شمع انجمن کیطرح

کوئی ہنگامۂ حیات نہیں
رات خاموش ہے سحر خاموش

اُن گردش حیات، تری فتنہ سازیاں
اپنے وطن سے دور ہیں اہل وطن سے ہم

خون جگر کے آنکھوں سے قطرے ڈھلک گئے
دیکھا جوان کو صبر کے ساغر چھلک گئے

کیا کوئی دیدہ ور نہیں یارو
چشم نرگس ہے کس لئے نمناک

کوئی گردش ہو کوئی غم ہو کوئی مشکل ہو
جس کو آنا ہو ہمارے وہ مقابل آئے

حق بات سر بزم بھی کہنے میں تامل
حق بات سر دار کہو سوچتے کیا ہو

رہ حیات کے یوں پیچ و خم نہ سلجھیں گے
رہ حیات کو بھی زلف پرشکن سمجھو

یہ جنوں ہے کہ جذبۂ اوراک
سی رہا ہوں میں دامن صد چاک

اُس عورت نے میری زندگی جہنم کر دی تھی۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے۔ ہاں میری زندگی تو جہنم کر دی تھی اور اس پر کیا بس تھا۔ میری والدہ نے میرے والد کی زندگی جہنم کر دی تھی اور میری ساس نے میرے سسر کی۔ سب ہی عورتیں ایسا کرتی آئی ہیں۔ سب یہی کرتی تھیں تب ہی تو غالب نے کہا ہے

آدم زن بشیطان طوقِ لعنت

خدا نے ہماری عدول حکمی کی یہی سزا مقرر کی تھی۔ ہمارے گلے میں عورت کا طوق شیطان کے گلے میں لعنت کا طوق۔

نہیں وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتی تھی۔ آنکھ کھول کر اُس نے مجھے ہی دیکھا تھا۔ کبھی نگاہ بھر کر کسی اور مرد کو نہیں دیکھا مجھے جی اور جان سے چاہتی تھی۔ میری انگلی دکھتی تو اس کا دل مُڑ جاتا۔ میں بیمار ہوتا تو وہ ایک ٹانگ سے کھڑی رہتی۔ ایسی تیمار داری کرتی تھی کہ کیا کہوں۔ ہمیشہ میری طرف سے لڑتی تھی۔ مجھے کوئی اشارے سے بھی بُرا کہے تو بگڑ کھڑی ہوتی تھی۔ وفاداری میں اس کا ثانی نہ تھا۔ عصمت میں ایسی کہ کبھی کسی نے اس کا آنچل تک نہ دیکھا تھا۔ ایسی کہ اس کے دامن پر نماز پڑھی جائے۔

مگر زندگی جہنم کر دی تھی .... ہر وقت تن بھن ہر بات میں غصہ، گرمی، رونا۔ بین کرنا، دامن پھیلا پھیلا کر کوسنا، کاٹنا، یہ یوں نہیں یوں۔ وہ ووں نہیں ووں۔ ماں کو یہی کرتے دیکھا تھا۔ ساس کو یہی کرتے دیکھا تھا۔ یہی تعلیم یہی تربیت ہوئی تھی۔ پہلی ہی رات سے جہنم شروع ہو گیا تھا۔ میری والدہ نے ڈیڑھ سو روپے دیئے تھے کہ کہ یہ سرہانے رکھنا۔ سنا باپ کی پوٹلی بندھی تھی۔ میں نے سرہانے رکھ دی تھی۔ رات ہی میں کوئی دو بجے ہوں گے اُٹھ کر پوٹلی کھولی، روپے گنے بولیں۔ "آئیں! یہ ڈیڑھ سو روپلی۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے" اور روپے پھینک دیئے اکڑے بکھریں پھیل گئے۔ میں اُٹھ کر چپنے لگا اور وہ بکتی رہیں۔ "واہ بڑی باجی کے میاں نے تین سو روپے رکھے تھے، چھوٹی کے میاں نے ڈھائی سو، یہ لے کے چلے ڈیڑھ سو روپلی۔"

میں نے کہا "یہ میں کیا جانتا تھا۔ اماں نے ہی دیئے"
تڑپ کر بولیں "اُن ہی کو جا کر دو۔ اماں نے ہی
دیئے۔"

میں منہ دیکھنے لگا۔ کہ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ خیر روپئے
میں نے جمع کرکے پھر پوٹلی باندھی اور ان کے پاس آیا۔
بولیں "دیکھو مجھے ہاتھ نہ لگانا نہیں تو کچا چبا جاؤں گا۔"
کچھ دیر میں خاموش رہا۔ پھر میں نے ہاتھ پر ہاتھ
رکھا۔ اُنھوں نے ہاتھ جھٹک کر کہا "آگ لگے۔"
میں نے کچھ دیر بعد پیر پر پیر رکھ دیا۔ وہ اُٹھ بیٹھیں اور
بولیں "یہ بھاڑ میں جائیے!" پلنگ سے اُٹھ کر تخت کے ایک
کونے پر جا بیٹھیں اور زار و قطار رو رہی ہیں۔ "ہائے مجھے
نہیں معلوم تھا۔ کہ قسمت یوں پھوٹے گی۔ ہائے خدا یہ کیا
ہوا۔ میں نے کونسا گناہ کیا تھا۔" جوں جوں میں منانے کی
کوشش کرتا۔ وہ اور بگڑتیں۔ یوں ہی صبح ہو گئی۔ میں باہر
آکر سو رہا۔ ان کو ان کے بھائی آکر لے گئے۔ چوتھی کے بعد
جب گھر آئیں تو میں نے پوٹلی میں سو روپے اور شامل کر
لیے تھے۔ وہ دی۔ تب ان کو گن کر مسکرائیں۔
دولہناپے کے زمانے میں ہر روز ایسی ہی ٹھن ٹھن
غصہ گرمی، بین، رونا دھونا رہتا تھا۔ آج عطر نہیں لائے
آج ہار لائے تو اس کے پھول سوکھے ہوئے، گھر کے پہننے
کی جوتیاں نہیں ہیں۔ روز مرہ کے کپڑے نہیں ہیں۔ کپڑوں
کے لیے ہم سو سو پھیرے کر رہے ہیں۔ جوتوں کے جوڑے
پر جوڑے لا رہے ہیں۔ کوئی پسند نہیں آتا۔ میں منیخ نکالے
جا رہا ہے۔ زندگی جہنم ہو رہی ہے۔ والد مرحوم خدا بخشے
سب دیکھتے تھے، سب جانتے تھے، ان پر گذر چکی تھی۔
کوئی دو مہینے بعد بولے تھے "بس اب ہو چکا سہاگ۔ اگر یہی
طرح زن مرید رہو گے تو پاگل ہو جاؤ گے پاگل، وقت وقت
سے گھر میں جایا کرو، بس" وہ بہانوں سے مجھے باہر بلوا لیتے
گھر سے کہلوا دیتے۔ فلاں مقدمہ میں کچہری گئے ہیں۔ فلاں کرایہ
دار سے کرایہ وصول کرنے گئے ہیں۔ فلاں صاحب سے ملنا
ضروری تھا۔ وہاں میں نے بھیجا تھا۔ مگر جب گھر میں آتا ان کے
پاس، وہی راگ روتی۔ خیر کچھ عادت پڑ گئی۔ کچھ مسکرا کر ٹالا
کبھی کبھی ہنسی بھی اڑائی۔ دن کٹتے گئے۔ بچے ہوئے تو کچھ
غصہ میں کمی آئی۔ مگر بین کرنے کی عادت بڑھ گئی۔ بچے کے
کچھ ہوا اور بین ہونے لگے۔ "ارے میرے بچے کو کیا ہوا جاتا
ہے۔ اے مولا آیئے، بچایئے" اور میرے پر کوسنے۔ اس مرے
کو کوئی خبر نہیں ہے۔ ایسا سنگ دل ہے اس کو اڑھائی
گھڑی کی موت آئے۔ ایسے مردوے کو خدا غارت کرے۔"
اور نہ معلوم کیا کیا کوسنے۔ اب تو یاد بھی نہیں رہے۔
اور ایک مصیبت یہ ہے کہ ہر وقت ساس سے نوک
جھوک ہونے لگی۔ جب گھر میں جاؤ تو "تمہاری ماں نے یہ کہا
تمہاری ماں نے وہ کہا۔ سنو!" ادھر والدہ کہہ رہی ہیں "ایسی
بہو نوج ہو کسی کی۔ یہ کیا اور وہ کیا اور یوں کہا اور دوں
کہا۔" اب جس کی طرف سے بولو دوسری بگڑ جاتی ہیں عجیب
مخمصہ میں جان! ایک منٹ سکون نہیں۔ والد مرحوم آکر
بہو کی پچ لیتے اور والدہ کو ڈانٹ دیتے۔ بہو اور شیر
ہو جاتیں۔ میں کہہ اٹھتا "اپنے جھگڑے اپنے تک رکھا
کرو میری زندگی جہنم نہ کرو" اب رونا شروع ہوتا۔
"ہائے میری تو قسمت پھوٹ گئی۔ میرا تو کوئی نہیں ہے۔
یا اللہ تو ہی انصاف کر۔" اور ایسی ہی بک بک جو لگتی
ہے تو تار ہی نہیں ٹوٹتا۔ خیر۔ قہر درویش برجانِ درویش
گزرتی گئی۔ ابا جان کا انتقال ہوا۔ ان کا سیوم بھی نہ ہونے
پایا تھا۔ کہ دھن لگ گئی۔ "ارے میں ان کے ساتھ نہیں رہ
سکتی گھر الگ کرو، دیوار کھچواؤ۔" ان کے چالیسویں تک

یہی راگ روتی۔ یہی راگ روتی۔ میرا وثیقہ کھلنے ہی نہ پایا تھا کہ گھر الگ کرنے کے سامان شروع ہو گئے دالان کے سامنے دیوار کھینچ کر میرا حصہ الگ ہو گیا۔ نئی دیوار کے سہارے کھپریلا ڈال کر باورچی خانہ بن گیا۔ ایک نوکرنی کھانا پکانے کیلئے رکھی گئی۔ اب دن رات اس سے بحث تکرار۔ "تو نے یہ ہنڈیاں یوں بگاڑ دی۔ تو نے یہ چیرا ایسا" میں نے جھنجھٹ ختم کرنے کے لیے کہا "آخر وہ بھی آدمی ہے جیسے باجی تم سمجھاتی ہو ویسے کرتی ہے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔" پھر کیا تھا بولیں "ہاں اس پر نگاہ ہے، یا رنی بنانا چاہتے ہو اس کو پر چک لیتے ہو اس کی، اسی کو بیوی بنا کر بٹھا لو۔ میں اپنے میکے چلی جاؤں گی اپنے بچے لیکر، خدا نے مجھے اپنے کھانے بھر کا دیا ہے۔۔۔" عجب عورت نہ ہاری مانتی نہ جیتتی۔ بس اپنی رٹ تھی۔ اور ایسی رٹ کہ کسی دن کوئی بات مل جائے۔ بس شام تک اسی کی رٹ رہے گی۔ بار بار دھرائی جا رہی ہے بات کے بتنگڑ بن رہے ہیں۔ اور ہماری زندگی جہنم ہوتی جا رہی ہے۔ شدید سے شدید جہنم۔ دماغ کی کیا حالت ہوا کرتی تھی کیا بتاؤں۔ جی ڈھونڈتا تھا۔ کہ کہیں سکون ملے مگر کہیں نہ ملتا۔ والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب الحمد کرو اللہ کی طرف آگئیں۔ سارے گھر کا انتظام ہاتھ میں ہو گیا۔ اب ہر وقت داتا کل کل۔ بہنیں تھیں وہ کبھی آجاتیں۔ کچھ دن بڑا سہاگ رہتا۔ مگر پھر ان سے بھی ان بن۔ وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر ان سے کم تھوڑی تھیں۔ آوا کا آوا ہی الٹا تھا۔ جس خاندان میں پوچھو یہی عالم۔ جتنی خاندانی عورتیں تھیں یہ سب اسی رنگ میں رنگی ہوئی۔ والد نے تین شادیاں کیں۔ ایک پہلے ہی مر چکی تھی۔ دوسری میری ماں تھیں۔ تیسری اور تھیں وہ بھی خاندانی۔ والد نے ایک رنڈی بھی ڈال لی تھی۔ اس کے بھی بچے تھے۔ مگر ان کو رنڈی والا لوگ کہتے تھے۔ مجھے بڑا برا لگتا تھا۔ میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ ایک کے سوا دوسری نہ کروں گا۔ نہ کوئی بیوی اور نہ کوئی رنڈی۔ چاروں طرف سے زندگی جہنم ہو جاتی زیادہ تر میں گھر سے باہر رہتا۔ دوستوں کے ساتھ کھیلوں میں تماشوں میں باتوں میں دن گزر جاتا۔ گھر میں کھانا کھانے آتا۔ اس کے بعد پھر باہر چلا جاتا۔ بارہ دری کے ہے میں ساری رہائش کر لی تھی۔ حقہ وہیں بھر کر آجاتا تھا۔ خاصدان میں پان لگ کر آجاتے۔ وہ گھر میں ماؤں سے لڑا کرتیں۔ اور میری شکایت کیا کرتیں: "ان کو تو گھر بار کی کوئی پروا ہے نہیں۔ کھانا کھایا باہر جا کر پڑ رہے۔ حقہ ٹرخ ٹرخ کر رہے ہیں" کئی برس اسی عالم میں گزر گئے۔

مگر زندگی کچھ عجیب اکیلی اکیلی معلوم ہوتی تھی باتیں کرنے کو دوست بہت تھے۔ مگر یہ جی چاہتا تھا کہ کوئی عورت ہو۔ جو میٹھے لہجے میں بات کرے۔ جس کی باتیں ایسی ہوں جیسے منہ سے پھول جھڑیں۔ نہ معلوم یہ کیسی خواہش تھی؟ کیوں تھی؟ ایک دن ایک دوست کے یہاں گیا انکے پاس ایک رنڈی تھی۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ دوست کے ساتھ وہ بھی باہر کے حصے میں آ بیٹھا کرتی تھی۔ وہ ہم سب سے کس پیار سے باتیں کرتی تھی۔ کیا بتاؤں ذرا سی تلخی ذرا سی گرمی کا نام نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ ان دوست کے یہاں جانے لگا۔ اکثر ایسا ہوا کہ دوست گھر میں نہیں ہوئے تو رنڈی نے مجھے نہایت احترام سے بٹھایا۔ پان رکھے حقہ منگوایا۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی، کبھی کسی میلے کا ذکر کبھی کسی محفل کا حال، بات بات میں شعر پڑھتی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا، عورت کی بات چیت بھی عجیب لطیف چیز ہے۔ مرد عورت کا تعلق آخر کتے کتیا کے تعلق کے

لاوہ بھی کوئی چیز ہے۔ اور یہ خاندانی تعلق رسم دنیا...،
مرداری اور افزائش نسل کے لئے ہو تو ہو اور کسی کام
ے لیے نہیں ہے مجھے محسوس ہوا کہ رنڈیاں کرنے کی ضرورت
نفس تقاضا، خواہش سے نہیں ہوا کرتی تھی۔ رنڈیوں سے
و ربط میسر آتا تھا۔ اس میں سکون اور تفریح ملتی تھی۔
نڈیاں، پڑھی لکھی، تہذیب یافتہ صاحب ذوق ہوتی تھیں
ن کی صحبت میں ذہنی سکون ملتا تھا۔ غصہ، گرمی، بدمزاجی
ن کے پاس چھو کر نہیں جاتی تھی۔ میں نے کئی اور دوستوں
کے یہاں جا جا کر دیکھا جن کے پاس رنڈیاں تھیں۔
س زمانے میں قریب قریب ہر رئیس زادے کے پاس
یک رنڈی ضرور ہوتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ رنڈی نہایت
ی دلکش مصاحب ہوتی ہے۔ مگر مجھے خوف تھا کہ رنڈی
الوں گا تو اس کے بچے ہوں گے۔ اور پھر وہ رنڈی بچے
ہلائیں گے۔ اور ان کی زندگیاں خراب ہوں گی۔ ایسی
رنڈی ہو جو بانجھ مان لی گئی ہو۔ ایسی مجھے مل بھی گئی۔
سے میں نے ادھر لا کر رکھا جدھر میرے والد کی رنڈی
ہتی تھی۔ اور ان کے مرنے کے بعد چلی گئی تھی۔ نازنین
ام تھا اس کا۔ کچھ ہی عرصے میں مر گئی۔ مگر وہ جو پانچ یا چھ
برس اس کے ساتھ گذرے ہیں۔ ان کو جنت کا نمونہ کہا
جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ہر وقت مسکراتا ہوا چہرہ میں غمزدہ
اور پریشان گھر میں آتا۔ تو دلاسے دے رہی ہے شعر
سن رہی ہے، سمجھا رہی ہے۔ راتوں کو قصہ کہانیاں
سناتی۔ اس کی صحبت سے مجھے شعری کا شوق ہو گیا تھا
بازار سے دیوان خرید لاتا۔ ہم دونوں پڑھتے سمجھتے غور
کرتے۔ حسن و قبح کی باتیں کرتے۔ داستانیں بھی کبھی وہ پڑھتی
یں سنتا۔ کبھی میں پڑھتا وہ سنتی۔ دونوں پلنگ پر لیٹ کر پڑھتے
سنتے۔ عورت نہ اس لئے بنائی ہے کہ خاندانی بچے بنانے کے
اور خاندانی گھر سنبھالنے کے زحم میں میاں کی زندگی جہنم
کر دے۔ اور نہ اس لئے کہ کتیا یا بلی ہو کہ جسمانی آسودگی
کے بعد آدمی الگ ہو جائے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ آدم
اور حوا جب جنت میں گیہوں کھانے سے پہلے ہوں گے تو
اسی طرح رہتے ہوں گے۔ مگر میری بیوی نے اسے جینے
نہ دیا روز اس کے یہاں تعویذ گنڈے نکلا کرتے تھے۔
جب میں اس کے بھاگ جانے چھوڑ جانے، اس کے مر
جانے کی دعائیں ہوتیں۔ وہ مجھے دکھاتی اور مسکرا کر کہتی
ان تعویذوں سے ہی سب کچھ ہو جایا کرے تو پھر دنیا
میں کوئی کچھ کرتا ہی نہیں۔" وہ ذرا بھی توہم پرست نہ تھی
مگر کیا معلوم بیوی نے اسے کچھ کھلوایا۔ یا شاید کوئی ایسا
عمل ہوگا۔ جو اثر کر گیا۔ کہ ایکدن اُسے خون کی قے ہوئی
اُسی دن میں نے اس کا چہرہ افسردہ دیکھا۔ حکیم کو بلا کر،
دکھایا۔ اُنھوں نے کہا کلیجہ کٹ گیا۔ اسی رات کو وہ سوتی
کی سوتی رہ گئی۔

میری زندگی پھر جہنم ہو گئی۔ اور بھی جہنم ہو گئی ہے۔
بیوی کے یہاں آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ گھر میں جب کبھی
جاتا چھپ جاتیں اور آڑ سے ہزاروں کوسنے مجھے اور اس
رنڈی کو دیا کرتیں۔ لڑکیاں سیانی ہو چلی تھیں وہ آ کر لپٹ
جاتیں۔ مگر وہ بھی ماں ہی پر پڑ رہی تھیں لڑکے رنڈی والے
گھر میں میرے پاس آیا کرتے تھے۔ رنڈی ان سے بڑا پیار
کرتی تھی۔ اور ان کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے اس کے
مرنے پر لڑکے ایسے روئے جیسے سگی ماں کے مرنے پر روتے۔
لوگوں نے کہا ایک اور ڈال لو۔ مگر اب آگے ہمت نہ پڑی
اس کی یاد ہی میں زندگی گزارنے کی ٹھان لی۔ دل کو قلق بہت
تھا۔ زندگی سے دل بھر چکا تھا۔ بڑھاپا بھی آ چکا تھا۔ ایک
دن میں بیمار ہو گیا۔ حکیموں نے بیوی سے نہ معلوم کیا کہلا بھیجا

وہ دوڑتی ہوئی باہر کے مکان میں آگئیں۔ اپنا سب غصہ
سب لڑائی بھول گئیں۔ اب جو انھوں نے میری خدمت
ہے تو اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اور وہ دونوں لڑکیاں
قت ایک ٹانگ سے کھڑی رہتیں۔ اس زمانے میں مجھے
وس ہوا کہ اُن کو مجھ سے محبت ضرور تھی۔ اور یہ میری زندگی
جہنم بنانے والا طریقہ محض ایک رسم تھی۔ ایک خاندانی
ہذیب، خاندانی عورت کا ایک اخلاقی فرض۔ خیر میں
ھا ہو گیا۔ اُنھوں نے بہت دھوم سے غسل صحت کرایا
وتیں ہوئیں، ناچ گانے ہوئے۔ جوڑے بٹے۔ میری
ہیں بھی آئیں۔ سب ٹھیک ہی ٹھیک ہوا۔ معلوم ہوتا تھا
اب وہ بالکل بدل گئیں۔ اب میں گھر کے خاص حصے
ں رہنے لگا۔ انگنائی میں ایک قطار میں پلنگ بچھتے۔ اس
رے پر میرا پلنگ۔ اُس سرے پر بیوی کا۔ بیچ میں بچوں
ے۔ سال بھر یہاں وہ لطیف زندگی تو نہیں حاصل ہوئی
اس رنڈی کے ساتھ تھی۔ مگر پھر بھی پورا سکون رہا۔

مگر یہ سال بھر ہی تک رہا۔ اب بیوی کا ایک پٹّو کا
شروع ہوا کہ "ارے لڑکیاں جوان ہو گئی ہیں کہیں بات
یت ٹھہراؤ۔ کنڈی رہ جائیں گی"۔ ہر ایک آئے گئے
سے کہتیں "وہ ان کو یوں ہی بوڑھا کر دے گا۔ نہ
شادی ہو گی نہ بیاہ!"

مجھے محسوس ہوا کہ پھر زندگی جہنم ہونے لگی۔ مگر وہ
ڈی دو باتیں سکھا گئی تھی۔ ایک تو ہر پریشان کن بات
ہنس کر ٹالنے کی اجازت ڈالی گئی تھی۔ اور دوسرے
بھے پڑھنے سے تفریح حاصل کرنا سکھا گئی تھی۔ اب میں
یوی کی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتا۔ کبھی جھوٹ بولتا کہ فلاں
لاں سے ذکر کر رکھا ہے۔ اب شادیوں کے رقعے آئیں
گے۔ اور زیادہ حقہ منہ میں لگا کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ گھر میں
مشاطائیں آیا کرتی تھیں۔ اُنھوں نے لڑکیوں کی شادیاں
ٹھہرائیں۔ شادیاں ہو بھی گئیں۔ اب دامادوں کے ہٹ
کنڈوں کے پٹّو کے شروع ہوئے اب غصے سے زیادہ
رونا اور پٹّیا سوار تھا۔ بڑی لڑکی کا میاں ذرا سخت تھا
ایکدن وہ گھر میں آیا۔ اس پر ایسی تان ماری کہ وہ بگڑ کر
چلا گیا۔ لڑکی کو روک لیا مگر وہ دیور کے ساتھ چلی گئی
اب کیا تھا جو کوئی آتا اس سے یہی رونا تھا "بڑی لڑکی
کی تو قسمت پھوٹ گئی۔ ایسا ظالم مرد ملا ہے، وہ ظلم کر رہا
ہے وہ صبر کر رہی ہے باپ ہیں کہ محو ہیں، سرشار ہیں نہ دنیا کی
خبر ہے نہ مافیہا کی"۔ کبھی بیٹھے بیٹھے رونے لگتیں، ہائے میری بچی
کہاں تیری قسمت پھوٹی۔ ہائے یہ کون سے گناہ کا مجھے بجورا
ملا ہے"۔ اور روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتیں۔ لڑکی
کانپور بیاہ کر گئی تھی اور اس کے بچہ ہونے والا تھا۔ داماد
نے ان کو اطلاع دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک دن انھوں
نے شور مچانا شروع کیا۔ "ارے گوشت سے ناخون جدا کر
رہا ہے۔ ارے میری بچی جیے گی بھلا نہیں"۔ خوب دھاڑ،
دھاڑ کر روئیں۔ سارے محلے کے لوگ جمع ہو گئے۔ مجھے تو
یاد بھی نہیں، کیسے کیسے بین کئے۔ ہاں یہ یاد ہے کہ بیقراری
انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، آواز آسمان پھاڑے دے رہی تھی
اور آنسوؤں سے سارا دوپٹہ بھیگ گیا تھا کیا سماں تھا۔
واللہ! اور میرے دماغ کی کیا حالت ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا
تھا کسی نے ایک دم سے جہنم کی آگ میں پھینک دیا۔
دوسری لڑکی کی شادی بھی کانپور ہی میں ہوئی۔ اب ہر
وقت یہ رونا تھا "ارے سب کی لڑکیاں تو یہیں ہیں میری
پر شہر چلی گئیں۔ میں نے خدا کا کیا گناہ کیا تھا نہ معلوم ہائے
مرتے وقت آ بھی نہ سکیں گی۔ بغیر دیکھے مر جاؤں گی۔ ارے
اللہ! یہ کیا ہو گیا"۔

لڑکوں کے بیاہ کیے بہویں لائیں۔ خود جا جا کر دیکھ آئیں۔ آ آ کر کہا "بڑی کم سخن لڑکیاں ہیں۔" مگر گھر میں آتے ہی وہ زبان دراز اور بدتمیز ہو گئیں۔ بہوؤں کی ہر بات پر اعتراض ہو رہے ہیں چپکے سے میرے کان میں کہہ رہی ہیں۔ "اسے دیکھو کیسی چنڈال ہے۔ میاں چیزیں لاکر دیتا ہے کسی کو پوچھتا تک نہیں۔ دن رات میکا، جب دیکھو میکا، یہ کون طریقے ہیں۔ گھر کو گھر نہیں سمجھتیں۔ ماں کا بھرنا بھرتی ہیں۔" بہویں ان ہی کی طرح خاندانی تھیں۔ ایک سے ایک جواب پر چٹ جواب دیتیں۔ وہ روتیں "ارے ایسی بہویں مجھے ملی ہیں۔ کہ خدا دشمن کو بھی نہ دے، اے خدا یہ میری چنٹی کیسی منحوس تھی، داماد ہیں تو، بہویں ہیں تو، مجھے کھائے جاتی ہیں۔ اب میں مر بھی نہیں چکتی۔ کسی کتے بلی کی آئی ہو تو مجھے آجائے۔ اے خدا مجھے بلالے اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔" اپنے آپ کو کوستے مجھے کوسنے لگتیں۔ میں بڈھا ہو چکا تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اب یہ سب باتیں تیر کی طرح دماغ میں گھستیں۔ میں بھی جھلا اٹھتا۔ "تم عورت نہیں ہو جہنم ہو۔ چالیس برس سے میری زندگی جہنم کیے ہو میرے سامنے ایسی باتیں بالکل نہ ہوں۔ نہیں تو میں گھر کے اندر نہ آیا کروں گا۔" میرے لہجے میں کچھ ایسی سختی تھی ــــ کہ انھوں نے متوجہ کرنا چھوڑ دیا۔ مگر ہٹیا پیٹیا کی عادت کہیں جانے والی تھی۔ وہ مرتے دم تک رہی۔ نزع کے عالم میں خاموش ہو گئی تھیں۔ ایک دم سے چونک کر بولیں "تم نے میرا کلیجہ نکال لیا۔" اور پھر خاموش ہو گئیں۔ کیا معلوم کس سے کیا کہا تھا مجھ ہی سے کہا ہوگا۔ خیر اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔

جو کچھ ہوا یہ ان کی غلطی نہ تھی۔ وہ پورا ماحول ہی ایسا تھا۔ ہر بیوی یہی کیا کرتی تھی۔ خاندانی ہونے کی پہچان یہی تھی۔ اب دس برس ہو گئے مجھے بھی مرنا ہے دو برس چار برس اور تحصیل لوں گا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ لڑکے ملازمتوں پر ہیں۔ کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ لڑکیاں بھی کبھی آجاتی ہیں۔ یہ میرا مکان اب گیارہ قطعوں میں تقسیم ہو گیا ہے میں نے پہلے ہی اس سب کو لڑکے لڑکیاں میں بانٹ دیا ہے سب اپنے اپنے حصول کا کرایہ لیتے ہیں۔ میرا وثیقہ میرے بعد سب میں بٹ جائے گا۔ پوتوں اور نواسوں کی بھی شادیاں ہوئیں۔ وہ لوگ یہاں آتی ہیں۔ پڑھی لکھی فیشن ایبل ترسے ادب قاعدے سے بات کرتی تھیں۔ حالاں کہ وہ بھی خاندانی ہیں۔ انھوں ہی میں سے ہیں شاید ہماری ان بیوی مرحومہ کی طرح کی اب عورتیں نہیں۔ خدا بخشے انھوں نے تو زندگی جہنم کر دی تھی۔

اب بھی کبھی کبھی خواب میں آجاتی ہیں۔ وہی تیوری پر بل وہی ہونٹ دبے ہوئے، وہی ٹک ٹک جھک جھک، وہی رونا پیٹنا، گھبرا کر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اکثر میری بہویں بھی آجاتی ہیں۔ انھیں اب سن رسیدہ کہنا چاہیے۔ ان کے سامنے ان کی ساس کا ذکر آجاتا ہے تو کان پر ہاتھ رکھ کر کہتی تھیں "ہا ہماری ساس' ان کی ارواح نہ شرمائے نتھنوں چنے چبوا دیئے" میں ان کی بہوؤں کا ذکر کرتا ہوں تو کہتی ہیں۔ "آج کل کی بہویں اچھال چھکا دیدے کی۔ گھر میں گھڑی بھر نہیں ٹکتیں۔ میاں کو ساتھ لیا اور پارٹیاں اور کلب اور بائیسکوپ کا تماشا دیکھنے جا رہی ہیں" ان کی ان باتوں پر میں کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہوں۔ شاید یہ خاندانی عورتوں کی فطرت ہے کہ ہر بات میں میاؤں پر اعتراض' بہوؤں پر اعتراض۔ یہ پڑھی لکھی پوت بہویں جو ہیں یہ ساس کا ذکر بھی نہیں کرتیں۔ ان کی بھی بہویں جب ہوں گی بھی نہیں۔ یہ سب جھگڑے ایک ہی گھر میں رہنے سے نکلتے تھے۔ الگ الگ رہیں۔ وقت وقت سے ملتے رہیں تو نفرت

نہیں بڑھتی اور زندگی جہنم نہیں ہونے پائی۔

میں سوچتا ہوں کہ اس میں ہم مردوں کی بھی خطا تھی۔ عورت کو ایسا بند کرکے رکھا تھا کہ میاں کے سوا اس کے سامنے کوئی ہوتا ہی نہ تھا۔ ہر کام کے سلسلے میں بس میاں ہی دکھائی دیتا تھا۔ لہذا وہ بیوی کے ہر تیر کا ہدف تھا۔ اس کی زندگی جہنم نہ ہو جاتی تو کیا ہوتا۔ یورپ والوں نے اپنی بیویوں کے ہاتھ میں گھر کا سب کام دے دیا ہے۔ اپنی سب آمدنی دے دی ہے اور آزادی دے دی ہے کہ جو ضرورت ہو اپنے آپ لے آئیں۔ ان کو میاں کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت۔ اور پھر تفریحات کے لیے بیوی سے ہٹ کر کسی رنڈی کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اب میاں بیوی ساتھ تفریحات میں جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھی اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ بیٹوں اور دامادوں کو بھی اس روش پر کچھ نہ کچھ اعتراض ہے حالانکہ کچھ کر نہیں سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ "یہ تو بہت اچھا ہے وہ زندگی جہنم تھی۔ اس سے تو نجات مل گئی ہے"۔

وہ عجب زمانہ تھا۔ عورت مرد سے سیدھی طرح بات بھی کرتی تھی۔ ہر وقت ایک قسم کی جھلاہٹ یا افسردگی اس کی ہر بات سے نکلتی تھی معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت اس میں سمایا ہوا ہے جو زبردستی اُسے بلوا رہا ہے جب کبھی ان کی بولی کا خیال کرتا ہوں تو "ارے یہ کیا کیا" "ارے مردے یہ کیا کر دیا؟" "اسے میں پیٹتی تھی میری نہ سنی"۔ "اے نوج ایسا مردوا ہو!" جوں جوں زمانہ گذرتا گیا "ارے" "ہائے" میں بدلتا گیا۔ "ہائے یہ ہو گیا" "ہائے میں پیٹتی تھی"۔ کس قدر زبان پر تھا ان مرحومہ کے۔ آج کل کی لڑکیاں اس کے مطلب بھی نہیں سمجھتیں۔ چلو اچھا ہوا۔ وہ ہر وقت پیٹتی تھیں۔ ان کو معلوم ہی نہیں پیٹتی تھی کے کیا معنے ہوئے ہیں۔

---

۲۵ مئی ۷۶ء

حضرت قبلہ ! تسلیم و خلوص

جناب قمر سیوہاری کی عنایت سے فروغ اُردو کا طوطی ہند نمبر نظر افروز ہوا، بے ساختہ منہ سے احسنت نکلا، اور اب جزاک اللہ، بموجب ویر آید درست آید یہ شمارہ قیمت و قامت ہر اعتبار سے ہندوستان ہی نہیں پاکستان کے خصوصی نمبروں پر فوقیت رکھتا ہے اس لئے میں نے اسے فروغ ہند کا نام دے دیا ہے گر قبول افتد۔

"قومی راج" کو جو آپ نے شرف توجہ بخشا اس کا شکریہ۔ اے کاش ہمارا خسرو نمبر عین موقعہ پر سخت حادثہ کا شکار نہ ہو گیا ہوتا تو واقعاً کسی قابل ہوتا کسی کو کیا معلوم کہ ہم اسے پُورے سو صفحات کا کر چکے تھے کاتب صاحب پریس کو چلے اور راہ میں آدھے اوراق گم کر دیئے پھر نہ پوچھئے تین چار دن چوبیس گھنٹہ سر پر تلوار اور آنکھ تلے اندھیرا رہا، خیر کسی طرح اسے ایک ڈھب پر لاکر پریس کے سپرد کر دیا اور خود افسردگی و اضمحلال بٹورے گھر میں بیٹھ گئے مگر لطف یہ ہے کہ دوسرے ہفتہ ہی مارکیٹ میں یہ نمبر نایاب ترین ہو گیا چہ بوالعجبی

اس نمبر میں جو مال شامل نہ کر پانے کا زیادہ افسوس ہے وہ سات سو برس کے درمیان اردو، فارسی، انگریزی میں امیر خسروؒ کے بارے میں ثقہ حضرات کی دقیقے و دلچسپ آرا کا اُردو خلاصہ تھا۔ تقریباً ۹ صفحوں پر پھیلا ہوا۔ اسمیں حسن لذت بھی پیدا کی گئی اب بھی جب اس مسودہ پر نظر جاتی ہے تکدر پیدا ہو جاتا ہے۔ مجھے دھیان ہی نہ رہا کہ رغیب صاحب مرحوم کے بعد آپ کا نمبر اس شان کا اور ضرور نکلے گا ورنہ کافی وقت تھا آپ کو بھیج دیتا تو اس کی مٹی سوارت ہو جاتی ہے ہاں اگر کچھ قاعدے کے مضامین رہ گئے ہوں اور ضمیمہ نکالنے کا خیال ہو، پھر گنجائش بھی ہو تو ضرور مطلع فرمایئے گا انتخاب خسروؒ کی جو جھلک قومی راج کے نمبر میں تھی اسے پسند کیا گیا اور آپکو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ خلیق انجم صاحب میرے منتخب کردہ تقریباً چار سو اشعار معہ ترجمہ چھاپ رہے ہیں جو تمام مثنویات و غزلیات احاطہ کر لیتا ہے اور یہ کام ہند و پاک میں اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ غالباً کتاب پریس کے باہر آگئی ہوتی۔

آپ کے نمبر کی خصوصیت محض مضامین کا تنوع اور صلاحیت ہی نہیں بلکہ لکھنے والوں کا موضوع اور امیر سے گرا مصنف بھی ہے۔ شبیر احمد غوری بڑے عالم آدمی ہیں ان کا مضمون ہر لحاظ سے آنکھوں پر رکھنے کے لائق ہے اور اُن کی مستند علمی اور بھاری بھرکم شخصیت کا مظہر بھی۔ یہ تو ہوا سرسری تاثر اب رہی تفصیل سو اس کا یارا کہاں یہ نمبر کل ہی مجھے واپس کر دینا ہوگا حسب وعدہ، دفتر کی کاپی مالک و مختار مستقل اسٹاف ہے جسکا دوسرا ہی نہیں گیا۔ کیا آپ احسان بالائے احسان فرما کر مجھے ذاتی طور پر اس یادگار نمبر کا ایک نسخہ بھجوا سکیں گے مشروطاً یا غیر مشروط طور پر؟ اگرچہ اس نمبر کا کمزور مضمون مجھے "دکن اور امیر خسروؒ" ہی نظر آتا ہے البتہ شعری حصہ ایک سے ایک بہتر ہے مگر کتابت کی غلطی کچھ زیادہ نظر آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ "انگار" والے صہبا لکھنوی صاحب ہی اس نمبر کی صحیح داد دے سکیں گے اور قدر کر سکیں گے کہ ولی را ولی می شناسد۔ اُمید کہ آپ مع الخیر ہونگے طویل نویسی کی معذرت کیساتھ آپ کا عقیدتمند

[signature]

جگر مرادآبادی

ڈاکٹر سیدہ جعفر

جگرؔ مجسّم غزل تھے۔ تغزل جیسے جان عیوض ہر رگ و پے میں جاری ہو۔ غزل نے جگرؔ کو بہت کچھ دیا۔ اور جگرؔ نے غزل کو بہت نوازا۔ جگر کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے اس صنف کی اس وقت لاج رکھ لی۔ اور اس کی کھوئی ہوئی ساکھ قائم کرنے کی کوشش کی۔ جب اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جا رہے تھے۔ جگر حسن و عشق کا نغمہ گانے والے شاعر ہیں وہ بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔ ان کے نزدیک زندگی کا سب سے خوبصورت محرک، سب سے عظیم حقیقت جمال ہے۔ جگر کے یہاں حسن اور رومانیت محض پرچھائیاں اور دھندلکے نہیں، زندگی کی حقیقت بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے ذکر سے زندگی اور کائنات کی وسعتیں سکڑتی نہیں حیات کی بصیرت گھٹتی نہیں، زندگی گزارنے کا حوصلہ کم نہیں ہوتا۔ ان سے زندگی زیادہ پرکیف، زیادہ حقیقی زیادہ وقیع اور سرشار دکھائی دیتی ہے

"شعلۂ طور" کی اکثر غزلیں ہلکی پھلکی اور رسیلی ہیں یہ گلابی حسن اور شرابی عشق کی رنگین داستانوں کا زمانہ تھا۔ ان غزلوں میں چاندنی راتوں کی تابناکی، ساغر مئے کی سرشاری اور شاخ گل کا حسن سمٹ آیا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب جگر کا تصور جمال سرمستی، وجد آگیں کیفیت، ترنم ریزی اور شگفتگی ملتی ہے۔ داغؔ اور ریاضؔ کی شاعری بھی اکثر جگہ اس خالص رومانی، بے لوث اور بے داغ رنگینی سے خالی نظر آتی ہے، حسن و عشق کے تجربات برسوں سے غزل کے متعلقات رہے ہیں۔ لیکن ان، تجربات میں تنوع پیدا کرنے، ان کو ایک سچائی کے روپ میں پیش کرنے، انھیں زندگی کی ناگزیر حقیقت بنا دینے، ان میں لطافت اور مٹھاس کا اضافہ کرنے اور ان میں کھو جانے کا جو انداز جگر کے یہاں ہے۔ اس کی مثال اردو شاعری میں مشکل سے ملتی ہے غزل کے جمالیاتی تقاضوں کا ایسا ادراک، یہ نغمگی اور مذاق جمال کی یہ لطافت بھی کم نظر آتی ہے ؎

وہ چمن میں جب روش سے ہو کے گزرے بے نقاب
دفعتاً ہر ایک گل کا رنگ گہرا ہو گیا

سفاک جیتو نیں بھی ہیں قاتل نظر بھی ہے
کیا چیز ہو گئے ہو تمہیں کچھ خبر بھی ہے

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ
میں اپنا جام اُٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

یہ تیرا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ

ایک تجلّی، ایک تبسم، ایک نگاہ بندہ نواز
اس سے زیادہ اے غمِ جاناں دل کی قیمت کیا ہے

جگر نے غزل کی مخصوص رومانی فضا، تاثراتی انداز، احساس کی لطافت اور عہدِ شباب کے لطیف ہیجان کی بڑی اچھی مصوری کی ہے۔ جگر کے عشق میں تندرست اور صحت مند جنسی کشش کا دبا دبا میلان بھی پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ معاملہ بندی، ادابندی یا غیر متوازن خارجیت کے تند دھارے میں بہہ نہیں نکلتے جگر کا عشق ناکامیوں اور محرومیوں کا ماتم نہیں اس میں تلخیِ زیست سے زیادہ لذتِ زیست ملتی ہے۔ جگر کے تجرباتِ عشق میں ایک وقار اور متانت ہے ان کے یہاں عاشق کا کردار حد سے بڑھی ہوئی روایتی خاکساری، پستی اور بے غیرتی کا پیکر نہیں۔ اس میں خود داری، خود اعتمادی اور پاسِ ناموسِ عشق ہی نہیں" پندارِ حسن بھی ہے، وہ حسن سے شکست کھانے والا عاشق نہیں، حسن کو مسحور کر لینے والا عاشق ہے ؎

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا
سو بار حسن پر بھی یہ الزام آگیا

عاشق کے اس کردار نے جگر کی عشقیہ شاعری میں سرمستی، سربلندی، پندار اور رجائیت کی خصوصیات پیدا کر دی ہیں حسرت کی طرح جگر کا عشق دو طرفہ ہے ——
اور حسن بھی مبتلائے عشق نظر آتا ہے دونوں جانب شعلوں کی لپک ہے سوزِ دروں اور خلشِ پنہاں کا احساس ہے۔ اس لیے جگر کا عشق بڑا بھرپور اور مکمل محسوس ہوتا ہے چاہے اور چاہے جانے کی زنگا رنگ کیفیات اور متنوّع تجربات نے ان کے عشق کو زیادہ پُر اثر، صداقت پسند اور حقیقی بنا دیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

کیا خبر تھی خود وہ نکلیں گے برابر کے شریک
دل کی ہر دھڑکن کو اپنی داستاں سمجھا تھا میں

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

مرگِ جگر پہ کیوں تری آنکھیں ہیں اشک ریز
اک سانحہ سہی، مگر اتنا اہم نہیں

جگر وہ بھی ز سرتا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش
اُس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

چھپ کے پہروں اسے دیکھنے والے یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو برابر کے کھلاڑیوں کا مقابلہ ہے فتح کبھی اس کے حصے میں آتی ہے کبھی اس کے، اس لئے شکست کوئی آہ و فغاں کرنے، رونے، بسورنے یا زندگی سے بیزار ہو جانے کی بات نہیں۔ یہ معاملاتِ عشق کی ایک وسعت اور پہنائی ہے اور عشق انھیں گوناگوں تجربات کا نام ہے۔ جگر نے محبت کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اسی لیے دوسرے غزل گو شعراء کے مقابلے میں ان کے

تجربات عشق زیادہ ہمہ گیر، زیادہ رنگا رنگ، زیادہ گہرے اور سچے معلوم ہوتے ہیں ؎

کوئی نہ دیکھ سکا جن کو دو دلوں کے سوا
معاملات کچھ ایسے بھی درمیاں گزرے

مدت ہوئی اِک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدت غم سے
ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد

یہ مقام عشق ہے ظالم کہ ان دنوں
اکثر ترے بغیر بھی آرام آگیا

کیا لطف کہ خود اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجیے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

چہرے تک آستین وہ لاکر چلے گئے
کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

جب سے اُس نے پھیر لیں نظریں رنگ تباہی آہ نہ پوچھ
سینہ خالی، آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہیے

خطا معاف! زمانے سے بدگماں ہو کر
تری وفا پہ بھی کیا کیا ہمیں گماں گزرے

محبت کے یہ تجربات کتنے حقیقی، کتنے سچے، دودھڑکتے ہوئے دلوں کے کیسے سچے ترجمان، زندگی اور حقیقت سے کتنے قریب اور زندگی سے کس قدر معمور نظر آتے ہیں معاملات عشق کی یہ گرمی، یہ صداقت اور رنگا رنگی بھی جگر کو اردو کے اچھے غزل گو شعرا کی صنف میں لاکھڑا کرتی ہے یہ صحتمند جذبات عشق زندگی کے مثبت پہلوؤں کے ترجمان ہیں معاملات عشق میں جتنا باریک اور لطیف مشاہدہ جگر کے کلام میں ہے اس کی مثالیں اردو شاعری میں زیادہ نہیں ملتیں۔ حسرت کی شاعری میں بھی ایک جیتی جاگتی حقیقت نظر آتا ہے اور حسرت ہی کی طرح جگر نے حسن کی عظمت اور عشق کی پاکیزگی پر زور دیا ہے اور وہ "دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا" والی روش پر گامزن نظر آتے ہیں۔ جگر نے عشق کے تصور کو اقبال کی طرح نئی وسعتیں نہیں بخشیں اسے کون و مکاں کی پہنائیوں کا امین نہیں بنایا۔ اور اصغر کی طرح مابعدالطبیعاتی انداز بھی نہیں عطا کیا لیکن حسرت کے عشق کی سی طہارت اور لطافت ضرور بخشی عشق صدیوں سے کوچۂ قاتل اور بازار رسوائی میں بھٹک رہا تھا حسرت نے اسے بازار سے نکالا۔ اور گھر کی چار دیواری اور صاف ستھری اور دلکش فضا میں کھو جانا سکھایا۔ حسن کی معصومیت کا یقین دلایا۔ "اور حسن خانہ نشین" اور تہذیب رسم عاشقی کا بول بالا کیا۔ انھوں نے عشق کو آداب خودی اور آداب زندگی سکھائے۔ جگر نے اس پاکیزہ تصور عشق میں یہ اضافہ کیا۔ کہ عاشق کی روایتی بے چارگی اور مفروضہ حرماں نصیبی نے تصور کو جو حسن کی صفائی، سوقیت، اور ہرجائی طینت کا غماز تھا، ترک کر دیا۔ حسرت اور جگر کی شاعری میں پہلی دفعہ حسن و عشق دوش بدوش زندگی کی دشوار گزار، راہوں پر گامزن نظر آتے ہیں۔ جگر کے یہاں عشق ارضی زیادہ اور ماورائی کم ہے لیکن اس ارضیت اور مادیت نے اس کی عظمت، وقار اور رفعت میں کمی نہیں کی۔ جگر کے یہاں عشق ایسی آنچ ہے جس میں شاعر کا وجود آہستہ آہستہ سلگتا رہتا ہے۔ اور بالآخر وہ روشنی پالیتا ہے جو زندگی کی راہوں کو منور کر دیتی ہے۔ اصغر کے یہاں یہی روشنی نور بن گئی ہے اور جگر کے یہاں زندگی کی چمک اور تابندگی ؎

ایمان و کفر اور نہ دنیا و دیں رہے
اے عشق شاد باش کہ تنہا ہمیں رہے

شادماں و زندہ باش اے عشق خوش سودائے من
تجھ سے پہلے اپنی عظمت بھی کہاں سمجھا تھا میں

عشق ہے اُس مقام پر کہ جہاں
زندگی نے شکست کھائی ہے!

توہینِ عشق نہ ہو اے جگر نہ ہو
ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

جگر کا عشق اصغر کے عشق سے بنیادی طور پر مختلف ہے
جگر کے فن کی کائنات اسی آب و گل کے محبوب کا جمال
اسی کا افسوں، اسی کا جلوہ اور نیرنگ ہے۔ اصغر کی آنکھ
بھی جلووں کی تمنائی ہے لیکن وہ صورت سے معنی کی طرف
مائل بپرواز نظر آتے ہیں۔ اور جلوۂ جانانہ کو "سرگرم تجلی"
ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ جگر میں ارضی عشق کے جانگداز
تجربات اور سخت لمحات سے گزر جانے کا حوصلہ ہے۔ حسن
کے مجرد تصور سے اصغر کی والہانہ وابستگی انھیں زندگی
بسر کرنے کا وہ سلیقہ اور عشق کے معرکے سر کرنے کا وہ عزم
عطا نہیں کرتی۔ جو جگر کے یہاں نظر آتا ہے، جگر حسن کو
دیکھتے اور اس کی موہنی، اس کی عشوہ طرازی، اس کی کائنات
ٹھٹک دیو اور اس کی مہک میں گم ہو جاتے ہیں۔ اصغر حسن
دیکھتے اور دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اور یہ حیرت انھیں تصوف
شاعر بنا دیتی ہے۔ جگر کا احساس رنگ اور احساس
بلکہ ان کی غزل کو رومانی عنصر، جمالیاتی شعور اقدار کا اور
اظہار کرتا ہے جگر نے اصغر سے بہت فیض اٹھایا ہے۔
اور انھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے ؎

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرتِ اصغر سے ارادت مجھ کو

نگاہِ حضرت اصغر کی ہو ودیعت خاص
قرار بن گئے جگر کے دلِ حزیں میں رہی

حریمِ حسن معنی ہے جگر کا شانۂ اصغر
جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر

جگر کی شخصیت اور ان کا شعور، ایک ایسے ماحول میں
ابھرا جس میں صداقت، احترام، انسانیت، شرافت نفس
اور اخلاقی و روحانی قدروں اور خلوص کی کمی نہ تھی۔ شباب
کے تقاضوں نے ابتدا میں انھیں مے و مینا "عہد ماہتاب"
اور "دور آفتاب" کا شاعر بنا دیا تھا۔ یہ رنگ ان کے تغزل
کا سب سے گہرا رنگ ہونے کے باوجود ان کی غزل گوئی کا
واحد رنگ نہ تھا۔ اصغر سے وابستگی اور عبدالغنی منگلوری سے
عقیدت نے ان سے اس قسم کے شعر بھی کہلوائے ہیں ؎

بے کار ہے یہ مجنوں، یہ پیکرِ آب و گل
اُس چیز کا طالب بن جو اصل میں لیلیٰ ہے

اُٹھا نہ دیدۂ بلبل سے پردۂ غفلت
ہلاک ہو گئی کمبخت رنگ و بو کے لیے

یہ فریبِ جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر ہے دلِ بیخبر
کہیں جم نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر

بھلا ہوا کہ نظر حیرتوں میں ڈوب گئی
کہاں کہاں نہ ترا حسن رائیگاں ہوتا

بہار لالہ و گل، شوقِ برق و شرر ہو کر
وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر ہو کر

شش جہت آئینۂ حسنِ حقیقت ہے جگر
قیس دیوانہ تھا، محو روئے لیلیٰ ہو گیا

"شعلۂ طور" سے "آتش گل" تک فکر و احساس کی بہت سی
منزلوں کے نشان ہیں۔ اور یہ سب رجحانات جگر کی نجی
زندگی اور ان کے ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مشرقیت
کے رنگ میں رنگے ہوئے جس گھرانے میں ان کی شخصیت
کا خمیر اٹھا تھا اس پر شرافت، رکھ رکھاؤ، اخوت اور اس
سے زیادہ خلوص و انسان دوستی کی گہری چھاپ تھی اور یہی
انسان دوستی جگر کو خارجی ماحول، عصری مسائل اور سماجی

مظاہر سے اثر پذیر ہونے پر مجبور کر دیتی ہے جگر اور اصغر دونوں نے زندگی کے بدلتے ہوئے انداز دیکھے تھے (اصغر نے کم اور جگر نے بہت زیادہ) قدروں کو بنتے اور مٹتے دیکھا تھا نار و نور کی اس جنگ کو دیکھ کر آصغر مادی زندگی کو اور زیادہ قابل ترک اور بے مایہ سمجھنے لگے تھے جگر ایک باشعور فن کار کی طرح سماجی حالات کی ناہمواری پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ اُن کے نغمے فریادوں میں ڈھلجاتے ہیں اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔ ؎

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

روحانی قوتوں پر ایمان رکھنیوالا شخص بھی جب گرد و پیش کے ماحول میں گندگی اور عفونت محسوس کرتا ہے اور جب اپنے ارد گرد بسنے والوں کو دکھ درد سے تڑپتا اور سسکتا ہے دیکھتا ہے۔ تو وہ اپنی ہمدردی اور انسان دوستی کا اظہار کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جگر کا آخری عہد میں سماجی مسائل کی طرف رجوع کرنا اور انھیں درخور اعتنا سمجھنا۔ دراصل ان کی انسان سے بے پناہ محبت اور آدمیت کے احترام کا ثبوت ہے۔ سیاست کا میدان ان کے لئے نہ کوئی دلچسپی رکھتا ہے نہ اس "کارگہ مکر" کو ان کی افتادِ طبع سے کوئی مناسبت تھی۔ وہ انسانیت کے درس کے سہارے اور "جیو اور جینے دو" کے اصول کے پیش نظر، شرافت اور انسانیت کا پرچار کرنا چاہتے تھے۔ محبت اور خلوص کی سپر ماحول کی زہر میں بجھی ہوئی تلواروں کو روکنا چاہتے تھے ؎

کام جو ان کا ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

انھیں انسان سے انسانیت، کو کھو دینے، اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچانتے اور اپنے منصب سے غافل ہو جانیکی شکایت ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان نے زمین و آسمان، چاند ستاروں، سمندروں اور فضاؤں کے بارے میں حیرت انگیز تحقیقات کیں اور بیشمار معلومات حاصل کر لی ہیں لیکن وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کو پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا۔

انسان اس دنیا سے بے خبر ہے ؎
باہمہ ذوقِ آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بیخبر

وہ وقت ہے کہ علم حق ہے علم شیطنت میں گم
وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے

جگر کے یہاں دورِ آخر کی شاعری میں حیات کی رمز شناسی دیدہ دری، انسانی عظمت کا یقین اور سماجی بصیرت کا احساس ملتا ہے انسانیت سے بے پناہ محبت ان کی توجہ، خدمت دار و رسن" کی طرف منعطف کر دیتی ہے ؎

سلامت تو، ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

"شعلۂ طور" اور "آتش گل" کا جو زمانی فاصلہ ہے اس کو ہم جگر کی شاعری کے ارتقا سے تعبیر کر سکتے ہیں جگر کی شاعری آخری وقت تک فکر و فن کے اعتبار سے مائل بہ ارتقا رہی "آتش گل" جگر کے ذہنی انقلاب کی ترجمان ہے۔ لیکن یہ انقلابی شاعری نہیں ہے زندگی کی سنگین حقیقتوں سے نظریں ملا کر بھی جگر حیات کے رنگین پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر سکے۔ حسن پرستی، شگفتگی اور رنگینی، ان غزلوں میں بھی موجود ہے جو خارجی حقائق کی ترجمان ہیں "آتش گل" میں بعض اشعار

ایسے بھی ہیں جو محض حوادث اور مسائل کا انعکاسات ہیں ان میں شعریت کا رنگ زیادہ گہرا نہیں ہے وہ اشعار جن خارجی حقائق اور سماجی میلانات کو غزل کے میلانات سے ہم آہنگ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی غزل گوئی میں ایک خوبصورت اضافہ معلوم ہوتے ہیں ان اشعار میں غزل کی قدیم علامات اور پرانے استعاروں ہی کے ذریعہ سے زندگی کی نئی دھڑکنوں اور نئی آہٹوں کی ترجمانی کی گئی ہے اور ان اشعار میں روحِ عصر کا سارا عطر کھنچ آیا ہے۔

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ
خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے یہ سماں گزرے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں
کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار ہو آئے

صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں
لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

کھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل
کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ

ہاں کے لالہ و گل، کیا بہار تو یہ شکن
بنے ہوئے ہیں دلوں کی جراحتوں کے چمن

آج کل میخانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگر
زہر کے ساغر شرابِ زندگی کے نام سے

سماجی اور سیاسی شعور کی بالیدگی کے باوجود دورِ آخر میں جگر کی رومانی اور جمالیاتی حسن کمزور، مضمحل اور کند نہ ہو سکی۔ جگر کے عشق نے انھیں حسن کا رمز شناس تو بنا ہی دیا تھا زندگی کا مبصر اور حیات کے رنگا رنگ جلووں کا شناسائی بھی بنا دیا۔ اسی لئے ان کی شاعری میں تہذیب نفس، احترامِ آدمیت اور عصمتِ شاعر سب ہی باتیں مل جاتی ہیں۔ جگر کے تصور میں شاعری کی وقعت اور عظمت اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی ادا شناس نباض اور پارکھ ہے اسی لئے وہ شاعر کے متعلق کہتے ہیں ؎

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

جب کوئی حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے
ذرہ ذرہ مری جانب نگراں ہوتا ہے

وہ بھی ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے
گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

حسین و سادہ ہے کس درجہ فطرتِ شاعر
ہنسے تو غنچہ و گل، رو پڑے تو شبنم ہے!

جگر کی بعض ابتدائی غزلیں، سطحی، کھوکھلی، اور بے مغز نظر آتی ہیں لیکن یہ غزلیں بھی بے کیف اور بے رنگ نہیں ہیں۔ "نظر ملا کے مرے پاس آکے لوٹ لیا"، "شباب حسن کا حسنِ شباب دیکھ لیا"، "ہر دم دعائیں دینا ہر لحظہ آہیں بھرنا"، "کس نظر سے آج وہ دیکھا کئے"۔ اور جوانی آتے ہی ان پر قیامت کی بہار آئی ایسی غزلیں ہیں، جو تہہ دار اور پر مغز شاعری یا معنویت اور گہرائی رکھنے والے کلام کی تعریف میں نہیں آسکتیں ان میں ہلکے پھلکے جذبات کو سادہ زبان اور براہ راست پیرایۂ ادا میں پیش کر دیا گیا ہے لیکن یہ غزلیں بھی مشاعروں میں خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ اور اس میں جگر کی خوش گوئی سے زیادہ ان کی خوش گلوئی کا حصہ تھا۔ جگر اتنے مقبول پسندیدہ شاعر تھے کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے عقیدت مندوں اور پرستاروں کے لئے وجد آفریں ثابت ہوتا اور پھر جگر کے ترنم کا حسن اور مٹھاس اور ان کی مخصوص لے معمولی معمولی اشعار کو بھی چار چاند لگا دیتی۔

جگر کی بعض غزلیں بادی النظر میں داغ کے تغزل کی یاد دلاتی ہیں۔ جس کی ظاہری وجہ اندازِ بیان کی شگفتگی، شیرینی

اور رنگینی تھی۔ لیکن دراصل، جگر اور داغ کے فکر و احساس کی سطح، ان کے میلانات اور افتادِ طبع میں خاصا اختلاف تھا داغ بنیادی طور پر معاملات چھیڑ چھاڑ اور جرأتِ رندانہ کے شاعر تھے۔ اور جگر کیفیاتِ عشق اور تاثراتِ محبت کے۔ انکے کلام میں نہیں وہ طراری، چبھن، جھپٹ محبوب پر چھا جانے کا جذبہ اور وہ تو تو میں میں یا "رئیس زادہ ہے داغ آپکا غلام نہیں!" والی انا نبت نہیں ہے۔ داغ کی دہلوی زبان اور روز مرہ و محاورات سے غیر معمولی دلچسپی اور لفظی بازی گری جگر کے یہاں دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے شعرا کو جو محض زبان کی صحت یا نمائش اور روزمرہ اور محاورے کی خاطر شعر کہتے تھے۔ جگر نے "کارنگیران" شعر کے نام سے یاد کیا ہے بعض نقادوں نے جگر کی زبان اور ان کی طرز ادا پر اعتراضات کئے ہیں اور اصلاحیں بھی دی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان اصلاحوں سے شعر کی تھوڑی بہت تصحیح ہوئی ہو تو ہو لیکن ان سے اصل شعر کی لطافت، شادابی اور ترنم ضرور موجود ہو گیا ہے یہ صحیح ہے کہ زبان و بیان کے اعتبار سے جگر کوئی نہ استادانہ حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن جگر کو زبان کے استاد کی حیثیت سے جانچنا بھی زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ جو لوگ محبت کے لطیف جذبات اور نازک احساسات اور آداب میں جمالیاتی قدروں کے کم قائل ہیں وہ جگر کے اشعار کو زیادہ سراہ نہیں سکتے اس میں نہ جگر کا قصور ہے نہ اُن نقادوں کا۔ اگر زبان میں روزمرہ کا استعمال بھی ہو، بیان کی مادی خوبیاں بھی موجود ہوں، صنائع اور بدائع کی حسن کاری بھی ہو۔ لیکن کیف، رس، رچاؤ، نکھار اور مہک نہ ہو تو، ایسے اشعار زبان و بیان کی صحت کے باوجود پھیکے اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں

کارنگیرانِ شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

جگر کی غزلوں میں الفاظ کا انتخاب، مصرعوں کی موزونیت اور بامعنی و خوبصورت ترکیبیں ایک خاص حسن پیدا کر دیتی ہیں

قریب سرحدِ حرماں جگر ٹھہر جاؤ
سنا ہے قافلۂ غم ادھر سے گذر یگا

جگر وہ خاک ہی تو سرمۂ چشم دو عالم ہے
میسر ہو جسے صرف جمالِ یار ہو جانا

ہاں اسطرف بھی اک نگہ نیشتر نواز
کب سے تڑپ رہی ہے رگِ جانِ آرزو

لطافت مانع نظارہ صورت سہی لیکن
دھڑکتا دل کا کہتا ہے وہ گزرے ہیں ادھر ہو کر

"حسرت زدۂ طور" رحمتِ عاجز نواز" برقِ جمالِ یار" شعبدہ نرگس مخمور کار" طوفان قیامت زا" سلسلہ جنبانِ اضطراب اور حسن برق وش" ایسی ترکیبیں نہیں جو اردو غزل کے اسلوب میں قابلِ نظر انداز ہوں۔

جگر کے یہاں اصغر، حسرت، یگانہ اور فراق کی سی فکری گہرائیاں نہیں۔ تخیل کی اونچی اڑانیں نہیں، انسانی سیرت کی پر اسرار پہنائیاں نہیں، ان کی غزلیں گمبھیر کیفیت، سنجیدہ فکر اور آفاقی ذہن کی ترجمانی نہیں کرتیں اس کے باوجود جگر کی غزلیں اپنے مخصوص رنگ میں بڑی دلکش، پراثر اور دل موہ لینے والی ہیں۔ داغ کے بعد اردو داں طبقے نے ایک مدت کے انتظار کے بعد اتنی چٹیلی آنحارسیلی اور ایسی حسین غزلیں سنیں تھیں ؎

عرصہ ہوا کہ رسمِ محبت بدل گئی　　دامن سے وہ معاملہ چشمِ تر کہاں

آکہ تجھ بن اسطرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

اُس گھڑی کی شرم رکھ لے لئے نگاہِ نازِ دوست
ہر نفس کو جب حیاتِ جاوداں سمجھا تھا میں

نہ پہونچی آنچ دامن تک کسی کے
جلا احساں ترا اے سوزِ خاموش

لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک
نہ آئے گی بہار اب کے برس کیا

ترک تعلقات کو مدت گذر چکی
ظالم ترے خیال سے پیچھا ہو کہاں

گناہ گار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد
یہیں کہیں تری جنت بھی پائی جاتی ہے

قریب منزل آخر انفراق جگر
سفر تمام ہوا نیند آ ہی جاتی ہے

یہ اشعار محض ہلکی پھلکی "جذباتی شاعری" کے ترجمان نہیں۔ ان میں بہت سی قابل قدر اور کمیاب خصوصیتیں بھی موجود ہیں ان کا مطالعہ ہمیں زندگی سے گریز نہیں سکھاتا زندگی میں ڈوب جانا سکھاتا ہے۔ ان سے زندگی کا نشہ اور عزم حیات کچھ اور بڑھ جاتا ہے ان میں شعور جمال اور حیات کی لطافتوں کا احساس ہے جگر کے یہاں لذت پرستی نہیں حسن و عشق کی چاشنی ہے۔ جگر کی مہذب رندی و سرشاری، نغمگی و شیرینی، ان کے لطیف اشارات، حسین کنایات اور شگفتگی و سرشاری نے اردو غزل کی تاریخ میں کچھ ان مٹ نقش ضرور چھوڑ رکھے ہیں۔

ایک تو بوڑھا، دوسرے حاجی اور وہ بھی گاؤں کا اکلوتا، نوجوان چھوکروں کی زندگی عذاب میں تھی۔

حاجی صاحب نے حج کیا۔ اللہ نے ان پر رحمت کی۔ مگر وہ اس حج کو بری طرح چپکے، جیسے رحمت سے ایک نقطہ چپک کر اسے زحمت بنا دیتا ہے۔ صبح شام مکے مدینے کا ذکر کرتے۔ اس گھڑی کو کوستے جب وہاں سے چلے تھے اور ان لوگوں کو کوستے جن کے درمیان واپس آئے تھے اپنے لیے تو وہ بلاشبہ رحمت تھے۔ مگر ہمارے چھوٹے سے گروپ کے لئے زحمت بن گئے

وجہ یہ تھی کہ وہ اصلاح کے موڈ میں آ گئے تھے۔ اور وہ بھی بالکل اسلامی روایت کے مطابق کہ ہر بوڑھا ساٹھ سال پورے کرتے ہی اُن لڑکوں کی اصلاح پر تل جاتا ہے۔ جو پندرہ سے پچیس برس کے پھیر میں ہوں۔ ستاروں کا لکھا یوں ہوا کہ حاجی صاحب اس روایت کی پہلی شرط پوری کرتے تھے (اس کے علاوہ کچھ تھا) اور ہم لوگ دوسری۔ چنانچہ وہ جیسے ہی ہم میں سے کسی کو کسی جگہ کسی انداز میں بھی دیکھ پاتے ڈانٹنا شروع کر دیتے۔ اور اگر کہیں پورا گروپ نظر آ جاتا۔ تو ان کی دانست میں اسلام خطرے میں آ جاتا۔

صدیوں سے باطن کا حال اللہ میاں پر چھوڑ کر ہم لوگ ظاہری اصلاحات میں اُلجھے رہے ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب نے بھی اس اصلاح کا پہلا سبق اسوۂ حسنہ پڑھنا چاہا۔ اصل فلسفے کا تو ہمیں علم نہ تھا۔ مگر جب کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر انھوں نے ایک گھنٹہ تک ہم سب کو بزورِ شمشیر دوبارہ مشرف بہ اسلام کرنا چاہا۔ تو ہم سمجھے کہ داڑھی، پٹے دار بال، ڈھیلی ڈھالی پگڑی، ٹخنوں سے اونچی شلوار، بغیر کالر کے قمیض اور سرمہ والی آنکھ کا مجموعی نام اسوۂ حسنہ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں بڑا ڈر لگا۔ جنت تو ناممکن ہو ہی گئی۔ مگر یہ زندگی بھی محال نظر آنے لگی۔ حاجی صاحب نے پہلے تو لکچر جھاڑا۔ پھر ہم سے سچے مسلمان بن جانے کا عہد لیا۔ اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے لیے ایک ہفتہ کی مہلت دی اور نماز قضا ہونے کا شکوہ کرتے چلے گئے۔

کاسے نے ایک چھوٹی سی چیت شفیع کے نئے منڈے

ہوئے سر پر جمائی اور بولا "مومنو! رکھو سر پر پٹے!"

پھجے نے بھی آگے بڑھ کر شفیع کے سر کی چمکتی ہوئی کالی جلد کو چوما۔ اور پھر سینے سے لگا کر ایسی آہ و فغاں کرنے لگا۔ جیسے کوئی جوان موت ہو گئی ہو

مگر شفیع نے اس کے پیٹ میں گدگدی کی اور وہ کھلکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔

کامے نے ہنستے ہوئے پھجے کو دبوچ لیا۔ اس کے کندھے پر سوار ہوا اور بازو لہرا لہرا کر پکارا "ساجی ہمارا!"

"مُردہ باد!" سب نے پھیپھڑے کھول کر نعرہ لگایا۔

پھر ہم سب کنوئیں کے پیپل کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور حاجی صاحب کا نام لے لیکر بڑی بڑی پھڑک دار گالیاں تصنیف کیں۔

حاجی صاحب سے ہمیں شکایت یہ تھی کہ اُنھوں نے ہمیں ان چیزوں سے منع کیا تھا۔ جو اُن دنوں ہمارے خاص شوق تھے۔ ہم چار دن، پانچوں اُس دور میں تھے۔ جہاں کسی کی مسیں پھوٹ رہی تھیں۔ کوئی بازوؤں کے پٹھوں کو گیند بنانے پر تلا تھا۔ کوئی چھوٹتی ہوئی سرسوں کو دیکھ کر شام کے دھندلکے میں بے اختیار ماہیا لاپنے لگتا۔ ہم جیبوں میں کنگھیاں رکھتے تھے اور حجام ا شیشہ ہو۔ ریت سے مانجھی ہوئی، چکیلی گاگر ہو یا ساکن الاب۔ ہر چکیلی چیز میں اپنا چہرہ دیکھنے کو دل چاہتا۔ اور م نئے نئے انگریزی طرز کے بال ماتھے پر سنوارنے لگتے۔ سوائے شفیع کے جو سر پہ استرا پھروا کر گھٹنوں آم کی گٹھلی رگڑا کرتا اور پھر ہلکا پھلکا سا اڑتا ہوا چلنے لگتا۔ دھوتی ہم ہمیشہ سے باندھتے تھے۔ مگر اب چلتے چلتے جسم گھما کر پیچھے دیکھتے۔ کہ نچلا کنارا ایڑی سے چھوتا ہے یا نہیں۔ لے میں لال ٹیکے باندھتے۔ گریبان کے اوپر والے بٹن کھلے رکھتے۔ اور جب کھلے کھیتوں میں مل کر ماہیا گاتے، تو افق کے پھیلاؤ میں پریاں سرگوشیاں کرتی کرتی معلوم ہوتیں۔

پھجا حاجی صاحب پر بہت خفا تھا۔ وہ سب سے کم عمر تھا۔ اور اُس کے چہرے پر ابھی بال سے نکلنے شروع نہ ہوئے تھے۔ بلکہ نرم نرم ریشمیں بال قلموں کے نیچے پھیلے پھیلے رخساروں پر ہلکی سی سبزی لیپ رہے تھے اور اوپر والے ہونٹ پر تھوڑا تھوڑا دھواں سا نظر آتا تھا وہ چوتھے پانچویں روز شریف حجام کی دکان پر جاتا۔ پانی میں انگلیاں تر کر کے چہرے پر رگڑتا رہتا ہے۔ پھر جب شریف استرا لگا کر نرم بال ملائی کی طرح اتارتا۔ تو پھجا سرور سے آنکھیں بند کر لیتا۔ اور سارا دن گھومتے پھرتے رخساروں پر اپنا ہاتھ چلاتا رہتا۔ مگر اب کی جو شریف حجام کی دکان پر کھڑے ہو کر اُس نے چکنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ تو انگلیاں دباتے ہوئے اُس نے بے اختیار حاجی صاحب کو گالی دیدی اور بولا۔

"اسے سالوں کے انتظار کے بعد تو یہ وقت آیا ہے کہ یہ مزے لیں اور یہ کہتا ہے کہ داڑھی رکھو"

مہلت کا ہفتہ گذر گیا۔ اور باقی کئے ہفتے ہم نے ایسے گذار دیئے، کہ جہاں حاجی صاحب نظر آئے۔ ہم لپک کر ساتھ والی گلی کی بغل میں۔ گلی نہ ہوتی تو اچک کر قریب ترین درخت پر، اور وہ بھی نہ ہوا تو جو بھی دروازہ ملا۔ اس میں ایسے گھسے، جیسے گولا باری میں سپاہی خندقوں میں گھس جاتے ہیں جان بھی بچ جاتی ہے اور کسی ماسی کو سلام کرنیکا ثواب بھی مل جاتا۔ چند ہی دنوں میں ہم نے یہ ثواب اتنا کمایا۔ کہ حاجی صاحب ہمارے لئے اسوۂ حسنہ کا ثواب غیر ضروری سمجھنے لگے۔

اب ہمارے گروپ اور حاجی صاحب کے درمیان باقاعدہ سرد جنگ کا آغاز ہو چلا تھا۔ جنگ کا صحیح اندازہ ہونے کے لیے طرفین کے حلقہ کو الف سے واقفیت ضروری ہے اس لیے اپنے تعارف کے طور پر عرض کروں گا کہ ہمارا چار پانچ افراد کا گروپ گاؤں کے بگڑے ہوئے لونڈوں کی روایت آگے چلانے والا تھا۔ اس وقت سے آج تک زندگی کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ میں اور گاما آٹھویں میں فیل ہونے کے بعد اس کے ساتھ شامل ہوئے اور شفیع کو اکھاڑے کی کھیل میں ایسی بھائی کہ دنیا کے باقی کام دھرے رہ گئے۔ ہم کھیتوں پر واجبی سا کام کرتے یا کبھی مویشیوں کے لیے چارہ لے آتے۔ باقی وقت اکٹھے گھومتے رہتے، کبھی کنوئیں کے پیپل کی چھاؤں تلے، کبھی پیر چنے شاہ کے مزار کے سائیں کے پاس، کبھی یونین کونسل کے دفتر کے گرد، اور کبھی لوگوں کے گڑوں میں گھومتے رہتے۔ ہمارے گروپ کا لیڈر شفیع تھا کیونکہ عمر میں بڑا ہونے کی وجہ سے اور دوسرے زراعت کے انسپکٹر حبیب خان سے واقفیت کی وجہ سے بھی کیوں کہ ان کے گھر میں ریکارڈ بجانے والی مشین تھی۔ اور ہم سب وہاں جا کر گانے سنا کرتے تھے۔ یہ پروگرام شفیع کی دست گیری کے بغیر نہ چل سکتا تھا۔

گاؤں کی رائے عامہ نے ابھی ہمیں لاعلاج نہیں مانا تھا لیکن ہمارا ذکر کرتے وقت اللہ کی مرضی اور والدین کے بُرے مقدر کے فلسفہ کا حوالہ ضرور دیا جاتا۔ حالاں کہ کسی معترض کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا کہ اپنے والدین کی عمر کو پہونچنے پر ہم ان سے بہتر نہ ہوں گے۔ مستقبل کا حال کسے معلوم۔ بس اسی ایک نقطہ پر ہمارا گاؤں بزرگوں سے اختلاف رائے تھا۔ باقی تو کوئی خاص بات نہ تھی۔

حاجی صاحب سے سرد جنگ تھی۔ تو وہ ہر وقت ہمیں سدھارنے اور اس طرح اپنا عاقبت سنوارنے کی فکر میں تھے۔ مگر ہمیں اُن سے اتنی چڑ ہو گئی تھی کہ ہم اُن کو جنت میں بھجوانے میں کوئی مدد نہ دینا چاہتے چاہے اس عدم تعاون کی سزا میں ہمیں خود جہنم آباد کرنا پڑے مقابلہ کڑا تھا۔ چند دن اپنے اپنے انداز میں زور آزمائی ہوئی اور جب حاجی صاحب نے تنگ آ کر اسوۂ حسنہ کی پیشکش واپس لے لی۔ تو ہم پہلا راؤنڈ جیت گئے

مگر دوسرے راؤنڈ میں حاجی صاحب کا حملہ ایسا سخت تھا کہ ہم مات کھا گئے، انھوں نے ڈاکٹروں والی ترکیب کی کہ چند جراثیم مارنے کے لیے سارے پانی میں ہی لال دوائی ڈال دو چنانچہ جو لال دوائی انھوں نے تجویز کی وہ یہ تھی کہ گاؤں کے سب لڑکوں کو مولوی صاحب قرأت پڑھایا کریں۔

"بھئی دیکھو نا!" حاجی صاحب بڑی فخریہ عاجزی سے کہتے "کہ اگر ہم لوگ کلام اللہ کا تلفظ ہی درست کر لیں تو جا ہے اور کچھ بھی نہ کریں جنت کے حقدار ہو جائیں گے"۔

پھر وہ اس موضوع پر کتنی ہی حدیثیں سنا ڈالتے اور ہم حیران ہوتے رہتے کہ حج پر جانے سے پہلے تو اُن کو ایک حدیث بھی نہ آتی تھی۔ نہ معلوم اب زندگی کے ہر مسئلے پر سینکڑوں حدیثیں کہاں سے سیکھ لیں۔ ہم سمجھتے تھے۔ کہ حج پر جا کر دوسرے امتحانوں کی طرح لوگ حدیثوں کا امتحان دیتے ہیں۔ اور حاجی جی کی بڑی کارگزاری ہے۔ کہ دو تین ماہ کے عرصے میں اتنا لمبا اور مشکل کورس پاس کر آئے ہیں۔ اور اب انھیں ہزاروں حدیثیں زبانی یاد ہیں۔

بہرحال ہوا یوں کہ کچھ عرصہ بعد گاؤں میں باقاعدہ

اسکول چالو ہو گیا۔ جہاں صبح کے وقت مولوی صاحب سب لڑکوں کو قرأت سکھایا کرتے تھے حاجی صاحب خود بھی وہاں آتے۔ ان کے ہاتھ میں پتلی سی چھڑی ہوتی جو لڑکا "ق" اور "ح" کو حلق سے ادا نہ کر سکتا وہ اسے مارتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے گاؤں میں جبری بھرتی کی ایک مہم شروع کی۔ جس میں لڑکوں کی بجائے ان کے باپ قابو کئے اور ان کے دیہاتی جوتے کے بے دریغ استعمال نے بچوں کو اسکول کا راستہ دکھایا۔ گاؤں کی فضا میں یہ لال دوائی اتنی موثر ثابت ہوئی کہ پہلے کھنڈرے پن کے جراثیم بھی مر گئے اور ہم سب سوائے پھیچے کے اسکول میں جاکر باقاعدہ قرأت سیکھنے لگے۔

پھیچا البتہ بڑا باغی نکلا۔ اس پر سب ہتھیار بے سود ثابت ہوئے۔ باپ نے جوتے مارے۔ حاجی صاحب نے چھڑیوں سے مارا۔ گاؤں کے لڑکوں سے پٹائی کرائی۔ ہم عمر بچوں سے سوشل بائیکاٹ کرایا۔ ماں کو اسلام کا واسطہ دے کر دودھ بند کروا رکھا۔ دوکانداروں سے کہا کہ اسے کوئی مٹھائی وغیرہ نہ دیا۔ مگر پھیچا ہر ایک کے سامنے خم ٹھوک کر کھڑا ہو جاتا۔ اور حاجی صاحب کی ذاتی شان اور ان کے عقائد اور نیتوں کے متعلق ایسی ایسی باتیں کھلے بندوں کہہ دیتا کہ سب لوگ اسے کافر کہنے لگے۔ اور اگر میں وہ سب باتیں بیان کردوں تو لوگ مجھے بھی سنگسار کر دیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان لوگ اٹھتے بیٹھتے اسلام کے احکام کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی زبان سے اسلام کو کچھ کہے تو اسے قتل کرنے پر تل جاتے ہیں۔ اس لیے بھلا میں کیوں پھیچے کی کہی ہوئی باتوں پر قتل ہو جاؤں۔ بس آپ سمجھ جائیں کہ اس نے کیا کہا ہوگا کیوں کہ اسے بڑی غلیظ گالیاں دینے کی عادت تھی۔

پھیچا اب بھی ہمارے گروپ میں باقاعدہ شامل تھا۔ ہم کنویں پر اکٹھے نہاتے۔ شفیع کے ساتھ اکھاڑے پر اکٹھے جاتے شریف حجام کی دوکان پر پھیچا جب بھی داڑھی پر استرا لگوانے جاتا۔ ہم ساتھ ہوتے۔ مگر جب ہم قرأت کے سبق کے لیے جاتے تو وہ ہمارا ساتھی بن جاتا۔ کبھی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ہم مکتب کو چلے تو وہ بھی ہنستا کھیلتا ہمارا ساتھ ہو لیا۔ مگر جیسے ہی اس گلی میں پہنچے۔ وہ سرپٹ بھاگ جاتا۔ ایک دفعہ ہم نے مذاق میں اسے پکڑ لیا۔ کہ زبردستی مکتب لے جائیں گے۔ مگر اس نے سچ مچ غصے میں آکر اتنی لڑائی کی کہ میرا کان چھل گیا۔ شفیع جیسے پہلوان کے گھٹنے پر چوٹ آگئی۔ کامے کی انگلی کا ناخن ٹوٹ گیا۔ اور خود پھیچے کو کئی خراشیں آئیں۔ اس کے بعد ہم اسے وہاں تو نہیں لے گئے مگر وہ کئی دن ناراض رہا اور بعد ازاں مکتب کے وقت پر ہمارے قریب نہ پھٹکتا

پھیچے کا باپ اس کی وجہ سے بہت تنگ تھا گاؤں کے سارے لوگ اس پر اعتراضات کرتے۔ کہ وہ اپنے گھر میں اللہ اور رسول کا نام نہیں چلا سکتا۔ اور بیٹے کے لچھنوں کی وجہ سے اسلام کی توہین کر رہا ہے پھیچے کا باپ اس وجہ سے بھی زیادہ شرمندہ ہوتا۔ کہ کرنے والے اپنے بیٹوں کے قرأت سیکھنے کا ذکر اس انداز میں کرتے گویا ان کے پاس مومن ہونے کا سرٹیفکیٹ ہے ایک دن کسی ایسے ہی آدمی کی بات پر چڑھ کر اس نے پھیچے کو بازار میں پکڑ کر اتنا مارا کہ اس کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ حاجی صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ دوسرے لوگ پھیچے کو بچاتے تھے مگر حاجی صاحب نے ان کو روکتے۔ اور کہتے کہ نفس کی اصلاح کے لیے ہر قسم کی سختی جائز ہے۔ ہم اپنے کندھوں پر اٹھا کر پھیچے کو گھر لے گئے تو اس

کی ماں نے رو رو کر پرانے لحاف سے روئی نکالی اور اس پر ہلدی اور میٹھا تیل لگا کر بچے کی چوٹوں پر لگایا اور ساتھ ساتھ حاجی صاحب کو برا بھلا بھی کہتی گئی۔ پٹی باندھتے میں ایک دفعہ اُس کا ہاتھ سخت پڑا تو بچہ چلایا۔

"اے ماں! میں مر گیا"!

تو ماں نے جھنجھلا کر ایک دو ہتھڑ اُس کے سر پر مارا۔ اور چیخ کر بولی "مرتا بھی تو نہیں۔ تجھے موت لے کیوں نہیں مولوی صاحب کے پاس جا کر پڑھتا ہے"

مولوی اور پڑھنے کا نام سنتے ہی بچے کی سسکیاں غائب ہو گئیں۔ اور وہ ایسے بے غرور سے تن کر بیٹھ گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں اور اسے مار پیٹ کی کوئی پڑی نہیں اور ہوا بھی یہی۔ جونہی ٹھیک ہوئے پر گلیوں میں تو گلیلیں مارتا رہا۔ مگر قرأت پڑھنے نہیں گیا۔

ایک دن مکتب میں ہمیں حاجی صاحب نے بتایا کہ انھوں نے اپنے ایک اور حاجی دوست سے جو شہر میں رہتا ہے کچھ ریکارڈ لئے ہیں۔ یہ ریکارڈ عرب شریف سے آئے تھے۔ اور ان میں بڑے بڑے علماء کی تلاوت بھری تھی۔ اُسی شام مغرب کی نماز کے بعد زراعت کے انسپکٹر صاحب کے ہاں مشین پر بجائے جائیں گے۔

ہم نے شرارت یہ کی کہ بچے سے جا کر کہا کہ آج شام زراعت کے انسپکٹر صاحب کے گھر مشین پر ریکارڈ بجائے جائیں گے جس میں ہیر وارث شاہ عبدالستار کی یوسف زلیخا اور جھگڑے کے گیت ہوں گے۔

بچے نے گالوں پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتا ہوا جھٹک کر کہنے لگا۔

"ضرور چلیں گے بادشاہو ہم بھی"!

شام کو انسپکٹر صاحب کے گھر کے سامنے کھلی گلی میں چھڑکاؤ ہوا۔ نرم نرم گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ ایک دری بچھائی گئی جو ہم لڑکیوں کے لیے تھی۔ دری کے ایک کنارے پر دو تین چارپائیاں بچھائی گئیں۔ سب سے پہلی پر کھیس بھی بچھا تھا۔ دری کے دوسرے کنارے پر چند کرسیاں رکھی گئیں۔ جن میں کسی کی ٹیک۔ اور کسی کی سیٹ لکڑی کی تھی۔ کسی کا بازو ٹوٹا تھا۔ اور کسی کی سُرخ ٹانگ پر سفید دیار کا جوڑ تھا۔ ایک کرسی پر میلی سی گدی بچھی تھی۔ یہ حاجی صاحب کے لیے تھی۔

یہ سارا کام مکتب کے بچوں نے کیا۔ اور بچے نے بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ کیوں کہ اُسے کسی نے نہیں بتلایا تھا کہ ریکارڈ کس قسم کے ہیں اور وہ سمجھتا رہا کہ وہ ہیر وارث شاہ سنے گا۔

شام کو جب سب لوگ آئے اور حقے گڑگڑانے لگے تو انسپکٹر صاحب نے باجا کھولا۔ سبز رنگ کے گول چکر کو برش سے صاف کیا۔ اس پر ریکارڈ جمایا۔ اس کو صاف کیا۔ باجے میں چابی بھری اور جب سوئیوں کی ڈبیا کھولنے لگے۔ تو ہم بچے کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

انسپکٹر صاحب نے سوئی گھومتے ہوئے توے پر رکھی تو ایک ہلکی سی سرسراہٹ اُبھری اور پھر پایاب ندی کے پھیلتے ہوئے پانی کی سی نرمی کے ساتھ قاری کی آواز فضا میں لہرائی۔

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم!

وقفہ پڑا تو حاجی صاحب جھوم کر بولے

"سبحان اللہ"!

قرأت جاری ہی تو بچے نے حیرت سے ہم لوگوں کی طرف

دیکھا۔ ہم سب سر نیچے ڈال کر اُبلتی ہوئی ہنسی کو دبانے کیلئے ہلکورے لینے لگے پھجا چند ثانیوں بعد کچھ سمجھ گیا موٹی سی گالی اُگلتے ہوئے اس نے اُٹھنا چاہا۔ مگر ہم سب تیار تھے اُسے وہیں جکڑ لیا۔ وہ ہیں گالیاں دیتا ہوا چھڑانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور ہم اپنے چہروں کو گھٹنوں میں دبائے اس کو روکے رہے۔

"ایۓ ادب سے بیٹھو ملعونو!" حاجی صاحب گرجے۔

"کون ہے شور کرنے والا؟" مولوی صاحب قرأت والے ماحول میں ڈانٹنے کا حق اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے ہم سب دبک گئے مگر پھجے پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی۔ اور وہ کچھ دیر مقابلے کے بعد ٹھنڈا ہو کر بیٹھ گیا تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہم سب کو باری باری گالیاں دیتا رہا۔

چند ریکارڈوں کے بعد انسپکٹر صاحب نے نیا ریکارڈ لگایا تو سب چونک اُٹھے۔ اس مرتبہ مرد کی بجائے عورت کی آواز تھی اور وہ بڑی خوش الحانی سے تلاوت کر رہی تھی۔ انسپکٹر صاحب گنے کے ڈبے میں پڑے ریکارڈ الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور پھر ڈبہ بند کرتے ہوئے بولے۔

"باقی سبھی ریکارڈ اسی کے ہیں"!

اگلا ریکارڈ لگایا تو مولوی صاحب بولے....

"سبحان اللہ! یہ تو سورہ رحمان ہے"

انسپکٹر صاحب نے بتایا۔ کہ یہ سورہ تین چار ریکارڈوں پر مسلسل ہے"۔ پھر تو مزے آجائیں گے"۔ حاجی صاحب کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے بولے "ایک کے بعد دوسرا لگائے جاؤ جی"

اور پھر واقعی مزے آگئے اُس عورت کی آواز بڑی سُریلی تھی۔ تلفظ میں بہت نکھار تھا۔ اور آواز کا اتار چڑھاؤ بہت تناسب تھا سورہ رحمٰن میں ایک آیت کا تکرار ہے۔

فبای الاء ربکما تکذبٰن

اور جب وہ بار بار اس آیت کو دہراتی تو بہت بھلی لگتی۔ کافی دیر تک ہم لوگ تلاوت سنتے رہے اور پھر رات گئے گھروں کو واپس آئے۔ راستے میں کئی لڑکے مکتب کے سبق کی بلند آواز میں تلاوت کرنے لگے۔

ہمارا مکتب ہفتے میں دو دن ہوتا تھا۔ اگلے دن باری تھی۔ میں گھر سے دیر میں نکلا۔ اور راستے میں بیلوں کی لڑائی دیکھنے رک گیا۔ اس لیے جب وہاں پہونچا تو چھٹی ہو چکی تھی اور مولوی صاحب باہر نکل کر جوتا جھاڑ رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر میں گلی کے کونے میں چھپ گیا۔ اور جب وہ چلے گئے تو میں مکتب کی طرف گیا۔ کہ شاید وہاں شفیع اور کاما موجود ہوں۔

مگر وہاں ایک عجیب ماجرا دیکھنے میں آیا۔ سارا مکتب خالی تھا۔ ایک کونے میں پھجا سر پر رومال ڈالے دوزانو بیٹھا تھا اور قراءت کا پہلا سبق بلند آواز میں بڑی تندہی سے پڑھ رہا تھا۔ میں حیرت سے کھڑا دیکھتا رہ گیا پھجے نے مجھے دیکھا مگر اپنے سبق میں مصروف رہا

میں تھوڑی دیر تک تماشا کرتا رہا۔ پھر قریب جاکر زور سے ایک دھپ اس کی کمر پر لگائی۔

"ابے پھجے تجھے تلاوت سے کیا کام؟"

پھجا خاموش رہا مگر جب میں نے دوبارہ ٹھوکا دیکر پوچھا تو اسکی آنکھیں شرمیلے انداز میں میری طرف اُٹھیں پھر موٹے موٹے بند ہوگئیں۔ وہ اپنے تازہ منڈے ہوئے رخسار پر ہتھیلی پھیلانے لگا۔ اور بڑے سرور بھرے لہجے میں گنگنایا۔

فبای الاء ربکما تکذبٰن

مطبوعات ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی معہ جدید قیمت مئی ۱۹۷۶ء)

(۲)

۱۔ امیر خسرو نمبر — فروغ اُردو — ۱۲/-
۲۔ ادبی جائزے — سعادت علی صدیقی — ۸/-
۳۔ ایکتا کا چمن، تہواروں کے پھول۔ — ثمر لسوانی — ۳/-
۴۔ احتشام حسین نمبر (فروغ اُردو) — سید انصار حسین ہاہلی — ۲۵/-
۵۔ اُردو کا ماضی۔ حال اور مستقبل۔ — احمد ابراہیم علوی — ۴/-
۶۔ آئینہ نظم اُردو — ثمر لسوانی — ۴/-
۷۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی — روپ نرائن شیو پوری شاکر — ۱/-
۸۔ اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر — ڈاکٹر محمود الحسن رضوی — ۱۶/-
۹۔ اُردو ہم نمبر، فروغ اُردو — اقبال صدیقی — ۳/۵۰
۱۰۔ انوار اللغات اُردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) — پروفیسر احتشام حسین — ۶/-
۱۱۔ ادبی تاثرات۔ — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۶/-
۱۲۔ آئینہ عقل — پروفیسر نکہت شاہجہانپوری — ۳/۵۰
۱۳۔ اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۶/۵۰
۱۴۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/۵۰
۱۵۔ انارکلی امتیاز علی تاج (جدید ایڈیشن) — ۲/۷۵
۱۶۔ امراؤ جان ادا — مرزا رسوا — ۵/۵۰
۱۷۔ اُردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۱۰/-
۱۸۔ اُردو میں تنقید — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۶/-
۱۹۔ انتخاب قصائد اُردو — مغیث الدین فریدی — ۱/۵۰
۲۰۔ ادب اور نظریہ — آل احمد سرور — ۸/-
۲۱۔ اُردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبد الشکور — ۷/-
۲۲۔ ادبی نقوش۔ — شاہ معین الدین ندوی — ۸/-
۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں — سید [illegible]
۲۴۔ انتخاب جدید نثر اُردو
۲۵۔ اقبال — مرثیہ — فروغ اُردو
۲۶۔ البرامکہ اور ان کا عروج و زوال — ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے — ۳/-
۲۷۔ انتخاب کلام غالب — بشیر احمد علوی — ۱/۵۰
۲۸۔ ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن — ۷/۵۰
۲۹۔ انتخاب قصائد و غزلیات — فروغ اُردو جدید ایڈیشن — ۶/-
۳۰۔ ادب کیا ہے — ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۳/۵۰
۳۱۔ ادبی خطوط غالب — مرزا محمد عسکری — ۷/-
۳۲۔ آئینہ نثر اُردو — سعادت علی صدیقی — ۴/۵۰
۳۳۔ ایک نادر روزنامچہ — ڈاکٹر انوار الحسن ہاشمی — ۲/۵۰
۳۴۔ انوانخمسہ — مجنوں گورکھپوری — -/۵۰
۳۵۔ اُردو کی کہانی — سید احتشام حسین — ۲/۵۰
۳۶۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر — ” — ۵/۴۵
۳۷۔ ابو الکلام آزاد (نظم) — جگناتھ آزاد — -/۲۵
۳۸۔ ارمغان نثر و نظم — عبد الاحد خاں خلیل — ۴/۷۵
۳۹۔ افسانہ نمبر — مرتبہ فروغ اُردو — ۱/۵۰
۴۰۔ اچھی نظمیں — اخگر مشتاق — -/۷۰
۴۱۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح — کامل دو جلد — جدید ایڈیشن — غلام احمد فرقت — ۲۵/-
۴۲۔ اُردو شاعری — امیر احمد علوی — ۲/-
۴۳۔ غزلیات حافظ صائب — غالب فارسی — ۳/-
۴۴۔ آخری یادگار — نادر شاہ — معہ ترجمہ — ۲/-
۴۵۔ اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب — اعجاز احمد فاروقی — ۱/۲۵
۴۶۔ اللہ کے پیارے — امیر حسن نورانی — -/۵۰
۴۷۔ اسپین کی شہزادی — صادق سرد لکھنوی — ۴/۵۰
۴۸۔ ادبی معرکہ نمبر — مرتبہ فروغ اُردو — ۱/۵۰

۴۹۔ اپنا موضوع میں — اُدارہ — ۲/۵۰

۵۰۔ انوارِ جدید خط و کتابت — خلیق احمد علوی — -/۵۰

۵۰۔ ایک جان تین قالب — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰

۵۱۔ اُلفت — " — ۵/۵۰

۵۲۔ آغازِ سحر — " — ۴/-

۵۴۔ امین آباد — " — ۴/-

۵۵۔ انشائے خطوط نویسی حصہ اوّل — مشیر احمد علوی — -/۴۰

۵۶۔ اچھی کہانیاں — شمس الدین نوری — -/۵۰

۵۷۔ انشائے خطوط نویسی حصہ دوم — -/۷۵

۵۸۔ ایجادوں کی باتیں — مصطفےٰ حسن رضوی — ۳/-

۵۹۔ اچھی کہانیاں حصہ اوّل — شمس الدین نوری — -/۵۰

۶۰۔ " " حصہ دوم — " — -/۵۵

۶۱۔ " " حصہ چہارم — " — -/۶۵

۶۲۔ ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۲/۵۰

۶۳۔ اسلامی نظمیں — محمد حسین علوی شمس — -/۴۵

۶۴۔ اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰

۶۵۔ اوراقِ گل — اصغر مشتاق — ۱/-

(ب)

۶۶۔ بابائے اُردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی — ۲/-

۶۷۔ بستانِ حرم (جدید نسخہ کلام) — زائر حرم حمید صدیقی — ۳/-

۶۸۔ شہید محبت بوٹا سنگھ — خان محبوب طرزی — ۴/-

۶۹۔ بزمِ بے تکلف — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴/۵۰

۷۰۔ بکٹ کہانی — ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۵/-

۷۱۔ بہادر شاہ ظفر — امیر احمد علوی کاکوروی — ۷/۵۰

۷۲۔ بہشتی ثمر (حصہ اوّل و دوم) خلاصہ بہشتی زیور — مولانا تھانوی — ۳/۸۰

۷۳۔ بانیٔ اسلام علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اُردو ترجمہ — -/۷۵

۷۴۔ بشریتِ انبیاء — عبدالماجد دریابادی — -/۴

(پ)

۷۵۔ پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۳/-

۷۶۔ پیاری باتیں — محسن کاکوروی — -/۴۰

۷۷۔ پھولوں کے انبار (ناول) — منظر سلیم — ۴/۷۵

۷۸۔ پیسہ اور پرچھائیں مجموعۂ ڈرامہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۶/-

۷۹۔ پاگل خانہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۳/۲۵

۸۰۔ پیغام — طاہر دریاپوری — ۳/-

۸۱۔ پنجاب میں اُردو — حافظ محمود شیرانی — ۸/-

۸۲۔ پردیس کے خطوط (حصہ اوّل) — مجنوں گورکھپوری — ۵/-

(ت)

۸۳۔ مختصر تاریخ ادبِ اُردو (فرہنگ اُردو ایڈیشن) — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۱۲/-

۸۴۔ تصویرِ درد مع تشریحات و ترجمہ — فرید احمد علوی — ۱/-

۸۵۔ تحریریں مجموعۂ مضامین — ڈاکٹر گیان چند — ۷/-

۸۶۔ تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یاسین — ۳/-

۸۷۔ تنقیدی تجزیے — کاظم علی خاں — ۵/-

۸۸۔ تعارف تاریخ اُردو ترمیم شدہ جدید ایڈیشن — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۷/-

۸۹۔ تاجدارِ مدینہ — اقبال صدیقی — -/۳۰

۹۰۔ تنقیدی اصول اور نظریہ — حامد اللہ افسر — ۷/۵۰

۹۱۔ تنقید و تحلیل — شبیہ الحسن نونہروی — ۶/۵۰

۹۲۔ تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن) — سید احتشام حسین — ۷/-

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
٩٣-	تنقیدی نظریات جلد اول	سید احتشام حسین	١٠/-
٩٤-	" " جلد دوم	"	١٠/-
٩٥-	تنقیدی اور عملی تنقید	"	٧/-
٩٦-	تنقیدی اشارے (جدید اڈیشن)	آل احمد سرور	٥/-
٩٧-	ترانہائے خیام	ڈاکٹر غیب حسین	٣/-
٩٨-	تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص	محمد حسین شمس	٣/-
٩٩-	تصویر درد معہ ترجمہ	علامہ اقبال	١/-

(ٹ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
١٠٠-	ٹیگور	نادم سیتاپوری	٣/-
١٠١-	ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاری	٢/-

(ث)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
١٠٢-	ثنائے حبیب و نعتیہ کلام	بہزاد لکھنوی	٢/٢٥

(ج)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
١٠٣-	جہان غالب	محمد حسین شمس علوی	٣/-
١٠٤-	جائزے	انور سیوانی	٣/-
١٠٥-	جواہرات اسمٰعیل	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	١/٥٠
١٠٦-	جنگ آزادی نمبر ١ (١٨٥٧ء)	فروغ اردو	٣/-
١٠٧-	" " نمبر ٢	"	٣/-
١٠٨-	جوئے رواں مجموعہ کلام	حامد اللہ افسر	٣/٥٠
١٠٩-	جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بلگرامی	٣/٥٠
١١٠-	جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ)	قیصر تمکین	٢/٥٠
١١١-	جلوے	معین الدین دردائی	٢/-
١١٢-	جمیلہ لوائری (ناول)	خان محبوب طرزی	٤/٥٠
١١٣-	جگر نمبر اول	سید احتشام حسین	٨/-

(چ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
١١٤-	چوتھی بہن مجموعہ افسانہ	مسیح الحسن رضوی	٣/-

(ح)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
١١٥-	حیات فضل الحق	خیر آبادی	١/٥٠
١١٦-	حالی بحیثیت شاعر (جدید اڈیشن معہ اضافہ)	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	٦/-
١١٧-	حسرت موہانی	عبد الشکور	٤/-
١١٨-	حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	٤/٥٠
١١٩-	حکیم نباتات	وزیر خاں لنگراں	٢/-
١٢٠-	حدیث غالب	سعادت علی صدیقی	٢/٥٠

(خ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
١٢١-	خضر راہ مع ترجمہ	علامہ اقبال	١/-
١٢٢-	خطبات ماجدی یا سیرت نبوی	عبد الماجد دریابادی	٣/٥٠
١٢٣-	خضر راہ معہ ترجمہ	علامہ اقبال	١/-
١٢٤-	خلاصہ شریف زادہ	مرزا رسوا	١/٢٥
١٢٥-	خلاصہ روح تنقید		١/-
١٢٦-	خلاصہ جواہر العروض		١/-
١٢٧-	خطوط مزاحیہ	محمد علی واحد معہ مقدمہ شوکت تھانوی	١/٥٠
١٢٨-	خوش بختی کی تلاش	احسن الظفر بلرامی	٣/-
١٢٩-	خلاصہ شعر الہند حصہ دوم		١/-
١٣٠-	خلاصہ المیزان		٢/٧٥

(د)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
١٣١-	دیوان آبرو	ڈاکٹر محمد حسن	٧/-
١٣٢-	دلچسپ کہانیاں	مسعود عالم	٣/٥٠

۱۳۳۔ دیوان نعمانی ۱/۵۰

۱۳۴۔ داستان سہراب و رستم مع مقدمہ (فارسی) عبدالاحد خاں خلیل ۳/۵۰

۱۳۵۔ دلی کا یادگار مشاعرہ — مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/۵۰

۱۳۶۔ دستۂ گل — شبلی نعمانی -/۷۰

۱۳۷۔ دوشیزہ قاف (ناول) — خان محبوب طرزی ۵/-

۱۳۸۔ دلربا " " ۳/-

۱۳۹۔ دلی کا دبستان شاعری (مع اضافہ جدید ایڈیشن)

۱۴۰۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱۲/-

۱۴۱۔ دھنک رنگیں — ذکی کاکوروی ۳/۵۰

(ڈ)

۱۴۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر نورالحسن -/۷۰

(ذ)

۱۴۳۔ ذوق و جستجو — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۶/-

۱۴۴۔ ذوق ادب و شعور — سید احتشام حسین ۶/۵۰

۱۴۵۔ ذوق و جنون، مجموعہ کلام — آل احمد سرور ۸/-

(ر)

۱۴۶۔ روایت اور بغاوت — سید احتشام حسین ۷/۵۰

۱۴۷۔ رباعیات غالب فارسی مع اردو ترجمہ — سید ابوالحسن تورانی ۲/-

۱۴۸۔ رہبر مضمون نویسی — شفاعت علی صدیقی ۳/-

۱۴۹۔ راکھی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی -/۵۰

۱۵۰۔ رخسار سحر (ناول) — اللہ کریم قدوائی ۱/۵۰

۱۵۱۔ رفتار — وحشی محمود آبادی ۳/۵۰

۱۵۲۔ رموز حکمت مع مقدمہ اردو — محمد شریف ۳/۵۰

۱۵۳۔ ریاض فارسی — منتخب کلام فارسی ۳/-

۱۵۴۔ ریختۂ ولی — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۲/-

(ز)

۱۵۵۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ) — مولانا تھانوی -/۸۰

۱۵۶۔ زینتو (کا بادشاہ) حکیم یانا مزاحیہ ناول — سید علی عباس حسینی ۳/-

(س)

۱۵۷۔ سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری ۲/۵۰

۱۵۸۔ سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی ۲/-

۱۵۹۔ سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکیم چند نیر ۸/-

۱۶۰۔ سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری ۳/۵۰

۱۶۱۔ سنگ گہر — سید احتشام حسین ۴/-

۱۶۲۔ سرسید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی ۱/۵۰

۱۶۳۔ سرمایۂ زبان اردو — جلال لکھنوی ۷/۵۰

۱۶۴۔ سفر (ناول) — مائل ملیح آبادی ۴/-

۱۶۵۔ سیاحت زمین (ناول) — محمود اعظم فہمی ۱/۵۰

۱۶۶۔ ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی ۳/۵۰

۱۶۷۔ سنہرا حلقہ -/۷۵

۱۶۸۔ سرسید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی -/۴۰

۱۶۹۔ سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی ۱/۷۵

۱۷۰۔ ساز دل — ذکی کاکوروی ۲/۵۰

(ش)

۱۷۱۔ شعور تنقیدی مجموعہ — ڈاکٹر محمد حسن ۶/۵۰

۱۷۲۔ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) — غلام احمد فرقت ۸/۵۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۷۲-	شرح سنگ گہر	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۳-	شاہ غمگین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۱۷۴-	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۱۷۵-	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۴/-
۱۷۶-	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۷-	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	۴/-
۱۷۸-	شرح دیوان غالب (مع بیاض یونیورسٹی)	نظم طباطبائی	۰/۵۰
۱۷۹-	شہری اور سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	۱/-
۱۸۰-	"	"	۱/۹۵
۱۸۱-	"	"	۱/-
۱۸۲-	"	"	۱/-
۱۸۳-	شاہانِ مادہ یعنی گجرات کی تاریخ	امیر احمد علوی	۳/۵۰
۱۸۴-	شعر العجم، حصہ اول۔ دوم، سوم، چہارم، پنجم	شبلی نعمانی	۴۴/-
۱۸۵-	شرح نثر امروز ایران	احسن الظفر بی اے	۳-
۱۸۶-	شرح امروز ایران	"	۳/۵۰
۱۸۷-	شمع و شاعر	علامہ اقبال	-/۵۰
۱۸۸-	شرح منیر نباتات وزیر خاں	نیّر مسعود	۱/۲۰
۱۸۹-	[illegible]	[illegible]	- -
۱۹۰-	شرح شعر بوستان حصہ اول	ڈاکٹر انوار الحسن	۳/-
۱۹۱-	شرح [illegible]	حکیم عبدالقوی	۲/-
۱۹۲-	شرح مفتاح العربیہ	عبدالقوی دریابادی	۱/۵۰
۱۹۳-	شرح نصاب فارسی		۵/-
۱۹۴-	شرح شعر بوستان دوم	احسن الظفر	۳/-
۱۹۵-	شرح گلہائے ادب		۳/-
۱۹۶-	شرح آئینہ نظم اُردو		۳/-
۱۹۷-	شرح نثر فارسی امروزہ		۳/-
۱۹۸-	شرح آئینہ نثر اُردو	خلیل قدوائی	۳/۵۰
۱۹۹-	شرح غنچہ و گل		۵/-
۲۰۰-	شرح شعر فارسی کلاسیک	احسن الظفر	۳/-
۲۰۱-	شرح ہماری زبان اُردو درجہ ۶، ۷، ۸ درجہ ت	خلیل قدوائی	۲/-

(ص)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۲-	سیدھا [illegible] (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۵/-
۲۰۳-	صحیفۂ محبت مہدی افادی کے خطوط	ڈاکٹر محمود الٰہی	۶/-

(ط)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۴-	طرزی نمبر (خان محبوب طرزی)	مرتبہ فروغ اُردو	۳/-
۲۰۵-	طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے	غلام الثقلین	-/۲۵
۲۰۶-	طلسم اسرار (ڈرامہ)	مرزا رسوا لکھنوی	۱/۵۰

(ع)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۷-	عذرا (ناول)	صالحہ عابد حسین	۶/-
۲۰۸	عکس اور آئینہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	سید احتشام حسین	۶/۵۰
۲۰۹-	عبدالماجد دریابادی نمبر		۹/-

(غ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۱۰-	غالب کا تنقیدی شعور	اخلاق حسین عارف	۴/-
۲۱۱-	غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۶/-
۲۱۲-	غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر	سید امیر حسن نورانی	۶/-
۲۱۳-	غالب کی تخلیقی تخیل	تمہید صفی پوری	۸/
۲۱۴-	غنچہ و گل	سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۱۵	غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	نادم سیتاپوری	۶/-
۲۱۶	سنہری دروازہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۱۷	غزلیات نظیری		۱/۵۰
۲۱۸	غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید ایڈیشن)	ذکی ککوروی	۲۵/-

(ف)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۱۹	فروق (لغت)	طاہر محسن علوی	۴/۵۰
۲۲۰	فن خطابت یعنی استاد تقریر	کتاب مصطفےٰ ایڈ کمپنی	۱۵/-
۲۲۱	فریدہ	خان محبوب طرزی	۱/-
۲۲۲	فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی	نادم سیتاپوری	۷/-
۲۲۳	فلسفۂ اقبال	عبدالقوی دریابادی	۴/۵۰
۲۲۴	فلسفی ابن رشد	مائل ملیح آبادی	۳/۵۰
۲۲۵	فروغ جام مجموعہ کلام	نشور واحدی	۴/-
۲۲۶	فغان محسن	محسن کاکوروی	۴/-
۲۲۷	فارسی آموز	منیر احمد علوی	۱/-
۲۲۸	فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن)	پروفیسر کلیم الدین احمد	۷/-

(ق)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۲۹	قدمچے، جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں	غلام احمد فرقت	۶/-
۲۳۰	قصائد ظہیر فاریابی		۲/-
۲۳۱	قصائد مومن۔ مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	۶/۵۰
۲۳۲	قطرے سے گہر ہونے تک	صالحہ عابد حسین	۷/-
۲۳۳	قصص و مسائل	عبدالماجد دریابادی	۳/-
۲۳۴	قصائد قاآنی (فارسی)		۱/-
۲۳۵	قومی ادب نثر و نظم	حامد اللہ افسر	۴/۷۰
۲۳۶	قیامت صغریٰ (سائنس ناول)	خان محبوب طرزی	۳/-

(ک)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۳۷	کلیات اقبال	علامہ اقبال	۸/-
۲۳۸	کیسہ اور کاہی	بدرالدین علیم جی	۳/-
۲۳۹	کفِ مدروش (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۶/۵۰

(گ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۴۰	گاندھی نمبر		۲/-
۲۴۱	گلدستۂ فارسی اول و دوم	محمد غوث بیگ سیفی	۲/۲۵
۲۴۲	گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدید		-/۷۰
۲۴۳	گلہائے ادب	عبدالاحد خان خلیل	۳/-
۲۴۴	گاندھی جی کے ساتھ	حامد اللہ افسر	۱/۵۰

(ل)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۴۵	لوائح جامی مع مقدمہ	عبدالاحد خان خلیل	۱/۵۰
۲۴۶	لال قلعہ	مائل ملیح آبادی	۶/-
۲۴۷	لب بام	عادل رشید	۶/-
۲۴۸	لسانیات اور اردو	سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰

(م)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۴۹	مرقع اقبال	عصمت فاطمہ علویہ	۱۲/-
۲۵۰	مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو	غلام احمد فرقت	۸/۵۰
۲۵۱	محسن کاکوروی نمبر		۳/۵۰
۲۵۲	مسلمان اور کانگریس	ابوالکلام آزاد	۳/۵۰
۲۵۳	مرثیہ نگاری اور میر انیس	ڈاکٹر احسن فاروقی	۵/-
۲۵۴	مضامین فرحت حصہ اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	۵/-
۲۵۵	〃 〃 حصہ دوم	〃 〃	۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۵۶-	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر طہری	۳/-
۲۵۷-	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۲۵۸-	موسم گل (ناول)	عادل رشید	۲/-
۲۵۹-	مجبور	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۲۶۰-	مضامین جدید	محمد ہادی	۱/۷۵
۲۶۱-	مثنوی سحر ہلال فارسی	مع مقدمہ قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۲۶۲-	مطالعہ	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۶۳-	مولوی نذیر احمد کی کہانیاں	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۲۶۴-	معرکہ روم دیونان	صادق سردھنوی	۴/-
۲۶۵-	مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۲۶۶-	مطالعہ ماذ		۴/-
۲۶۷-	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
۲۶۸-	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/۵
۲۶۹-	مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۷۰-	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصابی، اے حالی	۲/۵
۲۷۱-	مرثیہ غالب	حالی	-/۲۵
۲۷۲-	محبوبہ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۷۳-	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۷۴-	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	-/۴۰
۲۷۵-	انتخاب فسانہ آزاد یعنی	سرشار لکھنوی	
۲۷۶-	مہاراج بلی	ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۲۷۷-	مسز ملاکی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	-/۷۵
۲۷۸-	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۲۷۹-	مصباح بلاغت مع مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۲۸۰-	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۲۸۱-	مقدمات و مقالات	عبدالاحد خان خلیل	۵/۵۰
۲۸۲-	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۴/-
۲۸۳-	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۸۴-	نثر امروز ایران	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۲۸۵-	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۶/-
۲۸۶-	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۲۸۷-	نقش حالی و دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
۲۸۸-		شجاعت علی سندیلوی	۳۰/-
۲۸۹-	نغمہ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۹۰-	نغمات الہند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۳/-
۲۹۱-	نظم سائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۰/-
۲۹۲-	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۲۹۳-	نسرین و نسترن	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۹۴-	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۲۹۵-	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۷۵
۲۹۶-	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبدالماجد دریابادی	
	نوائے سرور جہاں آبادی	ڈاکٹر حکم چند نیر	۷/۵۰
۲۹۷-	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۹۸-	نور و نار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۹۹-	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدید	آل احمد سرور	۱۰/-
۳۰۰-	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۶/۵۰
۳۰۱-	نیلم	انتصار حسین	۳/-
۳۰۲-	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۰۴	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	[illegible]
۳۰۵	منشی نولکشور نمبر		۲/۵۰
	(و)		
۳۰۶	وعدہ فردا	اخگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-
	(ہ)		
۳۰۷	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۵/-
۳۰۸	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۱/۲۵
۳۰۹	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۱۰	[illegible]	[illegible]	۱/۹۰
۳۱۱	[illegible]		۱/۵۰
۳۱۲	بہارستان حصہ ۱	[illegible]	-/۸۰
۳۱۳	" حصہ ۲	"	-/۹۵
۳۱۴	" حصہ ۳	"	۱/-
۳۱۵	" حصہ ۴	"	۱/-
۳۱۶	یادگار غالب	مولانا حالی	۴/-
۳۱۷	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳۱۸	یادگار انیس		
		امیر احمد علوی	۴/-

ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اُردو نمبر ۳۷ (امین آباد پارک لکھنؤ)

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کیساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی، ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

جلد (۲۴) شمارہ (۷)
ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان
رجسٹرڈ نمبر ایل، ڈبلیو/این، پی ۹۰
بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)
فون دفتر: ۲۶۱۳۵
فون رہائش گاہ ۲۶۶۵۲

فروغ اردو لکھنؤ

ایڈیٹر:
محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

مجلس ادارت:
۱۔ عبدالقوی دریابادی بی۔ اے
۲۔ سعادت علی صدیقی

جلد (۲۴) نومبر ۱۹۷۶ء شمارہ (۷)

ترتیب

رسالہ اعزازی
عوام سے: دس روپیہ / آٹھ روپیہ
فی پرچہ: ۷۰ پیسے
پتہ:
ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

انصار حسین نے سرفراز قومی پریس ناداں محل روڈ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

اپنی باتیں

اُردو زبان کے مسئلہ کو بعض لوگ کچھ اور ہی نظریہ سے دیکھتے ہیں وہ یہ کہ اُردو دوستوں کو اُردو کی بقا کے لئے کسی قسم کی جارحانہ کارروائی یا ستیہ گرہ کرنا چاہیئے اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے وہ ہماری اس رائے سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں کہ ہم کو اس بات کی جدوجہد کرنا چاہیئے کہ اسکولوں میں لاکھوں ایسے بچے کہ جن کی مادری زبان اُردو ہو اور جو اُردو ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں داخل کرائیں اسی طرح ہزاروں بیسک اسکولوں میں اُردو کو رائج کرائیں اور نہ ہماری اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ جدوجہد کا ایک بہت کامیاب طریقہ یہ بھی ہوگا کہ جابجا شبینہ مدارس قائم کر کے لوگوں کو اُردو خواں بنایا جائے اور اَن پڑھ بالغوں کی جو بہت بڑی جائداد بے کار پڑی ہوئی ہے اس پر قبضہ کر لیا جائے اس سے اُردو بہت دولت مند ہو جائے گی ان لوگوں کے نزدیک یہ سب کمزوری کی باتیں ہیں ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا افسوس ہے کہ اس قسم کی رائے رکھنے والوں نے نہ تو اُردو کے مسائل پر غور کیا ہے نہ حالات پر نہ اس پر کہ ستیہ گرہ ہے کیا چیز انھوں نے تو صرف جوش کی بنیاد پر یہ طے کر لیا ہے کہ ستیہ گرہ ہو ہر لوگ جیل جائیں اور یہ کہ ایسا کرنے پر ہی طاقت کا اظہار ہوگا اور حکومت مجبور ہو جائے گی جھکنے پر آج کل کا دور اس کا متقاضی نہیں کہ حکومت کو مجبور کرنے کے لئے یہ وسائل اختیار کئے جائیں بلکہ ہم یکجہتی اور اپنی اجتماعی قوت کو مستحکم کر کے یکجا ایک محاذ بناکر اراکین حکومت کو

مجبور کریں کہ وہ اُردو زبان کو جو مشترکہ ہندو اور مسلمانوں کی جدو جہد سے عالم وجود میں آئی تھی اس کی بقاء کی خاطر وہ تدابیر اختیار کریں کہ جس سے حکومت خود ہی مجبور ہو کر ہمارے حقوق کی بحالی کی باتیں کرنے لگے اور یہ بات یقینی ہے کہ ہماری مسلسل بچپیس سالہ جدو جہد اور آئینی حقوق کے اندر رہتے ہوئے کدو کاوش کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارے ملک میں اُردو زبان کی مقبولیت بڑھتی جارہی ہے اور اراکین محسوس کرنے لگے ہیں کہ اُردو زبان مشترکہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اور اس کے حقوق کی بحالی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ اس مرحلہ پر ہمکو خصوصی توجہ کے ساتھ یہ لائحہ عمل بنانا چاہیئے کہ جو نقائص اُردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کے حقوق و فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں اراکین حکومت کیجانب سے حکومت کے کارندے دانستہ طور پر انجام دیتے رہتے ہیں اس کے دفاع کیلئے جدو جہد کرتے رہیں جیسے کہ ہماری اُتر پردیش حکومت اُردو گزٹ کے نام سے رسمی طور پر شائع کرتی ہے۔ اسکو اُردو گزٹ کا نام دیا جاتا ہے وہ مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ باعث شرم ہے کہ اُردو گزٹ کا نام دیکر اُردو زبان کو رسوا کیا جائے ارباب حل و عقد کا فرض ہے کہ وہ اُردو گزٹ کو دیکھیں کیا اس کی زبان اُردو زبان کہلانے کی مستحق ہے صرف (اُردو گزٹ کا نام) اسکی پاسداری نہیں کرتا بلکہ حقیقی معنوں میں اس گزٹ کے ذریعہ اُردو زبان کے حقوق کی بحالی ہے بلکہ اس اُردو گزٹ کے نام سے اُردو زبان کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے اس لئے ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ یا تو نامی اُردو گزٹ کو بند کر دیا جائے یا پھر حقیقی معنوں میں اُردو گزٹ کو گیسوئے اُردو سے سنوارا جائے تاکہ محبانِ اُردو کی صحیح ترجمانی ہوسکے اُمید ہے کہ وزیر تعلیم حکومت یو پی اس خصوصی معروضات کیجانب خصوصی توجہ دے کر محبان اُردو کی دلی تمناؤں کی تکمیل کر کے سُرخروئی کا موقع دیں گے۔

ضبط خوئی سے رہے ہم خوش و خرم کتنے
ہاں مگر ایسی اداؤں کے ہیں محرم کتنے

روئے گل فصل بہارانی میں ہیں پُرنم کتنے
عید لے آئی ہے ہمراہ محرم کتنے

اُن سے سب شکوہ یہ لب ہی سہی تاہم کتنے
ان کی دل جوئی کے ہیں ڈھنگ بھی پیہم کتنے

یادِ عشرت میں ہے دیدۂ پُرنم کتنے
ہم کو کرنے پڑے خوشیوں کے بھی ماتم کتنے

آدمی کو مہر و انجم پہ لئے پھرتی ہے
ایک نازک سی ہوا۔ اُس کے ہیں دم خم کتنے

تیغ احباب کی یادیں، نہ مٹانے سے مٹیں
میرے زخموں پہ رکھے وقت نے مرہم کتنے

پاسِ آئینۂ تقدیر سکندر تو نہیں
ہم قلندر ہی سہی، ہیں خوش و خرم کتنے

سختیوں پر کبھی لے کے رہے نام ترا
کبھی ہم نام سے تیرے ہوئے برہم کتنے

آ رہے ہیں وہ یہاں میرے سیہ خانے میں
اب جلاتے ہیں دیئے، دیدۂ پُرنم کتنے

رُخ پہ غصہ بھی عیاں، چشمِ توجہ بھی نہاں
تولتے ہیں وہ نگاہوں میں کہ ہیں ہم کتنے

وہ نگاہ غلط انداز، اچٹتی سی نظر
گزرے ہم پر اُسی اک لمحے میں عالم کتنے

غم کے طوفانِ نہاں تک نہ نگاہیں پہنچیں
دھارے دریائے محبت کے تھے مدھم کتنے

ہنس کے کھاتے ہیں مگر اُف رے یہ دنیا کے فریب
پرورش نام سے خوشیوں کے کئے غم کتنے

پھول کھل کر بھی رہا جوشِ خود آرائی سے
برق و بارانی تھے تباہی پہ منظم کتنے

رہا مفتوں مری نظروں میں بس اپنا ہی علم
رہنماؤں نے دکھائے مجھے پرچم کتنے

علامہ اقبال اور مولانا ظفر علیخاں

مناظر عاشق ہرگانوی
ہرگانواں، بربگہہ، مونگیر (بہار)

مولانا ظفر علی خاں اُردو ادب کے مشاہیر میں سے ہیں۔ اُنھیں بابائے صحافت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کے ہم عصروں اور ان کے خاص دوستوں میں مولانا ظفر علی خاں کا بھی شمار ہوتا تھا۔

اقبال سے ان کی ملاقات اس زمانے میں ہوئی، جب اقبال انارکلی والے مکان میں رہا کرتے تھے۔ اس سے پہلے جب ظفر علی خاں حیدرآباد میں تھے تو "مخزن" میں اقبال کی نظمیں دیکھ کر اُنھوں نے ایک خط لکھا جس میں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو خراج تحسین ادا کیا گیا تھا۔ اقبال نے بھی اس خط کا جواب دوستانہ پیرائے میں دیا۔ اور یوں ان دونوں کے درمیان "قلمی دوستی" قائم ہوگئی۔

جب ظفر علی خاں لاہور آئے تو انارکلی والے مکان میں اقبال سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ان دنوں وہ جوان تھے، شباب ان کے چہرے سے پھوٹ پھوٹ پڑتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف ہوگئے۔ اس کے بعد دونوں میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں میں اس دور کے حالات، شاعری فلسفے اور طرح طرح کے مسائل پر گھنٹوں گفتگو ہوتی۔

اور یہ حقیقت ہے کہ اقبال شاعر سے زیادہ ایک عظیم المرتبت فلسفی تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ ملت اسلامیہ کی حیات نو کے پیغامبر تھے۔

حیدرآباد کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر جب ظفر علی خاں نے لاہور سے "زمیندار" نکالا تو اقبال نے اس میں پوری پوری دلچسپی لی۔ اکثر وہ "زمیندار" کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھ دیتے جو اس کے صفحۂ اول پر شائع ہوتی تھی۔

بہ حیثیت شاعر اقبال کی شاعری کے تین ادوار ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جب وہ ایک سچے وطن پرست تھے اور اسی دور میں اُنھوں نے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" جیسی نظمیں لکھیں۔ دوسرا دور وہ ہے جب وہ انگلستان گئے اور وہاں ان پر "پان اسلام ازم" کی تحریک کا رنگ چڑھا۔ اور تیسرا دور وہ ہے

جب وہ مستقل طور پر اسلامی فلسفۂ حیات کی طرف مائل
ہو گئے اور آخر دم تک اسی طرف متوجہ رہے۔ یہی وجہ
ہے کہ ان کی شاعری اور پیغام نے ملت اسلامیہ کا دل
ہلا دیا اور وہ اس خواب گراں سے چونک پڑی جس نے
اس کے جسم پر کیفیتِ مرگ طاری کر رکھی تھی۔

لیکن اقبال کے مزاج میں ظریفانہ رنگ بھی بہت
تھا۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں وہ خوب کھل کھیلتے
تھے اور ایک ہی نشست میں کئی کئی لطیفے کہہ ڈالتے
تھے۔ مزاحیہ اشعار بھی کہتے تھے۔ ان کا یہ مصرعہ زبان
زد عوام ہو چکا

الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک آیا

مولانا ظفر علی خاں، اقبال کے ایسے بے تکلف
دوستوں میں تھے کہ کبھی کبھی اقبال ایک دو مصرعے
کہہ دیتے اور ظفر علی خاں سے کہتے کہ وہ باقی نظم مکمل
کریں۔ اسی طرح ایک مرتبہ ان دونوں نے ایک
مشترکہ نظم کہی جس میں آدھے شعر اقبال کے اور آدھے
ظفر علی خاں کے تھے۔ یہ واقعہ جولائی ۱۹۱۱ء کا ہے۔
نظم کا موضوع اس دور کے غدار اور ضمیر فروش تھے۔
پوری نظم یہ تھی

ہمارے شاہ کا ہمسر نہ دارا ہے نہ خسرو ہے
کہ اس کی ذات پر نازاں لباسِ کہنہ و نو ہے
اگر اس کی سلامی کے لیے نواب جھکتے ہیں
تو راجاؤں نے بھی چھدوائی اپنے کان کی لو ہے
نئی مسلک کئے ہیں لازمی تعلیم نے پیدا
احمد شاہ کا کوئی لچھو کوئی گنا کا پیرو ہے
عجب ہے کھیل قسمت کا کہ جیسی الیکشن کی
بچھائی شیخ بیچارے نے لالہ اویری لو ہے
نہیں ہے بہر اظہار وفا لازم نمود اصلا
نہ بحر شعر میں پانی نہیں مطلق مگر شو ہے

اقبال بطور دوست ایک مثالی آدمی تھے۔ کئی دفعہ
ایسا ہوا کہ "زمیندار" میں ظفر علی خاں نے...
شعر کی زبان میں اقبال پر کچھ لطیف چوٹیں کیں، مگر
اقبال نے کبھی برا نہ مانا۔ بلکہ الٹا ظفر علی خاں کی
نظموں کی تعریف کی۔ یہی "لطیف چوٹیں" تھیں جن کا
مطلب لوگوں نے یہ نکالا تھا کہ اقبال اور ظفر علی خاں
ایک دوسرے سے کبیدہ خاطر ہو گئے ہیں۔ حالانکہ ایسا
کبھی نہیں ہوا۔ اقبال کا ظرف بہت بلند تھا۔ اور رنجیدہ
ہونے کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ ظفر علی خاں نے جو
کچھ لکھا وہ ایک مخلص دوست کا شکوہ تھا۔

حصول جاہ و ثروت جس وفاداری کا مقصد ہو
وہ جنس ناروا گندم نہیں، گندم نما جو ہے
ملے گی تشنۂ عزت کو کب اعزاز کی قلفی
مہینہ جون کا ہے اور یہ سرگرم تگ و دو ہے
مبارک ہے یہ جشن تاجپوشی جس کے صدقے میں
وہ مسجد تک چلا آیا کلب گھر کا جو رہرو ہے
مسلمانوں کی جمعیت اگر کم ہے تو کیا پروا
عدد سو کے چھیاسٹھ ہوں مگر مفہوم تو سو ہے
نہیں ہوتے ہیں لیڈران میں پیدا قابلیت سے
مسلمانوں میں یہ مخلوق مثل سبزۂ خودرو ہے
خوشامد نے جلا ڈالا ہے خودداری کے خرمن کو
ذرا سی شمع ہے کم بخت اور کتنی بڑی لو ہے
وزارت کچھ نہ کچھ دنیا میں ہے عصمت فروشوں کی
یہ روحانی قدمچہ ہے یہ اخلاقی بدر رو ہے

پرانی روشنی میں دیکھ لو ہے بچگی کیسی
کہ پہلے دن سے مہر و ماہ میں قائم وہی ضو ہے

مسلمانوں کے حالات کی کتنی صحیح عکاسی اس نظم میں ہے۔ اقبال ایسی ہی قوم کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ اقبال کی موت پر ظفر علی خاں کے یہ اشعار دیکھیے۔

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پہ ہے قیامت کا گزرنا
کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صف ماتم
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا
تھا اس کے تخیل کا فسوں جس نے سکھایا
سو سال کے سوئے ہوئے جذبوں کو ابھرنا
ہر روز دیا اس نے مسلماں کو یہ درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا
ملت کو نئی زندگی اقبال نے بخشی
ممکن نہیں اس بات کا اقرار نہ کرنا

اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ اقبال ہی تھے جن کی گرمی گفتار نے جوانان اسلام کے سینوں میں آرزو اور سوز و ساز کی مشعلیں روشن کیں اور انھیں اپنی منزل سے آشنا کیا۔ اقبال نے ایک بار یہ آرزو کی تھی۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

افسانہ

صبح کی نرم و نازک کرن کھڑکی سے چھن کر خواب گاہ کے پلنگ پر مچلنے لگی نجمہ کسمسا کر اُٹھی جوڑے ٹھیک کئے اور مرجھایا ہوا گجرا پلنگ کی دوسری طرف رکھدیا پھگنا ہٹ بڑی ڈھٹائی سے لپٹیں چھوڑ رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے شوہر کے پیٹ میں گدگدی کرنے لگی جو محبت کا ایک پیکر تھا۔ اُس نے اُ ہنہ کرکے دوسری کروٹ لے لی نجمہ کو ایک شرارت سوجھی مُرغی کے ایک پر سے اُسے چھیڑنے لگی اُس نے اپنی بانہیں نجمہ کی باہوں میں ڈال دیں اُسے سینے سے چمٹا لیا۔ نجمہ کسمسا کر اُس کی باہوں سے نکل آئی۔ پھر اس کے شوہر نے ایک انگڑائی لی اور چادر اوڑھ کے سوگیا نجمہ گنگناتی ہوئی آٹا نکال کر کٹھوتی میں گوندنے لگی آج وہ بے حد خوش تھی اُس کا شوھر اُسے اپنے گاؤں سے آٹھ میل دور پاداپوری لے جانیوالا تھا۔ جہاں مہاویر جین کا مندر تھا۔ اُس مندر کے احاطے میں رنگا رنگ پھول کھل رہے تھے نجمہ گھر کی چہار دیواری میں گھٹ رہی تھی۔ آج وہ پھولوں سے کھیلے گی رُوح پرور ہواؤں سے لُطف اندوز ہوگی۔ اکثر وہ دو چار ماہ میں یہیں آکر لمبی لمبی سانسیں لیتی ہے۔ اُسی وقت اُس کی چہیتی سہیلی ریحانہ گوبر کے سوکھے اُپلوں کے ساتھ آئی بے چاری لڑکیاں تنگ و تاریک گلیاں پھلانگتی آگ لانے قریب کے گھروں میں آتی جاتی ہیں اپنے دُکھ سکھ آپس میں بانٹتی ہیں دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہیں آگ تو ایک بہانہ ہے۔ ریحانہ نے نجمہ کو چھیڑتے ہوئے کہا "آج صبح ہی صبح من میں لڈو کیوں پھوٹ رہے ہیں کیا رات بھر تیرا خصم تجھے لڈو تو نہیں کھلاتا رہا بڑی خوش نظر آرہی ہو میری لاڈو ——— !

"چُپ بے شرم! لڈو کیا چیز ہے میں تو کہوں گی میری طرح ہر سہیلی کو خصم ملے جس کے آنگن میں قدم رکھتے ہی غبارہ بن کر اُڑ جانے کو جی چاہتا ہے۔" نجمہ نے اپنی سہیلی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

ریحانہ اُداس ہوگئی اُس کی آنکھیں بجھی ہوئی لالٹین کی مانند ویران سی ہوگئیں وہ بے چارے بھی تو اپنے دل میں ان گنت خواب ہمیشہ بنتی رہی تھی ایک

وبصورت سے گھونسلہ بنانے کے سپنے دیکھے تھے لیکن
ہ خواب تلخیوں کا مدفن ہو گئے۔ اُس کا شوہر ایک
ھیڑ عمر کا زمیندار تھا جس کی آنکھیں ہر وقت خمار آلود
ہتی تھیں وہ تاڑی کے نشے میں ہر وقت دُھت رہتا
ہ پیار اور تڑپ سے بھی واقف نہیں تھا۔ نجمہ نے
ی سہیلی سے کہا "پگلی! اُداس ہونے کی کیا بات
ہے۔ یہ زندگی بھر رات ہی رات تھوڑے ہی رہیگی
بھی تو وہ صبح آئے گی جس کا جس کا خواب تم نے
ی کنواری زندگی میں دیکھا تھا دیکھنا تیرا یہی شوہر
پنے کئے پر ایک دن پچھتائے گا معافی مانگے گا اور
جھ سے پیار بھی کرے گا بس تو اُس کا دل جیتنے میں
امیاب ہو جا۔"

ریحانہ کی پلکیں جھکی تھیں اور آنسوؤں کے چند
ھلملاتے قطرے شبنم کی مانند پلکوں کی چوکھٹ پر
رجم سے گئے تھے اُن میں چمک تھی لیکن زندگی نہیں
ی دھڑکن نہیں تھی کوئی خواب نہ تھا کوئی تعبیر نہیں تھی
۔ ریحانہ اُپلے میں آگ رکھ رہی تھیں اور آنسو
پ ٹپ آگ میں گر رہے تھے پھر وہ چلی گئی۔

نجمہ سوچ رہی تھی۔ کیا ماں باپ بھی قصائی ہو
سکتے ہیں پھر جان بوجھ کر اپنی زندگی بھر کی پالی ہوئی
یاری سی گڑیا کی زندگی سے کھلواڑ کیوں کرتے ہیں
یا دولت خوشیوں سے زیادہ حسین ہے۔ زیادہ
ششش ہے۔ یہ کل ہی کی تو بات ہے عارف
یری ساری دولت مجھ سے چھیننے آئے تھے وہ خود
ین لئے گئے آج وہ میرے لیے سب سے بڑی دولت
یا اُس رات سردی جسم میں برچھیوں کی مانند چبھ
ہی تھی میں　نانی بخار سے کانپ رہی تھی دو کمرے
تھے ایک کمرہ میں ہم بچے سو رہے تھے دوسرا کمرہ مقفل
تھا بھیا اور بھابھی (آج کل) میکے گئی تھیں نانی
اُسارے میں کمبل اوڑھے پڑی تھیں بار بار مجھے ان
کے لئے جوشاندہ بنا کر لے جانا پڑتا تھا بارہ بج
چکے تھے رات کے لحاف میں سارا گاؤں منہ چھپا کر
خراٹے لے رہا تھا۔ میرا گھر گاؤں سے بالکل کٹا ہوا
تھا اُتر ٹولے میں ایک پوکھرا تھا اور لمبے لمبے بانس
کے پیڑ تھے جب بھی ہوا تیز چلتی دل دھڑکنے لگتا۔
میں کمرے کا دروازہ بند کئے بغیر بھابھی سے چُرائی
ہوئی ایک کتاب "شوہر اور بیوی" پڑھنے میں نہمک
تھی اچانک نانی چلّانے لگیں "دروازہ بند کر دیوار
الانگ کر چور اندر گھس آیا ہے۔" میں دروازہ بند کرنے
کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ وہ میرے کمرے کے اندر
چلا آیا اُس نے چلا کر کہا "الماری کی چابی دو ورنہ
داغ دوں گا۔" میں نے کانپتے ہاتھوں لالٹین تیز
کر دی اُس کی صورت دیکھتے ہی میں ہکا بکا رہ گئی۔
مجھے دیکھتے ہی وہ بھی ہکا بکا رہ گیا وہ بیحد پرکشش
نوجوان تھا جسے دیکھتے ہی گاؤں کی کوئی بھی کنواری اپنا
ہوش کھو بیٹھتی اُس کے ہاتھ میں ایک پستول تھی اور
دوسرے ہاتھ میں اٹیچی کیس۔ اُس کے ساتھ دو تین
اور بھی نوجوان کھڑے تھے۔ میں نے ہمت کر کے کہا
لو یہ چابی اور نکال لو تمام زیورات ان زیورات
میں بے سہارا بیوہ کی روح اور ہم یتیموں کا دل بھی
ہے سب چرا کر لے جاؤ اتنے صحت مند اور خوبصورت
ہو کے تمہیں دیکھنے کے بعد چور کہتے ہوئے زبان لڑکھڑا
گی۔" وہ تھوڑی دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا
رہا پھر چابی اُچھال کر پھینک دی۔ پستول اٹیچی کیس

میں رکھ کر تیزی سے چل پڑا۔ نانی جان کو بھی بڑی
حیرت ہوئی ہم لوگوں نے رات آنکھوں میں کاٹ
دی۔

ایک جھلستی دوپہر آنگن میں امرود کے پیڑ کے
نیچے میں سوپ میں چاول پھٹک رہی تھی بھابھی بیمار
تھیں اُس دن بھیا کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان بھی
تھا میں اُسے دیکھ کر بھونچکا رہ گئی میرے بھیا نے کہا
"ارے بھئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو یہ میرا
پرانا دوست عارف ہے آج ہی ملا ہے برسوں کے
بعد بچھڑ گیا تھا۔ میں کنوئیں سے نہا کر آتا ہوں، تو
جلدی سے ایک پیالی چائے بنا کر اسے پلا دے اور
ہاں چاول آج زیادہ پکانا ہم لوگ اکٹھے کھانا کھائیں
گے اکٹھے بکھیر جائیں گے۔" میں باورچی خانے میں
گئی اور جھٹ ایک پیالی چائے بنا کر لے آئی اور
میز پر رکھ کر جانے لگی اُس نے بڑے دھیمے لہجے میں
کہا "سنئے آپ جا کیوں رہی ہیں اُس رات میرا
ضمیر بڑا کوستا رہا اور میں نے چوری نہ کرنے کی قسم
کھائی میرے اپنے بچپن میں مجھے دکھ درد کی موجوں
میں چھوڑ کر چلے گئے میں اُن موجوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔
اپنے آپ سے زندگی سے سماج سے اور اخلاق سے
بیگانہ ہو گیا بُرے دوستوں کی صحبت میں رہ کر چور
اُچکا اور دورِ جدید کی جتنی دین ہے سب کچھ بن گیا۔
کئی بار آپ سے ملنے کی تمنائیں انگڑائیاں لیتی رہیں
اور انھیں بہلا پھسلا کر سلاتا رہا آج قدرت نے دو
کناروں کو قریب کر ہی دیا۔" چائے پیجئے نا۔!
ٹھنڈی ہو جائے گی۔" میں نے انگلی سے پیالی کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر ہم تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہے میں
نے سکوت توڑتے ہوئے کہا "دیکھئے آپ پڑھے لکھے
نوجوان ہیں میٹرک تو ضرور ہوں گے بھیا کے آفس میں
کلرکی کر لیجئے اُن سے منیجر کی خوب بنتی ہے۔"

بھیا کندھے پر تولیہ لئے اور ہاتھ میں بالٹی تھامے
کنوئیں سے نہا کر آچکے تھے یہ تو میں نہیں جانتی کہ اُس
کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ تھی یا نہیں لیکن مجھے
کچھ موہ سا ضرور ہو گیا تھا اور میں اُسے اپنے سے
الگ نہیں سمجھنے لگی تھی پھر وہ اکثر ہمارے گھر آنے لگا
اور جب کبھی بھی موقع ملتا وہ آہستہ سے پوچھ ہی لیتا،
"کیسی ہیں آپ۔؟" "اچھی ہوں" میرا جواب ہوتا اور
میری نگاہیں جھک جاتیں۔

ایک دن میں خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی
جب اُسے آفس میں کلرک کی نوکری مل گئی تھی اُس
روز وہ "مٹھائی" کا ایک خوبصورت سا پیکٹ لے کر
آیا دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا کلیجہ دھک دھک
کر رہا تھا۔ دروازہ کھولا وہ سامنے کھڑا تھا دونوں
ایک دوسرے کو تھوڑی دیر تک دیکھتے رہے پھر اُس
نے کہا "مجھے نوکری مل گئی ہے لیجئے منہ میٹھا کیجئے۔"
میں نے کہا "بیٹھئے نا! آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی
ہوں" چائے لے کر آئی تو اُس نے پاس ہی بٹھا لیا،
اور بہت ڈرتے ڈرتے کہا "میں ایک بات کہنے کیلئے
وقت کا انتظار کر رہا تھا اب وہ وقت آگیا ہے اور میں
اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا ہوں کیا آپ زندگی بھر میرا
ساتھ دیں گی۔" میں نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور چپ
چاپ اٹھ کر جانے لگی اُس نے ہاتھ پکڑ لیا "جواب تو
دیتی جائیے" میں نے کہا "بھیا سے بات کر لیجئے نا!"

پھر ایک دن بھیّا نے مجھے اپنے پاس بٹھایا، اور کہا: "میری نظر میں عارف ایک شریف لڑکا ہے میں تیرا اُس کے ساتھ رشتہ کرنا چاہتا ہوں کیا وہ تجھے پسند ہے؟" میں بغیر جواب دیئے جانے لگی۔ مُسکراہٹ میرے ہونٹوں پر مچل رہی تھی۔ بھیّا نے بھانپتے ہوئے کہا "تبھی وہ سالا عارف کا بچّہ کہہ رہا تھا نجمہ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ہمارے تمہارے گھر کی لڑکیاں بے چاری کیا جواب دیں گی؟ اب بات سمجھ میں آئی کہ اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی تھی۔"

وہ نہا کر بھی آچکا تھا اُس نے بالٹی کنارے رکھ دی آتا گوندھتی ہوئی نجمہ کی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا: "بتاؤ میں کون ہوں ---؟"

"چور کہیں کے"! نجمہ کی زبان سے بیساختہ نکلا۔

"خیامِ اُردو عزیز عظیم آبادی"

نشاط احمد صدیقی

صوبۂ بہار زمانہ قدیم ہی سے علم وادب کا مرکز رہا ہے۔ اس مردم خیز ریاست نے اپنی سرزمین سے بے شمار اہلِ قلم اور فنکار پیدا کیے ہیں۔ جنھوں نے اُردو زبان کی آرائش و نشو و نما میں انتہائی جد و جہد کا ثبوت دیا ہے۔ اور اپنی کاوشوں اور جانفشانیوں سے سرزمینِ بہار کو گلزارِ ارم بنا دیا۔

دبستانِ بہار کے متعلق ادبی جانبدار طبقوں میں بہت سی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں خاص کر دبستانِ لکھنؤ اس سے ہمیشہ بدظن رہا ہے۔ یہ ایک عام بات ہے کہ کسی محدود جغرافیائی اور تاریخی دائرے میں پرورش و پرداخت کے سبب فطری طور پر ذہن و مزاج کی ایک مخصوص قماش بن جاتی ہے اور مقامیت کا احساس اپنے آپ کو بڑا کہنے پر مجبور کر دیتا ہے تاہم علمی و ادبی حلقوں میں یہ بات خود ستائی پر محمول کی جاتی ہے اگر صوبہ بہار علم و ادب کے لحاظ سے دبستانِ لکھنؤ اور دلی سے آگے نہ بڑھ سکا تو یہ ان سے کسی قدر پیچھے بھی نہ رہا۔ خاص کر یہاں ہر دور میں اُردو شاعری کا بازار گرم رہا اور ہر عہد میں ماہرِ فن اور اساتذہ پیدا ہوتے رہے۔ پرانے شعراء کرام میں مرزا عبدالقادر بیدل کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ اس کے بعد ملا محمد علم تحقیق، اشرف خاں فغاں، سید محمد شاکر ناجی، خواجہ امین الدین امین، جبار علی ..، محمد روشن جوشش، ہیبت علی خاں حسرت شیخ محمد .. بردا، میر غلام حسین شورش، مرزا مظہر علی جذب شیخ غلام یحییٰ منصور، محمد تسلیم اور شیخ غلام علی راسخ ایسے ماہرینِ فن اور اہلِ کمال گزرے ہیں جو فنِ شاعری کے موسسِ اعلیٰ، ولی دکنی، شاہ حاتم سودا، مرزا جانِ جاناں مظہر، خواجہ میر درد وغیرہ کے ہم عصر تھے، جناب تحقیق اور حضرت ناجی۔ ولی دکنی کے ہم عصر اور .. میر کے ہم عصر تھے، جوشش، میر درد کے پیرو تھے اور حسرت کو مرزا مظہر سے تلمذ حاصل تھا۔ اپنے عہد میں حضرت شاہ .. پھلواری حضرت شاہ مزد علیہ الرحمۃ طبقہ مشائخ و اہلِ سلوک میں ایسے فارسی گو گزرے ہیں جن کی مثال اس وقت تک صوبہ بہار کیا دوسرے صوبوں میں بھی نہیں مل سکتی، مرزا احمد فشاد میر ذبیح، ملا احمد، خواجہ پیارے لعل الفتی، سید شاہ

الفت حسین فریاد بھی اسی بہار کی زمین میں پیدا ہوئے جن کی بدولت دیار سخن کی اجڑی ہوئی اور ویران بستیاں آباد ہوئیں، شیخ غلام علی راسخ کے بعد شاہ اُلفت حسین فریاد عظیم آبادی اساتذۂ پٹنہ میں باکمال اور پرانے تہذیب و تمدن کے باوضع شخص تھے اور شاد عظیم آبادی ان کے عزیز ترین شاگرد رشید تھے، شاد عظیم آبادی بہار کے ایک ایسے نمائندہ شاعر گذرے ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں بڑے ہوئے اساتذہ کرام کے کان کھڑے کر دئے۔

تمام محفلوں میں یکبارگی یہ شور بلند ہوا
شاد آیا نہ کہو حافظ و شیراز آیا

اور شاد تمام محفلوں میں بڑھ کر داد تحسین خاص کرتے رہے اور یہی کہتے رہے۔

یہ بزم مئے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

شاد کے عہد ہی میں فضل حق آزاد بھی ایک مقتدر اور مایہ ناز ہستی تھی۔ ان دونوں میں ہمیشہ چشمک رہتی تھی چوں کہ فضل حق آزاد نظم گو تھے اور غزل بہت کم کہا کرتے تھے، اور شاد غزل کے علاوہ نظمیں بھی کامیاب کہتے تھے۔ اس لئے شاد کو آزاد پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی پھر بھی آزاد عظیم آبادی نے جو نظم کا بیش بہا سرمایہ چھوڑا ہے وہ دبستان بہار کے لئے نہیں بلکہ اردو شاعری کے لیے باعث صد فخر ہے۔

آج بہار کا اردو ادب اُنھیں کی نیتا ... ہوش ڈگر پہ چل رہا ہے جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی نے شاد اور آزاد کی نظموں سے استفادہ ... ل کیا ہے۔ اور اُنھیں کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں۔ خاص کر عزیز عظیم آبادی کے نظمیہ احساسات پر آزاد کے فن کی گہری چھاپ ہے۔ عزیز عظیم آبادی، فضل حق آزاد کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ جنھوں نے پدر ماجد کے انتقال کے بعد اردو شاعری کی لاج کو بچائے رکھا اور اس ادبی میراث کو اخیر وقت تک سینے میں محفوظ رکھا۔

ایک بار مجھے پٹنے کے مشاعرے میں عزیز کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ بات بات پر زیر لب مسکرانے والا انسان جس کے چہرے پہ کبھی ناخوشگواری کی لکیر تک نظر نہ آئی، جو شاید ذرہ ذرہ تردد کا دشمن تھا اس شام کا عکس اب بھی میرے ذہن میں موجود ہے۔ لیکن وقت کے دھندلکے بُری طرح مسلط ہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں حلیہ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی ناکام ہوں، اس کی زبان، اس کا لب و لہجہ اور اس کا انداز فکر سو فیصدی شاعرانہ تھا۔ اگر کبھی فلسفہ کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ حقیقت پسند شاعر زندگی اور فلسفے کے ان تمام اہم نکتوں کا انکشاف کرتا جہاں تک ہماری نظریں پہونچ سکتیں۔

عزیز کو علم و ادب کا خزانہ ورثہ میں ملا تھا۔ اردو زبان پر اس حد تک عبور حاصل تھا گویا زبان نے اس سے ... لیا ہے۔ اس کو خوبصورت اور نادر تشبیہات و استعارات کا تخلیق کار بھی کہا جا سکتا ہے یہ اپنی رباعیوں کی وجہ سے ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس کی رباعیوں میں شراب و شاہد کے تذکرے کے علاوہ زندگی کے پیچیدہ اور اہم مسئلے حل ہوتے نظر آتے ہیں۔ جوش اور فراق نے بھی اپنی رباعیوں میں فلسفہ اور زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن عزیز اپنی رباعیوں میں ان دونوں سے پیش پیش ہے —

عمر خیام اپنی رباعیوں کی مقبولیت سے زندہ جاوید
ہے۔ اس شاعری اور شخصیت دونوں میں
اپنی کیورین فلسفہ اپنانے کی کوشش
کی ہے اور بہت کامیاب نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
عزیز کو خیام اردو کہا گیا۔ اس نے نظم کے علاوہ غزلیں
بھی کثیر تعداد میں کہی ہیں۔ جو پڑھنے اور فکر و شعور کی
گہرائی تک پہونچنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں عزیز کی
ساری ادبی زندگی اور مکمل شاعری کا جائزہ مقصود
نہیں اس لیے صرف چند رباعیات بلا تخصیص پیش کر
رہا ہوں جو عزیز کی شاعری کی رنگا رنگ مفکرانہ اور
فلسفیانہ زندگی کا آئینہ دار ہیں۔

پیمانۂ صبر آج چھلکا ساقی　　تشنہ ہوں دو ایک جام ہلکا ساقی
خاور میں شفق کی سرخیوں کا پھیلاؤ　　ہے سرمۂ شام کا دھندلکا ساقی

امڈتے ہوئے ابر ہات جن کو چھوئے
رضواں دیکھے تو اپنی جنت بھولے
پھولوں کے ہجوم میں لچکتی شاخیں
جس طرح کوئی حسین جھولا جھولے

کلیاں چٹکیں بہار صہبا جاگی　　ساغر کھنکے نشاط مینا جاگی
آیا مئے ناب کا سفینہ آیا　　جاگی مرے دلولوں کی دنیا جاگی

اور اب جبکہ عزیز ہماری ادبی محفلوں سے اٹھ کر
غالب و اقبال سے جا ملا ہمیں اس کا ہر شعر اس کے بیش بہا
فلسفے اس کی خوش گفتاری، ملنساری اور اعلی بذلہ سنجی
کی یاد دلاتا ہے، وہ حافظ بھی تھا اور حاجی بھی وہ رند
بلانوش بھی تھا۔ اور پارسا بھی، غرض کہ ایک عجیب
فلسفی نما انسان تھا۔ جس نے ۱۲ ستمبر ۱۹۶۳ء بروز جمعرات
بوقت ۷ بجے شب　　داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ
وانا الیہ راجعون۔

بسمل سنہاروی نے　　سال وفات یوں لکھا ہے۔
"عزیز الحق بفضل حق ہوئے مہمان جنت میں"
۱۹۶۳ء

صبر رضوی مخدوم آبادی نے لکھا ہے۔
عزیز شاعر شیریں سخن اے وا　　۱۹۶۳ء

مرے دل کو صبر و قرار تھا، جو نظر میں جلوۂ یار تھا
مری آنکھ سے جو نہاں ہوا، تو نہ صبر تھا نہ قرار تھا

مرے دم سے رونق باغ تھی، مرے دم سے لطف بہار تھا
مرے بعد ایسی ہوا چلی، کہ جو گل تھا اب وہی خار تھا

جو شریکِ ہجر رہا مرا، جو نہ بے کسی میں جدا ہوا
وہ خیال زلف نگار تھا، وہ تصور رخ یار تھا

پس مرگ کیوں مری قبر پر، نہ ہجوم سنبل ولالہ ہو
میں اسیر گیسوئے یار تھا، میں نثار روئے نگار تھا

شبِ ہجر کا کروں کیا بیاں، وہ ہجوم غم تھا کہ الاماں
دل بیقرار کو کیا کہوں، کوئی برق تھا کہ شرار تھا

تری جستجو ہی میں آئے تھے، تری جستجو ہی میں جائینگے
تری جستجو میں ہیں کہیں، نہ قرار ہے نہ قرار تھا

میں قفس سے چھوٹ کے آیا جب، تو بدل گئی تھی فضا ہی سب
نہ چمن میں تھا وہ ہجوم گل، نہ وہ شور بلبل زار تھا

تجھے کچھ خبر بھی ہے بیوفا، وہ نفیس آج گزر گیا
تجھے جسکے نام سے عار تھی، ترے دلمیں جس سے غبار تھا

نفیس سندیلوی

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

بنگال کے چند ہندو شعراء

(۱) مہاراج آج کرشنا بہادر نام، آپ مہاراجہ تارا کرشنا بہادر کے خلف اکبر تھے۔ آپ نے بہادر شاہ اول معظم کا تذکرہ اُردو نظم کے سانچے میں ڈھالا تھا جو بہت مشہور اور مقبول ہوا۔ آپ کی فارسی کتابوں کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ فارسی کے زبردست عالم تھے۔ ان کا اُردو اور فارسی کلام پانچ جلدوں پر مشتمل تھا لیکن اب کہیں دیکھنے میں نہیں آتا ۱۸۶۰ء تک ان کے کلیات کی نقلیں کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی اور برلن کے سرکاری کتب خانہ میں موجود تھیں۔

(۲) راجہ کالی کرشنا بہادر مہاراجہ راج کرشنا بہادر کے بیٹے تھے فارسی اور اُردو کے ماہر تھے۔ اُنھوں نے مجموعہ لطائف اُردو اور گیکی کی ایک نظم کا اُردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ راجہ کالی کرشنا بہادر نے آخر دم تک اردو زبان اور لٹریچر کی خدمت کی مجموعہ لطائف منظوم کا نسخہ میرے کتب خانہ میں تھا لیکن میرے ایک دوست مطالعہ کے لئے لے گئے اور انھوں نے واپس نہیں کیا نہ معلوم اس نسخہ کا کیا حشر ہوا۔

(۳) راجہ جنم جے مِتر ارمان کا وطن مونزی تھا جو کلکتہ کے قرب وجوار میں واقع ہے۔ یہ حافظ اکرام احمد ضیغم کے شاگرد تھے۔ ان کے دادا راجہ بتیمبر مِتر بنگال کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ ارمان نے ... ... اُردو میں ایک تذکرہ لکھا تھا جو تذکرہ بہار دلکشا کے نام سے مشہور تھا۔ محمد سلیم صدیقی نے اُردو میں ہندوؤں کی خدمات کے سلسلے میں ایک مقالہ لکھا تھا اس میں ارمان کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

اردو تذکرہ نویسوں میں "خمخانۂ جاوید"
کے مصنف لالہ سری رام، دیبی پرشاد بشاش
راجہ جنم جے متر المتخلص بہ ارمان منشی درگا پرشاد
نادر خوب چند ذکا وغیرہ ہم قابل ذکر ہیں"۔

ارمان کا ۱۸۷۶ء میں انتقال ہوا۔ اب آپ کے کلام کا کہیں پتہ نہیں چلتا دو اشعار ملاحظہ فرمایئے جو بہت تلاش کے بعد دستیاب ہوئے ہیں۔

کام اپنا نہ کبھی تجھ سے مری جاں نکلا
تن سے جاں نکلی مگر دل کا نہ ارماں نکلا

رات بھر نالے کیا کرتا ہوں گریہ دن کو
پوچھتے کیا ہیں حقیقت مرے اوقات کی آپ

(۴) اتواری لال ذرّہ کے بزرگوں کا وطن کلکتہ تھا۔ ان کو فارسی زبان پر بڑی قدرت تھی۔ حضرت ناسخ ان کے دلی دوستوں میں تھے خط نستعلیق لکھنے میں ماہر تھے اس لئے کلکتہ کے لوگ ان کا منشی اتواری لال کے نام سے بڑے احترام کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔ یہ ۱۲۳۸ھ تک حیات تھے۔ ان کا ایک ضخیم اردو دیوان تھا لیکن نہ معلوم اس دیوان کا کیا حشر ہوا۔ ایک شعر ان کی یادگار رہے ملاحظہ فرمائیے۔

دلدار کی خاطر سے دلِ زار بھی چھوڑا
اُلفت میں سمن رویوں کے گلزار بھی چھوڑا

(۵) راجہ کشن نام، اُردو شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے یہ راجہ بنکش بہادر کے خلف اکبر تھے جو کلکتہ کے ایک اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جن کا خاندان کلکتہ میں بہت ذی اثر اور مشہور تھا۔ ایک ضخیم دیوان ان کی یادگار تھا جو اب نایاب ہے انکا ایک شعر محفوظ رہ سکا ہے جو درج ذیل ہے۔

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب
تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

(۶) بابو کشن چندر گھوش نام کشن تخلص کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ اردو ادب کی بہت خدمت کی۔ بجز ایک شعر کے اور کچھ ان کے بارے میں نہ معلوم ہو سکا۔

صدف اپنے گوہر کو بے آب سمجھے
یہ دنداں تمہارے دہن میں جو دیکھے

(۷) کنور راجا اپورب کشن نام، یہ راجہ راج کشن بہادر کے بیٹے تھے۔ تخلص معلوم نہ ہو سکا اپنے والد کی طرح اردو میں شعر کہتے تھے اور انھیں کے شاگرد تھے۔ دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

شیدا ہے عشق میں ترے دل شیخ و شاب کا
قالب تہی ہے یاد میں تیری حباب کا

نہ پوچھو گزری ہے جو مجھ پہ بیقراری رات
مثال شمع کٹی روتے روتے ساری رات

(۸) راجہ جادو کشن بہادر راجاؤں کے ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اردو شعر و ادب کا مذاق ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا اور مشفق تخلص فرماتے تھے۔ کلکتہ کے مشہور شاعر ظہور البتی محزوں کے ارشد تلامذہ میں تھے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

خفتگانِ خاک ہیں قربان اس رفتار پر
ہے قیامت کا گماں سب کو قدِ دلدار پر

نیند تو آتی نہیں جو خواب میں دیکھوں اسے
حیف آتا ہے مجھے اس دیدۂ بیدار پر

(۹) بابو جگن ناتھ پرشاد ملک۔ میر باسط علی محوی الہ آبادی کے شاگرد رشید تھے اور حضرت ناسخ نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر دوستوں میں کیا ہے۔ ملک ڈھاکہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

دل پہ اک سانپ سا لہراتا ہے اسوقت ملک
زلفِ جاناں کی صبا لے کے جو بو آتی ہے

تحسین سروری

محمد قلی قطب شاہ

جب سلطان قلی قطب شاہ مارا گیا تو اُس کے چھوٹے بیٹے ابراہیم قطب شاہ نے گولکنڈہ سے راہ فرار اختیار کر لی اور بجیا نگر ہندو راج دھانی میں شاہی پناہ گزین کی حیثیت سے مقیم ہوگیا۔ اس طرح اُس نے عین جوانی کے سات سال بیجانگر میں گذارے جب اس کے ظالم بھائی جمشید قلی قطب شاہ کا انتقال ہوگیا تو ۹۵۷ھ میں واپس آکر گولکنڈہ کو اپنی تسخیر میں لے لیا اور قطب شاہی سلطنت کو مستحکم کرنے میں ۳۲ سال صرف کئے اس دوران میں ابراہیم قلی نے محسوس کر لیا کہ مقامی باشندوں خاص کر تلگو رعایا سے راہ اور رسم پیدا کئے بغیر ملکی اور انتظامی معاملات بہتر نہیں ہو سکتے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے درباریوں اور مقربوں میں ہندو رؤسا و امراء بھی برا جمان ہیں جنہوں نے ... کہ گولکنڈہ کی اسلامی سلطنت کے استحکام میں ہندوؤں نے بھی اپنا زور لگایا تلگو زبان میں اب تک بعض ایسے کتبے اور مخطوطات پائے گئے ہیں جن میں ابراہیم قلی کی تعریف و تحسین خلوص دل کے ساتھ کی گئی ہے۔ خود تلگو کے ماخذ پتا دیتے ہیں کہ ابراہیم قلی قطب شاہ تلگو ادب شاعری کا قدردان اور محسن تھا۔

ان حالات میں ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خود بادشاہ کے گھر پر پورے ملک کے حالات کا کیا کچھ اثر نہ پڑا ہوگا۔ دکن کے مسلمان سلاطین کی تاریخوں میں ہمیں خانہ جنگی اور باہمی معرکہ آرائیوں کے مناظر نسبتاً کم اور قومیت کے عناصر کی جو فراوانی نظر آتی ہے غالباً اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہاں روا داری اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے کا اصول اختیار کر لیا گیا تھا۔ یہی رواداری اور قومی اتحاد آگے چل کر دکنی تہذیب و معاشرت کی بنیاد کا پتھر بنتے ہیں۔

ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا وارث تخت و تاراج ہوا جس نے ۳۲ سال حکومت کر کے ۱۰۲۰ھ میں انتقال کیا یہ وہی محمد قلی قطب شاہ ہے

جسے اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر سمجھا جاتا ہے اور اُردو ادب کی تاریخ میں اس کے کلام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے نہ صرف یہ کہ اپنے باپ کی قائم کی ہوئی روایتوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی بلکہ ان پر کچھ ایسا رنگ چڑھایا کہ آج پونے چار سو سال گزرنے کے بعد بھی زمانے کے سرد گرم کا اس پر کچھ اثر نہ پڑا۔ صرف یہی نہیں، محمد قلی نے اپنی طرف سے کچھ اضافے بھی کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم جس کو دکنی تہذیب کا نام دیتے ہیں۔ اس کو ایجاد کرنے والا یہی شاعر بادشاہ محمد علی قطب شاہ تھا۔

حیدرآباد دکن میں جو نذہبی اور سماجی رسوم رواج ہیں۔ وہ قطعی مقامی رنگ و ماحول کی حامل ہیں جن کے متعلق کہنا چاہیے کہ محمد علی قطب شاہ کی انفرادیت پسند طبیعت ابھی تک معجزہ دکھا رہی ہے۔ گولکنڈہ کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے ذہن میں ایک خیال گونجا کہ ایک نیا شہر آباد کرنا چاہیے پھر خیال کی یہ گونج جب مادی شکل اختیار کر لیتی ہے تو ایک نہایت پرفضا و پر رونق شہر آباد ہو جاتا ہے۔ پہلے یہ شہر بھاگ نگر کہلایا۔ پھر حیدرآباد کے نام سے مشہور رہا۔

محمد قلی کے تعمیر کئے ہوئے محلات، ایوان شاہی بازار، شفا خانے، سرائیں، باغات وغیرہ سب کے سب اس وقت اپنی شکل میں تو موجود نہیں۔ لیکن ان کی گرتی ہوئی متی اور ان کے مٹے ہوئے نقوش چار صدی قبل کی دکنی شان و شوکت کے جلوے دکھاتے ہیں اور اپنے معمار کے ذوق جمال و نفاست پسندی کی ثنا و توصیف اپنی

زبان خاموش سے اہل دل کو سناتے ہیں۔

قدیم تاریخیں یہ گواہی دیتی ہیں کہ قطب شاہی تاجدار بلا کے مذہب پرست اور اسلامی آئین و روایات کے سختی سے پابند تھے۔ لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ ان ترک زادوں نے تلنگانہ کے حالات کے مطابق آئین حکمرانی وضع کر لئے تھے یہاں کے رسم و رواج میں کچھ اپنے رسم و رواج شامل کر کے ان کو قومی رنگ دے دیا تھا۔ کیا یہ سب کچھ کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر تھا اس سوال کا جواب اب کوئی مورخ تو کیا دے گا۔ البتہ قطب شاہی عہد کی عمارت اور اس عہد کے کتبات ہی کچھ جواب دے سکتے ہیں۔

شاہجہاں آباد سے آئی ہوئی ایک گری پڑی بولی کو انھیں قطب شاہی سلاطین نے تخت تمکنت پر بٹھایا۔ اور اس کے سر پر فضیلت کا ایسا تاج رکھا کہ رفتہ رفتہ وہ ایک مستقل زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہے، پھر تصنیف و تالیف کے لئے جب اس زبان کو برتا ہے تو اس کے جوہر ایسے چمکے کہ آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ قطب شاہی رنگ کاری، عمارت سازی اور صنعت گری بھی اپنی الگ ایک شان رکھتی ہے۔ حد یہ ہے کہ فن خطاطی تک میں اُنھوں ایک علیحدہ روش نکالی۔ یہ صحیح ہے کہ خطاطی میں اہل دکن نے کوئی خاص کمال نہ دکھایا۔ لیکن خط ثلث کو رواج دے کر اپنا سادگی اور انفرادیت پسندی کا ثبوت بہم پہونچایا۔

محمد قلی قطب شاہ کی جو تصویر دستیاب ہوئی ہیں ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے لباس اور وضع قطع میں بھی ایک نئی شان پیدا کی تھی، چہرے سے داڑھی کا غائب کر دینا اور کندھوں پر چادر ڈالے رکھ

یہ خاص دکنی تہذیب کی نشانی ہے
دکن میں شادی بیاہ کے موقع پر جو رسم ادا کئے جاتے ہیں ان میں سے اکثر محمد قلی قطب شاہ کے رائج کئے ہوئے ہیں۔ اب تک بھی بوڑھی عورتیں اور دکنی مراثنیں محمد قلی قطب شاہ کے لکھے ہوئے گیت، جلوے، سالگرہ اور چلہ چھٹی کے وقت گاتی ہیں رسم تسمیہ خوانی اور سالگرہ کا دکھنی طریقہ بھی محمد قلی ہی کی یادگار ہیں۔ محرم میں عزہ داری اور عاشور خانوں کی آرائش وشہدائے کربلا کے اسمائے مبارک کے علم کی ایستادگی میں بھی محمد قلی قطب شاہ نے دکنی مزاج کو شامل کر دیا تھا۔ انقلاب حیدرآباد سے پہلے تک بھی محرم کی تقاریب سرکاری حیثیت میں منائی جاتی تھیں۔
یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ، حیدرآباد میں محمد قلی قطب شاہ، شمالی ہند میں شہنشاہ اکبر، بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ، ایک نئی ہند اسلامی تہذیب کی تشکیل کر رہے تھے۔ یہ تینوں بادشاہ ہم عصر تھے۔ اور تینوں کے ذہن میں بیک وقت ایک ہی بات آئی تھی۔ سلطان محمد علی قطب شاہ کا کلیات جو بڑی تقطیع کے بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تقریباً ہر صنف کا کلام موجود ہے۔ اس کا کلام پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سینے میں بلا کا ساسِ دل' اور دل میں محبت کی بھڑکتی آگ رکھتا تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ وہ ایک بادشاہ بھی تھا لیکن حقیقت میں اُس کے سر پر صرف سخنوری کا تاج ہمازیب دیتا ہے

شعر تیرا دو گو ہر ہے معانی سب میں
شعر حافظ کے مرادیہ ہے تاج پرویز

کرتے ہیں دعوئ شعر کا سب اپنی طبع سوں
بخشا ہے فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

محمد قلی قطب شاہ نے جس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کا شاعرانہ خلوص اور بے پناہ جذبۂ تخلیق کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اس شاعر نے جس زبان میں اپنے جذبات کو پیش کیا ہے، وہ اب ہمارے لئے نامانوس سی ہے۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہی وہ دکنی زبان ہے۔ جس نے ترقی کرکے ہندی یا ہندوی کا نام پایا یا پھر ریختہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اور اب "اردو" کہلاتی ہے۔ مطلب یہ کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ساری شاعری دکنی یعنی ابتدائی اُردو میں ہے۔ اکثر افعال و ضمائر الو کھے سے معلوم ہوتے ہیں بعض ترکیبیں اور استعمال اس وقت متروک ہیں۔ لیکن محمد قلی کی شاعری میں بان کی جو سمتیں ہمیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ بڑی روشن اور اُردو جیسی تخیلی زبان کی فطرت کے عین مطابق معلوم ہوتی ہیں۔ اگر اُردو کو فطری تقاضوں کے تحت ترقی کرنے کے مواقع دیئے جاتے اور اس کی ترقی میں قواعد نویسوں کی کارفرمائی کا دخل نہ ہوتا تو اُردو کچھ اور ترقی یافتہ زبان بن جاتی۔
سُلطان محمد قلی قطب شاہ کے سوانح نگار جہاں اُس کی جہانبانی اور کشورکشائی کے واقعات بیان کرتے ہیں وہاں اُس کی شاہد پرستی کی داستانیں بھی خاص طور پر بیان کرتے ہیں۔ تاریخ کے کچھ مبہم اشاروں اور دکن میں ہر طرف مشہور روائتوں سے اُس کی داستان عشق کا ایک باب یوں ترتیب پاتا ہے۔
قلعہ گولکنڈہ کے مشرقی جانب چھ سات میل کے فاصلے پر رود موسیٰ کے کنارے "چچلم" نام کا ایک موضع آباد تھا۔ گولکنڈہ کے نوعمر شہزادے محمد قلی قطب شاہ کا کسی روز "چچلم" میں گذر ہوا۔ اور وہاں "بھاگ متی" نام کی ایک

پرکار آتش رقاصہ سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ شہزادہ پہلی ہی ملاقات میں بھاگ متی کے تیر نظر کا گھائل ہوا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک لمحے کے لئے بھی بھاگ متی کا فراق برداشت کے قابل نہ رہا۔ کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا کہ شہزادہ رات کے وقت شاہی محل کے چور دروازے سے نکل کر موضع چچلم بھاگ جاتا۔ آخر مخبروں نے شہزادہ کا یہ افسانۂ عشق بادشاہ کے گوش گزار دیا۔ بادشاہ جب اس واقعہ سے باخبر ہوا تو برافروختہ ہوا۔ اور سب سے زیادہ یہ بات خاطر اقدس پر گراں گزری، کہ شہزادہ نے ایک شاہد بازاری سے پینگیں بڑھائیں اور ناموس خاندان شاہی کو داغدار کر دیا۔ پہلے تو شہزادے کی سرزنش کرنی چاہی پھر قرین مصلحت نہ جان کر شہزادے کو بڑی نرمی سے سمجھایا۔ لیکن شہزادہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ مجبور ہو کر بادشاہ نے محمد قلی کو محل میں نظر بند کر دیا۔

نظر بندی کی حالت میں شہزادے کی حالت نازک تر ہوگئی۔ دن رات آہ آہ کرتا رہتا۔ نہ وقت پر کھاتا۔ نہ وقت پر سوتا۔ نہ کسی سے بولتا نہ کسی کی سنتا۔ بادشاہ کو جب شہزادے کے اس حال تباہ کی خبر ملی تو ذہن رسا میں ایک ترکیب آئی چنانچہ بادشاہ نے عرب، ایران۔ ارمینیا، ترکی، گجرات اور تلنگانے کی چند عالی خاندان حسن وجمال میں بے مثال لڑکیوں کو جمع کیا۔ اور ہر لڑکی کو سمجھایا کہ تم میں سے جو مہ جبیں ولی عہد سلطنت کو اپنی طرف مائل کر لے گی اور اس کے دل سے چچلم کی رقاصہ بھاگ متی کا خیال نکال دے گی وہی اس سلطنت ابد مدت کی آئندہ ملکہ بنے گی۔ اور اس کی اولاد سرزمین دکن کی مالک تخت وتاج ہوگی۔

بادشاہ کی طرف سے یہ کتنی بڑی پیش کش تھی۔ کس لڑکی کے دل میں یہ خواہش نہ ہوگی کہ وہ ملکہ بنے۔ کون مہ جبیں ہوگی۔ جو ولی عہد سلطنت کی دلہن بننے پر راضی نہ ہوگی۔ غرض ہر پری تمثال لڑکی نے شہزادے کا دل موہ لینے کے جتن کئے۔ ہر ایک نے اپنے حسن وجمال کو سو سو رنگ میں پیش کرنا شروع کیا۔ کوئی کچھ کرتی لیکن ہمروشہزادہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور ہمیشہ بھاگ متی۔ بھاگ متی کی رٹ سے کام و ذہن کو تر رکھتا بعض وقت تو شہزادہ بے تاب ہو کر رو پڑتا۔ اب تو یہ حالت ہوگئی کہ یہ منتخب روزگار مہ لقائیں شہزادے کو اپنے عشوہ ناز دکھانے کے بجائے اس کی دلدہی کرنے لگیں۔ طرح طرح سے دلاسے دیتیں اور دعائیں دیتیں کہ یہ پیکر حسن وجمال شہزادہ جس کے عشق میں اس درجہ بیتاب ہو رہا ہے خدا کا اس کا وصل جلد نصیب کرے۔

اکثر شہزادہ اپنے محل کے بالاخانہ پر چڑھ کر چچلم کی طرف آنکھ لگا کے بیٹھا رہتا۔ لیکن اس سے بھی دل کی کچھ بھڑاس نہ نکلتی۔

ایک رات شہزادہ محل کے بالاخانے پر چڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر گولکنڈہ کے برابر سے بہنے والی رود موسیٰ پر پڑی یہ ندی ایک سمندر بن گئی تھی۔ اس میں شک نہیں کئی روز سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ اور ندی بھی بھر پور بہہ رہی تھی لیکن وہ رات قیامت کی رات تھی یعنی ندی میں طغیانی آگئی تھی۔ ہیبت ناک۔ بھیانک طغیانی۔ یہ وقت وہ تھا۔ جب کہ بارش تھم گئی تھی۔ بادل چھٹ گئے تھے۔ اور چاند جلوہ ریز ہو کر ہر طرف چاندنی پھینک رہا تھا۔ طغیانی کا منظر دیکھتے ہی شہزادے نے چچلم کی طرف نظر دوڑائی۔ اس طرف تو ٹمٹماتا چراغ بھی دکھائی نہ دیا۔

اُس سے شہزادے نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہو سکتا ہے کہ سارا گاؤں بہہ گیا ہو۔ سیلاب سے بچنے کیلئے بستی والے کہیں بھاگ گئے ہوں۔ ظاہر ہے اس گاؤں سے شہزادے کو بھاگ متی کی وجہ سے دل چسپی تھی۔ یہ قید بھی تو اس کے لئے کاٹ رہا تھا۔ شہزادہ فکر و تردد کے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ مہ جبینوں کے جھرمٹ کو چیر کر محل کے باہر نکل آیا۔ اور بالا حصار کے باہر آ کر گھوڑا سیا تال کیا۔ وہاں ہمہ وقت امراء کے ہاتھی گھوڑے بندھے رہتے تھے اور جلوخانے اور بالا حصار کے باہر پہرے دار ننگی تلواریں لئے مستعد کھڑے رہتے تھے ان سب سے بے نیاز ہو کر شہزادہ زن سے باہر آگیا۔ دیکھنے والوں کو محسوس ہوا کہ کوئی بجلی ادھر سے گذری۔ پہرے داروں میں سے کچھ دوڑتے ہوئے باہر لپکے دیکھا کہ یہ دلی عہد سلطنت میں۔ جو تنہا ایک ہاتھی پر سوار ہو کر ندی کی طرف جا رہے ہیں۔ جلدی جلدی گھوڑوں پر سوار ہو کر شہزادے کا پیچھا کیا۔ قریب پہونچ کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں لیکن شاہی رعب نے ان کی زبانیں بند کر دیں۔ ان میں سے کچھ تو شاہی ہاتھی کے دائیں بائیں ہو گئے۔ اور کچھ اس حادثہ ناگہانی سے صدر محافظ قلعہ کو مطلع کرنے کیلئے قلعہ کو واپس ہو گئے۔ کچھ دیر بعد شہزادے کا ہاتھی رود موسیٰ کے کنارے پہونچ گیا۔ طغیانی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ لیکن کچھ پرواہ کئے بغیر شہزادے نے اس کو پانی میں ڈال دیا۔ مگر ہاتھی سیلاب کے اس زور کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہا۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگا۔ شہزادہ پیچ و تاب میں آگیا اور ہاتھی پر سے کود کر ایک سپاہی کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (مرحوم) کے الفاظ ہیں کہ اقبال مند شہزادے کا ایڑ لگانا تھا کہ گھوڑا کشتی کی طرح پانی میں تیرنے لگا۔ اور تھوڑی دیر میں دوسرے کنارے پر پہونچ گیا۔"

دوسرے کنارے پر پہونچ کر شہزادے نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چچلم کی آبادی کا بیرونی حصہ سیلاب کی زد میں آیا ہے اور بستی والے سب کے سب محفوظ ہیں۔ پھر وہ آن واحد میں بھاگ متی کے گھر پہونچ گیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر بھاگ متی دوڑتی ہوئی دروازے پر پہونچی۔ شہزادے کو دیکھ کر حیرت اور خوشی کے مارے بیہوش سی ہو گئی دیر تک مدت کے بچھڑے ہوئے یہ نوجوان دعو برو راز نیاز کی باتیں کرتے رہے۔

شہزادے کے باپ سلطان ابراہیم قطب شاہ کو جب اپنے بیٹے کی اس جرأت کی خبر ہوئی تو اُس کو اندازہ ہو گیا کہ یہ کارنامہ جذبۂ ہوس کا نتیجہ نہیں بلکہ کوئی ایسی اندرونی طاقت ہے۔ جس کو سچے عشق کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن بادشاہ نے ندی پر پل بنانے کا حکم جاری کر دیا۔ رود موسیٰ کا یہ پہلا پل ہے جو آجتک قائم ہے اور "پرانا پل" کے نام سے موسوم ہے۔

مورخین کا بیان ہے کہ محمد قلی قطب شاہ جب مالک تخت و تاج ہوا اور گولکنڈہ کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ایک اور شہر بسانے کا اس کو خیال ہوا۔ تو اُس نے نئے شہر کے لئے موضع چچلم کو مناسب و موزوں مقام قرار دیا۔ پہلے تو اس شہر کا نام بھاگ متی کی رعایت سے "بھاگ نگر" رکھا گیا۔ جب بھاگ متی حیدر محل کے خطاب سے سرفراز ہوئی تو بھاگ نگر حیدرآباد ہو گیا۔ اور اس کا تاریخی نام فرخندہ بنیاد۔ انقلاب حیدرآباد تک اس کا سرکاری نام "حیدرآباد فرخندہ بنیاد" تھا۔

حیدرآباد کی قطب شاہی عمارتوں میں بلندی،
وسعت اور خوبصورتی کے اعتبار سے "چار مینار" خاصا
مشہور ہے۔ یہ دلچسپ روایت بھی سننے میں آتی ہے کہ
چار مینار ایسی جگہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں بھاگ متی کا مکان
تھا۔ اس کی تعمیر کی تاریخ "یا حافظ" ہے جس سے بحساب
جمل سنہ ۱۰۰۰ھ کے عدد برآمد ہوتے ہیں۔

اس واقعہ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ محمد قلی قطب
شاہ کے سینے میں کتنا حساس اور دردمند دل تھا۔ ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی بے قراری کا علاج
شاعری میں تلاش کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی
ساری شاعری سوز و گداز اور کیف و مستی کے جذبات
سے بھری ہوئی ہے۔ جب وہ کسی معشوقۂ طنّاز کا تذکرہ کرتا
ہے تو اس کے حسن و جمال کی رعنائیوں میں اس طرح کھو
جاتا ہے کہ اس کی باتوں میں شاہانہ تمکنت کی جگہ نیاز
مندی و سپاس گزاری کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک عاشق پیشہ بادشاہ تھا۔
ایک دل گرفتہ شاعر تھا۔

جو کوئی ہے عشق میں ثابت، سدا ہے جیونا اس کا
سو اس کے ناؤں سوں میخانہ سب معمور کر ساقی

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ و میخانہ کوں
دیکھتا ہوں ہر کہاں دستا ہے تج مکھ کا صفا

مکھ عرق تھے بھر صراحی ساقیا منج بزم میں
تا معانی پی کے گاوے ہور بجاوے نیہ رباب

عاشقاں کے شعر تھے جگ مک اُٹھے
میری آہ کا سرگ ہے جیوں آفتاب

پڑے دنیاں میں میرے سو اس تیناں کے دنیا لے
خدایا عشق مشکل ہے، بھرم رکھ توں معانی کا

ہمارا سجن خوش نظر بانا ہے!
تو اس دل میں پیا، سب عشق کا راز ہے

بھر دل میں غم کی موجاں آوتی ہیں فوج فوج
عشق کے تختے اوپر کہیا رہے طوفاں زور تھے

عاشقاں تجھ راہ میں بسمل ہوئے ہیں بے شمار
عاشق بے چارہ ہوں رکھ پیار کے دستور تھے

پیا تجھ آشنا ہوں میں تو بیگانہ نہ کر منج کوں
ملے نہ اک گھڑی تجھ یاد بن، تو نا پہ منج کوں

جہاں تو، واں ہوں میں پیارے تجھے پایا ہے گر سوں
نہ بت خانے کا شیخ پہ روا، نہ مسجد کی خبر منج کوں

گدا تج عشق کا ہوں دے زکاتِ شوق منج سائیں
لب ہے اعجاز تج من کوں کہ جیو دیتی عیسیٰ مریم کا

محمد قلی قطب شاہ نے نہ صرف وارداتِ قلب اور
داخلی جذبات کے اظہار ہی کی شاعری کی ہے، بلکہ اسکے
کلیات میں مناظرِ فطرت، محلات۔ شاہی اور دیگر عمارات
پر بھی کافی تعداد میں نظمیں موجود ہیں۔ مذہبی تقاریب جیسے عید
میلاد النبی، محرم، عید الفطر و بقر عید وغیرہ پر قصائد لکھ کر
اپنا زورِ طبع دکھایا ہے۔ نیز مقامی میلوں اور غیر مذہبی رنگ
رلیوں کو اپنا موضوعِ سخن بنا اپنی شاعری کے جوہر نمایاں
کئے ہیں۔ خوفِ طوالت کے باعث محمد قلی قطب شاہ کی نظموں
کے منتخب اشعار سے گریز کر رہا ہوں۔

دنیائے اردو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب
مرحوم کے اِس احسان کو فراموش نہیں کر سکتی کہ سب سے
پہلے اُنھوں نے محمد قلی قطب شاہ جیسے باکمال شاعر کا
سراغ لگایا اور اس کے کلام کی خصوصیات پر بصیرت
افروز مقالہ تحریر کر کے رسالہ اردو کے شمارہ جنوری ۱۹۲۲ء

ں شائع کرایا۔ اب یہ مقالہ مولوی صاحب کی کتاب
قدیم اردو" میں شامل ہے جسے انجمن ترقی اردو نے
۱۹۶ء میں شائع کیا ہے۔ مولوی صاحب کی اس تحقیق
ے اٹھارہ سال بعد ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر زور نے کلیات
حمد قلی قطب شاہ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔

آخر میں یہ عرض کردوں کہ محمد قلی قطب شاہ کو
راج عقیدت پیش کرنے کے خیال سے دکنی ادبیات کے
ماہر اور اردو کے مشہور محقق و نقاد ڈاکٹر سید محی الدین
ادری زور نے حیدرآباد میں انیس ۱۹ سال قبل جنوری
۵۰ء میں "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی بنیاد ڈالی تھی۔
ب سے یہ تقریب جاری ہے جو ہر سال جنوری کے
بتدائی دنوں میں منائی جاتی ہے۔ آخر اس رسم کو حیدرآباد
میں قومی تقریب کی حیثیت دیدی گئی جس میں ہندو مسلمان
اور ہر طبقے، ہر مزاج کے لوگ شریک ہوتے ہیں ہزاروں
آدمیوں کا ایک جلوس چار مینار سے روانہ ہو کر محمد قلی
کے مقبرے کو جاتا ہے۔ جہاں فاتحہ اور قرآن خوانی
ہوتی ہے۔ مقبرے کے احاطے میں اور باہر میلہ لگا
رہتا ہے۔ اس روز حیدرآباد کے سرکاری دفاتر میں
تعطیل ہوتی ہے۔ اس کو محمد قلی قطب شاہ کے
بے پایاں خلوص اور اس کی پرکشش شخصیت کا اعجاز
کہنا چاہیے ورنہ حیدرآباد کے لوگوں کا اتنے بڑے
تاریخی، سماجی اور سیاسی انقلاب کے بعد ایک مسلمان
بادشاہ کو وہ بھی ایک شاعر کی حیثیت سے یاد رکھنا
محال تھا۔

شیخ حبیب اللہ

(دوسری قسط)

میں کون ہوں کیا ہوں؟ اقبال

(سلسلے کے لیے اگست ۷۶ء کا شمارہ دیکھیے)

مے از میخانۂ مغرب چشیدم بجان من کہ دردِ سر خریدم
نشستم بانکویان فرنگی ازان بے سوز تر روزے ندیدم

ایک دفعہ مسز گاندھی نے کہا تھا کہ ۔ اے اہلِ یورپ تمھارے پاس دھرا ہی کیا ہے سوا مادیت کے! روحانیت کی جنت بریں تو ہمارے یہاں ہے مگر ہم ہیں کہ یوروپی شراب میں چشمۂ کوثر کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یعنی ہم نے اپنی عقل و دانش کے سرمایہ بلکہ اپنے ناموس و وقار تک کو یوروپ کے قدموں پر رکھ دیا ہے۔ ہر چند دانش افرنگیاں غارت گری کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر اقبال نے ایسا نہیں کیا ۔

کشودم از رخِ معنی نقابے بدستِ ذرہ دادم آفتابے
نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم مثالِ شاعراں افسانہ بستم

بکوئے دلبراں کارے ندارم
دل زارے، غم یارے ندارم

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

نہ خاک من غبار رہ گذارے
نہ در خاکم دل بے اختیارے

بجبریل امیں ہم داستانم
رقیب و قاصد و درباں ندانم

مرا ایں فقر سامانِ کلیم است
فرِ شاہنشہی زیرِ گلیم است

اگر خاکم بہ صحرائے نہ گنجم
اگر آبم بدریائے نہ گنجم

دل سنگ از زجاج من بلرزد
یم افکار من ساحل نہ ورزد

نہاں تقدیر ہا در پردۂ من
قیامت ہا بغل پروردۂ من

دمے در خویشتن خلوت گزیدم
جہانے لازوالے آفریدم

بجانم رزم مرگ و زندگانی است
نگاہم بر حیات جاودانی است

زجان جاں ترا بیگانہ دیدم
باندام تو جان خود دمیدم
ازاں نارے کہ دارم داغ داغم
شب خود را بیفروز از چراغم

بخاک من دلے چوں دانہ کشتند
بلوح من خط دیگر نوشتند

مرا ذوق خودی چوں انگبیں است
چہ گویم واردات من ہمیں است

میرے فہم و دانش نے علم و دانش کی تخلیق کی ہے میں نے ذرہ کو آفتاب بنایا۔ میں روایتی شعرا کی طرح نشہ میں چور ہو کر افسانہ و افسوں بیان نہیں کرتا ہوں۔ یہ تیری کم نگاہی ہے کہ تو مجھے شاعر دروغ گو تصور کرتا ہے۔ میں پتلی کمر اور صراحی دار گردن والی ماہ وشوں کا شیدائی نہیں ہوں۔ ان کے فراق میں نہ دل فگار ہوں اور نہ سوگوار۔ میری خاک کسی رہ گذر کی مٹی نہیں ہے میرے وجود خاکی میں دل بے قرار بھی نہیں ہے۔ میں ایسا ویسا انسان نہیں ہوں۔ میں تو جبرئیل امیں سے ہم کلام رہتا ہوں۔ مجھے رقیب و دربان سے کیا رقابت ہو سکتی ہے۔ میں فقیری میں کلیمی کرتا ہوں اور ناداری میں فال و فرشاہی کلاہ تاجدار ہوں میری خاک صحرا کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ میرے زجاج کی ضرب سے سنگ خارا کا دل لرز جاتا ہے۔ میرا یم تخیل ساحل کو قبول نہیں کرتا۔ میرے شعور میں گوناگوں دنیائیں آباد ہیں۔ میرے دست قدرت میں طوفانوں کے انبار ہیں۔ ذرا سے غور و فکر کے ذریعہ ایک دنیائے لازوال تخلیق کر لیتا ہوں۔ میری چشم شگرف کے سامنے زندگانی کے رزم و مرگ کا نقشہ متحرک رہتا ہے۔ اور میری نظر حیات جاودانی پر مرکوز رہتی ہے۔ میں اپنے وجود کی آگ سے داغ داغ ہوں۔ اے ناداں! آ اس نار کی روشنی سے اپنی دنیا روشن کر لے۔ میرا وجود دانا میرے لئے انگبیں سے فزوں تر ہے۔ کیا کروں میرے سوز و ساز کا یہی عالم ہے۔

کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں نے دنیائے دانش و حکمت میں فکر و نطق کا شعلہ روشن کر دیا ہے۔ ہند کو چھوڑیئے کیوں کہ یہاں متاع علم و عرفان لٹ چکی ہے ؂

بہ سواد دیدۂ تو نظر آفریدہ ام
بہ ضمیر تو جہانے دگر آفریدہ ام من

ہمہ خاوراں بخوابے کہ نہاں ز چشم انجم
بہ سرود زندگانی سحر آفریدہ ام من

میں نے تیری آنکھوں کے پردوں میں نور بصیرت سمو دیا ہے۔ تیرے ضمیر میں نطق و کلام کی دنیا آباد کر دی ہے۔ ان اقدار کو جو چشم انجم سے پنہاں ہیں اپنے سرود زندگانی کے ذریعہ سحر بیز کر دیا ہے ؂

اے لالہ اے چراغ کہستان باغ و راغ
در من نگر کہ می دہم از زندگی سراغ

مارنگ شوخ و بوئے پریشیدۂ نیستم
مائیم آنچہ می رود اندر دل و دماغ

مستی ز بادہ می رسد و از ایاغ نیست
ہرچند بادہ را نتواں خورد بے ایاغ

داغے بہ سینہ سوز کہ اندر شب وجود
خود را شناختن نتواں جز بایں چراغ

اے موج شعلہ سینہ بباد صبا کشائے
شبنم مجو کہ می دہد از سوختن فراغ

ادراک پردہ خشگاف کی قندیل کہاں ملے گی۔ تجھے

جیسے اللہ تمنائی نے اس شعر کو غلط پڑھا ہے اور غلط ہی مطلب نکالا ہے

کچھ معلوم ہے؟ آ میں تجھے بتاؤں کہ زندگی کا راز کیا ہے
میں رنگ شوخ نہیں اور بوئے پریشاں نہیں ہوں بلکہ
میں وہی کچھ ہوں جو میرے دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے
کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مستی بادہ سے پیدا ہوتی ہے ایاغ سے
نہیں ہر چند بلا ایاغ جرعہ کشی ممکن نہیں۔ میرے نادان
دوست! اپنے سینے میں اپنی آتش سوزاں سے وہ آگ
پیدا کر کہ تیرے وجود کی شب دیجور میں خودی کی شناخت
کی شمع فروزاں پیدا ہو جائے۔ کیوں کہ اس شمع کے بغیر
یہ کارنامہ انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔ اے موج شعلہ بار
صبا سے خود کو بھڑکا۔ شبنم کی تلاش مت کر کہ تجھ میں
تم خوردگی پیدا ہو جائے۔

تو مجبور و مضطر کیوں ہے کہ زندگی معما ہے۔ یہ
تیری بے خبری ہے ورنہ ؎

جہان رنگ و بو پیدا تو می گوئی کہ راز است ایں
یکے خود را بتارش زن کہ تو مضراب و تار است ایں
نگاہ جلوہ بدمست از صفائے جلوہ می لرزد
تو می گوئی حجاب است ایں، نقاب است ایں، مجاز است ایں
بیا درکش طناب پردہ ہائے نیل گونش را
کہ مثل شعلہ عریاں بر نگاہ پاک باز است ایں

دنیا کے نقش و نگار دعوت نظارہ دیتے ہیں دنیا کی
فیضان و جمال اظہر من الشمس ہیں۔ اس کی حقیقت معین
و قطعی ہے۔ اس کی وسعت و فراوانی، شرر سامانیاں اور
جلوہ آرائیاں نظر کو خیرہ کرتی ہیں اور تو کہتا ہے یہ حجاب
ہے، مجاز ہے۔ آ اور ان پردہ ہائے نیل گوں کی طنابوں کو
توڑ ڈال اور دیکھ کہ تیرے مغالطہ آمیز حجابوں کے پردے
چاک ہوتے ہیں کہ نہیں۔

قرآن (۵-۱۹) وفی الارض آیت للموقنین ٥ وفی انفسکم
افلا تبصرون۔ اور یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں (معرفت
حق کی) نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود میں بھی۔ پھر کیا
تم دیکھتے نہیں ؎

بہ نگاہ آشنائے چو درون لالہ دیدم
ہمہ ذوق و شوق دیدم ہمہ آہ و نالہ دیدم
بہ بلند و پست عالم تپش حیات پیدا
چہ دمن چہ تل، چہ صحرا، رم ایں غزالہ دیدم
نہ بہ ماست زندگانی، نہ ز ماست زندگانی
ہمہ جاست زندگانی، از کجاست زندگانی

میں نے جب نگاہ آشنا سے تخلیق عالم پر غور کیا تو مجھے
اس میں حسن جمال کی شگفتگی اور بخشش و فیضان کی فراوانی
نظر آئی سارے عالم کے نشیب و فراز میں شورش حیات کی
گھما گھمی ہے، خروش ہے۔ نغمہ سنجی ہے، جدھر دیکھو زندگی
کا عکس جمیل موجود ہے۔ کیا دمن، کیا تل اور کیا صحرا۔ ہر جگہ
یہی غزالہ مست خرام ہے۔

قرآن ۳۰-۷ اولم یتفکروا فی انفسھم ما خلق
اللہ السموات والارض وما بینھما الا بالحق اور سورہ
ص میں ہے۔ وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا
کیا ان لوگوں نے کبھی اپنے دل میں اس بات پر غور کیا کہ
اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے
محض بے کار و عبث نہیں بنایا ہے ضرور ہے کہ حکمت و
مصلحت کے ساتھ بنایا ہو ؎

ہر چند زمیں سائیم بر تر ز ثریائیم
دانی کہ نمی زیبد عمرے چو شرر ما را
شام و سحر عالم از گردش ما خیزد
دانی کہ نمی سازد ایں شام و سحر ما را

شایان جنون ما نہ پہنائے دو گیتی نیست
ایں راہ گذر ما نا آں راہ گذر ما نا

ہر چند میں خاکی ہوں مگر ثریا سے ارفع و اعلیٰ ہوں۔
لہذا یہ تو بر ما ب عمر میرے شایان شان نہیں۔ یہ شام
و سحر میری گردش کی پیداوار ہیں۔ میں شام و سحر کی گردش
کی پیداوار نہیں ہوں۔ یہ پہنائے دو گیتی میرے جنون
شعلہ ساماں کے سامنے ہیچ ہے۔ یہ تمام کے تمام میری
راہ گذر ہیں۔

آنچہ من در بزم شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ مے

میں تمھارے لئے کیا تحفہ لایا ہوں کچھ معلوم بھی ہے
جام جانفزا، نالۂ نیستاں اور گل دستۂ بہار سنو!

من ایں گویم جہاں در انقلاب است
درونش زندہ در پیچ و تاب است

زمانے با ارسطو آشنا باش
دمے ساز بیکن را ہم نوا باش

ولیکن از مقام شاں گذر کن
شو گم اندریں محفل حذر کن

مقام تو بروں از روزگار است
طلب کن آں یمیں کہ بے یسار است

میری سنو! دنیا وہی ہے جس میں پے بہ پے انقلاب
نما ہوتے ہیں۔ اسی کے اندر زندگی پیچ و تاب میں ملتی
ہے۔ ارسطو کا مطالعہ کرو بیکن کو پڑھو مگر کسی کے فلسفہ
ق سے مرعوب مت ہو۔ تقلید پرستی کی وبا سے بچو
راہ الگ نکالو۔ کیوں کہ تمہارا مقام زمان و مکان
پرے ہے۔ اُس منزل کی تلاش کرو جس کی نہ کوئی
ہو نہ حساب ہے

منم کہ طوف حرم کردہ ام بتے بہ کنار
منم کہ پیش بتاں نعرہ ہائے ہو زدہ ام

دلم ہنوز تقاضائے جستجو دارد
قدم بہ جادۂ باریک تر ز مو زدہ ام

میں تمام ادوار تفکر و تدبر سے گزر چکا ہوں ـــ
تشکیک فی الدین اور عبودیت و نیاز بھی۔ دل میں تلاش
و جستجو کا طوفان بپا رہتا ہے۔ میں بڑی بڑی پیچیدہ
اور بال سے بھی باریک پل صراطوں سے گزرتا رہتا ہوں
اور نتیجہ ظاہر ہے۔

من دریں خاک کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

کوہ را مثل پرکاہ سبک می یابم
پرکاہے صفت کوہ گراں می بینم

دانہ را کہ با آغوش زمیں است ہنوز
شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیر جہاں می بینم

مجھے اس خاک کہن میں گوہر حیات کی ضو فشانیاں
نظر آتی ہیں۔ اس خاک کے ہر ذرہ میں زندگی کے زینت
و تفاخر کے جلوے نظر آتے ہیں۔ یہاں کے ذروں کی
چشم انجم نگراں معلوم ہوتی ہے۔ وہ دانہ جو آغوش
زمین میں مدفون ہے۔ اُس کی حقیقت مجھ کو عیاں ہو
جاتی ہے۔ اُس کی شاخیں مجھے برومند و جواں نظر آتی
ہیں۔ میری فکر شگرف کا یہ عالم ہے کہ کبھی پہاڑ رائی نظر
آتا ہے اور کبھی رائی پہاڑ! وہ انقلاب جو ضمیر افلاک میں

نہیں سما سکتا ہے اسے بھی میں دیکھ لیتا ہوں۔ مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ میں ان اسرارِ غوامض کو کیوں کر دیکھ پاتا ہوں ؎

آں زمینے کہ بر و گریۂ خونیں زدہ ام
اشکِ من در جگرش لعل و گوہر خواہد بود

وہ سرزمین جہاں میں نے اپنے گریۂ خونیں سے آب یاری کی ہے، رنگ لائے بنا نہ رہے گی۔ میرے اشک ضرور لعل و گوہر کی صورت اختیار کر لیں گے ؎

ما ز خلوت کدۂ عشق بروں تاختہ ایم
خاکِ پا را صفتِ آئینہ پرداختہ ایم

در نگر ہمتِ ما را کہ بہ دادے نگیم
دو جہاں را کہ عیاں پردہ جہاں باختہ ام

پیش ما می گذرد سلسلۂ شام و سحر
بر لبِ جوئے رواں خیمہ برافراختہ ایم

در دل ما کہ بریں دیر کہن شبخوں ریخت
آتشے بود کہ در خشک و تر انداختہ ایم

میرا عشق خلوت سے جلوت میں آگیا۔ میں نے خاکِ پا کو آئینہ فام کر دیا۔ سلسلۂ شام و سحر کی حقیقت کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس لئے غم و اندوہ اور کلفتوں کو میں خاطر میں لاتا ہی نہیں۔ اپنی کارگزاریوں پر خوش رہتا ہوں میرے دل میں شعلۂ رشک قمر موجود ہے۔ میں نے اس دیر کہن میں شبخوں مارا ہے اور شعلوں کے سحر جا بجا بکھیر دیئے ہیں۔

خاکیم و تند سیر مثال ستارہ ایم
در نیل گوں یمے بتلاش کنارہ ایم

بود و نبود ماست زیک شعلۂ حیات
از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم

با نوریاں بگو کہ ز عقلِ بلند دست
ما خاکیاں بدوشِ ثریا سوارہ ایم

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد بہ بادِ صبح
در کارِ زندگی صفتِ سنگِ خارہ ایم

چشم آفریدہ ایم چو نرگس دریں چمن
در بند برکشا کہ سراپا نظارہ ایم

میرا عشق شعلہ ساماں ہے۔ ہر چند میں پیکر گِل ہوں مگر ستاروں کی طرح تند سیر ہوں اور اس نیل گوں یم بے کراں میں ساحل کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ میری ہستی و نیستی کیا ہے؟ شعلۂ حیات کا ایک جز میں تو لذت انا کے شرر سے پارہ پارہ ہوں۔ نوابوں سے کہہ دیا جائے کہ ہم خاکی نژاد عقل بلند کے ذریعہ دوش ثریا پر سوار ہیں۔ میں تو باغ عشق میں ایک غنچہ کی طرح حریر پہ نیاں ہوں جو باد صبا کے جھونکوں سے لرزتا رہتا ہے۔ مگر کارزار زندگی میں مثل سنگ خارہ ہوں۔ میں اس چمن میں چشم نرگس طناز ہوں۔ چہرے سے پردہ اٹھا کہ میں سراپا نظارہ ہوں۔

اقبال بہ منبر زد رازے کہ نہ باید گفت
ناپختہ بروں آمد از خلوتِ میخانہ

اقبال نے رازہائے ناگفتنی کو فاش کر دیا۔ اسمیں بے خودی پائی جاتی ہے ؎

بیا کہ من زخمِ پیرِ روم آوردم
مئے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی است

لوگو! آکر دیکھو میں نے پیر روم کے خزانے سے گفتہ دلبرانہ کے موتی رول لئے ہیں، جو بادۂ عنبی سے بھی زیادہ مسحور کن ہیں اور ان کے آثار و مظاہر کی لذت محویت مسحور کن ہے۔

پردہ برگیرم و در پردہ سخن می گویم
تیغ خوں ریزم و خود را بنیامے دارم

میں پردۂ خفا سے ظاہر تو ہو جاتا ہوں مگر سخن دانی میں شانِ راز و نیاز قائم رہتی ہے۔ ہر چند میری شمشیر خوں آشام ہے مگر اسے میں نیام ہی میں رکھتا ہوں ؎

حسرتِ جلوۂ آں ماہ تمامے دارم
دست بر سینہ نظر بر لب بامے دارم
حسن می گفت کہ شامے نہ پذیرد سحرم
عشق می گفت تب و تاب دوامے دارم

نہ بہ امروز اسیرم نہ بہ فردا نہ بہ دوش
نہ نشیبے نہ فرازے نہ مقامے دارم

بادۂ رازم و پیمانہ گسارے گواہم
در خرابات مغاں گردش جامے دارم

بے نیازانہ ز شوریدہ نوائم مگذر
مرغِ لاہوتم و از دوست پیامے دارم

مجھے اُس ماہ تمام کے جلوہ و نظارہ کی حسرت دامن گیر رہتی ہے۔ دل پر ہاتھ اور بام پر نگاہ جمی رہتی ہے۔ حسن نے کہا جناب والا میری سحر شام پذیر نہیں ہے عشق نے کہا میری ذات میں بھی تب و تاب جاودانی ہے نہ میں، امروز، فردا اور دوش کا اسیر ہوں اور نہ ہی کوئی نشیب و فراز اور مقام رکھتا ہوں۔ میں بادۂ راز ہوں مجھے پیمانہ گسار کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ خرابات مغاں میں جام گردش میں رہتا ہے۔ خدارا میرے کلام شوریدہ سے غفلت شعاری مت برتو۔ میں مرغ لاہوتی ہوں اور دوست سے پیام جاں فزا لایا ہوں ؎

ز شعرِ دل کش اقبال می تواں دریافت
کہ درس فلسفہ می داد و عاشقی ورزید

اشعار اقبال کی صباحت خلد بریں کا کیا کہنا بادی النظر میں درس فلسفہ ہیں مگر در حقیقت شعلۂ عشق ہیں۔

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست
با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر
باز ایں نگر کہ شعلۂ در گیرم آرزوست

گفتند لب بہ بند و ز اسرار ما مگو
گفتم کہ خیر! نعرۂ تکبیرم آرزوست

اے تن آساں سہیل انکار! میں تو تیر و سنان، خنجر و شمشیر کا آرزو مند ہوں۔ میرے ساتھ کیوں آ رہا ہے میں تو شبیری عزم و ہمت کا متلاشی ہوں۔ آشیاں سازی کے لیے میری خس اندوزی کا وفور شوق دیکھ اور اس جذبۂ بے اختیار کو بھی دیکھ کہ میں شعلۂ آغوش بھی ہونا چاہتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں، حضرت! یہ فلسفۂ سخن وری بند کیجیے اور کچھ اسرار و رموز کی پردہ کشائی فرمایئے۔ میں کہتا ہوں، خیر، ایسا ہی سہی! تو سنو بھائیو میرا راز نعرۂ تکبیر ہے ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

میری کشت فکر میں دمادم مسائل تازہ بہ تازہ نو بنو نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ ایک عقدہ کو حل کرتا ہوں تو فوراً دوسری گتھی پیدا ہو جاتی ہے ؎

خیالم کو گل از فردوس چیند
جو مضمون غریبے آفریند

درلم در سینہ می لرزد چو برگے
کہ بر روے قطرۂ شبنم نشیند

میرے دل میں فردوس بریں کے خیالات جنم لیتے ہیں

انہی سے میں مضامین عالیہ کی تخلیق کرتا ہوں۔ میرا دل
برگ گل کی طرح ڈولتا ہے اور اسی پر شبنم پاشی ہوتی
ہے۔

زجان بے قرارم آتش کشادم
دلے در سینۂ مشرق نہادم
گلِ او شعلۂ زار از نالۂ من
چو برق اندر نہاد او فتادم

میری جان بے قرار نے آتش افشانی شروع کر دی
اور سینۂ مشرق میں نور بخشعور پیدا ہو گیا۔ اس خطہ
کی خاک میری شعلہ نوائی سے آتش زار ہے۔ میں نے
اس کی فطرت کو برق پاش کر دیا ؎

عجم از نغمہائے من جواں شد
ز سودایم متاع او گراں شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت
ز آواز درایم کارواں شد

عجم میرے نغمہائے حکیمانہ و نکتہ آفریں کے ذریعہ
پرشباب ہو گیا۔ میرے جوہر فکر و نظر نے اس کے متاع
غریب کو گراں مایہ کر دیا۔ یہاں کی مخلوق آشفتہ مغز
جنگلوں میں بھٹک رہی تھی مگر میری متاع گفتار نے انھیں
منظم و منضبط کارواں کی شکل دے دی۔ اور یورپ
کی ہمہ دانی خاک میں مل گئی ؎

نوا مستانہ در محفل زدم من
شرار زندگی بر گِل زدم من
دل از نور خرد کردم ضیا گیر
خرد را بر عیار دل زدم من

میں نے محفل میں سرود مستانہ بلند کیا اور اہل محفل
کے دلوں میں شرار زندگی پیدا ہو گیا۔ ان کے قلوب کو نور
خرد سے ضیا یاب کر دیا، خرد راہ گذر نہیں بلکہ خرد پردہ
خشگاف ہے جہاں روئید از مشت گل من
بیا سرمایہ گیر از حاصل من

میرے کلام کا ہر شعر گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔ آؤ اس
گنج گرانمایہ سے موتی رول لو ؎

دل من بے قرار از آرزوئے
درون سینۂ من ہائے و ہوئے
سخن اے ہمنشیں از من چہ خواہی
کہ من از خویش دارم گفتگوئے

کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میرا دل کتنا بے قرار رہتا ہے
میرے سینہ میں ہمیشہ ہنگامہائے ہو ہو کا تزاحم و کشاکش
بپا رہتا ہے۔ نئی نئی دنیائیں منکشف ہوتی ہیں۔ مجھ سے
تو لطف تکلم کا کیا خواہاں ہے۔ میں خود اپنے دل سے
ہم کلامی کی لذت میں محو رہتا ہوں ؎

دل من راز دان جسم و جاں است
نہ پنداری اجل بر من گراں است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است

میرا دل راز دان حیات ہے۔ موت میرے سامنے
ہیچ ہے۔ اگر ایک دنیا میری آنکھوں سے اوجھل ہو
جائے تو کیا غم ہے۔ میرے ضمیر میں سینکڑوں دنیائیں
آباد ہیں ؎

میان آب و گل خلوت گزیدم
ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم
جہاں را جز نگاہ خود ندیدم

میں نے اس جہاں آب و گل میں خلوت گزینی کی ہے

افلاطون و فارابی کا مطالعہ کیا مگر ان کی کفش برداری
نہیں کی اور نہ ہی اُن کے افکار کی نقالی کی۔ میں نے
دنیا کو اپنے نور بصیرت سے دیکھا ہے میری نگاہ
فراست اور فکر و نظر کا مرکز ہے ؎

ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود
خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود
ولیکن چو بخود نگریستم من
کران بے کران در من نہاں بود

ایک سیارہ سے دوسرے سیارہ کے مابین فاصلہ
لاانتہا موجود ہے۔ مگر خرد کی تنگ دامانی دیکھئے اُسے
ہر جگہ آسمان نظر آتا ہے۔ لیکن جب میں نے اپنی ذات
کا جائزہ لیا اور اپنی خودی کو دیکھا تو معلوم ہوا اس میں
کران بیکراں پوشیدہ ہے۔ یہ ہے عظمت و قوت و اقتدار
و تسلط آدم۔ اس کے جام جہاں نما میں ایام و قرون
غرق ہیں ؎

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

خرد کی خرمستیوں نے حرم میں بغاوت پیدا کر دی
ہے۔ اس لئے میں ولایت عشق سے سپاہ تازہ کی تشکیل
میں مصروف ہوں ؎

ہم چو نے نالیدم اندر کوہ و دشت
تا مقام خویش بر من فاش گشت

میری ذات میں شعور و آگہی اور خودی کا مقام اعلیٰ
و اوفیٰ یوں ہی فاش نہیں ہو گیا اس کے لیے مجھے علوم
و معارف کے ہفت خواں طے کرنا پڑے ہیں ؎

عشق من از زندگی دارد سراغ
عقل از صہبائے من روشن ایاغ

عشق نے مجھ پر راز حیات فاش کر دیا ہے۔ اور
خرد کو میری برق خودی نے روشن کر دیا ہے ورنہ ممکن
نہ تھا کہ میں نکتہ ہائے خاطر افروز کہہ پاتا۔ مسلمانوں میں
بیداری میرے ہی کلام سے ہوئی ہے۔ اُنھیں میرے
فانوس خیال نے روشن ضمیری بخشی ہے اور ان کے جمود
و تعطل کا خاتمہ ہوا ہے

نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت
با مسلماں حرف پرسوزے کہ گفت

یاد رکھو!

تا نہ رمز لا الٰہ آید بدست
بند غیر اللہ را نتواں شکست

نکتہ گویم از مردان حال
اُمتاں را "لا" "جلال" "الا" جمال
لا و الا احتساب کائنات
لا و الا فتح باب کائنات

جب تک لا الٰہ کا گوہر یک دانہ ہاتھ نہیں آتا
دنیا میں عظمتوں اور فتح مندیوں کا جلوہ نظر آنے والا
نہیں۔ مردان حال میں کیا جوہر پنہاں تھا؟ بتاؤں؟
اُمتوں کے لئے لا جلال اور الا جمال کا گُر اُنھیں معلوم
تھا۔ لا و الا احتساب کائنات ہیں۔ تسخیر کائنات کے لیے
لا و الا باب الفتح ہیں ؎

گم شدم اندر ضمیر کائنات
چوں رباب آمد بجستم من حیات

میں جب ضمیر کائنات کے عرفان حقیقت میں محو
ہوا تو مجھ پر اسرار حیات فاش ہو گئے۔

(باقی آئندہ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۴۹	اپنا موج میں	ادارہ	۲/۵۰
۵۰	انوار جدید خط وکتابت	خلیق احمد علوی	-/۵۰
۵۱	ایک جان تین قالب	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۵۲	اُلفت	〃	۵/۵۰
۵۳	آغازِ سحر	〃	۴/-
۵۴	امین آباد	〃	۴/-
۵۵	انشائے خطوط نویسی حصہ اوّل	مشیر احمد علوی	-/۴۰
۵۶	اچھی کہانیاں	شمس الدین نوری	-/۵۰
۵۷	انشائے خطوط نویسی حصہ دوم		-/۷۵
۵۸	ایجادوں کی باتیں	مصطفےٰ احسن رضوی	۳/-
۵۹	اچھی کہانیاں حصہ اوّل	شمس الدین نوری	-/۵۰
۶۰	〃 حصہ دوم	〃	-/۵۵
۶۱	〃 حصہ چہارم	〃	-/۶۵
۶۲	ادب کا مقصد	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۴/۵۰
۶۳	اسلامی نظمیں	محمد حسین علوی شمس	-/۴۵
۶۴	اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں	عبدالماجد دریابادی	۳/۵۰
۶۵	اوراقِ گل	اخگر مشتاق	۱/-

(ب)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۶۶	بابائے اردو عبدالحق	عبداللطیف اعظمی	۷/-
۶۷	بستانِ حرم (جدید نعتیہ کلام)	زائر حرم حمید صدیقی	۳/-
۶۸	شہیدِ محبت بوٹا سنگھ	خان محبوب طرزی	۴/-
۶۹	بزمِ بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	۴/۵۰
۷۰	بکٹ کہانی	ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۵/-
۷۱	بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی کاکوروی	۷/۵۰
۷۲	بہشتی ثمر (حصہ اوّل و دوم) خلاصۂ بہشتی زیور	مولانا تھانوی	۳/۸۰
۷۳	بانیٔ اسلام	علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ	۵/۷۵
۷۴	بشریتِ انبیاء	عبدالماجد دریابادی	۴/-

(پ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۷۵	پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۳/-
۷۶	پیاری باتیں	محسن کاکوروی	-/۴۰
۷۷	پھولوں کے انبار (ناول)	منظر سلیم	۴/۷۵
۷۸	پیسہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ	ڈاکٹر محمد حسن	۶/-
۷۹	پاگل خانہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۳/۲۵
۸۰	پیغام	طاہر دیالپوری	۳/-
۸۱	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی	۸/-
۸۲	پردیسی کے خطوط (حصہ اوّل)	مجنوں گورکھپوری	۵/-

(ت)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۸۳	مختصر تاریخ ادبِ اردو (فروغ اردو ایڈیشن)	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۱۲/-
۸۴	تصویر درد معہ تشریحات و ترجمہ	فرید احمد علوی	۱/-
۸۵	تحریریں مجموعہ مضامین	ڈاکٹر گیان چندر	۷/-
۸۶	تاریخی جائزے	ڈاکٹر محمد یاسین	۳/۰
۸۷	تنقیدی تجزیے	کاظم علی خاں	۵/-
۸۸	تعارف تاریخ اردو ترمیم شدہ جدید ایڈیشن	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۷/-
۸۹	تاجدار مدینہ	اقبال صدیقی	-/۳۰
۹۰	تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر	۷/۵۰
۹۱	تنقید و تحلیل	شبیہ الحسن نونہروی	۶/۵۰
۹۲	تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن)	سید احتشام حسین	۷/-

۹۳۔ تنقیدی نظریات جلد اول سید احتشام حسین ۱۰/-
۹۴۔ " " جلد دوم " ۱۰/-
۹۵۔ تنقیدی اور عملی تنقید " ۷/-
۹۶۔ تنقیدی اشارے (جدید اڈیشن) آل احمد سرور ۵/-
۹۷۔ ترانہائے خیام ڈاکٹر رغیب حسین ۴/-
۹۸۔ تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص محمد حسین شمس ۳/-
۹۹۔ تصویر درد معہ ترجمہ علامہ اقبال ۱/-

(ٹ)

۱۰۰۔ ٹیگور نادم سیتاپوری ۳/-
۱۰۱۔ ٹھیکرے کی مانگ صدیقہ بیگم سیوہاری ۲/-

(ث)

۱۰۲۔ ثنائے حبیب و نعتیہ کلام بہزاد لکھنوی ۲/۲۵

(ج)

۱۰۳۔ جان غالب محمد حسین شمس علوی ۳/-
۱۰۴۔ جائزے نور سیوانی ۳/-
۱۰۵۔ جواہرات اسمٰعیل ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱/۵۰
۱۰۶۔ جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء) فروغ اردو ۳/-
۱۰۷۔ " " نمبر ۲ " " ۳/-
۱۰۸۔ جوئے رواں مجموعہ کلام حامد اللہ افسر ۳/۵۰
۱۰۹۔ جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول) ڈاکٹر اثر بلگرامی ۳/۵۰
۱۱۰۔ جگ ہنسائی (مجموعہ افسانہ) قیصر تمکین ۲/۵۰
۱۱۱۔ جلوے معین الدین دردائی ۲/-
۱۱۲۔ جمیلہ لوائری (ناول) خان محبوب طرزی ۲/۵۰
۱۱۳۔ جگر نمبر اول سید احتشام حسین ۸/-

(چ)

۱۱۴۔ چوتھی بہن، مجموعہ افسانہ مسیح الحسن رضوی ۳/-

(ح)

۱۱۵۔ حیات فضل الحق خیر آبادی ۱/۵۰
۱۱۶۔ حالی بحیثیت شاعر (جدید اڈیشن معہ اضافہ) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۶/-
۱۱۷۔ حسرت موہانی عبدالشکور ۴/-
۱۱۸۔ حجاج بن یوسف جرجی زیدان ۴/۵۰
۱۱۹۔ حکیم نباتات وزیر خاں لنگراں ۲/-
۱۲۰۔ حبیبۂ غالب سعادت علی صدیقی ۲/۵۰

(خ)

۱۲۱۔ خضر راہ مع ترجمہ علامہ اقبال ۱/-
۱۲۲۔ خطبات ماجدی یا سیرت نبوی عبدالماجد دریابادی ۳/۵۰
۱۲۳۔ خضر راہ معہ ترجمہ علامہ اقبال ۱/-
۱۲۴۔ خلاصہ شریف زادہ مرزا رسوا ۱/۲۵
۱۲۵۔ خلاصہ روح تنقید ۱/-
۱۲۶۔ خلاصہ جواہر عروض ۱/-
۱۲۷۔ خبطی مزاحیہ محمد علی واحد معہ مقدمہ شوکت تھانوی ۱/۵۰
۱۲۸۔ خوش بختی کی تلاش احسن اظفر علی رائے ۲/-
۱۲۹۔ خلاصہ شعر الہند حصہ دوم ۱/-
۱۳۰۔ خلاصہ المیزان /۷۵

(د)

۱۳۱۔ دیوان آبرو ڈاکٹر محمد حسن ۲/-
۱۳۲۔ دلچسپ کہانیاں مسعود عالم /۵۰

۱۷۲۔ شرح سنگ گہر — عبدالقوی دریابادی — ۵/-
۱۷۳۔ شاہ غمگین حضرت جی — پروفیسر عبدالشکور — ۳/-
۱۷۴۔ شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — ۴/-
۱۷۵۔ شرح ادب پارے نظم — ڈاکٹر محمود الحسن — ۴/-
۱۷۶۔ شرح منتخبات فارسی — عبدالقوی دریابادی — ۵/-
۱۷۷۔ شبلی نعمانی — انوار الحسن نورانی — ۴/-
۱۷۸۔ شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن) نظم طباطبائی — ۷/۵۰
۱۷۹۔ شہری اور سماجی زندگی — عبدالعلی قدوائی — ۰/۸۰
۱۸۰۔ " " " " — ۰/۹۵
۱۸۱۔ " " " " — ۱/-
۱۸۲۔ " " " " — ۱/-
۱۸۳۔ شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ امیر احمد علوی — ۳/۵۰
۱۸۴۔ شعر العجم، حصہ اول۔ دوم، سوم، چہارم، پنجم شبلی نعمانی — ۴/-
۱۸۵۔ شرح نثر امروز ایران — احسن الظفر بی اے — ۳/-
۱۸۶۔ شرح امروز ایران — " — ۳/۵۰
۱۸۷۔ شمع و شعر — علامہ اقبال — ۰/۵۰
۱۸۸۔ شرح ضمیر مناجات وزیر خاں — نیر مسعود — ۱/۲۵
۱۸۹۔ شرح انتخاب قصائد اردو و رباعیات — [illegible] — ۴/-
۱۹۰۔ شرح شعر پاستان حصہ اول — ڈاکٹر انوار الحسن — ۳/-
۱۹۱۔ شرح تماشہائے نیام — حکیم عبدالقوی — ۲/-
۱۹۲۔ شرح مفتاح العربیہ — عبدالقوی دریابادی — ۱/۵۰
۱۹۳۔ شرح نصاب فارسی — ۶/-
۱۹۴۔ شرح شعر پاستان دوم — احسن الظفر — ۳/-
۱۹۵۔ شرح گلہائے ادب — ۳/-
۱۹۶۔ شرح آئینہ نظم اردو — ۳/-
۱۹۷۔ شرح نثر فارسی امروزہ — ۳/-

۱۹۸۔ شرح آئینہ نثر اردو — حسین قدوائی
۱۹۹۔ شرح غنچہ وگل
۲۰۰۔ شرح شعر فارسی کلاسیک — احسن الظفر
۲۰۱۔ شرح ہماری زبان اردو درجہ ۸ — حسین قدوائی

(ص)

۲۰۲۔ صید ہدف (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت
۲۰۳۔ صحیفۂ محبت، مہدی افادی کے خطوط ڈاکٹر محمود الٰہی

(ط)

۲۰۴۔ طرزی بمر (مکاتیب) — مرتبہ [illegible]
۲۰۵۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہو — [illegible]
۲۰۶۔ طلسم اسرار (ڈرامہ) — [illegible]

(ع)

۲۰۷۔ عذرا (ناول) — اے لکھ عابد حسین
۲۰۸۔ عکس اور آئینہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) — سید احتشام حسین
۲۰۹۔ عبد الماجد دریابادی نمبر

(غ)

۲۱۰۔ غالب کا تنقیدی شعور — اخلاق حسین عارف
۲۱۱۔ غالب نام آورم — نادم سیتاپوری
۲۱۲۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر — سید امیر حسن نورانی
۲۱۳۔ غالب کی تخلیقی تخیل — تمہید شفیق ایزدی
۲۱۴۔ غنچہ وگل — سید محمود الحسن رضوی — ۳/۵۰

۲۱۵- غالب کے کلام میں الحاقی عناصر — نادم سیتاپوری — ۶/-
۲۱۶- غنیمی دروازہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/۵۰
۲۱۷- غزلیات نظیری — ۱/۵۰
۲۱۸- غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید ایڈیشن) ذکی کاکوروی — ۲۵/-

(ف)

۲۱۹- فروق (لغت) — ظاہر حسن علوی — ۴/۵۰
۲۲۰- فن خطابت یعنی اُستاد تقریر — کتب مصطفٰے ایند کمپنی — ۱۵/-
۲۲۱- فیروزہ — خان محبوب طرزی — ۱/-
۲۲۲- فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی — نادم سیتاپوری — ۷/-
۲۲۳- فلسفۂ اقبال — عبدالقوی دریابادی — ۴/۵۰
۲۲۴- فلسفی ابن رشد — مائل ملیح آبادی — ۳/۵۰
۲۲۵- فروغ جام مجموعہ کلام — غفور داعدی — ۴/-
۲۲۶- فغان محسن — محسن کاکوروی — ۴/-
۲۲۷- فارسی آموز — مشیر احمد علوی — ۱/-
۲۲۸- فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) پروفیسر کلیم الدین احمد — ۷/-

(ق)

۲۲۹- قدسیجے۔ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں — غلام احمد فرقت — ۶/-
۲۳۰- قصائد ظہیر فاریابی — ۲/-
۲۳۱- قصائد مومن۔ مع شرح — ظہیر احمد صدیقی — ۶/۵۰
۲۳۲- قطرے سے گہر ہونے تک — صالحہ عابد حسین — ۷/-
۲۳۳- قصص و مسائل — عبدالماجد دریابادی — ۳/-
۲۳۴- قصائد قاآنی (فارسی) — ۱/-
۲۳۵- قومی ادب نثر و نظم — حامد اللہ آفسر — ۴/۷۰
۲۳۶- قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) — خان محبوب طرزی — ۳/-

(ک)

۲۳۷- کلیات اقبال — علامہ اقبال — ۸/-
۲۳۸- کیسر اور کاہی — بدرالدین طیب جی — ۳/-
۲۳۹- کف فروش (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۵/۵۰

(گ)

۲۴۰- گاندھی نمبر — ۲/-
۲۴۱- گلدستۂ (فارسی) اول و دوم — محمد غوث بیگ سیفی — ۲/۲۵
۲۴۲- گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدید — -/۷۰
۲۴۳- گلہائے ادب — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/-
۲۴۴- گاندھی جی کے ساتھ — حامد اللہ آفسر — ۱/۵۰

(ل)

۲۴۵- لوائح جامی مع مقدمہ — عبدالاحد خاں خلیل — ۱/۵۰
۲۴۶- لال قلعہ — مائل ملیح آبادی — ۲/-
۲۴۷- لب بام — عادل رشید — ۶/-
۲۴۸- لسانیات اور اُردو — سید محمود الحسن رضوی — ۳/۵۰

(م)

۲۴۹- مرقع اقبال — عصمت فاطمہ علویہ — ۱۲/-
۲۵۰- مزاحیہ شرح دیوان غالب اُردو — غلام احمد فرقت — ۸/۵۰
۲۵۱- محسن کاکوروی نمبر — ۳/۵۰
۲۵۲- مسلمان اور کانگریس — ابوالکلام آزاد — ۳/۵۰
۲۵۳- مرثیہ نگاری اور میر انیس — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۵/-
۲۵۴- مضامین فرحت حصہ اول — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۵/-
۲۵۵- 〃 〃 حصہ دوم — 〃 — ۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۵۶	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۳/-
۲۵۷	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۲۵۸	موسم گل (ناول)	عادل رشید	۷/-
۲۵۹	مجبور	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۲۶۰	مضامین جدید	محمد ہادی	۱/۷۵
۲۶۱	مثنوی سحر حلال فارسی معہ مقدمہ	قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۲۶۲	مطالعہ	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۶۳	مولوی نذیر احمد کی کہانیاں	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۲۶۴	معرکہ روم دیونان	صادق سردھنوی	۶/-
۲۶۵	مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۲۶۶	مطالعہ		۶/-
۲۶۷	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
۲۶۸	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/-
۲۶۹	مثنوی چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۷۰	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصابی الے حالی	۲/۵۰
۲۷۱	مرثیہ غالب	حالی	-/۲۵
۲۷۲	محبوبہ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۷۳	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۷۴	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	-/۴۰
۲۷۵	انتخاب فسانہ آزاد یعنی	سرشار لکھنوی	
۲۷۶	مہاراج بلی	ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۲۷۷	مسٹر ملا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	۲/۷۵
۲۷۸	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۲۷۹	مصباح بلاغت معہ مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۲۸۰	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۲۸۱	مقدمات و مقالات	عبد الاحد خان خلیل	۵/۵۰
۲۸۲	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۳/-
۲۸۳	مفتاحات العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۸۴	نثر امروز ایران	ڈاکٹر رغیب حسین	-/۷
۲۸۵	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۲/-
۲۸۶	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۲۸۷	نقش حالی دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
۲۸۸		شجاعت علی سندیلوی	۴/-
۲۸۹	نغمہ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۹۰	نقوش الہند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	-/۷۵
۲۹۱	نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۰/-
۲۹۲	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۲۹۳	نسرین و نسترن	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۹۴	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۲۹۵	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۲۹۶	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبد الماجد دریابادی	
	نوائے سرور جہان آبادی	ڈاکٹر حکم چند نیر	۷/-
۲۹۷	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۹۸	نوروز	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۹۹	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدید	آل احمد سرور	۱۰/-
۳۰۰	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۲/۵۰
۳۰۱	نیلم	انتصار حسین	۳/-
۳۰۲	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۰۰	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۵/-
	منشی نولکشور جبسہ		۲/۵۰
	(و)		
۳۰۱	وعدہ فردا	انگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-
	(ی)		
	ہمارے گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۵/-
۳۰۰	ہندی کے مسلمان شعرا	میر حسن نورانی	۱/۲۵
۳۰۷	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۱۰	[illegible]	[illegible]	۱/۹۰
۳۱۱	ہندوستانی ادبیات [illegible]		۱/۵۰
۳۱۲	ہمارا سماج ۱	[illegible]	-/۸۰
۳۱۳	" ۲	"	-/۹۵
۳۱۴	" ۳	"	۱/-
۳۱۵	" ۴	"	۱/-
۳۱۶	یادگار غالب	مولانا حالی	۴/-
۳۱۷	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳۱۸	یادگار اتیس		
		امیر احمد علوی	۴/-

ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اردو نمبر ۳۷ (امین آباد پارک لکھنؤ)

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کیساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی، ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمائیے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

جلد (۲۴) شمارہ (۸)
رجسٹرڈ نمبر ایل۔ ڈبلیو / این ، پی ۹۳
دفتر فون : ۲۶۱۳۵
فون رہائش گاہ ۲۶۶۵۶

اِدارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان
بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین (مرحوم)

فروغ اُردو لکھنؤ

ایڈیٹر :
محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

مجلس ادارت :
۱۔ عبدالقوی دریابادی بی۔ اے
۲۔ سعادت علی صدیقی

جلد (۲۴) دسمبر ۱۹۷۶ء شمارہ (۸)

ترتیب

زرسالانہ اعزازی دس روپیے
عوام سے : آٹھ روپیے
فی پرچہ : ۷۰ پیسے
پتہ :
ادارہ فروغ اُردو ۳۳ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ میں چھپوا کر دفتر فروغ اُردو لکھنؤ ۳۳ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

اپنی باتیں

ہم برابر اس پر زور دیتے رہے ہیں کہ ہندوستان میں اصولاً اُردو کو ہر طرح کے حقوق معاشرتی اور ادبی ملنے چاہیئے ہندوستان کی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی اور صدر جمہوریۂ ہند فخرالدین علی احمد بھی اپنی تقاریر میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی ہمہ گیر مقبولیت کا اظہار فرمایا کرتے ہیں اسی طرح جب کہ ۶ر نومبر ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ میں صدر جمہوریہ اردو اکاڈمیوں کی کانفرنس کا افتتاح فرما رہے تھے تو انھوں نے اس امر پر زور دیا کہ ملک کی سیاسی قیادت کا ذہن اُردو زبان کے بارے میں بالکل صاف ہے ملک کی مرکزی اور ریاستی سطح کی سیاسی قیادت کو اُردو سے نہ صرف ہمدردی ہے بلکہ وہ اس کو فروغ دینے کی ہر ممکن اور بھرپور کوشش کرنا چاہتی ہے لیکن انھوں نے سرکاری پالیسی پر عمل درآمد کرنیوالوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے ذہنوں کو صاف کرلیں اور اردو سے منصفانہ رویہ اختیار کریں اسی کے ساتھ صدر جمہوریہ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم کیا تعلیم کے میدان میں اور کیا علمی و ادبی سرگرمیوں کے میدان میں بہر صورت اُردو کا فروغ چاہتے ہیں اس کے علاوہ صدر جمہوریہ نے یہ بھی فرمایا کہ اُردو زبان کو عوام میں مقبول کرنے اور قومی زندگی میں اسے اس کا جائز مقام دلانے کیلئے ہمیں اپنے دماغ اور ذہن کو صاف کرنا ہوگا کیوں کہ یہ کوئی باھری زبان نہیں ہے اس کا مذہب سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے وہ اس ملک میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی مگر افسوس یہ ہے کہ ان جذبات کے ہوتے ہوئے

کیوں نہیں اُردو زبان کو دستوری اور قانونی حق دیا جاتا صدر جمہوریہ اور شریمتی اندرا گاندھی آئینی حقوق پر عمل کرانے میں کیوں پس وپیش فرماتے رہتے ہیں اگر وہ قانونی حیثیت سے یہ حکم نافذ فرمادیں کہ اردو زبان کو اب وہی حقوق دیئے جارہے ہیں کہ جو آزادی سے قبل اور ۱۹۴۷ء سے پہلے اس زبان کو حاصل تھے تو خود بخود تمام تنازعہ ختم ہو جائیں گے اس موقعہ پر ہمارے صوبہ اُتر پردیش کے گورنر ڈاکٹر چنا ریڈی نے جن خیالات کا اظہار فرمایا اگر ان پر عمل درآمد شروع ہوجائے تو اس گتھی کے سلجھانے میں نہ تو وقت ضائع ہوگا اور نہ درد سری کی منزلوں سے محبان اُردو کو گذرنا ہوگا کیونکہ گورنر صاحب کی یہ رائے کہ اُردو زبان کو معاشرتی پہلو سے مقید کردیا جائے تو خود بہ خود اُتر پردیش کا ہر متنفس اُردو زبان کی تعلیم اور اس کے فروغ کیلئے خود بخود جدوجہد کرنے لگے گا اور اس زبان کی ترویج و اشاعت میں جو رکاوٹیں ہیں وہ خود بخود ختم ہو جائیں گی اسی لئے مختلف صوبوں کی اردو اکاڈمیوں کے وہ ذمہ دار حضرات جوکہ اس کانفرنس میں شرکت کیلئے مختلف صوبوں سے شہر لکھنؤ میں تشریف لائے تھے اُنھوں نے بھی متحدہ طور پر رزولیوشن پاس کیا کہ اُردو زبان کے تحفظ و بقا و ترقی کیلئے کل ہند اکاڈمیوں کا یہ اجلاس حکومت ہند اور متعلقہ ریاستی حکومتوں سے پر زور سفارش کرتا ہے کہ دستور ہند کی زبان سے متعلق دفعات کے تحت پنجاب، ھریانہ، ہماچل پردیش۔ دہلی۔ اتر پردیش۔ بہار۔ مغربی بنگال، آندھرا کرناٹک، مہاراشٹر، گجرات اور راجستھان میں اُردو کو بھی علاقائی اور دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور اس مقصد کے حصول کیلئے جلد از جلد آئینی اقدامات کئے جائیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے صدر جمہوریہ اور شریمتی اندرا گاندھی اس متحدہ آواز کی اہمیت کے پیش نظر جلد از اردو زبان کو متعلقہ صوبوں کیلئے دوسری سرکاری زبان کا قانونی حق دے کر محبان اُردو کی دلی تمناؤں کی تکمیل کرکے اُن کے دلوں کو جیت لیں گی۔

شاہدِ رعنا

قمر بسوانی

شکلِ صبوحی، گردن مینا، ہاتھ ترے پیمانے ہیں
زلفِ سیہ گھنگھور گھٹائیں، آنکھیں دو میخانے ہیں

اتنا سُن کر ظالم دُنیا جانے کیا الزام دھرے
کیسے کہیں اے شاہدِ رعنا ہم تیرے دیوانے ہیں

ہم نے دیکھا سن بڑھتے ہی دست و پا تک روٹھ گئے
کوئی نہیں سنسار میں اپنا سب کے سب بیگانے ہیں

نظروں سے ہونٹوں کا تبسّم دل کے داغ چھپائے ہے
میرے نگر میں جھانک کے دیکھو کتنے ہی ویرانے ہیں

اوروں پر مئے کی بارش ہے جام ہمارا خالی ہے
اتنے پر بھی ہم ساقی کو اپنا ساقی جانے ہیں

حسن کی جانب آنکھ اُٹھی تھی دُنیا پیار کو لے دوڑی
سُست قدم سچّائی کے آگے تیز قدم افسانے ہیں

ایک قمر کا خانۂ دل کیا کم عمری یہ کہتی ہے
حسن کو قدِ آدم ہو کر لاکھوں کعبے ڈھانے ہیں

میرؔ سے منسوب ایک غزل کی حقیقت

از: ظہیر علی خاں شکیبؔ

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد

میر تقی میرؔ ان اساتذہ میں سرِفہرست نظر آتے ہیں۔ جن کے کلام میں ان کے مخصوص رنگ سے ملتا جلتا غیر معروف شعراء کا کلام یا آوارہ گرد اشعار کو آسانی شامل کیا جاتا رہا ہے۔ ایسا ہی ایک شعر یہ ہے۔ جو میرؔ سے غلط طور پر منسوب ہوگیا تھا۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اسکے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

حالاں کہ یہ شعر رام پور کے ایک شاعر فکرؔ یزدانی مرحوم شاگرد حضرت رازؔ یزدانی کی غزل کا مقطع تھا۔ راز صاحب کے توجہ دلانے پر نگاریں کچھ بحث بھی چلی تھی۔ اور بالآخر یہ مسئلہ طے ہوا کہ یہ میرؔ کا شعر نہیں، بلکہ کسی نے فکرؔ تخلص کی جگہ میرؔ کر دیا ہے۔ فکرؔ نے یہ غزل تقریباً ۳۵۔۴۰ سال قبل صاحبزادہ محمود علیخاں رزم کے دولت کدہ محلہ راجدوارہ رام پور پر منعقدہ ایک طرحی مشاعرہ میں پڑھی تھی۔ اور آج بھی ان کی بیاض میں موجود ہے۔ ایک مرتبہ مذکورہ بالا مقطع کو سن کر مولانا عرشی مدظلہٗ نے پہلے مصرعہ پر مندرجہ ذیل اصلاح فرمائی تھی۔

اٹھے وہ بزم سے اتنا تو فکرؔ نے دیکھا

رازؔ یزدانی مرحوم نے بھی مولانا کی اصلاح کو پسند کیا تھا۔ اور حقیقتاً انھیں الفاظ سے محبوب کی تعریف بھی شعر سے نکلتی ہے۔ ورنہ پہلی شکل سے تو وہ مثل یاد آتی ہے کہ کالے کے سامنے چراغ نہیں جلتا ایک دوسرا شعر جو میرؔ کے تخلص کے ساتھ آج بھی لوگوں کو پڑھتے سنا جاتا ہے۔ حسب ذیل ہے ؎

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس شعر کا مصرعہ ثانی ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ لیکن اتفاق سے یہ بھی رام پور ہی کے ایک شاعر کا شعر ہے۔ جو میرؔ کے بعد اور قائمؔ چاند پوری کے

شاگرد تھے۔ یعنی نواب محمد یار خاں امیر (متوفی ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء)
برادر اصغر نواب فیض اللہ خاں بہادر والی رامپور۔
ان کا شعر اس طرح ہے ؎

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ کو دلِ ناتواں نے خوب کیا

یہ تو رہا اشعار کا معاملہ اب ایک پوری غزل کے بارے میں عرض کرنا ہے جسے بالعموم لوگ میر سے منسوب کرکے لطف اندوز ہوتے ہیں اور جس کا مطلع یہ ہے ؎

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

چوں کہ اس غزل کا مزاج اور اندازِ بیان میرؔ کے مخصوص رنگ کے عین مطابق ہے، نیز اس کے مقطع میں میرؔ کا تخلص بھی موجود ہے۔ لوگوں نے اسے کلامِ میر سمجھ لیا ہے اس غلط فہمی کے پھیلانے میں ہند و پاک کے ریڈیو اسٹیشنوں نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ غالباً سب سے پہلے پاکستان کے مشہور گلوکار مہدی حسن نے اس غزل کو سحرکارانہ طور پر پیش کرکے خواص و عام میں مقبول بنایا اس کے بعد ہندوستانی ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی اسے میرؔ کے نام سے پیش کیا جانے لگا ہے۔ اس غزل کے بقیہ اشعار عام طور پر اس طرح مشہور ہیں ؎

منہ پہ رکھ دامنِ گل روئیں گے مرغانِ چمن
ہر روش خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی تجھے میری وفا میرے بعد

کیا عجب مرقدِ لیلیٰ سے جو نکلے یہ صدا
میرے مجنوں ترا کیا حال ہوا میرے بعد

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

شاید ریڈیو کے منتظمین کی توجہ اس امر کی جانب کسی نے مبذول کرانے کی کوشش ہی نہیں کی کہ یہ غزل میر تقی میر کی نہیں ہے۔ یہی نہیں، میر نے اس زمین میں سرے سے کوئی غزل کہی ہی نہیں ہے۔ ان کے قلمی اور مطبوعہ کلیات میں ایک شعر بھی اس زمین میں مجھے نظر نہ آیا۔ دراصل مذکورہ بالا غزل کئی شعرائے قدیم کی غزلیات کا انتخاب ہے۔ مطلع اور اس کے بعد کا شعر منور خاں غافل لکھنوی شاگرد مصحفی کی غزل کے ہیں بقیہ اشعار مصحفی ہی کے ایک دوسرے نامور شاگرد نواب محمد تقی خاں ہوس کے ہیں۔ اصل غزلیات میں بعض لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پہلے غافل کی غزل ملاحظہ ہو۔ جو کہکشاں مرتبہ مہدی علی خاں رامپوری مخطوطہ مخزونہ رضا لائبریری اور دیوانِ غافل مطبوعہ (ص۲۵) میں موجود ہے۔

(۱)

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی (مری جا) میرے بعد

(۲)

منہ پہ (لے) دامنِ گل روئیں گے مرغانِ چمن
ہر روش خاک اڑائے گی صبا میرے بعد

(۳)

چاک اس غم میں گریباں کیا ہے میں نے
کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد

(۴)

اب تو ہنس ہنس کے (لگاتا ہے وہ مہندی لیکن)
خون رلائے گا اسے رنگ حنا میرے بعد

(۵)

دوستی کا بھی تجھے پاس نہ آیا ہے ہے
تو نے دشمن سے کیا میرا گلا میرے بعد

(۶)

سن کے مرنے کی خبر یار میرے گھر آیا
یعنی مقبول ہوئی میری دعا میرے بعد

(۷)

قتل تو کرتے ہو پر خوب ہی پچھتاؤ گے
مجھ سا ملنے کا نہیں اہل وفا میرے بعد

(۸)

گرم بازاری اُلفت ہے مجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نام وفا میرے بعد

(۹)

شرط یاری یہی ہوتی ہے کہ تو نے غافل
بھول کر بھی نہ مجھے یاد کیا میرے بعد

اس غزل کے مطلع کا مصرع ثانی اس طرح مشہور ہے

"نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد"

اس میں لفظ "کوئی" کا استعمال عجیب معنوی اُلجھن کا سبب بنتا ہے۔ اور میر کا شعر یاد کرتے ہوئے ذی علم حضرات تک بھی ایک مہمل روایت کی تاویل کر کے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن غافل کے دیوان کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ اصل مصرعہ میں "کوئی جا" کی جگہ "میری جا" ہے۔ دراصل شاعر نے سیدھی سی بات کہی تھی کہ قیس کے سجادہ نشین ہو جانے سے میری جگہ پُر ہو گئی۔ مذکورہ بالا غلط تصرف آج سے تقریباً سوا سو سال پیشتر ہو چکا تھا۔ جیسا کہ آئندہ بحث سے واضح ہو جائیگا۔

غافل کے دیوان میں شعر ۲ بھی مروجہ شکل سے مختلف صورت میں ملتا ہے۔ یعنی "منھ پر رکھ" کی جگہ "منھ پہ لے" اور "اڑائے گی" کی جگہ "اڑا دے گی" ان اختلافات سے کوئی معنوی فرق تو پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ قدیم زبان کا لطف مفقود ہو جاتا ہے۔

اس زمین میں ہوسؔ کی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں جو ان کے قلمی دیوان مخزونہ رضا لائبریری سے نقل کئے گئے ہیں ؎

(۱)

بیکسی ہی نے نہ دنیا کو تجا میرے بعد
غم بھی مرقد پہ مرے بیٹھ رہا میرے بعد

(۲)

تیز (رکھیو) سر ہر خار کو اے دشتِ جنون
شاید کوئی آ جائے آبلہ پا میرے بعد

(۳)

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی (تمہیں) میری وفا میرے بعد

(۴)

اپنے مرنے کا مجھے غم نہیں پر یہ غم ہے
کون ہوگا ہدف تیر بلا میرے بعد

(۵)

کیا عجب (مدفن) لیلیٰ سے جو نکلے یہ صدا
میرے مجنوں ترا (کیا) حال ہوا میرے بعد

(۶)

میتی زندان میں دی جان بلا سے میرے
باغ عالم میں رہی گو کہ قضا میرے بعد

(۷)

بسکہ باعث تھا میں اس شوخی کی بدنامی کا
سجدۂ شکر کیا اس نے ادا میرے بعد

(۸)

اٹھ گیا میں جو جہانِ گزراں سے تو ہوس
خاک چھانے گی بہت یادِ صبا میرے بعد

غزل کی مروجہ شکل اور دواوینِ غافل و ہوس کی روایت میں جو لفظی اختلافات سامنے آجاتے ہیں وہ خود بھی خاصے قدیم ہیں اور تقریباً سوا سو سال پیشتر ہو چکے تھے چنانچہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ "بیاض طوطی جان" کے اندر ایک ہوس کے نام سے ملتی ہے۔ جو اس طرح ہے ۔

(۱)

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی (کوئی جا) میرے بعد

(۲)

(چاک کرتا ہوں اسی غم میں گریبان کفن)
کون کھولے گا ترے بند قبا میرے بعد

(۳)

اب تو ہنس ہنس کے لگاتی ہے حنا ہاتھوں میں)
خون رلائے گا (تجھے) رنگ حنا میرے بعد

(۴)

تیز (رکھتا) سر ہر خار کو اے دشتِ جنون
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

(۵)

جیتے جی قدر بشر کی نہیں ہوتی پیارے
یاد آئے گی (تجھے) میری وفا میرے بعد

---

(۶)

اپنے مرنے کا مجھے غم نہیں پر یہ غم ہے
کون ہوگا ہدفِ تیرِ بلا میرے بعد

(۷)

کیا عجب (مرقدِ) لیلیٰ سے جو نکلے یہ صدا
میرے مجنوں ترا (یہ) حال ہوا میرے بعد

(۸)

اُٹھ گیا میں جو جہانِ گزراں سے تو ہوس
خاک چھانے گی بہت بادِ صبا میرے بعد

"بیاض طوطی جان" کی غزل کے اشعار ۱ تا ۳ غافل کے اور بقیہ اشعار ۴ تا ۸ ہوس کے ہیں۔ چونکہ اس بیاض میں ہوس کا مقطع انتخاب کیا گیا ہے اس لئے مکمل غزل ہی ہوس کی قرار دی گئی۔ ہم طرح غزلوں میں کبھی کبھی یہ صورت پیش آجاتی ہے۔ خصوصیت سے گانے والے اس کے ذمہ دار ہوا کرتے ہیں اور اس میں ان کے سامعین کی پسند و ناپسند کا دخل ہوتا ہے۔ اتفاق سے طوطی جان بھی ایک مغنیہ تھیں جن کا تعلق نواب یوسف علیخاں ناظم والی رام پور (متوفی ۱۸۶۵) کے دربار سے تھا۔ مذکورہ بیاض میں اس دور کی مقبول و معروف اُردو فارسی غزلیں ٹھمریاں اور ٹپے نقل ہوئے ہیں۔ نیز طوطی جان کا ذاتی کلام بھی موجود ہے۔ نواب موصوف نے ان کو اپنے حرم میں داخل کرکے سردار دلہن کے خطاب سے نوازا تھا۔ اور نواب حیدر علی خاں بلتی والے جو مشہور ماہر موسیقی مانے جاتے ہیں۔ طوطی جان ہی کے بطن سے تھے۔ ان کے شاگردوں میں استاد وزیر خاں اور خود ان کے بیٹے صاحبزادہ سعادت علی عرف چھمّن صاحب ہندوستان گیر شہرت کے موسیقی داں ہوئے ہیں۔ طوطی جان کا مقبرہ خسرو باغ رام پور کے قریب واقع ہے

اور طوطی کا مقبرہ کہلاتا ہے۔ بیاضِ مذکور کی غزل کے
اشعار ۱ تا ۵ اور ۷ میں اختلافات نظر آتے ہیں، اور
جو قوسین دکھائے گئے ہیں ان کی یہ تبدیلیاں ذوق
اور زبان کے اختلاف کی وجہ سے عمل میں آئیں۔ جو
عہدِ میر و مرزا اور عہدِ غالب و ناظم میں پیدا ہو چکا تھا۔
اور اس غزل کی مروجہ شکل بیاضِ طوطی جان سے بے حد
مطابقت رکھتی ہے۔ اب رہا مروجہ غزل کا مقطع ؎

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

تاحال اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا کہ یہ کس کا ہے
رام پور میں اس مقطع کا پہلا مصرعہ اس طرح مشہور رہا
ہے ؎

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ آمیر

رام پور سے امیر مینائی کے طویل تعلق کی بنا پر ممکن
تھا کہ یہ ان ہی کا کہا ہوا ہوتا۔ لیکن ان کے دواوین میں
اس کا سراغ نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی نواب محمد یار
خاں آمیرؔ ہی کا شعر ہے۔ جس طرح ان کا ایک اور شعر
میر سے منسوب ہو گیا ہے۔ چوں کہ ان کا دیوان تلف
ہو چکا ہے اس لیے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال
میر کے کلام میں موجود نہیں پھر خدا جانے نقلی نے بھی اِسے
میر سے کس طرح منسوب کر دیا۔

افسانہ

ہاتھی کے دانت

جلیل باژید پوری

اس سال بھی گرمی کی تعطیل میں ہر سال کی طرح ایک جھلستی دوپہر کو اپنے گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا۔ میرا گاؤں پہاڑوں کے آنچل میں تھا اور اُس آنچل پر نہ جانے کتنے کنوارے خوب اب بھی میرے بکھرے پڑے تھے؟ لیکن اب تو میرا وہاں اپنا کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی گاؤں، وہاں کی مٹی اور اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان سے بہت پیار تھا پیدا جو وہاں ہوا تھا۔

میں ایک پیپل کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ یادوں کی حسین کتاب کے چند اوراق پھڑ پھڑانے لگے اُسی پیپل کے درخت کے پاس بھی گائے اور بیل کی نادیں تھیں۔ میں جب بھی اپنے دوستوں سے لڑ جھگڑ کر روتا ہوا اپنے ابّو سے شکایت کرتا وہ سان لگاتے ہوئے ہاتھوں سے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیتے اور یہ کہہ کر ٹال دیتے "کس نے مارا ہے تو تو بہت بڑا آدمی بننے والا ہے پھر کیوا ذرا ذرا سی باتوں پر آنسو بہانے لگتا ہے۔؟؟ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سامنے مکھیا جی کھڑے تھے۔" چھی چھی! تم نے ہم لوگوں کو ہمیشہ غیر ہی سمجھا ہے تب ہی تو اپنے آپ کو اکیلا سمجھتے ہو۔ میں بھی تو تمھارے باپ ہی کی طرح ہوں۔ اُنھوں نے میرے منہ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اس گاؤں میں مکھیا جی کا بڑا چرچا تھا ابھی حال ہی میں انھوں نے الیکشن جیتا تھا بڑی رنگین طبیعت کے مالک تھے ویسے میں تو ہر سال اپنے ماں باپ کے ٹوٹے پھوٹے مکان ہی میں ٹھہرتا لیکن اس بار ہر اتوار کی شام ریڈیو پروگرام سننے، مکھیا جی کے گھر ضرور جاتا اور خوب خوش گپیاں ہوتیں۔ ایک شام طبیعت بڑی اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ جیسے زندگی میں کوئی رس نہیں؛ میرا کوئی اپنا نہیں۔ اس شام بھی دھواں دھواں تھی اور ایسی تنہائی کا احساس جیسے کہ میں کسی غار میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ ایسے میں اکثر ایک سہارے کی تلاش ہوتی ہے۔ آج مکھیا جی بڑی ہی جلدی میں تھے۔ سیلاب زدہ کی امداد کے سلسلے میں یہ اپنی

ننھی منی حبیب سے کہیں جا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں سے اُنھوں نے میرا تعارف بڑے حسین انداز میں کرایا۔ واپسی میں رات بالکل تاریک۔ لحاف میں لپٹ چکی تھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہمیں ڈھٹائی سے چھو رہی تھیں کہ اچانک ایک نسوانی چیخ سنائی دی مکھیا جی چونک پڑے اور دوسرے ہی لمحے اُنھوں نے کار روک دی۔ ان کی نظریں اُس لڑکی پر مرکوز ہو گئیں جو ان کی کار کی زد میں آ کر بے ہوش ہو چکی تھیں۔ تنفس ٹھیک تھا۔ ہم دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لڑکی بیحد جاذب نظر تھی۔ کتابی چہرہ اور اُس کی نیلی نیلی آنکھیں جھیل جیسی گہری تھیں اور ہونٹ لالی کے بغیر دو لال گاجر کے ٹکڑوں کے سے تھے۔ لیکن یہ سب تو میں نے بعد میں محسوس کیا اُسوقت تو ہم گھبرائے کھڑے تھے۔ چند لمحوں کے بعد لڑکی کے جسم میں جنبش ہوئی اور ہم لوگوں کو دیکھتے ہی دوپٹہ سنبھالنے لگی وہ ٹکر ٹکر ہم لوگوں کو دیکھے چلی جا رہی تھی کہ اچانک مکھیا جی نے خاموشی کو توڑا اس حادثہ کے لئے میں معافی چاہتا ہوں لیکن تم اُسوقت کہاں جا رہی تھیں اور کیا میں تمھارا نام پوچھ سکتا ہوں ؟"

"جی... میں ریحانہ ہوں۔" اُس کے ہونٹ کپکپائے

"مگر یہ تو کہو اس وقت یہاں کیسے۔ ؟"

اتنا سنتے ہی وہ اپنے دونوں ہاتھ سے منہ چھپا کر رونے لگی شاید وہ اکیلی تھی اور بے بس بھی! مکھیا جی نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا "کیا تم میرے یہاں رہنا پسند کرو گی۔ ؟"

وہ نظریں اٹھا کر ہم دونوں کو دیکھنے لگی شاید وہ اپنے اندر کی ریحانہ سے پوچھ رہی تھی "کیا ایسا ممکن ہے ؟"

"ہاں ہاں تم میری بیٹی بن جاؤ۔ بیوی تو برسوں پہلے مجھ سے روٹھ گئی اور اولاد کی خلش تو ہمیشہ بچھو بن کر ڈنک مارتی رہی ہے۔" مکھیا جی کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ "ابو ــ" ریحانہ کی آنکھوں کے دونوں کٹورے بھر گئے۔ مکھیا جی نے سینہ سے لگا لیا۔ جیب نہایت تیزی کے ساتھ دوڑنے لگی۔

اتوار آیا لیکن شام کے ریڈیو پروگرام سنکر واپسی پر میری شام بالکل اُجاڑ بن بنکر رہ گئی تھی اور اب میرا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں نہیں بلکہ ریحانہ کے بارے میں سوچنے میں گزرنے لگا وہ میری رُوح کی بے قراری بن گئی اور شاید بکھرے ہوئے خیالات کی ایک خوبصورت سی رُت بھی۔ مہینوں گزر گئے لیکن کبھی بھی ریحانہ سے بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ آج بھی اتوار تھا اور ریحانہ کو صرف دیکھنے کے خیال ہی سے میرا اداس موسم سہانا بن جاتا تھا جب میں مکھیا جی کے گھر پہونچا انھوں نے بڑے تپاک سے بٹھایا وہ بے حد خوش تھے۔ اُنھوں نے دو پیالیاں چائے کی فرمائش کی۔ تھوڑی دیر بعد ریحانہ سہمی سہمی چائے کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی۔ میری چور نظریں اُٹھتیں اور پلٹ جاتیں اور کبھی کبھی جم کر رہ جاتیں مکھیا جی کی بوڑھی اور تجربہ گاہ ... ہیں بھانپ گئیں۔

پھر اتوار کی شام آئی میں اُداس اداس دل لیے مکھیا جی کے گھر پہنچا تو وہ نہیں تھے۔ ذرا گھبراہٹ سی ہوئی لیکن خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا اتنے میں ریحانہ قریب آ کر کہنے لگی "ابا کہیں ضروری کام سے باہر گئے ہیں آپ چائے پینا پسند کریں گے۔"

"پلانے والے پوچھ کر نہیں پلاتے۔" میں نے بھی
ہنیت کے دروازے کو ایک ہی جھٹکے میں توڑ دیا۔
"آپ بڑے دلچسپ ہیں۔"
"آتش فشاں کبھی دلچسپ نہیں ہوتا۔"
"کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ ۔ ؟"
"سچ ہی تو کہہ رہا ہوں میں نہ جانے کب پھٹ پڑوں
ا ۔ ؟"
"یہ تو زندگی کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی ۔
"زندگی نے میرے ساتھ انصاف ہی کب کیا ہے؟
بہ نے بڑے فلسفیانہ انداز میں اُسے سمجھانے کی کوشش
ا ۔ اتنے میں وہ چائے بنانے اندر چلی گئی تھوڑی دیر
ے بعد اُس کے گورے گورے ہاتھوں میں چائے
ں۔ میں نے چائے کی تعریف شروع کر دی اور پھر اُس
ا آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "کچھ اپنے
رے میں بھی تو کہئے ۔"
"میں بدنصیبی کے گھٹا ٹوپ جنگل میں تنہا بھٹک
ہی ہوں"
اُس نے ماضی کی دبیز چادر ہٹانے کی کوشش
ا۔ میں میٹرک پاس کرنے کے بعد چچا کے ساتھ شہر میں
ہنے لگی اور کالج میں پڑھنے لگی بڑے ارماں تھے
بن جب ماں باپ چل بسے اپنوں کی آنکھوں میں کھٹکنے
ا۔ میں نے پڑھائی چھوڑ دی اور ایک دن اپنوں کے
نوں سے تنگ آکر گھر بھی چھوڑ دیا ۔ دوسرے محلے میں
ب۔ رئیس کے بچوں کو ٹیوشن دینے لگی اُس کی بوڑھی
ساتھی بیوی مر چکی تھی۔ میں وہیں رہنے لگی ۔ ایک برسات
ڈراؤنی رات وہ بغیر کہے سُنے میرے کمرے میں گھس آیا
باورچی خانے سے منتقل تھا اُس وقت اس پر شہوانیت

کا بھوت سوار تھا میں ٹھہری ایک دیہاتی لڑکی اُسے
دھکے دیتی ہوئی اپنے دامن کو تار تار ہونے سے بچاتی
ہوئی اور تاریکی چیرتی ہوئی بھاگ نکلی اور اندھیرے
میں آپ لوگوں کی جیپ کے نیچے آگئی ۔" اُس نے گہری
سانس لی۔
"میں بھی تو اکیلا اور ویران ہوں بالکل اُس
ٹوٹے پھوٹے مکان کی طرح جس کی نہ کھڑکیاں باقی رہ
گئی ہیں اور نہ آنگن اوسارا ۔ !
میرے بھی تمام خواب ادھورے رہ گئے پھر بھی
زندگی سے ہاتھا پائی کر رہا ہوں ۔ ہم دونوں کی قسمت
کی کستیاں ایک جیسی ہیں میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کوئی
میرے لئے تڑپے ایک چھوٹا سا گھر ہو جھونپڑا ہی
سہی لیکن اس گھر میں پیار اور محبت کی مچلتی ہوئی گرمیاں
ہوں ۔" میں بھی بے حد جذباتی ہوگیا۔
اُس نشیلی رات شاید ریحانہ بھی نہ سو سکی ہوگی
وہ بلبل بدمست کی مانند زمزمے کر رہی ہوگی۔ میں تو
خوشی میں رات بھر زندگی کو ایک سوئٹر کی مانند بنتا
رہا اور اُدھیڑتا رہا۔ لوگ نیند کی آغوش میں ہوتے
اور میں رات کے آنچل کے سرکنے کے بعد بھی کروٹیں
بدلتا رہتا اسی طرح ہفتوں اور مہینوں گذر گئے ۔
آدھی رات کے بعد اچانک کسی نے دستک دی
میں دل ہی دل میں سوچنے لگا " اتنی رات گئے کون ہو
سکتا ہے ۔ ؟ نہ دروازہ کھولا سامنے ریحانہ تھی خاموش
اور آنکھیں اُس کی سوجھی ہوئی تھیں۔
"این ۔" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے
اُسے جھنجھوڑا۔
"کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں۔" وہ بجھے ہوئے انداز میں کہہ گئی۔

"کچھ تو ہے۔"

"ہوتا تو نہ بتاتی۔"

"پھر یہ اُداسی کیسی۔ یہ خاموشی کیسی اور یہ کوئی ملنے کا وقت ہے؟"

"ماں یاد آ گئی۔"

"اوہ! راستے میں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں۔ اتنی رات گئے تمھیں نہیں آنا چاہیے تھا رسیا!" میں نے اُسے سمجھایا۔

وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ میں اُسے دروازہ تک چھوڑ آیا۔

ایک صبح میں تھیلا لئے بازار جا رہا تھا جب میں اپنے رشتے کی ایک بھابھی سے ملنے گیا تو ریحانہ سامنے کھڑی اوکھلی میں چاول مُوسل سے چھانٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی مُوسل رکھ کر بیٹھ گئی اور چاول کو اُوکھلی ہی میں چھوڑ دیا۔ میں نے ازرہ مذاق کہا "کیوں آپ نے چاول چھانٹنا کیوں بند کر دیا۔ اجی! ہمارے دیس کی سگھڑ لڑکیوں کی یہی تو پہچان رہ گئی ہیں۔ کیا ہم نوجوان اس سے بھی محروم ہو جائیں؟ اور آپ جیسے سگھڑ لوگوں کی کیا پہچان ہے۔؟" اس کے بھی ہونٹ ہلے لمبے بال بالکل لڑکیوں جیسے اور بیل باٹم بھی جیسے کبھی شوہر بھی پہن لے اور کبھی بیوی بھی۔ لیکن معاف کیجیے گا میرے بال ابھی میرے بال تو ہندوستان کے عظیم آرٹسٹ دلیپ کمار جیسے ہیں اور پتلون بالکل اولڈ کٹ ہے۔"

"بس صرف ایک دو پہچان۔!" وہ چونکی۔ اور ہم لوگ خوب زور زور سے ہنسنے لگے۔ اب جب بھی ریحانہ سے باتیں کرنے کو جی چاہتا میں بھابھی کے گھر آ جاتا اور جی کھول کر باتیں کرتا مذہب پر، سیاست پر۔ شہری زندگی پر۔ دیہاتی زندگی پر اور موجودہ سوسائٹی پر بھی۔

ایک دھندلی شام جب میں ریحانہ اور بھابھی سے باتوں سے لگا تھا کسی کے آنے کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی چند آدمیوں کے ساتھ مکھیا جی سر پر سوار تھے اور اُن کے ہاتھوں میں جھولتی ہوئی لالٹین کی سرخ سرخ آنکھیں لہو پینے والے ناگوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ مکھیا جی بپھرے ہوئے تھے کیوں کہ انھیں اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ میں ریحانہ کے بہت قریب ہو چکا ہوں۔ اُنھوں نے مجھے دھمکیاں دیں اور میں اُسی وقت اپنے گھر چلا گیا اور اپنی بیچارگی پر خوب رویا مجھے ایسا لگا کہ میرے سامنے کالی کالی پرچھائیاں پرچھائیاں پھڑپھڑا رہی ہیں میری بدنصیبی کی اور میری مایوسی کی۔ دوسرے دن میں نے گاؤں ہمیشہ کے لیے چھوڑنے فیصلہ کر لیا چلچلاتی دھوپ تھی فضا شعلوں میں سمٹی ہوئی تھی اور ایسے ہی میں میں اپنا چھوٹا موٹا سامان باندھنے لگا۔

گاؤں سے نفرت تھی اور پیار بھی اس لئے کہ یہاں کی مٹی میں میری کتنی پیاری پیاری یادیں دفن تھیں اُسی وقت اچانک مہنگو چند نوجوانوں کے ساتھ میرے گھر آ دھمکا وہ ایک سیدھا سادہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا وہ مکھیا جی کا ہلواہا بھی تھا اور نوکر بھی کہنے لگا "آپ اگر ہمارے ساتھ دو تو ایک بات کہیں۔"

"کیا بات ہے۔؟" میں نے بے چینی کا اظہار کیا۔

ھنگو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا " ہمارے ساتھ چلو۔"
میں ہکا بکا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔؟ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ مکھیا جی کے مکان پر پہونچے ایک بھیڑ سی لگ گئی اور ھنگو نے ریحانہ کو باہر لے آیا اور کہنے لگا۔ " بیٹا سچ سچ کہو کہ یہ تو ہار باپ ہو دیں ؟"

ریحانہ جذباتی ہوگئی اور چیخنے لگی " میرا باپ ھنگو ہے جو اس گاؤں کا مانا مریا داستھبا ہے جو لوگوں کی نظروں میں نیچی ذات کا ہندو ہے لیکن انسانیت کا ایک مینار ہے۔ اور یہ جو مکھیا جی ہیں اور جنھوں نے مجھے بیٹی بنا کر رکھا تھا انھیں جوان بیٹی کی شادی کی فکر نہیں ہوئی۔ یہ مکار ہے انسان نہیں جانور ہے اس کے دو قسم کے دانت ہیں بالکل ہاتھی کی طرح کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ ایک رات جب میں بے خبر سوئی تھی میری مجبوری سے اس نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی. واہ رے باپ! اگر ھنگو نہ ہوتا... تو میں ...؟؟ یہ اپنی جوان بیٹی کی ریشمی بانہوں کو ضعیف ہڈیوں میں سمیٹنا چاہتا تھا۔"

ریحانہ مجھ سے لپٹ گئی۔ مکھیا جی تیر کی طرح اکڑے ہوئے تھے موقع پاتے ہی انھوں نے اپنی پستول کی گولی ریحانہ کی پیشانی پر داغ دیا وہ بے جان ٹوٹی ہوئی ڈالی کی مانند میری باہوں میں لڑھک گئی۔ میں بڑبڑانے لگا " میں مکھیا کے بچے کو جلا کر راکھ کر دوں گا اگر تمہیں کچھ ہوگیا ریحانہ! تم میری روح ہو۔ تم میری زندگی ہو تم جوہی کی کلی ہو میں تمھارے لیے مسکراہٹ چرا کر لاؤں گا جو پو پھٹتے ہی کلیوں میں ہوتی ہے۔ ریحانہ! ہنسو تم نے ہی تو کہا تھا تمھارے ساتھ زندگی بھر ہنسوں گی قہقہے لگاؤں گی لیکن آج چپ کیوں ہوگئیں۔؟"

لوگ ریحانہ کو ہسپتال لے جانے لگے میں بجھی بجھی ہوئی شمع کی مانند ساتھ ساتھ خاموش تھا ابھی تک، ریحانہ کی سانسیں چل رہی تھیں لیکن ہسپتال کے دروازہ تک پہونچتے ہی اس کی زندگی کے کمرہ کا درواز بند ہوچکا تھا۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اقبال اور وطنیت

اسلامی دنیا میں اقبال کے سیاسی، معاشری
ر اجتماعی افکار کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ غالباً
ِہ اقبال بیسویں صدی کے اسلامی مفکر ہیں جو جدید
سفے اور سائنس کی روشنی میں اسلامی افکار و سیاسیات
، واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تفسیر و تشریح فرما رہے
ے۔ اقبال مرحوم کے خطبات "اسلامی الہیات کی تعمیر نو"
ی اشاعت کے بعد جدید تعلیم یافتہ طبقات میں خالص
سلام اور اس کی تعلیمات و روایات سے متعلق اس مفکر
ظم کے خیالات کو جو مزید اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس
تقاضہ ہے کہ ان کے افکار کو زیادہ سے زیادہ تشریح
، ساتھ پیش کیا جائے اور قرآن و حدیث کی روشنی
ں ان پر تبصرہ بھی کیا جائے۔

اقبال کے تمدنی اور ثقافتی تصورات میں وطنیت
ر مسئلہ وحدت اسلامیہ کو بہت اہمیت حاصل ہے
ں لئے میں اس فرصت میں بحث و تبصرہ کیلئے اسی
نتخب کر رہا ہوں۔ موجودہ حالات میں کم سے کم
ہندوستان میں مسئلہ وطنیت و قومیت بہت زیادہ فکر و بحث کا محتاج ہے۔ اور ممکن ہے کہ خاص اس مسئلے کی وضاحت اقبال کے دوسرے سیاسی افکار و تصورات کی توضیح و تشریح میں بھی کوئی مدد دے سکے۔

اس مسئلے کے متعلقات پر بحث کرنے سے پہلے میں ایک اصولی چیز کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ اصولی سے میری مراد یہ ہے کہ اگرچہ اس چیز کا اس مسئلے کے مختلف زاویوں اور گوشوں سے کوئی خصوصی تعلق نہیں اور اس حیثیت سے اُسے اس مسئلہ کے متعلقات میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اقبال کے عام فلسفیانہ تصورات و افکار کے سلسلے میں وہ ایک بنیادی حیثیت کی حامل ہے اور ضرورت ہے کہ جب کبھی اقبال کے کسی مخصوص فکر یا نظریے سے بحث کیجائے تو اس اصولی چیز کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ تاکہ اقبال کی حقیقی غرض و غایت سمجھنے میں بے راہ روی کو کوئی امکان باقی نہ رہے۔

اقبال مرحوم جیسا کہ ظاہر ہے، دراصل اسلامی

فلسفے کے جدید شارح ہیں جو مخصوص حالات میں اس
کے فلسفیانہ تصورات کی شرح فرما رہے ہیں۔ کسی
فلسفیانہ نظام کی شرح و تفسیر کے لیے بھی کچھ مقررہ اصول
اور ضابطے ہیں جن کی پابندی بہرحال ہر شارح کے لیے
ضروری ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک اہم اصل وہ
ہے جسے خود علامہ مرحوم نے اپنے خطبات کی تمہید
میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

"یہ بہرحال پیش نظر رہے کہ فلسفیانہ نظر و
فکر کے سلسلے میں قطعیت یعنی Finality کوئی چیز
نہیں۔ جس قدر علم ترقی کرے گا اور فکر کیلئے
نئی راہیں اور روشیں کھلیں گی اسی قدر دوسرے
خیالات اور شاید ان خیالات سے زیادہ
صحیح اور معقول خیالات جو ان خطبات میں پیش
کئے گئے ہیں، امکان پذیر ہوسکیں گے۔ ہمارا
فرض ہے کہ ہم انسانی فکر و تصور پر بیداری
کے ساتھ نظر رکھیں اور اس سے متعلق ایک
آزادانہ تنقیدی روش اختیار کریں۔"

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن حالات میں
اقبال مرحوم، اپنے خطبات میں اسلامی فلسفے کی گویا
ارتقائی تفسیر فرما رہے ہیں، وہ حالات تبدیل ہوسکتے
ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ قدرتی طور پر ان تفسیرات
میں بھی شاید بہتر اور مناسب تغیرات راہ پاسکتے ہیں
اس لئے اہل بحث و نظر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقبال
مرحوم کی پیش کردہ تفسیرات کو آخری اور قطعی تصور نہ
فرمائیں اور خود اقبال کے افکار کی تشریح میں بھی حالات
احوال اور گردوپیش کو نظر انداز نہ ہونے دیں۔

کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال اپنی شاعری کے
ابتدائی عہد میں وطنیت کے مبلغ تھے اور اس کے بعد
غالباً یورپ سے مراجعت فرمانے پر انھوں نے وطنیت
کو خیرباد کہا اور اس کے خلاف وحدت اسلامیہ کی تبلیغ
فرمائی۔ اس خیال کی تائید میں علامہ کی ابتدائی مشق
سخن کی نظمیں مثلاً تصویر درد، ترانہ ہندی، نیا شوالہ
ہندوستانی بچوں کا گیت پیش کی جاتی ہیں۔ ان تمام
نظموں کا نچوڑ ہے۔

ہندی ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

بعد کی نظموں اور مثنویوں میں نہ صرف یہ کہ وطنیت کی
مذمت کی گئی ہے بلکہ اُسے "تہذیب نوی" کا ایک بت
اور مذہب کا کفن" بتایا گیا ہے اور مسلم سے درخواست
کی گئی ہے۔

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

بظاہر اقبال کی تعلیمات میں یہ ایک تضاد ہے اور جس طرح
اقبال کے پرستار اس کو پیش کر رہے ہیں اس سے تو
صاف نیاپن نظر آتا ہے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار
نہیں رہتا کہ اقبال کی ابتدائی نظموں کو جن میں وطنیت
کا راگ الاپا گیا ہے منسوخ قرار دیا جائے اور یہ کہہ دیا
جائے کہ شاعر اسلام کے یہ خیالات اس عہد کے ہیں۔
جب ان کا فکر پوری طرح پختہ نہ ہونے پایا تھا۔ یہ شاعر
کے (خدا نخواستہ) خام خیالات ہیں جن پر اسلامی
نظام معیشت و سیاست کی بنیادیں کھڑی نہیں کی
جاسکتیں۔

جو اصحاب قرآن شریف کی بعض آیات کو جو بظاہر

انھیں متناقض نظر آتی ہیں بے باکانہ منسوخ قرار دیتے ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اقبال کی ان نظموں کو بھی قابلِ نسخ قرار دیں۔ بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ ایسا کر بھی رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ وہ شاعر کے بالکل ابتدائی اور ناپختہ خیالات ہیں جب شاعر کے مطالعے میں وسعت اور تجربات میں ہمہ گیری آئی تو طبعی طور پر ان کے خیالات بھی تبدیل ہو گئے وہ اولاً ہندوستانی قومی شاعر تھے۔ لیکن بعد میں وہ خالص اسلامی شاعر ہو گئے۔

دراصل یہ کہنا اقبال کی بہت بڑی توہین ہے کہ یورپ کے سفر نے ان کے نظریئے بدل دیئے اور انھیں قومی شاعر سے اسلامی شاعر بنا دیا۔ یہ تو یقینی ہے کہ اقبال کی تعلیمات میں کوئی تباین و تناقض نہیں۔ نہ ان کے خیالات میں کوئی ایسی ناہمواری ہی ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ ان کے ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ جس وطنیت کے اقبال گن گا رہے ہیں کبھی انھوں نے اس وطنیت کی مذمت نہیں کی اور نہ درحقیقت وحدتِ اسلامیہ اور وطنیت میں کوئی تباین ہی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ چونکہ اقبال وحدتِ اسلامی کے مبلغ ہیں اس لئے وہ وطنیت یا قومیت سے بیزار ہیں

وطنیت کے معنی ہیں وطنی اشتراک، وطنی اتحاد اور وطنی رشتہ۔ بنی نوعِ انسان میں سب سے زیادہ وسیع اشتراک انسانیت میں ہے۔ انسان کے تمام افراد بہر حال انسان ہیں اور وہ سب ایک وصف انسانیت میں شریک ہونے کے باعث انسان کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور صفات بھی ہیں جو افرادِ انسان میں اتحاد و یکسانی کی موجب ہیں۔ یہ سب صفات سب ایک حیثیت کی نہیں انسانیت کے بعد وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے ان میں درجات کا تفاوت ہے۔ مثلاً نسل، زبان، مذہب اور وطن۔ ان میں سب سے زیادہ وسیع تر مابہ الاشتراک مذہب یا دین ہے۔ اس لئے کہ مذہب نام ہے ان معتقدات و روایات کا جو زندگی کیلئے کسی مکمل نظامِ عمل کی تشکیل کر سکیں اور ظاہر ہے کہ اسمیں بڑی سے بڑی توسیع ہو سکتی ہے یعنی اس مکمل نظام عمل کی حدود میں مختلف نسل اور زبان کی قومیں داخل ہو سکتی ہیں اس کے بعد زبان اور نسل کا درجہ ہے میں چونکہ وحدتِ لسان کو وحدتِ نسل کا لازمی نتیجہ نہیں سمجھتا اس لئے زبان کی حدود کو نسلی دائرے سے زیادہ وسیع قرار دے رہا ہوں۔ سب سے آخر میں وطن ہے دوائر اتحاد میں سب سے زیادہ تنگ اور سب سے زیادہ مختصر یہی دائرہ وطنیت ہے جو ایک جغرافیائی حدود میں بسنے والے افرادِ انسان کو وحدت کے ایک ہی رشتے میں منسلک کئے ہوئے ہے۔ وطنیت سے تنگ تر دائرے بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً قبیلہ، خاندان، شہریت وغیرہ۔ لیکن موجودہ انسانی معیشت پر نظر رکھتے ہوئے ان دوائر کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے اس بحث و نظر سے ان کو خارج کر دیا گیا۔

گزشتہ دو صدی سے یورپ میں وطنیت کو اجتماعی زندگی کی اساس قرار دے دیا گیا ہے اور یہ جدید تمدن کی بعض مخصوص ضروریات کے ماتحت ہوا ہے۔ کسی رشتہ کا استحکام منحصر ہے اس کی افادیت اور نافعیت پر اور یہ افادیت موقوف ہے انسان کے عام سیاسی، معاشی اور اجتماعی منافع پر اس لیے سب سے بڑا محرکِ عمل وہی ہو سکتا ہے جو ان منافع کی صحیح

اور بہترین تنظیم کرسکے گذشتہ تاریخی تجربات نے بتایا
ہے کہ جتنے مابہ الاشتراک بھی ہیں۔ ان سب میں وطن
ہی اس قابل ہے کہ وہ کسی قوم کی بہترین اور شائستہ
ترین تنظیم انجام دے سکے اور شاید یہی ایک صورت
سیاسی تنظیم کی ممکن بھی ہے۔ دراصل بنی نوع انسان کے
اشتراک اور باہمی تعاون کا مسئلہ انسان کی اجتماعی،
حیات سے وابستہ ہے۔ اگر انسان طبعی طور پر متمدن نہ
ہوتا یا افراد انسان ایک دوسرے سے الگ اور جدا
رہ کر بھی ترقی کے منازل طے کرسکتے تو اشتراک یا
تعاون اور وحدت یا یکسانی کا سرے سے سوال ہی
پیدا نہ ہوتا۔ یہ سوال اس وقت پیدا ہوا جب نوع
انسان کے افراد ایک مقام پر رہتے بستے پائے گئے
ان کے سیاسی و معاشی مفاد کی یکسانی نے ان میں قومی
وحدت کے جذبے کو نشو و نما پانے کا موقع دیا۔ چنانچہ
تاریخ معیشت میں سب سے پہلے خاندان کی وحدت نے
جنم لیا۔ اس کے بعد اس وحدت نے اس طرح وسعت
اختیار کی جس طرح پانی میں کوئی چیز پھینکنے کے بعد جو
دائرہ سا بنتا ہے وہ بڑا بڑا وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔
خاندانی وحدت سے قبیلے کی وحدت پیدا ہوئی۔ اور
قبیلے کی وحدت سے وطنی وحدت نے جنم لیا۔ اور آخر
میں وطنی وحدت نے قومی یا نسلی وحدت کا روپ اختیار
کیا۔

وطنی وحدت کو جو دراصل جذبۂ وطنیت کی علت
ہے مصنوعی قرار دینا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ
اصلی فطری اور تاریخی چیز ہے اس میں شک نہیں کہ
وطنیت ایک تجریدی احساس Abstractive sense
ہے۔ لیکن مذہب بھی اس اعتبار سے تجریدی ہے۔ بلکہ
وطن کے مقابلے میں اس کی "تجریدیت" زیادہ شدید اور
تاریخی طور پر بعد کی چیز ہے۔ عام افراد انسان کے لئے
ہر وہ رشتہ زیادہ مقدس اور قابل احترام ہے جو ان کی
روزانہ زندگی میں زیادہ موثر ہے۔ مذہبی وحدت خالص
روحانی اور اخلاقی وحدت ہے اور اس کا شعور تاریخی
اعتبار سے نہ صرف یہ کہ انسان کے برتر تمدن کی یادگار ہے
بلکہ اس کو انسان کی روزانہ زندگی اور اس کی ابتدائی و
لازمی ضرورت سے اگر کوئی تعلق ہے تو نہایت بعید۔
شاید اسی وجہ سے وہ انسان اول کی زندگی میں کوئی بڑا
محرک عمل ثابت نہ ہوسکا۔ نسلی یا قومی وحدت کا احساس
جذبۂ وطنیت سے متاخر ہے اور یہ اس لیے کہ جب تک
کوئی قوم ایک جغرافیائی حدود میں محصور ہے اس وقت
تک نسل اور وطن ایک ہی دائرے پر منطبق ہیں اور ان میں
کوئی فصل نہیں جب قوم کے افراد وطن کی حدود سے قدم
باہر رکھتے ہیں اور کسی دوسری جگہ جا بستے ہیں تو نسلی دائرہ
گویا وطنی دائرے سے منفصل ہوجاتا ہے اور پھر یا تو پہلے
رشتے بالکل ٹوٹ جاتے ہیں اور نئے سرے سے نئے رشتے
جوڑے جاتے ہیں اور یہ دراصل وطنیت کی توسیع ہوتی ہے
یہ اس وقت ہوتا ہے جب نئی بستی میں جہاں قوم کے افراد
جا بستے ہیں کوئی دوسری قوم آباد نہیں اور اگر ہے تو
اقلیت میں ہے اس وقت یہ دونوں بستیاں مل جل کر
ایک نئے قومی وطن کی تشکیل کرتی ہیں۔ یا پہلے رشتے
اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔ اور مقام ہجرت میں بھی نئے
رشتے قائم ہوجاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہجرت
کرنے والے افراد کسی ایسے مقام پر پہونچ جاتے ہیں جو
پہلے مقام سے اس قدر دور ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے
ان میں کوئی رشتہ یا تعلق ہی نہیں۔ یا دار ہجرت میں وہ

ایک غیر اہم اقلیت میں ہیں۔ اس صورت میں بھی وہ اس
مقام کی اکثریت میں دل مل جاتے ہیں، اور ایک نئے وطن
اور جدید قوم کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔

لاطینی، ایرانی اور ہندی قومیں یوں تو ایک ہی
نسل یعنی آرین قوم کی مختلف شاخیں ہیں اور لسانی
شہادتوں کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی قدیم
زمانے میں ایک ہی مقام پر آباد تھیں اور ایک ہی زبان
عام بول چال میں استعمال کرتی تھیں۔ لیکن جب یہ قومیں
بچھڑیں اور ترک وطن کرکے زمین کے مختلف حصوں
میں پھیلیں تو ان کی نسلی وحدت مٹ گئی۔ اور گرد و
پیش کے حالات نے اُن کی شکل و صورت، اوضاع و
اطوار، زبان اور معتقدات کو ایک نئے سانچے میں ڈھال
کر اس درجہ بدل دیا کہ آج بدشواری خال خال لسانی
علامات اور کسی قدر طبعی آثار کی بنیاد پر غالباً یہ کہا جاتا
ہے کہ یہ قومیں کسی ماقبل تاریخ عہد میں ایک ہی مقام پر
آباد تھیں اور ان میں ہر قسم کا اتحاد و وفاق تھا۔

قدیم زمانہ میں وطن اور قوم کا مفہوم، جیسا کہ میں
عرض کرچکا ہوں، ایک ہی تھا۔ اور اس کی وجہ بھی بیان
کی جاچکی ہے۔ یعنی یہ کہ ایک قوم ایک ہی مقام کی حدود
میں محصور ہوتی تھی۔ قوم اور وطن کے تصور کا باہمی اختلاف
مربوط ہے، افراد قوم کی ہجرت اور ترک وطن کے ساتھ
جب کبھی کسی نسل یا قوم کے کچھ افراد کٹ کر الگ ہوگئے
اور ان کا سیاسی اور معاشی مفاد ان کی اصل یا سرچشمے
کے عام منافع سے جدا ہوا تو یہ افراد ایک جُداگانہ ہیئت
اجتماعی کے مالک ہوگئے اور مجبور ہوئے اس امر پر کہ وہ
اپنی سیاسی تنظیم اپنی قوم سے الگ اپنے مخصوص حالات
کے مطابق کریں یا اس تنظیم میں اپنی مقام سکونت کے
طبعی و جغرافیائی افتاد اور پڑوس میں آباد ہونے والی
اقوام کا بھی خاص خیال رکھیں۔ ابتدا میں ان طبقات کا
مخصوص ماحول اور ان کے اپنے سیاسی و معاشی مفاد کے
علاوہ کوئی اور چیز ان طبقات کو ان کے اصل سرچشمے سے
ممتاز یا مختلف نہ بناتی تھی۔ لیکن زمانہ کا امتداد ان
میں برابر امتیازی خصوصیات پیدا کرتا رہتا تھا۔ جس سے
وہ اپنی اصل سے بدستور دور ہوتی چلی جاتی تھیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ وطنیت کو انسان کی
اجتماعی حیات میں بہت بڑا دخل ہے اور یہ کہ وہ خاصۂ
فطرت کی پیداوار ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ گزشتہ
دو تین صدی سے یورپ میں اس فطری اصول اجتماع
کو شاید اس کی افادیت یا عمومیت کی بنا پر بہت سراہا
جارہا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مصنوعی چیز ہے اور
سرزمین یورپ کی پیداوار ہے یا اس کی زندگی کل دو
ڈھائی سو سال ہے جو اقوام کی زندگی میں ایک لمحے سے
زیادہ نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال یورپ کی جارحانہ وطنیت
سے بیزار ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو یقیناً ان کی بیزاری اس
صحیح اور فطری جذبہ وطنیت سے نہیں جس کی تخلیق ارتقائی
تاریخ کے نقطۂ نظر سے سطور بالا میں کی جاچکی ہے۔ اقبال
کی جارحانہ وطنیت سے بیزاری غالباً وطنیت کی بنیاد پر
نہیں ورنہ

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

کی تاویل ہوسکے گی؟ دراصل جارحانہ وطنیت سے بیزاری
اس کی جارحیت کی وجہ سے ہے اور جارحیت کے معنی ہیں
تخریب و افساد۔ یعنی اپنے وطن کی تعمیر کو دوسروں کی تخریب
سے مربوط سمجھنا۔ وطن کے نام پر بھولے بھالے افراد قوم کو

اس پر آمادہ کرنا کہ وہ دوسرے ارکان کی آزادی پر ڈاکے ڈالیں اور انھیں غلام بنائیں۔ دراصل وطنی تنظیم ایک محدود اور مخصوص تنظیم ہے۔ اس میں اگر کوئی فائدہ ہے تو یہ کہ اس کے ذریعہ انسانی اجتماعی ہیئات کے کسی قدر دشوار مسائل کو ذرا آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے انسان کا مفاد دو طرح کا ہے۔ شخصی اور اجتماعی۔ یہ دو طرح کے مفاد قدرتی طور پر برابر برسر زمار رہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان کی آئندہ ترقی اور کامیابی کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کے ان دو مختلف مفادات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور ان کی شکست و ریخت سے ایک خاص ایتلافی کیفیت حاصل ہو جائے۔ اس صورت میں اجتماعی منافع کے دائروں کو جس قدر تنگ کیا جائے گا اسی قدر اختلاف اور تصادم کے امکانات کم ہوں گے اور عام افراد معاشرہ کو بھی زیادہ سے زیادہ اتحاد کے رشتوں میں منسلک کیا جائے گا۔ اسی خیال سے یورپ میں جب دوسرے وحدانی نظام آزمائے جا چکے اور ان میں کوئی کامیابی نظر نہ آئی تو مجبور ہو کر وطنی تنظیم کو اختیار کیا گیا۔ اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور وطن کے نام سے یورپ کے مختلف ممالک نے گزشتہ دو صدی میں کافی ترقی بھی کی۔ لیکن اتفاق تھا کہ ترقی کے لیے مسابقانہ جذبہ کو ہوا دے دے کر خوب بھڑکایا گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس جذبے نے بھڑک کر رقابت کی شکل اختیار کی اور یورپ آگ اور خون کے کھیل میں دلچسپی لینے لگا۔

یورپ کی موجودہ وطنی تنظیم میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وطن سے بالاتر وہاں کوئی اور رشتہ نہیں جو ان مختلف اوطان یا ممالک کو ملا کر ایک بڑی وحدت بنا سکے۔ حیات و کائنات بے شمار وحدات کا ایک نامحدود نظام ہے جس میں قانون تدرج کام کر رہا ہے سب سے زیادہ وسیع وحدت خود وجود یا ہستی ہے جو جوہر اور عرض دو وحدتوں کی جامع ہے۔ جوہر ایک بہت بڑی وحدت ہے جس میں اجسام اور ارواح کی بیشمار وحدتیں بندھی ہوئی ہیں۔ جسم ذرات کی ایک ناپیدا کنار دنیا اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ ذرہ کا تجزیہ کیجئے۔ آپ کو نامعلوم برقپارے یا کوانٹم حرکت کرتے نظر آئیں گے۔ یہ ایک مثال ہے۔ یہ بات سمجھانے کیلئے کہ اوطان کی تنظیم کسی بلند تر جذبے کے ماتحت ہونا چاہیئے تھی تاکہ اس کے زیر اثر بین الاقوامی یا بین الاوطانی مسائل کی گتھیاں بھی سلجھائی جا سکیں۔ یورپ میں چوں کہ کوئی ایسا رشتہ نہ تھا اس لئے ان اوطان میں تصادم ہوا اور وہاں میدان کارزار گرم ہو گیا۔ اقبال مرحوم اسی جذبۂ رقابت، اسی جذبہ مسابقت اور اسی جارحانہ وطنیت کو جو بالاتر رشتۂ اتحاد سے محروم ہے ایک نو تراشیدہ بت قرار دے کر اسے توڑ دینے کی تبلیغ فرما رہے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اگر وطنیت سے اس کی جارحیت کی بنا پر بیزاری کا اظہار کیا جا سکتا ہے تو یہ جارحیت کسی ایسی تنظیم میں بھی پائی جا سکتی ہے جس کی بنیادیں مذہب پر قائم ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے عام مفاد کی خاطر غیر مسلموں پر بھی جور و جفا روا رکھا جا سکتا ہے۔ اسلام کے نام پر غیر مسلموں کا خون بھی بہایا جا سکتا ہے اور بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا ہے؟ جب تک دنیا میں غیر مسلم آباد ہیں اسلام کے نام پر تنظیم کے معنی یہ ہیں کہ زمین کے جیوں کو مسلم و غیر مسلم

حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ اور اب جو کچھ وطن کے
نام سے ہو رہا ہے اُسے اسلام، یہودیت، نصرانیت،
اشتراکیت، اشتمالیت وغیرہ ناموں سے خوب کھل کر کیا
جائے۔ بظاہر ان دو صورتوں میں کوئی فرق اس کے
سوا نہیں کہ اسلام ظلم و سفاکی کا مخالف ہے۔ اس لئے
ممکن نہیں کہ اسلام کے نام سے کوئی ناروا اقدام کیا
جاسکے۔ ایک مسلم کے نقطۂ نگاہ سے یہ درست ہے۔
اور شاید مسئلہ کی وضاحت کے لئے اس کی ضرورت
بھی نہیں کہ خواہ مخواہ مسلم تاریخ (اسلامی نہیں) کی
خوں ریزیوں کا اس سلسلے میں ذکر کیا جائے اور فقہائے
اسلام کے مشہور اصول اسلام اوالسیف" (اسلام قبول
کرو ورنہ قتل کئے جاؤ گے) کے عملی تفسیر میں بھی پیش
کی جائیں۔ وطن پرستوں کے نقطۂ نگاہ سے وطن بھی
خونریزی اور ظلم و تعدی کو روا نہیں رکھتا اور شاید یہ
صحیح بھی ہے کہ یورپ کے باشندے اپنے وطن کا نام
روشن کرنے کیلئے، اپنے قومی وقار کے استحکام کے لئے
اور اپنے وطن کو اچھالنے کی غرض سے جو انسانیت سوز
اقدامات کرتے رہتے ہیں وہ انصاف اور جمہوریت کے
نام سے کرتے ہیں۔ وہ ایک انسان کے دل میں بندوق
کی گولی پیوست کرتے وقت بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم انسان
کی عزت و ناموس کے بقا اور اعلاء کلمہ حق کے لیے یہ سب
کچھ کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ درست ہے اور ہزار بار درست
ہے کہ قرآن کا فرمان ہے لَا تَعْتَدُوْا (زیادتی نہ کرو)
لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس فرمان پر عمل بھی کیا
جائے گا۔ اسلام زندہ باد اور مسلم قوم آباد کے فلک
شگاف نعروں میں کسی حق پرست کی کمزور آواز لَا تَعْتَدُوا
بھی سنی جائے گی۔

ڈاکٹر اقبال کی اسلامی وحدت وطنیت سے بالاتر
ضرور ہے۔ لیکن اسی طرح جیسے دس نو سے زائد اور اس
سے برتر ہے۔ وحدت اسلامی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ
تمام وطنی امتیازات مٹا دیئے جائیں اور اس پر اسلامی
وحدت کی بنیادیں کھڑی کردی جائیں اور یہ ممکن بھی
نہیں۔ اسلام نام ہے زندگی کے ہمہ گیر حق پرستانہ اصولوں
کا اور بہرحال اسلامی ممالک یہ شاندار اصولیات
اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ان اصول کی تنفیذ کے
لئے جن افراد کی ضرورت ہے وہ کسی ایک مقام کے باشندے
ہی ہو سکتے ہیں۔ جن کی کچھ اپنی مخصوص ضروریات اور
حالات بھی ہیں۔ یہ پورا ڈھانچا ملا جلا کر وطنیت کے
نام سے موسوم ہے مختلف اوطان یا ڈھانچوں کی تنظیم
کے لیے بھی کچھ بالاتر اصول و قواعد کی ضرورت ہے وہ
بھی اسلامی اصول ہیں جو ان ڈھانچوں کے باہمی تعلقات
اور ارتباطات کی توثیق میں زیادہ سے زیادہ مدد
پہنچاتے ہیں۔

وحدت اسلامی ایک بین الاقوامی نظام کا نام ہے
جو بہت سے اسلامی اوطان کی وحدات پر مشتمل ہے۔
اس لئے وطنیت اور وحدت اسلامی میں کوئی تقابل
یا منافات نہیں ہو سکتی۔ ایک دہائی یعنی دس نام
ہے جداگانہ دس اکائیوں کا۔ جب تک دس اکائیاں
ایک جگہ جمع نہ ہوں دہائی کا وجود ناممکن ہے۔ اسیطرح
جب تک متعدد اوطان کی وحدات نہ ہوں ایک اسلامی
وحدت کا وجود کہاں ہو سکتا ہے اگر ایک دہائی اور
دس اکائیوں میں کوئی اختلاف یا تقابل نہیں تو وطنیت
اور اسلامی وحدت میں بھی منافات قطعی ناممکن ہے۔
وحدت اسلامی کی تشکیل صرف اسلامی وطنی وحدا

ہی سے ہو سکتی ہے اور ڈاکٹر اقبال نے اس سلسلے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سید عبدالرحمان الکواکبی اور مولانا جمال الدین افغانی کی تعلیمات اور پرخلوص مساعی کی گویا بازآفرینی ہے مولانا افغانی کی سیاسی سرگرمیاں عالم اسلامی میں کافی مشہور رہیں۔ وہ وحدت اسلامی (پان اسلامزم) کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔ اور اس راہ میں ان کی بے مثال قربانیاں قابلِ صد ستائش ہیں وہ اسلامی ممالک کو ایک ہی رشتۂ اتحاد میں منسلک، کرنے کیلئے برابر ساعی رہے لیکن ان کا منشاء ہرگز یہ نہ تھا کہ عراق، عرب، شام، فلسطین، مصر، افغانستان، ایران اور ترکی اپنی قومی وحدات مٹا کر ایک وحدت بن جائیں بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان ممالک میں اسلام کے نام سے ایک مستحکم رشتہ اخوت قائم ہو جائے۔ وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے بھی منفرد موتی کے دانوں کے دانوں کی طرح ایک ہی مسلک میں منسلک ہوں

اقبال جو مولانا جمال الدین کے پرستاروں میں سے ہیں دول اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق کے خواہاں ہیں اور چونکہ یہ خطرہ ہے کہ ایران کی ایرانیت، افغان کی افغانیت اور ترک کی ترکیت اس اتحاد کی راہ میں مزاحم ہو اس لئے اس بلند و بالاتر مقصد کے پیش نظر وہ اس جذبہ کو سبک اور حقیر قرار دے رہے ہیں۔ جہاں مسلم کے ساتھ غیر مسلم بھی آباد ہیں یا جہاں غیر مسلم ریاستیں بھی ہیں قدرتی طور پر وہاں وحدت اسلامی کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مقام پر بسنے والے مسلم و غیر مسلم کا اتحاد صرف وطنی خطوط پر ہی ہو سکتا ہے اور چونکہ وطنیت اپنی جگہ یعنی جب اس کا وحدت اسلامی سے تصادم نہ ہو، صحیح اور مسعود جذبہ ہے اس لئے وہ معیوب نہیں اور نہ اس سے بیزاری کوئی معقول چیز ہے

مارچ ۱۹۳۸ء میں یعنی وفات سے ایک ماہ پہلے اقبال مرحوم نے وطنیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیوں کہ ہم سب کرہ ارضی کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہندی کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ ہم سب کرہ ارضی کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علی ہذا القیاس چینی عربی، جاپانی ایرانی وغیرہ۔ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے۔ اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کیلئے قربانی کو تیار رہتا ہے۔ (روح اقبال صفحہ ۲۴۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور وطن میں کوئی تصادم نہیں۔ ایک مسلمان مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنی جنم بھومی کیلئے قربانی دینے کو تیار ہو سکتا ہے اور اس کی بہبود کے لئے جدوجہد بھی کر سکتا ہے۔

وحدت اسلامی کی جو تشریح سطور بالا میں پیش کی گئی ہے وہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اقبال مختلف اسلامی اوطان کی ایک بالاتر تنظیم کرنا چاہتے تھے جس کے صاف اور واضح معنی یہ ہیں کہ وہ وطنیت کے مخالف نہ تھے۔ یہ غلط ہے کہ وہ ایک واحد اسلامی ریاست کا قیام کرنا چاہتے تھے۔ یہ دراصل نا ممکن ہے جو اصحاب وطنیت کے مخالف ہیں یا جو اقبال کو وطنیت کا مخالف بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک وحدت اسلامی کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں ایک واحد اسلامی ریاست ہو۔

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب نے لکھا ہے۔ (اردو اقبال نمبر صفحہ ۱۹۹)

"اقبال کہا کرتے تھے کہ اسلام میں خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک بھی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم نہ ہو سکی اور نہ اس کی کوئی امید دکھائی دیتی ہے۔ البتہ اتحاد اسلامی کا تخیل اس معنی میں ضرور عملی جامہ پہن سکتا ہے۔ کہ تمام اقوام آزاد ہوں اور اسلامی مقاصد کے لئے باہم ایک دوسرے کیساتھ تعاون کریں۔ یہ حکومتیں ایک قسم کی اسلامی قومی حکومتیں ہوں گی۔"

جن الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے انھیں غور سے پڑھئے اور فیصلہ فرمایئے کہ اقبال قومیت یا وطنیت سے بیزار ہیں۔ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

"مگر ان قومی حکومتوں کی بنیاد اخلاق اور محبت پر استوار ہونا چاہیئے یہ قومیت یورپ کیطرح جارحانہ نہ ہونا چاہیئے جس کا لازمی نتیجہ شہنشاہیت اور سرمایہ داری کی لعنت ہے۔"

یعنی جو قومیت "اخلاق اور محبت" سے عاری ہے وہ یورپی قومیت ہے اور اقبال مرحوم اس سے ہمیں دور رکھنا چاہتے ہیں۔

مسلم اور غیر مسلم کا اتحاد، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ وطن ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور یہ اتحاد اقبال کی تحریک کے مطابق اسلام اور اس کی تعلیمات کے منافی نہیں لیکن اگر کوئی ایسی صورت پیش آئے کہ کسی مشترک قومی وطن کے مفاد کا تصادم کسی اسلامی قومی ریاست کے مفاد سے ہو جائے تو مشترک قومی ریاست کے مسلم باشندے کیا راہ اختیار کریں؟ اس جواب کسی قدر دشوار ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی صورتیں پیش آتی رہی ہیں اور مسلم فقہاء اسلامی اصول کے مطابق اس کا حل بھی پیش کرتے رہے ہیں

مسعودی عرب کا مشہور مورخ اور سیاح ہے۔ اس نے چوتھی صدی ہجرت کے اوائل میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت کثیر تعداد میں مسلمان آباد تھے جو اہل ہند کے ساتھ رل مل گئے تھے۔ انھوں نے یہاں شادیاں بھی کر لی تھیں اور مستقل طور پر یہیں رس بس گئے تھے۔

بحر خزر (کیسپین سی) کے آس پاس بسنے والی قوموں کے متعلق مسعودی کا بیان ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور لُرشیہ کہلاتے ہیں یہ خوارزم (خیوہ) سے ہجرت کرکے یہاں آبسے ہیں یہ بہترین سپاہی ہیں اور خزر کے بادشاہ کو ان کی بہادری کا بڑا اعتماد ہے۔ یہ لوگ اس شرط پر یہاں آباد ہیں کہ وہ نماز پڑھ سکیں گے اور مسجدیں بھی تعمیر کر سکیں گے۔ وزیر انھی میں سے چنا جائے گا۔ اور اگر خزر کے بادشاہ کو کسی اسلامی سلطنت سے جنگ پیش آئے تو مسلمان کو ان کے خلاف جنگ میں نہ بھیجا جائے گا۔ وہ دوسری قوم سے لڑنے کیلئے ہر وقت تیار رہیں گے۔ ان کے یہاں سات حکام عدالت ہیں۔ دو مسلمان، دو خزری، دو عیسائی، اور ایک روسی۔ اگر کوئی مشکل قضیہ پیش آتا ہے تو اسے مسلم حکام عدالت کے روبرو پیش کیا جاتا ہے اور شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ان کی مسجد میں درس قرآن کے مدارس بھی ہیں۔ (مروج الذہب جلد دوم صفحہ ۱۰)

یہ قدیم قومیت کی ایک ابتدائی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی رشتۂ اخوت وطنی اتحاد سے، کسی قدر بلند اور بالاتر ہے۔ یعنی اگر وطنی و ملی حقوق میں

ڈاکٹر پیکر جعفری (اترولوی)

غزل

زباں پر اُن کی آ جاتا ہے دلوانے کا نام اکثر
ذرا سی ہوشیاری سے نکل جاتا ہے کام اکثر

جو چھپتے ہیں نگاہوں سے جو رہتے ہیں حجابوں میں
تصوّر میں وہ خود ہوتے ہیں مجھ سے ہم کلام اکثر

ٹھکانہ اک جگہ رہتا نہیں وحشت کے ماروں کا
سحر بستی میں ہوتی ہے تو ویرانے میں شام اکثر

خلوص و شوق میں آنے دیا میں نے نہ فرق اب تک
مزاجِ حسن کا بدلا ہوا پایا نظام اکثر

اُٹھاؤں ساغر و مینا کا احساں کس لئے پیکرؔ
پلا دیتے ہیں وہ آنکھوں سے خود اُلفت کا جام اکثر

شیخ حبیب اللہ

میں کون ہوں کیا ہوں؟ اقبال

(تیسری قسط)

دنیا آج دولت کے لئے دیوانہ ہو رہی ہے۔ ذہنی تعطل و تفلّج کا یہ عالم ہے کہ پستیٔ اخلاق کوئی عیب ہے ہی نہیں کسی طرح بھی ہو بس دولت حاصل ہو جائے۔ اور لوگوں کی نظروں میں یہ بڑی مستحسن بات ہے۔ دولت جمع کرو۔ رشوت سے، چور بازاری سے، جعل و فریب، لوٹ کھسوٹ، اشیاء خوردنی میں زہر آمیزی سے، چوری ڈکیتی سے گویا کسب زرِ حرام کی وبا پھیلی ہوئی ہے ہر جگہ پیسہ، پیسہ کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے۔ اقبال نے کیا کہا:۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

من کی دولت آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا دھن

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

علامہ اقبال پر معانی و دقائق کے اسرار نازل ہوتے تھے۔ مگر اس دفتر بے پایاں کو ضبط تحریر میں لانے کے وسائل مفقود تھے۔ اس لئے اُن کے خیالات کا عشر عشیر بھی ہمیں دستیاب نہ ہو پایا۔

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی

علامہ اقبال کے پہلے دنیائے شاعری بے جان تھی۔ تفکر و تدبر کا ڈھنگ بھی بے ڈھنگا تھا۔ حتیٰ کہ شعور مذہب بھی روایتی اور رسم پرستانہ تھا۔ مگر اقبال نے فکر و عمل کی دنیا میں انقلاب رونما کر دیا۔ اور عوام و خواص میں معنوی روح بھی پھونک دی ؎

میری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے اُنھیں ذوقِ آتش آشامی

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج
کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیانِ مشتاقی

مسلمان خواب خرگوش میں خراٹے لے رہے تھے۔
جبکہ تعلیم یافتہ طبقہ ذہنی غفلت و تعطل و تفلج کا شکار تھا
مگر کلام اقبال نے انھیں چونکا دیا اور اب مکمل بیداری
کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا

راز حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کے گفتگو کے انداز محرمانہ

خرد نے کی مجھ کو عطا نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

ایسے ہی اعلا پیمانہ کے نغمہائے جبریل آشوب،
زبان اقبال سے ادا ہوتے رہے مگر فی زمانہ معیار
تعلیم اتنا پست ہے کہ اقبال فہمی دور از کار بات ہوگئی
ہے۔

میں نے تو کیا پردہ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

علامہ اقبال کے قیام بھوپال پر کوئی ریسرچ نہیں
ہوا تھا۔ مگر اب سیفیہ کالج نے اس باب میں کچھ کام کیا
ہے مگر یہ کارنامہ ہنوز پردہ خفا میں مستور ہے۔ اس کی
کوئی تشہیر نہیں ہوئی ہے۔ مندرجہ امور پر بھی کسی نے
اب تک روشنی نہیں ڈالی ہے۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

دراصل علامہ اقبال پر تفکر و تدبر کا عظمت و اجلال
تلاوت کلام پاک سے پیدا ہوا۔ لہٰذا اُن کے کلام میں
زینت و تفاخر کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ھو

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
نہ ہو روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

اقبال کو کسی کی نقالی کی کیا ضرورت تھی۔ انھیں تو
قدرت کی طرف سے افکار عالیہ الہام ہوئے تھے۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

افسوس مذہب خواص میں رسم پرستی ہو گیا ہے اور
عوام میں اوہام و ظنون مگر جو قوم روح مذہب کو سمجھتی
ہے اُس کے علو و رفعت کا کیا کہنا۔

میں نہ عارف نہ مجدد نہ محدث نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام
عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ روشن ہے صفت ماہ تمام

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات

یہ مذہب مردان خدا مست و خود آگاہ
وہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

وہ نبوت ہے مسلماں کیلئے برگ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا مقام

علامہ کا کلام زلزلہ افکار ہے

میں بندہ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانہ لاہوت سے پیوند

اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند

تاثیر ہے یہ میرے نفس کی خزاں میں
مرغان سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند

علامہ کی کشت فکر سے خورشید داماں خیالات کا اظہار - کیا؟ خداداد بات نہیں ؎

نگاہم از مہ و پرویں بلند است
سخن را بر مزاج کس نگویم

میری نگاہ مہ و پرویں سے بلند تر ہے۔ میں کسی غیر کے افکار کو اپنے کلام میں پیش نہیں کرتا ہوں ؎

بر آں رازے کہ گفتم پے نہ بردند
ز شخل شاعر من خرما نہ خوردند

من اے میر اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں دنیا کے سامنے جو کچھ کلام کی صورت میں پیش کرتا ہوں اُس کی حقیقت کو کوئی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا ہے اور نہ اُس پر عمل پیرا ہو کر فیض یاب ہوتا ہے اس لیے اے میر اُمم میرے کلام کی داد تم ہی دے سکتے ہو کیوں کہ کم سواد دنیا مجھے بھی روایتی یا وہ گو غزل خواں شاعر سمجھتی ہے اور حقائق و معارف کی رعنائیوں سے آنکھیں بند کرلیتی ہے۔

گہے افتم، گہے مستانہ خیزم
چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم

نگاہ التفاتے بر سر بام
کہ من بہ عصر خویش اندر ستیزم

میرے شغل سینہ کاوی کا یہ عالم ہے کہ میں مصاف زندگی میں ہمیشہ جہد مسلسل میں اُفتاں و خیزاں مستانہ وار جادہ پیماں رہتا ہوں۔ میری فکر گہرا اندوز بلندیوں پر رہتی ہے کیوں کہ میں زمانہ کے ساتھ نبرد آزما رہتا ہوں اسی تزاحم و کشاکشی اور جہد و رستخیز میں میری بلا تیغ و سنسان خوں ریزی قابل دید ہے۔

علامہ اقبال نے مطالب و مفاہیم کی خبر رسانیاں کیوں کر پیدا ہوئیں ؎

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

بادہ گراں عجم عربی مری شراب
مرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام

اس لئے ؎

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنیوالے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اغیار نے تمام احکامات و ہدایات و انذار قرآنی اپنا لئے اور فیض یاب و کامران ہو رہے ہیں ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

ہم نے اغیار کا شیوہ خود غرضی اور انفرادی زندگی کا فلسفہ اختیار کرلیا۔ ملت کا خیال نہ ہو تو تشکو و استحکام

کیوں کر نصیب ہو ؎

ہو گئی رسوا زمانہ میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

اقبال خود اپنے تفکر کی حکیمانہ نکتہ آرائی پر متحیر تھے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

الہامی افکار کی دقائق اندیشیوں پر عقلی استغراب کا ہونا لازمی بات ہے علامہ کی فرشتگی اخلاق ملاحظہ ہو ؎

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ مانند سحر اس کی جوانی

علامہ اقبال اپنے کلام گیر تاخر و اثرات، رسوم و اشکال، معنی و مفہوم اور اندیشہائے گوناگوں پر حیرت ہوتی تھی اور یوروپی اصحاب علم و دانش کی کج اندیشیوں پر افسوس ہوتا تھا در اصل اہل یوروپ قرانی فلسفہ کے جمال حقیقت سے محروم محض ہیں۔ اس لئے وہ اقبال کے فلسفہ کا تانا بانا یوروپی اصحاب علم و فکر سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے وہ غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے قلم اٹھانا پڑا۔ ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں :۔

"میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں اسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات زینہ و درجہ و رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے، اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ نعم کے اشیاء کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور حسن معاملت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنے ہم سایوں کے بارے میں اس قسم کا طریقۂ کار اختیار کیا جائے۔ یوروپ میں اس گنج گراں مایہ محروم ہے اور یہ متاع ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

"میں نے اسرار خودی اسرار خودی پر چند تشریحی نوٹ لکھے تھے جنھیں آپ نے دیباچۂ اسرار میں شامل کر لیا ہے۔ ان تفسیری حواشی میں، میں نے مغربی مفکروں کے افکار و عقائد کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کر دی ہے۔ یہ طریق محض اس لئے اختیار کیا گیا تھا تاکہ انگلستان کے لوگ میرے خیالات بہ آسانی سمجھ لیں، ورنہ قرآن حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں کے افکار سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے چنانچہ میں نے اسرار کے پہلے ایڈیشن میں بزبان اُردو جو دیباچہ لکھا ہے اُسمیں یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

"میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ صوفیائے کرام کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اور تو اور وقت کے متعلق برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کیلئے کوئی نئی چیز نہیں ......
عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم جب اُن مسائل کو مذہبی تجربات و افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جنکا مدار اور سر چشمہ قرآن مجید ہے تو اُس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پُرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں پیش کیا جا رہا ہے بدقسمتی سے اہل یُوروپ اسلامی فلسفہ کی تعلیم سے ناآشنائے محض ہیں...؟

منظر سلیم

اردو افسانہ نگار اور ہندی رسالے

جیسے چند سال قبل ادبی حلقوں میں لوگ بڑے فخر سے سر اٹھا کر کہا کرتے تھے کہ صاحب اُردو شاعری ہندی والوں میں بیحد مقبول ہو رہی ہے اور مختلف شعرا کے کلام کے انتخابات تیزی کے ساتھ ہندی میں بڑے آب و تاب کے ساتھ شایع ہو رہے ہیں ویسے ہی ان دنوں اس بات کا بڑا چرچا ہے کہ اُردو کے افسانہ نگار ہندی رسالوں پر چھائے جا رہے ہیں اور ہندی کے ہم معیاری یا نسبتاً کم معیاری لیکن کثیر الاشاعت رسالہ میں اُردو کے ممتاز افسانہ نگاروں کی تخلیقات بہ ضرور شامل ہوتی ہیں۔

اُردو شاعری ہندی والوں میں کس حد تک مقبول ہوئی اور چند مشہور کلاسیکی شعراء کے علاوہ کتنے جدید اُردو شعرا کی تخلیقات دیوانہ گری رسم خط میں شائع ہوئیں اس کا کوئی باقاعدہ جائزہ تو نہیں لیا گیا۔ لیکن ہندی کی کتابوں کی دوکانوں کے چکر لگانے اور اردو شعرا کی کتابوں پر نظر ڈالئے تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی کہ گنے چنے پبلشروں نے گنتی کے جدید اُردو شعرا کے کلام کے انتخابات شائع کیے ہیں اور ان میں بھی اکثریت ایسے جدید شعرا کی ہے جو ایک خاص ادبی تحریک سے وابستہ رہے ہیں اس چیز کو سیاسی معنی نہ پہنایئے تب بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو شعرا کے کلام کو دیو ناگری رسم خط میں شائع کرنیکا سلسلہ کسی خاص رجحان یا تحریک کے تحت نہیں شروع کیا گیا بلکہ یہ محض ہندی کے بعض ذہین پبلشروں کا خالص تجارتی اور کاروباری اقدام تھا کیوں کہ جس طرح یہ سلسلہ شروع ہوا تھا اسی طرح ختم نہیں تو بہر حال دھیما تو یقیناً پڑ گیا ہے پھر اردو شاعری کے ان مجموعوں کی اشاعت کے سلسلہ میں ایک خاص بات جو اُردو والوں کے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ نظمیں اور غزلیں ہندی والوں کے لیے نہیں بلکہ اردو والوں کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ان کے الفاظ انداز بیان استعارے سب کے سب اُردو کے ہیں اور ان کے ہندی میں منتقل ہونے سے اُردو زبان و ادب کو کوئی نقصان نہیں پہونچا بلکہ اس لحاظ سے فائدہ ہی

ہوا کہ بعض اُردو شاعروں کو کچھ معاوضہ مل گیا اور ہندی
والے اُردو شاعری کے ایک مخصوص رخ سے واقف بھی
ہوگئے۔

لیکن اب جو صورت حال ہے وہ بہت ہی مختلف
ہے ہندی رسالوں نے اُردو کے اچھے افسانہ نگاروں
کے لیے اپنے دروازے بڑی فیاضی کے ساتھ کھول دیئے
ہیں۔ اُردو والے افسانہ نگار اور اُردو داں طبقہ بھی جو
ہندی کے رسالے پڑھنے بھر کی ہندی سیکھ گیا ہے اس
صورت حال پر اترائے اترائے پھرتے ہیں اور اسے
اُردو ادیب و ادب کی عظمت و زبان کی بے پناہ مقبولیت
سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ سارا
معاملہ واقعی اس قدر قابل مسرت ہے؟ اور کیا یہ چیز
بھی ویسی ہی ہے بے ضرر بلکہ مفید ہے جتنی بعض اردو شاعروں
کے منتخب کلام کی دیوناگری رسم خط میں اشاعت بے ضرر
بلکہ مفید ہوئی۔

غور کیجیے تو صورت حال آئینہ ہو جاتی ہے اور دونوں
باتیں بالکل مخالف ہونے لگتی ہیں۔ اُردو شاعری دیوناگری
رسم خط میں منتقل ہوئی (یا ہو رہی ہے) تو اس کے عام
مزاج و لب لہجہ، الفاظ یا روایات کے مجروح ہونے کا
سوال ہی نہیں اٹھا جوں کہ توں ہندی میں شائع کر دی
گئی ہیں اور ہندی افسانے کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے
گویا اُردو شاعری کو ہندی کے گھر میں مہمان کی حیثیت سے
سے مدعو کیا گیا تو اس کے لباس اور بول چال پر کوئی
پابندی نہیں لگائی گئی لیکن اب جو افسانہ کو مدعو کیا جا رہا
ہے تو اس شرط کے ساتھ کہ مہمان کا لباس بول چال اور
طور طریق میزبان کا جیسا ہو۔

ہندی رسالوں نے پہلے اردو کے بعض اچھے افسانوں
کے ترجمے شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر وہ ان افسانہ
نگاروں سے براہ راست خط و کتابت کے ذریعہ ان کے
افسانے حاصل کرنے لگے اور اپنے طور پر ترجمے کا انتظام
کرایا۔ اب سننے میں آیا ہے کہ لوگ خود ہندی میں لکھ کر
یا لکھوا کر ہندی رسالوں کو افسانے بھیجتے ہیں۔ پہلے اُردو
میں چھپے ہوئے افسانے کام دے جاتے تھے لیکن اب
یہ قید بھی لگا دی گئی ہے کہ افسانہ غیر مطبوعہ ہونا چاہیے
یعنی اُردو میں چھپا ہوا نہ ہو۔ ان تمام پابندیوں کے
باوجود عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر
خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر .....
ہنس راج رہبر، رام لعل اور متعدد دوسرے ممتاز افسانہ
نگار کی تخلیقات پابندی کے ساتھ ہندی کے معیاری
رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ اور بعض افسانہ نگار
پہلے ہندی میں لکھتے ہیں پھر اسے فرصت ملنے پر اُردو
میں منتقل کرتے ہیں۔ یا ہندی رسالے سے اردو رسالوں
کے ایڈیٹر خود ترجمہ کرا کے اُردو میں شائع کرتے ہیں
چنانچہ ہندوستان اور پاکستان کے رسالوں میں ہمارے
بعض ممتاز افسانہ نگاروں کی جو تخلیقات شائع ہوتی
ہیں اُن کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں خود
مصنف نے اُردو میں لکھا ہے یا کسی دوسرے نے ہندی
سے ترجمہ کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ہندی رسالوں کی اس فیاضی
سے اُردو افسانہ نگاروں کو بہت فائدہ پہونچ رہا ہے
رسالے کے چار پانچ صفحات کے افسانے کا سو ڈیڑھ
سو روپیہ تک معاوضہ ایسی بات ہے جس کا اردو والے
تصور بھی نہیں کر سکتے کیوں کہ ہمارے یہاں ابھی تک
ڈھائی تین سو روپیہ میں پوری پوری کتابیں خریدنے کا

طریقہ عام طور پر رائج ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کے افسانے ہندی میں خاص تعداد میں چھپ جاتے ہیں ان کے افسانوی مجموعے بھی خاصے داموں پر فروخت ہو جاتے ہیں جب کہ اردو میں سستے ناول چھاپنے والوں کا پروپیگنڈہ کئی سال پرانہ ہونے کے باوجود ابتک اپنا اثر نہیں کھو سکا۔ افسانوں کے مجموعے خریدنا لوگ پسند نہیں کرتے۔ ان حالات میں اردو افسانہ نگاروں کا ہندی میں افسانے لکھنا اور کافی معاوضہ کمانا سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ خاص طور سے اس لئے اور بھی کہ اردو کے اچھے افسانہ نگاروں کو ہندی کے اچھے افسانہ نگاروں کے برابر کا درجہ بھی دیا جاتا ہے۔

ان حالات میں اس بات کا خطرہ بہرحال موجود ہے کہ ہمارے بعض ممتاز افسانہ نگار کچھ دنوں بعد صرف ہندی میں لکھیں اور اردو میں لکھنے کا سلسلہ ترک کر دیں کیوں کہ ہندوستان میں نہ تو ہندی رسالوں کے جیسے خوبصورت معیاری اور کثیر الاشاعت اردو رسالے نکلتے ہیں اور نہ ہی چند رسالوں کو چھوڑ کر کوئی رسالہ افسانے کی اشاعت کا معاوضہ دیتا ہے چناں چہ اردو رسالوں کے لیے لکھنے کا معاملہ محض "ادب برائے ادب" قسم کی سرگرمی بن کر رہ جائے گا جسے اس بھاگ دوڑ اور مصروفیت کے زمانے میں بہت کم لکھنے والے جاری رکھ سکیں گے۔

ادیب کا اپنی تحریر کا معاوضہ اور معقول معاوضہ طلب کرنا کوئی معیوب بات نہیں لیکن اردو رسالوں اور ہندی رسالوں کے اس تقابل کے پس منظر میں یہ بات غور طلب ضرور ہے کہ اردو کی مخصوص پوزیشن اور اس کی بقا و ترقی کو لاحق ہونے والے خطرات کے مدنظر اردو افسانہ نگاروں کو اپنے موجودہ رویہ پر نظر ثانی کرنے کی حمایت میں بہت سی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن غالباً یہ دلیلیں زیادہ موثر نہ ثابت ہوں گی۔ ہمارے ملک میں ترقی اور روپیہ کمانے کے نئے نئے راستے نکل رہے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب کسی کام کو مشن سمجھ کر کرنے کا زمانہ عارضی طور پر ہی کیوں نہ سہی ختم ہو چکا ہے۔ لوگ ادب کو پیشہ کے طور پر اپنانے میں زیادہ یقین رکھتے ہیں اور جب ادب پیشہ بن جاتا ہے تو پھر جس ادب سے اور جس قسم کے ادب سے زیادہ پیسہ مل سکتا اس کی طرف ادیبوں کا توجہ دینا بالکل فطری بات ہے ملک کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ترقی کے طرح طرح کے مواقع مل رہے ہیں خود اردو جیسی غریب زبان کے ادیبوں کو بھی چھوٹے پیمانہ پر کیوں نہ سہی بہت سی سہولتیں مل رہی ہیں اور بعض شاعر مشاعرے میں شرکت کے لئے مدراس سے بذریعہ ہوائی جہاز جموں پہونچتے ہیں یا بعض ادیب اردو ہی کے نام پر روس امریکہ اور دوسرے ملکوں کے سال میں دو دو چکر لگا لیتے ہیں۔ ان حالات میں اردو کے افسانہ نگاروں کو ہندی کے رسالوں میں لکھنے سے کون روک سکتا ہے اور ایک ایک افسانے کا سو ڈیڑھ سو روپیہ معاوضہ، وصول کرنے والے کسی کی بات کیوں مانیں گے۔

دراصل یہاں مقصد کسی کا مذاق اڑانا یا کسی پر نکتہ چینی کرنا نہیں بلکہ اس صورتحال کو اجاگر کرنا ہے۔ ان حالات میں ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ اردو افسانہ نگار ہندی رسالوں پر چھائے جا رہے ہیں یا ہندی رسالے اردو پر چھائے جا رہے ہیں۔

(بسلسلہ صفحہ ۲۳)

تصادم ہو تو بہر حال ملی حقوق مرجح ہونا چاہئیں۔ لیکن اسلامی ریاست کے ساتھ ہو کر وطن اور ملک کے خلاف جنگ بھی نہ کرنا چاہیئے۔ مشہور فقیہ علامہ سرخسی فرماتے ہیں" اگر اسلامی حکومت اور اس حکومت میں جہاں مسلمان آباد ہیں جنگ چھڑ جائے تو مسلمانوں کو اپنے زمانہ قیام میں ہر طرح کے محاربانہ اعمال اور غداری سے مجتنب رہنا چاہیئے"۔ (مبسوط جلد دہم صفحہ ۹۸)

بعض اصحاب کی یہ روش نامحمود ہے کہ وہ علامہ اقبال کے جستہ جستہ اشعار سے وطنیت کے متعلق اُن کے تصور کی تعین فرماتے ہیں۔ اور ان کی نثری تحریرات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اقبال مرحوم کے واضح سیاسی اور مذہبی تصورات کو کسی قدر دھندلا بنا دیتے ہیں۔ خود شعر و شاعری کی بابت علامہ کے یہ الفاظ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئیں۔

"شاعرانہ القا یا الہام سے جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے وہ اصلاً انفرادی حیثیت کا ہے۔ وہ مجازی، مبہم اور غیر متعلق یعنی نامشخص ہوتا ہے" (خطبات صفحہ ۱)

مطبوعات ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی معہ جدید قیمت مئی ۱۹۷۶ء)

(ا)

۱۔ امیر خسرو نمبر — فروغ اردو — ۱۲/-

۲۔ ادبی جائزے — سعادت علی صدیقی — ۸/-

۳۔ ایکتا کا چمن، تہواروں کے پھول۔ — عمر لسوانی — ۳/-

۴۔ احتشام حسین نمبر (فروغ اردو) — سید انصار حسین ناہلی — ۵/-

۵۔ اردو کا ماضی، حال اور مستقبل۔ — احمد ابراہیم علوی — ۳/-

۶۔ آئینہ نظم اردو — عمر لسوانی — ۳/-

۷۔ انتخاب کلام چکبست لکھنوی — روپ نرائن شیوپوری شاکر — ۱/-

۸۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر — ڈاکٹر محمود الحسن رضوی — ۱۶/-

۹۔ اردو ہم نمبر، فروغ اردو — اقبال صدیقی — ۳/۵۰

۱۰۔ انوار اللغات اردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز) — پروفیسر احتشام حسین — ۴/-

۱۱۔ ادبی تاثرات۔ — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/-

۱۲۔ آئینہ عقس — پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری — ۴/۵۰

۱۳۔ اردو ناول کی تنقیدی تاریخ — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۷/۵۰

۱۴۔ امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۴/۵۰

۱۵۔ انارکلی امتیاز علی تاج (جدید ایڈیشن) — ۲/۷۵

۱۶۔ امراؤ جان آدا — مرزا رسوا — ۵/۵۰

۱۷۔ اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۱۰/-

۱۸۔ اردو میں تنقید — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۶/-

۱۹۔ انتخاب قصائد اردو — مغیث الدین فریدی — ۱/۵۰

۲۰۔ ادب اور نظریہ — آل احمد سرور — ۸/-

۲۱۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم عبد الشکور — ۷/-

۲۲۔ ادبی نقوش۔ — شاہ معین الدین ندوی — ۸/-

۲۳۔ اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں — عبد الماجد دریابادی — ۸/-

۲۴۔ انتخاب جدید نثر اردو — سید احتشام حسین — ۴/۱۰

۲۵۔ اقبال مرتبہ فروغ اردو — ۰/۵۰

۲۶۔ البرامکہ اور ان کا عروج و زوال — ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے — ۳/-

۲۷۔ انتخاب کلام غالب — بشیر احمد علوی — ۱/۵۰

۲۸۔ ادبی تنقید — ڈاکٹر محمد حسن — ۷/۵۰

۲۹۔ انتخاب قصائد و غزلیات فروغ اردو جدید ایڈیشن — ۶/-

۳۰۔ ادب کیا ہے — ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی — ۳/۵۰

۳۱۔ ادبی خطوط غالب — مرزا محمد عسکری — ۷/-

۳۲۔ آئینہ نثر اردو — سعادت علی صدیقی — ۴/۵۰

۳۳۔ ایک نادر روزنامچہ — ڈاکٹر انوار الحسن ہاشمی — ۲/۵۰

۳۴۔ ابو نمبر — مجنوں گورکھپوری — ۰/۵۰

۳۵۔ اردو کی کہانی — سید احتشام حسین — ۲/۵۰

۳۶۔ ادب پارے حصہ نظم و نثر — " — ۵/۲۵

۳۷۔ ابو الکلام آزاد (نظم) — جگن ناتھ آزاد — ۰/۲۵

۳۸۔ ارمغان نثر و نظم — عبد الاحد خاں خلیل — ۲/۷۵

۳۹۔ افسانہ نمبر — مرتبہ فروغ اردو — ۱/۵۰

۴۰۔ اچھی نظمیں — اختر شتاق — ۰/۷۰

۴۱۔ اردو ادب میں طنز و مزاح جدید ایڈیشن — غلام احمد فرقت — کامل دو جلد — ۲۵/-

۴۲۔ اردو شاعری — امیر احمد علوی — ۲/-

۴۳۔ غزلیات حافظ صائب — غالب فارسی — ۳/-

۴۴۔ آخری یادگار نادر شاہ معہ ترجمہ — ۲/-

۴۵۔ اپنے پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب — اعجاز احمد فاروقی — ۱/۲۵

۴۶۔ اللہ کے پیارے — امیر حسن نورانی — ۰/۵۰

۴۷۔ اسپین کی شہزادی — صادق سرحدی — ۴/۵۰

۴۸۔ ادبی معرکہ نمبر — مرتبہ فروغ اردو — ۱/۵۰

۴۹۔ اپنی موج میں　اُدارہ　۲/۵۰
۵۰۔ انوارِ جدید خط و کتابت　خلیق احمد علوی　۔/۵۰
۵۱۔ ایک جان تین قالب　خان محبوب طرزی　۴/۵۰
۵۲۔ اُلفت　″　″　۵/۵۰
۵۳۔ آغازِ سحر　″　″　۴/۔
۵۴۔ امین آباد　″　″　۴/۔
۵۵۔ انشائے خطوط نویسی حصہ اوّل　مشیر احمد علوی　۔/۴۰
۵۶۔ اچھی کہانیاں　شمس الدین نوری　۔/۵۰
۵۷۔ انشائے خطوط نویسی حصہ دوم　۔/۷۵
۵۸۔ ایجادوں کی باتیں　مصطفےٰ حسن رضوی　۳/۔
۵۹۔ اچھی کہانیاں حصہ اوّل　شمس الدین نوری　۔/۵۰
۶۰۔ ″　″　حصہ دوم　″　۔/۵۵
۶۱۔ ″　″　حصہ چہارم　″　۔/۶۵
۶۲۔ ادب کا مقصد　ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی　۲/۵۰
۶۳۔ اسلامی نظمیں　محمد حسین علوی شمس　۔/۴۵
۶۴۔ اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں　عبدالماجد دریابادی　۳/۵۰
۶۵۔ اوراقِ گل　اختر مشتاق　۱/۔

(ب)

۶۶۔ بابائے اُردو عبدالحق　عبداللطیف اعظمی　۶/۔
۶۷۔ بستانِ حرم (جدید نستعلیق کلام)　زائر حرم حمید صدیقی　۳/۔
۶۸۔ شہیدِ محبت بوٹا سنگھ　خان محبوب طرزی　۲/۔
۶۹۔ بزمِ بے تکلف　ڈاکٹر سید عابد حسین　۴/۵۰
۷۰۔ بکٹ کہانی　ڈاکٹر نورالحسن و ڈاکٹر مسعود حسین خاں　۵/۔
۷۱۔ بہادر شاہ ظفر　امیر احمد علوی کاکوروی　۶/۵۰
۷۲۔ بہشتی ثمر (حصہ اوّل و دوم) خلاصۂ بہشتی زیور　مولانا تھانوی　۳/۸۰
۷۳۔ بانیِ اسلام　علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اُردو ترجمہ　۔/۷۵
۷۴۔ بشریتِ انبیاء　عبدالماجد دریابادی　۔/۴

(پ)

۷۵۔ پطرس کے مضامین　پطرس بخاری　۳/۔
۷۶۔ پیاری باتیں　محسن کاکوروی　۔/۴۰
۷۷۔ پھولوں کے انبار (ناول)　منظر سلیم　۴/۷۵
۷۸۔ پیسہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ　ڈاکٹر محمد حسن　۴/۔
۷۹۔ پاگل خانہ (ناول)　مائل ملیح آبادی　۳/۲۵
۸۰۔ پیغام　″　طاہر دریاپوری　۳/۔
۸۱۔ پنجاب میں اُردو　حافظ محمود شیرانی　۸/۔
۸۲۔ پردیسی کے خطوط (حصہ اوّل)　مجنوں گورکھپوری　۵/۔

(ت)

۸۳۔ مختصر تاریخ ادب اُردو (فروغ اُردو ایڈیشن)
ڈاکٹر سید اعجاز حسین　۱۲/۔
۸۴۔ تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ　فرید احمد علوی　۱/۔
۸۵۔ تحریریں مجموعہ مضامین　ڈاکٹر گیان چندر　۶/۔
۸۶۔ تاریخی جائزے　ڈاکٹر محمد یاسین　۳/۔
۸۷۔ تنقیدی تجزیے　کاظم علی خاں　۵/۔
۸۸۔ تعارف تاریخ اُردو ترمیم شدہ جدید ایڈیشن
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی　۶/۔
۸۹۔ تاجدارِ مدینہ　اقبال صدیقی　۔/۴۰
۹۰۔ تنقیدی اصول اور نظریے　حامد اللہ افسر　۶/۵۰
۹۱۔ تنقید و تحلیل　شبیہ الحسن نونہروی　۶/۵۰
۹۲۔ تنقیدی جائزے (جدید ایڈیشن)　سید احتشام حسین　۶/۔

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۹۳-	تنقیدی نظریات	جلد اول	سید احتشام حسین	۱۰/-
۹۴-	" "	جلد دوم	"	۱۰/-
۹۵-	تنقیدی اور عملی تنقید		"	۶/-
۹۶-	تنقیدی اشارے	(جدید اڈیشن)	آل احمد سرور	۵/-
۹۷-	ترانہائے خیام		ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۹۸-	تعلیمات اسلامی	مکمل چار حصص	محمد حسین شمس	۳/-
۹۹-	تصویر درد معہ ترجمہ		علامہ اقبال	۱/-

(ٹ)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۰۰-	ٹیگور		نادم سیتاپوری	۳/-
۱۰۱-	ٹھیکرے کی مانگ		صدیقہ بیگم سیوہاری	۲/-

(ث)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۰۲-	ثنائے حبیب و نعتیہ کلام		بہزاد لکھنوی	۲/۲۵

(ج)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۰۳-	جان غالب		محمد حسین شمس علوی	۳/-
۱۰۴-	جانگڑے		انور سیوانی	۳/-
۱۰۵-	جواہرات اسمٰعیل		ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۵۰
۱۰۶-	جنگ آزادی نمبر ۱	(۱۸۵۷ء)	فروغ اردو	۳/-
۱۰۷-	" " نمبر ۲		" "	۳/-
۱۰۸-	جوئے رواں	مجموعہ کلام	حامد اللہ افسر	۳/۵۰
۱۰۹-	جادو کی آنکھ	(جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بلگرامی	۳/۵۰
۱۱۰-	جگ ہنسائی	(مجموعہ افسانہ)	قیصر تمکین	۲/۵۰
۱۱۱-	جلوے		معین الدین دردائی	۲/-
۱۱۲-	جمیلہ بوپائری	(ناول)	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۱۱۳-	جگر نمبر اول		سید احتشام حسین	۸/-

(چ)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۱۴-	چوتھی بہن،	مجموعہ افسانہ	مسیح الحسن رضوی	۳/-

(ح)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۱۵-	حیات فضل الحق		خیر آبادی	۱/۵۰
۱۱۶-	حالی بحیثیت شاعر	(جدید اڈیشن معہ اضافہ)	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱۶/-
۱۱۷-	حسرت موہانی		عبد الشکور	۴/
۱۱۸-	حجاج بن یوسف		جرجی زیدان	۴/۵۰
۱۱۹-	حکیم نباتات		وزیر خاں لنگراں	۲/-
۱۲۰-	حبیبۂ غالب		سعادت علی صدیقی	۲/۵۰

(خ)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۲۱-	خضر راہ مع ترجمہ		علامہ اقبال	۱/-
۱۲۲-	خطبات ماجدی یا سیرت نبوی		عبد الماجد دریابادی	۳/۵۰
۱۲۳-	خضر راہ معہ ترجمہ		علامہ اقبال	۱/-
۱۲۴-	خلاصہ شریف زادہ		مرزا رسوا	۱/۲۵
۱۲۵-	خلاصہ روح تنقید			۱/-
۱۲۶-	خلاصہ جواہر العروض			۱/-
۱۲۷-	خبطی مزاحیہ		محمد علی واحد معہ مقدمہ شوکت تھانوی	۱/۵۰
۱۲۸-	خوش بختی کی تلاش		احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۲۹-	خلاصہ شعر الہند	حصہ دوم		۱/-
۱۳۰-	خلاصہ المیزان			-/۷۵

(د)

نمبر	کتاب		مصنف	قیمت
۱۳۱-	دیوان آبرو		ڈاکٹر محمد حسن	۶/-
۱۳۲-	دلچسپ کہانیاں		مسعود عالم	۴/۵۰

۱۳۳۔ دیوانِ فغانی　　۱/۵۰

۱۳۴۔ داستانِ سہراب و رستم معہ مقدمہ (فارسی)
عبدالاحد خاں خلیل　　۳/۵۰

۱۳۵۔ دلی کا یادگار مشاعرہ　　مرزا فرحت اللہ بیگ　　۱/۵۰

۱۳۶۔ دستۂ گل　　نبی نعمانی　　-/۶۰

۱۳۷۔ دوشیزۂ قاف　　(ناول)　　خان محبوب طرزی　　۵/-

۱۳۸۔ دلربا　　〃　　〃　　۳/-

۱۳۹۔ دلی کا دبستانِ شاعری (معہ اضافہ جدید ایڈیشن)

۱۴۰۔　　ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی　　۱۴/-

۱۴۱۔ دھندلکے میں　　ذکی کاکوروی　　۳/۵۰

(ڈ)

۱۴۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب　　ڈاکٹر نورالحسن　　-/۴۰

(ذ)

۱۴۳۔ ذوق و جستجو　　ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی　　۱۶/-

۱۴۴۔ ذوقِ ادب و شعور　　سید احتشام حسین　　۶/۵۰

۱۴۵۔ ذوقِ جنون، مجموعہ کلام　　آل احمد سرور　　۸/-

(ر)

۱۴۶۔ روایت اور بغاوت　　سید احتشام حسین　　۷/۵۰

۱۴۷۔ رباعیاتِ غالب فارسی معہ اردو ترجمہ　　سید اکبر حسین نورانی　　۳/-

۱۴۸۔ رہبرِ مضمون نویس　　شفاعت علی صدیقی　　۲/-

۱۴۹۔ راکھی　　ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی　　-/۵۰

۱۵۰۔ رخسارِ سحر　　(ناول)　　اللہ کریم قدوائی　　۱/۵۰

۱۵۱۔ رفتار　　وحشی محمود آبادی　　۳/۵۰

۱۵۲۔ رموزِ حکمت معہ مقدمہ اردو　　محمد شریف　　۳/۵۰

۱۵۳۔ ریاضِ فارسی　　منتخب کلامِ فارسی　　۳/-

۱۵۴۔ ریختۂ ولی　　ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی　　۲/-

(ز)

۱۵۵۔ زکوٰۃ الحلی یعنی (زیورات کی زکوٰۃ)　　مولانا تقی نوری　　-/۵۰

۱۵۶۔ زینتوں کا بادشاہ، حکیم بانا مزاحیہ ناول
سید علی عباس حسینی　　۳/-

(س)

۱۵۷۔ سلور کنگ　　آغا حشر کاشمیری　　۲/۵۰

۱۵۸۔ سوانح اور خاکے　　نجم الحسن نقوی　　۴/-

۱۵۹۔ سرور جہاں آبادی　　ڈاکٹر حکیم چند نیر　　۸/-

۱۶۰۔ سرودِ نو　　(مجموعہ کلام)　　پروفیسر اختر قادری　　۳/۵۰

۱۶۱۔ سنگ گہر　　سید احتشام حسین　　۴/-

۱۶۲۔ سرسید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری　　سید علی عباس حسینی　　۱/۵۰

۱۶۳۔ سرمایۂ زبانِ اردو　　جلال لکھنوی　　۷/۵۰

۱۶۴۔ سفر　　(ناول)　　مائل ملیح آبادی　　۴/-

۱۶۵۔ سیاحتِ زمین　　(ناول)　　محمود اعظم فہمی　　۱/۵۰

۱۶۶۔ ستاروں سے آگے　　ناظر کاکوروی　　۳/۵۰

۱۶۷۔ سنہرا حلقہ　　-/۷۵

۱۶۸۔ سرسید احمد خاں　　انوار الحسن صدیقی　　-/۴۰

۱۶۹۔ سوشل اسٹیڈی　　احمد محسن کاکوروی　　۱/۷۵

۱۷۰۔ سازِ دل　　ذکی کاکوروی　　۲/۵۰

(ش)

۱۷۱۔ شعرِ نو تنقیدی مجموعہ　　ڈاکٹر محمد حسن　　۶/۵۰

۱۷۲۔ شرحِ دیوانِ غالب　　(مزاحیہ)　　غلام احمد فرقت　　۸/۵۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۷۲	شرح سنگ گہر	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۳	شاہ غمگین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۱۷۴	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۱۷۵	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۴/-
۱۷۶	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۱۷۷	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	۴/-
۱۷۸	شرح دیوان غالب (جدید ایڈیشن)	نظم طباطبائی	۷/۵۰
۱۷۹	شہری اور سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	۱/۸۰
۱۸۰	" "	"	۱/۹۵
۱۸۱	" "	"	۹/-
۱۸۲	" "	"	۱/-
۱۸۳	شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ	میر احمد علوی	۳/۵۰
۱۸۴	شعر العجم، حصہ اول۔ دوم، سوم، چہارم، پنجم	شبلی نعمانی	۲/۴۴
۱۸۵	شرح نثر امروز ایران	احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۸۶	شرح امروز ایران	" "	۲/۵۰
۱۸۷	شمع و شعر	علامہ اقبال	۱/۵۰
۱۸۸	شرح منیر منتخبات وزیر خان	نیر مسعود	۱/۲۵
۱۸۹	شرح انتخاب قصائد [illegible]	[illegible]	۱/-
۱۹۰	شرح شعر پاکستان حصہ اول	ڈاکٹر انوار الحسن	۳/-
۱۹۱	شرح تا نہایت نیام	حکیم عبدالقوی	۲/-
۱۹۲	شرح مفتاح العروض	عبدالقوی دریابادی	۱/۵۰
۱۹۳	شرح نصاب فارسی		۵/-
۱۹۴	شرح شعر پاکستان دوم	احسن الظفر	۳/-
۱۹۵	شرح گلہائے ادب		۳/-
۱۹۶	شرح آئینہ نظم اردو		۳/-
۱۹۷	شرح نثر فارسی امروزہ		۳/-

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱۹۸	شرح آئینہ نثر اردو	خلیل قدوائی	۳/۵۰
۱۹۹	شرح غنچہ و گل		۵/-
۲۰۰	شرح شعر فارسی کلاسیک	احسن الظفر	۳/-
۲۰۱	شرح ہمارا زبان اردو درجہ ۶، ۷، ۸ درجہ کے	خلیل قدوائی	۲/-

(ص)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۲	صید و ہدف (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۵/-
۲۰۳	صحیفۂ محبت مہدی افادی کے خطوط	ڈاکٹر محمود الہی	۲/-

(ط)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۴	طربی نمبر (رسالہ صوب طرزی)	مرتبہ فروغ اردو	۳/-
۲۰۵	طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے	غلام الثقلین	-/۴۵
۲۰۶	طلسم اسرار (ڈرامہ)	مرزا رسوا لکھنوی	۱/۵

(ع)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۰۷	عذرا (ناول)	صالحہ عابد حسین	۴/-
۲۰۸	عکس اور آئینہ (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	سید احتشام حسین	۱/۵۰
۲۰۹	عبدالماجد دریابادی نمبر		۹/-

(غ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۱۰	غالب کا تنقیدی شعور	اخلاق حسین عارف	۶/-
۲۱۱	غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۶/-
۲۱۲	غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر	سید امیر حسن نورانی	۴/-
۲۱۳	غالب کی تخلیقی تخیل	تمہید صفی پوری	۸/-
۲۱۴	غنچہ و گل	سید محمود الحسن رضوی	۲/۵۰

۲۱۵- غالب کے کلام میں اخلاقی عناصر — نادم سیتاپوری — ۴/-
۲۱۶- عشق کا دروازہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/۵۰
۲۱۷- غزلیات نظیری — ۱/۵۰
۲۱۸- غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید ایڈیشن) — ذکی کاکوروی — ۲۵/-

(ف)

۲۱۹- فروغ (نعت) — طاہر محسن علوی — ۴/۵۰
۲۲۰- فن خطابت یعنی اُستاد تقریر — کالب مصطفیٰ ایڈوکیٹ — ۱۵/-
۲۲۱- فریدہ — خان محبوب طرزی — ۱/-
۲۲۲- فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی — نادم سیتاپوری — ۷/-
۲۲۳- فلسفۂ اقبال — عبدالقوی دریابادی — ۴/۵
۲۲۴- فلسفی ابن رشد — مائل ملیح آبادی — ۳/۵۰
۲۲۵- فروغ جام مجموعۂ کلام — نشور واحدی — ۴/-
۲۲۶- فغان محسن — محسن کاکوروی — ۴/-
۲۲۷- فارسی آموز — منیر احمد علوی — ۱/-
۲۲۸- فن داستان گوئی (جدید ایڈیشن) — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۷/-

(ق)

۲۲۹- قدیم جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں — غلام احمد فرقت — ۴/-
۲۳۰- قصائد ظہیر فاریابی — ۲/-
۲۳۱- قصائد مومن مع شرح — ظہیر احمد صدیقی — ۴/۵۰
۲۳۲- قطرے سے گہر ہونے تک — صالحہ عابد حسین — ۷/-
۲۳۳- قصص و مسائل — عبدالماجد دریابادی — ۳/-
۲۳۴- قصائد قاآنی (فارسی) — ۱/-
۲۳۵- قومی ادب نثر و نظم — حامد اللہ افسر — ۴/-
۲۳۶- قیامت صغریٰ (سائنسی ناول) — خان محبوب طرزی — ۳/-

(ک)

۲۳۷- کلیات اقبال — علامہ اقبال — ۸/-
۲۳۸- کیسر اور کاہی — بدرالدین طیب جی — ۳/-
۲۳۹- کف گل فروش (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۵/۵۰

(گ)

۲۴۰- گاندھی نمبر — ۲/-
۲۴۱- گلدستۂ فارسی اول و دوم — محمد غوث بیگ سیفی — ۲/۲۵
۲۴۲- گلزار فارسی یعنی آمد نامہ جدید — -/۷۰
۲۴۳- گلہائے ادب — عبدالاحد خاں خلیل — ۳/-
۲۴۴- گاندھی جی کے ساتھ — حامد اللہ افسر — ۱/۵۰

(ل)

۲۴۵- لوائح جامی مع مقدمہ — عبدالاحد خاں خلیل — ۱/۵۰
۲۴۶- لال قلعہ — مائل ملیح آبادی — ۶/-
۲۴۷- لب بام — عادل رشید — ۶/-
۲۴۸- لسانیات اور اردو — سید محمود الحسن رضوی — ۴/۵۰

(م)

۲۴۹- مرقع اقبال — عصمت فاطمہ علویہ — ۱۲/-
۲۵۰- مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو — غلام احمد فرقت — ۸/۵۰
۲۵۱- محسن کاکوروی نمبر — ۳/۵۰
۲۵۲- مسلمان اور کانگریس — ابوالکلام آزاد — ۳/۵۰
۲۵۳- مرثیہ نگاری اور میر انیس — ڈاکٹر احسن فاروقی — ۵/-
۲۵۴- مضامین فرحت حصہ اول — مرزا فرحت اللہ بیگ — ۵/-
۲۵۵- " " حصہ دوم " — ۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۵۶	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۳/-
۲۵۷	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۶/۵۰
۲۵۸	موسم گل (ناول)	عادل رشید	۷/-
۲۵۹	مجبور	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۲۶۰	مضامین جدید	محمد ہادی	۱/۲۵
۲۶۱	مثنوی سحر ہلال فارسی	معہ مقدمہ قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۲۶۲	مطالعہ	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۶۳	مولوی نذیر احمد کی کہانیاں	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۲۶۴	معرکہ روم دیونان	صادق سردھنوی	۶/-
۲۶۵	مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۲۶۶	مطالعہ ماؤ		۶/-
۲۶۷	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
۲۶۸	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/۵
۲۶۹	مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۷۰	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصاب بی اے حالی	۲/۵۰
۲۷۱	مرثیہ غالب	حالی	-/۲۵
۲۷۲	محبوبہ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۷۳	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۷۴	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	-/۴۰
۲۷۵	انتخاب فسانۂ آزاد یعنی	سرشار لکھنوی	
۲۷۶	مہاراج بلی	ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۲۷۷	مسز بلاکی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	-/۷۵
۲۷۸	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۲۷۹	مصباح بلاغت معہ مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۲۸۰	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۴/۵۰
۲۸۱	مقدمات و مقالات	عبدالاحد خاں خلیل	۵/۵۰
۲۸۲	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۲/-
۲۸۳	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۸۴	نثر امروز ایران	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۲۸۵	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۴/-
۲۸۶	نقد و انتقاد	اعجاز احمد مبجز	۲/۵۰
۲۸۷	نقش حالی دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	
۲۸۸	شجاعت علی سندیلوی		۳۰/-
۲۸۹	نغمہ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۹۰	نفحات الہند مع مقدمہ۔ اردو	محمد شریف	۳/-
۲۹۱	نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۰/-
۲۹۲	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۲۹۳	نسرین و نسترن	ذکی کاکوروی	۵/-
۲۹۴	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۲۹۵	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۲۹۶	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبدالماجد دریابادی	
	نوائے سرور جہاں آبادی	ڈاکٹر حکم چند نیر	۷/-
۲۹۷	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۲۹۸	نوروز	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۹۹	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدید	آل احمد سرور	۱۰/-
۳۰۰	نقوش و افکار	مجنوں گورکھپوری	۶/۵۰
۳۰۱	نیلم	انتظار حسین	۳/-
۳۰۲	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۰۴	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۵/-
۳۰۵	منشی نولکشور نمبر		۲/۵۰

(و)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۰۶	وعدہ فردا	اخگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-

(ہ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۰۷	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۵/-
۳۰۸	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۱/۲۵
۳۰۹	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۳۱۰	ہندو تہوار [illegible]	[illegible]	۱/۶۰
۳۱۱	ہندو تہوار [illegible]		۱/۵۰
۳۱۲	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر [illegible]	-/۸۰
۳۱۳	" حصہ ۲	"	-/۹۵
۳۱۴	" حصہ ۳	"	۱/-
۳۱۵	" حصہ ۴	"	۱/-
۳۱۶	یادگار غالب	مولانا حالی	۶/-
۳۱۷	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۳۱۸	یادگار قیس		
		امیر احمد علوی	۴/-

ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اُردو نمبر ۳۷ (امین آباد پارک لکھنؤ)

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو یا تین تاریخ کو پابندی کیساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی، ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں۔

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں۔

(۴) جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے۔

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

جلد (۲۴)
رجسٹرڈ نمبر ایل، ڈبلیو/ این۔پی ۹۲
دفتر فون : ۲۶۱۳۶
فون رہائش گاہ ۲۶۷۵۶

ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان
شمارہ (۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱)

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱) مئی، فروری، مارچ، اپریل ۱۹۷۷ء جلد (۲۴)

ایڈیٹر:
محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

مجلس ادارت:
۱۔ عبدالقوی دریابادی بی، اے
۲۔ سعادت علی صدیقی

مرتب، چکبست نمبر
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی
(شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی)

زر سالانہ اعزازی — دس روپے
عوام سے — آٹھ روپے
فی پرچہ — ۷۰ پیسے
چکبست نمبر — دس روپے

پتہ
ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

مجلس مشاورت

سید شبیہ الحسن نونہروی صدر شعبہ اردو	لکھنؤ یونیورسٹی
جناب نسیم قریشی ریڈر شعبہ اردو	مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر انوار الحسن	لکھنؤ یونیورسٹی
ڈاکٹر حکم چند نیّر	بنارس یونیورسٹی
ڈاکٹر سید محمود الحسن	الہ آباد یونیورسٹی
سید جعفر عباس	الہ آباد یونیورسٹی

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس، نادان محل روڈ لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحات
۱۱-	چکبست کی قومی شاعری کا تجزیہ	نجم الحسن انجم ادیب	۸۹
۱۲-	بلبل شیدا	فدا المصطفےٰ فدوی	۹۵
۱۳-	چکبست و شرر کا ادبی معرکہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۹۶
۱۴-	پنڈت برج نرائن چکبست اور نوحے	ڈاکٹر آصفہ زمانی	۱۰۱
۱۵-	چکبست کے شخصی مرثیے	ڈاکٹر اخلاق اثر	۱۱۳
۱۶-	چکبست بہ حیثیت نقاد	ڈاکٹر سید محمود الحسن رضوی	۱۲۷
۱۷-	سانیٹ شعر چکبست	اشرف مالوی	۱۳۱
۱۸-	چکبست لکھنوی شخصیت اور شاعر	مفتوں کوٹوی	۱۳۲
۱۹-	چکبست کی وطنی شاعری	مناظر عاشق ھرگانوی	۱۴۰
۲۰-	چکبست ایک قومی شاعر	قاسم رضا جعفری	۱۴۴
۲۱-	چکبست کی سیاسی شاعری	علیم جہانگیر	۱۴۷
۲۲-	اے محب وطن	جعفر ملیح آبادی	۱۵۲
۲۳-	روح چکبست کا پیام	سید فرحت حسین	۱۵۳
۲۴-	پنڈت برج نرائن چکبست	ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	۱۵۸
۲۵-	پنڈت برج نرائن چکبست	ڈاکٹر سلمان عباسی	۱۶۸

قندِ مکرّر

چکبست نمبر کی اشاعت کے ساتھ 'فروغ اُردو' کے خصوصی شماروں کی تعداد میں ایک شمارہ کا اور اضافہ ہو رہا ہے، اب تک اُردو اور لکھنؤ کے اس منفرد شاعر اور ادیب پر کسی جریدہ نے خصوصی نمبر نہیں شائع کیا۔ فروغ اُردو نے چکبست نمبر نکال کر اپنا ایک اَدبی فریضہ بھی ادا کیا اور اوّلیت کا شرف بھی حاصل کیا۔

ادارہ فروغ اُردو کے لیے یہ بات بڑے فخر و اطمینان کی ہے کہ اس کے تمام خصوصی شمارے دُنیائے ادب میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ حالیؔ، جگر، غالبؔ، محسنؔ، احتشام حسین، عبدالماجد دریابادی اور حضرت امیر خسرو کی حیات اور اَدبی کارناموں پر اس کے خصوصی نمبر، اُردو کا گرانقدر سرمایا تسلیم کیے گئے، ان کے علاوہ دوسرے نمبر افسانہ نمبر، نولکشور نمبر، فرقت کاکوروی نمبر،

اردو نہم نمبر وغیرہ کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔

چکبست نمبر کے لیے بھی یہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ نمبر ہر حیثیت سے معیار اور مثالی ہو، چکبست کی سیرت و شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤ کو تحقیقی انداز میں پیش کیا جائے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے بہت سے کرم فرماؤں نے، اپنے گرانقدر مقالوں سے اس نمبر معیاری بنانے میں ادارہ سے اشتراک فرمایا ہے اور چکبست کی حیات ان کی شاعری اا نثر نگاری کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے ادارہ فروغ اُردو ان حضرات کا تہہ دل سے شکر گذا میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں جناب اخلاق اثر صاحب کا شکریہ ادا کروں جنکے خصوصی کرم ـ چکبست کی تصویر شعبہ اُردو ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال سے حاصل کرکے ادارہ کو مرحمت فرمائی یہ تصویر، مشہور مصور جناب شکیل اعجاز کے موقلم کا کرشمہ ہے۔ ادارہ ان سب کا شکر گزار ہے

اُردو کے ادیبوں، دانشوروں، اساتذہ اور مختلف اداروں کے نمائندوں نے تمام سیاسی جماعتوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اُردو زبان بولنے والوں کے حسب ذیل مطالبات کے سلسلہ میں واضح، غیر مبہم، اور دوٹوک الفاظ میں اپنے موقف کی وضاحت کریں۔

- شمالی ہند کی ان ریاستوں میں جہاں کی سرکاری زبان ہندی تسلیم کی گئی ہے خاص طور پر دہلی، اتر پردیش اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔
- ان ریاستوں کے تمام سرکاری اور میونسپل ملازمین کے لیے (جنمیں پوسٹ آفس اور بنکور کے ملازمین بھی شامل ہیں) اُردو زبان کا جاننا لازمی قرار دیا جائے۔
- ان ریاستوں میں اُردو کو مادری زبان گننے والے بچوں کی تعلیم کا انتظام ثانوی منزل تک مادری زبان میں کیا جائے اور اس مقصد کیلئے حکومت اُردو میڈیم اسکول، کالج اور ضرورت ہو تو یونیورسٹی

قائم کرے۔

- ان ریاستوں کے تمام اسکولوں میں جونیر سطح پر ہندی کیساتھ ساتھ اُردو کی تعلیم بھی لازمی قرار دیجائے
- ان مقاصد کے حصول کیلئے سرکاری زبان کے ایکٹ اور ضرورت ہو تو دستورِ ہند میں مناسب ترمیم کیجائے دستخط کرنیوالوں میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ، انجمن ترقی اُردو ہند اور دوسری انجمنوں کے ذمہ داران، اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر صاحبان، اور مشہور و ممتاز قومی و سماجی حضرات ہیں۔

یہ مطالبات نئے نہیں ہیں، انجمن ترقی اُردو اور دوسرے ادارے سیکڑوں مرتبہ اس قسم کی عرضداشتیں حکومت کی بارگاہ میں پیش کر چکے ہیں انمیں سے بہت چند باتیں حکومت تسلیم بھی کر چکی ہے متعلقہ محکموں کو ہدایات اور مشورے بھی دے چکی ہے مگر ان پر عملدرآمد کیوں نہیں ہوتا، اور حکم عدولی کرنے والوں سے باز پرس کیوں نہیں کی جاتی ؟ اس کو حکومت کی مصلحت اندیشی، بے بسی، یا چشم پوشی سمجھئے یا پھر لسانی آمریت کا حکم عدولی کرنے والوں سے باز پرس کیوں نہیں کی جاتی ؟ یہ حکومت کی چشم پوشی، مصلحت اندیشی اور بے بسی ہے یا لسانی آمریت کا جبر، کچھ بھی ہو اُردو کو عملی طور سے منظم طریقہ پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ابھی جشن لکھنؤ بڑے اہتمام کے ساتھ منایا گیا تھا ایک لکھنوی تہذیب و ثقافت کی نمایش کیگئی تھی۔ اس نمایش میں اس امر کا خاص اہتمام کیا گیا کہ کہیں اُردو زبان کا کوئی لفظ کسی سرکاری، نیم سرکاری، ادارے میں آنے پائے حتیٰ کہ نوابین اودھ کا تعارف بھی اس زبان میں نہ کیا جائے یہ سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت اُردو کشی پر عمل نہیں کیا گیا۔

حکومت کے تمام شعبہ جات میں "اُردو کے چلن" کا یہی حال ہے۔ اُردو کے بارے میں قول و عمل کا یہ تضاد روزِ روشن کیطرح عیاں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے جمہوریت باشعور ہوتی جائیگی اُردو کی ترقی ہوتی جائیگی۔

۱۹۷۶ء کے ابتدائی مہینے اُردو دنیا کے لیے انتہائی نامبارک ثابت ہوئے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی جناب فخرالدین علی احمد اور جناب کرشن چندر جیسی عظیم ہستیاں اور جناب مختار ہاشمی و جناب بسمل صدیقی لکھنوی جیسے کہنہ مشق شاعر اس مختصر مدت میں ہم سے جدا ہوگئے، ادارہ فروغ؛ دو اپنے سرپرستوں اور محسنین سے محروم ہوگیا ان سب کی وفات اردو دنیا کیلئے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

جعفر ملیح آبادی

شاعرِ حیات

قطعہ

چکبست اے محبِ وطن شاعرِ حیات
بے مثل و بے نظیر سخندانِ لکھنؤ
اُردو ادب کی شان بڑھی تیری ذات سے
کرتا ہے تجھ پہ ناز دبستانِ لکھنؤ

نظم

وہ چکبست وہ شاعرِ خوش بیاں
وہ نازِ ادب، فخرِ ہندوستاں
وہ شیریں سخن اور شیریں مقال
وہ روشن دماغ اور روشن خیال
تہہ دل سے بھارت کا غم خوار تھا
غلامی سے ناخوش تھا بیزار تھا
غمِ ہند میں جان کھوتا تھا وہ
تڑپتا تھا دل، خون روتا تھا وہ
رہا عمر بھر نغمہ خوانِ حیات
سُناتا رہا داستانِ حیات
دلوں میں جگاتا رہا ولولے
بڑھاتا رہا قوم کے حوصلے
سُناتا رہا حریت کا پیام
لنڈھاتا رہا حبِ قوم کے جام
وہ گیسوئے اُردو سنوارا کیا
چمن شاعری کا نکھارا کیا
کلام اُس کا ہے بے بدل بے نظیر
تخیل ہے پیارا، زباں دل پذیر

"عجب سوز ہے اور عجب ساز ہے"
ہر اک سے جُدا اُس کی آواز ہے

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
سابق صدر شعبۂ اردو (لکھنؤ یونیورسٹی)

چکبست کے تغزل کا ایک رنگ

پنڈت برج نرائن چکبست (۱۸۸۲ء - ۱۹۲۶ء) اپنے زمانہ کے ترقی پسند شعراء میں تھے۔ شروع بیسویں صدی کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک پرجوش سیاسی بیداری کا زمانہ ہے۔ اس وقت کا تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ بالخصوص حب وطن اور وطنیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر بدیسی حکومت کے پنجوں سے نجات پانے کیلئے بیقرار ہو رہا تھا۔ یہ سیاسی آزادی کبھی ہوم رول کے نام سے کبھی مملکتی درجہ (ڈومی نین اسٹیٹس) کبھی سوراج کبھی ملک آزادی کے نام سے طلب کیجاتی تھی۔ جنگ عظیم کے اختتام (۱۹۱۹ء) سے لیکر ۱۹۳۶ء تک اس سلسلے میں بڑے بڑے ہنگامے ہوئے۔ چکبست لکھنؤ کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے معاشرتی زندگی کی اصلاح اور قومی سیاسی زندگی کے مسائل کو بالواسطہ اور بلا واسطہ شعر و شاعری میں جگہ دی۔ ملک کی سیاست میں وہ کھل کر تو حصہ نہ لے سکے لیکن اس وقت کے تمام قومی لیڈروں سے رابطہ روحانی قائم تھا گوکھلے، رانا ڈے اور تلک پر اُن کے مرثیے اور مسز اینی بسنٹ کی رہائی پر اُن کی نظم اس پر شاہد ہیں۔ اُن کی دیگر نظمیں بھی حب وطن اور سیاسی آزادی (بصورت ہوم رول) کے جذبے سے سرشار ہیں اسی کے ساتھ معاشرتی اصلاح کے سے خیالات کی بھی آئینہ داری کرتی ہے۔ خصوصاً 'ہوم رول' پر بہت زیادہ زور ہے اور یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

سیاسی اور معاشرتی زندگی سے یہ تعلق خاطر ظاہر ہے کہ وہ غزلوں میں اس قدر شدت کے ساتھ اور اتنی شرح و بسط نیز اتنی واقعیت کے ساتھ نہیں پیش کر سکتے تھے اسی لئے نظمیں لکھیں لیکن لکھنؤ میں غزل اُن کے زمانہ میں بھی عام مقبولیت رکھتی تھی جگہ جگہ طرحی مشاعرے

آئے دن ہوا کرتے تھے۔ اُن کی جتنی غزلیں اُن کے مجموعہ کلام "صبح وطن" میں ملتی ہیں وہ سب زیادہ تر ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۸ء تک کی کہی ہوئی ہیں۔ ان کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ چالیس سے کم ہی ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں بھی اپنے جذبہ حب وطن اور آزادی کی لگن کو نہیں بھولے ہیں۔ ہر چند کہ غزل رمز و کنایات، تشبیہ و استعارات کی زبان ہوتی ہے لیکن ان پردوں میں بھی اور کہیں واضح طور پر وہ اپنے مخصوص خیالات و جذبات کو پیش کرنے سے باز نہیں رہ سکتے ہیں۔

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کیلئے
یہ آرزو کی جوانی، رہے رہے نہ رہے

•••

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کیلئے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

جذبہ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ مہکنے پائیں
چپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے

باغ میں لے کے جنم ہم نے اسیری جھیلی
ہم سے اچھے رہے جنگل میں جو آزاد
دم سے گاندھی کے رہے شور وفا بستی میں
قیس جنگل میں رہے کوہ پہ فرہاد رہے

بعض غزلیں پوری پوری وطن کی محبت سے پر ہیں یا سیاسی حالات پر تبصرہ کی نوعیت رکھتی ہیں مثلاً ذیل کی غزلیں جن کے چند اشعار یہ ہیں۔

کبھی تھا ناز زمانہ کو اپنے ہند پر بھی
پر اب عروج وہ علم و کمال فن میں نہیں
غرور جہاں نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

جو غزل پنجاب کے مارشل لا کے وقت ۱۹۱۹ء میں کہی گئی تھی اُس کے دو شعر ملاحظہ فرمائیے۔

انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے
گنہگاروں میں شامل ہیں گناہوں سے نہیں واقف
سزا کو جانتے ہیں ہم خدا جانے خطا کیا ہے

۱۹۱۷ء میں مسز اینی بسنٹ کی نظر بندی کا حکم منسوخ

...ہونے پر یہ غزل کہی تھی۔

...گردنیں خم ہیں ندامت سے دل آزاروں کی
...ہو گئی بات زمانے میں وفاداروں کی

بیڑیاں کٹ کے گریں خاک کے پتلے کی طرح
روح آزاد تھی پہلے ہی گرفتاروں کی

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

...۱۹۱۶ء میں ہندو مسلم اختلافات کے سلسلے میں ایک غزل
...کہی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

...زباں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا
...کبھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا

زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
ابلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

بہت پنہاں رہی دل میں خلش خارِ تعصب کی
مگر اب امتحاں کے وقت پردا ہو نہیں سکتا

...اسی قبیلہ کے یہ اشعار بھی ہیں

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے
طرزِ ہندو دیکھ کر رنگِ مسلماں دیکھ کر

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں

نفاقِ گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

وہ فرنگی تہذیب سے بیزار ہیں خود انگلستان چلے
نہیں جاتے ہیں۔ دوسرے جاتے ہیں تو اُن پر افسوس کرتے
ہیں۔

کرشمہ یہ بھی ہے اے بے خبر افلاس قومی کا
تلاشِ رزق میں اہلِ ہنر کا دربدر جانا

نئی تہذیب کے صدقہ نہ غرمانے دیا دل کو
رہے منطق کے پردے میں کرشمے بے حیائی کے

ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

ذیل کے اشعار بھی اُن کی وطن پرستی کے جذبات سے پر ہیں

کچھ ایسا پاسِ غیرت اس عہدِ پرفن میں
کہ زیور ہو گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا داماں مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

ہم پوچھتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

لایا ہے کیا پیام وطن پوچھتا ہوں میں
غربت میں دیکھتا ہے جو ابرِ بہار کو

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو

روشن دل ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اجڑے ہوئے گھر میں

خاک وطن میں دامن مادر کا چین ہے
تسکین گزند کی ہے لحد کا فشار کیا

دل کیے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

خلاصہ یہ کہ چکبست نے نظموں کے علاوہ اپنی غزلوں میں بھی اپنے ماحول سے تاثر پذیری خواہ وہ سیاسی نوعیت کی ہو یا سماجی پہلی مرتبہ لکھنؤ کی رجعت پسند فضا میں بڑے خلوص، جوش اور سوز کے ساتھ پیش کی اور یہاں کے روایتی ماحول میں ترقی اور انقلاب پسندی کی ایک روشن مثال قائم کر دی۔

●●

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

چکبست کی نظم گوئی

"صبحِ وطن" پنڈت برج نرائن چکبست کے کلام کا واحد مجموعہ ہے۔ جس کی اشاعت بدقسمتی سے انکی وفات کے بعد ۱۹۲۶ء میں ہوئی، پوری کتاب پانچ حصّوں میں منقسم ہے، پہلے، دوسرے اور تیسرے حصہ میں ۲۷ نظمیں ہیں جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۸ء تک کہی گئی ہیں۔ حصہ چہارم میں غزلیات ہیں جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۹ء تک تقریباً پندرہ سال کی مدت کی ہیں۔ اس میں مذہبِ شاعرانہ، جلوہ معرفت اور دو قطعہ بھی شامل ہیں، حصہ پنجم میں ابتدائی سات نظمیں اور کچھ متفرق کلام اور رباعیات ہیں جو ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۴ء تک کے دوران کے ہیں۔

ان پانچ حصوں سے الگ دو نظمیں "نذرانہ روح" اور نظم ظریفانہ "لارڈ کرزن سے چھیڑ" بھی اس کتاب کے شروع اور آخر میں درج ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ کلام ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۹ء تک یعنی تقریباً ۲۲ سال پر محیط کرتا ہے۔

چکبست ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تقریباً ۴۴ سال کی عمر پائی، ۱۹۰۸ء میں یعنی تقریباً ۲۶ سال کی عمر سے وکالت شروع کی اس پیشہ میں وہ بہت کامیاب رہے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ اسی پیشہ کے ہنگاموں میں گزرا۔ شاید مختصر زندگی اور مصروف و کامیاب وکالت نے اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ اردو ادب کو اپنی شاعری سے زیادہ مالا مال کرتے اور اپنی شاعری کو اپنی فکر کی گہرائیاں عطا کر سکے۔

چکبست کے زمانہ کا اگر جائزہ لیا جائے تو سیاسی شعور کے بیداری کا زمانہ ہے، حب الوطنی کے نغمہ الاپنے کا زمانہ ہے قومی اصلاح کا زمانہ ہے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں جو سیاسی ہار ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے شکست خوردگی، احساس کمتری، پژمردگی، مایوسی اور غمناکی کی جو فضا پیدا ہوئی تھی، اس کے اثرات اب زائل ہوتے نظر آتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ قوم میں احساس زندگی کی لہر پیدا ہونے

گئی تھی، مایوسی کی جگہ پر اُمیدی لے رہی تھی، بے عملی کی جگہ جذبۂ عمل بیدار ہوا چاہتا تھا، چنانچہ پر سکوت فضا میں جوش و خروش کے آثار نمایاں ہونا چاہتے تھے۔

اردو شاعری بھی ان حالات سے متاثر ہوئی چنانچہ الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے قومی، وطنی، اور اصلاحی نظموں کے ہندوستان کی فضا گونج اُٹھی تھی۔ خود چکبست کے ہم عصر علامہ اقبال کی فکر انگیز نظموں نے حب الوطنی اور حب قومی کے جذبے کو تیز سے تیز تر اور اس کی جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی کوشش کی تھی، ایسے پس منظر سے متاثر ہو کر لکھنؤ کے مخصوص شعری فضا سے ہٹ کر چکبست شاعری کے میدان میں حب الوطنی کا علم بلند کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور بہت مختصر مدت میں جدید اردو شاعری کی دنیا میں اپنا ایک مخصوص مقام پیدا کر لیتے ہیں۔

"صبح وطن" چکبست کی شاعری کا کل سرمایہ ہے جسے اگرچہ پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن میں نے اسے "مشق ابتدائی کا کلام" اور غزلیات کو چھوڑ کر اس طرح چھ حصوں میں بانٹا ہے۔

پہلا حصہ :-

حب وطن سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے جس میں حسب ذیل تین نظمیں ہیں۔ خاک ہند۔ ہمارا وطن دل سے پیارا وطن۔ وطن کو ہم، وطن ہم کو مبارک۔

دوسرا حصہ :

قومی شاعری کا ہے۔ اس حصہ میں اُن نظموں کو شامل کیا گیا ہے جو سیاسی، محدود قومی اور اصلاحی کہے جا سکتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:-

سیاسی۔ آوازہ قوم، ہم ہوں گے اور عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا، وطن کا راگ، مسز بسنٹ فریاد قوم، قوم کے سپوت ماؤں کی الوداع۔ نالہ درد،

محدود قومی۔ قومی مسدس، درد دل، نالہ یاس،

اصلاحی۔ پھول مالا (لڑکیوں سے)، برق اصلاح۔

تیسرا حصہ :-

اس حصہ میں وہ نظمیں ہیں جن میں شاعر نے اپنے مذہبی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ جو یہ ہیں۔ کرشن کنھیا، رامائن کا ایک سین۔

چوتھا حصہ :

شخصی مراثی کا ہے جس میں حسب ذیل سات مراثی ہیں۔

ماتم یاس، گنگا پرشاد ورما، بشن نرائن در، گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، اقبال نرائن مسلدان، نشتر یاس۔

پانچواں حصہ :

قدرتی مناظر اور اور عمارت سے متعلق ہے میرے ..... حساب سے اس میں صرف دو نظمیں آتی ہیں۔ سیر دہرہ دون۔ آصف الدولہ کا امام باڑہ (لکھنؤ)

چھٹا حصہ :

متفرقات کا ہے جو مندرجہ ذیل نظموں پر مشتمل ہے۔

معذرت، یادگار بابو گنگا پرشاد ورما، جلوۂ معرفت (فلسفۂ ویدانت)، قطعہ، گائے

(۱)

میری تقسیم کے مطابق پہلا حصہ خالص حب وطن سے متعلق نظموں پر مشتمل ہے ۔ خاک وطن چکبست کی مشہور نظم ہے جو اردو شاعری کی وطنی نظموں میں نمایاں درجہ رکھتی ہے اور مسدس کے آٹھ بند پر مشتمل ہے ۔ زبان بیان، انداز، لہجہ ہر اعتبار سے یہ نظم بہت اہم ہے اس کی ابتدا نہایت پر وقار اور پر خلوص انداز سے ہوتی ہے جس میں ہندوستان کی بڑائی بیان کرتے ہوئے ہمالہ کی عظمت، رفعت اور اہمیت مسرتوں سے لبریز ہو کر ظاہر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس کا وجود ہندوستان کے لیے باعث ناز ہے۔

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

پھر اس ملک کے روشن ماضی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہندوستان نے اس وقت جب وحشت اور درندگی کا دور تھا روحانی فیض پہنچا کر اور علم و دانش کا چراغ جلا کر دنیا کی رہنمائی کی ہے یہ سرزمین ہے جسے گوتم نے آبرو دی، اکبر نے الفت کا جام پلایا، رانا نے اپنے لہو سے اسے سینچا اور سرمد نے اپنے وطن کو اس کی خاطر خیرآباد کہا۔

یہاں کی اذان میں فردوس گوش کی کیفیت ہے اور ناقوس کی فغاں ایک خاص اثر رکھتی ہے ۔ کشمیر جنت نظیر کا پہلے جیسا حال ہے ، دریائے گنگ میں پانی کی شوکت باقی ہے ۔ اس طرح اپنے وطن ہندوستان میں اس کی ساری خوبیاں اب بھی پیشتر کی جیسی موجود ہیں لیکن انھیں اس کا غم ہے ۔

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

اور پھر نہایت غمگین لہجے میں کہتے ہیں ۔

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اور دعا کرتے ہیں ۔

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

آخری دو بند میں پھر وطن کے ساتھ محبت کی حمیت کا اظہار ان کے اس اعلان کے ساتھ ملتا ہے :

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

چکبست کی یہ نظم اردو میں وطن سے متعلق نظموں میں نمایاں مقام رکھتی ہے چنانچہ اس نظم کو ہمیشہ مقبولیت بھی حاصل رہی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ہندوستانیوں کے دلوں میں وطن سے محبت کے جذبہ کو نہ صرف تیز سے تیز تر کیا ہے بلکہ اس نے جنگ آزادی کی لڑائی میں حریت پسندوں کو ہر موڑ پہ آواز بھی دی ہے ۔ اس سلسلہ کی دو نظمیں اور ہیں جو بچوں کے لیے کہی گئی ہیں اور بہت خوب ہیں ، پہلی نظم

"ہمارا وطن دل سے پیارا وطن" اور دوسری نظم "وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک ہے" دونوں نظمیں ہلکی پھلکی، رواں دواں اور بڑی شستہ اور پاکیزہ و شیریں زبان میں ہیں۔ ان نظموں میں یہاں کے درخت، پھل پھول، ساون کی کالی گھٹا، برسات کی ہلکی پھوار، گنگا، جمنا، کوئل، مور سبھی پر اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ بچے بوڑھے سبھوں کے دل میں وطن کے لیے پیار اور اس کی خدمت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

(۲)

دوسرے حصہ میں سات ایسی نظمیں ہیں جو قومی کہی جاسکتی ہیں۔ جن کی تخلیق کا سبب بھی جذبہ حب الوطنی ہے جن سے کسی حد تک چکبست کے سیاسی شعور کی جھلک ملتی ہے اس حصہ کی پہلی نظم "آوازہ قوم" ہے اپریل ۱۹۱۶ء کو ہندوستان کے لیے اہم قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ اسی تاریخ کو مسز بسنٹ نے ہوم رول کو ہندوستان کے لیے بہت اہم بتایا تھا اور چکبست کی نگاہ میں مسز اینی بسنٹ کی اس لئے قدر تھی کہ وہ ہندوستان کی بہی خواہ تھیں۔ چنانچہ مسز اینی بسنٹ کی آواز سے آواز ملاتے ہوئے وہ کہتے ہیں ؎

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

اور یہ بھی کہتے ہیں ؎

وطن کے عشق کا بت بے نقاب نکلا ہے
نئے افق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

اس موقع پر انھوں نے دیکھا کہ شیخ و برہمن محبت اور اتحاد کی شراب پی کر بے خود اور سرمست ہو رہے ہیں اس لیے وہ یہ بھی کہتے ہیں ؎

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے
اذاں کے نعرۂ دلکش سے خط اٹھائے ہوئے
کہیں ہے نغمہ ناقوس دل لبھائے ہوئے
اس فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے
یہ حکم پیر مغاں کا ہے نشہ مے میں
یہ راگ آ کے ملیں ہوم رول کی لے میں

چکبست ہوم رول کے کس قدر خواہشمند تھے اس کا اندازہ ان کے اس اعلان سے ہوتا ہے ؎

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

اسی سلسلہ کی دوسری نظم "ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا" چکبست نے دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ میں پڑھی تھی۔ یہ نظم مختصر ہے اور کل چھ بند پر مشتمل ہے جس کے پہلے ہی بند میں وہ اہل وطن کو مبارکباد دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اہل وطن مبارک تم کو یہ بزم اعلیٰ
جس میں نئی امیدوں کا ہے نیا اجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا
مسجد بھی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا
ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

"ہوم رول" کا مقصد حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں ملک کے اندرونی معاملات میں خود مختاری حاصل کرنا تھی، چکبست بھی اس وقت کے حالات کے پیش نظر حکومت برطانیہ کے وجود کے خلاف نہیں تھے اس لئے ہوم رول کے خواہش مند تھے ان کے نزدیک یہ بھی آزادی کی طرف ایک قدم تھا اس میں شک نہیں

کر وہ حق بجانب تھے ایک بند ملاحظہ کیجئے ؎

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے
نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیر دام رہے
سرپہ شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

یا

برطانیہ کا سایہ سرپہ قبول ہوگا
ہم ہونگے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

اس سلسلہ کی تیسری نظم "وطن کا راگ" ہے جو ۱۹۱۷ء میں کہی گئی ہے اور آٹھ بند پر مشتمل ہے جس میں ٹیپ کے بند کے طور پر انھوں نے بار بار کہا ہے ؎

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہ نظم بڑی رواں ہے، اس میں جوش ہے، آزادی کی لگن ہے، کچھ کر لینے کا جذبہ ہے، عزم ہے، ارادہ ہے، اتحاد کا پیام ہے، وطن سے محبت کی تڑپ ہے لہجہ میں وقار ہے، متھاس ہے، اس نظم کا بند بند حب الوطنی کے جذبہ سے پوری طرح سرشار ہے اس نظم میں چکبست کی زبان سے پہلی بار گاندھی جی کا نام نہایت عقیدت کے ساتھ آیا ہے ؎

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جسکو پہنا ہے
سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول بدلے

یا اس عزم کو ملاحظہ کیجئے ؎

پہنائے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے
جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائینگے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائینگے
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبست نے ایک نظم "مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیام وفا" ۱۹۱۷ء میں اُن کی نظربندی کے زمانہ میں کہی تھی، چکبست انھیں اس لیے بھی عزیز رکھتے تھے کہ

"مسز بسنٹ تھیاسوفسٹ ہونے کی حیثیت سے مذہب کی پابندیوں کی سخت مخالف تھیں اور مذہب کے اختلاف کو ختم کرنا ان کا اہم ترین مقصد تھا"

چنانچہ پہلے بند میں ہی چکبست ان کو مخاطب کرکے اس انداز سے کہتے ہیں ؎

قوم غافل نہیں مانا تری غمخواری ہے
زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے
اب بھڑکی ہے تری آہ کی چنگاری سے
خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزاری سے
دل ترا قوم کے دامن میں دیئے جاتے ہیں
ہڈیوں کو تری زنداں میں لئے جاتے ہیں

اور مسز بسنٹ کی آپس میں اتحاد و اتفاق کی کوشش کے سلسلہ میں اپنے خیال کا اس طرح اظہار کرتے ہیں ؎

داستان دین کی دنیا کی سنائی تو نے
مذہبی بیر کی بنیاد مٹائی تو نے
آگ بھڑکی ہوئی صدیوں کی بجھائی تو نے
راہ انصاف کی اندھوں کو دکھائی تو نے

کس نے گرتی ہوئی قوموں کو سنبھالا ہوتا
تو نہ ہوتی تو نہ دنیا میں اجالا ہوتا

چکبست وطن پرست بھی تھے اور مختلف مذاہب خاص طور سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میل ملاپ کے شیدائی بھی تھے اسی لئے مسز بسنٹ ان کی پسندیدہ رہنما تھیں ان کے لئے ان کے دل میں بڑی عزت و محبت تھی۔

"فریاد قوم" اور "قوم کے سورماؤں کی الوداع" دونوں نظمیں ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی ہیں۔ پہلی نظم "فریاد قوم" کے متعلق تحریر ہے کہ

"یہ نظم اس زمانہ میں تصنیف کی گئی ہے جبکہ
دور افتادگان وطن جنوبی افریقہ میں ٹرنسوال
کے حکام کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے
عاجز تھے اور مہاتما کرم چند گاندھی ان
غریب الوطنوں کی حالت درست کرنے کی کوشش
میں دل و جان سے مصروف تھے۔ یہ نظم ایک
رسالہ کی صورت میں شائع کی گئی تھی اور
مہاتما گاندھی کا نام بصورت ذیل زیب
عنوان کیا گیا تھا،

بخدمت فدائے قوم مسٹر کرم چند گاندھی
نثار ہے دل شاعر ترے قرینے پر
کیا ہے نام ترا نقش اس نگینے پر
چکبست لکھنوی

یہ نظم طویل ہے اٹھارہ بند پر مشتمل ہے اور حب الوطنی کے سلسلہ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس میں جنوبی افریقہ میں بسے ہوئے ہندوستانیوں پر ظلم کے خلاف احتجاج اور غم و غصہ کا اظہار ملتا ہے اور اس میں ہندو مسلمانوں کے لیے اتحاد و اتفاق کا درس بھی ہے ایک بند ملاحظہ کیجئے وہاں کے بند ہندوستانیوں کے بارے میں کہتے ہیں ؎

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی
اسیر یاس بھی ہیں اور اسیر زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی
ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی
پڑھی نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کے گنگا میں

چناں چہ وہ ہندوؤں کو للکارتے ہیں ؎

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

مسلمانوں کو احساس دلاتے ہیں ؎

کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیت کا
دیا تھا دشمنِ قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا
یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروت کا
اگر نہ اب بھی ہو اسلام کا جگر پانی
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

اور پھر ہندوستانیوں سے غم ناک لہجے میں سوال کرتے ہیں ؎

جو دب کے بیٹھ رہے سر اٹھا کے پھر کیا
عدو سے قوم کو نیچا دکھا کے پھر کیا

له صبح وطن ص ۴۳۔

جفا و جور کی ذلت مٹاؤ گے پھر کیا
تم اپنے بچوں کو قصہ سناؤ گے پھر کیا
رہے گا قول یہی ان سے انکی ماؤں کا
لہو رگوں میں تمھاری ہے بھیاؤں کا

آخری بند سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی نظر میں وطن اور اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا تھی ؎

فنا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے
فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

دوسری نظم "قوم کے سورماؤں کی الوداع" اس زمانہ میں لکھی گئی ہے؛

"جب کہ ہندوستانی سپاہیوں کی فوج دولت برطانیہ کی جانب سے یورپ کی جنگ عظیم میں حصہ لینے کیلئے روانہ کی گئی تھی" [1]

اس جنگ میں جیت یا ہار سے ہندوستان کا کوئی نقصان یا فائدہ ہونے والا نہیں تھا، لیکن چکبست کا جذبہ حب الوطنی یہاں بھی مچل اٹھتا ہے، اس لیے کہ سپاہی جو لڑنے جا رہے ہیں وہ ہندوستانی ہیں ان کی بہادری اور دلیری سے ہندوستان کی عزت اور عظمت میں اضافہ ہوگا اور اس سے ہندوستانیوں کو سرخروئی حاصل ہوگی چنانچہ پہلے بند میں وہ اس انداز سے سپاہیوں کے رخصت ہونے کا منظر پیش کرتے ہیں ؎

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں
پھر نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں
تیغ زن برق فگن قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کے تلوار کے سایہ میں قضا چلتی ہے

اس بند میں انیس کے رنگ کی جھلک نمایاں ہے۔ تیسرے بند میں ہندوستانی سپاہیوں کی کس جوش اور ولولے کے ساتھ للکارتے ہیں ملاحظہ کیجئے ؎

ہاں دلیران وطن دھاک بٹھا کر آنا
طنطنہ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا
ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا
بہا گنگا ہے سپاہی کے نہانے کیلئے
تاکہ تلوار کی ہے پار لگانے کے لئے

اور آخری بند میں وہ بات بھی صاف صاف کہہ جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بے چین تھے یعنی ؎

مادر قوم کا ہے اپنے سپوتوں سے پیام
خطۂ ہند کا اس جنگ میں روشن رہے نام
تیغ خوں ریز نے جس شان سے چھوڑا ہے نیام
اپنے مسکن میں اسی شان سے پائے آرام
شاعر گوشہ نشیں شکر خدا کرتا ہے
جنگ ہو فتح کو مبارک یہ دعا کرتا ہے

اس سلسلہ کی آخری نظم "نالۂ درد" ہے جو ۱۹۱۸ء میں لکھی گئی ہے "جب کانگریس کے قدیم لیڈر اس قومی مجلس سے مجبوراً علیحدہ ہو گئے تھے" نظم مختصر ہے جس میں کل تیرہ شعر ہیں۔ زبان نہایت سادہ ہے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

---

[1] صبح وطن حاشیہ ص ۸۴۔

سے چکبست کے جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

ئی کس کی ہوگی مجھ کو حیرت ہے یہی
میں قوم کے سب پیشوا ہونے کو ہیں
آنسوؤں سے اپنے جو سینچا کئے باغِ وطن
بیوفائی کے انھیں خلعت عطا ہونے کو ہیں

کو حنزل سے زیادہ ہے ہوا کا رخ عزیز
کے بیڑے کے ایسے ناخدا ہونے کو ہیں
مادرِ ناشاد روتی ہے کوئی سنتا نہیں
دل جگر سے بھائی سے بھائی جدا ہو چکے ہیں

ری نظم میں یہی فضا ہے جس سے چکبست کے دل کی
تا کی جھلکتی ہے۔

تین نظمیں محدود قومی نظریہ کے تحت کہی گئی ہیں، جن
"قومی مسدس" ہے جو ۱۹۱۱ء کی ہے، ہندو یونیورسٹی
متعلق ہے اور اٹھارہ بند پر مشتمل ہے۔ یہ نظم ۳ ستمبر ۱۹۱۱
لکھنؤ میں ہندو یونیورسٹی کے عظیم الشان جلسہ میں
ھی گئی تھی۔

پہلے ہی بند سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا
ہے کہ چکبست کی نظر میں ان لوگوں کی کتنی عزت تھی جو اس
یونیورسٹی کی تعمیر کے لیے کوشاں تھے اور چندے کی فراہمی
ن مصروف رہتے تھے ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ کون فرشتے ہیں یہ گدائے وطن
صفا کے قلب سے جن کی یہ بزم ہے روشن
جھکی ہوئی ہے سبھوں کی لحاظ سے گردن
مبارک زبان پہ ہیں تعظیم اور ادب کے سخن
صفیں کھڑی ہیں جوانوں کی اور پیروں کی
خدا کی شان یہ پھیری ہے کن فقیروں کی

اس لیے کہ ؎

جو اپنے واسطے مانگیں یہ وہ فقیر نہیں
طمع میں دولتِ دنیا کی یہ اسیر نہیں
امیرِ دل کے ہیں ظاہر کہ یہ امیر نہیں
وہ آدمی نہیں ان کا جو دستگیر نہیں
تمام دولتِ ذاتی لٹائے بیٹھے ہیں
تمہارے واسطے دھونی رمائے بیٹھے ہیں

اور اپنی قوم کے دولت مندوں پر تنقید بھی کرتے نظر آتے
ہیں ؎

یہ قحط کیا ہے، یہ طاعون کیا ہے، کیا ہے وبا
تمہاری قوم پہ نازل ہوا ہے قہرِ خدا
جو راہِ راست سے بھولی ہے کوئی قوم جہاں
اسی طرح اسے ملتی ہے ایک روز سزا
اسی طرح سے ہوا قوم کی بگڑتی ہے
اسی طرح سے غریبوں کی آہ پڑتی ہے

پھر انھیں مشورہ دیتے ہیں ؎

گناہ قوم کے دھو جائیں اب ایسا وہ کام کرو
مٹے کلنک کا ٹیکا وہ فیض عام کرو
نفاق و جہل کو بس دور سے سلام کرو
کچھ اپنی قوم کے بچوں کا انتظام کرو
یہ کام ہو کے رہے چاہے جان رہے نہ رہے
زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے

مسز بسنٹ اور پنڈت مدن موہن مالویہ کا ذکر بھی بہت
احترام کے ساتھ کرتے ہیں اور لوگوں کو ہندو بچوں
کی خراب حالت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان
کا کہنا ہے کہ ؎

...ن میں جہل کی چھائی ہوئی ہیں تیرہ تار
...آرزو ہے کہ تعلیم سے ہو بیڑا پار
مگر جو خواب سے اب بھی نہ تم ہوشیار ہوئے
تو جان لو کہ ہے اس قوم کی چتا تیار
کے گا ... اور آمد بھی جائے گی
تمہارے نام سے دنیا کو شرم آئے گی

...س لئے۔

ذرا حمیت و غیرت کا حق ادا کر دو
فقیر قوم کے آئے ہیں جھولیاں بھر دو

...وسری نظم "دردِ دل" ۱۹۱۲ء میں کہی گئی ہے جو "لکھنو کی
...جمن نوجوانانِ کشمیر کے آٹھویں سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی
...تھی۔ اس انجمن سے چکبست کو بڑی دلچسپی تھی، یہ نظم
۳۱ بند پر مشتمل ہے آٹھویں سالانہ جلسہ میں پڑھی
گئی تھی۔" اس انجمن سے چکبست کو بڑی دلچسپی تھی،
...نظم ۳۲ بند پر مشتمل ہے اور چار حصوں پر تمہید، ترقی
انجمن، حالت قوم، نوجوانوں سے خطاب میں منقسم
ہے۔ تمہید میں اپنا تعارف کرتے ہوئے بتاتے ہیں
...ر وہ لوگ اور ہوں گے، جنھیں مقدر سے گلہ ہے اور
جنھیں ان کی محنت کا صلہ نہیں ملا ہے میں نے تو غیب
سے جو کچھ مانگا وہ مجھے مل گیا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ

کیا مٹائے گی بھلا گردشِ دوراں مجھ کو

...ور وطن سے محبت کی سرشاری کا اظہار نہایت
خوبصورتی کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں ؎

...ل میرا دولتِ دنیا کا طلبگار نہیں
...ا خاک نشینی سے مجھے عار نہیں
مست ہوں حبِ وطن سے کوئی میخوار نہیں
مجھ کو مغرب کی نمائش سے سروکار نہیں

اپنے ہی دل کا پیالہ پئے مدہوش ہوں میں
بھولی پیتا نہیں مغرب کی وہ مے نوش ہوں میں

اور تمہید کے آخر میں مژدہ جانفزا سناتے ہیں ؎

یہ نسیم سحری آج خبر لائی ہے
سال گزرا ہے گلشن میں بہار آئی ہے

دوسرے حصہ "ترقی انجمن" میں اس انجمن کے کام پر روشنی
ڈالتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ

میں نے سینچا ہے اسے خونِ جگر سے اپنے

اور انجمن کے اراکین کی خوبیاں اس طرح بیان کرتے
ہیں ؎

بوئے نخوت سے نہیں یاں کے گلوں کو سروکار
ہے بزرگوں کا ادب ان کی جوانی کا سنگار
علم و ایماں کی طراوت کا دلوں میں ہے گزار
دھو گئے چشمۂ اخلاق سے سینوں کے غبار
رنگ دکھلاتی ہے یوں دل کی صفا یاروں میں
روشنی صبح کی جس طرح ہو گلزاروں میں

اس بات کو کہ اس انجمن کے ممبران بچے سے جوان ہوگئے
برجستہ اور دل نشیں لہجے میں کہتے ہیں :

جو کہ پودے تھے شجر ہو گئے ماشاء اللہ

اس خوشی کے موقع پر ان ممبروں کا ماتم بھی نہایت
غمناک لہجے میں کرتے ہیں جو اس دوران میں اس دنیا
سے رخصت ہوئے ؎

یہ وہ گل تھے جنھیں اسبابِ نظر نے ڈبویا
بھائی نے بہنوں نے مادر نے پدر نے رویا
خاک رونا تھا جو اس عہد کو تم نے رویا
بدلے آنکھوں کے مرے قلب و جگر نے رویا

دل پہ کچھ داغِ محبت ہیں نشانی اُنکی
بچپنا دیکھ کے دیکھی نہ جوانی ان کی

اور انجمن کو آخر میں اس طرح دعا دیتے ہیں ۔

میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

اپنی قوم کی حالت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ۔

گلشنِ قوم میں ہے پیشِ نظر رنگ عجیب
فتنے جاگے ہوئے ہیں خوابِ گراں میں ہے نصیب

دل محبت سے خفا ہیں تو مروت کے رقیب
دور ہیں دل سے جو آنکھوں سے ہیں بظاہر قریب

اب وہ پہلے کی محبت وہ بھلائی ہے کہاں
دل کے آئینوں میں اگلی سی صفائی ہے کہاں

یا

دولتِ علم و ہنر میں بھی سمایا ہے زوال
ہو رہا ہے چمنستانِ ذہانت پامال

سر میں سودا وہ نہیں جس سے کہ ہو کسبِ کمال
پڑھنے لکھنے کا فقط دولتِ دنیا ہے مآل

عمر یوں علم کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
اک تجارت ہے کہ دن رات چلی جاتی ہے

اور نصیحت بھی کرتے ہیں ۔

علم و اخلاق کے دامن پہ تمہارے یہ داغ
جو بزرگوں نے لگایا تھا اجڑتا ہے وہ باغ

تم کو اللہ نے بخشے ہیں وہ دل اور وہ دماغ
جس سے روشن ہو زمانہ کی ترقی کا چراغ

اک ذرا جذبۂ اخلاق کو باقی کر دو
قوم مرحوم کی تربت پہ اجالا کر دو

تیسری نظم "نالۂ یاس" ہے جو ۱۹۱۸ء کو لکھی گئی ہے جو کشمیر کی یاد میں ہے اور پُر درد ہے جس کے مطالعہ سے ان کے وطنی اور قومی جذبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے زبان دلنشیں اور پُر تاثیر ہے۔ دیکھئے ماضی کی یاد انھیں کس طرح مضطرب کرتی ہے ۔

وہ بھی کیا عالم تھا جب دنیا سے دل آزاد تھا
اور سب بھولے تھے ایک قصہ وفا کا یاد تھا

قوم کا سودا وفا کا شوق خدمت کی امنگ
بس انھیں دو تین کے صدقے میں دل آباد تھا

کوفت تھی ہم کو اگر گمراہ تھا بچہ کوئی
ہم بھی خوش تھے گر کسی معصوم کا دل شاد تھا

تھی ابھی رنگِ محبت سے امیدوں کی بہار
کیسے کیسے پھول تھے کیسا چمن آباد تھا

ہم یہ برسوں کی محبت بھولنے والے نہیں
اتنے بھائی ایک ماں کی گود کے پالے نہیں

مجموعی حیثیت سے یہ تینوں نظمیں "قومی مسدس"، "دردِ دل" اور "نالۂ یاس" اچھی ہیں اور ان کے وطنی اور قومی جذبے کی مظہر ہیں۔ ان کا یہی محدود جذبہ جب اپنے حدود سے نکل گیا تو پورے ہندوستان کو محیط کر گیا ہے۔

اس حصہ کی آخری کڑی یعنی اصلاحی نظمیں صرف دو ہیں۔ دو نظمیں ۱۹۱۷ء کی ہیں پہلی نظم "پھول مالا" لڑکیوں کے لیے ہے جس میں کل ۴۲ شعر ہیں۔ چکبست اس نظم میں۔ ہندوستانی خواتین کو تنبیہ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ترقی اور ریفارم کے نام پر جو چیزیں لائی جا رہی ہیں وہ مردوں کی "روشِ جام" کا نتیجہ ہیں انھیں وہ اختیار نہ کریں۔ چکبست کی اس نظم سے یہ بات بہت واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ وہ یورپ

سے فیض حاصل کرنے کے خلاف نہیں تھے لیکن اس کے بدلے میں غیرت قومی کو مٹانا پسند نہیں کرتے ؎

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز

یا

رنگ و روغن تمہیں یورپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

اس بات کو کہ مردوں نے اپنی مشرقی اخلاق کو کھو دیا ہے لیکن خواتین ایسا نہ کریں وہ اپنے اس شعر میں کس خوبصورتی سے ظاہر کرتے ہیں ؎

نقد اخلاق کا ہم نل کی طرح ہار چکے
تم ہو دمینت یہ دولت نہ لٹانا ہرگز

پوری نظم کا ماحصل یہ ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین کو چاہیئے کہ وہ مردوں کی طرح ہندوستانی اخلاق اور انداز زندگی کو نہ کھو دیں، مردوں نے انھیں کھو کر بہت کچھ کھو دیا ہے۔

"برق اصلاح" اس سلسلے کی دوسری نظم ہے جیسا حاشیہ پر درج ہے :

"کشمیری پنڈتوں کے فرقہ میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی آگرہ میں ہوئی تھی اس اصلاح کے خیر مقدم میں یہ نظم کہی گئی ہے[۱]"

گیارہ بند پر مشتمل اس نظم کی ابتدا ہی کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ چکبست کی اس موقع پر خوشی اور مسرت کا اندازہ اچھی طرح ہونے لگتا ہے، وہ اس جرأت مندانہ قدم پر مبارکباد دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مرحبا جرأت اصلاح دلانے والو
قوم کے بار امانت کو اٹھانے والو
دل کی اجڑی ہوئی نگری کو بسانے والو
مادر ہند کی بگڑی کے بنانے والو

کیسے طوفاں میں دیا ہے سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا تم نے

اور نہایت جوش کے ساتھ اپنے پر خلوص جذبات کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

آئیں پیران طریقت یہ تماشا دیکھیں
ہاں نئے دور کا اٹھتا ہوا پردا دیکھیں
جوش اصلاح کا بہتا ہوا دریا دیکھیں
پار ہوتے ہوئے مظلوم کا بیڑا دیکھیں

دیکھ لیں دھرم کی اس قوم میں خو باقی ہے
ان رگوں میں ابھی رشیوں کا لہو باقی ہے

پوری نظم کے معاملہ سے ان کی وسعت قلبی، وسعت نظری اور انسان دوستی کے جذبہ کا اظہار ملتا ہے۔ اور اوپر کی دونوں نظموں کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ قوم کی برائی کی اصلاح کے خواہشمند تھے اور دوسروں کے اس قسم کے اقدام کی قدر کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ سارا جذبہ ان کا حب قومی کی وجہ سے تھا۔

(۳)

میرے نزدیک تیسرا حصہ اُن نظموں کا ہے جن میں شاعر نے اپنے مذہبی جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے نظمیں کہی ہیں، اس حصے میں صرف دو نظمیں شامل کی جا سکتی ہیں "کرشن کنھیا" اور "رامائن کا ایک سین" ان دونوں نظموں پر کوئی سنہ درج نہیں ہے۔ پہلی نظم کرشن کنھیا (جنم اشٹمی) سترہ بند پر مشتمل ہے۔ اس طرح کی نظمیں

---

۱ صبح وطن حاشیہ ص ۹۵

اردو میں زیادہ نہیں ملتی ہیں۔ چکبست نے نہایت دلنشیں انداز میں یہ نظم کہی ہے بعض حصے بہت خوب ہیں، تاریک شب کا یہ منظر ملاحظہ کیجئے :۔

شب تاریک کے قبضے میں ہے ایوان فلک
چھپ گئی جاتی ہے اندھیرے میں ستاروں کی پلک

وہ ہوا ہے کہ اڑے جاتے ہیں فانوس تلک
نظر آتی نہیں بستی میں ستاروں کی جھلک

صرف جگنو ہے جو دیوانہ صفت پھرتا ہے
شمع لیکر کبھی اٹھتا ہے کبھی گرتا ہے

یا ؎

رات تاریک ہے اور سر پہ گھٹا بادل کی
وہ گھٹا مینہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی

شوق و طرار و حسین چھوکریاں گوکل کی
چلی آتی ہیں صراحی پئے جمنا جل کی

دل لڑکپن کی امنگوں پہ مچل جاتا ہے
کھلکھلا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

اور پھر اس رات کی عظمت کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں جس میں کنھیا پیدا ہوئے تھے ؎

آج سوتی ہوئی دنیا کی ہے قسمت بیدار
سال بھر بعد وہ رات آئی ہے دل جس پہ نثار

یہی بجلی تھی یہی ابر، یہی جوشش بہار
جب کنھیا کے جنم سے ہوئی روشن شب تار

قید خانہ کی سیاہی میں وہ تارا چمکا
جس سے انسان کی ہستی کا ستارا چمکا

چکبست کی بعض باتیں اس نظم میں کس قدر صداقت پر مبنی ہیں جن سے زندگی اور اسکی سچائیوں کا پردہ چاک ہوتا نظر آتا ہے۔

روح دنیا کی مسافر ہے اجل منزل ہے

یہی پھل کے لالچ میں لگاتے ہیں ... ملاحظہ کیجیے خالق و مخلوق کے رشتے پر کس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔ کون اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے۔

وہی بسمل وہی جوہر شمشیر بھی ہے
شعلہ شمع وہی ہے وہی گلگیر بھی ہے

خود مصور ہے وہی اور وہی تصویر بھی
وہی حاکم وہی قیدی وہی زنجیر بھی

جوہری بھی ہے وہی جوہر عالی بھی وہی
پھول بھی وہی ہے وہی اس باغ کا مالی بھی

مجموعی طور سے یہ نظم پاکیزہ فضا میں ڈوبی ہوئی ہے اور پر تاثیر ہے۔

دوسری نظم "رامائن کا ایک سین" ہے جو طویل اور مشہور نظم ہے اور جس کا چکبست کی اہم نظموں میں شمار ہوتا ہے اس نظم میں چکبست نے خاص طور سے جذبات نگاری، پیکر تراشی اور مکالمہ نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ اس نظم کا تعلق اگرچہ ایک مذہب کے ماننے والوں سے ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ کسی بھی مذہب وملت سے تعلق رکھنے والا اسے پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، دراصل اس میں انسانی احساسات کی صداقتوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور درد و کرب کو اس انداز سے سمویا گیا ہے کہ وہ دلوں کو چھوئے اور مضطرب کیے بغیر نہیں رہتے۔ رام چندر جی کا ماں کے پاس جانا ملاحظہ کیجئے وہ جانتے تھے کہ ماں بن باس کی خبر سن کر نہ صرف بے انتہا رنجیدہ اور مضمحل ہوگی، بلکہ اس کی حالت کچھ سے کچھ ہو چکی ہوگی چنانچہ وہ ؎

ان آنسوؤں کی قدر تمہیں کچھ ابھی نہیں
باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل لگی نہیں
لیکن تمہیں جو رنج ہے میری خوشی نہیں
جاؤ سدھارو خوش رہو میں روکتی نہیں
دنیا میں بے حیا ہیں جو زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

ماں کا یہ کہنا تھا کہ رام چندر کا دل ہل گیا، ان سے کچھ جواب نہ بن پڑا چنانچہ وہ ان کے قدموں پر گر پڑے اور کہا کہ اگر مجھ سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے تو میرے لیے زندہ رہنے سے زیادہ بہتر مر جانا ہے اسی لئے کہ ؎

مجرم ہے وفا ہے مادر ناشاد کے لیے
دوزخ وہ زندگی ہے اس اولاد کے لئے

پھر وہ ماں کو اس طرح سمجھاتے ہیں کہ وہ بے اختیار ہو جاتی ہے اور ہندوستانی ماں کی طرح ممتا کے جذبے سے مغلوب ہو کر ؎

سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اٹھا لیا
سینے سے اپنے لخت جگر کو لگا لیا

اور ؎

گنگ و جمن کی طرح آنسو بہنے رواں

اور پھر چکبست نظم کو ختم کرتے ہوئے رام چندر کے لئے لکھتے ہیں۔

ایسا گھر نہ تھا کوئی دسرت کے تاج میں

رتاری کو ایک غمناک لیکن ایک عجیب پرسکون
نا میں چھوڑ جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ چکبست
لہائن" کو منظوم کر دیتے اور کچھ نہ لکھتے تو یہ ان کا
ہندوستان پر، اردو پر اور ہم سب پر بڑا احسان
تا اس لئے کہ وہ قدرت سے اس طرح بھی پر درد

اور پر تاثیر نظموں کے کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔

(۴)

میں نے چوتھا حصہ شخصی مراثی کا قائم کیا ہے اس حصہ میں سات نظمیں آتی ہیں، ان میں "ماتم یاس" اور "نشتر یاس" میں عزیزوں کا ماتم ہے، اور گنگا پرشاد ورما، گوپال کرشن گوکھلے، بشن نرائن ورما، بال گنگا دھر تلک پر چار شخصی مرثیے سیاسی رہنماؤں کے ہیں، ایک مرثیہ ایک ایسے شخص کا ہے جو نہ عزیز ہے نہ قومی رہنما لیکن بحیثیت انسان نہایت اچھا تھا، وطن کا خدمت گذار تھا یعنی "اقبال نرائن مسلدان" اس لئے ان کا ماتم کیا گیا ہے

حق بات یہ ہے کہ اس وقت تک شخصی مرثیے اردو میں زیادہ نہیں لکھے گئے تھے اگر اس صنف کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تاریخ بہت پرانی نہیں بلکہ غالب و مومن سے اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ مومن کا ایک مرثیہ محبوب کے انتقال پر ملتا ہے جس کے چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جاں کو کیا ہوا
دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا
سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے
کیا جانے اس کے زلف پریشاں کو کیا ہوا
دل میں خلش ہے زلف مسلسل کدھر گئی
برہم ہے حال کاکل پیچاں کو کیا ہوا
دعویٰ ہے نکتہ چینیوں کا غزالان دشت کا
اس خوش نظر کا جنبش مژگاں کو کیا ہوا

یہ مرثیہ غزل کی صورت میں ہے اور آہ و نالہ کے باوجود اس قدر دردناک نہیں ہے جس کی اس مرثیہ سے توقع

یہ مرثیہ سولہ بندوں پر مشتمل ہے اور ان کی وفات پر ۱۹۱۶ء میں لکھا گیا ہے جس میں غم کا اظہار ضرور ہے لیکن اس میں وہ شدت اور اضطراب نہیں جو عام طور سے مرثیوں کی جان ہوتے ہیں پہلے بند ہی سے مرثیے کی فضا کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

صدمہ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زباں دل کا سہارا نہ رہا
گلشن علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلع دانش و بینش کا ستارہ نہ رہا
سب پہ غم ایک طرف ایک طرف غم چھپا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم چھپا

غالب نے کہا ہے "آدمی کو بھی میسر انساں ہونا" چکبست "انسان ہونے" کو آدمی کے لیے معراج تصور کرتے ہیں ۔

دولت علم و ہنر سے نہیں دنیا خالی
بزم عالم کی یہ رونق نہیں جانے والی
پر ہے کمیاب وہ جوہر وہ سرشت عالی
آدمیت کی بنا جس نے ازل میں ڈالی
کچھ بڑی بات نہیں فاضل دوراں ہونا
آدمی کے لیے معراج ہے انساں ہونا

وہ آدمی انہیں بشن نرائن در میں مل جاتا ہے چنانچہ ان کی موت پر انہیں اس آدمی کے کھونے کا صدمہ نمایاں طور سے محسوس ہوتا ہے ۔

آدمیت کی یہ تصویر مٹی جاتی ہے
حسن اخلاق کی تدبیر مٹی جاتی ہے
جذبۂ خیر کی توقیر مٹی جاتی ہے
ہم سمجھتے ہیں کہ تقدیر مٹی جاتی ہے

دل مایوس محبت کا عزا خانہ ہے
اپنی آنکھوں میں یہ دنیا نہیں ویرانہ ہے

وہ بشن نرائن در کی صفات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

تجھ کو معلوم نہ تھا دولت دنیا کیا ہے
حرص کیا شے ہے زر و مال کا سودا کیا ہے
خود پرستی کا زمانہ میں تقاضا کیا ہے
عیش کیا چیز ہے راحت کی تمنا کیا ہے
تو نے سمجھا کبھی غیروں کی مدد کے غم میں
اپنی راحت کا بھی سامان ہے اس عالم میں

یا

شہرۂ عام کو سمجھا نہ لیاقت کا صلہ
نکتہ چینوں سے شکایت نہ رقیبوں کا گلہ
دیدۂ غیر میں کھٹکی نہ طبیعت کی جلا
تو زمانے سے سر نو کسی طرح جھک کے ملا
عاجزی دل کی جھلکتی رہی پیشانی سے
تو وہ دریا تھا جو واقف نہیں طغیانی سے

دنیا میں ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے کچھ بد خصلت اور بد نصیب لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا وجہ مخالفت کرتے ہیں چنانچہ در کو ایسے کم ظرف لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے

بد نصیب ایسے ہیں تجھ سے جو بگڑ کر رہے
آگے دنیا میں فقط دل آزار رہے
ایسے بے درد زمانے کے گنہگار رہے
مگر احسان سے تیرے سبکسار رہے
ان کو شرمندہ کیا تو نے محبت کر کے
خود گنہگار ہوئے تجھ سے عداوت کر کے

پورا مرثیہ ایک خاص فضا اور ایک خاص سنجیدہ اور پر درد
لہجہ میں ہے [illegible] اور ہمیں کسک محسوس کرتے
جاتے ہیں، البتہ بعض مصرعہ اور شعر زندگی اور اس کی
صداقتوں اور ان کے برتنے کے طریقوں سے بڑی خوبی
کے ساتھ آگاہ کرتے ہیں۔

ع آدمیت کے لئے معراج ہے انساں ہونا

ع تو زمانے سے مہ نو کی طرح جھک کے ملا

؎ رنگ دنیا سے رہا عالم فانی میں جدا
جیسے لہروں سے کنول رہتا ہے پانی میں جدا

؎ یوں ہوا کرتے ہیں یاران کہن دل سے جدا
جیسے پتوں سے گرا دیتی ہے پانی کو ہوا

؎ زندگی یوں تو فقط بازیٔ طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے

چوتھا مرثیہ بال گنگا دھر تلک کا ہے یہ مرثیہ مختصر
اور آٹھ بند پر مشتمل ہے، اس میں بھرپور غم کی کیفیت
ور ہے لیکن کہیں بھی آہ و نالہ نہیں ہے۔ دیکھیے کس
کوہ الفاظ میں چکبست ان کی موت پر اظہار افسوس
تے ہیں ؎

گیا دولت ناموس وطن کا وارث
رحوم گئے اعزاز کہن کا وارث
جاں نثار ازلی شیوۂ دکن کا وارث
[illegible] کے گرجتے ہوئے رن کا وارث
تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

قوم میں ان کی حیثیت نگہبان کی تھی لیکن دشمن ان سے
لرزتے تھے اب اہل وطن ان کو یاد کرکے آنسو بہائیں
گے، یہاں بھی لہجہ کا وقار ملاحظہ ہو ؎

تھا نگہبان وطن دبدبہ عام ترا
نہ ڈگیں پاؤں یہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا
نیند سے چونک پڑے سن کے جو لیا نام ترا
یاد کرکے تجھے مظلوب وطن رو لیں گے
بندہ رسم جفا چین سے اب سو لیں گے

اور آخری بند میں زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ اپنے
محبوب رہنما کی آخری رسم ادا کرنا چاہتے ہیں ؎

لاش کو تیری نہ سنواریں نہ رقیبان کہن
ہو جبیں کیلئے صندل کی جگہ خاک وطن
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن
شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

ان چار قومی رہنماؤں کے مرثیوں کے علاوہ ایک شخصی مرثیہ
اور ہے جو "اقبال نرائن مسلدان" کی موت پر لکھا گیا
ہے۔ اقبال نرائن کی حیثیت لیڈر کی نہیں تھی بلکہ قوم کے
ہمدرد اور خدمت گزار کی تھی، چکبست کا یہ مرثیہ سب
سے مختصر یعنی کل سات بند پر مشتمل ہے جس متوفی کی خصوصیات
یعنی ان کی بامروت آنکھیں، نورانی چہرہ اور گفتگو کے
طرز کو یاد کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ وہ نمود و نمائش اور
خود پرستی کی خرابیوں سے پاک تھے ظاہر ہے یہ ایسی
خوبیاں ہیں جن سے انسان کی بڑائی نمایاں ہوتی ہے
اور جن کو اپنا کر قوم کے افراد قوم کی تعمیر کر سکتے ہیں،

بلکہ ان کی [illegible] نے اپنی گہری دلچسپی کا بھی اظہار کیا ہے۔ یہ نظم [illegible] (دو بند) پر مشتمل ہے اس کے متعلق چکبست کا خیال ہے کہ یہ محل

محل ہے عظمت کا نہیں نظر ہستی پہ حباب

اس لئے وہ سیاحوں کو مشورہ دیتے ہیں ؎

دیکھ سیاح اسے رات کے سناٹے میں
منھ سے اپنے مہ کامل نے جب الٹی ہو نقاب

کبھی ان کی حیران نگاہوں کو محسوس ہوتا ہے ؎

ڈھل کے سانچے میں زمیں پر اتر آیا ہے سحاب

ان کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ امام باڑہ بھی

دور سے عالم تصویر نظر آتا ہے

اس عمارت کی بعض خوبیاں وہ اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

شوکت و شان عمارت کی خبر دیتا ہے
پردہ شب کے سرکنے پہ سحر کا آغاز
وہ سپیدی سحر نور کی ہلکی ہلکی
آشیاں چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز
ایسے عالم میں وہ کہرے سے ابھرنا اس کا
جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز

اس طرح چکبست نے اس عمارت کی تصویر الفاظ کے ذریعہ شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی ہے اور وہ بہت حد تک اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

(۶)

چھٹا اور آخری حصہ ایسی نظموں پر مشتمل ہے جس کے لیے میں نے متفرقات کا عنوان قائم کیا ہے اس حصے میں مندرجہ ذیل نظمیں آ گئی ہیں۔

معذرت - یادگار بابو گنگا پرشاد - جلوہ معرفت (فلسفہ دید) - قطعہ - گائے

پہلی نظم "معذرت" ۱۹۱۷ء میں متھرا میں اپنے ایک دوست کی شادی میں شریک نہ ہونے پر کہی تھی اس میں کل اٹھارہ شعر ہیں۔ جس میں اپنے دلی تاثرات اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

میں یہاں دل ہے وہاں جسم یہاں جان وہاں
پھر رہا ہے نظر شوق میں شادی کا سماں

یا

جو خوشی تم کو ہے وہ آب و ہوا میں ہے بسی
ابر چھایا ہیں وہی ہے وہی پھولوں میں ہنسی

پھر دعا دیتے ہیں ؎

شوق کے پھول محبت کی ہوا میں کھل جائیں
جس طرح راگ سے لے ملتی ہے دل یوں مل جائیں

اس نظم کی لے دھیمی ہے لیکن بعض اشعار خلوص اور محبت کے پیکر ہیں۔

دوسری نظم "یادگار بابو گنگا پرشاد ورما" ہے۔ "لکھنؤ میں بابو گنگا پرشاد ورما کی یادگار میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے اس کتب خانہ کی تعمیر عمارت کا افتتاحی جلسہ زیر صدارت ہز اکسلنسی سر ولیم میرس بہادر قرار پایا تھا۔ یہ نظم اسی موقع پر پڑھی گئی تھی[1] مختصر سی یہ نظم پانچ شعر پر مشتمل ہے معلوم نہیں "صبح وطن" کے حصہ سوم یعنی "نوحہ جات" میں اسے کیوں شامل کیا گیا ہے اس عمارت کے متعلق چکبست کا خیال ہے ؎

قوم کے جذبہ اخلاص کی تصویر ہے یہ
جس کی بنیاد دلوں میں ہے وہ تعمیر ہے یہ

---

[1] صبح وطن ص ۱۲۶ حاشیہ

ظاہر ہے کہ یادگار اخلاص کے تحت ہی قائم کئے جاتے ہیں نظم میں چکبست پہلے اس کی افادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ یہی کتب خانہ اور قیام گاہ سے کس کس طرح فائدہ تھا ہیں گے۔ چکبست کو قوم سے والہانہ محبت تھی اس لئے ہر قومی کام ان کے لئے مسرت کا باعث ہوتا تھا۔

تیسری نظم "جلوہ معرفت" (فلسفہ وید) ہے جو "ایک دوست کی فرمایش سے ایک مذہبی کتب خانہ کی لوح پر کندہ ہونے کے لئے تصنیف کی گئی تھی" اس لیے اسے بہت طویل نہیں ہونا چاہیئے تھا اس میں کل تیرہ شعر ہیں نظم اچھی ہے آخری سات شعر بہت خوب ہیں ملاحظہ فرمایئے:

عین کثرت میں یہ وحدت کا سبق وید میں ہے
ایک ہی نور ہے جو ذرہ خورشید میں ہے

جس سے انسان میں ہے جوش جوانی پیدا
اسی جوہر سے ہے موجوں میں روانی پیدا

رنگ گلشن میں فضا دامن کہسار میں ہے
خوں رگ گل میں ہے نشتر کی خلش خار میں ہے

تمکنت حسن میں ہے جوش ہے دیوانے میں
روشنی شمع میں ہے نشتر کی خلش خار میں ہے

رنگ دل ہو کر سمایا وہی گلزاروں میں
ابر بن کر وہی برسا کیا کہساروں میں

شوق ہو کر دل مجذوب پہ چھایا ہے وہی
درد بن کر دل شاعر میں سمایا ہے وہی

نور ایمان ہے جو پیدا ہو صفا سینے میں
عکس اس کا نظر آتا ہے اس آئینے میں

بارہ شعروں پر مشتمل ایک قطعہ بھی ہے جس میں منشی

اقبال نرائن گرٹو کا ایک اہم واقعہ دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ منشی اقبال نرائن گرٹو نے سنٹرل ہندو کالج بنارس کی خدمت کے لیے مفت میں اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا جس پر ایک بزرگ کو بڑی تکلیف ہوئی تھی وہ اسے "کار احمقانہ" سمجھ کر گو یا کار رکیک سمجھ رہے تھے ان کا خیال تھا

خدمت قوم تو ایک شغل ہے بے کاروں کا ۔
یاں جو مفلس ہیں مبارک رہے ان کا یہ چلن

جسے سن کر پنڈت برج نرائن چکبست کو استاد کے اس شعر کی یاد آئی ؎

اے کہ آگاہ نئی حالت درویشاں را
تو چہ دانی کہ چہ سودا در سر ایشاں را

اس طرح نہایت خوب صورتی کے ساتھ وہ گرٹو صاحب کے جذبہ خدمت خلق کی تائید اور ان کے دوست کی تردید کر جاتے ہیں۔

میرے نزدیک متفرقات میں ان کی نظم "گائے" بھی شامل کی جا سکتی ہے جس میں انھوں نے "گائے" اور اس کی ہماری زندگی میں جو کچھ اہمیت ہے اسے جتانے کی کوشش کی ہے، زبان سادہ، خیال سادہ اور انداز سادہ ہے ملاحظہ کیجئے:

تن سے تیرے ہے عیاں نرمی دل کا جوہر
جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھل کر

رنگ کالا ہو کہ اجلا ہو یہ کہتی ہے نظر
بندرابن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر

کنگرے سے یہ نہیں چہرۂ نورانی پہ
تاج قدرت نے سجایا ہے تری پیشانی پہ

اور اس کی موہنی صورت کے دل پر نقش ہونے کا حال

اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

نقش ہے دل پہ میرے سوہنی صورت تیری
خوب دنیا کے خزانے میں ہے صورت تیری

ذرا ملاحظہ کیجئے یہ بند جس کے ہر ہر لفظ سے وہ گائے کو کس حد تک پسند کرتے تھے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار
بے پئے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار
وہ اترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار
ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

گائے ہمیں دو طرح سے غذا بہم پہنچاتی ہے ایک دودھ کے ذریعہ ؎

نام جس کا ہے محبت وہ ہے ایمان تیرا
کوئی ہو سب کیلئے فیض ہے یکساں تیرا
زندگی کیلئے محتاج ہے انساں تیرا
کون بیمار نہیں بندۂ احساں تیرا
خلق میں دودھ سے جو تیرے تری رہتی ہے
خشک ہوتی تن لاغر کی ہری رہتی ہے

اور اس کے بچھڑے کھیتوں میں ہل چلا کر ہماری غذا اناج کی صورت میں فراہم کرتے ہیں ؎

تیرے بچوں نے کیا اپنے تئیں ہم پہ نثار
اپنی گردن پہ لیا پرورش قوم کا بار
نظر آتی ہے جو ہر فصل میں کھیتی تیار
ہے یہ سب ان کے لہو اور پسینے کی بہار
آن کو منظور نہ ہوتا جو مٹانا اپنا
ہند کی خاک اگلتی نہ خزانہ اپنا

انھیں خصوصیات کی وجہ سے چکبست یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ؎

ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر مجھے تیرا سایہ

مجموعی طور سے یہ نظم اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھی ہے اور چونکہ اردو میں اس طرح کی بہت کم نظمیں لکھی گئی ہیں اس لئے اہم ہے

چکبست کے مندرجہ بالا کلام کے علاوہ دو نظمیں اور ہیں ایک "ندرانۂ روح" اور دوسری ظریفانہ نظم "لارڈ کرزن سے چھیڑ چھاڑ" ہے۔ ندرانۂ روح میں پنڈت بشن نرائن در سے دو بند میں عقیدت اور محبت کا اظہار کیا گیا ہے اور "لارڈ کرزن سے چھیڑ چھاڑ" طنزیہ اور ظریفانہ نظم ہے جو

"منشی سجاد حسین مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ کے حسب فرمائش تصنیف کی گئی تھی اور اودھ پنچ میں شائع بھی ہوئی تھی، لارڈ کرزن نے کلکتہ یونیورسٹی کے کانوکیشن کے موقع پر ایک تقریر فرمائی تھی جس میں ہندوستانیوں کی تہذیب و اخلاق پر سخت اور ناجائز حملہ کیا تھا"[1]

یہ نظم طویل ہے اور ترپن شعر پر مشتمل ہے جس میں بڑی جرأت مندی اور بے باکی کے ساتھ چکبست نے لارڈ کرزن پر لعن طعن کیا ہے، یہ ہمت کسی عاشق وطن ہی میں پائی جا سکتی ہے، اس میں ظرافت کم ہے طنز سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے ؎

لیجے سامنے میرے ہے شبیہ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ

---

[1] صبح وطن ص ۲۰۸

سرخ غصہ سے زرد کبھی صدمہ سے
خوف کے مارے کبھی رنگ میں ہے نیلا پٹ

آگئے ہیں آپ تو کچھ حضرت کرزن سنئے
آپ اگر منہ کے کرشمے ہیں تو ہوں میں پالا ہٹ

آگیا طیش مجھے دل کا نکالوں گا بخار
صاف کہتا ہوں تمہیں بات میں اپنی نو ہٹ

مانیے تھا نہ برا آدمی ہیں آپ شریف
ظالم میں بک جاؤں اگر سٹ پٹ

ہاں ذرا کیوں آپ کے گم ہو گئے ہیں ہوش و حواس
کونسی کیفیت میں یہ دکھلائی ہے کیا جھلاہٹ

گل غنماق کے عوض دور کیا دل کا بخار
خوب پھینکا سر احباب پہ کوڑا کرکٹ

دیں صلاحیں ہمیں کس رنگ کی ماشاء اللہ
خوب ہم جانتے ہیں آپ ہیں جیسے لٹ کھٹ

گالیاں کس لئے در پردہ سنائیں ہم کو
ناچنے نکلے تو پھر منہ پہ رکیا گھونگھٹ

یاد رہ جائے گی لیکن ہے وہ ٹھوکر کھائی
توسنِ طبع کو اب پھر نہ اڑانا سرپٹ

....

یا

یہی اقرار یہی قول یہی وعدہ تھا
او سخن ساز، دغا باز فسونگر نٹ کھٹ

لیکن یہ لہجہ بھی قابل غور ہے ؎

میرے مولا میری بگڑی کے بنانے والے
تو ہی تقدیر اب اس خطہ بیکس کی پلٹ

شاہ اڈورڈ کا اقبال بڑھا دنیا میں
جس پہ سر پھوڑتے ہیں ہم وہ ہے اسکی چوکھٹ

یہ نظم اپنا منفرد مقام اور لہجہ رکھتی ہے اور چکبست کی وطن کے ساتھ شدت کی محبت اور اس کے مخالف سے شدید نفرت کا اظہار کرتی ہے۔

چکبست کا شمار اردو کے نمایاں شاعروں میں سے ہے وہ اگرچہ اقبال کے ہم عصر تھے لیکن وہ حالی اور اقبال کے درمیانی کڑی محسوس ہوتے ہیں انھوں نے حالی کی شاعری، ان کی حب الوطنی، اصلاح پسندی اور درد مندی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور چونکہ وہ وکیل زیادہ تھے اور شاعر کم اس لئے اردو شاعری کو بہت کچھ نہیں دے سکے۔ کم عمری نے بھی بے وفائی کی اس وجہ سے بھی وہ اس میدان میں زیادہ غور و فکر نہیں کر سکے۔ پھر بھی ان حالات میں انھوں نے جو کچھ دیا ہے اس کی ہم قدر کرتے ہیں،

زبان سادہ، سلیس رواں دواں شیریں اور کہیں کہیں بہت پرشکوہ ہے، ہندی کے الفاظ، شکتی، سورج، ماتا ست پاکھنڈ، ودیا، اپکار، کرپہ ورت بھی جا بجا نظر آتے لیکن چکبست کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے انھیں فنکاری کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کی ہے ان کے یہاں اکبر، رانا، ہری سنگھ کے ساتھ کنس، ارجن، بھیم، بھیشم اور انگد کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اسطرح انھوں نے اپنی شاعری میں نئے لفظوں اور تلمیحوں کو استعمال کرکے ادب میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کا مستحسن اقدام ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری انیس، حالی اور اقبال سے متاثر ہے لیکن ان کی اپنی انفرادیت اردو شاعری میں ان کو نمایاں مقام دلانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

از ڈاکٹر اپین چند شرما جبل پور

پنڈت برج نرائن چکبست

پنڈت برج نرائن چکبست عہد وسطیٰ کے ان مشہور شعراء میں سے ہیں جن کو وطنی شاعری کے باعث ایک خاص اہمیت اور شہرت حاصل ہے۔ چکبست کشمیری پنڈت تھے ان کے اجداد نے ایک عرصہ سے عروس البلاد لکھنؤ میں آکر رہائش اختیار کر لی تھی۔ چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں عالم وجود میں آئے۔ ع۔ زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب لیکن ابتدائے عمر ہی میں لکھنؤ آ گئے اور وہاں ان کی نشو و نما ہوئی۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد چکبست نے ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ پھر ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ اس پیشہ میں مختصر عرصہ میں نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔ ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکلاء میں ہونے لگا۔ چکبست جیسے ہونہار انسان سے علم و ادب کو بڑی امیدیں تھیں مگر افسوس کہ انھوں نے عالم شباب ہی میں دارالمحن سے منہ موڑ لیا اور بڑی حیرت ناک موت پائی۔ ہوا یہ کہ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو کسی مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں قریب ایک سا رائے بریلی تشریف لے گئے اور مقدمہ ختم کر کے سہ پہر کو لوٹنے کے لئے سٹیشن پر آئے دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہو گئی۔ حتی الوسع دوڑ دھوپ ہوئی مگر حملہ اتنا شدید تھا کہ جانبر نہ ہو سکے آخر سات بجے رات کو ان کے بڑے بھائی رائے بہادر پنڈت مہاراج نرائن چکبست لاش کو لکھنؤ لے آئے۔

کاظم حسین محشر لکھنوی نے مرحوم ہی کے ایک مصرعہ سے تاریخ وفات نکالی ہے۔

موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

۱۳۴۴ھ

چکبست نے افضل خلف آمیر کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ ان کو ابتدائے عمر ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ انھوں نے نو برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ جیسا کہ ابتدائی نمونہ اردو کا کلام ان کے مطالعہ میں رہا اور آتش کے کلام سے وہ خاص طور پر مستفیض ہو سکے۔

آپ کی غزل پر آتش اور مسدس پر میر انیس کا رنگ غالب ہے۔ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہ تھے اور نہ کوئی تخلص اختیار کیا۔ البتہ گاہ گاہ صرف لفظ "چکبست" پر اکتفا کیا ہے۔ خود کہا ہے۔

ذکر کیوں آئے گا بزم شعرا میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

چکبست نے مروجہ رواج کے مطابق شاعری کی ابتدا غزل ہی سے کی اور کچھ عرصہ تک اس کی مشق کرتے رہے ان کے پاکیزہ ذوق نے شاعری میں ایک خاص جدت پیدا کی۔ حالات کے دھارے بدل رہے تھے۔ انھوں نے سلاست زبان، بندش الفاظ اور حسن ترکیب میں قدما کی پیروی کی ہے۔ غزلیات میں حسن و عشق کی واردات بہت کم ہے۔ انھوں نے غزل کے قدیم مضامین کو صداقت و اصلیت کا رنگ دے کر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان میں وہ سرمدی نغمہ پیدا کیا کہ اس نے ان کو زندہ جاوید کر دیا۔ ایک انگریزی مقولہ کے مطابق "شاعر پیدا نہیں کئے جاتے۔ بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔" چکبست کی ذات اس مقولہ پر پوری اترتی ہے۔ غزل میں انھوں نے آتش و غالب کے طرز کی تقلید کی اور ان کی اکثر غزلوں میں ان اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ مگر غزل گوئی کی محدود فضا سے نکل کر وہ نیچرل شاعری کی وسیع دنیا میں آ گئے اور اس میدان میں انہیں کے رنگ سخن کی رہبری میں انھوں نے ایک شاعر سیاسی، قومی اور ملکی نظموں کی [illegible] اور فلسفہ مرگ و حیات کے موضوع پر بکثرت [illegible] ہیں۔ حب وطن کے جذبات کو اپنے تعلق اور

پورے جوش کے ساتھ ادا کیا ہے۔ تحریکات آزادی کا ان کے دل پر خاص اثر ہوا اور وہ ابتدا سے انتہا تک وطن اور قوم کی محبت میں ڈوبے رہے اور پورے احساس کے ساتھ ان جذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھالا۔

چکبست نے دور جدید کے مسئلوں پر نظمیں لکھیں اور انھوں نے یہ صنف انہیں کے زیر اثر اختیار کی۔ ان کے اس مجموعۂ کلام کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
(۱) منظومات حب قومی (۲) منظومات حب وطنی۔
(۳) منظومات سیاسی (۴) منظومات احباب اور لیڈروں کے مراثی۔ ان تمام منظومات میں وطن و قوم کے محرکات سب سے زیادہ قومی ہیں۔ ان کی شاعری کا خاص مقصد ابنائے وطن کو بیدار کرنا ہے۔ ان میں قومی احساس حالی ہی کے زمانے میں پیدا ہو چکا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس احساس میں قوت آ گئی اور اکبر، اقبال کے زمانہ تک اس میں نکھار پیدا ہو گیا۔ چنانچہ چکبست ان شعرا میں سے ہیں جو سراپا وطن و قوم کی محبت میں سرشار ہیں۔ اور سیاسی و معاشرتی آزادی مدام ان کا نصب العین رہا۔ ان کی شاعری میں مذموم قنوطیت مفقود ہے۔ اقبال کی طرح وہ بھی رجائی ہیں۔ جب ہندوستان کی [illegible] و قومیت کا خوشگوار خواب دیکھ رہے تھے۔ چکبست کی قومی منظومات اقبال کے کلام کی رہین منت ہیں۔ آپ کی ابتدائی نظموں "خاک ہند" "وطن کا راگ" "ہمارا وطن" وغیرہ پر اقبال کا رنگ غالب ہے۔ لیکن بعد میں خداداد طباعی کی بنا پر چکبست نے انفرادی حیثیت حاصل کر لی۔ قومی منظومات میں ان کا جوش و خروش [illegible]

مانند شاعروں میں سارتا ہے۔ قومیت کا جذبہ ان کے رگ رگ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کا ہر لفظ دلفریب اور ہر شعر پر درد تاثیرات کے لئے سے خزانہ ہے۔ چکبست ہمارے ملک کی آزادی کے علمبردار ہیں جو دار و رسن کی قربانیوں کو اپنا فرض تصور شمار کرتے ہیں۔ وہ سیاسی، علمی، اقتصادی اور مذہبی آزادی کے پرستار ہیں۔ ہندوستان کو غلامانہ ذہنیت سے نجات دلانے کے طالب ہیں۔

سبحان اللہ لکھنؤ کی سرزمین بھی کیا اکسیر کا رتبہ رکھتی ہے اس خاک سے ایسے بے نظیر شعرائے کرام اٹھے ہیں کہ انھوں نے شعر و شاعری کے مینار کے ہر گوشے میں ایسی ضو پاشی کی ہے کہ بایدو شاید۔ اس عروس البلاد کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس نے معتبر یگانۂ روزگار ادیب اور فن کار ہمیں عطا کئے ہیں کہ ہم ان کے احسانات سے تا عاقبت سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں۔ اللہ اللہ اس فضا میں کیا تاثیر ہے کہ یہاں پہلوان سخن اور اکابر مصنفین، ابھر کر ہوئے ہیں۔

چکبست نے اپنے احباب اور آشنا لوگوں کے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں لیڈران قوم کی وفات پر شاعر نے جو پر زور نظمیں کہی ہیں وہ انتہائی صداقت اور خلوص کی آئینہ دار ہیں۔ ان نظموں میں علمبرداران آزادی کی سچی سیرت اور انفرادی خصوصیت کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چکبست کی ان نظموں میں اپیل کا مادہ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

چکبست کا اسلوب بیان سادہ و شستہ ہے

شو ی گلزار نسیم کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

لیکن یہ یاد رہے کہ محض عبارت سادہ نظم کرنا شاعری نہیں ہے۔ شاعری کی عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش اور پر تاثیر ہو...

... برخلاف نثر کے شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اختصار کے ساتھ باندھا جائے اور محض ایک حالت کا اشارہ کرتی ہے ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے گذر جائیں۔

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ شاعری کو ایک سادہ صنعت گری کا نمونہ خیال کرتے تھے۔ اور چند سخن الفاظ کے معاملے میں آتش کی مرصع سازی کے قائل تھے۔ بقول

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

ان کی زبان صاف و شستہ ہے اور لکھنؤ کی خالص ٹکسالی زبان ہے۔ انھوں نے ہندی کے سلیس اور مترنم الفاظ کا استعمال کر کے کلام کی شیرینی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے گویا ان کی زبان آب کوثر میں دھلی ہوئی ہے۔ چکبست کی نظم "رامائن" اردو شاعری میں قابل قدر ہے۔ اس کا موضوع مرثیہ کی طرح مہتم بالشان ہے۔ اور اسلوب بیان میں بھی مرثیہ کی جھلک کارگر ہے۔ یہ نظم ایک حزنیہ ہے۔ اس میں ڈرامائی خوبی بڑی حد تک موجود ہے۔

وطن اور قوم کی محبت، تاریخی یا مذہبی واقعات

فطرت کے مناظر کی ہو بہو نقاشی کرتے ہیں۔ جزئیات کی تفصیل، تخئیل کی صفائی اور حسن بیان کے اعتبار سے یہ نظم اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ ہے

"نثر میں وہ معرکۂ چکبست و شرر کی وجہ سے مشہور ہوئے لیکن فن تنقید کے نقطۂ نظر سے اس معرکہ کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ اس کا انداز شخصی اور ذاتی زیادہ ہے علمی اور ادبی کم"۔ مضامین چکبست کا دائرہ محدود ہے۔ نہ ان میں تنوع ہے نہ موضوعات میں رنگا رنگی۔ ان کی تو بر کشمیری پنڈتوں کے سرسری حالات زندگی اور ان کے علمی و ادبی کمالات پر مرکوز ہے۔ اُن کا نثر میں کوئی معتد بہ کارنامہ نہیں ہے۔ وہ مخصوص تفکرات کے مالک ہیں گو اُن کے فکر کی پرواز فلکِ ہفتم کو مس کرتی ہے لیکن ان کے چند مضامین آنکھوں کو نور دل کو سرور پہونچاتے ہیں۔ ان کے ادبی شاہکار بہت معدودے چند ہیں۔

القصہ ان کے مضامین بیسویں صدی کے تہذیبی کش مکش، جدید اور قدیم قدروں کا تصادم اور اس کے اثرات کا جائزہ لینے میں مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس دور کے ادبی، سیاسی و اقتصادی رجحانات پر روشنی ڈالتے ہیں نیز لکھنؤ اسکول کے نظریہ شعر و ادب کے سمجھنے کے لئے کارآمد ہیں۔ یہی ان مضامین کی افادیت ہے۔

ان کی تنقیدوں میں وسعت اور گہرائی مفقود ہے نہ ان میں جامعیت ہے اور نہ رفعت۔ ان کی طرز تحریر دلکش اور سنجیدہ ہے ان کی نثر کی پاکیزگی اور شگفتگی بھی قابل قدر ہے۔ ان کے جادو نگار قلم کی ہر تصویر لطافت اور سلیقہ مندی کی آئینہ دار ہے۔ گو ان کی تحریریں عیب سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن بے عیب نام صرف اللہ کا ہے۔ تعمیری اور اصلاحی پہلو نام نہاد ہے لیکن چکبست مدلل اور سنجیدہ بیانی کی بناء پر دیگر نقادوں پر گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ وہ اپنے قلم کو ذاتیات سے آلودہ کرنے کے قائل نہیں ہیں یہ اُن کے بلند کردار پر دال ہے۔ ہر قرن کا ماحول اور ادبی قدریں جداگانہ ہوتی ہیں۔ جس فضا میں چکبست سانس لیتے ہیں اُن کی ادبی صلاحیت اور تنقید نگاری اُسی ماحول کی پیداوار ہے لیکن اب تنقید نگاری روز بروز ترقی کی منزل کی جانب گامزن ہے نیز چکبست کے عہد اور تفکرات سے بہت آگے نکل آئی ہے

چکبست کو وطن سے والہانہ محبت ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں حب الوطنی کا راگ سمایا ہوا ہے جس کو وہ لفظی جامہ پہنا کر اپنے سیاسی شعور کو اظہر من الشمس کرتے ہیں۔ اُن کو وطن کی خاک اُس کے پہاڑوں، اس کے قدرتی مناظر سے اُنسیت ہے۔ اپنے ملک کی عظمت پر ان کو ناز ہے۔ قدرتی مناظر میں بھی اللہ کا نور جلوہ گر ہے ہمارے ملک کی شان و شوکت پر کوہ ہمالیہ شاہد ہے۔ قدرت کی ہر شے میں روحانیت کا جذبہ موجزن ہے جو سب کو حب الوطنی کا پیغام دیتا ہے۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے

تیری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اگر چکبست نے ہندو قوم پرستی کی علامت گوتم۔ سرمد اور رانا پرتاپ کی وفات پر نوحہ گری کی ہے تو مسلم قوم پرستی کی علامت جیسے اکبر اعظم کی موت پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ ان قوم اور ملک کے جانثاروں کی خدمت و عظمت کا اعتراف کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے اس خاک کے پردے میں مہ جبین۔ سرتاج اور مذہبی پیشوا ابدی نیند میں سرمست ہیں۔ یہ

کھنڈر بتا رہے ہیں کہ عمارت بلند تھی

خاک ہند میں چکبست نے اس کی جبیں سے نورانی حسن کا جلوہ عیاں کیا ہے۔ مشترکہ تہذیب و کلچر کی عکاسی بڑے مؤثر پیرایہ میں کی ہے۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمین پر صدقے کیا وطن کو

اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

چکبست نے ہندوستان کی قلمرو کو انگریزی حکمران کے آہنی چنگل سے نجات دلانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ شاعر محکوم رہنے سے قید خانہ کی زندگی اور بیڑیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہاں نہ کسی محتسب کا خوف اور نہ حاکم کا ڈر عذاب جان ہوگا۔ وہ ہوم رول کے صادق فدائی او علمبردار ہونے کی حیثیت سے اس کی دستیابی کے لئے بیتاب ہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ مینا و حور کو بھی تج کر سکتے ہیں۔

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے

جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

شاعر ساکنان دنیا کی بے وفائی سے نالاں ہے۔ برگ و بار بھی اس ماحول سے بیزار ہیں۔ طیور قفس میں محبوس ہیں۔ اور ان کی آزادی چھین لی گئی ہے۔ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے لیکن انگریزوں نے ہمارے دل و دماغ کو مفلوج کر کے طوق غلامی گلے میں ڈالا ہے۔ قدرتی مناظر اور پھول بھی آزادانہ نشو و نما سے محروم ہیں۔

ہے آج کل کی ہوا میں وفا کی بربادی
گھٹے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی

قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی
اڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی

ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

یاد رکھیے آزادی کے شیدائیوں کا قلبی جوش و خروش ایک دن اپنا رنگ لائے گا۔ شاعر کا خون اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے تملا رہا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اور انگریز

کا جابرانہ رویہ اس ولولہ کو دبا نہیں سکتے ہیں۔ شاعر کسی بھی قیمت پر ہوم رول کا طالب ہے۔ اس کے لیے رضوان خواہ جنت کا دروازہ بند رکھے لیکن اُس کا نصب العین حاصل ہو جائے۔

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا

یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبست کی دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا کہ چند ہندوستانیوں نے ولایت کی زیارت کرکے غداروں کی صف میں شمار ہونا احسن سمجھا ہے۔ ان کا انداز گفتگو، اطوار، رفتار اور دماغی رجحان سب بناوٹی ہیں۔ گو رنگ حسب معمول سیاہ ہے لیکن وہ خود کو ہندوستانی تصور کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ حکمرانوں کے سامنے جبیں سائی کرکے فخر کرتے ہیں اور اپنے مذہبی رہنماؤں سے دشمنی مول لیتے ہیں۔

جچ اکبرسے جو یورپ کے ہوئے ہیں ممتاز
ہے وطن میں بھی غریب الوطنی پر انہیں ناز

بیر یارانِ طریقت سے ہے غیروں سے ہے سانٹھ
وہ بناوٹی ہوئی چتون وہ انیلے انداز

لب و لہجہ میں لگاوٹ ہے طرحداری ہے
اک فقط رنگ پہ قابو نہیں لاچاری ہے

شاعر ہندوستانیوں پر ٹرینسوال میں جو مصائب نازل ہوئے ہیں۔ اس دردناک سانحہ کا عبرتناک نقشہ کھینچ کر ہمیں عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن قومی اتحاد کا مفہوم ان کے یہاں بھی پختہ ہے۔ وہ قوم کو ہندو اور مسلم دونوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور دونوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں۔

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی
اسیر یاس بھی اور اسیر زنداں بھی

تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی
ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی

پڑھی نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کے گنگا میں

شاعر حب الوطنی کے جوش میں سرمست ہے اور وطنیت کا جذبہ اس کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے ہر شخص کسی نہ کسی قدرتی منظر کا دلدادہ اور شیدائی ہے۔ بلبل بھی پھولوں کی محبت میں سرشار ہے۔ چکبست کو وطن کی خاک کا ہر ذرہ عزیز ہے اور اس خاک میں مرمٹنے کو عین سعادت سمجھتا ہے۔

تجھ خاک کا پتلا ہے تو خاک ہونا ہے تجھے

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک

بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

سر تیج بہادر سپرو لکھتے ہیں "مگر چکبست کے کلام میں زیادہ رنگینی اور درد ہے اور انسانی جذبات و محسوسات پر

اس کا اثر بہ نسبت انسانی دماغ کے زیادہ پڑتا ہے۔
اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ چکبست نے لکھنؤ کی آب وہوا میں نشو و نما پائی ہے اور ان پر ان اساتذہ کے کلام کا زیادہ اثر ہے جو لکھنؤ کی ناموری کا باعث ہوئے اور جہاں نے اس شہر کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔"

چکبست کی شاعری و جادو نگاری کے آنکھے ہم عصر کلمہ پڑھتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرے گا اس لافانی شاعر کی شہرت میں اضافہ ہوگا۔ آئندہ نسلیں اسکو دور جدید کا رہنما شمار کریں گی۔

قصہ کوتاہ چکبست ہر لحاظ سے صف اول کے شعرا کے زمرہ میں شامل ہیں اور ان کا مجموعہ کلام "صبح وطن" باوجود یکہ بہت مختصر ہے لیکن اپنی نوعیت و اعتبار کے لحاظ سے اس کا پلہ بہت سے ضخیم دواوین پر بھاری ہے

●●

از حکیم عبدالقوی دریابادی

چکبست پر بہترین تحقیقی مقالہ

پنڈت برج نرائن چکبست اُردو کے ہندو شاعروں اور ادیبوں میں خصوصی درجہ حیثیت رکھتے تھے ساتھ ہی وہ ایک اچھے قانون پیشہ اور سیاسی رہنما کی بھی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن وہ اس وقت کی بقول (معتدل) جماعت سے تعلق رکھتے تھے یہ سیاسی مقاصد کے قول کے لیے عوامی تحریکات اور سیاست میں جوش و خروش کی قائل نہ تھی۔ تاہم اُن کا جذبہ حب وطن نیر شک و شبہ سے خالی نہ تھا۔

افسوس ہے کہ اُن کی سوانح حیات اور ادبی خصوصاً شاعرانہ کارناموں پر کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی اور اردو کے شعرا کے تذکروں ادب اُردو کی تاریخوں میں اُن کا ذکر بہت مختصر ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُن کیساتھ پُورا انصاف نہیں کیا گیا۔

اب جاکر ڈاکٹر افضال احمد ایم اے، ایل ایل بی نے 'پی ایچ ڈی کے مقالہ کے لیے چکبست کی حیات اور ادبی خدمات' کے موضوع کا انتخاب کیا۔ اور اپنے لائق اُستاد اور اُردو کے نامور خدمت گزار پروفیسر احتشام (جن کو مرحوم لکھتے قلم کا کلیجہ شق ہو جاتا ہے) کی نگرانی میں اسے بڑی محنت و تلاش سے مرتب کیا۔ اس کی اشاعت کی تو میدیہ اُردو اکاڈمی یو پی کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۰ء میں آئی اور اس کی بدولت اردو کے اس شاعر، اور ادیب کے متعلق بہت کچھ منظر عام پر آگیا!

مقالہ کے شروع میں چکبست کی سوانح درج ہے۔ اسی سلسلہ میں کشمیر کے پنڈتوں کے متعلق بہت سے ضروری معلومات آگئے ہیں، اور اسی سوانح والے حصہ میں جناب چکبست کے ایک خط سے اس مغالطہ کی تردید کر دی گئی ہے کہ اُن کا تخلص چکبست تھا۔ موصوف نے تذکرہ خمخانہ جاوید کے مولف علامہ سری رام دہلوی کو اپنے خط میں لکھا تھا کہ

چکبست میرا عرف ہے نہ کہ تخلص

اور چکبست اُن معدودے شعرائے اردو میں شامل ہیں جن کا سرے سے کوئی تخلص نہیں مثلاً مولوی محمد اسماعیل میرٹھی مرحوم (جن کی درسی کتابیں اُردو سکھانے کیلئے بہترین مانی گئی ہیں اور جو برسوں داخل نصاب ہو چکی ہیں) اور مولانا ظفر علی خاں اڈیٹر زمیندار۔

مقالہ نگار نے بڑی تلاش کے بعد یہ بتایا ہے کہ چکبست آنجہانی مظفر علی خاں اسیر مرحوم کے صاحبزادے منشی سید افضل علی افضل کے شاگرد تھے۔

اس کے علاوہ چکبست لکھنؤ کے ایک اور صاحب علم اور سیاسی رہنما پنڈت بشن نرائن در تخلص بہ ابر سے بھی بہت متاثر ہوئے۔ امیر صاحب اگرچہ اصلاً انگریزی کے مضمون نگار تھے لیکن اُردو میں بھی تھوڑا بہت اُنھوں نے لکھا ہے وہ خوب لکھا ہے اُن کی موت پر چکبست نے جو نوحہ لکھا ہے وہ بہت ہی موثر اور اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ہے

چکبستؔ کا مجموعۂ کلام صبح وطن کے نام سے شائع ہوا تھا اور نثر میں اُن کے نثری مضامین کا مجموعہ مضامین چکبست کے نام سے شائع ہوا تھا چکبست لکھنوی کے ایک اور اہم سیاسی مخلص اور محترم صحافی بابو گنگا پرشاد ورما سے بھی بہت متاثر تھے۔ ان کی آزاد خیالی اور سیاسی افکار نے اُن پر بہت اثر ڈالا تھا۔ اُن کے دیوان میں گنگا پرشاد ورما صاحب کا جو مرثیہ درج ہے وہ بشن نرائن در کے مرثیہ سے کسی طرح نہیں۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

اپنی آنکھوں میں سمائی ہے تری موت کی رات
سرگ سے آتے ہیں دلیوتا کہ رشی کی وفات
ذات معبود سے ملتے ہیں کہ ہے تیری ذات
طے ہوا جاتا ہے اک آن میں دریائے نجات
عرش سے فرش پہ سامان سفر آیا ہے
"چاند کشتی لئے گردوں سے اُتر آیا ہے

میدان سیاست میں اس وقت مسٹر تلک اور مسٹر گوکھلے ایک دوسرے کے مد مقابل کی حیثیت رکھتے تھے چکبست اگرچہ تلک کا بہت احترام کرتے تھے اور اُنکی موت پر بھی ایک درد ناک مرثیہ لکھا اور اپنے ماہنامہ صبح امید لکھنؤ کے اداریہ میں اُن کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی اظہار کیا ہے کہ وہ اُن کے عملی پولیٹکل مسلک پر گامزن نہ ہو سکے۔ بلکہ اُس کے مخالف ہی رہے گوکھلے کا انتقال بھی چکبست کی زندگی میں مسٹر تلک سے بہت پہلے ہوا، اُن کا مرثیہ اُنھوں نے لکھا" اور تلک کے مرثیہ سے بھی زیادہ سوز و گداز اور تاثر رکھتا ہے۔ گوکھلے تقریر بھی انگریزی میں کرتے تھے اُس زمانہ میں ہندی کا زیادہ چرچا نہ تھا۔ اُن کی انگریزی تقریروں کا ترجمہ گوکھلے کی تقریریں کے نام سے ۱۹۱۷ء میں ہندوستان پریس نظیر آباد لکھنؤ سے چھپا تھا۔ اس پر سلیس اُردو میں دیباچہ چکبست ہی کے قلم سے ہے۔

غزلیات کے علاوہ چکبست نے جن مخصوص اصناف سخن میں خصوصی مہارت کا ثبوت دیا ہے اُن میں مرثیہ بھی ہے ان کی قومی نظمیں بھی بہت خوب ہیں اور اس زمانہ کی سیاسی فضا میں خاصی مقبول ہوئی تھیں کہ اُن کے زمانہ میں مسز اینی بسنٹ نے ہوم رول تحریک چلائی تھی۔۔۔

اس کا ذکر ان کی متعدد نظموں میں ملتا ہے اور اس تحریک
کے سلسلہ میں اُن کے اس شعر نے خاص شہرت حاصل
کی تھی ؎

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

چکبست نے اصلاح قوم کے لیے بھی متعدد نظمیں کہی تھی
بیوہ کی شادی اس زمانہ میں ناقابل برداشت تھی، انھوں
نے اس کی بڑی کوشش کی کہ بیوہ کی شادی کا رواج
ہو جائے۔

وہ لڑکیوں کی تعلیم کے قائل تھے لیکن انھیں یہ
گوارا نہ تھا کہ وہ مغربی تہذیب سے سرشار ہو کر مشرقی
اور ہندی حیا اور شرافت کو خیرباد کہیں۔ چکبست کے
زمانہ میں لڑکے جذبہ نقالی میں تعلیم کے اثر سے مغربیت
کی جس روش پر گامزن تھے اس سے بچنے کی انھوں نے اپنی قوم
کی لڑکیوں کو پرزور تلقین کی ہے۔ اُن کی مشہور نظم پھول
مالا کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

روش خام سے مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم پہ اپنی نہ لگانا ہرگز
تم کو قدرت نے جو بخشا ہے حیا کا زیور
مول اس کا نہیں قاروں کا خزانہ ہرگز

انھوں نے اپنی ایک سیاسی نظم میں اس وقت کے سیاسی
حالات کے پیش نظر مسلمانوں سے بھی دردمندانہ خطاب
کیا ہے ایک بند ملاحظہ ہو ؎

دکھا دو جذبۂ اسلام اے مسلمانو
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کے یادگار ہو تم

منظر نگاری میں بھی چکبست کو کمال حاصل تھا۔ اس
سلسلہ میں ان کی دو نظمیں سیر دہرہ دون اور آصف الدولہ
کا امام باڑہ جس کی نشان دہی مرتب کتاب نے کی ہے
واقعی یہ دونوں نظمیں بڑی بلند پایہ اور شاعرانہ خوبیوں
سے مرصع ہیں۔ امام باڑہ سے متعلق صرف ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

آصف الدولہ مرحوم کی تعمیر کہن
ان کے کلام میں جس کی صنعت کا نہیں صفحۂ ہستی پہ جواب غزلیات
بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ ..... شاعری کی قدیم راہ سے
ہٹ کر انھوں نے اعلیٰ اخلاق اور فلسفیانہ چیزیں بھی
سلیس انداز سے اپنے اشعار میں پیش کی ہیں اسی سلسلہ
میں اُن کا یہ شعر تو تقریباً ضرب المثل بن گیا ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

ایک اور غزل کا مطلع اسی رنگ اور اسی تیور کا ملاحظہ
ہو ؎

فنا کا ہوش آنا، زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

چکبست کی شاعری نسبتاً زیادہ معروف رہی لیکن ان
کی نثر نگاری بھی کچھ کم رتبہ کی نہ تھی۔ ۔۔ ان کا رسالہ
صبح امید سیاست و ادب کے سلیس و شگفتہ مضامین کا
حامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مشہور ظریفانہ ہفتہ وار

اودھ پنچ لکھے ایک زمانہ میں مستقل مضمون نگار تھے۔ اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ ۲۰ مضامین پر مشتمل مضامین، چکبست کے نام سے شائع ہوا تھا غالباً اس کا ایک ہی اڈیشن نکلا۔ ان مضامین میں اُن کا ایک تنقیدی، مضمون اُردو شاعری پر خاص طور سے لائق مطالعہ ہے۔

اُردو ادب میں جس ادبی مباحثہ یا معرکہ نے چکبست کو خاص شہرت دی وہ معرکۂ چکبست و شرر ہے اُردو کے مشہور مورخ و ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالہ دلگداز لکھنؤ میں نسخہ دیا شنکر نسیم صاحب کی، مشہور مثنوی گلزار نسیم پر اعتراضات کئے تھے۔ جس کا جواب اودھ پنچ میں چکبست نے شرر کے مضمون کے جواب میں اردوئے معلی اور اودھ پنچ کے متعدد مضامین لکھے جو اس کے جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ جاری رہا۔ رفتہ رفتہ بے سنجیدہ شاعرانہ و علمی بحث سے رکیک و نامعتدل حملوں کی شکل اختیار کر گئی اور ادب کے نام سے بے ادبی کا ارتکاب دونوں سے ہوا۔ اسی قسم کے سارے مضامین کا مجموعہ معرکۂ چکبست و شرر کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور اب بھی اسے دیکھا جاسکتا ہے۔

چکبست نے اس سلسلہ میں مضامین لکھے خصوصاً شروع بحث پر اس میں اپنی سنجیدگی انھوں نے برقرار رکھی۔ لیکن اس میں جب بحث نے طول کھینچا اور نوبت ذاتیات کی آ گئی تو کہیں کہیں اُن کا قلم بھی جادۂ اعتدال

سے ہٹ گیا اور ایسی بحثوں میں عموماً ایسا ہوکر رہتا کم لوگوں کو علم ہوگا کہ چکبست نے ایک ڈرا بھی کملا کے نام سے لکھا تھا اور اُن کی دوسری مثنو نگاروں کی طرح سے صرف ایک ہی بار زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اس ڈرامے کے ذریعہ چکبست نے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ مغربی تہذیب تعلیم کے اثرات اور خاص طور پر مغربی خیالات حد سے تجاوز کر جائیں تو وہ کسی طرح مشرقی زندگی ساتھ نہیں دے سکتے اور اُن کے باعث طرح طرح خرابیاں پیدا ہوکر رہیں گے مرتب کتاب میں اس ڈ کے جواب تقریباً نایاب ہے اقتباسات اچھے خاصے دیکر اسے بھی اور حلقہ ...... میں زندگی دیدی۔ اور ۲۳۰ صفحات کے اس مقالے میں اس ڈرامے لئے پورے اٹھائیس صفحے وقف کر دیئے ہیں۔

مقالہ کا آخری عنوان چکبست کا ادبی مقام اس میں مرتب نے جس توازن و اعتدال کیا اور ہیرو واشب سے جو احتراز کیا گیا ہے وہ بلاشبہ قابل داد

ڈاکٹر سلام سندیلوی

چکبست کی شاعری

جس طرح اجڑے ہوئے گھر کی رونق جلوۂ مہتاب سے ہوتی ہے اسی طرح چکبست کے ٹوٹے ہوئے دل کی زینت وطن کی محبت سے تھی۔ وہ حب الوطن کے نشہ سے سرشار تھے ان کی زندگی کا مقصد ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا انھوں نے اپنی ساری زندگی حب وطن میں گذار دی اور مرتے دم تک ہندوستان سے محبت کرتے رہے۔ درحقیقت ان کے دل میں آزادی کے ارمان اس طرح تاباں تھے جس طرح فلک میں تاروں کی چمک جھلکتی ہے۔

چکبست کا شمار ہم اردو کے ان شعرا میں کر سکتے ہیں جنھوں نے ملک و قوم کی خدمت کی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری مقصدی شاعری ہے۔ عام طور سے مقصدی شاعری میں [illegible] فنکاری کی چمک نہیں پائی جاتی ہے۔ مگر چکبست کی مقصدی شاعری میں ادبی محاسن بھی ہیں کیونکہ ان کی شاعری کلاسیکی، شاعرانہ جذبات کے خلوص اور اسلوب کے حسن

یہ صحیح ہے چکبست کی شاعری اپنے عہد کی آواز ہے۔ ان کی شاعری ہندوستان کی آزادی کی نقیب ہے۔

درحقیقت شاعری زندگی کی تنقید ہوتی ہے۔ اب یہ شاعر پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کلام میں ذاتی زندگی کی جھلک پیش کرے یا اپنے سماج کی عکاسی کرے۔ جب شاعر اپنے سماج کی عکاسی کرتا ہے تو ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب سماج کی پیداوار ہے۔ اسی بنا پر ہڈسن نے لکھا ہے کہ...

(LITRATURE IS THE PRODUCT OF SOCIETY).

ہڈسن کا یہ قول چکبست کی شاعری پر مکمل طور سے منطبق ہوتا ہے چکبست نے اپنے ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ چکبست کے عہد میں ہندوستان کی تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ اس تحریک آزادی کی علمبردار کانگریس تھی کانگریس کی تحریکات اور اس کی تحریکات کا عکس ہم کو چکبست کی شاعری میں ملتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ چکبست کی شاعری بڑی حد تک سیاسی شاعری

اس موقع پر اگر ہم چکبست کے عہد کی سیاسی کش مکش کا
جائزہ لیں تو شاید بے محل نہ ہوگا۔

چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے مگر
ان کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی۔ جو ان کا اصل
وطن تھا۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے کیننگ کالج سے بی
اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں وکالت کا امتحان
پاس کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں وکالت کرنے لگے
اور اپنے پیشہ میں بڑی کامیابی حاصل کی۔

چکبست نے جب ہندوستان کی فضا میں آنکھ کھولی
تو انھوں نے انگریزوں کی حکومت کو اس پر مسلط پایا۔
اس سے قبل ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کی سلطنت
ختم کر دی تھی اور نواب واجد علی شاہ کو قید کر کے کلکتہ
روانہ کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا اور انگریزوں نے
بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے رنگون بھیج دیا۔ اس طرح
انگریزوں کی حکومت ہندوستان پر مستحکم ہو گئی۔

اگرچہ ہندوستانی غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔
مگر اس ملک کا ذہین طبقہ اس غلامی کے طوفان کو توڑ کر
پھینک دینا چاہتا تھا۔ لارڈ رپن (۱۸۸۰—۱۸۸۴ء) نے
پہلی بار محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کو انتظام حکومت میں
شامل کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس نے لوکل سلف گورنمنٹ
کا طریقہ رائج کیا۔ اور میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ
قائم کئے۔ اس میں ممبران خود اپنا چیرمین منتخب کرتے
تھے۔

لارڈ رپن کی اس تبدیلی کے باوجود ہندوستان کا
مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ہندوستان کا اعلیٰ طبقہ
انگریزوں کے انتظام سلطنت سے مطمئن نہیں تھا بہت
سے ہندوستانی اس بات کے شاکی تھے کہ ان کو انتظام
سلطنت میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح ان
حقوق کو نظر انداز کیا گیا ہے اسی بنا پر ہندوستان
میں قومی و ملکی جذبات نمودار ہوئے۔ بنیادی حقوق
حاصل کرنے کیلئے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس
کی بنیاد پڑی۔ اس کے بانی ایلن اوکٹاوین ہیوم
مگر اس کے سرگرم اراکین ہندوستانی تھے۔ ۱۸۸۵ء میں
انڈین نیشنل کانگرس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ہوا اور یہ
مطالبہ کیا گیا کہ لیجسلیٹو کونسل میں اصلاح ہو اور ہندوستان
کی مفلسی دور کی جائے۔ لارڈ ڈفرن نے ان مطالبات
کسی نہ کسی حد تک منظور کر لیا۔

۱۹۰۵ء میں جاپان اور روس کے درمیان جنگ
ہوئی جس میں جاپان کو چھوٹی سی سلطنت نے روس کی
عظیم الشان سلطنت کو شکست دیدی۔ اس واقعہ نے
ہندوستانیوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ چنانچہ انھوں نے
انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا اور مختلف مقامات پر
ہندوستان میں ہنگامے برپا کئے مگر اس دوران میں،
ہندوستانیوں میں اور خصوصاً کانگرس میں اختلاف پیدا
ہو گیا۔ اب کانگریس میں ایک نرم پارٹی تھی جس میں
دادا بھائی نوروجی سریندر ناتھ بنرجی، مدن موہن مالویہ
اور گوپال کرشن گوکھلے شامل تھے۔ دوسری گرم پارٹی تھی
جس میں بال گنگا دھر تلک لالہ لاجپت رائے اور مسٹر
اروند گھوش تعلق رکھتے تھے۔

۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں اجلاس ہوا۔ تاریخی نقطہ نظر
سے اس اجلاس کی بہت اہمیت ہے اس کے صدر دادا
بھائی نوروجی تھے۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں
واضح طور پر کہا کہ کانگریس کا اصل مقصد سوراج
ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سورت میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔

اس میں گرم پارٹی غالب آگئی۔ اب دکن اور مہاراشٹر
میں تلک کا اثر بہت بڑھ گیا۔ ان کے مضامین "کیسری"
میں شائع ہوتے تھے اور ہندوستانیوں میں جوش
پھیلاتے تھے۔

انگریزوں نے جب ہندوستانیوں کے جوش و
خروش کو محسوس کیا تو لارڈ منٹو نے جو اسوقت ہندوستان
کے وائسرائے تھے۔ وزیر ہند مسٹر منٹو سے مشورہ کیا اور
یہ طے ہوا کہ اہل ہند کو کچھ مراعات دی جائیں۔ چنانچہ
۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاح کی رو سے گورنمنٹ آف
انڈیا ایکٹ پاس ہوا۔ اس کے بموجب وائسرائے کی
رو سے یہ بھی طے ہوا کہ کونسل میں نامزدگی کے بجائے
انتخاب ہو۔ اس ایکٹ کو نرم پارٹی والوں نے منظور کیا
خصوصاً گوکھلے نے اس کو ٹھیک کہا۔ مگر گرم پارٹی والوں
نے ناپسند کیا۔

اس کے بعد یورپ میں ۱۹۱۴ء میں پہلی بار جنگ
عظیم کا آغاز ہوا۔ اس میں یورپ کے بہت سے ممالک
شامل ہوگئے چنانچہ ایک طرف انگلستان، فرانس، بلجیم،
اٹلی۔ یونان روس اور امریکہ تھے۔ دوسری طرف
آسٹریلیا جرمنی، ترکی، بلگیریا۔ سرویا اور رومانیا
وغیرہ ریاستیں تھیں۔ اس جنگ میں انگریزوں نے
ہندوستانیوں سے درخواست کی کہ وہ جنگ میں انکی
مدد کریں تو وہ ہندوستان کو آزاد کر دیں گے۔ ہندوستانی
اس مدد کیلئے راضی ہوگئے۔ ہندوستانی فوجوں نے
فرانس مصر اور عراق وغیرہ کے میدان میں بہادری کے
جوہر دکھائے۔

دوران جنگ میں بھی ہندوستان میں آزادی کی
تحریک جاری رہی۔ چنانچہ مسز اینی بسنٹ نے ۱۹۱۶ء
میں "ہوم رول لیگ" کی بنیاد ڈالی اور اپنے اخبار "نیو انڈیا"
کے ذریعہ اپنے نظریات کی ترویج کی۔ برٹش گورنمنٹ
اس لیگ سے بہت مخالف ہوگئی۔ اس نے ۱۹۱۷ء میں
مسز اینی بسنٹ کو نظر بند کر دیا مگر ہوم رول کی تحریک کم
نہیں ہوئی۔

چونکہ پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانیوں نے انگریزوں
کی مدد کی تھی۔ اس لیے ۱۹۱۸ء میں جنگ کے اختتام پر
ہندوستانیوں کو بجا طور پر امید تھی کہ اب ہندوستان
کو انگریز آزاد کر دیں گے مگر انگریزوں نے اپنا وعدہ
پورا نہیں کیا اور ہندوستان کو آزادی نہیں دی۔ اس
کے بجائے انھوں نے ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ
پاس کیا جس کی رو سے دوہری حکومت کا اصول
(DYARCHY SYSTEM) رائج ہوا۔ انگریزوں
نے صوبائی لیجسلیٹو کونسل قائم کی۔ اس ایک شعبہ منتقلہ
(TRANSFERED DEPARTMANT) تھا۔ اس میں گورنر نے
وزرا کو کچھ اختیارات سپرد کر دیئے تھے دوسرا شعبہ محفوظ
(RESRENED DEPARTMEN) تھا۔ اس کے اختیارات
گورنر کے ہاتھوں میں محفوظ تھے۔ انگریزوں نے مرکزی
کونسل آف اسٹیٹ۔ اس میں ۶۰ ممبر ہوتے تھے جن میں
سے ۲۶ کو وائسرائے کے نامزد کرتا تھا۔ دوسرا لیجسلیٹو
اسمبلی کہلاتا تھا۔ اس میں تقریباً ۲۰۰ اراکین ہوتے تھے۔
اس میں انتخاب کا طریقہ رائج تھا۔ اور منتخب ممبروں کی
تعداد زیادہ ہوتی تھی۔

جب ۱۹۱۹ء کا ایکٹ پاس ہوا تو ہندوستانی اس
سے مطمئن نہیں ہوئے۔ کیوں کہ وہ لوگ سلف گورنمنٹ
چاہتے تھے اس لیے ہندوستان میں [illegible]
ہو گیا۔ ان ہنگاموں کو کچلنے کیلئے برٹش گورنمنٹ نے

۱۹۱۹ء میں "رولٹ بل" پاس کر دیا۔ تاکہ باغیوں کو سزا دی جائے۔ اس قانون سے ہندوستانی بہت برہم ہوئے اور انھوں نے گاندھی جی کی قیادت میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دی۔ ۱۹۱۴ء میں گاندھی جی افریقہ سے واپس آگئے تھے۔ انھوں نے ستیہ گرہ کی تحریک کو باقاعدہ منظم کیا۔ اب سارے ملک میں ستیہ گرہ کی تحریک پھیل گئی اس تحریک کے سلسلہ میں پنجاب میں دو لیڈر گرفتار ہوئے۔

اس گرفتاری کے خلاف جلیان والہ باغ میں ایک بڑا جلسہ ہوا اس جلسے کو منتشر کرنے کے لئے جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جس میں بہت سے ہندوستانی مارے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں ملابار کی موپلا قوم نے بغاوت کر دی۔ پھر چوراچوری کا المناک واقعہ پیش آیا مختصر یہ کہ اس وقت ہندوستان انتشار کے دور سے گزر رہا تھا۔

۱۹۲۲ء میں ترک موالات کے سلسلے میں گاندھی جی گرفتار کر لئے گئے۔ اور ان کو چھ سال کی سزا ہو گئی مگر دو سال کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ گاندھی جی کی قید سے ستیہ گرہ کی تحریک مدھم پڑ گئی تھی۔ اسی درمیان میں کچھ کانگریسیوں نے اور خصوصاً سی۔ آر۔ داس نے طے کیا کہ ہم لوگوں کو کونسل میں شریک ہونا چاہیئے اور وہاں جا کر "سوراج" کے لئے کوشش کرنا چاہیئے چنانچہ ۱۹۲۳ء میں کونسل ہی کے اندر "سوراج" پارٹی قائم ہو گئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں برٹش گورنمنٹ نے ایک کمیٹی قائم کی۔ تاکہ ہندوستانیوں کو مزید حقوق دیئے جائیں مگر سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر محمد علی جناح نے اس کمیٹی کی رپورٹ کو نامنظور کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ایک ذمہ دار حکومت قائم کی جائے جس میں ہندوستانیوں کو شامل کیا جائے غرض کہ ہندوستان ملک کی آزادی کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے اور انھوں نے حصول مقصد کے لئے مصائب بھی برداشت کئے۔ کیونکہ چکبست کا انتقال [illegible] فروری ۱۹۲۶ء میں رائے بریلی میں ہو گیا اس لئے گذشتہ صفحات میں ۱۹۲۶ء تک کی تحریک آزادی کا ذکر کیا گیا ہے۔

چکبست نے زیادہ تر اپنے جذبات کا اظہار نظموں میں کیا ہے۔ اس لئے پہلے ان کی نظموں کا جائزہ لیا جاتا ہے ان نظموں میں بھی ان کی سیاسی نظمیں بہت اہم ہیں اس لیے ان کی سیاسی نظموں کا ذکر سب سے پہلے کیا جا رہا ہے۔

چکبست کی نظموں کا مطالعہ

(چکبست کی سیاسی شاعری)

چکبست بنیادی طور پر ایک وطنی شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "صبح وطن" رکھا ہے۔ انھوں نے جب شعور کی فضاؤں میں آنکھ کھولی تو غلامی کا دھندلکا نظر آیا۔ لیکن انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہندوستانی رہنما اس دھندلکے کو دور کرنے میں مصروف ہیں اور ہندوستان کی فضا میں آزادی کا اجالا پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ در اصل چکبست کی شاعری میں ان کے دور کا عکس نظر آتا ہے ہندوستان کی تحریک آزادی جن منزلوں سے گزر رہی تھی وہ نقوش ان کی شاعری میں کہکشاں کی طرح روشن ہیں۔

چکبست کو ہندوستان سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اپنے ملک کی محبت میں سرشار تھے۔ ہندوستان میں حب الوطنی

قوم کے درد سے ہوں سوزِ وفا کی تصویر
میری رگ رگ میں ہے پیدا تپِ غم کی تاثیر

ہے مگر آج نظر میں وہ بہارِ دیگر
کر لیا دل کو فرشتوں نے طرب کے تسخیر

یہ نسیمِ سحری آج خبر لائی ہے
سال گذرا ہے گلشن میں بہار آئی ہے

اس نظم میں چکبست نے چند بند بطور "تمہید" نظم کیے ہیں اس کے بعد "ترقی انجمن" کا عنوان ملتا ہے پھر انھوں نے "حالت قوم" کا ذکر کیا ہے۔ یہ نظم بھی بہت موثر ہے اس کے ساتھ ہی چکبست کی کہنہ مشقی پر دلالت کرتی ہے اگرچہ اس نظم کا تعلق صرف کشمیری قوم سے ہے تاہم اس سے ملکی محبت کی بھی بو آتی ہے۔

۱۹۱۴ء میں چکبست نے نظم "فریاد قوم" کے عنوان سے کہی۔ یہ نظم ان ہندوستانیوں کی محبت میں کہی گئی ہے جو جنوبی افریقہ میں ٹرینسوال کے حکام کے جور و ستم سے عاجز تھے۔ ان ہندوستانیوں کی مدد کے لیے گاندھی جی ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ گئے تھے "فریاد قوم" نظم میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے اس کے علاوہ ہندوستان کے باشندوں کو پیغام ہمدردی بھی دیا گیا ہے۔ چنانچہ چکبست فرماتے ہیں۔

وطن سے دور تباہی میں ہے وطن کا جہاز
ہوا ہے ظلم کے پردے میں حشر کا آغاز

سنیں تو ملک کے ہمدرد قوم کے دمساز
ہوا کے ساتھ یہ آتی ہے دکھ بھری آواز

وطن سے دور ہیں ہم پہ نگاہ کر لینا
ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

....

ٹرینسوال کے حاکم وفا شعار نہیں
کچھ ان کے قول کا دنیا میں اعتبار نہیں

ہماری قوم پہ احساں کا ان کے بار نہیں
یہ ظلم کیوں ہے ہم ان کے گنہگار نہیں

اگر وہ دولتِ برطانیہ کے پیارے ہیں
تو اہلِ ہند بھی آسماں کے تارے ہیں

اس نظم میں چکبست نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بیداری کا بھی پیغام دیا ہے۔

کہاں ہیں ملک کے سرتاج، قوم کے سردار
پکارتے ہیں مدد کے لئے در و دیوار

وطن کی خاک سے پیدا ہیں جوش کے آثار
زمین ہلتی ہے اڑتا ہے خون بن کے غبار

جگر سے اپنے ہے چھوڑ کی زمیں سر کی
لرز رہی ہے کئی دن سے قبر اکبر کی

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ، ہوشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار

اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیرِ موج فنا ہوگا آبرو کا مزار

مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

دکھا دو جوہرِ اسلام اے مسلمانو
وقارِ قوم گیا قوم کے نگہبانو

ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرضِ وفا کو پہچانو

نبی کے خلق مروت کے وارث ہو تم
عرب کی شان حمیت کے یادگار ہو تم

یہاں ایک اور نکتہ قابل غور ہے۔ چکبست کی نظر میں
سارا ہندوستان ایکتا کے تحت آجاتا ہے۔ یعنی وہ دو
قومی نظریہ کے قائل ہیں۔ اسی لیے انھوں نے ایک
طرف ہندؤں کو مخاطب کیا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے
مسلمانوں کو قوم کے نوجوانوں کہہ کے خطاب کیا ہے
۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوگیا۔ اسوقت
ہندوستانی فوج نے انگریزوں کی مدد کی۔ انگریز لوگ
جرمنی کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ ہندوستانی فوج
انگریزوں کی حمایت کر رہی تھی۔ اس وقت کانگریس
کا بھی نظریہ تھا کہ انگریزوں کی مدد کی جائے اور اس
کے معاوضے میں ہندوستان کے لیے آزادی کا مطالبہ
کیا جائے۔ اس وقت چکبست نے ایک نظم بہ عنوان
"قوم کے سورماؤں" کی الوداع کہی۔ جس کے ذریعہ
انھوں نے ہندوستانی فوج کے حوصلے بلند کیے۔ اس کے
چند بند درج ذیل ہیں۔

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں
لے کے نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
دل میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں
تیغ زن، برق فگن، قلعہ شکن جاتے ہیں
سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کے تلوار کے سائے میں قضا چلتی ہے

ان و بیران وطن دھاک بٹھا کر آنا
نقشۂ جرمن خود بیں کا مٹا کر آنا
قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا
ندیاں خون کی برلن میں بہا کر آنا
یہی گنگا ہے سپاہی کے نہانے کے لیے
دھار تلوار کی ہے پار لگانے کے لیے

یا ظفر یاب تمھیں دیکھ کے دل ہو بشاش
آئے یا خو کے وطن خون میں ڈوبی ہوئی لاش

سر جدا تن سے ہو یا ہو تن بسمل صد پاش
گوشۂ امن و اماں کی نہ ہو آنکھوں کو تلاش

موت معراج ہے اس دشت کے راہی کے لیے
آنچ تلوار کی جنت ہے سپاہی کے لیے

جیسا کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے کہ مسز اینی بسنٹ نے
۱۹۱۶ء میں "ہوم رول لیگ" کی بنیاد ڈالی تھی جس کا
مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو خود حکومت بنانیکا موقع
دیا جائے۔ جب مسز اینی بسنٹ نے یہ انجمن قائم کی تو
اس کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی اور عوام نے ان کا
ساتھ دیا۔ چکبست نے بھی مسز اینی بسنٹ کے نظریات
کی ہمنوائی کی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے "آوازۂ قوم"
کے عنوان سے ایک نظم کہی جس میں ہندوستانیوں کا مقصد
"ہوم رول" قرار دیا۔ اس کے کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردہ میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

یہ آرزو ہے کہ ہر وہ فضا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح شام رہے
نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیر دام رہے
سر شہنشاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

اور اس موقع پر بھی انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ایک
غزل کی صورت میں کیا۔ اس غزل کے دو اشعار یہ ہیں

انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

امیدیں مل گئیں مٹی میں دورِ ضبط آخر ہے
صدائے غیب بتلا دے ہمیں حکم خدا کیا ہے

۱۹۲۰ء کے بعد چکبست کی سیاسی شاعری کچھ مدھم
پڑ گئی۔ غالباً ان کو مایوسی نے گھیر لیا اور وہ یہ سمجھے کہ
ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا بہت مشکل ہے۔
یہی وجہ ہے ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی گرفتار ہوئے اور ان
کو چھ سال کی سزا ہوگئی تو چکبست نے کوئی غمگین نظم
نہیں کہی۔ اگرچہ گاندھی جی کو چھ سال کی سزا ہوئی تھی
مگر وہ دو سال کے بعد رہا کر دیئے گئے یعنی ۱۹۲۴ء میں
ان کو رہائی حاصل ہوگئی۔ اس خوشی کے موقع پر بھی چکبست
خاموش رہے اور انھوں نے کسی مسرت آمیز نظم کی تخلیق
نہیں کی۔ چکبست کی خاموشی کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے
کہ وہ وکالت کے پیشے میں زیادہ مصروف ہو گئے ہوں
اس لیے ان کو شاعری کا موقع نہ ملتا ہو۔ غرضیکہ ۱۹۲۰ء
کے بعد چکبست کی شاعری پر جمود چھا گیا اور ۱۹۲۶ء میں
ان کا انتقال ہوگیا

بہر حال ایک بات مسلم ہے کہ چکبست کی سیاسی
شاعری کانگریس کی تحریک کے دوش بدوش چلتی ہے
اس دور میں کانگریس کے جو نظریات تھے اس کی عکاسی
چکبست نے اپنی شاعری میں کی ہے۔ چکبست کے عہد
کے ہندوستان میں زیادہ تر سیاسی خیالات یہ تھے کہ
انگریزوں سے مفاہمت کر کے سیاسی حقوق حاصل کئے
جائیں اور ملکی انتظام میں حصہ لیا جائے یا پھر جنگ میں
مدد دے کر ہندوستان کو آزاد کرایا جائے۔

دراصل حصول آزادی میں ہندوستان دنیا کے دیگر
ممالک سے پیچھے تھا۔ مثلاً ۱۹۰۷ء میں روس والوں نے
زار کی حکومت ختم کر دی تھی اور وہاں کمیونسٹ حکومت
قائم ہو گئی تھی۔ اسی طرح ۱۹۱۱ء میں چین میں ینگ پارٹی
(Young China Party) نے منچو حکومت
(Manchu Dynasty) کو ختم کر دیا تھا
۱۹۲۱ء میں آئرلینڈ نے جو خود مختاری حاصل کرلی تھی
ہندوستان کے سامنے آزادی کی یہ مثالیں تھیں۔ مگر
ہندوستانی بغاوت کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے
چکبست کے یہاں بھی باغیانہ خیالات نظر نہیں آتے ہیں

اردو ادب میں چکبست کی سیاسی شاعری کی بڑی
اہمیت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی شاعری
میں خلوص اور صداقت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔
چکبست واقعی حب الوطنی کے نشے سے سرشار تھے
یہی وجہ ہے کہ وہ وطن کے نور سحر کو جوئے شیر سمجھتے تھے۔
اور یہاں کے ہر ذرہ کو رشک مہر تصور کرتے تھے۔ ان کی
حب الوطنی کا یہ عالم تھا کہ وہ مرنے کے بعد کفن کے لئے
خاک وطن کی خواہش رکھتے تھے یہ ان کی حب الوطنی
کی انتہا ہے۔

چکبست کی معاشرتی شاعری

چکبست کا دور اصلاحی تھا۔ اس دور میں زندگی کے

سے شیعہ عیسائی اصلاح کی کوشش کیجا رہی تھی۔ چوں کہ ہندوستان میں انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوگئی تھی۔ اس لیے انگریزی مشن کے اراکین عیسائی مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ہندوستانیوں کو اس سے خطرہ محسوس ہوا کہ ان کا مذہب تباہ ہوجائے گا۔ اس قسم کا احساس سب سے پہلے بنگال میں بیدار ہوا۔ چنانچہ راجہ رام موہن رائے (۱۷۷۲ء ۔ ۱۸۳۳ء) نے بنگال میں "برہمو سماج" کی بنیاد ڈالی۔ یہ جماعت کئی مذہبوں کا نچوڑ تھی۔ اس میں اسلام کی وحدانیت انجیل کی اخلاقیات اور ابنیشد کا فلسفہ شامل تھا۔ چونکہ راجہ رام موہن رائے انگریزی داں تھے اس لیے ان کی نظر میں وسعت تھی۔ اس کے باوجود ان کی تحریک کا خاص مقصد ہندو قوم کی اصلاح تھا۔ اسی لئے انھوں نے فرسودہ مذہبی رسوم کو ٹھکرا دیا۔ اس کے علاوہ بت پرستی کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ انھوں نے ستی کو بھی [illegible] قرار دیا اور ہندو سماج کی مختلف خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

راجہ رام موہن رائے کے بعد کیشو چندر سین نے برہمو سماج تحریک کو آگے بڑھایا۔ کیشو چندر سین نے ذات پات کی تفریق کو ختم کرنے کی کوشش کی انھوں نے اس بات کی بھی ہمت افزائی کی کہ مختلف ذات کے افراد آپس میں شادی بیاہ کریں۔ اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے انھوں نے ۱۸۶۶ء میں "برہمو سماج" کی بنیاد ڈالی۔

بنگال میں رام کرشن (۱۸۳۶ء ۔ ۱۸۸۶ء) نے بھی ہندو مذہب کو فروغ دیا۔ انھوں نے ہندو مذہب کے معتقدات کو ایک نئی زندگی دی جس سے ہندوؤں کے دل و دماغ روشن ہوئے۔ رام کرشن کے اثر سے بنگال میں "بھگتی تحریک" کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے "گیتا" کے مطالعہ پر زور دیا۔ ایشور چندر ودیا ساگر اور رابندر ناتھ ٹیگور اسی تحریک کے مقلد تھے۔

بنگال کے علاوہ یوپی میں بھی مذہبی اور سماجی تحریک نے کروٹ لی۔ سوامی دیانند سرسوتی (ولادت ۱۸۲۴ء) سنسکرت کے ایک زبردست عالم تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۵ء میں "آریہ سماج" تحریک کی بنیاد ڈالی انھوں نے مذہب کی قدیم کتب اور خصوصاً پران کا گہرا مطالعہ کیا۔ ان کا قول تھا کہ قدیم ویدوں پر ہندو مذہب کی اصل بنیاد قائم ہے۔ اس لئے دیگر باتیں فروعی ہیں۔ انھوں نے وحدانیت کا پرچار کیا اور بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی۔ انھوں نے ذات پات کی تفریق کو بھی مٹانے کی کوشش کی اس کے علاوہ عورت اور مرد کے رتبہ کو مساوی قرار دیا۔ عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی وہ مائل ہوئے انھیں وید اور سنسکرت کی ترقی کیلئے ۱۹۰۲ء میں "گرو کل" کی بنیاد ڈالی غرض کہ ہندوستانی سماج میں انھوں نے زبردست اصلاح کی۔ اور آریہ سماج جماعتیں ہندو مذہب کی تبلیغ ایک نئے انداز سے کر رہی تھیں۔ چوں کہ اسوقت تک ہندوستان میں انگریزی ادب کافی پھیل چکا تھا اس لیے ہندوستانیوں کے دماغ میں فہم و فراست اور عقل و خرد کی شعاعیں روشن ہو چکی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں نے عقل و خرد کی روشنی میں مذہبی اصولوں کی تبلیغ کی۔

ہندوستانیوں کی ترقی کے سلسلہ میں سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء ۔ ۱۸۹۸ء) کا نام بھی ضروری ہے۔ انھوں نے

ایام غدر کے بعد ہندوستانیوں کی اور خصوصاً مسلمانوں
کی زبردست خدمت کی انھوں نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الا
خلاق" جاری کیا۔ اس کے ذریعہ انھوں مسلمانوں کی سیاسی
معاشی، معاشرتی، مذہبی ادبی اور علمی ترقی کی کوشش کی
اور بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔

سرسید نے بھی عقل و دلائل کی روشنی میں اسلام کو
ایک نئے انداز میں پیش کیا ان کے دور میں انگریز مسلمان
اور اسلام پر مسلسل حملے کرتے تھے۔ خصوصاً سر ولیم میور
لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغرب) نے "لائف آف محمدؐ"
چار جلدوں میں لکھی اور بانئ اسلام پر رکیک حملے کئے۔
سرسید نے اس ذلت کو برداشت نہیں کیا اور انھوں
نے اس کے جواب میں بارہ مقالات لکھے جن کو "خطبات
احمدیہ" کے نام سے شائع کر دیا اس میں سر ولیم میور کے
ہر اعتراض کا مدلل جواب ہے۔

جن لوگوں نے ہندو سماج کو بلند کیا ہے ان میں
بادیو گووند رانا ڈے (۱۸۴۲ء - ۱۹۰۱ء) کا نام بھی بہت
اہم ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے لوگوں کو اپنے نظریات
سے متاثر کیا۔ ۱۸۶۱ء میں انھوں نے MARRIAGE
ASSOCIATION کی بنیاد ڈالی۔ اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۹ء میں ایک بیوہ کی شادی ہوئی۔ انھوں
نے پونا میں "سرو جنک سبھا" بھی قائم کی اور انڈین نیشنل
کانگریس کے ساتھ بھی کام کیا۔ بہرحال ہندوستانی سماج
اصلاح میں رانا ڈے کا بھی ہاتھ ہے۔

اس سلسلے میں گوپال کرشن گوکھلے (۱۸۶۶ء - ۱۹۱۵ء)
کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۵ء میں Society
Servants of India قائم کی جس کا مقصد یہ
تھا کہ ہندوستانیوں میں روحانیت بیدار کی جائے۔ اس
سوسائٹی نے اہل ہند کے اخلاقی معیار کو کافی بلند کیا

پنڈت مدن موہن مالویہ (۱۸۶۱ء - ۱۹۴۶ء) نے
بھی ہندو سائٹی پر اچھے خاصے اثرات چھوڑے ہیں انھوں
نے ہندو سماج کی اصلاح کی ہے خاص طور سے وہ تعلیمی
رجحان رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں
کے مفاد کے لیے بنارس ہندو یونیورسٹی قائم کی اس کے
علاوہ انھوں نے آریو ویدک کالج کی بھی بنیاد رکھی۔
بہرحال انھوں نے ہندوستانی قوم کی بہت خدمت کی ہے

مہاتما گاندھی (۱۸۶۹ء - ۱۹۴۸ء) ہندوستان کے
سب سے بڑے رہنما تھے۔ ہندوستان کی آزادی کا سہرا
انھیں کے سر ہے۔ سیاسی مصروفیات کے علاوہ انھوں نے
معاشرتی اصلاحات کی طرف بھی توجہ کی۔ وہ ۱۸۹۳ء میں
جنوبی افریقہ گئے اور وہاں ۱۹۱۴ء تک قیام کیا۔ افریقہ
میں انھوں نے ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کیلئے جنگ
کی۔ مہاتما گاندھی نے خاص طور سے اچھوت طبقے کی ترقی
کیلئے کوشش کی۔ انھوں نے ان کو "ہری جن" کے خطاب
سے نوازا انھوں نے چھوت چھات کی لعنت کو ہندوستان
سے دور کرنے کی کوشش کی۔

جب چکبست نے معاشرتی شاعری کا آغاز کیا تو
اس وقت ان کے سامنے ہندوستان کی ساری معاشرتی
اصلاح کی تحریکات تھیں۔ انھیں تحریکات کی روشنی میں
انھوں نے اپنے قلم کو جنبش دی اور ملک و قوم کے مفاد
کیلئے اپنے نظریات پیش کئے۔

پنڈت مدن موہن مالویہ تعلیم کی طرف کافی متوجہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ ۳ ستمبر ۱۹۱۱ء کو لکھنؤ میں ہندو یونیورسٹی کے سلسلے میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا یہ جلسہ چندہ جمع کرنے کیلئے منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسے میں پنڈت مدن موہن مالویہ بذات خود موجود تھے۔

اس موقع پر چکبست نے ایک نظم "قومی مسدس" کے عنوان سے کہی اور اس جلسے میں پڑھی اس نظم میں چکبست فرماتے ہیں ؎

الٰہی کون فرشتے ہیں یہ گدائے وطن
صفائے قلب سے جھلکے یہ بزم ہے روشن
جھکی ہوئی ہے سبھوں کی لحاظ سے گردن
ہر اک زباں پہ ہیں تعظیم اور ادب کے سخن
صفیں کھڑی ہیں جوانوں کی اور پیروں کی
خدا کی شان یہ پھیری ہے کن فقیروں کی!
فقیر علم کے ہیں ان کی داستان سن لو
پیام قوم کا دکھ درد کا بیان سن لو
یہ دن وہ دن ہے جو ہے یادگار ہاں سن لو
ہے آج غیرت قومی کا امتحاں سن لو
یہی ہے وقت امیروں کی پیشوائی کا
فقیر آئے ہیں کاسہ لیے گدائی کا

کیوں کہ راناڈے کا اثر ہندو قوم پر زبردست پڑ رہا تھا اس لئے انھوں نے خصوصاً بیوہ عورت کی شادی پر زور دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کشمیری پنڈتوں کے فرقہ میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی ہوئی۔ چکبست نے اس اصلاح کا خیر مقدم کیا اور اس موقع پر ۱۹۱۲ء میں ایک نظم کہی جس کا عنوان "برق اصلاح" ہے اس نظم کے چند بند درج ذیل ہیں ؎

مرحبا، حضرات اصلاح دلانے والو
قوم کے بار امانت کے اٹھانے والو
دل کی اجڑی ہوئی نگری کے بسانیوالو
مادر ہند کی بگڑی کے بنانے والو
کیسے طوفاں میں دیا ہے یہ سہارا تم نے
خوب ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارا تم نے
کل جسے عین لطافت میں خزاں نے لوٹا
آج اس باغ کا شاداب ہے بوٹا بوٹا
بیڑیاں کٹ کے گریں قفل اسیری ٹوٹا
چاند معصوم کی قسمت کا گہن سے چھوٹا
تم بھی خود شاد ہوئے قوم کو بھی شاد کیا
دل کے ویران شوالے کو بھی آباد کیا

عورتوں کی اصلاح کیلئے چکبست نے ایک نظم "پھول مالا" کہی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے عورتوں کو آزادی کے خراب نتائج سے آگاہ کیا ہے ان کے عہد میں انگریزی کلچر کا گہرا اثر ہندوستانی سوسائٹی پر ثبت ہو چکا تھا۔ اس لئے ہندوستانی عورتیں ذہنی آزاد تھیں وہ کلب جاتی تھیں اور سیر و تفریح میں اپنا وقت گزارتی تھیں اس غلط آزادی کی خامیوں کو ظاہر کرنے کیلئے چکبست نے ہندوستانی عورتوں کو خطاب کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

رنگ ہے جسمیں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز

چکبست کی مذہبی شاعری

چونکہ چکبست ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے اس لئے فطری طور پر ان کا رجحان ہندو مذہب کیطرف تھا: یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بہت سی ایسی نظمیں کہی ہیں جن کا تعلق ہندو مذہب سے ہے ۔ مثلاً "رامائن کا ایک سین" ان کی بہترین مذہبی نظم ہے۔ ایک جگہ انھوں نے شری رام چندر کا ماں سے رخصت ہونے کا منظر پیش کیا ہے ؛

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی
دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

یہ نظم بیانیہ شاعری کی ایک حسین مثال ہے۔ اس میں جذبات کی صداقت موجود ہے اور قدم قدم پر فصاحت اور بلاغت کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ ایک طرف تو رام چندر اداس ہیں مگر وہ رو کر ماں کو ملول نہیں کرنا چاہتے ہیں دوسری طرف ماں بھی ضبط سے کام لے رہی ہے اس کے باوجود بیٹے سے اپنی محبت کا اظہار کر رہی ہے وہ کہتی ہے۔

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

آگے چل کر ماں کہتی ہے۔

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

یہ بلاغت کی ایک اعلیٰ مثال ہے چونکہ ماں غم زدہ ہے اس لئے وہ رانی کے بجائے ایک فقیر کی بیٹی بننا پسند کرتی ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں کسی کو اس سے حسد نہ ہوتا۔ بہر حال چکبست کی یہ نظم بہت کامیاب ہے۔

چکبست نے ایک نظم کرشن کنھیا پر جنم اشٹمی کے سلسلے میں کہی ہے اس نظم میں بھی خلوص و صداقت موجود ہے

معلوم ہوتا ہے ان کے دل سے چشمے پھوٹتے ہیں اور کاغذ
پر گنگناہٹ کے ساتھ رواں دواں ہیں اس نظم کے دو
بند ملاحظہ ہوں۔

آج کی رات کا دنیا کے لیے کیا ہے پیام
حسن قدرت کا سر شام سے ہے جلوہ عام
نور برساتے ہیں تاروں کے چھلکتے ہوئے جام
بن گیا ساز طرب ہستی عالم کا نظام
فرش راحت پہ اگر آنکھ جھپک جاتی ہے
بانسری کی مرے کانوں میں صدا آتی ہے

بے حجابی کی عروسان چمن میں ہے ادا
گل کی نکہت سے اشارہ ہے کہ پردہ کیسا
دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے موروں کی صدا
برسنے کی ہے کہتی ہے یہ پورب کی ہوا
پیشوائی کے لئے خلق خدا اٹھی ہے
آج جمنا کے کنارے سے گھٹا اٹھی ہے

دراصل یہ بند حسن و جمال کا مرقع ہے۔ کہ کرشن کنھیا
کے سلسلے میں عروسان چمن کی بے حجابی کا ذکر بلاغت
کا نازک ترین انداز ہے۔

اگرچہ چکبست ہندو تھے مگر وہ اسلام کے مخالف
نہیں تھے۔ دراصل ان کی نظر میں ہندوستان کی ایک قوم
کی اہمیت تھی۔ اس لئے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو
ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے ان کی "ہم ایک ہیں" کا یہ عالم
ہے کہ انھوں نے "خاک ہند" نظم میں ایک بند میں گوتم
اور رانا پرتاب کا نام لیا ہے اور اسی نظم میں اکبر اور
سرمد کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی
ہے کہ ان میں تعصب نہیں تھا ان کی بے تعصبی کے ثبوت
میں ہم ان کی اس نظم کو پیش کر سکتے ہیں جس کا عنوان
"آصف الدولہ کا امام باڑہ" ہے۔ اس نظم کے چند اشعار
درج ذیل ہیں۔

آصف الدولہ مرحوم کی تعمیر کہن
جس کی صنعت کا نہیں لکھنؤ بستی پہ جواب
دیکھ اے سیاح اسے رات کے سناٹے میں
منہ سے اپنے مہ کامل نے جو الٹی ہو نقاب
در و دیوار نظر آتے ہیں جو صاف ایک
سحر کرتی ہے نگاہوں پہ ضیائے مہتاب
یہی ہوتا ہے گماں خاک سے مس اس کو نہیں
ہے سنبھالے ہوئے دامن میں ہوائے شاداب
یک بیک دیدہ حیراں کو یہ شک ہوتا ہے
ڈھل کے سانچے میں زمیں پر اتر آیا ہے سحاب
بیخودی کہتی ہے آیا ہے فضا میں کیوں کر
کسی استاد مصور کا ہے یہ جلوہ خواب
اک عجب منظر دلگیر نظر آتا ہے
دوسرے عالم تصویر نظر آتا ہے

چکبست کی منظریہ شاعری

اردو میں دور قدیم کی منظریہ شاعری زیادہ تر رسمی
اور تقلیدی انداز میں ملتی ہے مثنویوں میں جو منظر نگاری
پائی جاتی ہے وہ یا تو غیر ملکی ہے یا محض تخیلی ہے جیسا
غواصی نے "سیف الملوک و بدیع الجمال" مثنوی میں مصر
کے مناظر قدرت پیش کئے ہیں جو محض فرضی ہیں یا میر حسن

کون سے شہر کا نام معلوم ہے اور نہ بادشاہ کا۔ اس لئے
قصہ سراسر خیالی ہے۔ یہی حال اُردو قصائد کی منظر نگاری
کا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ کی تشبیب میں سودا کہتے ہیں

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

سودا نے ایرانی مہینوں یعنی بہمن و دے اور اردی کا استعمال
کیا ہے انھوں نے بھی غیر ممالک کے ناظر پیش کئے ہیں۔
مرثیوں کے واقعات کا تعلق سرزمین کربلا سے ہے اس
لیے اس صنف کی منظر نگاری میں تضاد ملتا ہے۔ کربلا
کی منظر نگاری کے بجائے اس میں ہندوستان کے مناظر
قدرت کے جلوہ دکھائے ہیں غرض کہ دور قدیم میں محمد قلی
قطب شاہ اور ولی گجراتی کے علاوہ کسی نے برنائے
مشاہدہ منظر کشی نہیں کی ہے البتہ دور متوسط میں نظیر اکبر
آبادی کے یہاں مناظر اپنے اصل خط و خال میں ملتے
ہیں۔

دراصل منظر نگاری کا حسن و جمال اُردو شاعری
کے دور جدید میں نکھر کر سامنے آیا ہے۔ مولوی محمد حسین
آزاد، حالی۔ اسمٰعیل میرٹھی، بے نظیر شاہ۔ سرور جہاں
آبادی اور جوش ملیح آبادی کے یہاں مناظر قدرت
کے نقشے اصلی اور عین موجود ہیں۔ ان شعرا نے جن
مناظر قدرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے انھیں کو
قلم بند کیا ہے۔

چکبست کے یہاں بھی منظر نگاری کی مثالیں
موجود ہیں۔ بلکہ چکبست نے اپنی شاعری کا آغاز
ہی منظر نگاری سے کیا ہے چنانچہ ۱۹۰۰ء میں انھوں
نے "جلوہ صبح" کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے اس نظم کا
لب و لہجہ میر انیس کے رنگ و آہنگ سے ملتا جلتا ہے
میر انیس نے اپنے مرثیوں میں صبح کے مناظر پیش کئے ہیں
وہی انداز بیان ہم کو چکبست کے یہاں ملتا ہے۔
میر انیس ہی کی طرح چکبست نے مسدس کی شکل میں،
"جلوہ صبح" نظم کہی ہے چکبست کے مصرعوں کی روانی
الفاظ کی موسیقی اور زبان کی شگفتگی ہم کو میر انیس کی
یاد دلاتی ہے اس کے باوجود ان کی اس نظم میں بڑی
عمومیت ہے۔ کسی خاص مشاہدہ کی جھلک انھیں نظر
نہیں آتی ہے البتہ حسن بیان اپنے نقطہ عروج پر موجود
ہے اس نظم کے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

جب رنگ شب آئینہ ہستی سے ہوا دور
ہنگام سحر کون و مکاں ہو گئے پر نور
تبدیل صورت کوہ شب دیجور
چمکا وہ تجلی سحر سے صفت طور
بجلی کی طرح چرخ پہ نور سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر فرقِ انجم نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم
مرغان ہوا نغمہ زنی کرتے ہیں باہم
ہنگام سحر باد سحر چلتی تھی پیہم
آرام میں سبزہ تھا نہ چادر شبنم
ہر سمت بندھی نعرۂ بلبل کی صدا تھی
غنچوں کی نسیم سحری عقدہ کشا تھی

چکبست نے ۱۹۰۹ء میں ایک نظم بہ عنوان "بہار"
کہی ہے مگر چونکہ یہ غزل کے رنگ میں ہے اس لئے

چکبست کو کھل کر اظہار خیال کا موقع نہیں ملا اسکا
نتیجہ یہ ہوا کہ .... اس نظم میں برسات
کی کوئی خاص کیفیت نظر نہیں آتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں

ہے دلاتی یاد دے لو غمی فضا برسات کی
دل بڑھاتی ہے آ آکر گھٹا برسات کی

اگ رہا ہے ہر طرف سبزہ در و دیوار پر
انتہا گرمی کی ہے اور ابتدا برسات کی

دیکھنا سوکھی ہوئی شاخوں میں بھی جان آگئی
حق میں پودوں کی مسیحا ہے ہوا برسات کی

منظریہ اعتبار سے چکبست کی بہترین نظم "شہر دہرہ
دون" ہے جو انھوں نے ۱۹۱۶ء میں کہی ہے چکبست نے اس
نظم میں مشاہدات کی صحیح جھلکیاں پیش کی ہیں ـــــ
دہرہ دون کو انھوں نے بذات خود اپنی نظروں سے دیکھا
تھا۔ اس لیے انھوں نے وہاں کے مناظر قدرت کی عکاسی
میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کے چند اشعار درج
ذیل ہیں۔

کہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا سگون
[illegible] دلکش ہے شہر دہرہ دون

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی
جدھر نگاہ اٹھے ہر طرف ہے ہریالی

گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب
لطیف و سرد ہوا پاک و صاف چشمۂ آب

طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ
کھڑے ہیں کوہ و شجر پہلوؤں میں صف بستہ

یہاں، جو آکے مسافر قیام کرتے ہیں
یہ سنتری انھیں پہلے سلام کرتے ہیں

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر
فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر

بس ایک شام ہو چار سمت طاری ہے
نہ شورش ہے نہ دنیا کی آہ زاری ہے

چکبست نے ان اشعار میں بتایا ہے کہ دہرہ دون،
میں ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے وہاں درخت گھنے ہیں
جھاڑیاں ہری ہیں، زمین شاداب ہے ہوا ٹھنڈی ہے
پانی صاف ہے۔ ندی میں پیچ و خم نظر آتا ہے ہر طرف خموشی
طاری ہے یہ سارے مناظر اصلیت اور صداقت پر مبنی ہیں
اس لیے چکبست کی نظم "شہر دہرہ دون" بہت کامیاب
ہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو کی منظریہ شاعری میں اس نظم
کا ایک اعلیٰ مقام ہے۔

چکبست کی رثائی شاعری

چکبست نے کچھ مرثیے بھی کہے ہیں جو اعلیٰ درجے کے
ہیں۔ مرثیوں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اول
مذہبی مرثیے، دوسرے شخصی مرثیے، مذہبی مرثیے شہیدان
کربلا کے ماتم میں کہے جاتے ہیں جیسے فارسی میں کمال
خیاث شیرازی، ابن حسن قاہقانی، خواجہ احمد
سبزواری اور محتشم کاشی کے مذہبی مرثیے مشہور ہیں۔
اردو میں محمد قلی قطب شاہ، سودا، میر، ضمیر، خلیق،
انیس اور دبیر وغیرہ نے مذہبی مرثیے کہے ہیں
شخصی مرثیوں کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں پہلی قسم کے

وہ مرثیے ہیں جو شعرا نے بادشاہوں کی موت پر کہے ہیں جیسے فرخی نے سلطان محمود کی موت پر مرثیہ کہا ہے اور معزی نے سلطان ملک شاہ سلجوقی کی وفات پر آنسو بہائے ہیں۔ کچھ شعرا نے اپنے رشتہ داروں کی وفات پر مرثیہ کہا ہے .... اور خاقانی نے اپنے بیٹے صالح کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے اور خاقانی نے اپنے بیٹے رشید الدین کی موت پر گریہ وزاری کی ہے۔ شخصی مرثیہ نگاری کی تیسری قسم بھی ہے۔ کچھ شعرا نے اپنی زندگی ہی میں اپنی وفات پر اشک باری کی ہے چنانچہ حافظ اور صائب نے ایسے مرثیے کہے ہیں۔ اردو شعرا نے اپنی وفات پر اپنی زندگی میں غالباً کوئی مرثیہ نہیں کہا ہے۔ مگر غزل میں اس قسم کے اشعار ملتے ہیں جو ان کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً ذوق فرماتے ہیں ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

غالب کہتے ہیں ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

اردو میں بھی شخصی مرثیے کچھ شعرا نے کہے ہیں چنانچہ غالب نے عارف کے انتقال پر پُر درد مرثیہ کہا ہے مگر چوں کہ یہ غزل کی ہیئت میں ہے اور غزل کا میدان اظہار خیال کے لیے بہت تنگ ہوتا ہے اس لئے اس مرثیے میں زیادہ سوز و گداز موجود نہیں ہے اس سے بہتر مرثیہ حالی نے غالب کی وفات پر کہا ہے جو غزل کے رنگ میں نہیں ہے بلکہ ترکیب بند میں ہے اس لئے یہ مرثیہ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور اردو شاعری کے شخصی مرثیوں میں ایک بلند مقام رکھتا ہے

دراصل شخصی مرثیوں کی طرف باقاعدہ توجہ چکبست نے کی ہے چونکہ وہ محب وطن تھے۔ اس لئے انھوں نے قومی رہنماؤں کے انتقال پر مرثیے کہے ہیں جنھوں نے ملک کی خدمت کی ہے۔ چنانچہ چکبست نے مہادیو گووند راناڈے (وفات ۱۹۰۱ء) گنگا پرشاد ورما (وفات ۱۹۱۴ء) گوپال کرشن گوکھلے (وفات ۱۹۱۵ء) اقبال نرائن (وفات ۱۹۱۸ء) اور بال گنگا دھر تلک (وفات ۱۹۲۰ء) وغیرہ پر مرثیے کہے ہیں یہ سارے مرثیے ایسے ہیں کہ قارئین کے دل و جگر کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔ ان سارے مرثیوں میں چکبست نے گوپال کرشن گوکھلے کی وفات پر جو مرثیہ کہا ہے۔ وہ بہت دلسوز ہے اس مرثیے کے بند درج ذیل ہیں۔

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کیساتھ
سحر کا نور بڑھا جیسے آفتاب کے ساتھ
چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے
دلوں پہ نقش ہیں اب تک تری زباں کے سخن
ہماری راہ میں گویا چراغ ہیں روشن
فقیر تھے جو ترے در کے خادمان وطن
انھیں نصیب کہاں ہوگا اب ترا دامن
ترے الم میں وہ اس طرح جان کھوتے ہیں
کہ جیسے باپ سے چھٹ کر یتیم روتے ہیں

یہ مرثیہ چکبست کے دل سے نکلا ہے اس لئے ان کی آواز میں دکھ درد موجود ہے۔ خصوصاً دوسرے بند کا آخری مصرع کہ جیسے باپ سے چھٹ کر یتیم روتے ہیں۔ تیر کی طرح ہمارے دل میں چبھ جاتا ہے یہ مرثیہ اس بات کا غماز ہے کہ چکبست کو گوکھلے سے خلوص تھا

۱۹۲۰ء میں بال گنگا دھر تلک کی وفات ہو گئی تلک نے بھی ہندوستان کی زبردست خدمت کی اور اپنے ملک پر اپنی جان قربان کر دی تلک کی وفات سے پورا ملک غم میں ڈوب گیا۔ ان کی موت سے چکبست بھی، بہت متاثر ہوئے اور ایک پردرد مرثیہ کہا چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار
روشنی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار

معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بے کسی چھائی ہے تقدیر بگڑی جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اس بند میں چکبست نے تلک کی ہمت و جرات کی داد دی ہے اور ان کو شیر سے تعبیر کیا ہے اس کے بعد ان کی وفات کا اثر کلام پر دکھایا ہے۔

اٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث
قوم مرحوم اعزاز کہن کا وارث

جاں نثار ازلی شیر دین کا وارث
پیشواؤں کے گزرتے ہوئے ان کا وارث

تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں
آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

اس مرثیے کا آخری بند بہت زوردار ہے

لاش کو تیری سنواریں نہ رفیقان کہن
ہو جبیں کیلئے صندل کی جگہ خاک وطن

تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

شور ماتم نہ ہو، جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

چونکہ چکبست نے تلک کو بھیشم تسلیم کر لیا ہے اسلئے کہ ان کا مشورہ ہے کہ ان کو لکڑیوں کی چتا کے بجائے تیروں کی چتا میں جلانا چاہیئے۔ مہا بھارت کی جنگ میں بھیشم کے جسم میں ان کی موت کے وقت سیکڑوں تیر چبھے ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے اس بند میں "تیروں کی چتا" کا ٹکڑا لطف دے رہا ہے

چکبست نے ان لوگوں پر بھی مرثیہ کہا ہے جو انسانیت اور خلوص کے پیکر تھے۔ چنانچہ انھوں نے لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر بشن نرائن در پر ۱۹۱۶ء میں ایک مرثیہ کہا ہے — بشن نرائن لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر تھے وہ ایک تعلیم یافتہ مہذب شایستہ شریف اور وطن پرست انسان تھے ان کی شخصیت سے چکبست کافی متاثر تھے چنانچہ ان کی وفات پر انھوں نے ایک مرثیہ کہا ہے جس کے کچھ بند بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

صدمہ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زباں کی زباں، دل کا سہارا نہ رہا

گلشن علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلع دانش و بینش کا ستارا نہ رہا

سب پہ غم ایک طرف، ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشک محبت اکثر
جن پہ صدقے ہیں زباں اور قلم کے جوہر
دو نگینے تھے قیمت کے ترے قلب و جگر
ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر

ظاہری حسن و لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

روش عام سے تجھ کو نہ سروکار رہا
جوہر خاص کا ہستی سے طلبگار رہا
گو کہ جنجال میں دنیا کے گرفتار رہا
اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے ہشیار رہا

رنگ دنیا سے رہا عالم فانی میں جدا
جیسے لہروں سے کنول رہتا ہے پانی میں جدا

تیسرے بند کا آخری شعر لاجواب ہے۔ چکبست نے بشن نرائن در کو کنول سے تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ اگرچہ کنول پانی ہی میں رہتا ہے اس کے باوجود پانی سے اوپر اٹھا رہتا ہے اس طرح بشن نرائن در دنیا میں رہتے ہوئے آسودہ دنیا نہیں ہوئے۔

چکبست نے اپنے چند عزیزوں کی وفات پر بھی مرثیے کہے ہیں چونکہ ان کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے قلبی لگاؤ تھا اس لئے ان کی وفات پر ان کو صدمہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایسے مرثیوں میں خلوص کی گہرائیاں موجود ہیں۔ مثلاً انھوں نے اپنے ایک نوجوان عزیز پنڈت ورجو دھیا ناتھ آغا کی وفات (۱۹۱۱ء) پر

ایک مرثیہ بعنوان "ماتم یاس" کہا ہے وہ فرماتے ہیں۔

اے جوانی کے مسافر اے اجل کے میہماں
سو گیا تو سنتے سنتے زندگی کی داستاں
تھک کے نیند آئی ہے ہوتا ہے یہ حیرت سے عیاں
نیم باز آنکھوں میں ہے کیفیت خواب گراں
کار دنیا سے کوئی یوں بے صبر ہوتا نہیں
رات بھر جاگا ہوا دولھا بھی یوں سوتا نہیں

یہ بند سوز و گداز کا پیکر ہے۔ خصوصاً آخری مصرع درد و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اصلیت و حقیقت کی بھی سچی تصویر ہے۔ دولھا کو رات بھر کا جاگا ہوا کہنا کس قدر صداقت آمیز بات ہے چکبست نے ۱۹۱۵ میں ایک مرثیہ بہ عنوان "نغمہ یاس" اپنے ایک نوجوان عزیز تیج نرائن چکبست کی خودکشی کے موقع پر کہا تھا۔ اس مرثیے سے ان کے گہرے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ چکبست فن بلاغت سے واقف تھے اس لئے انھوں نے اپنے شخصی مرثیوں میں مدارج کے فرق کو قائم رکھا ہے۔ محبان وطن کے مرثیوں میں ان کی حب الوطنی اور جذبہ ایثار کا ذکر کیا ہے۔ احباب کے مرثیوں میں ان کی شخصی خوبیاں پر روشنی ڈالی ہے اور عزیز داروں کے مرثیوں میں اپنے ذاتی خلوص کا اظہار کیا ہے غرضیکہ چکبست کے شخصی مرثیے بہت کامیاب رہیں۔

چکبست کی غزل گوئی

چکبست کی غزل عام شعرا کی غزل سے جدا ہے از لب و لہجہ اور انگ و آہنگ ایک نئی کونپل اور ایک نئی

کی کی تازگی رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی
غزل میں کچھ روایتی مضامین ملتے ہیں مگر ان کی تعداد کم
ہے۔ اس کے علاوہ وہ اہم بھی نہیں ہیں۔ انھوں نے
روایتی مضامین سے الگ ہٹ کر جو اشعار کہے ہیں وہ
قابل توجہ ہیں۔ دراصل چکبست کی غزل میں ہم کو کسی نہ
کسی حد تک مولانا حالی کے خواب کی تعبیر نظر آتی ہے۔
مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری" میں غزل کی
خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے ساتھ ہی ہم کو
مشورہ دیا ہے کہ غزل میں "حب وطن" اور قومی ہمدردی
کے جذبات کو شامل کرنا چاہیے۔ یہ عناصر ہم کو چکبست
کی غزل میں بہ حسن و خوبی ملتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

مٹی میں گل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشن ہندوستاں کے ہیں

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

مجھ کو مل جائے چہکنے کے لیے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

زباں کے زور پہ ہنگامہ آرائی سے کیا حاصل
وطن میں ایک دل ہوتا مگر دردآشنا ہوتا

کچھ ایسا پاس غیرت اٹھ گیا اس عہد پرفن میں
کہ زیور ہو گیا طوق غلامی گردن میں

ہم پوچھتے ہیں باغ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنا پھول سمجھتے ہیں خار کو

ان اشعار میں حب الوطنی کے جذبات کی خوشبو بسی ہوئی
ہے۔ یہ اشعار سپاٹ اور بے رنگ بھی نہیں ہیں۔ بلکہ ان
میں شاعرانہ خوبیاں بھی موجود ہیں۔ اس لیے یہ غزل
کے اشعار معلوم ہوتے ہیں جو ہم کو ادبی مسرت سے ہمکنار
کر دیتے ہیں۔

چکبست کی غزل کا ایک اور نمایاں عنصر منظر نگاری ہے
دراصل منظر نگاری غزل کا موضوع نہیں ہے کیوں کہ اس کا
تعلق خارجی شاعری سے ہے۔ اسی بنا پر اردو شعرا نے
غزل میں مناظر قدرت کے جلوے نہیں پیش کئے ہیں۔
البتہ بعض شعرا کے یہاں ضمنی طور پر کچھ منظریہ اشعار
مل جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہتے ہیں۔

چلتے ہو تو چمن کو چلئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

ناسخ کہتے ہیں

جنوں پسند ہے مجھ کو ہوا ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

مگر اس قسم کے اشعار چکبست نے غزل میں کافی تعداد
میں کہے ہیں ان کے کچھ منظریہ اشعار درج ذیل ہیں

کیا کونپلیں دکھاتی ہیں عالم ابھار کا
آنچل سرک گیا ہے عروس بہار کا

یاں چاندنی ہے نہ اُمید کی جھلک
دریا کی لہر دل ہے کسی بے قرار کا

دامان کوہ اس کیلئے ماں کی گود ہے
لیکن ذرا بھی چین نہیں آبشار کا

اُبھرے ہیں صحن باغ میں پھولوں کے قافلے
نظریں دکھا رہے ہیں عروس بہار کو

چکبست کی غزل حسن و عشق اور فلسفہ اخلاق تک محدود نہیں رہتی ہے بلکہ انھوں نے غزل میں ان خیالات کو بھی داخل کر دیا ہے جن کا تعلق نظم گوئی سے ہے۔۔۔

دراصل غزل کا فن بہت نازک ہے، اس لیے اس میں غیر مانوس خیالات اور اجنبی الفاظ کی گنجائش بہت کم ہے مگر چکبست نے اس قسم کی گنجائش کسی نہ کسی حد تک نکال لی ہے ان کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

دم سے گاندھی کے رہے شور وفا بستی میں
قیس جنگل میں رہے کوہ میں فرہاد رہے

غرور جہل نے ہندوستاں کو لوٹ لیا
بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

گاندھی، ہندوستان اور کشمیر کے الفاظ کسی نے نظم نہیں کئے ہیں اس قسم کے الفاظ کے متعلق خیالات نظموں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مگر چکبست نے الفاظ کو غزل میں جگہ دی ہے۔

چکبست نے اپنے عہد کے واقعات بھی غزلیں نظم کئے ہیں ۱۹۱۷ء میں جب مسز اینی بسنٹ کی نظر بندی کا حکم منسوخ ہوا تو چکبست نے مندرجہ ذیل شعر کہا۔

گردنیں خم ہیں ندامت سے دل آزاروں کی
رہ گئی بات زمانے میں وفاداروں کی

چکبست کی غزل میں اصلیت اور حقیقت کا رنگ جلوہ گر ہے اس کے باوجود کہیں کہیں ہم کو ان کے یہاں جذباتی مغالطہ (pathatic Fallacoy) کا بھی دھندلا نظر آتا ہے لیکن اسمیں شاعرانہ صداقت کی کرن بھی رقص کرتی ہے۔ مثلاً چکبست کہتے ہیں۔

نہیں کھلتی مری آنکھوں میں تاریکی شب غم کی
یہ تارے روشنی اپنی عبث برباد کرتے ہیں

عام طور سے ستارے اپنی چمک سے ہمارے دل کو خوش کرتے ہیں مگر جب کبھی انسان کا دل اُداس ہوتا ہے تو ستاروں کی چمک سے اس کے دل پر چوٹ لگتی ہے چکبست کے اس خیال میں شاعرانہ صداقت کی جلوہ گری ہے یہی نہیں کہ چکبست کی غزل میں سائنسی صداقت (Seicntific Truth) کی دھوپ بھی جلوہ دکھاتی ہے چکبست کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ فرمایئے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

یہ حقیقت ہے کہ جب تک ہمارے جسم میں عناصر کا اعتدال قائم رہتا ہے تب تک ہماری زندگی کا وجود رہتا ہے جب ان عناصر میں کمی بیشی واقع ہو جاتی ہے اسی وقت انسان موت کی آغوش میں سو جاتا ہے۔

طبی نقطہ نظر سے موت کا سبب یہی ہے اردو شاعری
میں سائنسی صداقت کی یہ ایک سین اور کامثال ہے
چکبست نے اکبرآبادی کی طرح محسوس کیا ہے کہ
ہندوستانی کلچر پر انگریزوں کا گہرا اثر پڑ رہا ہے اس
لئے وہ لوگ مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔
اسی بنا پر چکبست نے طنزیہ انداز میں کہا ہے۔

نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

چکبست نے اپنے کافی اشعار میں اپنے دور کی عکاسی
کی ہے اس قسم کا مندرجہ ذیل شعر بھی ہے

ہوا مزاج کا عالم یہ سیر یورپ سے
کہ اپنے ملک کی آب و ہوا کو بھول گئے

اس شعر میں تو بالکل اکبر الہ آبادی کی آواز گونج
رہی ہے۔

چکبست کی غزل میں خود پسندی کی بھی جھلک
نظر آتی ہے۔ ماہرین نفسیات کی اصطلاح میں خود پسندی کو
Vanity کہتے ہیں۔ جب خود پسندی کی سے تمیز
ہو جاتی ہے تو اسی کو تکبر (Conceit) کے نام سے
موسوم کرتے ہیں اور جب یہ جذبہ اور زیادہ شدید
ہو جاتا ہے تو اسی کو جذبہ برتری (Megalomania)
کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چکبست نے ایک غزل
"مذہب شاعرانہ" کے عنوان سے ۱۹۰۵ء میں کہی ہے
اس میں انھوں نے خود پسندی کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً
وہ فرماتے ہیں۔

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا
جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا

کیفیت گلشن ہے مرے نشہ کا عالم
کوئل کی صدا نعرۂ مستانہ ہے میرا
دریا مرا آئینہ ہے لہروں میں ہے گیسو
اور موج نسیم سحری شانہ ہے مرا

خود پسندی کے علاوہ چکبست کے ایک شعر سے جذبہ
محبوبیت (A desire to be loved) کا اظہار ہوتا
ہے جو نرگسیت کی ایک شکل ہے۔ اس شعر میں چکبست
نے خود کو معشوق قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں

عاشق بھی ہوں معشوق بھی یہ طرفہ ہے میرا
دیوانہ ہوں میں جس کا وہ دیوانہ ہے میرا

جب چکبست نے یہ غزل لکھی تھی اس وقت وہ ۲۳ سال
کے تھے یہ خود پسندی کی عمر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ
چکبست کشمیری برہمن تھے۔ اس لئے بہت خوبصورت انسان
تھے ایسی صورت میں وہ خود معشوق قرار دے سکتے ہیں
اس شعر میں چکبست کی شخصیت کا عکس واضح طور پر نظر
آتا ہے۔

چکبست کی شاعری کا اسلوب

چکبست نے اپنی شاعری کے اسلوب کی طرف خود
ہی اشارہ کیا ہے وہ ایک شعر میں فرماتے ہیں نیا ملک
نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں عروس شعر کو ہم قید سے
آزاد کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چکبست کا نیا ملک
اور نیا رنگ سخن کیا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کیلئے ہم کو
لکھنؤ کی شاعری پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ میں

ایک طرف تو مرثیہ گوئی نے ترقی کی اور انیس و دبیر نے
اس فن کو بام عروج تک پہونچا دیا دوسری طرف ناسخ
اور آتش نے غزل کے فن کو سنجیدگی اور بلندی عطا کی
مگر ناسخ کی شاعری میں تصنع اور تکلف زیادہ ہے
ان کے بہت کم ایسے اشعار ہیں جو دل میں چبھتے ہیں لیکن
آتش کے اشعار اپنی بانکپن اپنی تڑپ اور اپنی کسک
کی وجہ سے ہمارے دل پر بجلی گراتے ہیں

ناسخ اور آتش کے بعد ان کے شاگردوں نے،
اُردو شاعری کو کوئی خاص ترقی نہیں دی بلکہ امانت
نے تو اُردو شاعری کے درجے کو بہت پست کر دیا۔
مثلاً وہ فرماتے ہیں۔

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

اس کے بعد لکھنؤ میں امیر مینائی (۱۸۲۸ء ۔ ۱۹۰۰ء)
کی شاعری کا آغاز ہوا۔ ان کی شاعری کا رنگ عشقیہ
ہے مگر اس میں بھی کسی نہ کسی حد تک پستی موجود ہے۔
ان کے مندرجہ ذیل دو اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ہائے وہ دیکھ کے ابھرا ہوا جوبن ان کا
دونوں ہاتھوں سے مرا تھپ کو دبانا دل کا

جا ہی چکا تھا گھر میں دیوار پھاند کر
دربان یار جاگ اٹھا سو گیا نصیب

اگرچہ امیر مینائی کے یہاں کچھ اشعار تصوف کے
بھی ہیں جو بہت پاکیزہ ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان
کے یہاں رکیک اشعار بھی جابجا نظر آتے ہیں امیر مینائی
کے بعد لکھنؤ میں ایک نئے رنگ کی بنیاد پڑتی ہے جس
کے بانی یقیناً چکبست ہیں

اگرچہ چکبست کے عہد میں نظم گوئی کی بنیاد پڑ چکی
تھی کیونکہ ان سے قبل مولوی محمد حسین آزاد، حالی،
اسمٰعیل میرٹھی اور سرور جہاں آبادی وغیرہ نظم گوئی کے
نمونے پیش کر چکے تھے مگر چکبست کے عہد میں لکھنؤ میں
نظم گوئی کا رواج نہ تھا البتہ ان کے عہد میں احمد علی شوق
قدوائی (۱۸۵۲ء ۔ ۱۹۲۵ء) نے نظم نگاری کی طرف توجہ
کی تھی جن کی ولادت لکھنؤ کے مضافات میں قصبہ جگور
میں ہوئی تھی۔ مگر وہ زیادہ تر ملازمت کے سلسلہ میں
لکھنؤ سے باہر رہے اس لیے لکھنؤ میں صرف چکبست ہی
ہی تھے جو اپنے دور میں نظم کہتے تھے اسی بنا پر ہم کہہ سکتے
ہیں کہ انھوں نے ایک نیا اسلوب کم از کم لکھنؤ میں ایجاد کیا

چکبست کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے
کہ انھوں نے حب الوطنی کو اپنا خاص موضوع بنایا۔
حب الوطنی پر حالی، اکبر نے بھی نظمیں کہی ہیں یہی نہیں
بلکہ انھوں نے اپنی غزلوں میں حب الوطنی کے عناصر داخل
کیے ہیں۔

جہاں تک چکبست کی غزل کے اسلوب کا تعلق ہے وہ
آتش سے متاثر ہوئے ہیں وہ آتش ہی کی طرح شاعری
کو مرصع سازی سمجھتے ہیں اور انھیں کی طرح غزل کے
الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑتے ہیں مگر نظم میں چکبست نے
میر انیس کی تقلید کی ہے۔ میر انیس نے اپنے مرثیے مسدس
کی شکل میں کہے ہیں انیس کی یہ ہیئت اس قدر مقبول
ہوئی کہ چکبست اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ
انھوں نے اپنی بہت سی نظمیں مسدس کی شکل میں کہی ہیں

یہی نہیں بلکہ وہ میر انیس کی طرح خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کو قوت گفتار عطا کرے ایک مرثیہ میں میر انیس فرماتے ہیں۔

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر
اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر

تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلم رو سے نہ جائے

غواص طبیعت کو عطا کر وہ لآلی
ہو جن کی جگہ تاج سر عرش پہ خالی

ایک ایک بڑی نظم ثریا سے ہو عالی
عالم کی نظر ہو لئے گوہر قطب شمالی

سب ہوں در یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
منہ بات کی یہ ہوں کہ جنھیں رغبت ہے نبی سے

چکبست نے بھی اس انداز میں خدا سے دعا کی ہے کہ ان کو وہ شاعرانہ قوت بخشے۔ لطف یہ ہے کہ انھوں نے بحر بھی میر انیس ہی کی اختیار کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

ہاں نور زبان جلوہ گفتار دکھا دے
ہاں صبح زبان مطلع انوار دکھا دے

ہاں طبع رواں قلزم فرخار دکھا دے
ہاں رنگ سخن گلشن بے خار دکھا دے

گلزار معانی کا مہکتا نظر آئے
طوطی چمنستان کا چہکتا نظر آئے

وہ حسن بیاں میں چمنستاں کا تخیل
ہر نکتہ رنگیں نظر آئے صفت گل

ہر معنی پیچیدہ ہے طرۂ سنبل
عاشق ہوں سخن پر جو بلبل ...

جو مصرعہ ہو طوبیٰ کا وہ ثانی نظر آئے
کوثر کی طبیعت میں روانی نظر آئے

چکبست کے ان اشعار کی روانی اور سلاست میر انیس کی یاد دلاتی ہے۔ چکبست کے یہاں بہت سے مصرعے اتنے صاف اور ستھرے ہیں کہ میر انیس سے ٹکر لیتے ہیں چکبست کے مندرجہ ذیل مصرعے ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے
۲۔ ان کی تلوار کے سائے میں قضا چلتی ہے
۳۔ آنچ تلوار کی جنت ہے سپاہی کے لئے
۴۔ آج جمنا کے کنارے سے گھٹا اٹھتی ہے

ان مصرعوں میں نہ کہیں جھول ہے نہ کوئی لفظ بھرتی کا ہے۔ نہ کہیں کھانچا نظر آتا ہے نہ کہیں خلا دکھائی دیتا ہے۔ ان مصرعوں میں سلاست اور روانی بدرجہ اتم موجود ہے یہ سارے مصرعے سرو و صنوبر کے سائے میں گنگناتے ہوئے چشمے معلوم ہوتے ہیں۔

چکبست اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں وہ اپنی زندگی ہی میں مقبولیت حاصل کر چکے تھے اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی اس لئے ان کے اشعار عوام کی ذہنی سطح سے قریب ہیں یہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنے خیالات کو اس شستہ اور شگفتہ زبان میں ادا کیا جس سے لکھنؤ کے عوام اور اردو داں طبقہ مانوس تھا اس لئے ان کے اشعار لوگوں کے دلوں میں اتر گئے

یہ درست ہے کہ یہاں ٹیگور کی روحانیت نہیں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کا فلسفہ بھی وہاں نظر نہیں آتا ہے

(بقیہ مضمون صفحہ ۔۔ پر دیکھئے)

ذوق ہے مشرقی — ذہن ہے فلسفی
بات میں منطقی — جہد [illegible]
فکر معراج کی — [illegible]

نازِ اردو زباں — فخرِ ہندوستاں
اپنا چکبست ہے — اپنا چکبست ہے

●

برہمن کی قبا — شیخ کا اتقا
جسم ہے بتکدہ — قلب ہے حق نما
امتزاجی ادا — اتحادی نشاں

نازِ اردو زباں — فخرِ ہندوستاں
اپنا چکبست ہے — اپنا چکبست ہے

●

محوِ خوابِ گراں — قوم تھی بے گماں
ایسا بدلا سماں — جاگ اٹھا گلستاں
رو دیا باغباں — دیش کا مہرباں

نازِ اردو زباں — فخرِ ہندوستاں
اپنا چکبست ہے — اپنا چکبست ہے

●

جسم ٹھہرا کہیں — مدتوں ہم نشیں
روح کو بالیقیں — موت آئی نہیں
آفریں، آفریں — زندۂ جاوداں

نازِ اردو زباں — فخرِ ہندوستاں
اپنا چکبست ہے — اپنا چکبست ہے

ڈاکٹر انوار الحسن
صدر شعبۂ علوم شرقیہ (اردو و فارسی)
[illegible]

چکبست اور قومی یک جہتی

اردو شاعری کا آغاز تو فارسی شاعری کے زیر سایہ ہوا اور ایک طویل مدت تک فارسی شاعری کے اثرات، اردو شاعری کے لب و لہجہ، اسلوب بیان، مواد اور موضوع پر نمایاں رہے۔ رفتہ رفتہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو شاعروں کے خیالات بھی بدلتے رہے۔ محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کی کوششوں سے اردو شاعری میں جدید رجحانات پیدا ہوئے۔ یہ جدید رجحانات اردو شاعری کو وقت اور زمانے سے ہم آہنگ کرنے کے لئے ضروری تھے۔ انگریزی حکومت کے ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد آزادی کا آغاز ہوا۔ ملک میں ایک طرف قومی تحریکوں کا زور تھا دوسری طرف سماجی اصلاح کی کوششیں، انگریزی [illegible] [illegible] کے بدلتے ہوئے، [illegible] ان کے اثرات — غرض کہ انقلاب کی رنگا رنگی کے دور میں چکبست نے مشق شروع کی۔

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے اور تعلیم و تربیت لکھنؤ میں پائی۔ لکھنؤ ان دنوں ایک بڑا اور اہم ادبی گہوارہ تھا جہاں انیس و دبیر کے فن کے اثرات نمایاں تھے۔ چکبست کشمیری پنڈتوں کے ایک ممتاز گھرانے کے فرد تھے۔ رواج زمانہ کے مطابق فارسی اردو کی تعلیم پانے کے بعد بی۔ اے، ایل ایل بی کرکے وکالت کے معزز پیشہ میں داخل ہوئے۔ اس پیشہ میں ان کی حق پسندی، حق گوئی، جرأت اور بے باکی کو چار چاند لگ گئے۔

چکبست کے زمانے میں ہندوستان کی جدوجہد [illegible] زور پکڑ رہی تھی، انگریزی سرکار بھی کھلونے دے کر آزادی کے متوالوں کو بہلانے

جذبہ میں ایسا خلوص تھا کہ وہ ہر شے کو اسی رنگ میں دیکھتے تھے۔ "انڈین نیشنل کانگریس" کی سرگرمیوں سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ انھوں نے کانگریس کی ہر قومی تحریک پر صدائے لبیک کہی، ہر تعمیری مہم میں پیش پیش رہے اور اگر انھیں کہیں بھی قومی رہنماؤں کے باہمی اختلافات نظر آئے تو انھوں نے پوری صاف گوئی کے ساتھ اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ [illegible] میں جب کانگریس کے کچھ پرانے رہنما اس قومی جماعت سے مجبوراً علیحدہ ہو گئے تھے۔ تو اس دردمند شاعر کا دل اس اہم مسئلہ سے متاثر ہو کر "نالۂ درد" لکھنے پر مجبور ہو گیا"

جن کو جان سے زیادہ ہے بھولے رنگ عزیز
قوم کے بیڑے کے ایسے ناخدا ہونے کو ہیں

یادگار دور آخر ہیں جو کچھ حرماں نصیب
وہ اسیرِ گردشِ جسم و وفا ہونے کو ہیں

جو عطائے حسن سے صورت نمائے قوم تھے
دل کے آئینوں سے وہ جوہر فنا ہونے کو ہیں

کچھ عجب رنگ چمن بدلا ہوا ہے آج کل
غنچہ و گل صورتِ شبنم ہوا ہونے کو ہے

گر یہی گردش دوراں کا رنگ انقلاب
ہوش اڑ جائیں گے وہ فتنے بپا ہونے کو ہیں

جرأت اخلاق تیرے امتحاں کا وقت ہے
خود عزیزان وطن ہم سے خفا ہونے کو ہیں

نادر ناشاد روتی ہے، کوئی سنتا نہیں
[illegible] ہونے کو ہیں

[illegible] بچوں کے لیے بھی وطن کی محبت کے، ترانے لکھے۔ "ہمارا وطن دل سے پیارا" ہو یا "[illegible]" "وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک" اُن کی قومی شاعری کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ وہ قوم کی لڑکیوں سے بھی مخاطب کرتے ہیں تو انھیں بھی وطن کی محبت کا درس دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز

نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے
راگ ایسا کوئی ان کو نہ سکھانا ہرگز

کشمیری پنڈتوں کے فرقہ میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی آگرہ میں ہوئی تھی تو چکبست اس سماجی اصلاح کے اقدام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اپنی نظم "برق اصلاح" میں جرأت اصلاح دکھانے والوں کو مرحبا کہتے ہیں وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے لیکن وقت اور زمانے کی رفتار کے برعکس چلنے کو تیار نہ تھے۔ وہ ہر ایسی روایت سے بغاوت کر سکتے تھے جو ضعف اخلاق کی مظہر ہو وہ زخم کو پالنے اور اسے ناسور بنانے کے بجائے اس پر عمل جراحی کے منکر نہ تھے۔ وہ انسان کی آزادی، برتری اور شجاعت کو جنت اور دین سبھی پر ترجیح دیتے تھے۔ اُن کی آتش بیانی کبھی نہ تو نکتہ چینی تھی اور نہ دوسروں کی دل آزاری بلکہ صرف اپنی سوئی ہوئی قوم کو خواب سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔

وطن پرستی، آزادی، اور [illegible] یک جہتی کی تبلیغ چکبست کی زندگی کا مشن اور ان کی شاعری کا:

نظم ہو یا غزل انھوں نے اپنے پیغام کو ہر ذریعہ سے
نشر کیا۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق مرحوم ان کی نظر غزلوں
میں بھی سماجی اور سیاسی مسائل کی طرف پڑتی ہے۔
لیکن انھوں نے آداب غزل کو ترک نہیں کیا۔ چند نمونے
ملاحظہ ہوں:

جنوں حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

حکم مالی کا یہ ہے پھول نہ ہنسنے پائیں
چپ رہے باغ میں کوئل اگر آزاد رہے

زباں کو بند کریں مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرز جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

دل میں اس طرح ہے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

کچھ ایسا پاس غیرت اٹھ گیا اس عہد پرفن میں
کہ زیور ہو گیا طوق غلامی اپنی گردن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامن مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

رہتی ہیں امنگیں کہیں زنجیر کی پابند
ہم قید ہیں زنداں میں بیاباں ہیں نظر میں

مجھ سے روشن ان دنوں دیر و حرم کا نام ہے
پائے بت پر ہے جبیں لب پر خدا کا نام ہے

شاد ہیں ناشاد ہیں یا خانماں برباد ہیں
ہم سے اچھے ہیں کہ یہ وحشی وطیور آزاد ہیں

بہ سلسلہ مضمون صفحہ ۷۲

اسی لیے ان کے کلام میں ٹیگور اور اقبال کی بلندی نہیں
پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں خلوص
اور صداقت کے وہ عناصر ملتے ہیں جو اردو شاعری میں
عام نہیں ہیں ان کی شاعری ان کے دل کی آواز ہے۔ ہم
ان کے ہر شعر میں ان کے دل کی دھڑکن سن سکتے ہیں
یہ خلوص اور صداقت شاعری کی جان ہوتی ہے۔ اس
لحاظ سے چکبست کی شاعری بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔

سعادت علی صدیقی صدر شعبۂ اُردو
(ڈگری کالج سنبھل)

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد کا ہندوستان غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم جبر و استبداد کا بری طرح شکار تھا۔ جنگ آزادی کے مجاہدین اور شمع حریت کے پروانوں کا جینا دوبھر ہو رہا تھا لیکن اس ظلم اور بربریت کے باوجود دلوں میں آزادی کی لگن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی ایک طرف آزادی کے لئے سر و تن کی بازی لگائی جا رہی تو دوسری طرف شعر و ادب کی محفلیں بھی شباب پر تھیں دہلی اُجڑ چکی تھی لکھنؤ علم و فن کا گہوارہ بن رہا تھا اگرچہ یہاں کے مزاج پر عیش و عشرت کا راج تھا اور یہاں کی شاعری اس سے بہت متاثر تھی مگر جیسے جیسے قوم میں غلامی کی ذلت کا احساس بیدار ہوتا گیا شعراء بھی اس سے متاثر ہوتے گئے اور نئی شاعری کی داغ بیل پڑی جدید ادبیت کی تحریک کو پروان چڑھانے اور ی علم دیا اور حلقہ کمال میں مقبول بنانے میں آزاد حالی بر اور اقبال کا بڑا ہاتھ ہے وہ یہ زمانہ تھا جب — ہوئے حالات کے زیر اثر لکھنؤ ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔ نیا ادب نئے تجربات اور نئی قدریں اپنا رنگ جما رہی تھی۔ اور قدامت پسندی و وضع داری قدیم اقدار کو سرمائے عزیز کی طرح سینے سے لگائے ہوئے تھی پرانا رنگ اُتر رہا تھا اور نیا ابھر کر دل و دماغ میں اپنی جگہ بنا رہا تھا ایسے ہی ماحول میں پنڈت برج نرائن چکبست نے آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے اور اردو ادب میں اپنی مخصوص جگہ بنائی وہ اودھ کے مشہور شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے مگر بچپن میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں اُن کے شعور اور دماغی اہلیت کی ترتیب ہوئی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور بہت جلد ان کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکلاء میں کیا جانے لگا۔

چکبست کی فکر رسا اور دماغ روشن تھا قدرت نے انھیں حساس طبیعت اور سوز و گداز عطا کیا تھا۔ شاعری کا ملکہ خداداد تھا وہ نو سال کی عمر میں ہی شعر

کہنے لگے تھے ۲۵ سال کی عمر میں وہ اپنے ہم عصروں میں
ایک ممتاز اور منفرد شاعری کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے
وہ حقیقی معنوں میں تلمیذ الرحمٰن تھے تا حیات نہ تو کسی کی،
شاگردی اختیار کی اور نہ ہی کوئی تخلص رکھا فرماتے
ہیں۔

ذکر کیوں آئے گا بزم شعرا میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار نہیں

ایک جگہ اور فرماتے ہیں۔

میں باضابطہ شاعر نہیں ہوں تخلص کا بھی گنہگار
نہیں چکبست میرا عرف ہے نہ کہ تخلص سولہ سترہ برس
سے شعر و سخن کا مذاق ضرور ہے لیکن ایک دیوان بھی تیار
نہیں ہو دوستوں کا دل بہلانے کو کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہوں
پرانے رنگ کی شاعری یعنی غزل گوئی سے نا آشنا ہو لیکن
اسی کے ساتھ میرا عقیدہ یہ ہے کہ نئے خیالات کو توڑ موڑ
کر نظم کر دینا شاعری نہیں ہے میرے خیال میں خیالات
کی تازگی کے ساتھ زبان میں شاعرانہ لطافت اور...
الفاظ میں تاثیر کا ہونا ضروری ہے چکبست نے جب
شاعری کی ابتدا کی تو لکھنوی رنگ غالب تھا لیکن مغربی
ادب سے آگاہی اساتذہ کے کلام کا مطالعہ اور وطنی
رجحانات کے مشاہدے سے حقیقت آمیز شاعری کی
طرف مائل ہوئے اور ان کی غزل گوئی پر قومی ملکی سیاسی
سماجی اخلاقی شاعری پر اپنا اثر کرتی گئی اُن کی شاعری
بصیرت اور شاعرانہ صلاحیت نے اُنھیں مشکل پسندی
اور دقیانوسیت کی طرف راغب نہیں ہونے دیا غزلیں
ہوں یا نظمیں حب وطن کے نغمے ہوں یا اخلاقی و اصلاحی
باتیں سب میں شاعرانہ حسن پوری رعنائی و زیبائی
ساتھ موجود ہے چکبست کی غزلیں گل و بلبل کے پائمال قصے
وصل و فراق کی وارداتوں زلف و رخسار کی باتوں او
محبوب کی بے محابا تعریف و توصیف سے پاک ہیں ان
سنجیدگی ہے متانت ہے زبان و بیان کی پاکیزگی ہے۔
اخلاقی نکات ہیں قومی جذبات ہیں اور یہی ان کی شاعری
کی انفرادیت ہے چند اشعار دیکھئے۔

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اُتر جانا

عروس جاں نیا پیراہن ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا

جس کی قفس میں آنکھ کھولی ہو میری طرح
اس لیے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

دردِ دل پاس وفا جذبۂ ایمان ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

چکبست صرف شاعر ہی نہیں بلند پایہ ادیب اور تجربہ کار
صحافی تھے فارسی اور اردو دونوں میں زبانوں پر انھیں
قدرت کاملہ حاصل تھی وہ اساتذہ کے کلام سے بھی گہری
واقفیت رکھتے تھے اور اردو زبان کے جدید تقاضوں کے
نبض شناس بھی تھے شعر و شاعری کے بارے میں ان کا
نظریہ بہت وسیع تھا مثنوی گلزار نسیم کے دیباچہ میں انھوں
نے لکھا ہے۔

محض عبارت کا نظم کرنا شاعری نہیں ہے شاعری کی
عام تعریف یہ ہے کہ نثر سے زیادہ دلکش اور پر تاثیر ہو،
نثر کا انداز یہ ہے کہ جو مضمون بیان کیا جائے وہ نہایت

فصاحت کے ساتھ بیان کیا جائے اور الفاظ کی بندش
ایسی ہو کہ ان کے خاص معنی خاص طور سے پیدا ہوں بر
خلاف اس کے شاعری میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ
جو عنوان باندھا جائے اختصار کے ساتھ باندھا جائے
اور محض ایک حالت کا اشارہ کرے ترکیب الفاظ ایسی
ہو کہ اس حالت کی نسبت مختلف نقشے پڑھنے والوں کی
آنکھ کے سامنے گذر جائیں۔

اس اقتباس سے چکبست کے اسلوب بیان اور
انداز نگارش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے
کہ ادب پر ان کی نظر کتنی گہری تھی نیز وہ کس خوبی کیساتھ
اپنے خیالات کا اظہار نثر میں کر سکتے تھے انھوں نے مختلف
عنوانات پر مضامین بھی لکھے ہیں جن میں سوانح حیات
علمی و ادبی مباحث اور اصلاحی مضامین بھی شامل ہیں
مباحثہ گلزار نسیم ان کی علمیت کی بہترین مثال ہے انکے
مضامین کا مجموعہ مضامین چکبست کے نام سے شائع
ہو کر ادبی و علمی حلقوں کی زینت بن چکا ہے چکبست کا
عہد ملک کی تاریخ کا انقلاب آفریں عہد ہے ان کے
زمانے میں آزادی کی تحریک شباب پر پہونچ چکی تھی۔
وطن کا ہر سپوت وطن پر جاں نثار کرنے کی قسم کھا چکا
تھا سارا ملک آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں تن
من دھن کی بازی لگا رہا تھا شعرا بھی اپنے فرض سے
غافل نہ تھے آزادی وطن کیلئے ان کے نغمے حریت و
آزادی کی آنچ کو تیز تر کر رہے تھے۔ کشمیر سے راس کماری
تک فضا میں ایک ہی ترانہ گونج رہا تھا آزادی وطن کا
ترانہ، چکبست بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے وطن کی
محبت کا جذبہ اور جوش ان کی شاعری کا محرک بنا اور
انھوں نے آزادی وطن کیلئے حب قومی کا صور پھونکنا
شروع کیا

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

چکبست کو اپنی قوم کے اعلیٰ جذبات بیدار کرنے کا سلیقہ
آتا تھا وہ یہ بھی جانتے تھے اسے اپنی ذلت و پستی کا احساس
کس طرح دلایا جائے۔ وہ اپنی قوم کو سر بلند دیکھنا چاہتے
تھے اور اس کو اس کا صحیح مقام دلانا چاہتے تھے اسی لئے
انھوں نے قوم کے نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا
تھا۔

ہاں جوانان وطن خواب سے بیدار ہو اب
سو چکے رات بھی آخر ہوئی ہشیار ہو اب
سحر نور وفا کے لیے تیار ہو اب!
درد دل کچھ مجھے کہنا ہے خبردار ہو اب
بے خودی دل کی ہے تصویر بیاں میری ہے
مرثیہ قوم کا ہے اور زباں میری ہے

وطن کی محبت چکبست کی رگ رگ میں رچی بسی تھی ان کو
وطن کے ہر ذرے سے بے پناہ پیار تھا وہ خاک ہند کی
عظمت کے گیت گایا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد کفن کے لئے
خاک وطن نصیب ہو۔

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے

تیری جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عزوشاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

ہے جوئے شیر ہم کو نور سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا

ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا
تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

چکبست نے سماجی نظمیں بھی لکھی ہیں اور مذہبی بھی ان کی نظموں میں ہر جگہ ان کا خلوص نمایاں ہے محبت کا جذبہ کہیں قومی رنگ اختیار کئے ہوئے ہے کہیں مذہبی کہیں سیاسی کہیں اصلاحی قدیم روایات و رسمیات کا ذکر بھی موجود ہے نئی نئی تشبیہیں نئے نئے استعارے قدرتی مناظر کی تصویر کشی اور خیالات کی پاکیزگی سے ان نظموں کا رنگ نکھر آیا ہے ان نظموں میں تاثیر بھی ہے جذبات کی فراوانی بھی دل کشی بھی ہے تازگی بھی حب وطن کا جوش بھی ہے مادر وطن کی محبت کی سرشاری بھی ایک مبلغ کا انداز بھی ہے اور ایک مصلح کے انقلاب آفریں خیالات چکبست نے صنف نازک کے مسائل کی طرف بھی توجہ کی ہے اور اس موضوع پر خاص طور سے نظمیں لکھی ہیں وہ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کا مطلب مغرب پرستی بے حیائی اور بے حجابی نہیں سمجھتے تھے وہ مغرب کی اندھا دھند تقلید کے سخت مخالف تھے مشرقی حیا کا شدید احساس تھا عورتوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز

رخ سے پردے کو ہٹایا تو بہت خوب کیا
پردہ قوم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز

چکبست کی مذہبی نظموں میں رامائن کا ایک سین ایک شاہکار نظم ہے اگرچہ نظم مکمل ہو جاتی تو اردو شاعری میں اپنی نوعیت کی ممتاز اور تاریخی چیز ہوتی یہ نظم انتہائی موثر ہے اور شاعر نے شعر کے پیکر میں دل نکال کر رکھ دیا ہے عقیدت و احترام محبت اور ادب اس نظم کے ہر ہر لفظ سے نمایاں ہے رام چندر جی بن باس کیلئے رخصت ہونے کو اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں غم و الم سے،

نڈھال ماں نے ان کی طرف دیکھا اور
رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں

سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منھ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھ کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

ماں کی حالت زار دیکھ کر رام چندر جی کا دل بھی بھر آیا لیکن انھوں نے صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اس لیے

کہ ان کی جدائی کا صدمہ کہیں ماں کیلئے جان لیوا نہ ہو جائے
انھوں نے بہت ہی ادب کے ساتھ ماں سے کہا۔

پھر عرض کی یہ مادر ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور

صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور

شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

دردو اثر سوز و گداز اور رنج میں ڈوبی ہوئی اس نظم کے آخر میں چکبست کہتے ہیں۔

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں
گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں

ہر آنکھ کو نصیب یہ اشک وفا کہاں
ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقد جاں

چکبست کا مجموعہ کلام صبح وطن کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے شاعری میں سلاست زبان، بندش الفاظ، حسن ترکیب اور اظہار خیال میں آتش، ناسخ غالب اور حالی سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے خیالات میں پیچیدگی اور الجھاؤ نہیں ہے عام فہم الفاظ اور سیدھے سادے انداز میں بات کہنا چکبست کی خوبی ہے سلاست روانی، پختگی اور اثر ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی شاعری نے نوجوانوں کے دل میں حب وطن کا جوش پیدا کیا ہے۔ اور ان میں قومی جذبات بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

دل کیسے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

قوم کا غم مول لے کے دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

جو مانگنا ہو ابھی مانگ لو وطن کے لئے
یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

سرتیج بہادر سپرو نے چکبست کے بارے میں لکھا ہے۔

"چکبست کے کلام میں زیادہ رنگینی اور درد ہے اور انسانی جذبات و محسوسات پر اس کا اثر بہ نسبت انسانی دماغ کے زیادہ پڑتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ چکبست نے لکھنؤ کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی اور ان پر ان اساتذہ کے کلام کا زیادہ اثر ہے جو لکھنؤ کی ناموری کا باعث ہوئے۔"

اور ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے چکبست کو ان الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔

"وہ قادر الکلام شاعر ہے۔ زور بیان اور فصاحت زبان کے ساتھ خلوص اور درد بھی ہے وہ ملک کی بے بسی اور رحمت حالی کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے اور اس حال میں جو کہتا ہے اس کا ہر کلمہ اثر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ آزادی کا دلدادہ ہے۔ مگر بے لگامی کا روادار نہیں۔ وہ سچا لبرل ہے اور اس راستے پر چلنے والا ہے۔ جو بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے بتر ہے جس کا دوسرا نام اعتدال ہے۔ اس نے اپنے کلام سے اردو زبان کا رتبہ

بڑھا دیا اور اس کے ساتھ ہی اردو ادب میں اپنی جگہ قائم کر دی۔ بلاشبہ اس کا شمار ہمارے اساتذہ میں ہے۔ چکبست نے کہا تھا:-

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگ شباب
لب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

اور یہ شعر اس طرح صادق آیا کہ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو وہ ایک مقدمے کے سلسلے میں رائے بریلی گئے۔ دن بھر مقدمہ کا کام نپٹانے کے بعد شام کو لکھنؤ واپس ہونے کیلئے ریل کے ڈبے میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ دماغ پر فالج کا حملہ ہوا رفیقوں کے دل دھڑک اٹھے۔ ویٹنگ روم میں لاکر لٹایا گیا۔ ڈاکٹر آئے اور اپنی سی کر گزرے لیکن قضاو قدر کے ہاتھ شمع حیات گل کرنے کو آگے بڑھ چکے تھے سات بجے شام کو اردو کا یہ مشہور و ممتاز شاعر اور ادیب اور لکھنؤ کا نامور وکیل اور چکبست گھرانے کا قابل فخر فرد لکھنؤ کی ادبی محفلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سونا کر گیا۔ ہر دل سوگوار اور ہر آنکھ اشک بار ہوگئی

شمع بزم شعر برج نرائن چکبست
بے وفا عمر نے تم سے نہ وفا کی افسوس

داغ فرقت سے تمہارے ادب اردو پر
دہر سفاک نے اک تازہ جفا کی افسوس

ہائے بے تابی دل اور وہ بے تابی دل
جب زباں بند ہوا اک نقطہ سرا کی افسوس

نجم الحسن انجم ادیب ایم اے

چکبست کی قومی شاعری کا تجزیہ

چکبست جس دور میں پیدا ہوئے اور جس فضا میں پلے اس کا سیاسی تصور آج سے بالکل مختلف تھا، ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد ہندوستانیوں کو اپنی غلامی کا شدت سے احساس ہوگیا تھا۔ کانگریس اصلاح پسندوں کی، جماعت تھی۔ ہر ہندوستانی میں برطانوی حکومت سے ٹکر لینے کا خیال پیدا ہو رہا تھا۔ ہندوستانی انتظامی معاملات میں اپنی آواز چاہتے تھے اونچے عہدوں پر تقرر کے خواہاں تھے اور مختلف شعبوں میں نوکری کے داخلے کی مانگ کر رہے تھے۔ چکبست ہندوستانیوں کے ترجمان تھے۔ وطن پرستی قومیت معاشرتی اصلاح آزادی خیال ہی ان کی شاعری کا پیغام تھا اور آپ نے اسی پیغام کو اپنی اثر انگیز زبان میں پیش کیا ہے۔

چکبست اور اقبال سے تقریباً سات سال بعد فیض آباد میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم خاندانی رواج کے مطابق گھر پر ہوئی فارسی زبان سے زیادہ شغف تھا۔ مختلف شعراء کے کلام کا مطالعہ ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ۹ سال کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کیا تھا ۱۹۰۵ء میں بی، اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان میں پاس کیا اور وکالت شروع کی۔

ابتدائی غزل لکھی اور بعد میں انیس اور حالی کی پیروی میں "مسدس" لکھے اور مرثیہ نگاری بھی کی "مسدس" میں حالی سے زیادہ انیس کا رنگ غالب ہے۔ بحروں کا انتخاب اور روانی انیس کے مسدس سے ملتا جلتا ہے "رامائن کا ایک سین" ان کی ایک نظم ہے جس میں مرقع نگاری اور تاثیر کا اعجاز ہے۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام

اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی
دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

چکبست کو منظر نگاری میں بھی کمال حاصل تھا اور اسکی کامیاب مثال یہ شعر ہیں۔

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کو وہ پہ لانے بہکنا
دستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیم سحری کا

چکبست نے کہیں کہیں اپنی نظموں میں ہندو روایات کی صحیح عکاسی کی ہے اور "تلمیحات" کو جگہ بھی دی ہے۔ ہندوں کے مخصوص تیوہاروں پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں "صبح وطن" میں ہندوستانی روایات اور خیالات کی بہت سی جھلکیاں مل جاتی ہیں جیسے نل دمینتی۔ چتا، سفرشان۔ ہونی اور حدر، سرمد اور گوتم بندرابن اور متھرا وغیرہ ان کے مطالعہ سے اس ملک کی یاد ہمیں اور اس کی روایاتی تہذیب کی یادوں کے نشانے تو ہونکن نہیں انتہا پہنچے ہیں نظم "کرشن کنھیا" میں لکھنوی شاعری اور تخیل کا بڑا دلکش امتزاج پیش کیا ہے

چھا گیا ابر برسنے کو ہیں مہینہ کے جھالے
آپ ہی آپ ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
آنکھ کہتی ہے؟ یہ بادل نہیں کالے کالے
بال کھولے ہوئے ہیں سانولی صورت والے
دشتیٔ فکر بہی جاتی ہے جمنا کی طرف
دل مرا کھینچ رہا ہے مجھے متھرا کی طرف
راہ تاریک ہے اور سر پہ گرج بادل کی
دو ٹکڑا مہینہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی
شوخ و طرار کی حسین چھوکریاں گوکل کی
چلی آتی ہیں صراحی لئے جمنا جل کی
دل لڑکپن کی امنگوں پہ مچل جاتا ہے
مسکرا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

اب چکبست کی قومی شاعری سے متعلق کچھ روشنی ڈالیں گا وہ حالی، اکبر، شبلی وغیرہ کی طرح ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے وہ "ہند" کو مادر وطن سمجھتے تھے اُنکی شاعری میں قومیت اور وطنیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اقبال کی قومی اور وطنی شاعری سے بڑے متاثر تھے چکبست نے وطن سے الفت رکھنے والوں اور ہم وطنوں کے جذبات ابھارنے کیلئے اچھی اچھی نظمیں لکھیں اُن کی نظموں میں سوز گداز حریت اور وطن کی محبت کے مضامین بڑے ہی حسین انداز میں پیش کئے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اُن کی ملاقات دادا بھائی نوروجی گوپال کرشن گوکھلے وغیرہ سے ہوئی۔ اس وقت قومی تحریک عام ہو چکی تھی وہ اس تحریک سے متاثر ہوئے اور اپنے وطن سے متعلق نظم "خاک ہند" لکھی جو اپنی نظیر آپ ہے اس میں آپ نے "مشاہیر ہند کے کارناموں کو یوں بیان کیا ہے۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو

اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا ہو سے اپنے آتا نے اس چمن کو

سب سود رہیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں انکی ہڈیاں ہیں

چکبست کو اپنے ہم وطنوں اور وطن سے جس قسم کی محبت وعقیدت تھی وہ ان کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے چکبست نے قوم کی ہر مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھی اور قوم کی خوشی کو اپنی خوشی۔ وہ خود اپنے زمانے کی آواز تھے جب "ہوم رول" کا مطالبہ عام تھا اور عوام اس مطالبہ کو شدت سے دہرا رہے تھے۔ لیکن حکومت ایسے عوام کو مجرم ٹھہراتی اور "ہوم رول" کا مطالبہ کرنے والوں کو قید کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں جب اینی بیسنٹ "ہوم رول" تحریک میں گرفتار ہوئیں تو چکبست نے کہا۔

تو نے جو پودا لگایا تھا وہ پھل لایا ہے
آبرو قوم نے پائی ہے وہ دن آیا ہے
ہم نے بھولے ہوئے ورثہ کا نشان پایا ہے
مرنے والوں کی وفا کا یہی سرمایا ہے

دل تڑپتا ہے کہ سوراج کا پیغام ملے
کل ملے آج ملے صبح ملے شام ملے

حکم حاکم ہے کہ فریاد زنی رک جائے
دل کی بستی میں گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے
پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشہ نہیں یہ قوم نے کروٹ لی ہے

اور اس کے بعد "ہوم رول" کی سعید نوید یوں سرفراز ہیں ؎

جو دل سے قوم کے نکلی ہے وہ دعا ہے یہی
تھا جس پہ ناز مسیحا کا وہ صدا ہے یہی
دلوں کو مست جو کرتی تھی وہ ادا ہے یہی
غریب ہند کے آزاد کی دوا ہے یہی

نہ چین آئے گا بے "ہوم رول" پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لو لگائے ہوئے

یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خون کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جلا نہیں سکتا

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

"ہوم رول" اندرونی آزادی کے ساتھ ساتھ برطانوی اقتدار کو بھی تسلیم کرتا تھا اور ہر حساس ہندوستانی برطانیہ کی برابری کا دعویدار بن گیا تھا اس سے متاثر ہو کر چکبست کہتے ہیں ؎

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہونگے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

اپنے ہم وطنوں میں قومیت کے احساس کی کمی اور حب الوطنی کا فقدان پاکر چکبست ناامید اور مایوس نہیں ہوئے اور اپنا پیغام آخری وقت تک دہراتے رہے

اے نور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

پھر وہ طبیعتوں کی افسردگی مٹادے
اٹھتے ہوئے شرارے اس خاک سے دکھادے

جب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہوکر
سر میں خمار ہوکر دل میں سرور ہوکر

چکبست وطن اور قوم کی محبت میں ایسے گرفتار تھے کہ وہ "ہوم رول" کو دین اور ایمان تصور کرتے تھے اس زمانہ میں آزادی کی جد وجہد جاری تھی اور ہندو مسلم اختلاف بھی زوروں پر تھا۔ وہ اس اختلاف کو کیسے گوارا کر سکتے تھے انکا اپنا خیال تھا کہ ہندو مسلم تنازعات اگر یوں ہی بڑھتے گئے تو آزادی کی منزل بھی اتنی دور ہوتی چلی جائے گی اور غلامی کی زنجیریں اور بھی مضبوط ہوتی جائیں گی کہتے ہیں۔

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے
رنگ ہندو دیکھ کر قوم مسلماں دیکھ کر

یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا
اسیری لازمی ہے مذہب شیخ و برہمن میں
نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں

گاندھی جی آسمان سیاست پر ابھی طلوع ہی ہو رہے تھے۔ چکبست کی دور اس نگاہ نے اُن کی عظمت و شخصیت کا اندازہ کر لیا تھا اور ان کے قید و بند کے متعلق یوں لکھتے ہیں

وطن کے واسطے زنجیر و قید گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جسکو پہنا ہے

۱۹۱۳ء میں جب مہاتما گاندھی ہندوستانی باشندوں کی سدھار کی غرض سے جنوبی افریقہ گئے تو چکبست نے ایک نظم "فریاد قوم" کے نام لکھی تھی جس کا یہ شعر بڑا عمدہ ہے۔

وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ کر لینا
ادھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

جنگ عظیم میں شرکت کی غرض سے جب ہندوستانی سپاہی روانہ ہوئے تو چکبست ان سے یوں مخاطب ہوئے تھے

ہاں دلیراں دھاک بٹھا کے آنا
سلطنہ جرمن غرور بین کا لٹا کر آنا

قیصری تخت کی بنیاد ہلا کر آنا
ندیاں خوں کی برلن میں بہا کر آنا

یہی گنگا ہے سپاہی کے جانے کے لئے
دھار تلوار کی پار لگانے کے لئے

برطانوی پارلیمان سے انھیں حسن ظن ضرور تھا وہ اس بات کو باطل غلط سمجھتے تھے ہند کی ساری پالیسی لندن کے اشاروں پر چلتی ہے۔ "ٹرانسوال" کے ہندوستانی مظلوموں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جو اپنے حال پہ بے کسی برستی ہے
یہ نائبان حکومت کی خود پرستی ہے

یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے
وہاں سنا ہے محبت کی جنس سستی ہے

جو اس پہ حال وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں بیڑا بھی پار ہو جائے

جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا مصائب کا ذکر کر کے اپنے ہم وطنوں کو اکساتے اور اُن کی رگ حمیت کو بھڑکانے کیلئے ہندوؤں اور مسلمانوں سے یوں مخاطب کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ دونوں قوموں ہی سے ہند کی عزت و آبرو سمجھتے

تے کہتے ہیں

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہند و ہوشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے تو یہ ہے غفلت کی نیند میں اغیار
تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
قضا وطن پہ ہے فرض وطن کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کی یادگار ہو تم

قومی معاشرت کی اصلاح پر بھی چکبست نے توجہ دی رسوم کی اصلاح اخلاق کی تربیت اور مغربیت کے برے اثرات سے بچنے کا مشورہ دیا۔ برق اصلاح ۔ درد دل نالۂ یاس ۔ پھول مالا۔ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جس میں ملک کے نوجوانوں کو اصلاح و معاشرت کا پیام دیا گیا ہے اپنی موجودہ پست حالی اور بدحالی کا گلہ ہے۔ "پھول مالا" میں قوم کی لڑکیوں کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔

رنگ و روغن تمہیں یورپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز
رخ سے پردے کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے پاکھنڈ
تم یہ سوتے ہوئے فتنہ کو جگانا ہرگز

اپنے بچوں کو خبر قوم کے فرزندوں کو تھیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز

"درد دل" میں نوجوانوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں

چمن عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب
خم میں جاتی رہے گی یہ جوانی کی شراب
لے اڑے دل کو طبیعت کی روانی وہ ہے
بے پئے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

وطن پرستوں کا اظہار اپنی شاعری میں بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں اور بعض دفعہ وطن سے زیادہ ان کی محبت کا دم بھرتے ہیں چنانچہ "ہوم رول" کے سلسلہ میں جب مسز اینی بسنٹ "کو نظر بند کیا گیا تو چکبست نے یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

لہلہاتا ہے محبت کا تری دل میں چمن
ماں کے دامن سے ہے بڑھ کر ہمیں تیرا دامن
تیری تصویر سے ہیں قوم کی آنکھیں روشن
تیرے بالوں کی سفیدی ہے کہ ہے صبح وطن
دل پر درد کی تصویر ہے صورت تیری
تاج کانٹوں کا ہے پہنے ہوئے مورت تیری

چکبست کو مرثیہ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا گوپال کرشن گوکھلے کی موت سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

اجل کے دام میں آتا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

اور تلک کی موت پر یوں رقم طراز ہیں۔

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار
روشنی صبح وطن کی ہے کہ ہے ماتم کا غبار

معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بے کسی چھائی ہے تقدیر بھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

تلک اور گوکھلے کے مرثیہ میں قوم کا غم نظر آتا ہے مگر چکبست نے بشن نرائن در پر جو مرثیہ لکھا ہے وہ ان کی سیاسی بلندی اور وطن پرستی ہی کا ماتم نہیں بلکہ ان کے اخلاق و انسانیت کا نوحہ بھی ہے۔

ہم نے دیکھے تیرے اشک محبت اکثر
جن پہ صدقے ہیں زباں اور قلم کے جوہر

دو نگینے تھے حمیت کے ترے قلب و جگر
ہوئے غیروں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر

ظاہری حسن لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں فانوس کے پروانے ہیں

دل محبت پہ خدا آنکھ مروت سے غنی
تجھ کو دشمن کی جو منظور نہ تھی دل شکنی
مگر انصاف کے حق میں ہوا گر نیش زنی
پھر نہ تھا تجھ سے زیادہ کوئی جرات کا دھنی

شیر تھے معرکہ عام کی سرگرمی میں
طفل معصوم سے ملتا ہوا دل نرمی میں

۱۹۲۶ء میں کسی مقدمہ کے سلسلے میں رائے بریلی تشریف لے گئے تھے عدالتی کارروائی کے بعد لکھنؤ جانے کیلئے ریل میں سوار ہی ہوئے تھے کہ فالج گرا اور زبان بند ہو گئی۔ اور اسی شام بریلی کے اسٹیشن پر انتقال فرمایا۔ محشر لکھنوی نے چکبست ہی کے مصرعہ سے تاریخ وفات نکالی ہے

ان کے مصرعہ ہی سے تاریخ ہے ہمراہ ۱۰۰۰
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

بلبلِ شیدا

چکبست

فداء المصطفیٰ ندوی

ہوا کے دوش پہ روشن رہا چراغ اِس کا
شرابِ عشق سے لبریز تھا ایاغ اِس کا
عطا ہوئی اسے روزِ ازل بصیرتِ شعر
وطن کی فکر تھی، محوِ سخن دماغ اِس کا
کیا ہے خونِ جگر وقف آبیاری کو!
خزاں کی دھوپ میں شاداب ہے جو باغ اس کا

سخنوری میں نئی طرز اس نے کی ایجاد
جہانِ تازہ کیا فکر و فن کا اک آباد!
وہ نغمہ گر جسے راس آیا گلشنِ لکھنؤ
خمیر میں تھی نہاں! اس کے خاکِ فیض آباد
لہو میں اپنے حرارت ہے اس کے نغموں سے
کبھی نہ ہوگا یہ سرمایۂ ہنر برباد

طلوعِ 'صبحِ وطن' کی نوید دے کے گیا
اندھیری شب میں دلِ پُر اُمید دے کے گیا
کچھ اس طرح سے لگائی صدائے آزادی
کہ ہم کو مژدۂ عہدِ جدید دے کے گیا
چمن سے دور بہت دُور جا چکا وہ شخص
دوبارہ آنے کی لیکن اُمید دے کے گیا

وطن کے عشق سے اِس کے سخن میں ندرت ہے
وطن کا ذکر ہی اِس کے یہاں عبادت ہے
پچاس سال سے زیادہ ہوئے اسے بچھڑے
دلوں میں آج بھی موجود اس کی عظمت ہے
کوئی بتائے کہاں ہے وہ بلبلِ شیدا
وطن کو پھر اسی چکبست کی ضرورت ہے

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

چکبست و شرر کا ادبی معرکہ

اُردو میں ادبی معرکے ایک سے بڑھ کر ایک ہوئے ان معرکوں سے شعر و ادب کو بہت فائدہ پہونچا فریقین اپنا اپنا کمال فن دکھاتے اور عروس سخن کے گیسو سنوارنے کیلئے ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے۔ الفاظ کی تراش خراش ترکیب کی جدت، اور بیان کی ندرت سے زبان میں چار چاند لگاتے۔ معرکوں کا آغاز عام طور پر اس طرح ہوتا کہ دو ہم عصر استاد، ہم طرح غزلوں پر زور طبع دکھاتے کسی ایک شعر یا مقطع میں کوئی سخن گسترانہ بات آجاتی، دوسرا سمجھتا کہ مجھ پر طنز ہے۔ بس معرکہ شروع ہوجاتا لکھنؤ ان معرکوں کا مرکز رہا۔ میر سودا، انشا مصحفی۔ آتش و ناسخ۔ انیس و دبیر کے معرکے لکھنؤ ہی میں ہوئے۔ ان تمام معرکوں میں اساتذہ بہ نفس نفیس خود شریک ہوئے ان کے تلامذہ اور عقیدت مند ان کی ہم نوائی کرتے۔ سیف زبان کے خوب خوب جوہر دکھائے جاتے، برسوں کیا زندگی بھر یہ سلسلہ جاری رہتا مگر لکھنؤ میں ایک معرکہ ایسا بھی ہوا جو متعلقہ شاعر کے انتقال کے ساٹھ پینسٹھ برس بعد شروع ہوا اور جس نے تمام معرکوں کو گرد کر دیا۔ یہ معرکہ شرر و چکبست کا ہے چکبست نے گلزار نسیم کو ایڈٹ کر کے اپنے دیباچہ کیساتھ جنوری ۱۹۰۵ء میں شائع کیا یہ دیباچہ چکبست نے بڑی محنت اور تحقیق سے لکھا تھا۔ نسیم کی حیات لکھنے کے بعد گلزار نسیم کی حیات لکھنے کے بعد گلزار نسیم پر علمی و تحقیقی انداز سے تبصرہ کیا تھا۔ اور گلزار نسیم پر اعتراضات خاص طور پر مولانا حالی کے اعتراضوں کے مدلل جوابات دیئے تھے اور لکھا تھا کہ "اگر مولانا حالی گلزار نسیم کا کوئی صحیح نسخہ ملاحظہ فرماتے تو مولانا موصوف کو اس اعتراض کی تکلیف نہ گوارہ کرنی پڑتی کتاب کی غلطی کی وجہ سے مولانا حالی کو بھی اعتراض کردینے کا موقع مل گیا۔ چکبست کے نزدیک "حالی اصول شاعری سے بے خبر ہیں یہ مضمون اور ایک اور مضمون "مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا" دونوں اودھ پنچ میں شائع ہوچکے تھے کہ گلزار نسیم کا ایک صحیح اور اعلیٰ ایڈیشن شائع کریں۔ جنوری ۱۹۰۵ء میں

ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ اس ایڈیشن کے شائع ہونے کے دو مہینہ بعد مولانا عبدالحلیم شرر نے مارچ ۱۹۰۵ء کے دلگداز میں اس پر تبصرہ کیا۔ شرر نے چکبست کی ادبی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کو تسلیم کرتے ہوئے گلزار نسیم کو اُردو کی عجیب و غریب معرکہ آرا نظم قرار دیا وہ لکھتے ہیں

"اگر اس کے محاسن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ان نظموں سے ہے جن سے اُردو شاعری کو اپنی اس صدی دو صدی کی عمر میں شاید دو ہی چار نصیب ہوئی ہوں گی اور اگر "اس کے معائب پر نظر ڈالی جائے تو اس سے زیادہ عیوب کسی اردو نظم میں نہیں ہوں گے" یہ بھی لکھا کر

"نسیم لکھنوی کی مثنوی کا باوجود بہت سی غلطیوں کے چلنا اور مقبول ہو جانا قابل حیرت چیز ہے۔ یہی امر اس بات کی شہادت ہے کہ گلزار نسیم کی خوبیاں کس پائے کی ہیں کہ بہت سی لغزشوں کے ہونے پر بھی ایسے مذاق والوں میں عام پسند ہوگی، جو ہمیشہ لفظی بحثوں کو شاعری کا اعلیٰ جوہر سمجھتے رہے" شرر نے مختلف حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مثنوی گلزار نسیم، نسیم نے نہیں لکھی بلکہ خواجہ آتش نے اپنے شاگرد کو لکھ کر دیدی۔ چکبست نے نسیم کا موازنہ ہمعصر شعرا خلیل، آزد، خلق وغیرہ سے ادا کیا تھا اور نسیم کو بہتر بتایا تھا۔ شرر کے الفاظ میں۔

"ہم اس ریویو میں نسیم کے مقابل لکھنؤ کے بعض مشہور و معروف اور مستند شعرا کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے" شرر نے ریویو کے خاتمہ پر لکھا ہے کہ

"اس سلسلہ کو ابھی ہم نے ختم نہیں کیا ہے دل گداز کے آئندہ نمبروں میں ہم اصل مثنوی گلزار نسیم پر (ریویو) لکھینگے ہم اس کے محاسن نہیں بتائیں گے اس لیے کہ وہ سب کے نزدیک مسلم ہیں اور ان کے لئے ایک ضخیم کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہم صرف ان اشعار کو درج کریں گے جن پر عام اہل سخن معترض ہیں اور جن کا اس وقت تک جواب نہیں دیا گیا ہے۔ آخر میں یہ بھی لکھا ہے

کیا اچھا ہوتا کہ مسٹر چکبست بجائے مولوی حالی کے اعتراضات کا جواب دینے کے ان عیوب کے مٹانے کی کوشش کرتے۔

شرر نے دلگداز اپریل ۱۹۰۵ء میں گلزار نسیم پر تبصرہ کے دو مقصد اور بتائے۔

پہلا یہ کہ عام غلط فہمی دور ہو کہ گلزار نسیم کی زبان لکھنؤ کی مسلم و مستند زبان ہے۔

دوسرا یہ کہ چکبست کی توجہ اس جانب مائل کی جائے کہ ان شبہات سے جو اس مثنوی کی نسبت اکثر اہل لکھنؤ اور عام شعرائے اُردو کو ہیں، وہ واقف ہوں اور اُن کو دور کریں۔" یہ تسلیم بھی کیا کہ گلزار نسیم ایسی مثنوی ہے کہ ان اعتراضوں اور شبہوں سے اُسے کسی قسم کا نقصان پہونچ نہیں سکتا اس لئے کہ وہ باوجود، ان غلطیوں کے اعلیٰ درجہ کی اور بے مثل اور بے نظیر مثنوی ہے مگر ہاں اتنا ضرور ہوگا کہ لوگ دھوکے سے بچ جائیں گے اور ان غلطیوں سے محفوظ رہیں گے جو دکھائی جاتی ہیں۔"

مولانا شرر کی رائے کا تذبذب ان کی عبارت سے صاف ظاہر ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں مثنوی کو اعلیٰ درجہ کی بے مثل اور بے نظیر بھی تسلیم کرتے ہیں اور عیوب

ونقائص سے بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے قطعی بات کہنے سے
دانستہ یا نادانستہ گریز کیا ہے اس مضمون میں انھوں
نے چالیس پچالیس اشعار نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ
گلزار نسیم کے ہیں۔
روزمرہ اور محاورہ کی غلطیاں ہیں الفاظ کا غلط
اور بے محل استعمال کیا گیا ہے۔
مطلب اور مفہوم ادا کرنے میں خبط ہو گیا ہے۔
چکبست نے بعض اشعار پر جو تصحیح کی ہے ان کو
بھی غلط بتایا کہ ان اصلاحوں کو بہت برے اور گہرے
زخم لگے ہیں گو ان کے علاوہ اس مثنوی میں اور بھی
بہت سے شبہات ہیں مگر اسی قدر لغزشوں کا ظاہر کر دینا
کافی سمجھتا ہوں اور ان کے پیش کرنے کے بعد معذرت
خواہ ہو کے رخصت ہوتا ہوں؟

یہ دونوں تبصرے شائع ہونے تھے کہ "اودھ پنچ"
مقابلے پر آ گیا۔ سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ نے مئی ۱۹۰۵ء
کے شمارے میں "نسیم کی رنگین بیانی اور حضرت شرر کی
شرر افشانی" کے عنوان سے پہلا مضمون لکھا اور خوب خبر
لی۔

جب غنچہ ہے گرما کے بگڑتے ہیں شرر
پھولوں کے عوض دہن سے جھڑتے ہیں شرر
لیکن یہ نسیم سے بگڑنا کیا خوب
سبحان اللہ ہوا سے لڑتے ہیں شرر

اس کے بعد موافقت اور مخالفت میں مضامین کا
ایک سلسلہ شروع ہو گیا یہ سلسلہ جون ۱۹۰۵ء سے جون ۱۹۰۶
تک جاری رہا۔ شرر کے موافقین ریاض خیرآبادی،
جلیل حسن جلیل، حکیم برہم، مرزا محمد ہادی رسوا، فضل حق
منشی نثار حسین اور ظہیر الحق علوی وغیرہ شامل ہیں ان حضرات
کے مضامین ریاض الاخبار گورکھپور، [illegible] دبدبۂ
آصفی، دکن ریویو حیدرآباد، تہذیب، پیام یار اور دلگداز
میں شائع ہوئے۔

چکبست کی تائید میں منشی سجاد حسین، احمد علی
شوق، طیش بلگرامی، حامد کنتوری، ایڈیٹر کشمیر درپن،
ایڈیٹر تفریح ہوا خواہ نسیم، اور حسرت موہانی کے مضامین
اودھ پنچ، زمانہ، اردوئے معلی، کشمیر درپن اور تہذیب
میں شائع ہوئے۔ خود چکبست نے اعتراضات کے جوابات
میں تین مضامین لکھے جو اردوئے معلی اور اودھ پنچ میں
شائع ہوئے اور شرر نے بھی ریویو کے بعد تین مضامین
لکھے جو اتحاد و دلگداز میں چھپے۔ چکبست نے شرر کے
پہلے دونوں اعتراضات کے جواب میں ایک طول طویل
مدلل مقالہ لکھا جس میں شرر کے ہر اعتراض کا جواب
دیا گیا، یہ مقالہ اردوئے معلی جولائی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا
چکبست کا یہ جوابی مضمون ان کے وسیع مطالعے اور تحقیقی
و تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے علمی اور تحقیقی
انداز سے ہر اعتراض کا جواب دیا اس مضمون کے بعد شرر
نے دلگداز جولائی ۱۹۰۵ء میں گلزار نسیم پر مزید اعتراضات
کیے جن کے جوابات چکبست نے اگست ۱۹۰۵ء کے اودھ
پنچ میں دیئے۔ چکبست کا آخری مضمون، شرر کے مضمون
مطبوعہ اتحاد جولائی ۱۹۰۵ء کے جواب میں ستمبر ۱۹۰۵ء کے اودھ
پنچ میں شائع ہوا۔ چکبست اپنے مضمون کے خاتمے پر
لکھتے ہیں۔

کے نام ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء سے ۱۶ نومبر ۱۹۰۵ء تک بارہ خطوط لکھ ڈالے ان خطوط میں آتش نے فرر کے اعتراضات کے جوابات بھی دیئے اور ان کی زبان و عبارت کی خامیاں غلطیاں بھی بتائیں۔ ہر غلطی پر نمبر لگایا جن کی تعداد ۱۷۰ تک پہونچ گئی۔

آتش کے علاوہ ہمان صاحب، انیس و دبیر اور سودا کے بھی خرر کی خوب خبر لی۔ ہمان صاحب نے پوری طول ریختی میں فرر کے جواب میں لکھ کر بھیجی مقطع سے آپ بھی محظوظ ہو لیجئے ؎

ڈھیل بندی نہیں کسی کی اڑا کے رکھ دوں گی دھجیاں میں
نہ جان چکا یہ منہ کی آئیں یہ پیچ مرزا سے منہ کی کھا کر

سجاد حسین مرحوم نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ شرر کے ناول "بدر النسا" اور اس کی مصیبت پر اکتوبر ۱۹۰۵ء سے دسمبر ۱۹۰۵ء تک آٹھ مضمون لکھ کر اعتراضات کی بوچھار کردی اور یہ ثابت کردیا کہ شرر نے اس ناول میں ۵۰ ٹھوکریں کھائی ہیں ہر مضمون کو اس شعر سے شروع کیا جاتا تھا ؎

نکلا جو رن میں پنج کا خنجر غلاف سے
اڑنے لگے شرر دم غارا شگاف سے

غرض سجاد حسین صاحب نے پچیس چھبیس طنزیہ مضامین اس قسم کے لکھے جس میں نثر و نظم دونوں کی دھجیاں اڑا دیں یہ سب مضامین انتہائی غیر سنجیدہ اور معیار سے گرے ہوئے ہیں لیکن ان میں کئی اہم ادبی نکات اور الفاظ و محاورات سے متعلق مفید بحث موجود ہے۔ مولانا شرر کی طرف سے ان کے جوابات نہیں دیئے گئے پیام یار میں ایک آدھ مضمون ضرور نکلے لیکن شرر نے اس سلسلہ کو روک دیا۔

شرر و چکبست کا معرکہ اس حیثیت سے اہم اور یادگار ہے کہ زبان و ادب محاوروں اور اصطلاحوں کے بہت سے نکتے اس معرکے میں حل کئے گئے اور اس ادبی معرکے میں غالباً سب سے زیادہ مشاہیر ادب اور اساتذہ نے حصہ لیا۔

ماہنامہ فروغ اردو ملکیت کے متعلق رجسٹر شدہ اخبارات ۱۹۵۶ء کے قاعدہ ۸ کے تحت بیان

۱۔ مقام اشاعت:۔ لکھنؤ
۲۔ نوعیت اشاعت:۔ ماہنامہ
۳۔ نام پرنٹر:۔ سید انصار حسین
قومیت:۔ ہندوستانی
پتہ:۔ اقبال منزل مقبرہ عالیہ (گولہ گنج لکھنؤ)
۴۔ نام ایڈیٹر:۔ محمد حسین محسن علوی
قومیت:۔ ہندوستانی
پتہ:۔ نعمت اللہ بلڈنگ نعمت اللہ روڈ لکھنؤ
مالک اخبار:۔ سید انصار حسین

میں سید انصار حسین تصدیق کرتا ہوں کہ جو اطلاعات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں

(سید انصار حسین)

ڈاکٹر [illegible] لیکچرر شعبۂ فارسی
(لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ)

پنڈت برج نرائن چکبست اور نوحے

"نوحہ" کے لغوی معنی "مردے پر رونے" کے ہیں لفظ "مرثیہ" بھی اسی کے مترادف ہے، جس کے لغوی معنی ہیں، اوصاف مردہ اس طرح پر بیان کرے کہ سننے والوں کو رحم آجائے، صنف سخن کی حیثیت، عام طور پر ان مرثیوں کو حاصل ہے جن میں کربلا کے واقعے کے حالات بیان کئے گئے ہوں۔ نوحہ ہو یا مرثیہ دونوں کا تعلق براہ راست جذبات سے ہے، اور جذبات فطری طور سے ہر جاندار میں ودیعت کئے گئے ہیں، شاعری جذبات کی عکاسی کا نام ہے چنانچہ اصناف شاعری کے ہر دور میں یہ صنف بھی زندہ و پائندہ رہی ہے عربی ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی بڑے زبردست نوحے نظر آتے ہیں۔ جاہلی دور کی مشہور شاعرہ خنسار کے نوحے اپنے بھائی کی موت پر انتہائی درد انگیز اور رقت انگیز ہیں۔ فارسی شاعری میں آذری (متوفی ۸۶۶ھ) عام طور پر پہلا مرثیہ گو قرار دیا جاتا ہے جس کے یہاں درد و اثر بہر حال نمایاں [illegible]

چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

آں دم چرا زمین و زماں سرنگوں نہ شد؟
خاک سیاہ بر سر گردوں دوں نہ شد؟

ترجمہ: اس وقت زمین و زماں نے سر کیوں نہ جھکا دیئے کمینے آسمان کے سر پر سیاہ خاک کیوں نہ پڑی؟

خونین جو گشت فرق جگر گوشہ رسولؐ
روئے زمیں چرا ہمہ دریائے خوں نہ شد

ترجمہ: جب رسولؐ کے پارۂ جگر کا سر خون ہوا تو ساری دنیا خون کا دریا کیوں نہ ہوئی۔

آہ از دمے کہ زد بجفا شمر نابکار
بر بوسہ گاہ سید ما تیغ آبدار

ترجمہ: افسوس اس وقت پر کہ شمر نابکار نے ہمارے رسولؐ کی بوسہ گاہ پر تیز تلوار ماری

جہاں تک اردو ادب کا سوال ہے نصیر الدین ہاشمی نے مثنوی "نوسرہار" کے مصنف اشرف کو پہلا مرثیہ گو

چھوٹا سا واقعہ ہے کہ سات آٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی
کمائی تھی لیکن انیس نے اسی ایک واقعہ کے دریا بہا
دیئے۔ ایک ایک مضمون کو سیکڑوں دفعہ ہزاروں رنگ
سے ادا کیا ہے، ہر دفعہ نیا رنگ، نیا انداز نئی، نیوہ نیا،
گھوڑا، تلوار، مقابلہ، نیزہ بازی اس پر کیا منحصر صبح کا عالم
دیکھو، کہیں رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا،
نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے
تو شام غریباں کی اداسی، کبھی رات کا سناٹا، کبھی تاروں
کا چھٹکنا، کبھی چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے
دکھایا ہے، غرض جس حالت کو لیا ہے اس کا سماں باندھ
دیا ہے۔"[1]

میر انیس کے حریف مرزا دبیر بھی اسی مرد کے میدان
ہیں۔ شبلی نے اگرچہ موازنہ میں ایک حد تک غیر جانبداری
سے کام لیا ہے تاہم دبیر کی خصوصیات شعری کے وہ بھی
منکر نہ ہو سکے۔ فرماتے ہیں:۔

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت تخلیہ
نہایت زبردست ہے وہ اس قدر دور کے استعارات
اور تشبیہات ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں
تک اُن کے حریفوں کا طائر پرواز نہیں کرسکتا۔"

مجموعی طور پر مراثی میں ایک خاص بات جو نظر آتی
ہے وہ یہ کہ اس دور میں "ادبیت" زیادہ اور
"مرثیت" کم ہے۔ ان مرثیوں نے لکھنؤ کی اس
بہت چھپائی کو حسن لیست جذبات کی عکاسی نظم

آدمی جاتی رہی کا رنگ بدلنے میں بہت کچھ مدد کی
گو یا مراثی سے ایک طرح کی اخلاقی شاعری کا
دور دورہ شروع ہوا۔ بقول حالی ...: مرثیہ
کو اگر اخلاق کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو بھی
ہمارے نزدیک اردو شاعری میں اخلاقی نظم کہلانے
کا مستحق انھیں لوگوں کا کلام ٹھہر سکتا ہے، بلکہ
جس اعلیٰ درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ
میں بیان کئے اُن کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری
میں ذرا مشکل سے ملے گی۔[2]

چکبست کا زمانہ انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدی
کے شروع کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس زمانے کا
لکھنؤ جن حالات کے بدلتے ہوئے دور سے گذر رہا تھا۔
اس کی تصویر عبدالاحد خاں خلیل کی زبانی ملاحظہ ہو:۔
"اس زمانے کا لکھنؤ بدلتے ہوئے حالات کے زیر
اثر ایک کش مکش سے دوچار تھا۔ نیا ادب، نئے تجربات
اور نئی رومانیت کی دعوت دے رہا تھا اور قدامت پسندی
وضعداری اور کلاسیکیت قدیم اقدار کو سینے سے لگائے،
رہنے پر اصرار کر رہی تھی، پرانا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا اور
نیا رنگ اُبھر کر دل و دماغ میں جگہ بنا رہا تھا۔
۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اور اس کی تباہ کاریاں، نیز
برطانوی سیاست کی سفندہ بازیاں اور صبر آزمائیاں
سامنے تھیں ... نئے ادبی رجحانات مغربی اقتدار کے بعث
میں ہمارے شعر و سخن پر حاوی ہوتے جا رہے تھے لیکن قدیم

[1] "آب حیات" از مولانا محمد حسین آزاد۔

[2] "مقدمہ شعر و شاعری" از حالی صفحہ ۲۲۷۔۲۲۸

سرمایہ بھی اپنا وقار کسی حد تک قائم کئے ہوئے تھا چنانچہ اہل لکھنؤ عجیب علجھان میں مبتلا تھے نہ جدید ہی کو یکلخت اپنا سکتے تھے نہ قدیم ہی سے یکسر چپٹے رہ سکتے تھے۔ چنانچہ یہاں کے مذاق صحیح اور بقول شخصے کانٹے میں تلے ہوئے معیار سخن نے یہ طے کیا کہ لکھنؤ نے گذشتہ صدی میں اپنا خون جگر صرف کر کے جس سرخی کو اپنے ادب کی لسانی، رنگینی و دلفریبی اور بیان لطافت و نزاکت کا مختار و مجاز بنایا ہے اس کو پوری طرح قائم رکھا جائے، لیکن اس پہلو بہ پہلو نئے ادب کے خیالات اور انداز فکر سے حتی الامکان فائدہ اٹھایا جائے۔

لکھنؤ میں اس "نو ترمیم" لکھنویت اور جدید ادبیت کی تحریک کو پروان چڑھانے میں اور ذی علم و با اثر حلقہ اہل کمال میں مقبول بنانے میں چکبست کا بڑا ہاتھ ہے۔

یہ تھے وہ حالات جس میں چکبست کا "صبح وطن" ظہور میں آیا۔ "صبح وطن" کے مطالعہ کے بعد اگرچہ اسمیں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، نوحہ جات بھی ہیں اور رباعیاں بھی، بحیثیت مجموعی ذہن جو اثر قبول کرتا ہے وہ یہ کہ چکبست کا دل ایسے جذبات کا مرقع ہے جو ہلکی سی ٹھیس پر سسک اٹھتا ہے، اُن کے سینے میں ایک ایسا حساس دل دھڑک رہا ہے جو غزل میں بھی دردِ محبت کا ہی راگ الاپتا ہے اور بقول سید مسعود حسن رضوی "محبت بھی کس کی؟ ملک کی قوم کی نوع کی، حسن فطرت کی[1]...." پھر بھلا وہ شخص جو غزلوں میں بھی ملک و قوم کیلئے آہ بھرتا ہو وہ قومی لیڈروں کی جدائی اور ہمیشہ کی جدائی کیوں کر برداشت کر سکتا ہے چنانچہ "صبح وطن" میں چند ایسی نظمیں شامل ہیں جن کا عنوان انھوں نے خود نوحہ جات رکھا ہے ارسطو کا خیال ہے کہ المیہ ہمیشہ جذبات کو مخاطب کرتا ہے چنانچہ چکبست کی وہ نظمیں جو بلا واسطہ جذبات کے تاروں کو چھوتی ہیں نوحہ کے تحت آتی ہیں۔ اگر چکبست نے غزل میں آتش و غالب کی پیروی کی ہے تو مراثی میں انیس کا رنگ اپنایا ہے لیکن ان کے نوحے اُس معنی میں نہیں لیے جا سکتے، جیسے انیس کے مراثی۔ انیس کے مراثی کا عنوان صرف معرکۂ کربلا ہے انھوں نے اِس درد کو عالمگیر بنا کر پیش کیا ہے چکبست کے نوحے یا تو ذاتی ہیں یعنی عزیزوں اور دوستوں کے مرنے پر لکھے گئے ہیں یا قومی لیڈروں کی موت پر یا صرف سیاسی رہبروں کی وفات پر اگرچہ یہ نوحے بھی مسدس کی شکل میں ہیں تاہم اُن میں وہ عالمگیر غم ہیں جو انیس کے مرثیوں کی جان ہے چنانچہ ہم اسے مراثی کی تعریف میں نہ لا کر نوحہ ہی کہیں گے۔

چکبست نے کل نو نوحے لکھے ہیں۔

(۱) "اقبال نرائن مسلدان"
(۲) ایک جواں مرگ دوست" (یہ دو نوحے قریبی دوستوں پر لکھے گئے۔
(۳) نشتر یاس
(۴) ماتم یاس (یہ نوحے عزیزوں کی موت پر لکھے گئے)
(۵) بشن نرائن در
(۶) گنگا پرشاد ورما (ان دو نوحوں کو رہبر قوم کا نوحہ کہا جا سکتا ہے

---

[1] "اردو غزل کے پچاس سال" ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل۔ ناشر مکتبہ کلیان بشیرت گنج لکھنؤ دسمبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۹۶-۲۹۴

(۷) گوپال کرشن گوکھلے
(۸) بال گنگادھر تلک
(۹) مہادیو گووند راناڈے (ان تین نوحوں میں سیاسی لیڈروں کی موت پر اظہارِ غم کیا گیا ہے)

اقبال نرائن مسلدان، کا نوحہ ۱۹۱۶ء کی دین ہے، اس نوحہ میں انھوں نے اقبال نرائن کی اخلاقی خوبیوں کو سراہا ہے، نوحے کے بند پڑھنے کے بعد ایک ایسے شخص کی تصویر نظروں میں گھوم جاتی ہے جو ایک بامروت، باوفا، ہنس مکھ، کم سخن لیکن صاف گو شخصیت کا مالک تھا ملاحظہ ہو

نہیں ہٹتی نگاہوں سے تری تصویر نورانی
وہ چشم بامروت وہ کشادہ لوحِ پیشانی
ہنسی کا سحر لب پر گفتگو کا طرز لاثانی
نہ ابرو پر شکن لائی کبھی دل کی پریشانی
ابھی کچھ رات باقی ہے یہ قدرت کا اشارہ تھا
جھلکتا دور ہی سے صبحِ پیری کا ستارہ تھا

اُن کی موت سے بشن نرائن در کو بھی زندگی میں ایک خلا محسوس ہوا لیکن مشیت ایزدی کے آگے سوائے صبر کے کیا ہی کیا جا سکتا ہے چنانچہ وہ زیر لب یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ ع

"کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے رواں ہے"

بلاشبہ مرنے والے کی خوبیاں ہی نہیں جو بعد اسکے زندگی بھر رلاتی رہتی ہیں ؎

نہ دولت یاد آتی ہے نہ غم ہوتا ہے دنیا کا
مروت کا نہ ہے روتی ہے دنیا وہ جو ہو کر دیتا

"ایک جواں مرگ دوست" کے عنوان سے لکھا ہوا نوحہ "پنڈت پرتاپ کشن گرٹو" کی موت پر ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا۔ جو عین جوانی میں سدھار گئے۔ کہتے ہیں جوانی کی نیند بڑی غفلت کی ہوتی ہے، اس معنی کو کس دردانگیز طور سے قلمبند کیا ہے ؎

پاؤں پھیلا کر جو یوں سویا ہوا ہے بے خبر
کیا ہے خواب مرگ میں خوابِ جوانی کا اثر
دیکھ آنکھیں کھول کر عالم ہے کیا پیش نظر
آئی ہے فردوس سے سر پیٹتی روحِ پدر
سرو قد! اُٹھا نہیں جاتا اگر تعظیم کو
ہاتھ ہی اپنا ہلا دے آخری تسلیم کو

مرنیوالا خاموش راہیِ عدم ہو جاتا ہے، لیکن اپنے پرسانِ حال کو کس عالم میں چھوڑ جاتا ہے، ملاحظہ کیجئے اس بیوہ کا غم جس کا سہاگ عین جوانی میں لٹ گیا، جس کے خواب پریشاں ہو گئے، جس کی سلگتی تمناؤں نے دم توڑ دیا ؎

دیکھ تیری بیوہ غمگیں پہ کیا افتاد ہے
محو حیرت یاس سے وہ کشتۂ بیداد ہے
مہر خاموشی لبوں پر دل میں تیری یاد ہے
خانۂ ویراں کی صورت خاطرِ ناشاد ہے
خاک آلودہ مسرت ہائے پنہاں ہو گئیں
آرزوئیں دل کی سب خوابِ پریشاں ہو گئیں

اور اس ماں پر جواں بیٹے کی موت سے کیا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جو خود بیوگی کے غم سے پہلے ہی چور چور ہو ؎

مادرِ ناشاد تیری وہ ازل کی سوگوار
پہلے ہی اس کی نگاہوں میں تھی دنیا تنگ و تار

تیرے دم سے تھا بندھا شیرازۂ صبر و قرار
ہائے اس بیکس کا اب بیڑا کریگا کون پار
آج اس کا مایہ تاب و تواں جاتا رہا
ناخدائے کشتی بے بادباں جاتا رہا

بلا شبہ آج انسان کی عقل سلیم نے بڑے بڑے عقدے حل کر ڈالے لیکن موت ایک ایسی طاقت ہے جس پر آج تک انسان قابو نہ پا سکا اور نہ ہی اس راز سربستہ سے پردہ اٹھا سکا ہے

یہ وہ عقدہ ہے جو غور و فکر سے کھلتا نہیں
جہل سے بدتر نظر آتی ہے عقل دوربیں

یہ وہ نوحے ہیں جو عزیز دوستوں کی جدائی پر کہے گئے، جن سے انھیں ذاتی تعلق تھا، ظاہر ہے یہ ایک ایسا غم تھا جو صرف اُن کا یہ مرنے والے کے قریبی رشتہ داروں کا غم ہو سکتا تھا۔ لیکن اس انفرادی غم کو بھی انھوں نے اجتماعی غم کی شکل دیدی، کون دل ہے جو ان نوحوں کو پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔

اب ہم ایسے نوحوں کو زیر بحث لا رہے ہیں جو انھوں نے اپنے عزیزوں کی دائمی جدائی پر سپرد قلم کئے۔ جن میں "نشتر یاس" کے عنوان سے ۱۹۱۶ء کا لکھا ہوا ایک نوحہ شامل ہے جس کو چکبست نے اپنے ایک عزیز تیج نرائن چکبست کی موت پر لکھا، یہ وہ شخص تھا جس نے عالم جنون میں خودکشی کر لی، خودکشی کے راز سے پردہ نہ اٹھ سکا اور وہ عین جوانی میں اپنی زندگی جیسی دولت کو گنوا بیٹھا ہے

کھلا نہ راز طبیعت کی بے قراری کا
زباں کو پاس رہا دل کی پردہ داری کا
جنوں میں ہوش رہا ضبط آہ و زاری کا
نشاں طبیب نے پایا نہ زخم کاری کا
کسی نے بھی نہ طبیعت کا پیچ و خم دیکھا
کوئی سنک، کوئی سودا، کوئی جنون سمجھا

چکبست کے ایک اور نوجوان و ہونہار عزیز پنڈت ابودھیا ناتھ آغا کی وفات پر کہا ہوا "ماتم یاس" کے عنوان سے ۱۹۱۸ء کا ایک دوسرا نوحہ بھی بڑا پر درد ہے۔ بہت زیادہ غفلت میں سو جانے پر آنکھیں نیم وا سی رہتی ہیں۔ اور مرنے کے بعد بھی آنکھیں ہلکی ہلکی کھلی رہ جاتی ہیں اس حقیقت کی عکاسی دیکھئے کیسے پر درد الفاظ میں کی ہے ۔

اے جوانی کے مسافر اے اجل کے میہماں
سو گیا تو سنتے سنتے زندگی کی داستاں پر
تھک کے نیند آئی ہے ہوتا ہے یہ چتوں سے عیاں
نیم باز آنکھوں میں ہے کیفیت خواب گراں
کار دنیا سے کوئی یوں بے خبر ہوتا نہیں
رات بھر جاگا ہوا دولہا بھی یوں سوتا نہیں

اور درج ذیل بند میں ماں اور بھائی بہنوں کی حالت زار کا نقشہ بلاشبہ انیس کے بین کی یاد تازہ کر دیتا ہے ۔

ماں کو روتا ہے کہ جاتا ہے تو جا مل کے گلے
بھائی کہتا ہے رہوں گا کس کی چھاتی کے تلے
کہتی ہیں بہنیں کہاں منہ موڑ کر بھائی چلے
دھیان کچھ اس کا بھی ہے جس گود میں ہم تم پلے
کچھ سہارا چاہیئے اہل چمن کے واسطے
بھائی کی چھاتی بڑی شے ہے بہن کے واسطے

نوحے کے آخر میں وہ موت و زیست کے معمے میں الجھ کر

رہ جاتے ہیں اور پھر ہم سوچنے لگتے ہیں کہ ؎

انتظامِ دہر میں آخر ہے یہ تدبیر کیا
خواب دنیا ہے تو پھر اس خواب کی تعبیر کیا؟

بلا شبہ اس قسم کے اشعار فارسی کے مشہور شاعر عمر خیام کی رباعیوں کی یاد تازہ کر دیتے ہیں، جہاں وہ اس ناپائیدار اور بے ثبات زندگی کی گتھی سلجھانے میں محو نظر آتا ہے۔ چکبست نے اپنے نوحوں کے آخر میں زیادہ تر موت و زیست کے فلسفہ کو بیان کیا ہے۔ لیکن اُن کا یہ فلسفہ اقبال کے فلسفہ کی طرح سنگ۔ لاخ زمینوں سے ہو کر نہیں گذرتا جیسا کہ اقبال کی "والدہ مرحوم کی یاد میں" عنوان سے وہ نظم جس میں انھوں نے اپنی والدہ مرحوم کی یاد میں چند اشعار کے بعد موت و زیست کے عنوان پر فلسفیانہ بحث شروع کر دی۔

پنڈت بشن نرائن در سے چکبست کو بڑی عقیدت تھی، آپ ہمیشہ انھیں اپنا اُستاد اور رہبر کامل سمجھ کر اُن کی پرستش کرتے رہے "نذرانۂ روح" میں فرماتے ہیں ؎

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا
دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

وہ کون سی خصوصیات تھیں جسے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا اس کے لیے اُن کے خیالات پر ہم ذرا تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ اس ذہین ہستی نے ۱۸۷۳ء میں ضلع بارہ بنکی میں جنم لیا۔ آپ کی ذہانت اور انگریزی سے شغف کا یہ عالم تھا کہ ابھی انٹرنس بھی نہ پاس کیا تھا کہ کارلائل جیسے مصنف کی زیرِ دست تصانیف پر عبور بہم پہونچا لیا آپ کی انگریزی داں کو سراہتے ہوئے چکبست فرماتے ہیں:

"آپ کو انگریزی ادب اور انگریزی زبان پر وہ عبور حاصل ہو گیا جس کی تعریف آسان ہے مگر تقلید مشکل ہے۔"[1]

کشمیری کلب کے جلسوں نے تازیانہ کا کام کیا۔ یہیں سے خیالات میں وہ وسعت و کشادگی پیدا ہوئی کہ ولایت جانے کا خیال پیدا ہوا، اگرچہ آپ کا قیام وہاں تین سال رہا اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا لیکن اس عرصہ میں آپ برابر فن تاریخ، فلسفہ، اصول پالیٹکس اور سوشیالوجی کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے۔ آپ کے مطالعہ ہمیشہ سنجیدہ تصانیف ہی رہیں۔ اگر کبھی افسانوں کی طرف متوجہ بھی ہوئے تو اسکاٹ کے تاریخی افسانوں کا مطالعہ کیا۔ ولایت کے زمانۂ قیام میں آپ نے وہاں کے جن اخبار و رسائل میں مضامین لکھے بہت پسند کیے گئے۔

"آپ کی پولی ٹیکل زندگی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب آپ ولایت ہی میں تشریف فرما تھے ۱۸۹۱ء میں اعظم گڑھ میں گاؤکشی کے فتنہ میں آپ نے وہاں کے، واقعات کی تحقیقات کا خود ذمہ لیا، بعد وہاں کے حکام کا پردہ فاش کر کے ایک جرأت مندانہ قدم اُٹھایا۔

پنڈت جی کی تحریر میں فلسفیانہ جھلک اور زور ہے آپ ایک اچھے نقاد بھی ہیں۔ اُردو فارسی بچپن ہی سے پڑھی تھی۔ بقول چکبست آپ کا خیال تھا کہ قومی و ملکی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اپنے وطن کی قدیم زبانوں کو یعنی اُردو ہندی وغیرہ کی مردہ ہڈیوں میں نئی روح پھونکی جائے۔

۱؎ مضامین چکبست، ص ۲۹۶ انڈین پریس پبلیکیشن لمیٹڈ الٰہ آباد ۱۹۶۲ء

شعرا میں آتش و غالب اور انیس کے کلام کو نمونہ راہ بنایا۔ اخلاق اعتبار سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا، آپ دنیاوی نام و نمود سے ہمیشہ اجتناب کرتے رہے یہاں تک کہ ایک جرمن سائنسٹسٹ نے آپ سے مسئلہ ذات پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی جس پر آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری مل سکتی تھی۔ لیکن آپ نے اس پر کان تک نہ دھرا، ان کے مضامین ولایت میں کتابی صورت میں شائع ہو سکتے تھے لیکن آپ نے ہمیشہ نظر انداز کیا۔ خود پسندی کو گوارا نہ کیا عادت نے

ساتھ پردوں سے نکالا تجھے خود شہرت نے

موت سے کس کو فرار حاصل ہے۔ ٹی بی کی جان سوز بیماری نے آپ کی جان لے لی۔ چکبست آپ کی انھیں غیر معمولی خوبیوں کے ہمیشہ معترف رہے، ظاہر ہے آپ کی موت چکبست کے حساس دل پر تازیانے کا کام کر گئی ۱۹۱۰ء میں چکبست نے پنڈت در کی وفات پر جو نوحہ قلم بند کیا اس میں بلاشبہ وہ خون کے آنسو رو دیئے۔ نوحہ میں ان کی تمام خصوصیات کو تفصیل سے سراہا ہے۔ آدمی تو دنیا میں بہت مل جاتے ہیں لیکن ان میں سے انسان ہونا چند کو ہی نصیب ہوتا ہے ؎

کچھ بڑی بات نہیں فاضل دوراں ہونا
آدمی کے لیے معراج ہے انساں ہونا

چکبست نے ان کے اس نوحے میں صرف اپنے سوز دروں کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ مخاطب کو بتلا دیا ہے کہ اس عظیم ہستی کے اٹھ جانے سے ملک و قوم کو کیا نقصان ہوا ؎

نہ ہوا فرق تیرے رنگ محبت میں عیاں
دھوپ دولت کی رہی یا رہی افلاس کی چھاں

تیری خدمت سے ہوا احباب کی مشکل آساں
دین تیرا تھا یہی اور یہی تیرا ایماں ؟

ایک ہی وضع رہی ایک ہی انداز رہا
اپنے پیاروں کی غلامی پہ تجھے ناز رہا

۱۹۱۲ء میں ایک اور رہبر قوم گنگا پرشاد ورما کا نوحہ لکھتے ہیں، جن کا انتقال نینی تال میں ہوا تھا افسوس تو یہ تھا کہ وہ ان کے جنازے میں شرکت بھی نہ کر سکے۔ انسان اٹھ جاتا ہے اس کی جگہ خالی ہو جاتی ہے، پھر بھی نظام حیات جوں کا توں قائم رہتا ہے ؎

پیڑ سرسبز ہیں تھالوں میں رواں آب بھی ہے
ڈوبتی کرنوں سے فوارے میں اک تاب بھی ہے
گل نوخیز بھی ہیں سبزہ شاداب بھی ہے
شام کا وقت بھی ہے مجمع احباب بھی ہے
تو کہاں ہے جو اس باغ کا شیدائی ہے
تجھ سے ملنے کے لئے فصل بہار آئی ہے

کسی ماں کے سامنے اس کے بیٹے کا اس دنیا سے چلا جانا کس قدر جاں سوز منظر ہے چکبست نے اپنے مختلف نوحوں میں ماں کے درد کا حال بیان کیا ہے لیکن ہر جگہ اس کی تصویر ایک نئے رنگ درد سے پینٹ کی ہے ؎

کچھ تجھے مادر ناشاد کا آیا نہ خیال
جو شش طوفاں میں ہے کشتی شکستہ پامال
تیرے ماتم میں یہ [illegible]
دیکھ ملتی ہے زمیں [illegible]

مدتوں یاد ہمیں اپنی مدد دلاتا ہرگز
میں بھی آئی ہوں تجھے بھول نہ جانا ہرگز

گنگا پرشاد ورما ایک بے باک صحافی تھے، قوم و ملک کا درد اُن کا اپنا درد تھا، اُن کے نہ رہنے سے اخبار کے اوراق لاوارث ہو گئے یہ کہہ کر چکبست نے ایک نیا نکتہ پیش کیا ہے ؎

قوم کرتی تھی فقط تیری زباں سے فریاد
بحث و تحریک کے میدان میں قلم تھا آزاد
تیرے اخبار دلائیں گے تیرے جوش کی یاد
دل کے ٹکڑے ہیں یہی اور یہی تیری اولاد
ہوں خبردار ترا عشق جتانے والے
ان یتیموں سے ترا نام چلانے والے

گنگا پرشاد کی شخصیت قوم و ملک کے لیے باعث افتخار ہے، صحیح معنوں میں وہ روشنی کا مینارہ اور روشنی کا تابندہ ستارہ تھے ؎

روشنی جس کی تھی وہ تارا ڈوبا
مٹ گئی شام اودھ قوم کا تارا ڈوبا

چکبست نے رہبر قوم کی وفات پر آنسو بہائے ہیں لیکن صرف وہ ہی نہیں روتے، اُن کی خوبیوں کو گن کر اُن کی خصوصیات کو اجاگر کر کے ہر قوم پرست کو رلاتے ہیں۔

سیاسی لیڈروں میں گوپال کرشن گوکھلے کا نام نامی اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ایسا وطن پرست اٹھ جائے تو قوم بے ساکت ہو جاتی ہے ۱۹۱۵ء میں چکبست نے گوکھلے کا نوحہ قلم بند کیا اس وقت اپنے پرائے نیک اور کبھی اس غم میں برابر کے شریک تھے ؎

غریب ہند نے تنہا نہیں یہ داغ سہا
وطن سے دور بھی طوفان رنج و غم کا اٹھا

یہ صرف تنہا گوکھلے کا جنازہ نہیں بلکہ شاعر کی نظر میں ہندوستان کا جنازہ اٹھ رہا ہے، قوم کا سہاگ اجڑ رہا ہے ؎

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

بلاشبہ گوکھلے قوم کے ایسے رہبر تھے جن کے قدموں سے قوم کو اپنی حیثیت نظر آتی تھی ؎

پلی ہے قوم ترے سایۂ کرم کے تلے
ہمیں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

صبح وطن میں بال گنگا دھر تلک کا نوحہ بھی شامل ہے۔ اگرچہ چکبست کو ابتدا میں بال گنگا دھر تلک کے خیالات سے اتفاق نہ تھا جیسا کہ وہ رسالہ صبح امید کے ایڈیٹوریل میں لکھتے ہیں۔

"مسٹر تلک کے جو احسانات ملک و قوم پر ہیں انہیں ہم فراموش نہیں کر سکتے، مگر مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی تمام زندگی کا طریق عمل ایسا رہا ہے جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ [illegible] خیالات کے معاملے میں آپ نے ہمیشہ آزاد خیالی اور جمہوریت کے اصولوں پر خاک ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اپنے کم نصیب ہم جنسوں کی سوشل غلامی کو قائم رکھنے میں آپ کو ذرا بھی دریغ نہیں ہے۔"[1]

لیکن موت کی دوری نے سارے گلے شکوے دور کر دیے

[1] رسالہ صبح امید، ایڈیٹر [illegible] چکبست بار [illegible]

اور ان کی موت پر شاعر کا دل رو پڑا۔ تلک جیسے قوم
پرور رہنما کی موت کسی ایک انسان کی موت نہ تھی بلکہ
پورے مہاراشٹر کی موت تھی ؎

موت مہاراشٹ کی تھی یا تری مرنے کی خبر
زرد تھی چھا گئی انساں تو کیا پتھر پہ
پتیاں جھک گئیں مرجھا گئے بکھرا کے شجر
رہ گئے جوش میں بہتے ہوئے دریا تھم کر
سرد شاداب ہوا رک گئی کہساروں کی
روشنی گھٹ گئی دو چار گھڑی تاروں کی

تلک کا دبدبہ ملک و قوم پر ایسا تھا کہ سوتے ہوئے لوگ
بھی نام سن لیتے تو چونک کر جاگ پڑتے تھے۔ ایسے لوگوں
کی موت اگر اس کے ہم نواؤں کیلئے جاں سوز ہوتی ہے تو
اس کے حریفوں کے لیے باعث راحت بھی ہوا کرتی ہے ؎

تھا نگہبان وطن دبدبہ عام ترا
دو گھڑی پاؤں پہ تھا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ تھا کام ترا
نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا
یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
پہ عدو رسم دغا چین سے اب سوئیں گے

تلک نے ملک کی خدمت کی خاطر ساری زندگی خاک
کر دی، بڑھاپے میں بھی قید و بند کی تکالیف برداشت
کیں ؎

بھر رہا ہے مری نظروں میں سراپا ترا
آہ وہ قید و ستم اور بڑھاپا تیرا

قوم پرست شہیدوں کیلئے گاڑھے کپڑے کا کفن

نہیں شہیدوں کے لہو سے تر کفن کی ضرورت ہوا کرتی
ہے ؎

تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دے دیا اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن

ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم و نسل نے کچھ جیالے
سپوت پیدا کئے ہیں۔ مہادیو گووند راناڈے کا نام
قوم مرہٹہ کے سر کو ہمیشہ بلند کرتا رہے گا۔ ایسا زبردست
عالم اور زباں داں تھا کہ نطق کو سونا دیا جس کے
لب اعجاز پر" اور بقول چکبست ؎

زور قلم سے شاہی ملک بیاں ملی
بوسے لے جسکے نطق وہ پیاری زباں ملی

یہ وہ محب وطن تھا جو بغض و جہالت کے گرداب میں
ایک ناخدا کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایسے شخص کی موت قوم
و ملک لئے ضرورت سے زیادہ ضرر رساں ثابت ہو سکتی
ہے ؎

تیرے فراق میں ہے یہی حال قوم کا
تو ناخدائے کشتی اصلاح حال تھا
طوفان جو بغض و جہل و تعصب کا تھا بپا
تھی ان خرابیوں میں تری ذات سد رہا
تجھ کو تو موت لے گئی باغ نعیم میں
چھوڑا ہمیں دوآبۂ امید و بیم میں

چکبست کے نوحے خواہ وہ ان کے کسی عزیز یا
دوست کی موت پر ہوں یا کسی قومی یا سیاسی لیڈر کی
وفات پر ان کا انداز بیان بھاری اور جذبات کی عمیق
لہروں کا انعکاس ہر جگہ تلاطم نظر آتا ہے ؎

چکبست ایک "قومی شاعر" کی حیثیت سے پہونچانے
جاتے ہیں، نوحوں میں انھوں نے یہی رنگ برقرار رکھتے ہیں۔

چکبست کے نوحوں پر ناقدین نے چند اعتراضات
عائد کئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ چکبست کے نوحے
صاف انیس کی نقالی ہیں اول تو ایسا ہے نہیں اگر بالفرض
محال ایسا تصور کر بھی لیا جائے تو اہل نظر یہ کیوں بھول
جاتے ہیں کہ نقالی بھی ایک آرٹ ہے۔ مسعود حسن رضوی
صاحب نے اس اعتراض کا بڑا خوبصورت جواب دیا ہے
فرماتے ہیں کہ :-

"کسی کامل الفن کی نقالی خود کمال فن کی دلیل ہے
تاج محل کی سنگ تراشی دیکھ کر کوئی پتھر کے ویسے ہی بیل
بوٹے بنانے لگے تو کیا وہ ماہر سنگ تراش نہ ٹھہریگا
شیکسپیر کے ڈرامے پڑھ کر کوئی ویسے ہی ڈرامے
لکھنے لگے تو کیا وہ کامل تمثیل نگار نہ قرار دیا جائے گا
فنون لطیفہ کی نقل کے لئے بھی کمال کی ضرورت ہوتی
ہے، پھر چکبست انیس کی نقل کرتے بھی ہیں تو صرف
انداز بیان میں۔ خیالات و جذبات ہمیشہ اپنے رکھتے
ہیں، اس کا ثبوت اُن کی ہر نظم سے مل سکتا ہے[1]"

دوسرا بڑا اعتراض اُن کے نوحوں پر یہ کیا جاتا ہے
کہ ان کے سارے مرثیے ایک طرح کے ہیں۔ بھلا یہ
کیوں کر ممکن ہے کہ ہر شخص کی موت پر خواہ وہ دوست
ہو یا اپنا قریبی عزیز، سیاسی لیڈر ہو یا قوم کا رہنما ہر
ایک کے مرنے پر اُس کے جذبات کے تار ایک ہی طرح
جھنجھنا اٹھیں یہ ظاہر ہے جس سے جس طرح کی قربت ہوگی
اُس بات پر اتنی ہی اور ویسی ہی ٹھیس پہونچے گی چنانچہ
خیالات و الفاظ کا بدل جانا بھی لازمی امر ہے یہ تو
چکبست کی بڑی خوبی ہے کہ انھوں نے اس فرق مراتب
کو بڑی خوبی سے قائم رکھا ہے۔ بقول مسعود صاحب

"..... اُن کو (چکبست) متعدد لوگوں کی وفات پر دلی
صدمہ ہوا۔ لیکن یہ نہ سب ایک طرح کے تھے نہ اُن کے
انتقال کا غم ایک طرح کا ہو سکتا تھا، ان مختلف طرح
کے غموں کو اس طرح ظاہر کرنا کہ اُن کا فرق نوعیت
یا فرق مراتب ظاہر ہو، بڑا مشکل کام ہے چکبست نے
اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے[1]"

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ چکبست کے نوحوں میں
ڈرامائی انداز جو مراثی انداز کی جان ہے نہیں۔ بلاشبہ
چکبست کے نوحے ابتدا و خاتمہ کے ان مراحل نہیں گذرتے
جس سے مراثی انیس چنانچہ یہ اعتراض خود بخود رد
ہو جاتا ہے۔ ہاں البتہ اگر وہ راماین (جس کا اُردو ترجمہ
وہ نظم کی صورت میں شروع کر چکے تھے) کو مکمل منظوم کر
لیتے تو بلاشبہ کسی دوسرے انیس کے پیدا ہو جانے کا
امکان تھا۔ اس میں شک نہیں کہ زبان کے لحاظ سے
اُن کے نوحے آسان ترین اور جذبات کے لحاظ سے
موثر ترین کہلانے کے مستحق ہیں۔"

---

[1] مضمون "پنڈت برج نرائن چکبست" یادگار چکبست ص۵۹

[1] مضمون "پنڈت برج نرائن چکبست" یادگار چکبست ص۵۹

غزل انسائیکلوپیڈیا

مرتبہ ذکی کاکوروی۔ پانچ سو سال سے زائد زمانے کے اردو غزل کے کل سرمایہ کلاسیکی اور اعلیٰ ترین انتخاب جس میں ہر ذوق نظر کی پوری نمائندگی کی گئی ہے اور جس میں تاریخ اردو کے تمام بہترین اور مقبول ترین اشعار مل جائیں گے۔ اردو غزل سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کیلئے بہترین رفیق ۔ فنی افادیت اور جامعیت کے اعتبار سے یہ کتاب غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں ایک ہزار شعرائے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ قیمت :- ۲۵/-

نظم سائیکلوپیڈیا

مرتبہ ذکی کاکوروی۔ اردو کے ابتدائی زمانے سے لیکر اس وقت تک تمام اعلاترین شاہکار، معرکتہ الآرا نظمیں اس کتاب میں یکجا کردی گئی ہیں جن میں مختلف موضوعات اور ذوق کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ ہر صاحب ذوق اور عام اردو داں کے لیے نایاب تحفہ۔ قیمت :- ۱۷/-

تاریخ اودھ (تلخیص)

مؤلفہ علامہ نجم الغنی خاں رام پوری تلخیص و مقدمہ ذکی کاکوری۔ یہ کتاب اودھ کی تاریخ پر سند کی حیثیت رکھتی ہے اور غیر معمولی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ جناب ذکی کاکوروی صاحب نے پہلی دو جلدوں کی تلخیص مع مقدمہ و حواشی کرکے ایک بڑا اور ضروری کام انجام دیا ہے جس کی ضرورت ایک زمانے سے محسوس کی جارہی تھی کیوں کہ اصل کتاب اب نایاب ہے اور کوئی کتاب اودھ کی تاریخ پر اس کا بدل نہیں۔ قیمت ۲۰/-

چند شعرائے بریلی

از ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب۔ اس کتاب میں بریلی کے مستند اکابر شعرا کے حالات اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ تحقیقی انداز میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔ قیمت :- ۱۰/-

مطالعہ

از ذکی کاکوروی۔ اس کتاب میں ذکی صاحب کے چار بہت اہم اور تحقیقی اور تنقیدی مضامین ہیں دو مضامین واجد علی شاہ اور شاہان اودھ کے متعلق ہیں اور دو مضامین خواجہ آتش پر ہیں۔ یہ کتاب علمی حلقے میں بہت مقبول ہوئی ہے۔

اعمال نامہ

از ذکی کاکوروی، یہ ذکی صاحب کا وہ تنقیدی کارنامہ ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتاب پر گذشتہ دو برسوں میں اس کی اشاعت کے بعد ہندوستان کے مختلف اردو اور انگریزی اخبار و رسائل میں طویل جذباتی تبصرے ہوئے ہیں اور بڑی معرکہ آرائی کتاب ثابت ہوئی ہے اس علمی ادبی تنقیدی دستاویز کی قیمت :

۵/- روپے

ڈاکٹر اخلاق اثر

چکبست کے شخصی مرثیے

مرثیہ، غزل قصیدہ اور مثنوی کی طرح اردو کی ایک اہم صنف سخن ہے جس کی بنیاد موضوع اور ہیئت پر نہیں۔ مرثیہ کا اطلاق ہر اس نظم پر ہوتا ہے جس میں کسی حقیقی فرد یا افراد کی موت کا ذکر رنج و غم کے ساتھ کیا گیا ہو۔ مرثیہ اپنا خاص مفہوم میں شہدائے کربلا اور ان سے متعلقہ واقعات کے بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ شجاعت علی سندیلوی کا مرثیے کے بارے میں خیال ہے کہ

مرثیہ ہر ایک مصیبت اور تباہی پر کہا جاتا ہے اور صرف اشخاص افراد کے لیے ہی نہیں بلکہ قوم و ملک کی خستہ حالی اور تباہ حالی پر کہا جا سکتا ہے اور اکثر شعراء نے کہا بھی ہے۔

اس میں غالباً ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کا اشارہ سوداؔ کی ان نظموں کی طرف ہے جس میں انھوں نے اپنے عہد کی سیاسی سماجی اور قومی زوال کی داستانیں بیان کی ہیں۔ اگر مرثیے کو اس وسیع ترین مفہوم میں لیا جائے تو پوری اُردو شاعری اس کے دائرے میں آجائے گی۔ دوسرے اُردو میں مذکورہ حالات کے بیان کیلئے ایک دُوسری صنف شہر آشوب موجود ہے۔

مرثیے کے ارتقاء کا سلسلہ دکن کی آزاد حکومتوں سے جا ملتا ہے۔ مذہبی جذبات اور سلاطین کی سرپرستی نے ایسی فضا قائم کی ہے۔ جہاں مرثیے نے اپنے ابتدائی نقوش پورے کئے شمالی ہندوستان پہونچ کر مرثیے سودا اور میر تقی نے جذبات نگاری، سیرت نگاری، مکالمہ نویسی کی روایات پر جو دکنی شعراء کے ہاتھوں ڈالی گئی تھیں، شعوری طور پر توجہ دی اور صحت زبان کے ساتھ اسے آگے بڑھایا، تشبیہات اور استعارات سے زبان و بیان میں خوبصورتی پیدا کی۔ اور فکر و شعور کی تہی وسعتوں کے ساتھ مرثیہ کی حدود کو وسیع کیا۔ خلیق ضمیر دلگیر فصیح اور خاص طور سے دلگیر کے ہاتھوں مرثیے انتہائی بلندیوں کو چھونے لگا۔ اور اس کی امید نہ تھی کہ یہاں

کیلئے اور بھی وسعت درکار ہوگی، دکن کے بعد پھر مرثیہ کو اودھ کی فضا راس آئی۔ سلاطین اودھ کی مرثیہ نوازی نے عوام و خواص میں مرثیہ کے لئے جذبات جگائے۔ انیس و دبیر نے اپنے فکر و شعور جذبہ اور خلوص کے ساتھ مرثیہ کو نئی رفعتوں سے روشناس کرایا۔ اور مرثیہ میں فنی اعتبار سے بلا کی وسعت پیدا کی۔ مرثیہ ایک رزمیہ نظم ہے یا نہیں ایک طویل بحث ہے جس کے بیان کی گنجائش نہیں۔ پھر بھی رزمیہ شاعری کیلئے اردو میں مرثیہ ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرثیہ اپنی روایتی حدود کو توڑتا ہوا دور دور تک پھیل گیا اس معیار اور بلندی کو دیکھ کر مولانا حالی کہہ اٹھے۔

"یہ ترقی براہِ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کی ایجاد تھی حقیقتہً طور سے یہ بات مان لی گئی ہے کہ مرثیہ حرفِ آخر" کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو اور بھی بلندی و وسعت دینا ممکنات میں سے ہے جس لیے حالی نئے شعراء کو پیغام دیتے ہیں کہ وہ اس میدان میں انیس یا دوسرے مرثیہ گویوں کی راہ پر چلیں کیونکہ

ہمیں امید نہیں کہ اس خاص طرز میں اب کوئی شخص ان کا جیسا کمال حاصل کر سکے۔"

لیکن اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد بھی نہ صرف مرثیے لکھے گئے بلکہ آج بھی لکھے جا رہے ہیں اور میر انیس کے بعد حالی و اقبال جیسے عظیم شاعر بھی پیدا ہوئے۔ اظہر علی فاروقی کا خیال ہے کہ حالی اور اقبال نے افراد کی موت پر جو مرثیے لکھے ہیں وہ مرثیہ کی ذیل میں آتے ہیں۔ حقیقت میں یہ شخصی مرثیے ہیں۔ ان میں اور مرثیوں میں کیا فرق ہے۔ آئندہ صفحات میں ان پر روشنی ڈالی جائے۔

حالی کی رائے فنی اعتبار سے تھی۔ ورنہ یہ الگ حقیقت ہے کہ مرثیے کے محرکات مذہبی جذبات بھی تھے۔ انھیں احساسات کے ساتھ انھیں جذبات کے سہارے شعراء خیالات کے نئے آسمانوں سے فکر کے موتی لایا کرتے تھے۔ حالی کے پیش نظر وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات تھے۔ نئے خیالات تھے اور نئی قدریں تھیں۔ وقت کے تقاضے کو سامنے رکھ کر حالی نے فیصلہ کیا کہ۔

"شاعر جو قوم کی زبان ہوتا ہے جس کا یہ فرض ہونا چاہیئے جب کسی موت سے اس کے یا اس کی قوم یا
یا خاندان کے دل کو فی الواقع صدمہ پہونچے۔
اس کیفیت یا حالت کو جہاں تک ممکن ہو درد و سوز کے ساتھ شعر کے لباس میں جلوہ گر کرے۔"

یہ خیالات تو بہت بعد میں مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے قلمبند کئے اس سے قبل ان افکارِ عالیہ کا بیان وہی حکیم محمود خاں کی وفات کے موقع پر کر چکے تھے ان سے بھی قبل حالی نے ۱۸۶۹ء میں غالب کی موت پر دردناک مرثیہ کہا تھا جو صرف غالب کا ہی نہیں بلکہ پورے اس دور کا مرثیہ معلوم ہوتا ہے۔ حالی نے صرف نظریات ہی پیش نہیں کئے بلکہ انھیں عملی جامہ بھی پہنایا۔ یہی حالی کی عظمت کا راز ہے اس سے صاف

ہوتا ہے۔ عرب میں اگرچہ ایسا امتیاز تو نہیں پھر بھی شہدائے کربلا کے مرثیوں کے مجموعے مقتل الحسین یا صرف المقتل کے نام سے موسوم ہیں۔ دوسرے مرثیوں کے مجموعے مراثی کے نام سے، اردو میں شخصی مرثیہ کا رواج بہت بعد میں ہوا۔ یہاں میر کے مرثیے جو دس کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ میر تو صاحب غم تھے۔ ان کی ایک ایک سانس میں آہ و نالہ سمایا ہوا تھا۔ انسانوں کی بیوفائی سے مجبور ہوکر اکثر انسان اِن جذبات کی تسلی کیلئے ان کا رخ بے زبان جانوروں پرندوں کی طرف کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تنہائی میں یہ دلبستگی کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ جنگ آزادی کے دوران جب جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد کو قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا تو ان کی توجہ چھوٹے چھوٹے پرندوں اور جانوروں کیطرف مبذول ہوئی اور محبت کا ایک رشتہ سا قائم ہوگیا۔ میر کو جانوروں سے بھی پیار تھا۔ انھوں نے کتا بلی بکری اور مرغ پال رکھے تھے۔ ان کی معصوم حرکتوں پر اشعار بھی کہتے تھے۔ جب ان کا مرغ ایک مرغ سے لڑا اور وہ مرغ مرگیا تو انھیں بہت غم ہوا۔ اس کی یاد میں مثنوی میں ایک مرثیہ کہا ہے جو ان کے بھرپور غم کی ترجمانی کرتا ہے۔

اُردو میں شخصی مرثیہ کا رواج بہت بعد میں ہوا۔ سب سے پہلا شخصی مرثیہ غالب کا ہے جو اپنے عزیز عارف کی موت پر کہا۔ غالب اور ان کی بیوی عارف سے دیوانگی کی حد تک پیار کرتے تھے جس کا اندازہ اس

مرثیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں مرزا کی شخصیت بکھر نظر آتی ہے مرثیہ کی زبان اور انداز بیان تاثر میں اضافہ کرتا ہے۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن او
جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن
ہاں اے فلک پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن او
تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن
مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن ا
گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ! گذارا کوئی دن ا
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

اس کے علاوہ غالب نے ایک اور مرثیہ اپنے مجبور کی یاد میں لکھا ہے جو اس بات کی بھی دلالت کرتا ہے کہ انھیں کسی سے لگاؤ ضرور تھا جس کی زندگی انکی نذر تھی مطلع ہے ؎

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

پورا مرثیہ درد و غم سے لبریز ہے
بقول عبادت بریلوی "ایک ایک شعر اداسی

ایک شعر میں سموئے ہوئے ایک ایک خیال اس کے
ایک ایک لفظ سے اجنا ہیں کی شہرت پھوٹی پڑتی ہے۔"
مومن نے بھی اپنے محبوب کے انتقال پر مرثیہ لکھا
ہے جس میں گہرائی اور گیرائی نہیں جو غالب کے محبوب
کے مرثیے میں ہے" جگہ جگہ آمد پر صنعتیں غالب نظر آتی ہے۔
بقول مولانا عبدالسلام ندوی

"اس میں زیادہ تر تصنع آورد مضمون آفرینی اور
لکھنؤ کی زبان اور طرز بیان سے کام لیا گیا ہے۔

شجاعت علی سندیلوی ایک اور شخصی مرثیہ کی
کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"نواب مرزا شوق نے مثنوی کے اندر مرثیے لکھے
نواب مرزا شوق کی شہرہ آفاق مثنوی "زہر عشق"
میں ہیروئن کی موت پر ماں کی زبانی جو اشعار لکھے گئے
ہیں وہ بڑے دردناک ہیں"۔

اس طرح شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں اور
اظہر علی فاروقی نے ایک اور مرثیہ کا حوالہ دیا ہے۔

"فردوسی کا وہ مرثیہ جو اس نے سہراب کی ماں
کی طرف سے شاہنامہ میں نقل کیا ہے۔"

روایتی قصوں اور افسانوں کے کرداروں کے مرثیے
ان کی موت پر اظہار غم شخصی مرثیے کے دائرے میں داخل
نہیں ہوتے شخصی مرثیے کے لئے کسی حقیقی فرد یا افراد کی
موت کا سانحہ اور درد و غم کا اظہار ضروریات میں
سے ہے۔

حالی تو اردو شاعری کے مسیحا تھے۔ حالی نے
اردو میں پانچ شخصی مرثیے لکھے جو اردو شاعری میں
سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اپنی وسعت جذبات
کی شدت، سادگی بیان سلاست زبان اور تاثر کی
وحدت کی وجہ سے اعلیٰ پایہ کے ہیں ان میں نہ صرف
متوفی کی سیرت ابھرتی ہے بلکہ خود حالی کا کردار ان
کا معیار اور مزاج سامنے آتا ہے۔ حالی نے غالب۔
اپنے بڑے بھائی حکیم محمود خاں۔ ملکہ وکٹوریہ اور
محسن الملک کی یاد میں مرثیے لکھے ہیں۔ ان میں حیرت
انگیز بات یہ نظر آتی ہے کہ وہ مرثیے جو قومی رہبروں
اور دانشمندوں کی یاد میں لکھے گئے ہیں ان میں بلا کا رنج
و غم، درد، کسک موجود ہے اس کے برخلاف جو بڑے
بھائی کی یاد میں مرثیہ لکھا ہے وہ ان خصوصیات کا حامل
نہیں

شخصی مرثیوں کی فہرست میں ایک اور مرثیہ ملتا
ہے جو شبلی نے اپنے چھوٹے بھائی کی موت پر لکھا ہے۔
اس میں موت کی کوتاہ نظری اور بھتیجوں کی حالت زار
ان کے دل میں خار کی طرح کھٹکتی ہے اور اسحاق کی
موت سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ یہ مرثیہ شدت جذبات
دردمندی، دلسوزی خلوص اور سلاست زبان کے لحاظ
سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اسے پڑھنے کے بعد شبلی کا
غم معلوم ہوتا ہے اور یہی شبلی کی کامیابی کی دلیل ہے
ریاض اللہ اور منشی نوبت رائے نظر نے بھی غزل
اور مسدس میں اپنے کم سن بچوں کی موت پر مرثیے لکھے
ہیں جو شاعرانہ خوبیوں اور فنی لطافتوں کے ساتھ درد
غم کا مرقع ہیں۔

حالی کی بلند کی ہوئی آواز وقت کے سینے پہ تیرتی

یہاں چکبست اور اقبال کے فکری رسائل سے ٹکراتی ہے۔

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ان کا انتقال رائے بریلی میں ہوا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور ناکامی نے پورے ہندوستان پر مایوسی اور شکست خوردگی کا احساس مسلط کر دیا۔ اور ناکامی کی گہری کہر ان کے ارادوں پر چھا گئی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کچھ وقت گزرا اور اس اندھیرے کے بطن سے روشن کرنوں نے جنم لیا نیا احساس نیا جوش اور نئی امنگوں کے پرچم لے کر مادر ہند کے سپوت پھر اٹھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ روایت کی جگہ درایت قدیم کی جگہ جدید۔ جذبہ کی جگہ عقل اور سند کی جگہ استدلال نے لے لی تھی۔ سیاسی رہنماؤں کے علاوہ شعرا اور نثاروں کی ایک بڑی تعداد انکی ہم نوا ہوگئی جو ان کے پیغام کو اپنے جذبہ اور خلوص کی آنچ دیکر عوام تک پہونچاتی ہے۔ اس دور کی شعرا کی فہرست میں چکبست کا نام پیش پیش ہے۔ چکبست ایک سچے وطن پرست تھے ان کے اس بنیادی تصور کا اظہار ان کے مجموعہ کلام "صبح وطن" اور "مضامین چکبست" سے ہو جاتا ہے۔

چکبست آزادی وطن کے خواہاں تھے اس کی غلامی نے ان کے کلام میں بلا کا سوز و گداز بھر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی تڑپ بہت گہری ہو گئی ہے۔ غزل گویا نظم اس میں ایک ہی جذبہ جاری و ساری ہے اور وہ ہے وطن اور اس کی محبت اور اس کے ذرہ ذرہ سے پیار، اس کے عوام سے پیار۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ جہاں نظمیں اس جذبہ کی شاہکار ہیں وہاں غزلیں بھی قومیت اور وطنیت کے احساس سے لبریز ہیں اور اسلوب بیان کا کمال یہ ہے کہ تغزل کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔

اسلوب و موضوع میں جدید و قدیم، جذبہ و عقل، درایت اور روایت کا حسین امتزاج ہے۔ زبان کی سادگی، جذبہ کی گرمی اسلوب کی ندرت ان کے کلام کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

چکبست کے سیاسی افکار میں اعتدال پسندی تھی جو رانا ڈے بشن نرائن در کی دین ہے۔ ان کا کوئی اپنا پیغام نہ تھا بقول سید احتشام حسین

وہ سیاسی مفکرین کی طرح کوئی نیا نظام نہیں، ترتیب دے رہے تھے بلکہ ہندوستانی رہنماؤں کے عام جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔

چکبست کی اس وطن پرستی نے ان کے کلام میں وسعت رباعیات میں وزن کردار میں سنجیدگی اور خودداری پیدا کی۔

چکبست جو محبت اپنے وطن سے رکھتے تھے وہی محبت رہبران قوم سے بھی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر رہے تھے۔

جن کی منزل اس کی منزل تھی ان کی خوشی اس کی خوشی، ان کا غم اس کا غم تھا۔ حالی کی طرح چکبست

نے رہبرانِ قوم مثلاً ہیرو ادب عزیز و اقارب کی موت پر مرثیے
کے علاوہ ان کی حیات پر مضامین بھی لکھے۔

چکبست نے حسبِ ذیل مرثیے مسدس میں لکھے ہیں

۱- مہادیو گووند راناڈے
۲- ایک جواں مرگ دوست (پنڈت [illegible])
۳- ماتم ویاس (پنڈت اجودھیا ناتھ کی [illegible])
۴- گنگا پرشاد ورما
۵- نشترِ یاس (دیو نرائن چکبست)
۶- گوپال کرشن گوکھلے
۷- بشن نرائن در
۸- بال گنگا دھر تلک
۹- اقبال نرائن مسکین

صفحات کی تنگی کے پیشِ نظر چکبست کے مراثی پر مکمل
تبصرہ ممکن نہیں اس لیے قدرے اختصار سے کام لیا
جائے گا۔

چکبست نے ۱۹۰۱ء میں مہادیو گووند راناڈے
کی موت پر ایک دردناک نوحہ لکھا۔

جنگ آزادی کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ
ہندوستانیوں میں معاشی ابتری کے علاوہ سماجی گراوٹ
بھی بڑی حد تک پیدا ہو گئی ہے۔ اخلاقی گراوٹ،
آپسی پھوٹ، کردار کی پستی قوم کی رگ رگ میں اتر
چکی تھی۔ گووند راناڈے نے مرہٹہ قوم کی خیر اندیشی
کی اور اپنی شعلہ بیانی [illegible] قوم کی رگ
رگ میں نئے شعلے بھڑکا دیے انھوں نے دوسری طرف میدان
عمل میں اپنی مذہبی اور سماجی تحریکوں سے نہ صرف عوام
کو بلکہ اپنے دور کے ادیبوں اور شاعروں پر بھی گہرا اثر
چھوڑا۔ ان اصلاحات سے قوم کے دل میں راناڈے
کے لیے احساس محبت تیز ہو گیا۔ پریم چند بھی راناڈے
کی تحریکوں سے الگ نہ رہ سکے۔ احتشام حسین کہتے ہیں

"وہ (پریم چند) دوسری سماجی اور اصلاحی
تحریکوں سے بھی اثر لیتے تھے چنانچہ راناڈے وغیرہ کی
سماجی اصلاحی تحریک کا عکس ان کے مقالوں اور
ناولوں میں واضح طور پر ملتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ چکبست کا طائرِ فکر ان آسمانوں سے
کیسے دور رہ سکتا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب چکبست نے محفلِ سخن میں قدم
رکھا تھا۔ حساس طبیعت تھی اور وہ راناڈے سے بہت
متاثر تھے۔ ان کی موت سے چکبست کو صدمہ ہوا۔ اور
یہ غم یہ درد کسک اشعار کے جامہ میں ظاہر ہوئی۔ درد
مندی اور زبان کی سادگی نے ایک ایک شعر میں بلا
کی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ مطالعہ کا تمام [illegible] راناڈے
کی موت کا ذکر کرتے ہوئے مرہٹہ قوم کی بے سروسامانی
کا ماتم کرتے ہیں۔ ان کے علم و فن، تحریر و تقریر کی خوبیاں
بیان کرتے ہیں اور ان کے بعد جو اختلافات پیدا ہو گئے
تھے اس کا ذکر رنج و غم سے کرتے ہیں۔ ایک بیت میں راناڈے
کے بلند مرتبہ کا ذکر کس حیرت سے کرتے ہیں ؎

تو رہنمائے قوم تھا روشن دماغ تھا
اور اپنے بزمِ ملک کا چشم و چراغ تھا

اور اس کے لیے یہ سوز و گداز اس کے دل میں ہمیشہ قائم
رہا۔

بہتر یہی ہے یہی کہ یہ ماتم بپا رہے
تا حشر دل میں زخم محبت ہرا رہے

الفاظ کی سادگی نے کہیں بھی جذبہ کو مجروح نہیں کیا۔ مرثیہ میں آورد نام کو نہیں۔

دوسرا مرثیہ اپنے نوجوان دوست کی موت پر لکھا ہے۔ جوش و خروش، غم کی شدت اور تیزی ظاہر کرتی ہے کہ چکبست کو پنڈت پرتاپ کرشن اور ان کے اہل و عیال سے کس درجہ محبت تھی۔ دوست کی عین شباب میں موت انھیں بری طرح کھلتی ہے

بزم عالم کی تو لے سیر کی مثل حباب
خواب کا نیرنگ تھا یا تھا ترا حسن شباب

اور بیوہ کی حالتِ زار کا بیان خطیبانہ انداز میں کرتے ہیں جس میں حیرت کا پہلو نمایاں ہے ؎

ہے تڑپتا کون، دل اچھینے سے کس کا ہے بھر
ہاں کس نے لاش پر کھونے پر کیا اندھیر ہے

بیوہ کی خاموشی دل پر گہرا اثر کرتی ہے ؎

کیا کہے درد جگر منہ سے کہا جاتا نہیں
تیرے مرنے کا اسے اب تک یقین آتا نہیں

ماں باپ کے غم و اندوہ کا ذکر کرتے کرتے ان پر تفکریت طاری ہو جاتی ہے ؎

میں نظام دہر میں کچھ مصلحت پاتا نہیں
اس سمندر کا مجھے ساحل نظر آتا نہیں

گرٹو کے بعد دائرہ احباب میں جو خلا پیدا ہو گیا وہ کیسے پر ہوگا ہے

اب لطف زندگی حاصل نہ ہوگا خواب میں
جانشیں تیرا کہاں ہے صحبت احباب میں

درد و غم کا بیان اس قدر شدت اختیار کرتا ہے کہ وہ صحبت احباب کو بھی پسند نہیں کرتے اور سماج سے دور رہنے کی آرزو کرتے ہیں اور تنہائی کی موت گوارہ کرتے ہیں

نوحہ خواں ہوتا نہ کوئی چرخ گردوں کیلئے
قبر بن جاتی کہیں ریگ بیاباں کے لئے

چکبست نے تیسرا مرثیہ اپنے جواں مرگ عزیز پنڈت اجودھیا ناتھ آغا کی وفات پر کہا ہے۔ چکبست آغا کے خلوص محبت شادابِ طبیعت اور اپنائیت کے شیدا تھے۔ مرحوم کے ماں باپ، بھائی، عزیز و اقارب کی حالت زار اور خود اپنا غم چکبست کو چین نہیں لینے دیتا وہ دیوانہ وار اسے پکارتے ہیں۔

اے محبت کے فرشتے اے وفا کے آفتاب
تیرے سینے میں صفا تھی جیسے آئینے میں آب

اسلئے دشمن کے بھی دل میں نہ لایا تو عتاب
آج کیوں آتا ہے تجکو بھائی بہنوں سے حجاب

آج تو سنتا کہیں کی گریہ وزاری نہیں
اور عدم کو جانے والے بے وفا داری نہیں

آغا کی موت صرف انفرادی نقصان نہیں قوم کی ساکھ کو دھکا لگا ہے۔

[illegible] ہو گیا
ایک موتی [illegible] سے ہاتھ سے گر گیا

خواب تو کتنے سجائے تھے پیارے پیارے
یہ تمنا تھی یہ آئینہ جلا پائے گا آپ

ور اس ناگہانی موت نے چکبست کو حواس باختہ کردیا
خر اس میں راز کیا ہے ؟

انتظام دہر میں آخر ہے یہ تدبیر کیا
خواب دنیا ہے تو ہے اس خواب کی تعبیر کیا

چوتھا شخصی مرثیہ گنگا پرشاد ورما کی وفات پر کہا ہے
س میں حیرت اس بات کی ہے کہ ان کی موت شملہ میں
ہوئی اور وہ دو قدم کاندھا بھی نہ دے سکے انکی موت
کی خبر کے بعد اداسی پھیل گئی اور ہمی ماحول میں وہ ،
ڈوبنے سے لگے ہیں اور ان کی بے چین نگاہیں گنگا پرشاد
کو ڈھونڈتی ہیں وہ کیسے بھول سکتے ہیں انہیں

ہم کو آسان نہیں دل سے مٹانا تیرا
ایک دنیا کا بھلانا ہے بھلانا تیرا

ایک ایک کرکے ساری ملاقاتیں، ترقی کے مدارج
نظر میں گھوم رہے ہیں عوام وخواص میں اُن کی مقبولیت
یاد آرہی ہے وہ سوچ رہے ہیں جسارت اور ہمت میں
گنگا پرشاد کا مدمقابل کون ہوگا ؟

کون میدانِ سیاست میں کمر باندھے گا
قوم کے واسطے سینہ پہ سپر باندھے گا

صحافت کے میدان میں گنگا پرشاد ورما اپنے جوش
اور دلولہ کے لئے مشہور تھے ۔ ان کی آواز ان کی حق پرستی
اخباروں کے صفحات میں زندہ تھی ان کے کردار کا آئینہ ؎

ترے اخبار دلائیں گے ترے جوش کی یاد
دل کے ٹکڑے ہیں یہی اور یہی تیری اولاد

ٹھیک ہے موت سے کس کو رستگاری ہے" لیکن صدمۂ
عظیم اس وقت ہوتا ہے جب کوئی بڑا وطن پرست،
سدھارتا ہے ؎

داغ دیتا ہے مگر جب کوئی دلسوز وطن
اس کے صدمہ سے لرزتا ہے یہ ایوانِ کہن

اسی وجہ سے یہ زخم مندمل نہ ہوگا ؎

جس کو انسان بھلا دے یہ وہ آزار نہیں
یہ ہے وہ زخم جو مرہم کا طلب گار نہیں

پانچواں مرثیہ تیج نرائن چکبست کی موت پر کہا جنھوں
نے جنون کے عالم میں خودکشی کرلی تھی ۔ چکبست کو غم
اس بات کا بھی تھا کہ مرحوم کے مرض کو کوئی نہ سمجھ
سکا اور وہ اپنی خواہشات کا اظہار نہ کرسکے ۔ ابتدا موت
وحیات کی کشمکش سے ہوتی ہے اور مرحوم کی ناگفتہ حالت
دل پر اثر کرتی ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں ؎

کسی نے بھی نہ طبیعت کا یہ فسوں سمجھا
کوئی سنک کوئی سودا کوئی جنوں سمجھا

انسان پیدا ہوتا ہے زندگی کے سرد وگرم کا مقابلہ کرتا
ہے ۔ بہار میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑتی ہے تو خزاں
میں خاموش سناٹے پھیلتے ہیں لیکن "حسرت ان غنچوں
پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے " تیج کی بے وقت موت نے
اسے سرد وگرم سے آگاہ بھی نہ ہونے دیا ؎

مگر بہار خزاں تھی نہ اس شجر کے لئے
زمیں سے اس نے اٹھایا تھا قبر کے لئے

ہندوستان کے معماروں میں گوپال کرشن گوکھلے کا مقام
بہت بلند ہے ان کی مستقل کوششوں نے ملک میں

تبدیلیاں پیدا ہو رہی تھیں اور صدیوں کا سویا ہوا ہندوستان کروٹ لے رہا تھا۔ گوکھلے کی بے لوث خدمت وسعت نظر اور فراخ دلی نے اُنھیں ہندو مسلمان ملکی اور غیر ملکی لوگوں میں بہت محبوب بنا لیا تھا۔ گوکھلے نے ملک و قوم کے لیے زندگی کو تج دیا تھا۔ اور جب ہمیں کوئی شئے بہت عزیز ہوتی ہے تو اس کے کھو جانے کا احساس ہر وقت لگا رہتا ہے اور جس چیز کا ڈر تھا۔ وہی ہو کر رہا ہے

صدا سے یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے
زمیں یہ تاج گرا قدم ہند کے سر سے

وہ مجسم قربانی تھے۔ ایک شہید کے ارمان کی طرح۔ چکبست سوچتے ہیں

خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

اور وہ ہستی مذہب و ملت کی تفریق سے بہت بلند تھی

خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لئے!
کہ میرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کیلئے

اور اب گھوکھلے کا جنازہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم کا جنازہ ہے۔

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

گو کھلے کی شخصیت تھی بھی ایسی۔ انھوں نے اپنے پورے دور کو متاثر کیا اور ان کی شخصیت مختلف رہنماؤں کی زندگی میں جھلکتی نظر آتی ہے گاندھی جی نے کہا تھا۔ Gokhle's political career ...rved me as an ideal. I ...stalled him in my heart ...hearts as my teacher in ...olitics.

اس مرثیے میں چکبست کا فن معراج پر ہے۔ صرف د... غم کا احساس ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ مرحوم کی تصویر... کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ان کی تمام صفات اور جز... کا بیان لازوال اثر چھوڑ جاتا ہے بقول آل احمد سرو... "گوکھلے اور تلک کے گرد صرف آنسوؤں کے ہیا... ہی نہیں یہ زندہ اور تابندہ بھی نظر آتے ہیں۔ اس... یہ نظمیں صرف وقتی نہیں رہتیں بلکہ لازوال ہو جاتی... ایک سیرت نگار کی حیثیت سے بھی چکبست... مقام بلند ہے

ساتواں مرثیہ چکبست نے اپنے استاد بشن... ڈر کی وفات پر لکھا ہے۔ چکبست ان کی شرافت بل... نظری، اخلاق علمیت سے بہت مرعوب تھے اور ا... انسان دوستی کی خصوصیات کی وجہ سے بے حد محبت اور احترام کرتے ہیں۔ وہ ایک وکیل تھے لیکن انھو... پیشہ کی مصروفیت پر علم کو قربان نہیں کیا۔ اور ایسے مواقع جب پیشہ کو علم پر قربان کر دیا۔ چکبست... صرف ان کی یاد میں مرثیہ ہی نہیں کہا بلکہ ان کی حیا... میں ایک طویل مضمون بھی لکھا ہے جن میں ان کی تما... خصوصیات اور اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ایک... لکھتے ہیں۔

ڈر کی زندگی ایک ایسے مرد قانع کی زندگی تھی

علم کو دولت اور ملک و قوم کی خدمت کو ذریعہ نجات
تھا اور آزاد خیالی اور بلند نظر کو انسانی فراست کا
معیار خیال کیا ہے۔"

چکبست دہلی میں ان سے ملے اور پھر اتنا متاثر
ہوئے کہ ان کو استاد کا درجہ دے دیا۔

"مجھے پنڈت بشن نرائن سے دہلی میں چند بار ملاقات
کا موقع ہوا اس کے بعد مجھے ان سے ایسی عقیدت ہو گئی
جیسی کہ کسی شاگرد کو استاد سے ہوتی ہے مجھے یہ کہنے
میں کلام نہیں کہ پنڈت بشن نرائن در نے مجھ کو غور و فکر
کا طریقہ بتلایا۔"

زندگی میں عقیدت کا عالم تھا تو ان کی موت پر
ان کو کتنا گہرا غم ہوا ہوگا اس کا احساس کرنا بہت مشکل
نہیں ہے۔ ان کا غم شدید تر ہے

سب پہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

چکبست ان کے علم سے زیادہ انسان دوستی پر لٹو
تھے ؎

کچھ بڑی بات نہیں فاضل دوراں ہونا
آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

ایک اچھا انسان دوسروں کی راحت کے لیے اپنی راحتوں
کی قربانی دیتا ہے اور یہی در صاحب نے کیا ؎

تو نہ سمجھا کبھی غیروں کی مدد کے غم میں
اپنی راحت کا بھی سامان ہے اس عالم میں

در یہ خدمت خلق صرف دکھاوا نہ تھی ؎

تیری خدمت سے ہوا احباب کی مشکل آساں
دین تیرا تھا یہی اور یہی تیرا ایماں

چکبست کی در کی یاد میں پُر تاثیر مرثیہ کہہ کر اپنی عقیدت
اور خلوص کا حق ادا کیا اور در کو لازوال شہرت بخشی
در کی خدمات انسان دوستی، ایثار، محبت کا جس انداز
سے ذکر کیا ہے ان میں تصنع کا شائبہ بھی نہیں جہاں در
کی شخصیت ابھرتی ہے وہاں چکبست کے مزاج پسند
اور معیار کا اندازہ بھی ہوتا ہے اس کے سوچ کا راز
بھی کھلتا ہے

"آزادی میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے حاصل
کرکے رہوں گا۔" لوک مانیہ تلک کے اس پرجوش
نعرے سے کون واقف نہیں۔ انگریزوں کی غلامی
کے دور میں لوگ زبان کھولتے ڈرتے تھے۔ تلک
کا یہ نعرہ بہت سے ضعیف دلوں میں لاکھوں چنگاریاں
بھڑکا گیا۔

تلک نے ملکی سیاست میں نئے ابواب کھولے۔
قمر رئیس نے اس سلسلہ میں کیا پتہ کی بات لکھی ہے۔

"تلک اور ان کے ساتھیوں نے عوامی زندگی کے،
مسائل کی نمائندگی پر زور دیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں
نے غیر ملکی سامراجی حکومت کے سامنے التجائیں کرنیکے
بجائے سیاسی حقوق کیلئے عملی جد و جہد کا راستہ دکھایا۔"

تلک صرف ایک سیاسی رہنما ہی نہیں بہت بڑے
عالم اور صحافی تھے۔ تلک نے ملک کی آزادی کے لیے ہر
مصیبت برداشت کی۔ تلک کے سیاسی افکار سطحی نہ تھے
بلکہ اخلاقی اور مذہبی تھے۔ ان کی نس نس میں ...

کوٹ کر بھری تھی۔ no religion but love
(گاندھی جی) of his country He knew
ان کے ذہن میں بلا کی وسعت تھی۔ ان کے سامنے
وطن کی محبت پر مذہب کی قربانی بھی کوئی بڑی چیز نہیں
تھی۔ وطن وطن وطن اور اس کی محبت ہی ان کا پیغام
تھا۔" (احتشام حسین)

تلک اور چکبست وطن کے سودائی تھے۔ دونوں کا
معیار اور مذاق ایک تھا۔ دونوں قوم و ملک کے دیوانے
تھے۔ اسی لیے چکبست تلک کی یاد میں اشعار کہتے ہیں تو
اس میں ان کے دل کی کسک اور آنسوؤں کی ٹھنڈی
آنچ اور خون کی جلن سمو جاتی ہے۔ ایک عام بے کسی کا
عالم ہے ؎

بے کسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

چکبست اس قدر اداس ہیں کہ انھیں سارا عالم انسان
حیوان جاندار غیر جاندار شجر اور دریا اداس نظر آتے
ہیں، کہساروں میں بہتی ہوئی ہوا رک گئی اور تاروں کی
روشنی ماند پڑ گئی ہے ؎

موت مہاشٹ کی تھی یا ترے مرنے کی خبر
مردنی چھا گئی انساں تو کیا پتھر پر
پتیاں جھک گئیں مرجھا گئے صحرا کے شجر
رہ گئے جوش میں بہتے ہوئے دریا تھم کر
سرد و شاداب ہوا رک گئی کہساروں میں
روشنی گھٹ گئی دو چار گھڑی تاروں کی

اور اب حاکموں کو سکون ملے گا اور محکوموں سے سکون
چھنے گا

یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندہ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

چکبست کو ان کی جوانی یاد آتی ہے۔ بڑھاپا یاد آتا ہے
قید و بند کی صعوبتیں یاد آتی ہیں اور وہ جگر تھام لیتے
ہیں ؎

پھر رہا ہے مری نظروں میں سراپا تیرا
اور وہ قید و ستم اور بڑھاپا تیرا

چکبست نے ایک اور مرثیہ اقبال نرائن مسلدان کی،
وفات پر کہا ہے اس بعد انھیں اس کی مہلت ہی نہ ملی کہ
اور داغ کھائیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا کو
چھوڑ کر چلے گئے۔ اقبال نرائن کے انتقال کے بعد موت
نے تو ان کے جسم کو چھین لیا لیکن، ان کے تصور کو ان سے
کون چھین سکتا ہے۔ اور وہ تصور وہ حسین خیال انھیں
بے چین رکھتا ہے ؎

نہیں ہٹتی نگاہوں سے تری تصویر نورانی
وہ چشم با مروت وہ کشادہ لوح پیشانی
ہنسی کا سحر سب پر گفتگو کا طرز لاثانی
نہ ابرو پر شکن لائی کبھی دل کی پریشانی

ان کی سادگی اور انکساری رہ رہ کر یاد آتی ہے ؎

نہ عادت خود پرستی کی نہ سودا پیشوائی کا
چمکتا تھا مگر جوہر طبیعت کی صفائی کا

ان کی وطن دوستی کو کیسے بھول سکتے ہیں ؎

حلاوت تھی وطن اور قوم کی خدمت سے جینے میں
امانت تھی خدا کی اک دل پر درد سینے میں

ایک ایک فعل یاد آتا ہے۔

پیامِ صلح دنیا شکوۂ احباب سن لینا
تیرا شیوہ رہا کانٹوں سے بچ کر پھول چن لینا

یہی صفات تھیں جنھوں نے چکبست کو گرویدہ کر لیا تھا"

نہ دولت یاد آتی ہے نہ غم ہوتا ہے ثروت کا
جسے روتی ہے دنیا ہے وہ جوہر آدمیت کا

چکبست کے مرثیوں پر مجموعی نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں زبان اور بیان کی بلا کی سادگی ہے اور یہ سادگی اپنی پرکاری کے ساتھ جلوہ افروز ہے اسلوب نے موضوع کو مجروح نہیں کیا اور نہ کہیں موضوع نے قالب کو تار تار کیا۔ شروع کے مرثیوں اور بعد کے مرثیوں میں ایک تدریجی ارتقا صاف نظر آتا ہے رفتہ رفتہ ان میں بندش کی چستی بلاغت اور فصاحت کے پہلو صاف نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ اسی سادگی میں اگر جذبہ کی گرمی نہ سموئی جاتی تو یہ اشعار سرما کی چاندنی کی طرح بے کیف ہوتے چکبست نے وہی کہا جو کچھ محسوس کیا۔ کہیں کہیں فلسفیانہ خیالات سپردِ قلم کئے ہیں۔ لیکن اقبال کی طرح ان میں کھو نہیں گئے۔ چکبست نے سیرت نگاری کے فرائض بڑی خوبی سے ادا کئے ہیں اور ان میں کہیں جھول نہیں آنے دیا۔ انھوں نے عزیزوں اور رہنماؤں کے مرثیے کہے جن میں وہ قومیت کی عینک سے بلند نظر آتے تھے یا ان میں اخلاقی قدریں موجود تھیں چکبست کو کو جہاں غزلوں نے۔ مضامین نے ادب میں جگہ دی وہاں مرثیے نے انھیں ایک تاریخی حیثیت بخشی اور شہرتِ عام کا تاج بخشا۔ دیا نرائن نگم لکھتے ہیں کہ

"چکبست اگر ان مرثیوں کے سوا اگر کوئی اور قومی نظم نہ لکھتے تب بھی اپنے زمانے کے قومی شاعر سمجھے جاتے۔"

اور پروفیسر سید مسعود حسین رضوی لکھتے ہیں کہ چکبست کے مرثیے شاعری کے وہ کارنامے ہیں کہ اگر حالی کے مرثیہ غالب کو الگ رکھ دیں تو ان کا جواب کہیں نہ ملے" ایک ہی طرح کے ہیں لیکن سید مسعود حسین رضوی کا خیال ہے کہ

مختلف طرح کے غموں کو اس طرح ظاہر کرنا کہ ان کا فرق نوعیت یا فرق مراتب ظاہر ہو بڑا مشکل کام ہے۔ چکبست نے اس مشکل کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔"

اس سے قبل کہ ان مرثیوں کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کیا جائے مناسب ہوگا کہ ان مرثیوں کے بنیادی محرکات پر نظر ڈال لی جائے تاکہ جذباتیت اور انتہا پسندی کے الزام سے دامن تر نہ ہو۔ چکبست کے بنیادی محرکات دو ہیں۔

صدمہ عام یہ ہے کہ قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زباں دل کا سہارا نہ رہا

نہ دولت یاد آتی ہے نہ غم ہوتا ہے ثروت کا
جسے روتی ہے دنیا ہے وہ جوہر آدمیت کا

رہبرانِ قوم کے مرثیوں میں حب وطن کو اور عزیزوں اور عزیزوں اور رشتہ داروں کے مرثیوں میں جوہرِ انسانیت کو دخل ہے ان محرکات کی روشنی میں چکبست کے شخصی مرثیہ کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے

لہ چکبست نے جو مرثیئے رہبران قوم کی یاد میں وہ ان،
رثیوں کے مقابلے میں جو عزیزوں اور دوستوں کی یاد میں
لکھے گئے ہیں زیادہ درد و غم رنج والم اور جذبات سے
بریز ہیں ان میں بلا کی وسعت ہے اور یہی عقد بقد جذبات
ان دونوں کے فرق کو ظاہر کرتی ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ وہ مرثیئے جو مختلف قومی
رہبروں کی یاد میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں یکسانیت پائی
جاتی ہے۔ اسی طرح عزیزوں اور رشتہ داروں کی یاد
میں لکھے گئے مرثیوں میں بھی انفرادیت نہیں پائی جاتی۔
حقیقت میں اگر ان کے عنوان ہٹا دیئے جائیں تو یہ معلوم کرنا
مشکل ہو جائے کہ کون سا مرثیہ کس کی موت پر لکھا گیا ہے۔

اس کی ایک وجہ ہے۔ چکبست کا اپنا ایک مخصوص
مزاج تھا۔ مخصوص قدریں اور تصورات تھے ظاہر ہے
ایک ہی طرح کی خصوصیات اور قدریں رکھنے والوں کا غم
بھی ایک ہی ہوگا۔ ان میں وہی مخصوص فضا ہوگی ــ اس
یکسانیت کے لئے ہم چکبست کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔
جہاں چکبست کا فن گوکھلے اور تلک کے مرثیوں میں اپنی
بلندیوں پر ہے۔ وہیں ان کا مرثیہ بشن نرائن در اپنے،
خلوص سادگی صفائی اور گہرے تاثر کی وجہ سے حالی کے
مرثیہ غالب کے ہم پلہ نظر آتا ہے۔ چکبست کو بشن نارائن در
سے وہی عقیدت اور محبت تھی جو حالی کو غالب سے۔

چکبست نے تھوڑی عمر پائی۔ ان کے خلوص محبت
انسان دوستی اور وسیع قلب و نظر نے انھیں زندہ جاوید
کردیا۔ ان کا تخیل صرف فضائے بسیط میں نہیں بھٹکتا
بلکہ دھرتی کے سینہ پر سکڑتی پھیلتی بڑھتی مچلتی زندگی کی
دھڑکنوں سے بھی ہم آہنگ ہے۔ ان کی اعتدال پسندی
نے ان کے کلام کو گرمی، گہرائی اور گیرائی بخشی۔ ان کی
نظموں اور غزلوں میں وطن دوستی اور انسان ہمدردی کا
بے پایاں جذبہ جاری وساری ہے جب تک انسان کی
سرشت میں آزادی وطن کا پیار رچا بسا ہوا ہے جس طرح
جذبۂ حُبِّ وطن لازوال ہے اسی طرح چکبست کی شہرت
کو بھی زوال نہیں ہے۔

●●

چکبست بہ حیثیت نقاد

ڈاکٹر سید محمود الحسن

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اگر ایک طرف سر سید اور علی گڑھ تحریک سے تعلق رکھنے والے بہت سے مصنفین مغرب سے زیادہ خیالات و نظریات شامل کر کے اردو ادب کو وسعت دینا چاہتے تھے تو دوسری طرف لکھنؤ میں "اودھ پنچ" کے زیر اثر ادیبوں اور شاعروں کا ایسا گروہ بھی موجود تھا جو مغربی علوم اور شعر و ادب کے مطالعہ کے باوجود نہ بالکل مغربی خیالات رکھتے تھے نہ جدید رنگ سے اپنے کو الگ ہی رکھنا چاہتے تھے۔ ان ادیبوں نے زیادہ تر لکھنوی انداز فن کو برقرار رکھنے پر زور دیا اور تہذیبی زندگی میں جدید خیالات کی آمیزش کے باوجود قدیم روایات سے اپنے کو یکسر الگ کر دینا مناسب نہ سمجھا۔ اودھ پنچ کے ادبی معاونین کی حیثیت سے جتنے لوگ شامل تھے تقریباً وہ سب اسی خیال کے پیرو تھے البتہ پنڈت برج نرائن چکبست کے علاوہ اس گروہ میں ایسا کوئی نظر نہیں آتا جس نے شعر و ادب کی خصوصیات سے متعلق کوئی تصنیف لکھ کر تنقیدی خیا
کو زیادہ جگہ دی ہو۔ چکبست کے مجموعۂ مضامین "مضـ
چکبست" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ فن تنقید
کسی مستقل نظریہ کے پابند نہ ہونے کے باوجود ا
اہمیت اس لئے ہے کہ انھوں نے وہ انداز اختیار کـ
جس میں محض ذاتی تاثرات کا اظہار ہونے کے بـ
ایک انفرادی رجحان ملتا ہے جو اس دور کے نقادو
بالکل مختلف ہے۔

چکبست نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں آنکھ کھـ
تھی: اس کی شاعری فضا میں خود اُن کا فن پروان
تھا، چنانچہ وہ شاعری میں تاثیر کے کلام کے سـ
ساتھ حسن کلام اور انداز بیان کو نظر انداز نہیں کر
تھے: انھیں چیزوں کی وضاحت کرتے ہوئے ایک
لکھتے ہیں:

"دُنیا کی معمولی اور غیر لطیف راحتوں کے مقابلہ

شاعری کو روحانی راحت کا سرمایا کہا گیا ہے
اگر زندگی کا راز محض راحت پسندی سمجھا
جائے تب بھی ہر انسان کے دل میں یہ شوق
ہونا چاہیئے کہ اس کا دماغ راحتوں کے
سرور سے محروم نہ رہے۔ پُرانے استادوں
کے زمانے میں روزمرہ اور محاورے کی
صفائی اور زُبان کے تکلفات کے جوھر
موجود ہیں مگر ان کے ساتھ شاعری کا اصلی
جوہر بھی موجود ہے۔ زمانہ حال میں قدیم
رنگ کے شعرا کی روش بہت مصنوعی ہو گئی
ہے۔ پُرانے رنگ کے غزل گو زیادہ تر حسن
و عشق کی بجھی ہوئی شمعوں کے پروانے ہیں
یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں زبان اور
محاورے کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے
مگر تاثیر کا پتہ کم چلتا ہے برعکس اس کے
نئے رنگ کے شعرا اکثر اس خیال کے معتقد
معلوم ہوتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کی شاعری
کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ اعلیٰ درجہ کے
مغربی خیالات محض نظم کے پیرایہ میں ظاھر
کر دیئے جائیں حسنِ کلام اور انداز بیان کو وہ
شاعری کا غیر ضروری جزو سمجھتے ہیں۔ پرانی
روش پر چلنے والوں کی طرح وہ بھی تاثیر سخن
کے جادو سے بے خبر ہیں"

اس اقتباس سے چکبست کے تنقیدی نظریات سامنے
آجاتے ہیں اور انھیں کی پیروی کر کے شاعری میں،
مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔

"مضامین چکبست" کے محض مضامین پڑھنے سے یہ
احساس ہوتا ہے کہ مصنف شعرا کے سوانحی حالات بیان
کرنے کے ساتھ ان کی فنی خوبیوں سے قاری کو روشناس
کرانا چاہتا ہے جس میں عقیدت کا جذبہ شدت سے موجود
ہے۔ لچھمی نرائن سرور، سجاد حسین، مچھو بیگ، برق،
سید محمد آزاد، اور پنڈت بشن نرائن در وغیرہ اسی قسم کے
مضامین ہیں۔ پنڈت دیا شنکر نسیم سے متعلق تین مضامین
شامل ہیں جن میں مثنوی گلزار نسیم کی خصوصیات کے
مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے نسیم کی شعری و
فنی خوبیوں کو پوری طرح واضح کرنے کی کوشش کی گئی
ہے۔ در اصل یہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو شرر
و چکبست کے معرکہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں بھی چکبست
کا یہی جذبہ کارفرما ہے کہ نسیم کی جن خوبیوں کی طرف
لوگوں نے کم توجہ کی تھی انھیں سامنے لایا جائے۔ اس
قسم کے مضامین چکبست کے ذاتی تاثرات اور خیالات
کا اظہار کرتے ہیں جس میں کسی گہرے تنقیدی اصول کا
پتہ نہیں چلتا۔ البتہ بعض مضامین ایسے ضرور ہیں جن کے
مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعروادب کے لئے
زبان و بیان اور لکھنؤ کی ادبی روایات پر زور دیتے
تھے اور انھیں سے چکبست کے ذہنی رجحانات کا پتہ
چل سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ طرزِ تحریر اور موضوعات
یکسانیت ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا تنوع نہیں ملتا پھر
بھی دلائل اور مثالوں سے کام لیکر اپنے مقصد کو پوری
طرح واضح کر دیئے ہیں۔ انھوں نے بہت سے ایسے موضوعات

سے بحث کی جہت کی طرف ان سے پہلے کسی نے توجہ نہ دی تھی اور ان کی ادبی خصوصیات سے قاری کو پوری طرح روشناس کرا دیا۔

چکبست لکھنؤ کی شعری روایات کے دلدادہ ہونے ہوئے بھی جب داغ دہلوی کی شاعرانہ خصوصیت کا تجزیہ کرتے ہیں تو انصاف پسندی اور غیر جانب دارانہ انداز میں ان کی خوبیوں کا اقرار کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"داغ کے شاعرانہ وقار کی کشتی اس وقت تحسین ناشناس اور نفرین بے جا کے دو گرداب میں پھنسی ہوئی ہے اور ایک عجیب طوفان اس کے گرد برپا ہے۔۔۔۔ بالفعل اس نامور شاعر کے کمال کا بے تعصبی کے ساتھ اندازہ کرنا کسی قدر دشوار ہو گیا ہے۔ لیکن انصاف پسندی اور بے تعصبی وہ اسم اعظم ہے جو مسافر تحقیق کو ضرور منزل مقصود تک پہونچا سکتا ہے۔"

تنقیدی مسائل میں ذاتی تاثرات اور جذبات انداز ہوتے ہوئے بھی اسی طرح بعض جگہوں پر ایسے خیالات کا پتہ چلتا ہے جو چکبست کی غیر جانبداری اور خلوص کا ثبوت ہیں اور یہی نقاد کے لیے بنیادی شرائط میں داخل ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے چکبست کی تنقیدوں میں کسی تنوع یا مخصوص نقطہ نظر کی تلاش مفید نہ ہوگی لیکن بعض جگہوں پر خیالات کا اظہار اسطرح کیا گیا ہے

کہ اس میں فلسفیانہ اور نفسیاتی گہرائی ضرور محسوس ہوتی ہے "اردو شاعری" میں ایک جگہ لکھا ہے :۔

"نفس شاعری کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ کھینچنا دشوار ہے۔ یہ ویسا ہے کہ سریلی آوازوں کے سننے سے یا دریا کی لہروں پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے بیان کرنے کی کوشش کیجائے حقیقت یہ ہے کہ شاعری وزبان کے جادو کی تشریح و تعریف زبان و قلم کے اختیار سے باہر ہے۔"

یعنی چکبست کے خیال میں شاعری فطری احساسات کا مجموعہ ہوتی ہے جو شاعر کی وجدانی کیفیات کے اثر سے وجود میں آتی ہے اور قاری و سامع کی قوت حسیہ کو اسی طرح متاثر کرتی ہے جس طرح عام فطری مناظر دیکھ کر انسان محظوظ ہوتا ہے۔ یہ احساسات کیوں اور کیسے پیدا ہوتے ہیں اس کی تشریح کرنا ناقد کے بس کی بات نہیں ہے۔ شاعری کے متعلق چکبست کا یہ خیال کہ یہ فطری طور پر وجود میں آتی ہے اور دوسروں کو بھی اسی طرح متاثر کرتی ہے جن جذبات اور احساسات کے تحت شاعر نے اس کا اظہار کیا، کوئی نیا نہیں ہے لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ فن اور انسانی ذہن کے تعلقات کے قائل تھے جو نفسیاتی مطالعہ کا ایک جزو بن سکتی ہے۔ اس سے زیادہ پیچیدہ اور گہرے مسائل کی ترجمانی اس وقت اور اس ماحول کے کسی ناقد

سے توقع کرنا فضول ہوگا۔

مختصر یہ کہ چکبست کے مضامین کی سب سے زیادہ اہمیت اس بات میں ہے کہ لکھنؤ کے نثر نگاروں کے فن کی خصوصیات پر اس سے پہلے کسی نقاد نے اظہار خیال نہیں کیا تھا۔ ایک محدود نقطۂ نظر اور انداز فکر ہوتے ہوئے بھی ان مضامین سے معلومات میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔

●●

نازشِ قوم و وطن خالقِ انداز و بیاں
فکر و احساس نے معراجِ وفا پائی ہے
تیرے ہر لفظ میں اعجازِ مسیحائی ہے
رہبری کرتے رہیں گے ترے قدموں کے نشاں

ذہن تیرا کسی رفتار کا پابند نہیں
عرش پہنچا ہے تخیل ترا اے جانِ غزل
روح نے ڈھونڈ لیا ہر سرو سامانِ غزل
یہ مسافر درو دیوار کا پابند نہیں

اب بھی محسوس یہ ہوتا ہے چپکے چپکے
رازِ ہستی کی گرہ کھول رہا ہے چکبست
منفرد لہجے میں رس گھول رہا ہے چکبست
امن و آزادی و اُلفت کا پیمبر جیسے

میر ہوں ذوق ہوں مومن ہوں کہ مرزا غالب
داغ و اقبال نہ حالی سے سروکار تجھے!
دلنشیں سب سے الگ راہ چنی ہے تو نے
تیرا کردار ترے فن پہ رہے گا غالب!

فلسفہ تیرا اسی خاک سے تعمیر ہوا
تیری تشبیہ ترا دَور فلک اور زمیں
تیری تمثیل "تلک" مسور پپیہا بھی یہیں
دیوتا تو نے اُنھیں خاک کے ذرّوں کو کہا

سادہ الفاظ میں اک فلسفہ پنہاں ہونا
یہ شرف کم ہوا اشرف کسی شاعر کو نصیب
زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے اُنھیں اجزا کا پریشاں ہونا

مفتون کوٹوی
کوٹہ (راجستھان)

چکبست لکھنوی
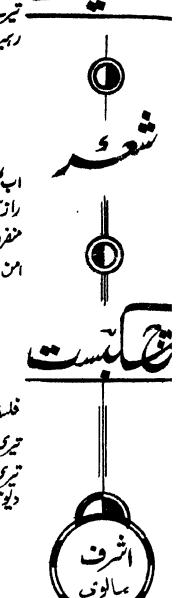
شخصیت اور شاعری کی تابانیوں میں

اردو خدمت کے سلسلہ میں کائستھوں اور کشمیریوں کی جگر کاویوں اور دماغ سوزیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا اردو ہندوستان کے ہر گوشہ میں جگمگائی ہے اور ہر ملت ومسلک، ہر طبقہ و فرقہ اور ہر نسل و قبیلہ کی محبوب ومرغوب رہی ہے، چنانچہ تسبیح و زنّار، اور قشقہ و سجدہ سبھی اس کے پرستار رہے ہیں اس میں انجیل و گیتا کے بھی ترجمے ہوئے اور قرآن و احادیث کی بھی تفسیریں لکھی گئیں، بنگال میں بھی اس کی زلف آرائی ہوئی اور پنجاب میں بھی اسے خون جگر سے سینچا گیا۔ دکن میں بھی اس کا بول بالا ہوا، تو اٹک میں بھی اس کی شہنائیاں بجیں۔ ہر قسم کے موضوعات وعنوانات سے اس کی تابانی ہوئی اور مختلف قسم کے فنون وعلوم سے یہ جگمگائی۔ مسلمانوں نے اس سے اذانیں لگوائیں تو غیر مسلموں نے اس سے ناقوس بجوائے، چکبست کاشمیری پنڈت تھے، ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں انکی نشوونما

ہوئی۔ یہیں پلے بڑھے، پڑھے لکھے۔ ۱۹۰۸ء میں امتحان قانون پاس کرکے وکالت کرنے لگے۔ یہ اپنے اس پیشہ میں بھی چمکنے لگے تھے اور ارباب وسیاست میں بھی کہ صرف چوالیس سال کی عمر میں خدا کو پیارے ہوگئے۔ خورشید در خورشید والے مستقبل پور، خداوند تعالے کو انھیں جلد ہی اپنے پاس بلانا تھا اس لئے انھیں چمکانے دمکانے میں بھی عجلت سے کام لیا۔ اور جتنا جس قدر ان سے کام لینا تھا لیا۔ اور پھر پردہ پوشی کردیا دوسروں کے لیے انھوں نے ایک راہ متعین کی اور پھر خود چل بسے انھیں بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف رجحان ہوگیا تھا، بتایا جاتا ہے کہ پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی عجیب بات ہے شعرا نے پہلے اپنی مشق سخن کی ابتدا بالعموم غزل ہی سے کی ہے، چاہے غزل کو پھر گردن زدنی و کشتنی قرار دے لیا ہو، چکبست تو غزل کے دلدادہ تھے، لیکن اُن کی نظمیں بھی بڑی پُر سوز اور دل گداز ہیں۔ یہاں

سلاست، زبان کی شیرینی، الفاظ کی بندش اور خیالات کی بلندی و پاکیزگی ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں اُن کی شاعری کو ادب و سیاست اور اصلاح و تعمیر کے خوشگوار انوار سے ضیا تاب قرار دیا جا سکتا ہے، وہ آتش کی غزل سے اور انیس کے مسدس سے متاثر تھے اور یہی اصناف بیشتر اُن کی جولانگاہ رہی ہیں، تنقید، میں وہ بیحد متین و سنجیدہ نظر آتے ہیں، نثر میں بھی اور نظم میں بھی، لیکن مباحثہ میں کہیں کہیں ظریفانہ انداز کے داؤ پیچ سے بھی کام لے لیتے ہیں اور اس آئینہ میں حریف مقابل کی قدرے تمسخر آمیز صورت گری کر کے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، یہ ظرافت کی چاشنی، اُن کی شوخی طبیعت اور شگفتگی مزاج کی ترجمانی کرتی ہے، اسی طرح اقبال جیسے مدبر و مفکر نے بھی اس سے اپنے کلام کو مزین و منور کیا ہے، چکبست کے متعارفین کہتے ہیں کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں بھی اپنی خوش مذاقی اور شگفتہ طبعی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ تاہم انھوں نے اپنے اس ظریفانہ انداز کے کلام کو اپنے نام سے چھپوانا کچھ مناسب نہیں سمجھا۔" لارڈ کرزن سے جھپٹ الیتیاں نئے مجموعہ میں شامل ہوئی ہے، اُس کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

لیجئے سامنے میرے ہے شبیہ کرزن
رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ

اب مناسب ہے یہی کیجئے ہجراغالی
ہم بھی خوش آپ بھی خوش دور کہیں ہو جھنجھٹ

یا الٰہی یہ چلی باد مخالف کیسی؟
آ گیا اڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ

لارڈ کرزن نے کلکتہ یونیورسٹی کے کنووکیشن میں ہندوستانیوں کو جھوٹا کہا تھا۔ اسی موقع پر اکبر آبادی نے کہا تھا "جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ"

فروری ۱۹۰۵ء میں گلزار نسیم کا ایک نیا ایڈیشن شائع ہوا، مولانا عبدالحلیم شرر نے گلزار نسیم پر اعتراضات وارد کئے۔ اس پر جواب و جواب الجواب کا سلسلہ چلا، بتایا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں جو ظریفانہ انداز کے مضامین اودھ پنچ میں "جنت کی ڈاک" اور "آتش کے خطوط" کے نام سے نکلے وہ تمام تر چکبست کے دماغ اور چکبست کے قلم کے تھے۔ دو رباعیاں اس سلسلہ میں ملاحظہ ہوں ؎

بت کی وقعت نہیں خدا کے آگے
کیا زاغ کا رتبہ ہے ہما کے آگے
بیگار نسیم سے بگڑتے ہیں شرر
چنگاری ہے کیا چیز ہوا کے آگے

جب غیظ سے گرما کے بگڑتے ہیں شرر
پھولوں کے عوض دہن سے جھڑتے ہیں شرر
لیکن یہ نسیم سے بگڑنا کیا خوب
سبحان اللہ ہوا سے لڑتے ہیں شرر

ایک ریختہ کے کچھ اشعار جو اسی ضمن میں جان صاحب کے نام سے جان صاحب کے رنگ میں کہے گئے ہیں ؎

زبان سے خاک انکو مس نہیں ہے حسد کی ہے آگ دل میں روشن
ہوائیں اپنی یہ باندھتے ہیں نسیم کا مضحکہ اڑا کر

جو یہ تعصب کھلا کھلا ہے چنے گا ڈھونگ اتحاد کا کیا
یہ کچی دیوار بیٹھ جائیگی ایکدن آپ پس پسا کر

جو ایک مجھکو کوئی کہے گا میری زباں سے وہ دس سنے گا
محل کی لونڈی نہیں ہے بندی جو منہ میں رہجائے گی گڑگڑا کر
یہ اچھی مضمون نگاریاں ہیں کہ غیر کی آڑ میں ہیں کہتے
چلے تو ہیں ناچنے کو مگر ہیں گھونگھٹ میں منہ چھپا کر
دبیل بندی نہیں کسی کی اڑا کے رکھ دونگی دھجیاں میں
نہ جان تھا پہ منہ کی آئیں یہ پنچ مرزا سے منہ کی کھا کر

کھلا جو دن میں پنچ کا خنجر غلاف سے
از شرر دم خارا شگاف سے

ایک وکیل اور اس کے آفس کا نقشہ جہاں موکل کا گذر نہ ہوتا تھا۔ رباعی

کرسی سے عیاں لغزش یک پائی ہے
میز ایسی ہے گویا کہ پڑی پائی ہے
منشی کا یہ جھگڑا نہ موکل کا گزر
آفس بھی عجب گوشۂ تنہائی ہے

ہم لائے موکل کو تدبیر اسے کہتے ہیں
وہ پھنس کے نکل بھاگا تقدیر اسے کہتے ہیں

مرتے دم جب ملک الموت مقابل آیا
دل ناشاد یہ سمجھا کہ موکل آیا

بہار کشمیر لاہور۔ اردو ماہنامہ "یادگار چکبست" بابت ماہ فروری ۱۹۳۶ء جو میری ان معلومات کا ماخذ ہے اپنے دامن میں چکبست کے ظریفانہ کلام کے اور بھی کئی نمونے پوشیدہ رکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا رنگ کلام متانت، سنجیدگی اور لطافت و پاکیزگی کا آئینہ دار ہے، محاسن دماغی کے ساتھ محاسن ادبی سے معمور ہے، علمی وفنی پختگی اس کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہوتی ہے اُن کے شعری موضوعات مختلف اقسام دستور اصناف پر مشتمل ہیں، اظہار و ابلاغ سے زبان پر مکمل عبور حاصل ہوتا ہے۔ اور مفکرانہ و مدبرانہ انداز سے مسائل حیات وکائنات پر نظر ڈالتے ہیں اور سلاست و نفاست کے ساتھ اشعار میں انھیں ظاہر کرتے رہتے ہیں خیالات فلسفیانہ ہیں لیکن ژولیدگی سے مبرا ہے

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے؟ خمار بادۂ ہستی اُتر جانا

دنیا میں اپنا حسن جتانے کے واسطے
احساں لیا ہے روح نے منت عنبار کا

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے
کچھ ابتدا ہی میں ہم انتہا کو بھول گئے

دردِ الفت آدمی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہوگئے

زندگی میری اسیری کی فقط تمہید ہے
دام میں دانے مری قسمت کے پنہاں ہوگئے

مرد قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس
پاؤں پھیلا کر جو بیٹھا ہاتھ پھیلاتا نہیں

اس آخری شعر میں محاورات کا استعمال کیسی خوبصورتی سے ہوا ہے، مندرجہ ذیل شعر میں خطروں سے کیا طوفان بپا

کیا ہے ؎

مے کے قطرے کیا تھے جبتک خم میں تھے ساغر میں تھے
مرے ہونٹوں تک پہنچتا تھے کہ طوفاں ہو گئے

اس شعر کی آرائش و زیبائش کا اندازہ کیجئے ؎

سبزہ باغ سے کہتی ہیں یہ شاخیں جھک کے
سر اٹھانے کی جگہ گلشن ایجاد نہیں

گل و گلشن کی کچھ باتیں اور۔ پرواز تخیل دیکھئے انداز بیاں دیکھئے ؎

حسن کے پردے میں کیا کیا عیب پنہاں ہو گئے
طرۂ دستار گل، تار گریباں ہو گئے

گلشن سے نہ خوش جائے گا شبنم کا مسافر
ہنس ہنس کے رلانے کی عادت گل تر میں

کیا کونپلیں دکھاتی ہیں عالم بہار کا
آنچل سرک گیا ہے عروس بہار کا
پھولوں کی جھولیوں میں ہیں موتی بھرے ہوئے
شبنم لٹا رہی ہے خزانہ بہار کا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن میں

آپ نے خیال فرمایا کہ گل و گلشن کے پردہ میں کیا کچھ کہہ دیا گیا ہے، اب ذرا ان کی کچھ نصیحتیں گانٹھ باندھ لیجئے ؎

درد دل، پاس وفا، جذبہ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

مصیبت میں جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کی گردش قسمت سے ڈر جانا

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی آنکھوں میں
اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

ابھرنے ہی نہیں دیتی یہاں بے مائگی دل کی
نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی
اس ایک مشت خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

اہل ہمت منزل مقصود تک آ بھی گئے
بندۂ تقدیر قسمت کا گلہ کرتے رہے

نام مردوں کا ازل سے ہے ابد تک زندہ
لوگ دنیا کو عبث دار فنا کہتے ہیں

چکبست کو تو خیال تھا اور کیسی انکساری و خاکساری کا خیال تھا کہ ؎

ذکر کیا آئے گا بزم شعرا میں اپنا
میں تخلص کا بھی دنیا میں گنہگار رہا

یہاں یہ جتا دینا ہے کہ اردو کا کوئی تذکرہ اور ادب اردو کی کوئی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہیں۔

انھیں اصلاح قومی و تعمیر ملک اتنا سودا تھا کہ معلوم ہوتا ہے خدا نے انھیں اسی ایک مقصد کیلئے پیدا کیا تھا۔ وہ اپنے معاشی سلسلے یعنی وکالت کے پیشہ میں بھی کامیاب اور شہرت یافتہ ہو گئے تھے۔ لیکن سماجی، اخلاقی اور قومی اصلاح و فلاح کا جذبہ انھیں بمقدار وافر عطا ہوا تھا۔ انھوں نے کشمیریوں کی یعنی اپنی قوم اور برادری کی

کی اصلاح کے لئے لکھنؤ میں ایک کلب کھولا، لائبریری اور ریڈنگ روم قائم کئے۔ اپنی قوم کے کئی نوجوانوں کو راہ راست پر لائے ۱۹۱۲ء میں اس کلب کے آٹھویں سالانہ جلسہ میں انھوں نے جو نظم سنائی اس کے ایک ہی بند سے آپ اس کی افادیت و مقصدیت اور اُن کی مشغولیت و محویت کا اندازہ کرسکیں گے ؎ قیاس کن ز گلستان من بہار مرا۔

قوم میں آٹھ برس سے ہے یہ گلشن شاداب
چہرۂ گل پہ یہاں پاس ادب کی ہے نقاب
مرے آئینہ دل میں ہے فقط اس کا جواب
اس کے کانٹوں پہ کیا میں نے نثار اپنا شباب
کام شبنم کا لیا دیدۂ تر سے اپنے
میں نے سینچا ہے اسے خون جگر سے اپنے

ممبران کلب ہر شام جمع ہوتے۔ اور ایک دوسرے کا محاسبہ کرکے اپنی زندگی سنوارتے ؎

نشۂ علم کی اُمید پہ جینے والے
سمٹ آتے ہیں سر شام سے پینے والے

محبت کے چمن میں مجمع احباب رہتا ہے
یہی جنت اسی دنیا میں ہم آباد کرتے ہیں

چکبست کے دل میں، اس سلسلۂ اصلاح و تعمیر کے متعلق کتنا خلوص تھا، اس شعر کو ملاحظہ کیجئے ؎

مرکے بھی روح مری کس طرح شاد رہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

اس طرح انھیں کشمیر، اپنے آبائی وطن سے بھی قلبی وابستگی تھی ؎

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں یہ نکتہ عرض کردوں کہ اُن میں لکھنویت اور اُس کا ادیبانہ ماحول ایسا رچا بسا تھا کہ اپنے خیالات کے اظہار میں وہ کبھی شاعرانہ وادیبانہ روش کو ترک نہیں کرسکے۔ ظریفانہ کلام سے اس سنجیدہ کلام تک ہر شعر پر نظر ڈال لیجئے۔ پتھر کے ٹکڑوں کے پانی دینے کا سا انداز بیان آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا۔

قومی اصلاح اور وطنی محبت نے آگے بڑھ کر اپنا دائرہ اور وسیع کرلیا۔ انھوں نے ہندوستان و ارباب ہندوستان کی فلاح و آزادی کا بیڑا اٹھایا۔ ملک سے محبت کرنے لگے۔ رہبران ملک پر عقیدت کی نظر ڈالی ؎

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نور سحر وطن کا
آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا

ہے اشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا
ملتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مرکر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

بشر کا دل وہ نہیں سنگ وحشت ہے لاکھ
کہ جس میں درد محبت نہ ہو وطن کے لئے

عزیزان وطن کو غنچہ و برگ اثر جانا
خدا کو باغباں اور قوم کو ہم نے شجر جانا

پہلے وہ قوم کی لڑکیوں سے مخاطب تھے ؎

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و ریفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
خود پرستی کو لقب دیتے ہیں آزادی کا
ایسے اخلاق پہ ایماں نہ لانا ہرگز
دل تمہارا ہے وفاؤں کی پرستش کیلئے
اس محبت کے شوالہ کو نہ ڈھانا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
پوجنے کیلئے جو مندر ہے آزادی کا
اس کو تفریح کا مرگز نہ بنانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

اب وہ جوانان قوم سے مخاطب ہیں اور دیس کے باغ پر جاں نثاری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں ؎

جذبہ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے
مزا شباب میں ہے سر سے خوں بہانے کا
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
اک ہستی بیدار کے دونوں ہیں کرشمے،
موجوں میں روانی ہے جوانی ہے بشر میں
سننے والوں کو وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آباد رہے
در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی ہے آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا
لے اڑے دل کو محبت کی روانی وہ ہے
بے پئے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

سورج کے متعلق اُن کی تڑپ کا اندازہ اس شعر سے لگائیے ؎

دل تڑپتا ہے کہ سورج کا پیغام ملے
کل ملے، آج ملے، صبح ملے، شام ملے،

اُس زمانہ میں ہوم رول کا بہت چرچا تھا، ہمارے بہت سے رہبران وطن ہوم آزادی کے حق میں تھے، بہت سے

ل آزادی کے۔ انھیں حصولِ آزادی کی ایسی تڑپ تھی
ہم آزادی ہی کی جانداری کرنے لگے تھے ؎

برطانیہ کا سایہ سر پر قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

نہ چین آئیگا بے ہوم رول پائے ہوئے
فقیر قوم کے بیٹھے ہیں لَو لگائے ہوئے

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

قوم کے لیڈروں پر اُن کی جو نظمیں ہیں، خلوص اور
سوز و گداز سے لبریز ہیں تو پال کرشن گوکھلے کے متعلق
رماتے ہیں، کتنا دردانگیز نوحہ ہے ؎

ز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے
آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھل پھول اور پتھر سے
زمیں پہ تاج گرا قوم ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں اُلٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

ہے گا رنج زمانہ میں یادگار ترا
کون دل ہے کہ جس میں نہیں مزار ترا
جو کل رقیب تھا ہے آج سوگوار ترا
خدا کے سامنے ہے ملک شرمسار ترا
پلی ہے قوم ترے سایۂ کرم کے تلے
ہمیں نصیب تھی جنت ترے قدم کے تلے

بال گنگا دھر تلک کی موت پر کیسا الم ناک سوگ کرتے ہیں ؎

اجل کے دام میں آتا ہے یوں تو عالم کو
مگر یہ دل نہیں تیار ترے ماتم کو
پہاڑ سہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو
مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

یہی وطنی نغمے اور اصلاحی ترانے ہیں کہ اردو کا کوئی نثری
یا شعری نصاب اُن کی نثر و نظم کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔
مذہبی نظمیں ہیں تو خوب ہیں، مناظرِ قدرت کا بیان کرتے
ہیں تو بڑے حسن سے کرتے ہیں، کیفیاتی و نفسیاتی تصویر
کشی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ نظم کرشن کنھیا کا ایک بند ؎

آج سوتی ہوئی دنیا کی ہے قسمت بیدار
سال بھر بعد وہ رات آئی ہے دل جس پہ نثار
یہی بجلی تھی یہی ابر یہی جوشش بہار
جب کنھیا کے جنم سے ہوئی روشن شبِ تار
قید خانہ کی سیاہی میں وہ تارا چمکا
جس سے انسان کی ہستی کا ستارا چمکا

"جلوہ صبح" کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

والشمس تھا کندہ نقش خاور کے نگیں پر
واللیل کا باقی تھا نشاں بھی نہ کہیں پر
تھی دہر کی ہلچل جو ضیا چرخ بریں پر
آنے لگا رہ رہ کے وہی نور زمیں پر

ذروں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا
پیمانۂ خورشید چھلکتا نظر آیا

رامائن کا وہ سین جب رام اپنی ماں سے بن باس کی اجازت طلب کرنے جاتے ہیں ؎

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کشمیری پنڈتوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج موہن، رتاتریہ کیفی، اور پنڈت برج نرائن چکبست اردو خدمات کے صلہ میں اپنی جلوہ تابی، خورشید اردو کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وابستہ کر چکے ہیں ...... یہ اربعہ اپنے اپنے انداز نگارش کے لحاظ سے جداگانہ حیثیت و مقام کے مالک ہیں۔ جناب چکبست کی نثر بھی بڑی متین اور سنجیدہ ہے۔ مختلف موضوعات کی اس میں جلوہ گری ہے، لالہ سری رام مولف خمخانۂ جاوید ہوں یا مولانا حسرت موہانی۔ سبھی چکبست کے زور قلم کے مداح ہیں۔ مجموعہ کلام "صبح وطن" کے نام سے اور مجموعہ مضامین نثر "مضامین چکبست" کے نام سے زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں بہ عارضہ فالج انتقال کیا۔

مشاہیر ادب نے اُن کی وفات پر سوگوار نظمیں لکھیں یہاں صرف مولانا صفی کے نوحہ چکبست درج ہیں ؎

شمع بزم شعرا۔ برج نرائن چکبست
بے قائم نہ تم سے رہ وفا کی افسوس
داغ فرقت تمہارے ادب اردو پر
زہر سفاک نے اک تازہ جفا کی افسوس
اے گل سر سبز گلشن کشمیر تجھے
راس آئی نہ ہوا دار فنا کی افسوس
موت نے خاک کے پردے میں چھپایا اسکو
ایک تصویر جو تھی ذہن و ذکا کی افسوس
کھل رہا تھا جو گل اس گل کو خزاں نے لوٹا
منزلیں طے نہ ہوئیں نشو و نما کی افسوس
ہے سیہ پوش جماعت وکلا کی صد حیف
تیرہ و تار ہے محفل شعرا کی افسوس
لکھنے بیٹھا ہے جو صفی واقعۂ درد انگیز
تھا زباں پر قلم تلخ نوا کی افسوس
سدا رہے نام اللہ کا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مناظر عاشق ہرگانوی
ہرگانواں، بربگہہ، مونگیر (بہار)

"چکبست کی وطنی شاعری"

بے کار تعلی سے ہے نفرت مجھ کو
لوں دادِ سخن، نہیں یہ عادت مجھ کو
کس واسطے جستجو کروں شہرت کی
اک دن خود ڈھونڈلے گی شہرت مجھ کو

چکبست کی یہ پیشین گوئی حقیقت کی شکل کیوں نہ اختیار کرتی جب کہ انھوں نے خود کو قوم و ملک، ادب اور شاعری کے لیے وقف کر دیا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے چکبست وکیل تھے مگر ایک طرف وہ مصلح قوم و ملک تھے اور دوسری طرف مصلح ادب بھی۔ ان کا دل قوم و ملک کی سچی دلی لوث محبت میں بے چین تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ شاعری اپنے وقت کی سچی ترجمان ہوتی ہے اور شاعر ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چکبست نے بھی اپنے دور کے سیاسی حالات و خیالات کو اپنی شاعری میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کیلئے جب سیاسی رہنما جد وجہد کر رہے تھے تو چکبست نے آگے بڑھ کر اپنی شاعری سے اسے ہر دلعزیزی بخشی ؎

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد دکھ اٹھائیں گے
یہی پیامِ وفا قوم کو سنائیں گے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفائے شوق میں گاندھی نے جس کو پہنا ہے
سمجھ لیا ہے ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
وشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پنے زمانہ کے سیاسی اور قومی واقعات کو نہایت کامیابی
شاعرانہ تاثیر اور پر جوش انداز میں بیان کرنا چکبست کا
اصہ ہے جس میں وہ رسمی لفظ پروری نہیں کرتے بلکہ اپنی
زادی رائے کا ہر جگہ خیال رکھتے ہیں ؎

نگاہ شوق کو ہے دورِ نو کی مشتاقی
نئی شراب نیا دور ہو نیا ساقی

گریزوں کی عمل داری میں نئے دور کی تمنا کھلے بندوں کرنا
چکبست کا ہی عمل ہے ؎

وطن میں بے وطن مجھ کو کیا ہے اک ستمگر نے
نہ میں ہندوستان کا ہوں نہ ہے ہندوستاں ہمارا

یہ بے چارگی چکبست جیسے خود دار اور وطن پرست شاعر
کے دل میں لاوا بھر دیتا ہے اور وہ حالات سے سمجھوتہ کرنے
کے بجائے غصے سے کہہ اٹھتے ہیں ؎

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو

بات اردو کے دوسرے وطن پرست شاعر کے یہاں
نہیں ہے۔ کیوں کہ سیاسی اعتبار سے یہ وہ زمانہ تھا جبکہ
زبان و قلم پر تالا بندی کا حکم نافذ تھا مگر چکبست نے اس
کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کا تمسخر اڑایا ہے ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ناز ہے
ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز

یہ آواز صرف چکبست کی نہیں تھی بلکہ ہر ہندوستانی کی یہ
آواز تھی، ان کے عام جذبات کی ترجمانی تھی جنھیں ادا
کرتے ہوئے وہ ڈرتے تھے لیکن چکبست ہندوستان کو
بیدار کرنے کے درپے تھا۔ وہ جوش و ولولہ سے کام لیکر
اپنی آواز ــــ دل کی آواز یہ بانگ دہل سناتے ہیں ؎

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو [illegible] میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے
یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آ کے یہ ارمان جا نہیں سکتا

چکبست کی یہ آواز، ایک سیاسی تقاضہ ہے جو آگے چل کر
آزاد ہندوستان کی حقیقت بنتی ہے۔ یہ ہوم رول منزل
مقصود تھا جس کے مضبوط متحدہ محاذ نے حکومت برطانیہ
کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ ۱۹۱۴ء سے لیکر ترقی پسند تحریک

...کے شروع ہونے تک یوں تو ہر شاعر کے یہاں یہ جذبہ سیلاب کی صورت میں دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ وہ امیدیں تھیں جو پہلی جنگ عظیم کے دوران ہم نے اپنے حاکموں سے وابستہ کر رکھی تھیں اور جن امیدوں کے صلہ میں رولٹ ایکٹ، مارشل لا اور جلیانوالا باغ جیسی دل خراش اور بہیمانہ ساعتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن انھیں دلخراش اور بہیمانہ حادثات نے ہندوستانیوں میں جدوجہد اور جوش وخروش کی نئی لہر دوڑائی، ترک موالات، رولٹ ایکٹ، مارشل لا، جنرل ڈائر اور اصلاحات نے انھیں ایک نئی واقعیت وصداقت دیدی، اُردو کے بیشتر شاعروں نے اس نئی لہر کا ساتھ دیا مگر چکبست نے انھیں جس طرح برتا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے یہاں حسن کے تصور میں آزادی کی دیوی کا روپ اور عشق کی آن بان میں جہادِ آزادی کے سپاہی کی آن بان بڑی دل کشی سے مل جل گئی ہے تبھی تو وہ کہتے ہیں کہ

آنچ تلوار کی جنت ہے سپاہی کے لئے

یا پھر یہ شعر

شورِ ماتم نہ ہو، جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہیئے قوم کے بھیشم کو چِتا تیروں کی

چکبست کے یہاں سادگی وپرکاری بھی ہے۔ ان کے وطنی شاعری فلسفیانہ رنگ سخن سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے قدسی الاصل اور دل سے نکلی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے ایسا لگتا ہے گویا چکبست کے دل ودماغ میں حب الوطنی کا ایک سیلاب ہے جو بلا روک ٹوک آگے بڑھتا جا رہا ہے اور ساری سرزمین کو اس جذبہ حب الوطنی سے سیراب کرنے والا ہے۔ زور بیان، مبالغہ، تلمیحوں کا استعمال، دلکش اور جاذب نظر تراکیب ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں

اس خاک دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آب یاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادیٔ کہن میں

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

وطن کی خاک تری بارگاہ اعلیٰ ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالا ہے

چکبست کے یہاں ملکی آزادی، اصلاح رسم ورواج، یکجہتی، رواداری اور اتحاد ومساوات کے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ اصلاح رسم ورواج اور یکجہتی و رواداری کی خیال دیکھیئے ؎

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے
طرزِ ہندو دیکھ کر رنگِ مسلماں دیکھ کر

اذاں دیتے ہیں بت خانہ میں جاکر شان مومن سے
حرم میں نعرہ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

ان کا پہلا تصور سیاسی تصور ہے اور دوسرا جغرافیائی ، رو سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی تشکیل اور بناوٹ میں پہاڑ، دریا، سمندر، شہر اور حکمراں کام کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ وطن اور حب وطن کی اصطلاح بڑی حد تک مبہم اصطلاح ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا جاندار اعتقاد ہے جس کی بنیادوں پر ہر ذرہ خاک ایک دیوتا کی صورت عام سے خراج تحسین حاصل کرتا ہے جہاں تک جغرافیائی تصور کا سوال ہے اور اس کی تشکیل اور بناوٹ میں جو عوامل کارفرما ہیں، ان کو بھی پیش نظر رکھ کر چکبست نے اپنی شاعری کو وسعت بخشی ہے۔ آصف الدولہ کے امام باڑہ پر انھوں نے گہری نظر ڈالی ہے۔

یہ سیاح اسے رات کے سناٹے میں
اسے اپنے مہ کامل نے جب (نمی) ہوتا ہے

یہی ہوتا ہے گماں خاک سے مس اسکو نہیں
ہے سنبھالے ہوئے دامن میں ہوا شاداب

یک بیک دیدہ حیراں کو یہ شک ہوتا ہے
وصل کے سانچے میں زمیں پر اتر آیا ہے سحاب

صبح سویرے اس عمارت کی سحر طرازی ملاحظہ فرمایئے۔

سپیدی سحر نور کی جلتی بتی
نیاں چھوڑ کے جب کرتے ہیں طائر پرواز

ایسے عالم میں وہ کہرے سے ابھرتا اسکا
جیسے موجوں کے تلاطم سے نمایاں ہو جہاز

فسانہ حیات کا ایک پیرایہ بیان چکبست کی جزئیات نگاری دیکھئے۔

مل گئے خاک میں سب اس کے بسانے والے
کچھ شجرہائے کہن اب ہیں پرانے دمساز

اردو شاعروں میں چکبست ہی ایک واحد شاعر ہیں۔ جنھوں نے وطن اور صرف وطن کے گیت گائے ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں جذبات عشق اور حسن کے افسانے نہیں ہیں بلکہ ملکی آزادی، اصلاح رسم و رواج یکجہتی و رواداری اور اتحاد و مساوات کے مضامین ہیں،۔ اور لہجہ کہیں بھی خطیبانہ نہیں ہے

زمیں لرزتی ہے، بہتے ہیں خون کے دریا
خودی کے جوش میں بندے خدا کو بھول گئے

●●

قاسم رضا جعفری

چکبست ایک قومی شاعر

جناب آل احمد سرور نے "تنقیدی اشارے" میں لکھا ہے "چکبست نے جن ماحول میں آنکھ کھولی وہ سرعت سے بدل رہا تھا..... کچھ لوگ قدامت پرست تھے، کچھ ایک نئی دنیا کے خواب دیکھ رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو تھوڑی اصلاح تھوڑی سی تبدیلی، تھوڑی سی رفوگری کے قائل تھے۔ چکبست اس آخری طبقہ سے تعلق رکھتے تھے"۔

سب سے پہلے ۱۸۹۶ء میں جب چکبست کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔ ایک مسدس "جلوۂ صبح" کے عنوان سے لکھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انیس سے کس قدر متاثر ہیں چکبست کے کلام کا مجموعہ "صبح وطن" ان کے رجحانات کا صحیح پتہ دیتا ہے۔ انھوں نے کسی نہ کسی عنوان سے وطنیت کے جذبات کو ابھارا ہے یا قومی احساس کو بیدار کیا ہے۔

چکبست کی شاعری میں قومیت اور وطن پرستی کے جذبات غالب ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ

نیا مسلک نیا رنگِ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

قوم (Nation) سے مراد ایک فرقہ (Community) سے لی جاتی تھی۔ مغرب سے قوم کا تصور ملک سے ایک ہونے سے آیا۔ اور یہ تصور ترقی یافتہ تصور تھا۔ اور چکبست کے یہاں قوم سے مراد ملک کے ایک ہونے سے ہے۔

چکبست وطن سے تو محبت کرتے ہی ہیں لیکن ساتھ ہی قوم کی اصلاح کرنے والے بھی ہیں۔ انھوں نے بشن نرائن سے فیض حاصل کیا گو وہ باقاعدہ حیثیت سے کسی کے شاگرد نہ تھے۔ حب وطن اور قوم پرستی چکبست کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

حب قومی ہو گیا نقش سلیمان مجھے، ایک اور جگہ کہا ہے "روشن دلِ ویرانہ ہے محبت سے وطن کی"

چکبست کے وقت میں مسز بسنٹ نے ہوم رول تحریک شروع کی۔ ہوم رول منزل مقصود بن چکا تھا۔ آئینی تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہو رہی تھیں اور حکومت برطانیہ ایک خود اختیاری حکومت کا وعدہ کر چکی تھی لیکن دقت یہ تھی کہ ہندوستانی متحد نہ تھے۔ چکبست نے اس کے لئے

نعرہ بلند کیا۔

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق گاندھی نے جس کو پہنا ہے

حب وطن پر تمام نظمیں نہایت خلوص اور دل سوزی سے
ہندوستانیوں کے لیے ہیں جس میں مذہب و ملت کی تفریق
قطعی نہیں "خاک ہند" کا ہر بند بلکہ ہر لفظ قوم پرستی کے جذبات
سے بھرا ہوا ہے۔ جب وہ بھارت ماتا کا ذکر کرتے ہیں تو
سننے والوں کا دل احترام سے وطن کے سامنے جھک جاتا
ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو

چکبست نے اکبر اور راناؔ دونوں کو ہیرو مانا ہے۔ اکبر سارے
ملک کو ایک وحدت میں باندھنا چاہتا تھا۔ اور رانا اپنی
آزادی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے یہاں وطن پرستی میں
فرقہ وارانہ تعصب کو قطعی دخل نہیں۔۔ وہ ملک کے مختلف
طبقوں اور ذاتوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتے تھے چکبست
اپنا ملک اپنے ہی وطن والوں کے ہاتھوں برباد ہوتا ہوا نہ
دیکھ سکتے تھے انھوں نے کہا ہے

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں

فریاد قوم، اس وقت تصنیف کی گئی ہے جب ہندوستانی
جنوبی افریقہ میں ٹرانسوال کے حکام کے غیر منصفانہ برتاؤ
سے عاجز تھے۔ دیکھیے اس کا ایک بند کتنا موثر ہے۔

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی
اسیر یاس بھی ہیں اور اسیر زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی
ہوئے نذر مصیبت کے دین و ایماں بھی
پڑھیں نماز تو اجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنی لہو کی گنگا میں

چکبست نے اپنی نظموں میں کسی خاص جماعت یا فرقے کو
مخصوص طور پر مخاطب نہیں کیا ہے انھوں نے اگر ہندوؤں
کو مخاطب کیا ہے تو مسلمانوں کو بھی خطاب کیا ہے مثلاً "فریاد
قوم" میں ہندوؤں کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوو ہشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

اس کے بعد مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو!
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شان حمیت کی یادگار ہو تم

عموماً چکبست کی غزلیں بھی اُن کی نظموں کی طرح.... قومیت اور وطنیت کے جذبات سے بھری ہوئی ہیں۔ چند مثالیں۔

مٹی میں گل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشنِ ہندوستاں کے ہیں

جذبہ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

"صبحِ وطن" کے تیسرے حصہ میں چکبست نے زیادہ تر انھیں بزرگوں کے مرثیے کہے ہیں جو وطن کی محبت کا جذبہ رکھتے تھے اُن کے یہ مرثیے رسمی نہیں بلکہ ان کے ادبی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں چکبست نے مرثیوں میں مرنے والوں کی خصوصیات اور کارناموں کو بھی بیان کیا ہے۔ گوکھلے کے مرثیے کا یہ شعر کتنا بلیغ ہے۔

جنازہ ہند کا گھر سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

اُن کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کے ساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ
چنے وفا کے گل حسنِ انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ
جو آج نشوونما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

چکبست کسی پارٹی کے پابند نہ تھے۔ دیکھئے بال گنگا دھر تلک کے مرثیے کا رنگ اور طرز جدا ہے۔

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار
روشنی صبحِ وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار
معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سوتی ہے کچھار
بے کسی چھائی ہے تقدیر بھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

کیسا جوش ہے کیسی خوبصورت بندش ہے اور کیسے پرشوکت الفاظ ہیں۔ لچھمن نرائن در کے نوحہ میں اُن کے فاتی اوصاف کس خوبی سے بیان کئے ہیں۔

دل محبت پہ فدا، آنکھ مروت سے غنی
مجھ کو دشمن کی بھی منظور نہ تھی دل شکنی
مگر انصاف کے حق میں ہوا گر نیش زنی
پھر نہ تھا تجھ سے زیادہ کوئی جرأت کا دھنی
خیز معرکۂ عام کی سرگرمی میں
طفل معصوم سے ملتا ہوا دل نرمی میں

ہر جگہ بلا کی روانی ہے۔ ان کے استعارے اور تشبیہیں اور مناظر سبھی ایسے ہیں جو ہندوستان اور صرف ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں اُن کی شاعری گل و بلبل، شیریں و فرہاد، لیلیٰ مجنوں کی داستان نہیں بلکہ ارجن و بھیشم، اکبر و پرتاپ، گوتم و سرد الغرض خاص ہندی رنگ ہے۔

آصف الدولہ کے امام باڑے کی نظم قابلِ غور ہے جو بے تعصبی کی بہترین مثال ہے۔

آصف الدولۂ مرحوم کی تعمیرِ کہن
جس کی صنعت کا نہیں صفحۂ ہستی پہ جواب
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمارِ فرنگ
ہے یہ تہذیبِ اودھ کیلئے سرمایۂ ناز

علیم جہانگیر

چکبست کی سیاسی شاعری

۱۸۵۷ء کا عہد آفریں انقلاب ادبی تاریخ کا ایک نہایت اہم موڑ ہے۔ غدر نے نہ صرف ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر اثر ڈالا بلکہ علمی و ادبی دنیا میں بھی ایسا انقلاب آیا کہ اردو کا شاعر اپنی فرضی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں سانس لینے لگا۔ رفتہ رفتہ اردو شاعری کے دامن میں سیاسی نظموں کو بھی جگہ ملنے لگی اور آج اردو شاعری ہر مناسب موضوع کو اپنائے ہوئے ہے۔ مغربی افکارات اور خیالات نے نئی شاعری کی بنیاد رکھی۔ جدید ادبیت کی تحریک کو پروان چڑھانے اور اسے بااثر ذی علم حلقہ کمال میں مقبول بنانے میں آزاد، حالی، شبلی، اکبر اور اقبال کا نمایاں حصہ ہے۔ نیا ادب، نئے تجربات اور نئی قدریں اپنا رنگ جما رہی تھی۔ قدامت پسندی، وضع داری اور کلاسکیت قدیم سر، یہ عزیز کو سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ قدیم رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ جدید رنگ دل و دماغ میں جلا پا رہا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ نہ تو یک لخت جدیدیت کے علم بردار بن سکتے تھے اور نہ ہی قدامت پسندی پر قائم و دائم رہ سکتے تھے۔ سرسید کی مصلحانہ کوشش سرخروئی حاصل کر رہی تھی علی گڑھ تحریک مقبولیت کا درجہ پا رہی تھی۔ حالی اپنے مخصوص انداز میں مغربی ادب کے گن گا رہے تھے۔ سجاد حسین اور ان کے ہم عصر "اودھ پنچ" کے ذریعے ان کا حال اجڑ گئے ہوئے تھے۔ غرض اہل لکھنؤ کے لئے یہ مرحلہ بڑا دشوار کن تھا کہ وہ قدیم یا جدیدیت میں سے کون سی راہ اختیار کریں۔ اس لئے یہاں کے مذاق صحیح نے یہ طے کیا کہ لکھنؤ کا قدیم ادبی سرمایہ پائمال بھی نہ ہونے پائے اور مغربی افکارات اور خیالات کی اندھا دھند تقلید بھی نہ کی جائے۔ اس کوشش کے نتیجہ میں لکھنؤ نے ادبی خصوصیات قائم رکھیں اور قدرے ضروری ترمیم و اصلاح کے بعد قدیم مذاقِ سخن اور اندازِ فکر کو زندہ رہنے کے قابل بنایا۔ اس سلسلے میں چکبست کہتے ہیں ؎

لطف شاہی کی تمنا غیر کے دل میں رہے

ہم فقیروں ہی سے زندہ لکھنؤ کا نام ہے

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں اودھ کے مشہور شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے جہاں اُن کی ذہنی شعور اور دماغی صلاحیت کی پرورش ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کیا ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کرکے وکالت کا آغاز کیا اور بہت جلد ممتاز وکلاء میں شمار کئے جانے لگے۔ ۱۹۲۶ء میں وہ ایک مقدمے کے سلسلے میں رائے بریلی سے لوٹے اسٹیشن پر فالج کا حملہ ہوا اور وہیں انتقال کر گئے۔ آخری رسومات لکھنؤ ہی میں ادا کی گئیں۔

چکبست کو بچپن ہی سے شاعری کا ذوق تھا انھوں نے اردو کے اساتذہ کے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا آتش غالب اور انیس سے بیحد متاثر تھے۔ مسدس میں انیس اور غزل میں آتش کا انداز بیان ہر جگہ نمایاں ہے۔ لیکن ان کو صرف آتش اور غالب کا مقلد کہنا ٹھیک نہیں۔ انھوں نے اسی انداز کو اختیار کرکے اپنے لئے ایک علیحدہ مقام بنایا۔ انھوں نے عموماً جذبات اور احساسات کا سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں پیش کیا۔ جس کی وجہ سے جذبات، تصنع اور مبالغہ سے آزاد ہیں جو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چکبست کو زبان اور اسلوب پر قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے غزلوں میں موقع اور محل کے اعتبار سے الفاظ کا استعمال فنکارانہ کیا ہے جس سے اثر و درد میں زور پیدا ہو گیا ہے۔ اظہار غم کے جذبات کی صداقت، احساسات کی گہرائی و گیرائی، زبان کا لوچ بیان کی نزاکت، لہجے کی درد آگینی اور کردار نگاری میں عقیدت کے جذبے اور خلوص کی فراوانی اور کیفیات کی تصویر کشی ان کے یہاں انیس کا انداز پیدا کر دیتا ہے جس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوتا ہے ؎

شہرۂ عام کو سمجھا نہ لیاقت کا صلہ
نکتہ چینوں سے شکایت نہ رقیبوں سے گلہ

دیدۂ غیر میں کھٹکی، نہ طبیعت کی جلا
تو زمانہ سے مہ نو کی طرح جھک کے ملا

عاجزی دل کی جھلکتی رہی پیشانی سے
وہ تو دریا تھا جو واقف نہیں طغیانی سے

چکبست کی شاعری میں گل و بلبل کے فرسودہ قصوں وصل و فراق کی وارداتوں، زلف و رخسار کی باتوں اور محبوب کی بے محابہ تعریف و توصیف سے پاک ہیں۔ ان میں سنجیدگی، متانت، اخلاقی نکات اور قومی جذبات ہیں۔ غالب کے علوئے تخیل، فلسفیانہ رنگ، فارسی ترکیبیں لطیف و نازک خیالات چکبست کے مذاق سخن میں ملاحظہ فرمائیں ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھی اجزا کا پریشاں ہونا

مٹا نا تھا اسے بھی جذبہ ذوق فنا تجھ کو
نشاں قبر مجنوں داغ ہے صحرا کے دامن پر

جہاں میں رہ کے قائم ہوں اپنے بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن پر

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادہ ہستی اتر جانا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

چکبست کی شاعری کی نشوونما اور ارتقا کا زمانہ ہندوستان میں ۱۹۰۵ء میں بنگال کی فرقہ وارانہ تقسیم، غیر ملکی کپڑوں کی بائیکاٹ، ۱۹۰۸ء میں تلک اور حسرت کو سزائے قید بامشقت، منٹو مارلے کی اصلاحات کی جدید قسط، تحریک خلافت، پہلی جنگ عالمگیر، ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ کی فریب اصلاحات، جلیانوالہ باغ کی خونی واردات، گوکھلے اور تلک کی قیادت، ۱۹۲۳ء میں شدھی سنگھٹن کا پرچار، ہوم رول، چوری چورا کے حادثات، سوراج کی جدوجہد، عدم تعاون اور حکم عدولی غرض ہر قسم کی سیاسی بے داری اور سیاسی تحریکات جو کشمیر سے راس کماری تک پھیلی ہوئی ہے کا عروج کا زمانہ تھا۔ اُن کی ابتدائی شاعری میں لکھنوی رنگ غالب تھا لیکن وطنی رجحانات اور مشاہدے سے وہ حقیقت آمیز شاعری کی طرف راغب ہوئے اور اُن کی شاعری میں جذبہ وطن پرستی زیادہ واضح، گہرا، بلند آہنگ اور پرسوز ہوتا گیا۔ اُنھوں نے اکثر وبیشتر غزلوں میں اس عہد کی سیاست پر تنقید بھی کی ہے۔ ذیل کے اشعار سے بخوبی پتہ چلتا ہے ؎

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پیر میں ہوں اور دل آزاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

گرد میں خم ہیں ندامت سے دلآزاروں کی
رہ گئی بات زمانے میں وفاداروں کی

ہندوستان میں قومیت کا تصور اصلاحات کے محدود دائرے سے نکل کر نظام حکومت میں دخل اور اختیارات کے مطالبے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں ایک ایسی جماعت عمل میں آچکی تھی جو ملک کو متحدہ رکھنے حب الوطنی کے جذبات ابھارنے کے ساتھ ساتھ ذہنی اور سیاسی بیداری کی جدوجہد میں منہمک تھی اس کے نتیجے میں ایک طرف ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ کو اختیارات کے حصول اور آزادی کے مطالبے سے دلچسپی پیدا ہوتی جا رہی تھی تو دوسری طرف زندگی اور ادب پر قومی اور سیاسی تصورات کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی ہر چیز اور ہر بات کو اسی عہد کے رجحانات اور میلانات کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جا رہا تھا۔ چکبست بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے جذبہ وطن پرستی اور جوش اُن کی شاعری کا محرک بنا، اور اُنھوں نے آزادی وطن کے حب قومی کا صور پھونکنا شروع کیا۔

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

جب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

اُن کی شاعری میں قومی جذبے کی فراوانی اس حد تک ہے کہ چکبست کی آواز پوری قوم کی دل کی آواز بن جاتی ہے۔ ان کا دل خدمت قوم سے لبریز تھا وہ قوم کی جذبۂ حمیت بیدار کرنے، ان کو صحیح مقام دلانے اور قوم کا

ر بلند کرنے کیلئے قوم کے نوجوانوں سے یوں مخاطب
ہوگئے ہیں ؎

ں نوجوانان وطن خواب سے بیدار ہو اب
ہو چکے رات بھی آخر ہوئی ہشیار ہو اب
سحر نوردفا کے لیے تیار ہو اب
درد دل کچھ مجھے کہنا ہے خبردار ہو اب
بے خودی دل کی ہے تصویر بیاں میری
مرثیہ قوم کا ہے اور زباں میری

طن کی محبت چکبست کے رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔
یہاں کے ذرے ذرے سے انھیں بے پناہ عقیدت تھی
عظمت ہند کے بارے میں کہتے ہیں ؎

اے خاک ہند تری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض تیرے ملئے رواں ہے

چکبست مصلح اقوام اور معتدل مزاج شاعر تھے انھوں
نے پیشہ وکالت کے ساتھ سیاست اور سماجی اصلاحات
کو اپنا مسلک بنایا۔ سیاست میں ان کا رجحان اعتدال
پسند تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں۔

"وہ آزادی کا دلدادہ ہے مگر بے لگامی کا روادار
نہیں۔ وہ سچا لبرل ہے اور اس راستے پر چلنے والا
ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار
سے زیادہ تیز ہے جس کا دوسرا نام اعتدال ہے"[1]

چکبست نے مرثیوں میں ان خوبیوں اور صفات کو بھی
یاد کیا ہے جن کا تعلق وطن یا وطن کی سیاسی، سماجی
اور اصلاحی تحریکات سے تھا۔ ذیل کے اشعار سے انکے
اعتدال پسندانہ سیاسی رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے ؎

بڑھی ہوئی تھی نحوست زوال کے بہم کی
ترے ظہور سے تقدیر قوم کی چمکی
چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کیساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کیساتھ
رہا مزاج میں سودا اے قوم خو ہو کر
وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہو کر!
حدیث قوم بنی تھی زبان کے لیے
زباں ملی تھی محبت کی داستاں کیلئے

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اعتدال پسند تحریک
کا مسلک نظام حکومت میں اصلاحات کے مطالبے کی
حدود تک رہا۔ اس تحریک کو برطانوی حکومت کی
ہمدردیاں حاصل تھیں۔ گوکھلے کی موت پر برطانوی حکومت
کا تعزیتی پیغام اس بات کا بین ثبوت ہے جسکا اشارہ
چکبست نے اس طرح کیا ہے کہ اعتدال پسند تحریک کے
حامیوں کے ساتھ سامراج کے ابتدائی عہد کی عکاسی
ہوتی ہے ؎

غریب ہند نے تنہا نہیں یہ رنج سہا
وطن سے دور بھی طوفان رنج و غم رہا
عجیب کیا ہیں حریفوں نے زباں سے کہا
سفیر قوم، جگر بند سلطنت نہ رہا
پیام شہ نے دیا رسم تعزیت کیلئے
کہ وہ ستون تھا ایوان سلطنت کیلئے

بیسویں صدی کی ابتدا میں اعتدال پسند سیاسی رجحان کے
ساتھ انتہا پسند سیاسی رجحان نے بھی جنم لیا اس جوش
و خروش اور ابال کا اندازہ تلک کے اس مرثیے سے لگائیے ؎

خدا نگہبان وطن جذبہ عام ترا
نہ ڈگیں پاؤں لپٹا قوم کو پیغام ترا
دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ کام ترا
نیند سے چونک پڑے سن لیا جب نام ترا
یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا اب چین سے سو جائیں گے

مجموعی طور پر چکبست نے قدیم اور جدید کے حسین امتزاج کے ایسے پر اثر اور دردناک اشعار کہے کہ دل کی دھڑکنیں ان کے قلم کی جنبش سے شعر و نغمہ کے قالب میں ڈھل گئے اس طرح آزادی وطن کی تڑپ، جرأت اظہار اور واقعہ نگاری میں انھوں نے کسر نہ چھوڑی ہے

دل کے تسخیر بخش فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے
قوم کا غم مول لیکر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے نہ رہے
جو مانگنا ہو ابھی مانگ لو وطن کے لیے
یہ آرزو کی جوانی رہے نہ رہے

غرض انھوں نے سیاسی قومی تحریکوں، اصلاحوں اور سانحوں کو نئی کیفیت کے ساتھ پیش کیا۔ وہ حسن و عشق کے راگ کم الاپتے ہیں۔ وطن بیداری ان کا خاص موضوع رہا ہے جس میں اس عہد کی بھرپور عکاسی ملتی ہے مگر وہ ایک طرف مغرب کے جدید خیالات کو پسند کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کو مشرقی روایات بھی عزیز ہیں۔ بعض جگہ ان کا رنگ ناصحانہ ہو گیا ہے لیکن اس رنگ میں بھی ایک وارفتگی کی کیفیت پائی جاتی ہے منظر نگاری کے لئے انھوں نے اپنے ہی وطن کی چیزوں کو منتخب کیا۔ جس کی وجہ سے ایک خاص وصف پیدا ہو گیا ہے۔

چکبست نے موجودہ عہد کی سیاسی اور قومی واقعات کو کامیابی اور شاعرانہ تاثرات کے ساتھ پیش کیا ہے ان کا مضامین کا مجموعہ "مضامین چکبست" کے عنوان سے شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں کی زینت بن چکا تھا ان کی نظموں کا مجموعہ کلام "صبح وطن" کا عنوان بھی ان کی حب الوطنی اور پاک نظری پر دلالت کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی جنگ آزادی اور اردو زبان کی خدمات کے سلسلے میں ان کے ادبی کارنامے لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہیں۔

● ●

بہ سلسلہ مضمون صفحہ ۱۲۶

۱۹۱۸ء میں نالۂ یاس کے عنوان سے ایک نظم چکبست نے لکھی تو دیکھئے یہاں بھی قوم کے دکھ درد سے بے خبر نہیں۔

کیا کہیں کس سے کہیں ہم آج کیا کہنے کو ہیں
آخری افسانۂ شوق و وفا کہنے کو ہیں
جن امیدوں کی لڑکپن میں ہوئی تھی ابتدا
آج اس کی انتہا کا ماجرا کہنے کو ہیں
بے خبر اب بھی نہیں ہم قوم کے دکھ درد سے
چپ ہیں ہمت تھی دوا کی اب دعا کہنے کو ہیں

سربلند کرنے کیلئے قوم کے نوجوانوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ؎

ہاں نوجوانان وطن خواب سے بیدار ہو اب
سو چکے رات بھی آخر ہوئی ہشیار ہو اب

سحر نور وفا کے لیے تیار ہو اب
درد دل کچھ مجھے کہنا ہے خبردار ہو اب

بے خودی دل کی ہے تصویر عیاں ہے میری
مرثیہ قوم کا ہے اور زباں میری

وطن کی محبت چکبست کے رگ و پے میں بسی ہوئی تھی۔ یہاں کے ذرے ذرے سے انھیں بے پناہ عقیدت تھی عظمت ہند کے بارے میں کہتے ہیں ؎

اے خاک ہند تری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض تیرے ملئے رواں ہے

چکبست مصلح اقوام اور معتدل مزاج شاعر تھے انھوں نے پیشہ وکالت کے ساتھ سیاست اور سماجی اصلاحات کو اپنا مسلک بنایا۔ سیاست میں ان کا رجحان اعتدال پسند تھا۔ ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں۔

"وہ آزادی کا دلدادہ ہے مگر بے لگامی کا روادار نہیں۔ وہ سچا لبرل ہے اور اس راستے پر چلنے والا ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے جس کا دوسرا نام اعتدال ہے"

چکبست نے مرثیوں میں ان خوبیوں اور صفات کو بھی یاد کیا ہے جن کا تعلق وطن یا وطن کی سیاسی، سماجی اور اصلاحی تحریکات سے تھا۔ ذیل کے اشعار سے انکے اعتدال پسندانہ سیاسی رجحانات کی عکاسی ہوتی ہے ؎

بڑھی ہوئی تھی نحوست زوال کے پہر کی
ترے ظہور سے تقدیر قوم کی چمکی

چنے رفاہ کے گل حسن انتخاب کیساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کیساتھ

رہا مزاج میں سودا اے قوم خو ہوکر
وطن کا عشق رہا دل کی آرزو ہوکر!

حدیث قوم بنی تھی زباں کے لیے
زباں ملی تھی محبت کی داستاں کیلئے

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اعتدال پسند تحریک کا مسلک نظام حکومت میں اصلاحات کے مطالبے کی حد حد تک رہا۔ اس تحریک کو برطانوی حکومت کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ گوکھلے کی موت پر برطانوی حکومت کا تعزیتی پیغام اس بات کا بین ثبوت ہے جسکا اشارہ چکبست نے اس طرح کیا ہے کہ اعتدال پسند تحریک کے حامیوں کے ساتھ سامراج کے ابتدائی عہد کی عکاسی ہوتی ہے ؎

غریب ہند نے تنہا نہیں یہ رنج سہا
وطن سے دور بھی طوفان رنج و غم رہا
حبیب کیا ہیں حریفوں نے زباں سے کہا
سفیر قوم، جگر بند سلطنت نہ رہا

پیام شہ نے دیا رسم تعزیت کیلئے
کہ تو ستون تھا ایوان سلطنت کیلئے

بیسویں صدی کی ابتدا میں اعتدال پسند سیاسی رجحان کے ساتھ انتہا پسند سیاسی رجحان نے بھی جنم لیا اس جوش و خروش اور ابال کا اندازہ تلک کے اس مرثیے سے لگایئے ؎

تھا نگہبان وطن وہ بہ عام ترا
سنڈ گیں پاؤں پہ تھا قوم کو پیغام ترا

دل رقیبوں کے لرزتے تھے یہ کام ترا
نیند سے چونک پڑے یہ سن لیا جب نام ترا

یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا اب چین سے سو جائیں گے

مجموعی طور پر چکبست نے قدیم اور جدید کے حسین امتزاج کے ایسے پر اثر اور درد ناک اشعار کہے کہ دل کی دھڑکنیں ان کے قلم کی جنبش سے شعر و نغمہ کے قالب میں ڈھل گئے اس طرح آزادی وطن کی تڑپ، جرأت اظہار اور واقعہ نگاری میں انھوں نے کسر نہ چھوڑی ؎

دل کے تسخیر بخشش فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

قوم کا غم مول لیکر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے نہ رہے
جو مانگنا ہو ابھی مانگ لو وطن کے لیے
یہ آرزو کی جوانی رہے نہ رہے

غرض انھوں نے سیاسی قومی تحریکوں، اصلاحوں اور سانحوں کو نئی کیفیت کے ساتھ پیش کیا۔ وہ حسن و عشق کے راگ کم الاپتے ہیں۔ وطن بیداری ان کا خاص موضوع رہا ہے جس میں اس عہد کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اگر وہ ایک طرف مغرب کے جدید خیالات کو پیش کرتے ہیں تو دوسری طرف اُن کو مشرقی روایات بھی عزیز ہیں۔ بعض جگہ ان کا رنگ ناصحانہ ہو گیا ہے لیکن اس رنگ میں بھی ایک وارفتگی کی کیفیت پائی جاتی ہے منظر نگاری کے لئے انھوں نے اپنا ہی وطن کی چیزوں کو منتخب کیا۔ جس کی وجہ سے ایک خاص وصف پیدا ہو گیا ہے۔

چکبست نے موجودہ عہد کی سیاسی اور قومی واقعات کو کامیابی اور شاعرانہ تاثرات کے ساتھ پیش کیا ہے ان کا مضامین کا مجموعہ "مضامین چکبست" کے عنوان سے شائع ہو کر علمی و ادبی حلقوں کی زینت بن چکا تھا اُن کی نظموں کا مجموعہ کلام "صبح وطن" کا عنوان بھی اُن کی، حب الوطنی اور وسیع نظری پر دلالت کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی جنگ آزادی اور اردو زبان کی خدمات کے سلسلے میں ان کے ادبی کارنامے لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہیں۔

بہ سلسلہ مضمون صفحہ ۱۴۶

۱۹۱۸ء میں نالۂ یاس کے عنوان سے ایک نظم چکبست نے کہی تو دیکھئے یہاں بھی قوم کے دکھ درد سے بے خبر نہیں۔

کیا کہیں کس سے کہیں ہم آج کیا کہنے کو ہیں
آخری افسانہ شوق وفا کہنے کو ہیں
جن اُمیدوں کی لڑکپن میں ہوئی تھی ابتدا
آج اُس کی انتہا کا ماجرا کہنے کو ہیں
بے خبر اب بھی نہیں ہم قوم کے دکھ درد سے
پہلے ہمت تھی دوا کی اب دُعا کہنے کو ہیں

چکبست اے محبِ وطن

جعفر ملیح آبادی

چکبست اے محبِ وطن، جانِ لکھنؤ بے مثل و بے نظیر سخندانِ لکھنؤ
سرمایۂ وقارِ ادیبانِ لکھنؤ کرتا ہے تجھ پہ ناز دبستانِ لکھنؤ

ہے سازِ حریت کی نوا تیری شاعری
پیغامِ عشق و درسِ وفا تیری شاعری

آیا تھا تو وطن کو جگانے کے واسطے شمعِ خلوص و مہر جلانے کے واسطے
نفرت کی تیرگی کو مٹانے کے واسطے آئینِ اتحاد سکھانے کے واسطے

انسانیت کے گیت تھے تیری زبان پر
ناقوس پر نثار تھا قربان اذان پر

جب تھا وطن میں ابرِ غلامی گھرا ہوا چھائی ہوئی تھی نکبت و ادبار کی گھٹا
تھی قوم درد و رنج و مصائب میں مبتلا اس حالِ زارِ ہند پہ دل تیرا رو دیا

اُٹھا جو سر میں قوم کا سودا لئے ہوئے
آزادیِ وطن کی تمنا لئے ہوئے

تو نغمۂ حیات سُنا کر، چلا گیا اُردو زباں کی شان بڑھا کر چلا گیا
ایوانِ شاعری کو سجا کر، چلا گیا ہر سو نئے چراغ جلا کر، چلا گیا

مرغِ سخن کو قوتِ پرواز مل گئی
سازِ ادب کو اک نئی آواز مل گئی

سید فرحت حسین، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ

رُوحِ چکبست کا پیام

اٹھارویں صدی کے اختتام سے شمالی ہند کے شعرا میں جو سیاسی شعور پیدا ہو چلا تھا اُسی کی جھلک میرؔ، سوداؔ حاتمؔ اور غالبؔ کی غزلوں، ہجویات، شہر آشوب اور قصائد میں مل جاتی ہے نظیرؔ کے یہاں تو یہ شعور بہت واضح ہے لیکن ان کا مقصد اور نوعیت جداگانہ تھی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں غیر ملکی تسلط کے ردعمل کے طور پر جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی اُس کی بدولت ہماری تہذیبی اقدار اور فکری معیار میں زبردست انقلاب آیا۔ راجہ رام موہن رائے اور سرسید کی اصلاحی تحریکات نے قوموں کے سوچنے کا ڈھنگ بدل دیا۔ چنانچہ شعروادب، جو اپنے زمانے کا عکاس اور اپنے ماحول کی زبان ہوتا ہے، اسمیں بھی نئے تجربات اور نئے مشاہدات کا رجحان پیدا ہوا حالی نے مسدس کے ذریعے اُردو میں قومی شاعری کی پہلی آواز بلند کی۔ یہ آواز اتنی بلند اور اتنی پُرتاثیر تھی کہ اکبرؔ، اقبالؔ، چکبستؔ، جوشؔ اور فیض احمد فیضؔ تک، اس کی گونج سنی جا سکتی ہے۔ حالیؔ کی مسدس سرسید کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر ابھرنے والے قومی شعور کا شاہکار ہے .... اس لیے اس سے ایک مخصوص ذہن کی نمائندگی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن یہ شعور قومی بھی حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہے

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد نے زیادہ زور پکڑا تو سارے ہندوستانی ادب پر انقلابی کیفیت اور اضطراری وجدان کی فضا چھا گئی۔ ٹیگور کے نغموں اور نذرالاسلام کی صدائے انقلاب کے ساتھ اردو ادب میں حالیؔ کے بعد چکبستؔ کی "صبح وطن" طلوع ہوئی۔

انیسویں صدی کے ربع آخر سے ہندوستان کی آزادی تک کے عرصے میں اردو زبان نے جو ادب پیدا کیا اُس میں، حب الوطنی کے علاوہ متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے چشمے اُبلے پڑے ہیں۔ آزادی کے بعد پھر اُسی قومی اور

تہذیبی وحدت کے لیے ادھر اُدھر نظر دوڑائی جارہی ہے لیکن وہ زبان درخور اعتنا ہے جس کو برج نرائن چکبست جیسے قومی شاعروں نے اپنے تہذیبی، سماجی اور ثقافتی احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنا کر ہندوستانی کلچر کا ترجمان بنایا۔ اکثریت کو یہ غلط فہمی ہے کہ اردو مسلمان کی زبان ہے اس کے ازالے کے لیے چکبست کی شاعری کو پیش بھی کیا جاسکتا ہے اور نقش راہ بھی بنایا جاسکتا ہے

چکبست اس دور کے شاعر ہیں جب اردو ادب کا قافلہ ایک نئے شعور کے ساتھ نئی جہت کی طرف رواں دواں تھا اور اس کی شاعری کو اقبال کے ذریعے معراج مل چکی تھی۔ تحریک آزادی کا جذبہ موجزن تھا اور ملک میں متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کا نظریہ ابھر رہا تھا۔ یہ بات مسلم ہے کہ قومی اور تہذیبی وحدت کی بنیاد مشترک زبان پر آسانی سے کھڑی کی جاسکتی ہے۔ چکبست نے حالی کے مخصوص ذہن کے قومی شعور اور اقبال کے مخصوص فلسفیانہ افکار سے روشنی لے کر اپنے تہذیبی افکار کو دیو مالائی استعارات و تلمیحات کی خوب صورتی کے ساتھ اپنی شاعری میں اس فنکارانہ طریقے سے سمو دیا کہ اردو کو مشترکہ تہذیبی سرمائے کی توانائی مل گئی۔ اسطرح چکبست نے وقت کے تقاضے اور ضرورت کے تحت اردو شاعری کو ایک نئی راہ پر ڈالنے کی ابتدا کی۔

چکبست کی حب الوطنی سے سرشار شاعری میں کسی کو کلام نہیں اور ان کی فنی حیثیت میرے زیر بحث نہیں۔ میری نظر میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو اپنے طبقے کی مذہبی اقدار سے پرے ثقافتی محسوسات کے استعارے اور تہذیبی افکار کے عناصر سے مالا مال کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف قوموں نسلوں، تہذیبوں اور نظریات کی آمیزش و آویزش سے اردو زبان کی پیدائش، پرورش اور ارتقا ہوا۔ کوئی زبان صرف شعری غنائیت کے بل بوتے پر پروان نہیں چڑھتی، مذہبی نیم مذہبی اور قدیم تاریخی عظمت داستانیں بھی اس کے ارتقا اور مقبولیت کا باعث ہوتی ہیں۔ جس اختلاطی ضرورت کے تحت اس زبان کا نشو نما ہوا، چکبست نے اسی تہذیبی ارتباط کی ہم آہنگی خوبصو عطا کی۔ انیس و دبیر نے واقعات کربلا کے مرثیے لکھ کر اردو شاعری میں تاریخ کے عظمتی بیان، ڈرامائیت اور تاثیر سازی کا راستہ دکھایا، چکبست نے مہابھارت اور رامائن کے عظیم واقعات کو اردو شاعری کا قالب دے کر یہ ثابت کیا کہ یہ زبان تمام مذاہب کے جواہر ریزوں سے تابناک ہے۔ اس میں کربلا کا سوز و گداز بھی ہے اور رام چندر جی کی عظمت اور سیتا کی پاکیزگی کا جلوہ بھی۔ کرشن کنھیا کے جنم دن پر ایک نظم کے اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

کشتی فکر بھی جاتی ہے جمنا کی طرف
دل مرا کھینچ رہا ہے مجھے متھرا کی طرف

شوخ طرار حسین چھوکریاں گوکل کی
چلی آتی ہے صراحی لئے جمنا جل کی

تھا جو دنیا کو رہِ راست پہ لانا منظور
ہو حسن نے کیا قالبِ خاکی میں ظہور
جو ملی رحمتِ حق سے فیض و کرم سے معمور
ظلمتِ جہل مٹانے کو بڑھا چشمۂ نور
پردۂ غیب سے متھرا کے چمن تک پہونچا
بڑھ کے متھرا سے کروکشیتر کے رن تک پہونچا

رامائن کے ایک منظر میں جب رامچندر بن باس جانے کیلئے ماں سے اجازت لینے گئے تو ماں کو اداس اور گم سم بیٹھی دیکھ کر کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہوئی اور چپ کھڑے رہے آخر ماں نے کہا۔

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

ان اشعار میں الفاظ کی خوبصورت بندش کے ساتھ چکبست نے جو استعاراتی معنویت ان کو دی ہے وہ اس تہذیب کی نمائندگی کے حامل بن گئے میں جس کے چکبست ایک فرد ہیں۔ ایک دوست کی شادی میں شرکت نہ کر سکنے پر جو دعائیہ معذرت نامہ منظوم کیا اس کچھ اشعار دیکھیے۔

جن کے اعمال میں مذہب کی لطافت نہیں خاک
ان کے قدموں سے نہ یہ پاک ہوں ہوں ناپاک
بس محبت کے فرشتے کی دعا کافی ہے
آگ کے سامنے پیمانِ وفا کافی ہے

شوق سے محبت کی ہوائیں کھل جائیں!
جس طرح راگ سے لے ملتی ہے دل یوں مل جائیں

جنوبی افریقہ میں جب ہندوستانیوں پر حکومت وقت کی ظالمانہ کاروائیاں ہو رہی تھیں تو چکبست نے اس درد سے متاثر ہو کر قوم کو بیدار کرنے کیلئے "فریاد قوم" تصنیف کی۔ کچھ اشعار یہ ہیں۔

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندو ہشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار!
مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

یورپ کی جنگ عظیم میں ہندوستانی سپاہیوں کی فوج جرمنی کے خلاف محاذ جنگ پر روانہ ہوئی تو "قوم کے سورماؤں کی الوداع" میں چکبست کی تہذیبی تمثیل نگاری دیکھیے۔

جس گھڑی معرکۂ جنگ میں ہو تیغ علم
سورما لڑتے ہیں اسطرح پکارے عالم
دل ہو ارجن کا جگر بھیشم کا انگد کا قدم
موت کے وقت نظر میں ہو شبیہ بھیشم
جس کا قابو نہ ہٹا موت کی تدبیروں پر
سایۂ تیغ میں آرام کیا تیروں پر

چکبست نے تمثیل نگاری اور منظر کشی میں جن تہذیبی علامات سے کام لیا وہ ان سے پہلے کے شاعروں سے اگرچہ مختلف ہیں لیکن بندش، معاملہ بندی اور تاثر میں

وہی کیفیت وہی وجدان اور اسی طرح کا سحر ہے۔ ایک اصلاحی نظم "پھول مالا" میں لڑکیوں سے خطاب کیا ہے۔ ذیل کا شعر دیکھیے جو ایک پر مغز نصیحت اور ایک مکمل تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔

دل تمہارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لیے
اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز

چکبست نے سیاسی اور مذہبی لیڈروں کی موت پر نوحہ خوانی بھی کی ہے اور گائے کی تقدیس اور نوجوانوں سے خطاب کو بھی شعری سانچوں میں ڈھالا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چکبست نے انیس و دبیر کے مرثیوں، حالی کے مسدس اسلوب اور اقبال کی شاعرانہ فنکاری سے ایک ساتھ ذہنی غذا حاصل کی۔ سپاہیوں کے نام نظم انیس کے مرثیاتی اتار چڑھاؤ اور ڈرامائی دلکشی سے مرصع ہے۔ پھول مالا میں لڑکیوں سے خطاب حالی کے پیروی ہے نیز تمام شاعرانہ کاوش مسدس کا اسلوب لئے ہوئے ہے۔ الفاظ کی بندش، تکلمانہ انداز بیان اور فکری شعور میں اقبال کا تتبع جھلکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان اساتذہ سخن نے اپنے تہذیبی ورثے کو اردو، شاعری کے قالب میں ڈھالا اور چکبست نے اپنی تہذیب کو اردو شاعری کا روپ دیا۔ اردو ادب پر اسلامی، تہذیب کا پرتو زیادہ نمایاں تھا اس لیے میرا خیال ہے کہ توازن برقرار رکھنے کے لئے چکبست نے دانستہ طور پر ایسے مضامین خیال کو اپنی شاعری میں درکیا اور ان الفاظ واستعارات کا استعمال کیا جو ان کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ زبان صحیح معنوں میں تمام ہندوستانی قوموں کی نمائندہ زبان ہونے کا مقام حاصل کرلے۔

چکبست ایسا دردمند دل رکھتے تھے جس کی آنچ قوم کے دلوں کو گرمانے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے درمیان اتحاد و یگانگت پیدا کرتی ہے انھوں نے ایسے متوازن اشعار بھی کہے ہیں جن سے ایک ملی جلی تہذیب کا گمان ہوتا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

ابتک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے

اذاں دیتے ہیں بتخانہ میں جا کر شان مومن سے
حرم میں نعرہ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

غالباً چکبست کے اسی رنگ اور خصوصیت کی وجہ سے اقبال کی رائے تھی کہ چکبست کا دل مومن اور دماغ کافر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چکبست لکھنوی دبستان کی روایت کے مطابق قدامت پسند ہونے کی وجہ سے اپنی تہذیب اور معاشرت سے بھی دلی لگاؤ رکھتے تھے اور اردو ادب سے بھی۔ وہ اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو قدیم وجدید کے سلسلوں کو ملانے والی ایسی کڑی سمجھی جاتی ہے جس نے قومی، تہذیبی اور لسانی وحدت کے نظریئے کو

[illegible] تھا یا۔ چکبست نے اپنی شعری اقدار کا معیار [illegible] وطن سے محبت کو بنایا تھا۔ ان کے فن اور فکر کی محدودیت انھیں وطن سے باہر نہیں نکلنے دیتیں اور یہ حدود اتنی مضبوط اور اتنی بلند ہیں کہ نوعِ انسانی کے تمام تہذیبی سرچشموں کو وطن کے سمندر میں گرتا ہوا دیکھنا چاہتی ہیں تاکہ ان کا چمنستانِ وطن گلہائے رنگا رنگ سے رنگین، معطر اور حسین بنا رہے اور کسی گلچیں کا خوف و خطر باقی نہ رہے۔

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے
نہ کوئی مرغِ خوش الحاں اسیرِ دام رہے
سریرِ شاہ کا اقبال ہو بہارِ چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدارِ چمن

اور اس آرزو کی تکمیل کے لیے ہوم رول ایکٹ کے سلسلے میں "آوازۂ قوم" میں چکبست نے اہلِ وطن کو یہ پیام دیا ہے؛

اسی کے مست کہیں ہیں حرم پہ چھائے ہوئے
اذاں کے نعرۂ دلکش سے خط اٹھائے ہوئے
کہیں ہے نغمۂ ناقوس دل لبھائے ہوئے
اسی فضا میں یہ سب راگ ہیں سمائے ہوئے
یہ حکمِ پیرِ مغاں کا ہے نشہ مے میں
یہ راگ آ گئے ملیں ہوم رول کی لے میں
رقیب کہتے ہیں رنگِ وطن نہیں یکساں
بنا ہے قوس و قزح خاکِ ہند کا داماں
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں۔
نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ ربا
جو ہوم رول پہ یہ چشمِ شوق شیدا ہو
تمام رنگ ملیں ایک نور پیدا ہو

اگر ہوم رول کی معنویت کو وسعت دے دی جائے تو آج ملک اور قوم کی درپیش مسائل اور وقت کے تقاضوں کی روشنی میں چکبست کے پیام کی ازلیت میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔

●●

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

برج نرائن چکبست

چکبست نے قدیم اقدار کی افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے سیاسی شعور یا جذبات کی ترجمانی کے لیے شاعری اختیار کی اور نظم اور غزل کو بھی ضروری سمجھا۔ چکبست کا زمانہ ۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۶ء ہے جب کانگریس کی تحریک کافی زور پکڑ چکی تھی اور انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے کیلئے ایسے تدابیر کئے جاتے تھے جو خاموش ضرور لیکن ٹھوس اور با اثر تھے۔ چکبست کے شاہکار، حب الوطنی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ہمارے جدید ادب میں ان کے مضامین، نظمیں اور غزلیں ایک ایسا مختصر لیکن جاندار سرمایہ ہیں کہ کچھ ادیبوں کے شاہکار بھی آسانی سے ساتھ ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

چکبست حالی کے حامی ہیں ان کی رائے میں زمانہ کے ساتھ اردو شاعری کو بھی نیا لباس بدلنا چاہیئے لیکن وہ حالی کی سادہ نگاری اور مقصدیت کو پوری طرح سے اپنانے کے لئے تیار نہیں نظر آتے وہ تخلیق ادب میں روحانی سرور، اور شاعرانہ لطافت، کے متلاشی ہیں۔ وہ انگریزی ادب کے اس لطیف پہلو اور افادی نظریہ کی قدر کرتے ہیں جس میں سچے جذبات کے ساتھ انداز بیان کی لطافت اور نزاکت بھی ہوتی ہے وہ خیالات و زبان دونوں کو بنیادی عناصر سخن سنجی سمجھتے ہیں

انھوں نے روز مرہ کے الفاظ کو اپنی غزلوں میں سمونے کی کوشش کی۔ ان کے کلام میں زیادہ رنگینی اور درد ہے اور انسانی جذبات و محسوسات پر اس کا اثر بہ نسبت انسانی دماغ کے زیادہ پڑتا ہے وہ ملک و قوم میں نئے اسلوب حیات۔ نئی روشنی اور نئے انداز فکر کے مروج کرنے میں کوشاں ہیں۔ وہ زیادہ تر اخلاقی مضامین باندھتے ہیں عشق و محبت کا بیان بھی ہوتا ہے مگر ان کے یہاں محبت کا اظہار ملک و قوم کے لیے ہوتا ہے یہی وجہ ہے حب وطن و جذبہ آزادی کی مثالیں ان کے یہاں بکثرت ملتی ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام "صبح وطن"

کے پیش نظر ہم اُن کی شاعری کا عمیق جائزہ لیتے ہیں
چکبست کی پیدائش ۱۸۸۲ء میں فیض آباد،
(یو۔پی) میں ہوئی انھوں نے لکھنؤ کیننگ کالج میں تعلیم
حاصل کی اور وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ ۹ سال
کی عمر ہی سے غزل کہنے لگے تھے۔ ان کی پوری شاعری
آہ ہے اور مرثیہ کا رنگ اختیار کئے ہوئے ہے اُن کے
مسدس پر انیس کا رنگ غالب ہے لیکن خیالات
مختلف ہیں۔ سلاست زبان بندش الفاظ اور حسن
ترکیب میں وہ اپنے ہم عصروں سے کافی آگے نکل گئے
ہیں۔ اُن کی شاعری پر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کی مہر لگی
ہوئی ہے وہ ایسے معشوق کی تعریف نہیں کرتے جس کا
صرف تخیل ہی ہو۔ راست بازی کی مثالیں اقبال کی طرح
چکبست کے یہاں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ چکبست کے یہاں
آتش کا رنگ نمایاں ہے۔ چکبست دور جدید کے رہنما
ہیں جنھوں نے حب الوطنی اور مذہبی شاعری کا اُردو
ادب میں جادو جگایا ہے اُن کا انتقال ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء
کو رائے بریلی میں ہوا۔

چکبست کو کوئی گذشتہ یا حال کا تاریخی واقعہ سخن
سنجی کیلئے مجبور کر دیتا ہے اور کبھی کوئی قدرت کا نظارہ یا
مذہبی راز اُن کے جذبات کو متحرک کر دیتا ہے وہ انسانی
جذبات اور احساس کی سچی تصویر کھینچ کر قوم کو سبق دیتے
ہیں۔ قومیت اور ہندوستانیت کا خیال اُن کی شاعری
کا عظیم جز ہے۔

یہ چکبست کا عظیم کارنامہ ہے کہ انھوں نے ہندو
مذہب کی روایات اور ویدک فلسفہ کو اردو ادب میں
ڈھالنے کی کوشش کی ہے اُن کی نظم "رامائن کا سین"
ایک مثالی نظم ہے جو ہر قاری کے دل میں انسانی جذبات
و تاثرات پیدا کر دیتی ہے۔ انھوں نے جم اصلی اور
گانے پر بھی سلیس اور پر مغز نظمیں کہی ہیں اب ہم رامائن
کے سین کے آئینہ میں اُن کے جذبات کا جائزہ لیتے ہیں
اس نظم میں چکبست نے انسانی نفسانیت کا کمزور پہلو
چھوا ہے اور ماں کی ممتا کو اپنے الفاظ میں مکمل طور سے
اتار دیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

چہرے کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

ماں کو سب سے زیادہ عزیز اس کی اولاد ہوتی ہے اس
کو جاہ و حشم نہیں چاہیئے۔

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کسی سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

شدید غم میں بھی کچھ چارہ گری کے آثار نمایاں ہو جاتے
ہیں اور یہی انسانی فطرت ہے۔ انسان اپنے غم کو کسی نہ
کسی فلسفہ سے منسوب کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

لیکن بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اُجڑ گیا

تو وہ آلام جب سر پر پھٹ پڑتا ہے تو انسان اپنے فلسفہ جبر و اختیار کو ناچار سپرد کر دیتا ہے اور اپنے تمام سانحات و واقعات کو پروردگار عالم سے منسوب کر دیتا ہے۔

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی جانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

رنج و غم میں خداوند کریم کو اپنی سپردگی۔ انسان میں الم برداشت کرنے کی جرأت پیدا کرتی ہے

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامن مادر سے کم نہیں

اس نظم میں چکبست نے انسانی جذبات و احساسات کا اچھوتے ڈھنگ سے نقشہ کھینچا ہے۔ یہ نظم ہر ذی حس انسان کا دل جھنجھوڑ دیتی ہے۔ میں جب درجہ ہشتم میں یہ نظم پڑھتا تو آنسو نکل آتے تھے اور آج بھی آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ یہ سچی ممتا کی سچی عکاسی ہے۔

چکبست کی دوسری مذہبی نظم کرشن کنھیا ہے جو جنم اشٹمی کے موقع پر کہی گئی ہے۔ اس نظم میں کرشن جی کی تعلیم یعنی کرم یوگ پر زیادہ زور دیا گیا ہے

روح دنیا کی مسافر ہے اجل منزل ہے
اس سفر میں جو کھٹکتا ہے وہ کانٹا دل ہے

خود ریاضت کو سمجھتے ہیں ریاضت کا ثمر
پھل کے لالچ میں لگاتے نہیں نیکی کا شجر

ارجن کو کرشن جی اپدیش دیتے ہیں کہ انسان کو کسی موہ یا لالچ میں پھنس کر صحیح 'کرم' سے منہ نہ موڑنا چاہئے سب کچھ خدا ہی کرتا ہے انسان صرف کار انجام دینے کا ذریعہ ہے۔ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔

پھول مایا کے جو کھلتے ہیں لبھانے کیلئے
سانپ بچھو ہیں مسافر کے ستانے کے لیے
سلسلہ ہستی فانی کا مٹانے کے لئے
بزم عالم سے نہ جا اوس کے آنے کے لئے

تیری ہستی کا جو ہے راگ بھلا دے اسکو
پردہ ساز حقیقت میں چھپا دے اسکو

اس بند میں چکبست کرم کے ذریعے آواگون سے مکتی پانے کیلئے تلقین کرتے ہیں دنیا کے مکر و فریب سے بچ کر اپنی ہستی کو پردۂ یزداں میں کھونے کا درس دیتے ہیں۔

کس لئے خاک کے پتلوں کیلئے روتا ہے
دیکھنے کو ہے کھلی آنکھ مگر سوتا ہے
کچھ خبر ہے تجھے کیوں جان عبث کھوتا ہے
کون کرتا ہے فنا کون فنا ہوتا ہے
دوست دشمن کا مددگار وہی جگ میں ہے
وہی صورت گر ہستی ہے جو ہر رنگ میں ہے

یہ نظم کرشن جی کے آدرشوں کی ہو بہو عکاسی کرتی ہے۔

چکبست کی تیسری مذہبی نظم گائے ہے۔ اس نظم میں انھوں نے
گائے کے سیدھے پن و مفید عام پہلو کی عکاسی کی ہے

نام جس کا ہے محبت وہ ہے ایماں تیرا
کوئی ہو سب کے لیے فیض ہے یکساں تیرا
زندگی کے لئے محتاج ہے انساں تیرا
کون بیمار نہیں بندۂ احساں تیرا
حلق میں دودھ سے تیرے جو تری رہتی ہے
خشک ٹہنی تن لاغر کی ہری رہتی ہے

اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جس طرح گئو ماتا
ہندو دھرم کا ایک جز ہے اسی طرح اس کی ... بھی
دھارمک جذبے سے اُجاگر ہیں۔

تن سے تیرے ہے عیاں نرمی دل کا جوہر
جوڑ بند ایسے کہ سانچے میں بنے ہیں ڈھلکر

رنگ کالا ہو کہ اُجلا ہو یہ کہتی ہے نظر
بندرابن کی وہ ہے شام یہ متھرا کی سحر
کنگرے سے یہ نہیں چہرۂ نورانی پر
تاج قدرت نے سجا ہے تری پیشانی پر

گائے وفا کی دیوی ہے جس طرح ماں سے ممتا ملتی ہے اسی
طرح گئو ماتا سے فیض یاب ہو کر اس کے دودھ سے ہم
اپنی زندگی میں برق رفتاری حاصل کرتے ہیں

صاحب دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں
چشمۂ فیض خدا مردِ خدا کہتے ہیں

چکبست کی ان دھارمک نظموں میں ویدک فلاسفی کی
روشنی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کو فلسفیانہ
اور صوفیانہ طور سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔
ہر مذہب کسی نہ کسی فلسفہ پر مبنی ہوتا ہے اور وہی اسکی روح
ہوتی ہے۔ چکبست نے اپنے دھرم کے فلسفہ کو اچھی طرح سے
اپنے اشعار میں نبھایا ہے

چکبست کے دل میں حب وطن کا جذبہ کوٹ کوٹ
کر بھرا تھا۔ ان کو وطن کی ہر چیز سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ
انگریزی سامراج کے مخالف تھے لیکن سیاسی حالات
سازگار نہیں تھے اس لئے کھلے الفاظ میں حکومت سے
بغاوت بھی نہیں کرنا چاہتے تھے وہ دبے لفظوں.....
عدم تشدد سے حکومت کو آگاہ کرنا چاہتے تھے اور وہ
ہوم رول کے خواہاں تھے جس میں سرپرستی انگریزوں
ہی کی تھی۔

چکبست کے آزادی کے خیالات کبھی کبھی انگریز سامراج
کو چیلنج دے دیتے ہیں

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

یہ وہ شعر ہے جس کو شہید قوم جناب اشفاق اللہ خاں
نے عدالت کے روبرو پڑھا تھا اور جج نے انکے گستاخانہ
رویہ پر ناراضگی ظاہر کی تھی۔

چکبست نے اپنے آزادی کے ارمانوں کی تمثیل سے اپنے
جذبہ کا صحیح عکس کھینچا ہے۔

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی!

چکبست ہندوستان کو انتہائی محبت کرتے تھے ان کی ہر
سانس میں ہندوستانیت بسی ہوئی ہے اور رگوں میں

خالص ہندوستانی خون رواں ہے۔

سیدائے بوستاں کو سرو سمن مبارک
رنگین طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک

بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

اُن کی وطنیت میں دیوانگی کی بو آتی ہے اور وہ بچے دیش بھگت ہیں۔

مٹی میں گل جو اور کسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشن ہندوستاں کے ہیں

چکبست ہی صرف وطن کی آراستگی میں مصروف نہیں۔ بلکہ وہ قدرت اور فطرت کو اپنے وطن کی زینت آرائی میں برسر کار پاتے ہیں۔

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

آخر میں چکبست اپنے وطن کی عظمت کے لئے خدا سے دعا مانگتے ہیں اور نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

اک ذرا جذبۂ اخلاق کو اعلیٰ کر دو
قوم مرحوم کی تربت پہ اجالا کر دو

چکبست کا حب الوطنی کا جذبہ ان کو شوشل ریفارم یا سماجی اصلاح کی طرف کو راغب کرتا ہے انھوں نے قومی بہبودی کیلئے بہت سی نظمیں کہیں ہیں جن میں اہم پھول مالا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے قوم کی لڑکیوں سے، خطاب کیا ہے اور اُن کو تنبیہ کی ہے کہ وہ انگریزی تہذیب سے متاثر نہ ہو کر ہندوستانی ناری کا آدرش پیش کریں اور اپنی عصمت اور قومی وقار کی نگہبانی کریں۔ اسی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم پہ اپنی نہ لگانا ہرگز

پوچھنے کے منہ پر جو ہے آزادی کا
اس کو تفریح کا مرگز نہ بنانا ہرگز

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز

کاغذی پھول و کے دکھا کر ان کو
دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز

چکبست نے برق اصلاح کے عنوان سے ایک نظم اس موقع پر کہی جب آگرہ میں کشمیری پنڈتوں کے فرقہ میں پہلی مرتبہ ایک بیوہ لڑکی کی شادی ہوئی۔ وہ بیوہ شادی کے موافق تھے اور اس کو سماج میں باعزت جگہ دینے کو تیار تھے۔

گل بسے عین لطافت میں خزاں نے لوٹا
آج اس باغ کا شاداب ہے بوٹا بوٹا

بیڑیاں کٹ کے گریں قفل اسیری ٹوٹا
چاند معصوم کی قسمت سے گہن کا چھوٹا!

تم بھی خود شاد ہوئے قوم کو بھی شاد کیا
دل کے ویران شوالے کو پھر آباد کیا

وہ زبانی جمع خرچ کے قائل نہیں ہیں بلکہ عملی اصلاح چاہتے ہیں وہ قوم میں تعلیم کے حامی ہیں اُن کا خیال ہے کہ بغیر تعلیم کے کوئی قوم ترقی نہیں کرتی۔

دکھلاتی ہے بس سیفِ زباں جو ہر عالی
لاریب صدا دیتا ہے جو ظرف ہے خالی
اصلاح کی تقلید ہے اک امرِ خیالی
جب بانیِ اصلاح ہوں خود دشمنِ قالی
نہیں عشق بھی پیدا نہیں ہوتا
بلبل گلِ تصویر پہ شیدا نہیں ہوتا

چکبست نے ہندوستان کے سماجی حالات اور رسم و رواج میں اصلاح کی حتی الامکان کوشش کی اور خاص طور سے کشمیریوں اور کشمیری پنڈتوں کے سماجی دقیانوسی ہٹانے کا عزم کیا۔ وہ سماج کے ہر طبقہ میں اتحاد تعاون چاہتے تھے۔

اذاں دیتے ہیں بتخانہ میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

چکبست کے دل میں قوم کے لئے سوز و گداز کا جذبہ موجزن تھا انھوں نے قوم کا مرثیہ اور بہت سے نامور لیڈروں کا مرثیہ کہا ہے۔ گوکھلے، گنگا دھر تلک، مہا دیو رانا ڈے گنگا پرشاد ورما، بشن نرائن در۔ اقبال نرائن مسلدان پر کہے ہوئے مرثیے اہم ہیں۔ ان کے مسدس پر انیس کا رنگ غالب ہے لیکن ان کے جذبات مذہبی ہو کر زیادہ تر قومی ہیں۔ ان کے مراثی زیادہ تر قومی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

چکبست کے مرثیوں میں جذبات نگاری اپنی انتہا پر ہے۔ گوپال کرشن گوکھلے پر کہے گئے مرثیہ سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ قومیت کا جذبہ چکبست کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ذیل کا بند پیش خدمت ہے

لرز رہا تھا وطن جس خیال کے ڈر سے
وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے
صدا یہ آتی ہے پھول پھل اور پتھر سے
زمیں پہ تاج گرا قومِ ہند کے سر سے
حبیب قوم کا دنیا سے یوں روانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

چکبست نے گوکھلے کی وطن پرستی کو کس خوبی سے نبھایا ہے۔

خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا

آخر میں گوکھلے کی شخصیت میں ساری ہندیت کو وہ سموتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اُن کا انتقال ہندوستان کی بدقسمتی کا عین باعث بتاتے ہیں۔

جنازہ ہند کا در سے تیرے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے

ایک دوسرا قومی مرثیہ بال گنگا دھر تلک کی موت پر کہا گیا ہے۔ تلک کے روئے روئے میں حب الوطنی کا جذبہ بھرا تھا اور یہ اُن کی کاوشوں ہی کا نتیجہ تھا کہ ملک میں چاروں طرف قوم پرست اُن کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار تھے اور وطن کے لئے شہید ہونے میں عظمت سمجھتے تھے۔

لاش کو تری سنواریں نہ دِ جہان کہن
ہو جبیں کیلئے صندل کی جگہ خاکِ وطن
تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے پنجاب کے مظلوم کفن
شور ماتم نہ ہو جھنکار ہو زنجیروں کی
چاہئے قوم کے بھیشم کو چتا تیروں کی

تلک کو بھیشم پتاما سے تشبیہ دی ہے۔

چکبست نے مہادیو گووندرانا ڈے کی موت پر ۱۹۰۱ میں ایک اہم نوحہ کہا ہے ؎

افسوس آج باغ جہاں میں نہیں ہے تو
پھیلی ہے چار سمت محبت کی بُری لو
تو کیا گیا وطن کی گئی تیرے آبرو
کیوں چشم یاس سے نہ بہے خون آرزو
خرمن جلا اسد کی کھیتی اُجڑ گئی
یہ گلشن مراد پہ کیا اوس پڑ گئی

چکبست نے گنگا پرشاد ورما کی موت پر بھی مرثیہ کہا ہے۔ آج بھی اُن کی یادگار۔ گنگا پرشاد میموریل ہال اور گنگا پرشاد پبلک لائبریری امین آباد۔ لکھنؤ باقی ہے

چھپ گیا چاند مگر ہے ابھی بالا باقی
شمع باقی نہیں لیکن ہے اُجالا باقی

چکبست نے بشن نرائن در کی موت پر ۱۹۱۶ میں ایک دل کو ہلا دینے نوحہ کہا ہے اس کے کچھ انسانیت آموز اشعار ملاحظہ ہوں.

رنگ دنیا سے رہا عالم فانی میں جدا
جیسے لہروں سے کنول رہتا ہے پانی میں جدا
زندگی یوں تو فقط بازی طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے
کچھ بڑی بات نہیں فاضل دوراں ہونا
آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

چکبست کے قومی مرثیہ سوز و گداز سے بھرے ہوئے ہیں
چکبست نے تو اپنی عمارات پر بھی نظمیں کہی ہیں اس سلسلہ کی اُن کی نظم آصف الدولہ کا امام باڑہ (لکھنؤ) بہت مشہور ہے۔

چکبست نے اخلاقی شاعری پر بھی اپنا قلم اٹھایا ہے اُن کی نظم دولت موجودہ سماج میں دولت کے صحیح نظریہ کی عکاسی کرتی ہے

کوشش کبھی زردار کی جاتی نہیں بے سود
رہتا ہے سدا سایہ فگن طالع مسعود
انسان کی نیت میں اگر شر نہ ہو موجود
زر ہاتھ میں اس کے ہے در مقصود
کب گو ہر امید کو رولا نہیں اس نے
تھا کون سا در بند جو کھولا نہیں اس نے

دولت سماج اور انسان کے لئے بہت کار آمد چیز ہے اگر انسان کی نیت میں خباست نہ موجود ہو۔

لیکن وہ زر و مال نہیں قابل تحسین
انسان کو بنا دے جو شکم پرور و خود بیں
زردار وہ ہے جس میں شرافت کے ہوں آئین
ہو بزم محبت کے لیے باعث تزئیں
سرسبز رہے قوم یہ انعام ہو اس کا
باراں کی طرح فیض کرم عام ہو اسکا

دولت قوم کی ترقی کے لیے استعمال ہونا چاہیے

چکبست نے کچھ نظمیں چھوٹے بچوں کیلئے بھی کہی ہیں جس سے ان کے دل میں قوم پرستی کے جذبات کم عمری میں ہی بیدار ہو سکی۔ ایسی نظمیں 'ہمارا وطن دل سے پیارا'، 'وطن'، 'وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک'، وغیرہ ہیں۔

یہاں کی خاک ہم کو کیمیا ہے
یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے
وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

نیچرل شاعری چکبست کے کلام کا اہم جز ہے۔ انکا دل نیچر کی نیرنگیوں کو دیکھ کر بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ نیچر کا عمیق مشاہدہ کرتے ہیں اور اُن کو اپنے اشعار میں ہو بہو اتار دیتے ہیں۔ اس نوعیت کی اُن کی نظمیں سیر دیرہ دون اور جلوہ صبح، بہت سہر دل عزیز ہیں۔

یہیں بہار کا پہلے پہل ہوا تھا شگون
عجیب خطہ دلکش ہے شہر دہرہ دون
سپرد دام کے ہے انتظام پانی کا
ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا
نگہ کو دور سے پانی ہے جو نظر آتا
سپید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

ذرا تشبیہ تو ملاحظہ ہو۔
آپ یہیں وہ نیچر کی رنگا رنگی کو روح کی یکجہتی کیلئے استعمال کرتے ہیں اور اُن کو قدرت کے درپن میں اپنی آتما کا مسکن نظر آتا ہے

جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنی راز نہیں
کچھ آبشار ہیں اور ہم ہیں امتیاز نہیں

جلوہ صبح، میں بھی چکبست نے فطرت کے نظاروں کو اشعار کے آبگینوں میں بخوبی تراشا ہے

والشمس تھا کندہ شہ خاور کے نگیں پر
واللیل کا باقی تھا نشاں بھی نہ کہیں پر
تھی مہر کی پھیلی جو ضیا چرخ بریں پر
آنے لگا رہ رہ کے دہی نور زمیں پر

ذروں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا
پیمانۂ خورشید چھلکتا نظر آیا

چکبست نے کشمیر پر ایک دلکش نظم لکھی ہے وہ کشمیری تھے اور جنت ہندوستان کشمیر کی عالم تاب نیرنگیوں کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتے تھے۔

میووں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے
بکھرے ہوئے وہ دامن کہسار پہ لالے
اڑتے ہوئے بالائے ہوا برف کے گالے
دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے
وہ ابر کے ٹکڑوں کا تماشہ سجھ دل پذیر
پانی کی صدائیں وہ پہاڑوں کے در و تیر

چکبست نے برسات پر بھی ایک جاندار نظم لکھی ہے اور ان تمام جذبات کا بیان کیا ہے جو برسات کے موسم میں فطرتاً بیدار ہو جاتے ہیں

ہے دلاتی یاد مے نوشی فضا برسات کی
دل بڑھا جاتی ہے آ آ کر گھٹا برسات کی
دیکھنا سوکھی ہوئی شاخوں میں بھی جان آ گئی
حق میں پودوں کے مسیحا ہے ہوا برسات کی
اصل تو یوں ہے مے و معشوق کا جب لطف ہے
چاندنی ہو رات کو دن کو گھٹا برسات کی
ناز ہو جس کو بہار مصر و شام و رُوم پر
سرزمین ہند میں دیکھے فضا برسات کی

چکبست نے کچھ ظریفانہ نظمیں بھی لکھی ہیں جیسے لارڈ کرزن سے جھپٹ، اس نظم میں انھوں نے اپنے سیاسی جذبات کو بخوبی طنز و مزاح کے انداز میں ڈھالا ہے۔ اس

نظم کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں جو چکبست کی، حب الوطنی کے ساتھ ساتھ اُن کے فن سخن کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔

جس سے ناشاد رعایا ہے وہ ہے دور ترا
کر دیا ملک کو اس پانچ برس میں چوپٹ

بس ترا چل نہ سکا قحط و وبا سے کچھ بھی
شہر ویران ہیں آباد ہوئے ہیں مرگھٹ

منہ دکھاتا تجھے ذا جب نہیں کلکتہ میں
اب مناسب ترے رہنے کے لئے ہے چہنٹ

اب مناسب ہے یہی کیجئے پنجرا خالی!
ہم بھی خوش آپ بھی خوش دور کہیں ہو جھنجھٹ

چکبست نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے انھوں کچھ رباعیات بھی کہی ہیں جو زیادہ تر اخلاقی رنگ کی حامل ہیں۔

چکبست کا کلام آہ ہے مرثیوں میں جو جذبات نگاری اور قوم پرستی اپنے پورے عروج پر ہے وہ مراثی میں انیس کے پیروکار ہیں اور غزل میں آتش کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی زبان لکھنوی ہے۔ اور الفاظ میں لکھنویت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ انکے اشعار میں ہندو کی رسالت الفاظ کی افراط ہے۔ ان کے کلام میں ندرت خیال۔ ندرت بیان اور حسن بیان کی چاشنی موجود ہے وہ صرف ہندوستانی تشبیہات ہی استعمال کرتے ہیں۔ چکبست کے خیالات زیادہ تر ویدک فلسفہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔

کثرت میں یہ وحدت کا سبق وید میں ہے
ایک ہی نور ہے جو ذرہ و خورشید میں ہے

نور ایماں سے جو پیدا ہو صفا سینے میں
عکس اس کا نظر آتا ہے اس آئینے میں

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
آج کل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

چمن زار محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا

کہتے ہیں خودی حسن کو خدا نام ہے کس کا
دنیا ہی فقط جلوۂ جانانہ ہے میرا

اُنھوں نے اپنے ویدک فلسفہ سے حیات روح اور خدا کی تعریف ذیل کے اشعار میں اس طرح کی ہے اس کو آپ ندرت بیان بھی کہہ سکتے ہیں

جو ظہور عالم ذات ہے یہ فقط ہجوم صفات ہے
ہے جہاں کا اور وجود کیا جو طلسم وہم و گماں ہیں

یہ حیات عالم خواب ہے نہ عذاب ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علم راز جہاں ہیں

ان کے کلام میں خمریات کے بہت کم عناصر ملتے ہیں۔ انھوں ایک نظم آب انگور کہی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ خمریات کے حامی نہیں ہیں لیکن وہ شیخ پر آوازہ کستے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اُن کے کلام میں ندرت خیال کی اچھی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

نفاق گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

چکبست کا کلام روزمرہ سے مزین ہے۔

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

اُن کے الفاظ۔ محاورے اور بندشیں سب لکھنوی ہیں

روح و قالب کیطرح روز ازل پیدا ہوا
لکھنؤ کے واسطے ہیں لکھنؤ میرے لئے

اُن کا کلام بے کسی و بے بسی کی جیتی جاگتی مثال ہے جسمیں حب الوطنی بھی سموئی ہوئی ہے

اب جبیں کہاں آرام کہاں امید کہاں ارماں کہاں
آئی تھی الم کی فوج گراں وہ دل کی بستی لوٹ گئی

چکبست کی صحیح تصویر اُن کے ذیل کے اشعار کے آئینہ خانہ میں یوں نظر آتی ہے

نہ ہوں شاعر نہ ولی ہوں نہ ہوں اعجاز بیاں
بزم قدرت میں ہوں تصویر کی صورت حیران
دل ہی ایک رنگ ہے لفظوں سے جو ہوتا ہے عیاں
کسی کی محتاج نہیں ہے مری فریاد و فغاں
شوق شہرت ہوس گرمی بازار نہیں
دل وہ یوسف ہے جسے فکر خریدار نہیں

بسلسلہ مضمون صفحہ ۲۴۲

یہ ماتم ہے مصور اٹھ گیا گلزار قدرت کا
ہر اک طائر ہر اک برگ چمن ہے نوحہ خواں میرا

۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو چکبست کی زبان خاموش ہوگئی اوران کا قلم ہمیشہ کے لیے رک گیا۔ لکھنؤ سے ایک مقدمے کے سلسلے میں رائے بریلی گئے لیکن واپس آنے کی نوبت نہ آسکی۔ مقدمہ ختم کرنے کے بعد لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے اور ریلوے اسٹیشن پہونچے۔ وہیں فالج کا حملہ ہوا اور وہ لکھنؤ کے بجائے اُس سفر پر روانہ ہوگئے جسے سفرِ آخر کہا جاتا ہے۔

بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست کو اطلاع کی گئی وہ حیران و پریشان رائے بریلی پہونچے اور اپنے بھائی کی لاش لے کر رات ہی کو لکھنؤ واپس آگئے لکھنؤ اپنے اس سپوت کے غم میں الم کدہ بن گیا کیونکہ یہ چکبست کا جنازہ نہیں تھا بلکہ لکھنؤ کی تہذیب، ظرافت اور رواداری کے ایک دور کا خاتمہ ہو رہا تھا

اجل نے ہم سے چھینا آج کیسا اہل فن ہے یہ
کہ سونی ہوگئی یکبارگی بزم سخن ہے یہ

چکبست نے محبت، اور خوش خلقی کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ انھوں نے فکر و نظر کی جو نئی بستیاں آباد کیں، اپنے قومی نغموں سے وطن کی محبت کا جو پیغام دیا۔ اور ادب و زندگی کے کارواں کو جو نئی راہیں دکھا ہیں ان کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور جیسے جیسے وطن کا کارواں اپنی ترقی کے لئے نئی منزلوں پر گامزن ہوگا پنڈت برج نرائن چکبست کی قدر و منزلت میں اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔

رنگین بیانیوں کا تری عام ہے چلن
اشعار کیوں نہ ہوں ترے مقبول اہل فن

دلکش خیال، طرز ادا کا وہ بانکپن
الفاظ میں نزاکت برگ گل و سمن

اہل ادب ملول ابھی تیرے غم سے ہیں
زخم جگر ہرے تری نوک قلم سے ہیں

(بشکریہ آکاش وانی لکھنؤ)

پنڈت برج نرائن چکبست

ڈاکٹر سلمان سعید

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست کی زندگی کا آغاز اور اختتام اسی ایک فلسفہ پر مشتمل ہے۔ انھوں نے زندگی اور موت کا جو گہرا مطالعہ اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے وہ کم حیثیت کا نہیں ہے۔ زندگی کی ان گہرائیوں اور گیرائیوں کا تجزیہ کرنے والے بیسویں صدی کے صرف دو شاعر ہیں ڈاکٹر اقبال اور چکبست کا نام باقی بچتا ہے۔ ان کے دل میں حب قومی کے ساتھ ساتھ وطن میں رہنے والے ہر فرد سے محبت اور شفقت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ غلامی کے دور میں پروان چڑھنے والے شاعر کے دل میں آزادی کی امنگیں موجزن ہیں۔ زنجیر و سلاسل، قید و بند اور دار و رسن کے سائے میں امن کی دیوی آزادی کے ترانے سنا رہی ہے اور شاعر کے دل میں جذبہ آزادی کی لگن ایسی ہے جو کسی شکل میں کسی کے سامنے سر جھکانے کو تیار ہیں، کسی قسم کے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے حق میں نہیں اور کسی بھی ایثار اور قربانی کے وقت کسی سے پیچھے نہیں۔

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشہ کو بسائیں گے

جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ گیت گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

پنڈت برج نرائن چکبست ایک معزز کشمیری برہمن گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ان کے آبا و اجداد کا وطن لکھنؤ ہے لیکن وہ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔

چکبست اوائل عمری میں ہی لکھنؤ آ گئے اور یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی، اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۸ء میں یہیں سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور باقاعدہ وکالت شروع کر دی۔ وکالت میں انکو بہت

کم وقفہ میں شہرت حاصل ہوئی اور جلد ہی لکھنؤ کے اچھے وکلا میں شمار ہونے لگے۔ ۱۲ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کے سلسلے میں رائے بریلی گئے۔ واپس ہونے کیلئے ٹرین میں بیٹھے۔ فالج کے شدید دورہ پڑا اور اسٹیشن ہی پر داعی اجل کو لبیک کہا ؎

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

کاظم حسین صاحب محشر نے انھیں کے مصرعہ سے تاریخ وفات نکالی ؎

ان کے ہی مصرعہ سے تاریخ ہے ہمراہ عزا ۱۳۴۴ھ
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا ۱۹۲۶ء

چکبست کی ابتدائی شاعری کے متعلق اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے پہلی غزل صرف نو برس کی عمر میں کہی تھی اور جب سے یہ سلسلہ تا حیات جاری رہا۔ اساتذہ میں غالب آتش اور انیس سے کافی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی غزلیات سے آتش اور مسدس سے انیس کا رنگ جھلکتا ہے۔ انداز فکر الگ ہیں لیکن سلاست، بندش الفاظ، حسن ترکیب اور روانی میں انھیں استادوں سے فیض اٹھایا ہے۔ چکبست نے جدید خیالات کو بھی نظم کیا ہے مگر زبان کی لطافت شیرینی، پختہ کاری اور پاکیزگی کو ہاتھ نہیں جانے دیا ؎

دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے
وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے

اہل ہمت منزل مقصود تک آ بھی گئے
بندۂ تقدیر قسمت کا گلا کرتے رہے

جہاں میں آنکھ جو کھولی فنا کو بھول گئے
کچھ ابتدا ہی میں ہم انتہا کو بھول گئے

جذبۂ شوق کی تاثیر دکھا دیتے ہیں
ہم وہ پیاسے ہیں جو دریا کو بلا لیتے ہیں

ان کی شاعری میں قدیم اور جدید رجحانات کی یکساں نمائندگی ہے۔ قدامت اور جدت کے اس حسین امتزاج سے انھوں نے استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس دور کی غزل کی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے والوں میں چکبست کا نام نمایاں اور سرفہرست ہے جب کہ اردو شاعری "درباری شاعری" کے حصار میں قید ہو چکی تھی اردو غزل دوسری اصناف سخن پر امرار اور روسا کی توصیف اور مدح کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ خصوصاً غزل تو صرف ایک روایتی صنف سخن بن کر رہ گئی تھی۔

فارسی غزل کے اثر سے اردو غزل محدود اور تنگ دست ہو گئی۔ غزل پر آورد اور تصنع نے پوری طرح قبضہ کر لیا۔ اس دور کے شعرا نے ایسے محاورے، تشبیہ اور استعارے استعمال کرنا شروع کر دیئے جن کا حقیقت میں کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اکثر شعرا یہ محسوس کرتے تھے کہ یہ بندشیں اور قیود ان کی شاعری کا گلا گھونٹ دیں گے لیکن وہ روایت کی پیروی کرنے پر مجبور تھے شاید ماحول کی اسی گھٹن کو محسوس کرتے ہوئے غالب

نے کہا تھا ؎

بلقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

پنڈت برج نرائن چکبست کا مزاج خالص لکھنوی ہے، وہ لکھنؤ کے ادبی ماحول میں پلے، بڑھے اور پروان، چڑھے۔ انھوں نے شاعری میں بھی لکھنوی رنگ اختیار کیا۔ ان کے طرز بیان پر لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر مُہر لگی ہے لیکن اس کے باوجود جدت طرازی، ندرت فکر اور پیش گوئی کی وجہ سے انھیں جدید شاعر ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ جدید ہندوستان کے معماروں میں ان کا نام یقیناً جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ انھوں نے جس حسن کے ساتھ روایت شکنی کی ہے اس کی مثالیں ان کے کلام میں جابجا ملیں گی۔ کنگھی چوٹی، زلف و رخ، آئینہ وادا اور دوسری عشقیہ علامات کو بالائے طاق رکھ کر، انھوں نے زنجیر و سلاسل، قید و بند اور دار و رسن کی، اہمیت پر زیادہ زور دیا ہے۔ انسانی زندگی کے تاریک و مکدر پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے انکانی کوششیں کیں اور آزاد فضا میں سانس لینے کی قسم کھائی ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے
میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے

برج نرائن چکبست کے تقریباً سبھی ہمعصران کی اور کمال کے قائل ہیں گو کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ سخن بھی بدل جاتا ہے ایک دور کی رائے دوسرے سے مختلف ہوتی ہے لیکن یہ دعویٰ کرنا کسی بڑے کا کام نہیں کہ جس قدر زمانہ گذرتا جائے گا شاعر مصنوعی قید سے آزاد ہوتی جائے گی اور آزاد دور میں اس کو نشو و نما کا موقع ملے گا برج نرائن چکبست شہرت بتدریج بڑھتی جائے گی۔ آنے والی نسلیں حقیقت کو تسلیم کریں گی وہ جدید دور کے رہنماؤں سے ہیں اور انھوں نے جدید ہندوستان کی رول ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر شجاعت علی (سندیلوی)

مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا

پنڈت برج نرائن چکبست کا یہ مضمون ۔ "مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا" مکالمہ کے انداز میں اودھ پنچ جلد بست و ہشتم نمبر ۲۵ مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ "حالی بحیثیت شاعر" پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے سلسلے میں۔ مجھے اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔[۱] یہ مضمون ان کے مجموعہ "مضامین چکبست" میں شامل نہیں ہے ۔ اودھ پنچ کے بعد کسی اور رسالے میں بھی یہ مضمون شائع نہیں ہوا۔ اور "نایاب وکمیاب" ہوگیا۔ یہ مضمون گلزار نسیم کے اس نسخہ کی اشاعت سے قبل شائع ہوا تھا، جو چکبست کی نگرانی میں ان کے دیباچے کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اس دیباچے میں، چکبست نے کہیں کہیں اس مضمون کی عبارت دہرادی ہے اور مولانا حالی نیز ان کی شاعری اور تنقید نگاری پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں اردو مثنویوں پر بحث کرتے ہوئے گلزار نسیم کا بھی جائزہ لیا تھا اور اس پر چند اعتراضات کیے تھے چکبست نے مختلف مضامین میں حالی کے اعتراضات کے جوابات دیئے اور ان کو بے سروپا ثابت کیا۔ اس سلسلہ میں اوّلیت اسی مضمون کو حاصل ہے اس کے بعد دیباچہ گلزار نسیم میں، چکبست نے گلزار نسیم پر اعتراض کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے، مولانا حالی کے اعتراضات تحریر فرمائے اور ان کے جوابات دیئے ۔

دیباچے میں متعدد جگہ قریب قریب عبارت وہی ہے جو "مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا" میں ہے۔ فرق صرف "مکالمہ" کا ہے۔ مثلاً

دیباچہ گلزار نسیم	"مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا"
اس زمانہ میں مولانا حالی نے گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم سے پامال کرنا چاہا ہے۔"[۲]	انھوں نے اگر گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم کی ہڈیوں سے پامال بھی کرنا بھی چاہا تو کچھ زیادہ فکر کا مقام نہیں
نسیم کے اس شعر پر اعتراض کرتا ہوا سے لڑتا ہے۔"[۳]	"ایسے بادِ ہوائی اعتراضات کیے"

اشعار کی تشریح اور وضاحت کرنے میں بھی مماثلت پیدا ہوگئی ہے ۔

چکبست نے نسیم اور گلزار نسیم پر اودھ پنچ کے علاوہ مختلف رسائل میں مضامین لکھے ۔ یہ تمام مضامین "مضامین چکبست" میں شامل ہیں۔
۱۔ نسیم ۔ کشمیر درپن فروری ۱۹۰۳ء　۲۔ دیباچہ گلزار نسیم "دلگداز" مارچ اپریل ۱۹۰۵ء　۳۔ گلزار نسیم، اُردوئے معلیٰ جولائی ۱۹۰۵ء
ان مضامین میں چکبست نے مولانا حالی کے اعتراضات کے جوابات دیئے۔ ان کے علاوہ مولانا شرر نے گلزار نسیم کے شائع ہونے کے بعد جو اعتراضات کیئے تھے ان کے بھی جوابات دیئے شرر اور چکبست کے ادبی معرکے میں بہت سے مشاہیر اور اساتذہ نے حصہ لیا۔ شرر کی موافقت میں ریاض خیرآبادی، جلیل حسن جلیل، حکیم برہم، مرزا ہادی، منشی نثار حسین، ظہیر الحق علوی، وغیرہ اور چکبست کی تائید میں منشی سجاد حسین، احمد علی شوق، طیش بلگرامی، ضامن کنتوری حسرت موہانی وغیرہ ۔ یہ ادبی معرکہ عرصہ تک جاری رہا۔

چکبست ایک منفرد اور عظیم شاعر ہی نہیں تھے، بہترین نثر نگار اور نقاد بھی تھے، مضامین چکبست کے مطالعہ سے انکی تنقیدی بصیرت معلوم ہو جاتی ہے۔ "مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا" میں بھی ادبی تنقید کی جھلکیاں موجود ہیں کردار نگاری اور جذبات نگاری کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ پیر مرد، مولانا حالی، پسند قدر بزرگوار۔ نسیم۔ بلبل ہزار داستان۔ اردوئے معلیٰ، چکبست نے ان تینوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ مکالمے کے انداز میں کہیں کہیں طنز فرمایا جاتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس مضمون سے چکبست کے نظریہ شعر و ادب اور انکے اسلوب نگارش کیساتھ ساتھ گلزار نسیم سے انکی والہانہ عقیدت...

۱۔ حالی بحیثیت شاعر۔ باب پنجم، حالی کی مخالفت صفحہ ۲۹۰ تا ۲۹۳　۲۔۳۔ مضامین چکبست، دیباچہ گلزار نسیم ۱۳۹، ۱۴۰

پنڈت برج نرائن چکبست

مولانا حالی کا ہوا سے لڑنا

(اودھ پنچ ۲۷؍ اگست ۱۹۰۳ء جلد بست و ہفتم ۳۵ (صفحہ ۲ تا ۶)

کسی مرد خدا کا قول ہے کہ دنیا میں دو آدمیوں کو، ضرورت سے زیادہ عقل ہوتی ہے۔ ایک وہ جو کسی کو صلاح دے اور دوسرا وہ جو کسی کی دی ہوئی صلاح کو نہ مانے۔ چنانچہ چند روز کا عرصہ ہوا۔ مولانا حالی کے ایک شاگرد نے صلاح دی تھی کہ ان اعتراضات کو بحث میں لاؤں۔ جو مولانا مخدوم نے گلزار نسیم کے مختلف اشعار پر کئے ہیں لیکن میں نے یہ صلاح نہ مانی اور ان صاحب کو یہ جواب دیا کہ مولانا حالی کے دیگر اوصاف کچھ ہی نہ ہوں لیکن جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے ان کی حالت قابل افسوس ہی نہیں بلکہ قابل رحم ہے۔ انھوں نے اگر گلزار نسیم کو اپنے اشہب قلم کی ٹاپوں سے مالامال کرنا بھی چاہا تو کچھ زیادہ فکر کا مقام بھی نہیں۔ اس گلزار پر آب حیات شبنم ہو کر برسا ہے۔ ایسے حوادث سے اس کی سر سبزی میں فرق نہیں آسکتا۔ لیکن

(ع) من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال

کا مضمون پیش آیا۔ زمانہ کی نیرنگ سازی چند احباب کے اصرار کی شکل میں نمودار ہوئی اور میرا ارادہ بدل دیا اور اس کے اوپر مجبور کیا کہ اس مضمون کے متعلق کچھ صفحے رنگے جائیں (خیالات کی رنگینی تو ہو) طبیعت نے بھی آمین کہا —— پھر کیا تھا۔

(بیت) مجموعہ خیال یہاں فرد فرد تھا۔

ایک روز گلزار نسیم کی سیر میں محو تھا کہ ہوا کے سرد کے دو تین جھونکے آئے۔ موسم بہار نے ایسا مست کیا کہ نیند آگئی۔ مگر واہ رے میں نیند کیا آئی نصیب جاگے۔ عالم خواب میں وہ سماں دیکھا کہ آنکھیں کھل گئیں۔ کیا دیکھتا ہوں۔ صبح کا سہانا وقت ہے اور میرا گذر ایک باغ مینو سواد میں ہے جو نئی دلہن کی طرح آراستہ ہے۔ اس باغ کے ایک گوشہ میں دو تین کرسیاں رکھی ہوئی ہیں مگر خالی۔ ایک سناٹے کا عالم طاری ہے۔ فقط ایک بلبل ہزار داستان، شاخ گل پر بیٹھا ہوا چہک رہا ہے۔ میں حیران تھا الٰہی یہ

ماجرا کیا ہے کہ اتنے میں اور ہی سماں نظر آیا۔
باغ کے مشرقی دروازے سے ایک بزرگوار داخل ہوئے
پستہ قد۔ بدن چھریرا۔ آزادوں کی وضع۔ سر پر عمامہ۔
قدیم وضع کی چکن زیب بر۔ ہاتھ میں کشمیری قلم دان۔
بغل میں ایک رسالہ جس پر جلی حروف میں گلزار نسیم لکھا
ہوا ہے آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کا آنا تھا کہ بلبل ہزار
داستان نہایت سریلی آواز میں یوں نغمہ سرا ہوا۔

چمن پہ ناز نہ کیونکر کرے بہار چمن
قدم نسیم کے آئے بڑھا وقار چمن

ایک لمحہ بھر بعد باغ کا مغربی دروازہ کھلا اور ایک پیر مرد
داخل ہوئے۔ مولویانہ وضع داڑھی پر انگریزی خضاب
سر پر ایرانی ٹوپی، ترکس کوٹ پہنے ہوئے جس کے ہر
ایک بٹن پر علی گڑھ کالج کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں
ایک پانی پت کا عصا۔ بغل میں ایک کتاب جس کے پہلے صفحہ
پر دیوان حالی مع مقدمہ" لکھا ہوا تھا۔ ان صاحب کا
تشریف لانا تھا کہ بلبل ہزار داستاں ایک دردناک لہجہ
میں یوں نغمہ زن ہوا۔

خزاں کے دور کے مانند دور حالی ہے
سمجھ لو بلبل و گل سے یہ باغ خالی ہے

ان بزرگوار نے ایک نگاہ غضب بلبل زار پر ڈالی اور
کرسی پر جاکر بیٹھ گئے جو بزرگوار پیشتر تشریف لائے تھے
وہ ان کو دیکھ کر مسکرائے اور ایک علیک سلیک کے بعد
یوں دونوں حضرات میں مکالمہ شروع ہوا۔

پہلے بزرگ:۔ آپ نے مجھے پہچانا؟
دوسرے بزرگ:۔ آپ ہی پنڈت دیا شنکر مصنف گلزار نسیم ہیں
لکھنؤ میں ایک مرتبہ آپ کی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا
پہلے بزرگ:۔ ہاں، ہوں تو سہی، اسم مبارک
دوسرے بزرگ:۔ مجھ کو خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی
کہتے ہیں۔ میں حال کا شاعر ہوں۔ میں نے طرز قدیم کے
نسخ کا بیڑا اٹھایا ہے۔
نسیم:۔ اخاہ! حضرت حالی آپ ہی ہیں۔ میں نے بہت
سید احمد خاں سے آپ کی تعریف سنی تھی آپ
سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ سید احمد صاحب مجھ سے
کہتے تھے کہ آپ نے مجھ پر؟ ان کی تصنیف گلزار نسیم
پر کچھ اعتراضات کیے ہیں۔
حالی:۔ ہاں صاحب کیے تو ہیں اگر قدما کے کلام پر اعتراض
نہ کروں تو ان کا طرز منسوخ کیونکر ہو میرا رنگ کیونکر
جمے۔
نسیم:۔ اچھا حضرت! مہربانی کرکے وہ اعتراضات مجھ سے
بھی بیان کیجئے۔ اگر واقعی اپنی غلطی مجھ کو معلوم
ہو جائے تو تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا
حالی:۔ بسم اللہ، سنئے! مثنوی لکھنے والے کا سب سے
مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب
ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرعہ دوسرا مصرعہ سے اور ہر
بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے مگر
آپ نے اس کا لحاظ نہیں رکھا۔ گلزار نسیم میں دو
شعر اس صورت میں ہیں

خوش ہوتے تھے مہ جبیں؟ سے
ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے

پیارا رہ وہ سب کو دیکھ اسی کو
پھر دیکھ نہ سکیے گا کسی کو

مطلب کہ آپ ادا کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ

"لوگ اس طفل مہ جبیں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے
نجومیوں نے بادشاہ سے یہ کہا کہ یہ لڑکا آپ کو پیارا تو
ہے مگر یہ ایسا پیارا ہے کہ اس کو دیکھ کر پھر کسی کو نہ دیکھ
سکئے گا (کیوں کہ اسکو دیکھتے ہی بینائی جاتی جاتی رہیگی)
ظاہر ہے کہ ان دونوں بیتوں میں جب تک کہ کئی لفظ نے
بڑھائے اور کئی لفظ بدلے نہ جائیں تب تک یہ مطلب
جو ہے اوپر یہاں کہا ہے ان بیتوں سے سیدھی طرح
نہیں نکل سکتا اور پہلا مصرع دوسرے مصرع سے اور
دوسرا مصرع تیسرے مصرع سے چسپاں نہیں ہو سکتا۔
دیکھو مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۵ سطر ۴ سے ۱۶ تک)

نسیم :- بس یہی اعتراض ہے۔ افسوس میری مثنوی کے

عام پسند اور مقبول ہونے نے مجھ پر یہ ستم ڈھایا ہے

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

آج کل گلزار نسیم کے بے شمار نسخے شائع ہوتے ہیں جنمیں
سیکڑوں جگہ کاتب کی اصلاح ہوتی ہے۔ میں نے آتش کی
اصلاحیں نہ مانی ہوں گی مگر ان اصلاحوں سے کچھ بس
نہیں چلتا اور تو اور اکثر شعر ان نسخوں میں غائب ہیں۔
اور جو چھپے ہیں وہ بھی غلت ربود۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے
ردی قسم کا نسخہ خریدا ہے اگر آپ گلزار نسیم کا صحیح نسخہ
ملاحظہ فرمائیے تو ان اعتراضات کی تکلیف نا گوار کرنی پڑتی
صحیح نسخہ میں یہ شعر اس صورت پر ہیں ؎

خوش ہوتے ہی[1] طفل مہ جبیں سے
ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو
پھر دیکھ نہ سکئے گا کسی کو

اب مطلب صاف ہے اور مصرعوں میں کامل ربط ہے
یعنی طفل مہ جبیں سے خوش ہوتے ہی ستارہ بیں سے
یہ ثابت ہوا کہ یہ لڑکا پیارا تو ہے مگر اس کو دیکھ کر پھر
کسی کو نہ دیکھ سکئے گا۔

حالی :- بے شک بے شک! اگر اسی صورت پر یہ دو
شعر ہیں تو میرا اعتراض کوئی وقعت نہیں رکھتا لیکن یہ تو
فرمائیے یہ صحیح نسخہ جس کا آپ نے ذکر کیا ہے کہیں دُنیا
کے پردہ پر ہے بھی کہ آپ ہی کے پاس جنت میں ہے اور
اس نسخہ کی شناخت کیا ہے؟

نسیم :- حضرت یہ نسخہ کمیاب ضرور ہے لیکن لکھنؤ میں پرانے
بزرگوں کے پاس بہت ملے گا۔ اس کی شناخت یہ
کہ "یہ میر حسن رضوی کے مطبع حسینی واقع محلہ محمود نگر
متصل اکبری دروازہ شہر لکھنؤ میں بعہد نواب امجد علی
شاہ ۱۲۶۰ھ میں طبع ہوا تھا۔ میں نے خود اس کا
مقابلہ اور تصحیح کی زحمت اپنے ذمہ لی تھی۔[2] علاوہ
بریں اس نسخہ میں میری کہی ہوئی تاریخ چھپی ہے
جو اور نسخوں میں نہ پایئے گا۔ قطعہ تاریخ حسب ذیل
ہے۔

---

[1] یہ مصرع اس طرح بھی ہے "خوش ہوتی ہے طفل مہ جبیں سے" ملا

[2] اصل عبارت نسخے کے آخر میں یہ ہے "پنڈت دیا شنکر متخلص بہ نسیم کہ در فن شاعری کمالے بہم رسانیدہ اند۔ قصہ تاج الملوک و بکاؤلی را از نثر بہ نظم آوردہ بہ گلزار نسیم موسوم ساختہ بودند۔ در بیت السلطنت لکھنؤ محلہ محمود نگر متصل اکبری دروازہ در مطبع حسینی سیدی سندی میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل مرحوم و مغفور بہ تصحیح و مقابلہ مصنف مبلغ طبع شدہ۔

اے خالق کردگار شکراً شکراً شکراً ہزار شکراً
کہیں جملہ ز ابتدا خبر داد شاخ قلم چنین خبر داد
در عہد خلافت شہنشاہ امجد علی شاہ خلد اللہ
از شمع رضا شنود و بستود در مطبع خویش طبع فرمود
چوں زیور طبع پوشید بہر تاریخ طبع کوشید
گلزار نسیم سخدچہ مسموع
گل گفت کہ تازہ گشت مطبوع ۳؎

اگر آپ نے قدما کے کلام کے نسخ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا تو آپ کا فرض تھا کہ آپ صحیح نسخے ان کے (مرثیے) کلام کے جمع کرتے ورنہ ایسے چھاپے کہ غلطیوں کا خاکہ اڑاتا دیانت و ایمان کے خلاف ہے۔

بلبل ہزار داستان:۔ آپ کا قطع کلام تو ضرور ہوتا ہے لیکن اگر کوشش و محنت کے ساتھ گلزار نسیم کا صحیح نسخہ تلاش کیا جاتا تو پھر اعتراض کے پیمانہ میں اپنے قلم کی روشنائی چمکانے کا موقع کہاں سے ملتا۔

حالی:۔ (بلبل ہزار داستان کی طرف مخاطب ہوکر) تو کیوں دخل در معقولات دیتا ہے۔

بلبل ہزار داستان:۔ پُردرد آواز میں

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

نسیم:۔ (حالی کی طرف اشارہ کرکے) حضرت آپ ادھر مخاطب ہو جایئے۔ جانور کی بات کا کیا بُرا ماننا۔

حالی: ہاں صاحب آمدم بر سر مطلب، واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے صحیح نسخہ گلزار نسیم کا تلاش نہیں کیا مگر یہ تو فرمایئے کہ اس اعتراض کو آپ کیوں رد کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بیٹا باپ کی آنکھ کا نور ہوتا ہے مگر یہ بیٹا باپ کی آنکھوں کیلئے ظلمت تھا۔ پس جب تک دوسرے مصرعہ کے الفاظ نہ بدلے جائیں۔ کلام مربوط نہیں ہو سکتا (مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۶)

نسیم:۔ قبلہ میں اعتراض کی تہ کو بالکل نہیں پہنچا۔ مجھ کو تو یہ شعر کسی مقام سے بے ربط نہیں نظر آتا جو مضمون آپ نے نثر میں بیان کیا وہی نظم کے پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص دو مصرعوں کو بے ربط کہے تو اس کا دماغ کافی طور سے وسیع نہیں۔

حالی: واقعی میں نے اعتراض تو کر دیا مگر اب میں خود دیکھتا ہوں کہ یہ اعتراض کچھ ٹھیک نہیں۔ اچھا اس اعتراض کو بھی جانے دیجئے۔ مگر ایک شعر اور آپ فرماتے ہیں؎

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ
نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

یہ دونوں مصرعے بھی مربوط نہیں کیوں کہ الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ 'شاہ' اور شخص ہے اور 'پدر' اور شخص ہے۔ حالانکہ پدر اور شاہ سے ایک ہی مراد ہے۔ دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہیے۔

؎ بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ

(مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۱۹۶ سطر ۶،۷)

۳؎ یہ قطعہ تاریخ سات شعر کا ہے۔ تیسرے شعر کے بعد یہ شعر بھی ہے؎ میر حسن آنکہ طبع پاکش ٭ چوں مطبع اوست خوش و دلکش
پانچویں شعر میں 'شنود' کے بجائے 'شنید' ہے"

نسیم :۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی ایسا نسخہ انتخاب کر کے
لیا ہے۔ جس میں ایک شعر بھی صحیح نہیں چھپا ہے۔
اصل شعر تو یوں ہے۔
آتا تھا شکار گاہ سے شاہ نظارہ کیا پسر کا ناگاہ
اب فرمائیے !
بلبل ہزار داستاں :۔ فرمائیں کیا شیخ کہہ گیا ہے
بریں عقل و دانش بباید گریست
اور دل لگی یہ کہ "خود را فصیحت و دیگراں را نصیحت" آپ
کا دستور العمل ہے۔ خود فرماتے ہیں
سنتے ہیں خدام ماموں کے بہت گستاخ تھے
ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا
آپ کا مطلب ماموں سے دونوں مصرعوں میں ایک ہی ہے
لیکن ظاہرا الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ پہلے مصرع میں
خلیفہ ماموں رشید سے مراد ہے اور دوسرے میں ماموں کے
معمولی معنی ہیں اور اصلاح تو اس بانکی دی کہ بارک اللہ
کہتے ہیں۔
'بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ'
کیا نشست الفاظ ہے کیا پیڑ (پہ پڑی) بتائی ہے اگر
آپ کی شاعری کا قوام ڈھیلا نہ ہوتا تو ایسا مصرع نہ نکلتا "
شاعر ہیں لیکن صفائی بندش کے دشمن۔ ہائے محمد حسین آزاد
کہہ گیا ہے ؎
ایسی بندش سے تو بہتر تھا کہ چھپر باندھتے
ایسی بندش تو نثر میں کانوں کو بری معلوم ہوتی ہے نظم تو
در کنار۔ آپ کہتے ہیں ؎
خندہ زن ہے جس مسلمانی پہ کفر ایسی ہے حالؔی مسلمانی مری

(معلوم ہوتا ہے مولانا کے بچپن کا شعر ہے) بہتر ہوتا اگر اس
کو یوں بدل دیتے
خندہ زن ہے جس سخندانی پہ نثر
ایسی ہے حالؔی سخندانی مری
حالؔی۔ واللہ ذبح کر ڈالوں گا۔ جواب کی پھر بولا
نسیم :۔ ابھی حضرت جانے بھی دیجئے۔ یہ فرمائیے اعتراضات
کا ذخیرہ ختم ہوا کہ نہیں۔
حالؔی :۔ ابھی کچھ شکوک باقی ہیں۔ آپ نے بکاؤلی کا حال،
تاج الملوک کے فراق میں کچھ مختصر سا لکھا ہے وہ
اس طرح بیان کیا ہے ؎
کرتی تھی بھوک پیاس بس میں
آنسو پیتی تھی کھاتے قسمیں
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ
کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
اک چند جو گذرے بے خورد و خواب
زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال رہ گئی وہ
ہیئت میں خال رہ گئی وہ
اس بیان میں بھی تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا
مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا اور ظاہرا آپ نے کوئی مطلب
رکھا بھی نہیں۔ آپ کو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے
کہ کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی۔
کپڑوں کے عوض رنگ بدلتی تھی"
(مقدمہ دیوان حالی صفحہ ۲۱۵ سطر ۳ تا ۹)
نسیم :۔ قبلہ ! گستاخی معاف ! آپ شاعری کا دم بھرتے ہیں

مگر آپ کا یہ اعتراض شہادت دیتا ہے کہ آپ اصول شاعری سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ آپ کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے شاعری اور نثر میں کچھ فرق نہیں حالانکہ کئی اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ نثر میں یہ اصول پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ جو مضمون بیان کیا جائے وہ نہایت وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے اور الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ ان سے ایک ہی معنی صاف طور پر پیدا ہوں برخلاف اس کے نظم میں یہ اصول مدنظر رہتا ہے کہ جو مضمون باندھا جائے اختصار کے ساتھ باندھا جائے۔ محض ایک حالت کی طرف اشارہ کرے اور ترکیب الفاظ ایسی ہو کہ اس حالت کے متعلق مختلف نقشے پڑھنے والے کی آنکھ کے سامنے گزر جائیں۔ اگر اس اصول کو مان کر آپ ان اشعار کا اندازہ کریں گے تو بے معنی نہ نظر آئیں گے بلکہ کوزہ دریا نوش کی کیفیت پیدا کریں گے۔ مثلاً پہلے شعر کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دل پر فراق یار کا صدمہ ایسا تھا کہ کھانے پینے کی اس کو مطلق فکر نہ تھی۔ اگر کوئی شخص اس جرم کا ذکر بھی کرتا تو ٹال دیتی تھی یعنی بھوک پیاس ایسی میں کرتی تھی) ایسی دن رات رویا کرتی تھی۔ اگر کوئی کھانے پینے پر اصرار کرتا تھا تو قسمیں کھاتی تھی کہ میں نہ کھاؤں گی۔ صاف ظاہر ہے کہ نثر میں یہ مضمون باوجود اس وضاحت کے وہ لطف نہیں دیتا جو نظم میں اختصار کے ساتھ کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے تنگ تھی۔ اپنی آرام و آسائش کا اس کو مطلق خیال نہیں رہتا تھا یہاں تک کہ کپڑے بھی نہیں بدلتی تھی بے شک طرح طرح کے صدمے جو اس کے دل پر گزرتے تھے تو اس کے چہرہ پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا تھا۔

چوتھا شعر، یکی شاعری کی تصویر ہے اس میں مصنف نے اپنی قوت خیال کا کمال دکھایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کھانا پینا چھٹ جاتا اور طرح طرح کے صدموں سے وہ ایسی نحیف و نزار ہو گئی تھی کہ اس کی شکل دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک تصویر خیال روبرو ہے جس میں کہ نہ دم ہے نہ تاب و تواں۔ اس کی عجیب ہیئت ہو گئی تھی۔ ایک سکتے کا عالم طاری تھا۔ عالم اجسام کے رہنے والوں کی اس میں کوئی بات نہیں پائی جاتی ہے۔ اپنی اگلی ہستی کا محض ایک شبہ بن کر رہ گئی تھی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس تشریح کو سن کر آپ ان اشعار کو بے معنی نہ کہیں گے کیوں کہ نازک خیالی اور بلند پروازی جو شاعری کے خاص جواہر ہیں ان اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔

بلبل ہزار داستان: یہ آپ کس سے کہتے ہیں، ہمارے حالی صاحب تو نظم و نثر میں سوائے قافیہ اور ردیف کی پابندی کے کوئی فرق نہیں سمجھتے آپ انگریزی نظموں کے ترجمے پڑھتے ہیں اور چوں کہ غیر زبان میں ترجمہ ہونے سے ان نظموں کی نازک خیالی اور بلند پروازی کے جوہر تشریف لے جاتے ہیں لہٰذا آپ سمجھتے ہیں کہ مغربی شاعری ویسی ہی ہے جیسی کہ آپ سمجھتے ہیں آپ کے نزدیک تو نظم کرنا اور شعر کہنا ایک ہی چیز ہے۔

حالی: ارے یہ بے ادب کون ہے آ کے دیا جن میں

نسیم: اجی وہ بے ادب ہیں آپ ان اشعار کے معنی سمجھے

سر تیج بہادر سپرو

چکبست دورِ جدید کا رہنما

پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن اُن کے اور میرے درمیان بزرگی اور خوردی کا تعلق نہ تھا بلکہ برابری کا تھا۔ حالانکہ وہ پرانی تہذیب کے مطابق بذات خود مجھ سے ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے جیسا کہ کچھ عرصہ قبل چھوٹے بڑوں سے کرتے تھے۔ ایک رشتہ اتحاد باہمی یہ تھا کہ اُنکو بھی اسی نادر الوجود ہستی سے عقیدت تھی کہ جس سے مجھ کو بھی تھی۔ میرا اشارہ پنڈت بشن نرائن در مرحوم کی طرف ہے۔ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا کہ جب پنڈت بشن نرائن در لکھنؤ سے ولایت بغرض تعلیم تشریف لے گئے اور مجھے خوب یاد ہے کشمیری پنڈتوں میں اس وقت کیسا غل و غوغا ہوا۔ برادری دو گروہوں میں منقسم ہو گئی۔ باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مگر میں ان باتوں کا تذکرہ کرنا فضول سمجھتا ہوں اس ۵۵ برس کے اندر کشمیری پنڈتوں کے طرز و طریق زندگی میں اور خیالات میں قریب قریب ہر جگہ ایسا انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے کہ اگر ۵۰ برس سے بیشتر کے بزرگ اس وقت دوبارہ پیدا ہو جائیں تو وہ اپنی اولاد کو پہچان نہ سکیں گے۔

پنڈت بشن نرائن کا اثر اس صوبہ میں کشمیریوں تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ میرے زمانہ کے ہر طبقے کے طالب علموں اور نوجوانوں پر بھی اُن کا بہت بڑا اثر پڑا پنڈت بشن نرائن صاحب کی علمیت اور انشا پردازی اور شوق تحصیل کا اندازہ آج کل کے نوجوانوں کو نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمارے صوبہ میں ۵۰ برس سے پیشتر کسی نے آزادیِ خیال و تحصیل علم کی بنیاد ڈالی تو پنڈت بشن نرائن در ہی نے ڈالی۔ مجھ کو اُن کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علاوہ اس کے مجھ کو اُن سے قرابت بھی تھی۔ میں اُن کو استاد مادی اور رہنما سمجھتا تھا [illegible] اُن کی صحبت میں بیٹھنا میں عین سعادت سمجھتا تھا۔ پنڈت بشن نرائن صرف انگریزی کے جید عالم نہ تھے بلکہ

فارسی اور اردو میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا اور جہاں
انھوں نے اپنے ہم عصروں میں اور شوق پیدا کئے اور
وہاں فارسی اور اُردو کے شوق کو بھی اُنھوں نے بڑھایا
مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے یہ ارشاد فرمایا
کہ تم جتنی چاہے زبانیں پڑھو مگر اپنی زبان اور اپنی
تہذیب سے بیوفائی نہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر
پنڈت برج نرائن چکبست کے خیالات میں پختگی اور
بلندی اس قدر جلد پیدا ہوئی تو اس کا ایک بہت بڑا
سبب یہ تھا کہ اُن کی علمی اور اخلاقی زندگی پنڈت
بشن نرائن صاحب در کی ذات بابرکات سے وابستہ
تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ایک نظم میں اس کا اعتراف
بھی کیا ہے ؎

کیا زمانہ میں کھلے بیخبری کا مری راز
طاہر فکر میں پیدا تو ہو اتنی پرواز
کیوں طبیعت کو نہ ہو بیخودی شوق پہ ناز
حضرت اکبر کے قدموں پہ ہے یہ فرق نیاز
فخر ہے مجھ کو اسی در سے شرف پانے کا
میں شرابی ہوں اسی رند کے میخانے کا

پنڈت دیا شنکر نسیم کے بعد اگر کشمیری پنڈتوں میں
کوئی شخص ہوا ہے کہ جس نے اُردو میں ویسا ہی کمال
حاصل کیا تو وہ برج نرائن چکبست تھا۔ برج نرائن
چکبست کی شہرت اس وقت ہندوستان میں ایک
طرف سے دوسری طرف تک پھیلی ہوئی ہے کوئی حلقہ
اردو دانوں کا نہیں ہوگا۔ جہاں برج نرائن چکبست
کا نام عزت اور احترام سے نہیں لیا جاتا۔ شاید
میرے لیے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت پنڈت
برج نرائن چکبست کی شہرت نسیم سے بہت زیادہ ہے
اور اس کی وجہ میری دانست میں یہ ہے کہ اب لوگوں
کا مذاق بدل گیا ہے ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اردو شاعری کے کئی دور ہوئے ہیں۔ اس میں کلام نہیں
کہ اردو شاعری پر فارسی شعراء کا بہت بڑا اثر پڑا ہے
گل و بلبل کے قصوں میں اردو شعراء ہمیشہ مبتلا رہے
ہیں لیکن آج کل جیسا میں نے اُوپر عرض کیا ہمارا مذاق
بدل گیا ہے حالاں کہ اس وقت بھی غزل گوئی کا شوق
قائم ہے اور اس صنف میں بڑے باکمال شعراء موجود
ہیں لیکن اب ایک دوسری دھارا بہ رہی ہے۔ یعنی
زمانہ نظم کا شوق ترقی پذیر ہے تبدیلی مذاق کے مختلف
اسباب ہیں۔ مغربی تعلیم کا ہمارے خیالات پر عظیم الشان
اثر پڑا ہے آزادی کے نعرے ہر طرف لگ رہے ہیں۔
وطن پرستی کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسی
حالت میں یہ غیر ممکن تھا کہ اس عصر جدید کے شعراء پر
ان تمام باتوں کا اثر نہ پڑے چنانچہ پنڈت برج نرائن
پر بھی بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ حالاں کہ پنڈت صاحب مرحوم
نے غزل گوئی میں اپنی نازک خیالی اور زبان دانی کا
سکّہ جما دیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نظم میں انھوں نے
خاص طور پر کمال حاصل کیا۔ ان کے طرز بیان پر لکھنؤ
کی ٹکسالی زبان کی مُہر لگی ہوئی ہے۔ آتش و انیس و دبیر
کے رنگ میں اُن کی زبان ڈوبی ہوئی ہے اور اسی زبان

ہیں انھوں نے قلبی واردانوں کو ادا کیا ہے۔ یہ میں
جانتا ہوں کہ چند نکتہ چینیوں اور حریفوں نے اُنکی
زبان پر بھی اعتراض کیا ہے لیکن منصف مزاج ،
شخصوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ اُن کی زبان لکھنؤ کے
بہترین طبقے کی زبان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ زبان
دانی سے قطع نظر کر کے میرا یقین ہے کہ چکبست کے کلام
میں جو درد ہے وہ بہت کم اُن کے ہم عصر شعرا کے کلام
میں پایا جاتا ہے جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے۔

جو خود نہیں سرگرم کرے گا وہ اثر کیا
جب دل میں نہیں درد زباں میں ہوا اثر کیا

اُن کی زبان دانی اور شاعری کے متعلق میں صرف یہ
عرض کروں گا کہ جس قدر زمانہ گزر جائے گا اور اردو
شاعری مصنوعی قیود سے آزاد ہو جائے گی اور آزادی
کی فضا میں اسے نشو نما پانے کا موقع ملے گا برج نرائن
کی شہرت بتدریج بڑھتی جائے گی اور آئندہ نسلیں
اس امر کو تسلیم کریں گی کہ وہ دور جدید کے رہنماؤں
میں سے ہیں۔ اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی وفات
کے بعد اِن اطراف میں تو یہ دعویٰ بدرجہ ثبوت پہونچ
گیا ہے۔

اگر شعر گوئی میں برج نرائن چکبست نے ایسا کمال
حاصل کیا جو ہمارے لئے مایہ ناز ہے تو اُن کی زندگی
بھی ایسی جیتی جاگتی مثال راست بازی، بلند خیالی
وطن پرستی وفا شعاری اور نیک چلنی کی تھی کہ جس
کا اندازہ صرف انھیں کو ہو سکتا ہے جو اُن کے زیر اثر
تھے ایسی ہستیاں زمانے میں بہت کم ہوتی ہیں اور جو
لوگ اُن کے ہم عصر رہ چکے ہیں اور اس وقت بقید حیات
ہیں اُن کیلئے یہی خیال کرنا ہی کہ وہ ایک زمانے
میں اُن کے ہم عصر تھے اور اُن کی صحبت سے فیضیاب
ہوئے تھے باعث فخر ہے۔

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہلِ وطن برباد کرتے ہیں
روشن دلِ ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اجڑے ہوئے گھر میں

پھر ایسا پاسِ غیرت اٹھ گیا اس عہدِ پُرفن میں
کہ زیور ہو گیا طوقِ غلامی اپنی گردن میں
پرانی کاوشیں دیر و حرم کی مٹتی جاتی ہیں
نئی تہذیب کے جھگڑے ہیں اب شیخ و برہمن میں
وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

شاد ہیں ناشاد ہیں یا خانماں برباد ہیں
ہم سے اچھے ہیں کہ یہ وحش و طیور آزاد ہیں

خالص تغزل کے اشعار کے درمیان یہ اشعار ملتے ہیں۔ ایک غزل لیجئے

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے
ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے
آپ سے ہم سے ہوا تھا کبھی پیمانِ وفا
کیجئے ظلم مگر وہ بھی گھڑی یاد رہے

ہر ایک شعر تغزل میں ڈوبا ہوا ہے کہ یکایک یہ اشعار بھی نظر آتے ہیں

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سوائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے
دم سے گاندھی کے رہے شورِ وفا بستی میں
قیس جنگل میں رہے، کوہ پہ فرہاد رہے

جذبۂ وطن پرستی کو غزل میں مرے نزدیک اور کسی شاعر نے اس قدر داخل نہیں کیا آج کل کا میلان تو بالکل اس کے مخالف ہے کہ غزلوں کو اس سے دور رکھا جاتا ہے کیونکہ ہمارا آج کل کا شاعر غزل سرائی میں وطن پرستی کو بے محل سمجھتا ہے اور تغزل کے حدود سے باہر نکلنا ناجائز خیال کرتا ہے۔ اقبال، چکبست کا ہم مشرب ہے اس کی کوئی غزل لے لیجئے۔

یوں تو اے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے
اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی
پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک
مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی
کہتے کہتے ہندوستان یاد آ گیا
میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی

دوسری غزل لیجئے :-

یہ رسمِ بزمِ فنا ہے اے دل، گناہ ہے جنبشِ نظر بھی
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بیقرار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سرِ راہ گذار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

اس غزل میں یہ شعر نظر آتے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

چکبست اپنے سیاسی و مذہبی معتقدات کو اپنی شاعری میں اکثر جگہ بیان کرتے ہیں انھوں نے اس سے گریز نہیں کیا۔ ان کے سیاسی معتقدات آج کل کی فضا میں کچھ بہت ترقی پرور اور آزادی پسند نہ معلوم ہونگے آج کل "شاعرانِ انقلاب" علمبردارِ حریت کے عنوانات شاعروں کو مل رہے ہیں چکبست اعتدال پسند مسلک کے پیرو تھے ہوم رول اور Domi nion status ہندوستان کے لیے کافی سمجھتے اس لیے ان کے اشعار آج کل کے انقلابی شعروں کی طرح شاید آتش بار نہ ہوں مگر لیلائے آزادی کے وہ اتنے ہی مجنوں صفت عاشق تھے جتنے کہ موجودہ زمانے کے بلند بانگ دلدادگانِ حریت :۔

مثلاً جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے

لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

اگر شاعر کے کلام سے اس کی شخصیت نمایاں نہ ہو تو اس کا کلام سوائے اس کے کچھ نہیں کہ سکہ رائج الوقت میں اس نے چند اور سکے چلا دیئے۔ عمدہ کلام تو اچھے سکے ہیں ورنہ ان میں کھوٹ ہے لیکن ان پر شاعر کی شخصیت اس کی انفرادیت کا ٹھپہ نہ ہو تو ایک ہی قسم کے سکوں میں وہ بھی مل جائیں گے۔ ہمارے شعرا نے تقلید کو اس درجہ سراہا اور اس کی اتنی پابندی کی کہ نئی ترکیب، نیا خیال، نیا مضمون باندھنا عیب میں شامل ہوگیا ہر لفظ کیلئے سند مانگی جاتی ہے۔ ہر تشبیہ کے لیے اساتذہ کے کلام سے نظیر طلب کی جاتی ہے

"کی جاتی ہے" میں نے غلط کہا "کی جاتی تھی" کیونکہ اب ان قیود سے لوگ آزاد ہوتے ہیں مگر ذہنی تقلید ابتک ساری و طاری ہے شاعری کے لیے جیسا عرض کیا جا چکا ہے حسن و عشق کے مضامین ہیں یا تصوف و معرفت کے حقائق، ہندو ہو یا مسلمان، ہر ایک شاعر ایک ہی قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ کسی غزل کو اٹھا کر پڑھیئے اگر شاعر کا نام معلوم نہ ہو تو کبھی یہ پتہ نہ چلے گا کہ لکھنے والا کس ملت سے منسوب ہے۔

اپنے مخصوص معتقدات پردہ خفا میں رکھے جاتے ہیں یہ غلط ہے۔ شاعری تنوع اور رنگا رنگی سے محروم ہو جاتی ہے میری رائے میں ہندو شعرا کو خاص طور سے ہندو معتقدات ہندو فلسفہ، ہندو رزمیات اور ہندو علم الاصنام پر، طبع آزمائی کرنا چاہیئے مگر ان لوگوں کو جو زبان پر قدرت رکھتے ہوں اور دل میں تپش۔

مجھے بیحد خوشی ہوئی تھی جب ایک ہندو شاعر نے کالی داس

کے میگھ دوت کو اصل سنسکرت سے اُردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ سنسکرت کا فاضل اور اردو کا ادیب اور شاعر ہو۔ یہ قرآن السعدین کم ہوتا ہے مگر خوش قسمتی سے اس نوجوان میں تھا۔ ترجمہ اس قسم کا نہ تھا جیسا اُردو میں کسی نے فردوسی کے شاہنامے کا کیا ہے

پکڑ کر کمر بند سہراب کا
دیا پیلتن نے زمیں سے اٹھا

میگھ دوت کا ترجمہ ادیبانہ شان رکھتا تھا۔ میں نے اس حصہ کو اُن سے لیکر علی گڈھ یونیورسٹی کے سہ ماہی رسالے میں چھاپا۔ مجھے معلوم نہیں وہ ترجمہ ختم ہوا یا نہیں اور ختم ہوا تو شائع ہو گیا یا نہیں، چکبست نے ترجمے تو نہیں کئے مگر ہندو معاشرت، ہندو تاریخ کے متعلق چند نہایت دلکش نظمیں لکھی ہیں۔

کرشن کنھیا کے یہ آخری بند سناتا ہوں تاکہ آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

اب نہ ارجن ہے نہ وہ گیان کا دریا باقی
نہ وہ آنکھیں ہیں نہ وہ نور کا جلوہ باقی
دل بھانے کو ہے دنیا کا تماشا باقی
درد باقی ہے نہ درد کا شیدا باقی
بانسری ہے کے نیا راگ سنا دے کوئی
سو رہا ہے دل مایوس جگا دے کوئی

پھر ہو دنیا میں کسی ہستی کامل کا ظہور
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گذر جانا
جذبہ خیر کی ہو جس کو پرستش منظور
بادہ شوق سے ہوں جس کی نگاہیں مخمور

دل کو تسخیر کرے انجمن آرا ہو کر
ہو نہ دنیا سے خفا، دین کا پیارا ہو کر

چکبست کی انفرادیت ذیل کے اشعار سے بھی نمایاں ہوتی ہے مسئلہ تناسخ کو کس شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

عروس جاں نیا، پیراہن ہستی بدلتی ہے
فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گذر جانا

نقل کرا پنے قالب سے، نیا قالب لبائیگی
اسیری کے لیے ہم روح کو آزاد کرتے ہیں

کشمیر جنت نظیر کو جس نے دیکھا اس کا دالہ شیدا ہو کر آیا۔ والہ وشیدا ہر شخص ہوتا ہے مگر اپنے احساسات کو پُر اثر طریقے سے بیان کرنا، شاعر ہی کا کام ہے ہم جیسے غیر شاعر تو حسرت سے یہی کہہ کے رہ جاتے ہیں۔
"آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں"
عرفی کی زبان سے کشمیر کے متعلق وہ شعر نکلا جو مبالغہ ہونے کے باوجود ہر شخص کی زبان پر اس طرح گویا وہ اس کی دل کی کیفیت بیان کر رہا ہے

ہو سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید
گر مرغ کباب ست کہ با بال و پر آید

اس شعر میں شیدائیت ہے مگر کوئی ذاتی رابطہ نہیں۔ چکبست کا قلب کس طرح متاثر ہوا اور وہ اس تاثیر کو کس الفاظ میں بیان کرتا ہے سنیئے:۔

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

"مرے کشمیر" میں کس قدر شدید رابطہ قلب پنہاں ہے۔ کس حسرت اور کس عقیدت سے ایک اور جگہ

لکھتے ہیں:۔

چھوٹے ہوئے اس باغ کو گزرا ہے زمانہ
تازہ ہے مگر اس کی محبت کا فسانہ
عالم نے شرف جس کی بزرگی کا ہے مانا
اٹھے تھے اسی خاک سے وہ عالم و دانا
تن جن کا ہے پیوند اب اس پاک زمیں کا
رگ رگ میں ہماری ہے رواں خون انھیں کا
ہاں میں بھی ہوں بلبل اسی شاداب چمن کا
ہے چشمۂ فردوس یہ عالم ہے دہن کا
کس طرح نہ سرسبز ہو گلزار سخن کا
ہے رنگ طبیعت میں چمن زار وطن کا
تازے ہیں مضامیں بھی طبیعت بھی رسی ہے
ہاں گلشن قومی کی ہوا سر میں بھری ہے

ہندوستان میں اپنی بے بسی کی حالت پر یا شاید اسی کشمیر کے شدید رابطۂ محبت نے یا کسی کشمیر کے فسوں گر نے جس کا جادو ان پر چل گیا تھا یہ شعر بھی ان کی زبان سے کہلایا ہے اُن سے جو وطنیت کا پرچار کرنے میں اپنا سارا زور صرف کرتے تھے۔

وطن میں ہے وطن مجھ کو کیا ہے اک فسوں گر نے
نہ میں ہندوستاں کا ہوں نہ ہے ہندوستاں میرا

ہمی اقبال بھی کہتا ہے:۔

ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیمایان ہند
اب سلیما کی نظر دیتی ہے پیغام فروش

چکبست مناظر قدرت کی تصویر موئے قلم کے اشاروں سے ایسی کھینچتے ہیں کہ اس کا نقش دل پر گہرا پڑتا ہے

کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں
ٹھہر گئی ہے بہار آکے اس گلستاں میں
نگہ کو دور سے پانی جو ہے نظر آتا
سفید ناگ چلا جا رہا ہے بل کھاتا

مسوری کے پہاڑ سے جنھوں نے وادئ دون کی ندیوں پر نظر ڈالی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ تصویر کس قدر صحیح ہے

دامان کوہ اس کے لیے ماں کی گود ہے
لیکن ذرا بھی چین نہیں آبشار کو

"دامان کوہ" کو آبشار کی گود نے تشبیہ دینا، کیسی تشبیہ نام ہے

باوجود جدت آفرینی کے، چوں کہ اساتذہ قدیم کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے کبھی کبھی اشعار میں پرانا رنگ بھی جھلک جاتا ہے۔

سبزہ باغ سے کہتی ہیں یہ شاخیں جھک کر
سر اٹھانے کی جگہ گلشن ایجاد نہیں

عالم یاس میں دریا سے یہ کہتا ہے حباب
غیر سیراب ہیں خالی مرا پیمانہ ہے

تیرے دل میں اور میرے دل میں ہے واعظ یہ فرق
وہ چراغ صبح ہے اور یہ چراغ شام ہے

اُن کی غزلوں میں مجھے ایسے اشعار بھی ملے جن میں دنیا کو دارِ فانی، عمر کو، عمر گریزاں گننے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اپنی موت کا بھی ذکر کیا ہے شعرا ر کوچہ یار میں اکثر شہید ہوتے ہیں اور ایک ٹھوکر سے جی اٹھتے ہیں اپنے مرنے کا اور طریقوں سے بھی ذکر کرتے ہیں۔

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مگر جس طرح چکبست نے اپنی موت کا ذکر کیا ہے وہ عرفی کے۔

"زنہار اے دلِ من از عمر فتاباں رفتم" کو یاد دلاتا ہے جس طرح عرفی کی پیشین گوئی پوری ہوگی۔ چکبست نے اپنے دنیا سے جانے کے متعلق جو کہا تھا وہ محض ایک شاعرانہ تخیل نہ نکلا بلکہ ادب اور ملک کی بدقسمتی سے وہ ایک صحیح پیشین گوئی نکلی۔

لے چلی بزم سے کس وقت مجھے مرگِ شباب
لب تک آیا بھی نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے

یہ ماتم ہے مصوّر اٹھ گیا گلزار قدرت کا
ہر اک طائر ہر اک برگِ چمن ہے نوحہ خواں میرا
مادرِ گیتی مدت تک ایسا مصوّر فطرت، پیدا نہ کرے گی

(بشکریہ آکاش وانی)

●●

نیاز فتحپوری

سخنور، شاعر اور اُستاد

چکبست کا لکھنؤ سے اتنا قدیم خاندانی تعلق تھا کہ وہ ان تمام ظاہری و باطنی خصوصیات کے لحاظ سے جو ایک شخص کو کسی خاص سرزمین سے وابستہ کر دیتے ہیں بالکل لکھنؤ کے انسان تھے، لکھنؤ کے شاعر تھے اور تمام لکھنوی عناصر اپنے اندر رکھتے تھے جن پر یہ قطعۂ زمین بہ لحاظ تہذیب و معاشرت یا ذہن و فراست فخر کر سکتا ہے

ہرچند انھوں نے تھوڑی سی عمر پائی، لیکن ایک خوش حال و معزز خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے اُن کو زمانہ سے زیادہ جنگ کرنا نہیں پڑی اور اس لیے اُن کی فطری ودیعتوں کو جلد ابھر جانے کا موقع ملا اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی انفرادی خصوصیت کے لحاظ سے ایک حد تک precocious بھی رہے ہوں۔ بہرحال یہ بات زیادہ حیرت کی نہ ہو لیکن قابل ذکر ضرور ہے کہ صرف ۴۳ سال کی عمر میں اُن کو وہ سب حاصل ہو گیا جو عام طور پر لوگوں کو اس عمر میں حاصل نہیں ہوتا۔

جس زمانہ میں انھوں نے ہوش سنبھالا، لکھنؤ کا میلان شاعری وہ نہ تھا جو اس وقت پایا جاتا ہے۔ تغزل پر ہنوز ناسخ کی بڑی گرفت قائم تھی اور جن شعراء نے اس سے چھٹکارا حاصل کیا بھی تو وہ داغ سے متاثر تھے۔ لیکن اس قدیم اختلاف کی وجہ سے جو لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی داد کو یہاں سے باہر نہ جانے دیا اور امیر مینائی کو اُس کا مقابل سمجھ کر صنم خانہ عشق کی پرستش کرنے لگے اور حیرت ہے کہ جلال کی طرف اُن کی نگاہ نہ گئی جو داغ کی چوچلے والی شاعری میں بھی ایک خاص وزن رکھتا تھا۔ بہرحال چکبست کا ابتدائی زمانہ وہ تھا جب لکھنؤ میں تغزل کا رنگ ملا جلا ناسخی و امیری تھا یعنی عشق و محبت میں بھی عروض و قافیہ، ایہام و رعایت لفظی کا ہوش انھیں باقی تھا اور اس لیے یہاں کی شاعرانہ فضا میں "زہر عشق" اور "گلزار نسیم" دونوں کے جراثیم پائے جاتے تھے۔ غزل

کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی جس سے لوگ متاثر بھی تھے اور مرغوب بھی اور وہ انیس کے مراثی تھے۔ مسدس کی شکل میں۔ یہ وہ صنف شاعری تھی جس میں انیس کا کوئی مدمقابل نہ تھا اور چوں کہ اس سے بڑی حد تک لکھنؤ کا فنی شوق شاعری بھی پورا ہوتا تھا اس لیے اس کی بڑی قدر تھی، یہاں تک کہ محسن کاکوروی نے اپنا مجموعۂ نعت بھی اسی زبان ولب ولہجہ میں مرتب کیا اور اگر میرا قیاس غلط نہیں تو شاید چکبست نے بھی، سب سے پہلے ۱۸۹۸ء میں جب کہ اُن کی عمر پندرہ سال کی تھی مسدس ہی لکھا جس کا عنوان "جلوۂ صبح" ہے۔ اور جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک انیس سے متاثر تھے چند بند ملاحظہ ہوں۔

جب رنگِ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور
ہنگامِ سحر کون و مکاں ہو گئے پُر نور
تبدیل ہوئی صورت کو شبِ دیجور
چمکا وہ تجلّی سحر سے صفت طور
بجلی کی طرح چرخ پہ نورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر خرمنِ انجم نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم
مرغانِ ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
ہنگام سحر بادِ سحر چلتی تھی پیہم
آرام میں سبزہ تھا تہِ چادرِ شبنم
ہر سمت بندھی نعرۂ بلبل کی صدا تھی
غنچوں کی نسیم سحری عقدہ کشا تھی

رونق پہ دم صبح تھا خم خانۂ عالم
تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سردی بھی تھی کم کم
پیمانۂ مہتاب تھا لبریز سحر دام
تھا جام صبوحی کے لیے نیّر اعظم
گردوں پہ شفق کی بھی عجب جلوہ گری تھی
مینائے فلک میں مئے گلرنگ بھری تھی

آپ گر ان بندوں کو انیس کے کسی مرثیہ میں شامل کر دیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی اور کا کلام ہے بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ چکبست کی شاعری کا آغاز ہی اس رنگ سے ہوا ورنہ عام طور پر نوجوان لوگ جب شاعری کرتے ہیں تو اس کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ چکبست فطرتاً بہت سوچنے والا دماغ لیکر آئے تھے۔ اور ان کے احساس شاعرانہ میں فکر فلسفیانہ کا جزو زیادہ شامل تھا۔ محبت کسی سے انھوں نے کی ہو یا نہ کی ہو لیکن محض اُس کی داستان لے بیٹھنا اُن کے حوصلۂ سخن سے فروتر چیز تھی اور اسی لیے وہ اپنی غزل میں بھی ایک بار اس حقیقت کے اظہار سے باز نہ رہ سکے کہ

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں
عروس شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

سو اس میں شک نہیں کہ انھوں نے عام لکھنوی شعراء کے مقابلے میں نیا مسلک بھی اختیار کیا اور عروس شعر کو بھی بڑی حد تک قید سے آزاد کیا یعنی انھوں نے اپنی نظموں کا رخ کام کی باتوں کی طرف پھیر دیا۔ اور غزلوں میں بھی وہ نقوش چھوڑ گئے جو بالکل مستقبل کی چیز تھی۔

جس طرح انھوں نے منظومات میں پہلے پہل "جلوۂ صبح" ایسی خالص ادبی نظمیں کہیں۔ اسی طرح انھوں نے غزل میں بھی اول اول ایسے شعر کہے جو بڑی حد تک غیر متغزلانہ تھے۔ مثلاً

کہتے ہیں جسے ابر وہ میخانہ ہے میرا
جو پھول کھلا باغ میں پیمانہ ہے میرا

عاشق بھی ہوں معشوق بھی یہ طرفہ مزا ہے
دیوانہ ہوں میں جس کا وہ دیوانہ ہے مرا

لیکن جب وہ سن وقوت کو پہونچے اور سیاسی ماحول نے اُن کے قوائے ادبیہ کو متاثر کیا تو پھر اُن کی شاعری کا داخلی و خارجی رنگ ایک ہو گیا یعنی جو تقاضائے فطرت تھا وہی ان کی زبان سے نکلنے لگا اور جس چیز کے احساس کیلئے اُن کا دماغ پیدا ہوا تھا وہی اُن کے قلم سے ظاہر ہونے لگا۔ یعنی اگر انھوں نے نظموں میں "خاک ہند" "آوازہ قوم" "نالۂ درد" ایسی نظمیں کہنا شروع کیں تو اُن کے تغزل میں بھی ایک مفکرانہ پختگی پیدا ہو گئی۔

چوں کہ میرا موضوع اُن کے کلام کی خصوصیت پر گفتگو کرتا ہے اس لیے میں اس اجمال کو ذرا واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اُن کا مجموعہ کلام (کلام سے میری مراد صرف مجموعۂ نظم ہے) جو "صبح وطن" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پانچ حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے دو حصوں میں سوائے تین آخری نظموں کے سب کی سب ادبیات ملّی سے تعلق رکھتی ہیں یعنی اُن میں کسی نہ کسی عنوان سے وطنیت کے جذبات کو ابھارا گیا ہے یا قومی احساس کو بیدار کیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں وہ نظمیں ہیں جنھیں بجائے احباب و اکابر کا مرثیہ کہنا، زیادہ موزوں ہوگا۔ چوتھا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے اور پانچواں حصہ ان کے ابتدائی کلام پر اور غالباً اصول انتقاد کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان کے کلام کا مطالعہ اسی آخری حصہ سے شروع کریں۔

اس حصہ میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی نظم وہ ہے جو نوجوانان کشمیر کے ایک سالانہ جلسہ میں اس پندرہ سال کے نوجوان کشمیری نے پڑھی تھی اور حیرت ہوتی ہے کہ اس کم سنی میں ایسے جذبات کہن سال کیونکر اُن کے اندر پیدا ہو سکے اور بیان کی کہ یہ قدرت انھیں کس طرح حاصل ہوئی۔ اس مسدس کی ابتدا ربالکل انیس کے رنگ میں ہوتی ہے وہی جوش، وہی شوکت، وہی رکھ رکھاؤ اور وہی روانی پہلا بند ملاحظہ ہو۔

ہاں نور ازل جلوہ گفتار دکھا دے
ہاں شمع زباں مطلع انوار دکھا دے
ہاں طبع رواں قلزم ذخار دکھا دے
ہاں رنگ سخن گلشن بیخار دکھا دے
گلزار معنی کا مہکتا نظر آئے
طوطی چمنستاں کا چہکتا نظر آئے

اس کے بعد سرزمین کشمیر کی رنگینیوں کا ذکر بھی اسی انداز سے کیا ہے

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کو وہ پیر لالے کا لہکنا
مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا

پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ جیسے پاؤں نسیم سحری کا

لیکن بعد میں جب قوم کی نکو نسازی کا بیان شروع ہوتا ہے تو اس میں حالی کا سا سوز و گداز درد پیدا ہو جاتا ہے اور اگر ہم اس مخصوص لب و لہجہ اور وزن و سنجیدگی کو نظر انداز کر دیں جو پختگی عمر کے بعد ہی حاصل ہونے والی چیز ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کم سنی میں وہ اس قدر پاکیزگی کس طرح اپنے کلام میں پیدا کر سکے۔

یہ نظم ۱۸۹۸ء کی ہے لیکن اس کے دو سال بعد ہی جب وہ گورنمنٹ وکٹوریہ کا نوحہ لکھتے ہیں تو اس کا انداز بیان کچھ اور ہوتا ہے۔ الفاظ کی جستجو کے بجائے مفہوم کی طرف زیادہ توجہ پائی جاتی ہے اور اسے یوں شروع کرتے ہیں۔

اے آفتاب اوج عمارت کہاں ہے تو
اے شمع بزم حسن لیاقت کہاں ہے تو
اے عندلیب باغ فصاحت کہاں ہے تو
اے خضر شاہراہ فراست کہاں ہے تو
اے رہ نوردِ عالم بالا چگونۂ
ما بے تو خستہ ایم تو بے ما چگونۂ

ہر چند شوکت الفاظ کا اس میں بھی خیال رکھا گیا ہے لیکن بہ نسبت پہلے مسدس کے اس میں روانی زیادہ پائی جاتی ہے۔ چکبست کا کلام بہت زیادہ نہیں ہے کیونکہ شاعری اُن کا وظیفہ نہیں تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ باوجود اس مشغلہ کے اُن کی ہر آئندہ نظم پچھلی نظم سے ترقی یافتہ ہوتی تھی اور اگر آپ سلسلۂ تاریخ کے لحاظ سے اُن کی منظومات کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت آسانی سے واضح ہو جائے گی۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں ایک مسدس جو دردِ دل کے عنوان سے لکھا ہے اس کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

اور ہوں گے جنھیں رہتا ہے مقدر کا گلہ
اور ہوں گے جنھیں ملتا نہیں محنت کا صلہ
میں نے جو غیب کی سرکار سے مانگا وہ ملا
جو عقیدہ تھا مرے دل کا ہلائے نہ ہلا
کیوں ڈراتے ہیں عبث گبر و مسلماں مجھ کو
کیا مٹائے گی بھلا گردشِ دوراں مجھ کو

آپ نے دیکھا کہ ۱۸۹۸ء کے مسدس سے ۱۹۰۱ء کا مسدس اور ان دونوں سے ۱۹۱۳ء کا مسدس کتنا نمایاں امتیاز رکھتا ہے لیکن چکبست کی فکر اپنی پختگی کے لیے ابھی کچھ اور زمانہ چاہتی تھی اور احساس کی زیادہ تلخیاں اُسے درکار تھیں۔ چنانچہ چند سال کا زمانہ اور ختم ہوا اور جب ۱۹۱۶ء میں نالۂ یاس کے عنوان سے ایک نظم انھوں نے لکھی تو اُس کا یہ رنگ تھا۔

کیا کہیں کس سے کہیں ہم آج کیا کہنے کو ہیں
آخری افسانۂ شوقِ وفا کہنے کو ہیں
جن امیدوں کی لڑکپن میں ہوئی تھی ابتدا
آج اُن کی انتہا کا ماجرا کہنے کو ہیں
بے خبر اب بھی نہیں ہم قوم کے دکھ درد سے
پہلے ہمت تھی دوا کی اب دعا کہنے کو ہیں

آپ نے غور کیا ہوگا کہ اب شراب کتنی رسا ہو گئی ہے انداز بیان میں کتنی آمد پائی جاتی ہے۔ سلاست و روانی

نے جذبات کے نقش کو کتنا حقیقی رنگ دے دیا ہے
پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ بلا وساطت،
الفاظ براہ راست مفہوم تک پہونچ گیا ہے اور یہی ہے
شاعری کا ارتقار۔

چکبست کے کلام کا اکثر حصہ اسی طرح کی قومی
و وطنی نظموں پر مشتمل ہے اور ان سے ہٹ کر جو چند نظمیں
اُن کی پائی جاتی ہیں وہ بھی وطنیت کا شدید جذبہ اپنے
اندر لیے ہوئے ہیں اسی طرح کی نظموں میں "رامائن کا
ایک سین" مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے راجہ رام چندر
جی کا اپنی والدہ سے رخصت ہونا دکھایا ہے لیکن اس
کے دیکھنے کا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن کی ابتدائی زمانے
کی نظم ہے اور یکسر انیس کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے
ابتدا کے دو بند ملاحظہ ہوں :۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

انیس نے بھی اس قسم کے مناظر کی تصویر [illegible] الفاظ
میں پیش کی ہے۔ ان کے نوحے بھی مختلف [illegible] کے
لکھے ہوئے ہیں اور ان کے انداز بیان میں [illegible] تدریجی
ارتقار پایا جاتا ہے جو مسدسوں میں نظر آتا ہے گنگادھر
تلک کے نوحہ کا آغاز یوں کرتے ہیں۔

موت نے رات کے پردے میں کیا کیسا وار
روشنی صبح وطن کی ہے کہ ماتم کا غبار

معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ [illegible] باقی نہیں سونا ہے کچھار
بیکسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

کیسا جوش ہے کیسی خوبصورت بندش ہے [illegible] کیسے پر
شوکت الفاظ ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خاص کاوش
سے کام لے کر لکھا گیا ہے لیکن جب اس کے کئی سال
بعد وہ اپنے کسی عزیز کا نوحہ لکھنے بیٹھے ہیں تو اس کا
اختتام یوں کرتے ہیں:۔

جہاں میں دیکھے ہیں ایسے بھی [illegible] شجر
سدھارتے ہیں جو گلشن سے پھول کر پھل کر
نظر سے گزرتے ہیں آئینے بھی نخل بارآور
جو سوکھ جاتے ہیں فصل بہار میں [illegible]
مگر بہار و خزاں تھی نہ اس [illegible]
[illegible] زمین سے اس نے اٹھایا تھا [illegible]

ان کی غزلوں کا حصہ نظموں کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن
[illegible] سے [illegible] تک ان کی کاوشیں ہیں جو [illegible]
سے ملتی ہیں [illegible] میں ان کے تغزل کا جو رنگ تھا وہ

نہ وہ ناسخی تھا نہ آمیری۔ بلکہ ایک حد تک اس قدر مبہم تھا کہ ہم اس کو دیکھ کر آئندہ کیلئے کوئی حکم نہ لگا سکتے تھے لیکن اس کے پانچ سال بعد اُس نے جو رُخ اختیار کیا وہ وہی تھا جسے عزیز لکھنوی نے تکمیل کو پہونچایا مثلاً :

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

نہیں ہوتا ہے محتاجِ نشیمن فیض شبنم کا
اندھیری رات میں موتی لٹا جاتی ہے گلشن میں

لیکن اسی زمانے میں ان کا جذبۂ وطن پرستی غزلوں میں بھی اپنا کام کرنے لگا۔ چناں چہ لکھتے ہیں :۔

ہم پوچھتے ہیں باغِ وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنے پھول سمجھتے ہیں خار کو

رونقِ دل ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اُجڑے ہوئے گھر میں

اور پھر چند سال بعد ان کے تغزل میں جو پختگی پیدا ہوئی تو اس کا رنگ ادھر بھی کچھ تھا ملاحظہ ہو :۔

انھیں یہ فکر ہے ہر دم نئی طرزِ جفا کیا ہے
ہمیں یہ شوق ہے دیکھیں ستم کی انتہا کیا ہے

مزا شباب میں ملتا ہے خوں بہانے کا
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

جو تو کہے تو شکایت کا ذکر کم کر دیں
مگر یقیں ترے وعدے پہ لا نہیں سکتے

اس میں شک نہیں کہ چکبست غزل گوئی کے لیے پیدا نہ ہوئے تھے لیکن یہ بھی اُن کی ذہانت اور خوش ذوقی کا کمال تھا کہ جب اس زمین کی طرف توجہ کی تو وہاں بھی آسمان کے تارے توڑ کر دکھا دیئے۔ آپ اُن کا سارا کلام پڑھ جائیے۔ کسی ایک جگہ بھی کوئی رکیک جذبہ یا لفظ نظر نہ آئے گا اور یہ خصوصیت چکبست کی اس انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے جس میں کوئی لکھنوی شاعر اُن کا شریک نہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

قدرداں کیوں مجھے تکلیفِ سخن دیتے ہیں
میں سخنور نہیں، شاعر نہیں، استاد نہیں

لیکن یہ اُن کا انکسارِ شاعرانہ ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سخنور بھی تھے، شاعر بھی تھے، اُستاد بھی تھے

سید احتشام حسین

چکبست بہ حیثیت پیامبر دورِ جدید

چکبست کو دورِ جدید کا پیامبر کہہ سکتے ہیں یا نہیں یہ بات اسی وقت طے ہو سکتی ہے جب زمانہ اور وقت کے لحاظ سے دورِ جدید کا تعین کیا جا سکے یا پھر یہی معلوم ہو سکے کہ دورِ جدید کہتے وقت ہمارے پیشِ نظر کون کون سی خصوصیتیں اور کون کون سے رجحانات ہوتے ہیں۔

تاریخ کا تسلسل اور اسباب نتائج کا مربوط رشتہ قدم قدم پر ہمیں واقعات کو قدیم اور جدید میں تقسیم کرنے سے روکتا ہے۔ درحقیقت مادی وسائل کی تبدیلیاں، معاشی و معاشرتی زندگی کے تغیرات، ہمارے رجحانات پر مادی معلوم ہوتے ہیں دنیا میں روحانیت اور جذبات کی ہم یکسانیت سے نہیں بلکہ معاشی کشاکش کی ٹھوس حقیقت سے رجحانات میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور تاریخی ادوار بنتے بگڑتے ہیں۔ ادب اس سے اپنا دامن بچا نہیں سکتا کوئی تحریک جو تہذیب و تمدن کو وقت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے، سیاست دانوں اور مدبروں کی زبان سے نکلتی ہے شاعروں کے ہاتھ میں پہونچ کر ادبی حقیقت بن جاتی ہے اس طرح وقت کی تبدیلیوں پر غور کرنے اور حالات کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ہی تاریخ کے ٹکڑے کرنے بھی پڑتے ہیں اردو ادب کی تاریخ کو ہندوستان کی مجموعی معاشرتی اور سیاسی تاریخ کے برابر رکھ کر ٹکڑے کرنے سے ایک بہت اہم منزل ۱۸۵۷ء کے قریب نظر آتی ہے یہیں سے ہندوستانی سیاست کے ساتھ ہندوستانی ادبیات میں بھی ایک نیا دور شروع ہو جاتا آگ اور خون کے اس کھیل میں ہندوستان نے اگر ایک طرف، بہت سی چیزیں کھوئیں تو دوسری طرف کچھ چیزیں ہاتھ بھی آ گئیں۔ سلاحِ جنگ جسم سے اتار لیا گیا تو اس کے اترنے کا احساس پیدا ہونا شروع ہوا۔ اقتصادی غلامی کا شکار بنائے گئے تو چند نئے علوم کے دروازے بھی کھل گئے غیر ملکی حکومت نے قدم اچھی طرح جمائے تو ایک نئی محبت کا قومی اور ملکی تصور بھی دلوں میں بیدار ہونے لگا۔

غرضکہ ہندوستان کی تاریخ کے اس اہم واقعہ نے کم سے کم ہندوستان کے لیے ایک نیا دور پیدا کر دیا جو آخرکار بڑھتے بڑھتے اور پھیلتے پھیلتے، حاکم و محکوم کے اس تصادم کی شکل میں نمودار ہوا جو قوموں کی غلامی اور اقتصادی تاراجی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اس وقت ہمارے سامنے ایک اور عالمگیر دور جدید ہے جو ۱۹۱۹ء کے بعد سے ساری دنیا میں تغیرات کا سبب بنا لیکن چکبست کا تعلق اس دور سے نہیں۔ وہ اس جدید ترین دور کے اساسی اصولوں تک نہ پہنچ سکے ان کا دور وہی قومی اور وطنی بیداری کے احساس کا دور ہے جو غدر کے کچھ عرصہ بعد کانگریس کا بھیس بدل کر اور آہستہ آہستہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتا گیا۔

انیسویں صدی جاتے جاتے ہمیں ایک مبہم سا قومی تصور دیتی گئی اور چکبست اسی دور کی پیداوار ہیں تقریباً ۱۹۱۴ء تک ہندوستانی بیداری کا یہی پیام رہا کہ ہم میں وطن کی محبت پیدا ہو، وطن سے محبت کرنے والوں سے محبت پیدا ہو ہندوستان کو ایک قومی حیثیت دی جائے اور انتظام ملکی میں ہندوستانیوں کا بھی ہاتھ ہو۔ ہماری سماجی زندگی میں مغرب کے میل سے کچھ اور وسعت پیدا ہو۔ کانگریس انقلابی نہیں بلکہ اصلاحی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی، اس کی آواز میں وزن پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی فریاد میں تلخی محسوس ہونا شروع ہو چکی تھی لیکن بہت آہستہ آہستہ، ہندوستانی اپنے اوپر کوئی بڑا بوجھ لینے کو تیار نہیں معلوم ہوتے تھے کیوں کہ انگریز مورخین اور مدرسین کی تحریروں نے انھیں یقین دلایا تھا کہ وہ اس قابل ہی نہیں۔ قوم کی رہنمائی متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور ناعاقبت اندیشی کرنیوالے آگے زیادہ دور تک نہیں دیکھ رہے تھے۔ چکبست اسی ہندوستان کے شاعر تھے۔ ان کا پیام اسی ہندوستان کا پیام تھا جو اس وقت کے لحاظ سے کارہنیہ معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ انھیں دنوں میں روس ایک انقلاب کے آغوش میں تھا، چین نے ایک جمہوری نظام قائم کر لیا تھا لیکن ہندوستانی رہنما جاپان کی قومی ترقی سے اتنا مسحور تھے کہ اُن کی نگاہیں حب الوطنی اور قومی ترقی سے آگے جاتی ہی نہ تھیں، سارے ہندوستان میں چند انقلاب پسند ہندوستانی تغیرات کو اس قوامی تبدیلیوں کے پس منظر میں دیکھ رہے تھے، لیکن اُن کی کوشش انفرادی تغیرات کو بین الاقوامی تبدیلیوں سے زیادہ نہ تھیں اردو کے ایک شاعر نے مزدوروں کو انقلاب کے لیے جنگ عظیم کے بعد ہی آواز دی تھی لیکن اس کی آواز علمی اور عالمانہ، وسعت نظر کی حدود میں قید ہو کر رہ گئی اس نے خضر بن کر مزدوری کو پیام دیا تھا۔

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

لیکن اس وقت یہ آواز صحرا میں بلند ہوتی تھی۔ بنگال کے نغمہ نواز نے پہلے ہی اس دنیا کی تھی جہاں دماغ آزاد ہو اور انسانیت غلامی کے دکھ نہ اٹھا رہی ہو۔ لیکن، تصوف کے استعارات نے اسے پیغام عمل نہ بننے دیا، انفرادی کوششیں ہندوستانی سیاست یا ادب کے عام رجحانات میں شمار نہیں کی جا سکتیں۔ ۱۹۱۷ء تک ہندوستان

برطانیہ کی محبت سے سرشار تھا۔ اسی کے دامن سے
لپٹا ہوا تھا کیوں کہ جدا ہونے کے وقت روس اور دوسری
طاقتوں کے خوفناک بھوت اس کے راستہ میں حائل
نظر آتے تھے۔ چکبست اسی دور کے شاعر تھے ، وہ
حب وطن سے مست و بیخود تھے، وہ ہندوستان کا
بھلا چاہتے تھے۔ وہ پرانی روشیں ترک کرنے پر
اکساتے تھے، وہ معاشرت میں تبدیلیاں چاہتے
تھے۔ ان کے پاس ایک اثر انگیز زبان تھی اور ایک
درد مند دل، اس لئے وہ اپنے پیاسوں میں رنگا،
رنگ جلوے بھر دیتے تھے وہ ان میں اپنے دل کی
گرمی اور اپنے سینے کا گداز منتقل کر دیتے تھے ہماری
غلطی ہوگی اگر ہم چکبست کے یہاں کوئی بین الاقوامی
نقطہ نظر تلاش کریں۔ اگر ہم ان کے یہاں کوئی سیاسی
فلسفہ ڈھونڈیں، اگر ہم ان سے عصر حاضر کے جمہوری،
نظریہ کا شاعرانہ بیان سننا چاہتے ان کے جذبات
وخیالات اس ہندوستان سے وابستہ تھے۔ جس میں
گوکھلے اور بشن نرائن در کی آواز گونج رہی تھی، اور
جنھوں نے حب وطن کا درس دے کر ایک اصلاحی،
پروگرام ہندوستان کے سامنے رکھا تھا شکایت کرنے
والے دبی زبان سے یہ شکایت ضرور کرسکتے ہیں کہ
۱۹۲۰ء کے بعد سے جو اہم سیاسی تغیرات ہو رہے تھے
اور جس تیزی سے ہندوستان آگے بڑھ رہا تھا اس
کے ساتھ چکبست کا قدم نہ اٹھ سکا انھوں نے دنیا
کی اور زیادہ ترقی پسند تحریکوں سے ہندوستان،
کے لئے کوئی بلند تر پیام تلاش نہیں کیا۔ مگر شاید
اس کا یہ جواب دیا جا سکے۔ ان کے مختصر مجموعہ میں ۱۹۱۰ء
سے ۱۹۲۶ء تک نظموں کی تعداد تقریباً نہ ہونے کے برابر
ہے۔ غالباً پیشہ کی مصروفیتوں نے انھیں دماغ اوھر
لگانے ہی نہ دیا۔

چکبست کی شاعری کا اگر تجزیہ کیا جا سکے تو
سیاسی تصورات کے علاوہ وہ چند تمدنی اثرات کا عکس
بھی ملے گا۔ ان کا گھر لکھنؤ میں تھا اور اگرچہ اودھ کی
تہذیب جس کی لطافت اور نفاست تصنع کے حدود
میں داخل ہوگئی تھی۔ مٹ چکی تھی لیکن اس کا عکس آج
بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ چکبست کی شاعری میں وہی لطافت
دکھائی دیتی ہے انھوں نے آتش کی رندی اور بے باکی
آزادی اور بانکپن میں۔ انیس کی مرصع کاری کا پیوند لگا
دیا دونوں چیزیں ان کے مزاج اور تصور حیات سے گہرا
تعلق رکھتی تھیں چکبست نے اپنے موضوعات کی مناسبت
سے لکھنؤ کی شاعری کو ایک نئی راہ پر لگانے کی کوشش
کی ہے یہ کوشش نظموں میں کامیاب ہوگئی ہے۔ لیکن
غزلوں میں تغزل کے فقدان کا سبب بن گئی ہے چکبست
کے یہاں کسی مخصوص ذہنی ارتقا رنگ نہیں جھلکتا اور
چونکہ ان کا انداز بیان تقریباً ہمیشہ یکساں رہا اس لئے
اس پختگی کے علاوہ جو عمر کے ساتھ پیدا ہو جاتی ہے۔
موضوعات کے انتخاب میں کسی گہرائی کا مخصوص پتہ نہیں
چلتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے تصورات میں وقت
کی عام جھلک پاتے ہیں۔ وہ سیاسی مفکرین کی طرح،
کوئی نیا نظام ترتیب نہیں دے رہے تھے بلکہ ہندوستانی
رہنماؤں کے عام جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے وہ

انھیں کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ صرف
اپنے شدتِ احساس سے اسے بُرا اثر بناتے تھے شراب
وہی تھی جو لیڈروں کے پیمانے میں تھی۔ وہ اسے جوش
دیگر دو آتشہ بناتے تھے۔

ہندوستان اپنی گزشتہ عظمتوں کی یاد دل میں لئے
ہوئے بیٹھا تھا اور چکبست اس کے ماضی اور حال کا
مقابلہ کر رہے تھے اسے ان بزرگوں کی یاد دلا رہے تھے
جن کی عظمتوں کا راز ہمالیہ کے سینہ میں پوشیدہ تھا اور وہ
پھر ہندوستان کو اسی ترقی پر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی
شاعرانہ نگاہ کو ہندوستان ایک "لاشِ بے کفن" نظر
آرہا تھا اور شعلہ نہیں "صورِ حب قومی" کو پکارتے تھے
کہ وہ ہندوستان کو خواب سے جگا دے، انقلاب کی
آواز ان کے کانوں میں بھی گونج رہی تھی لیکن صاف
نہ تھی۔

یہ خاک ہند سے پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالیہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھاتا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے اور ہوم رول کا ہے
یہ جوش پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خوں کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جسے پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم، ہوم رول کے بدلے

یہ وہی ہوم رول ہے جس کو آواز بلند کرنے کے
جرم میں مسز بسنٹ کو قید کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ اور
چکبست نے اس کا بے حد اثر لیا لیکن اسی نظم میں جہاں
ہڈیاں بیدار ہوئی تھی اور لہو رگوں میں برق کی رفتار
دکھا رہا تھا وہ اس جوش و خروش کے وجود اسی مرکز
پر آجاتے ہیں جہاں اس وقت کی سیاست ہندوستانیوں کو
لے جانا چاہتی تھی۔

یہ آرزو ہے کہ ہر وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں صبح و شام رہے
نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیر دام رہے
سر پہ شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

بدلا ہوا زمانہ ہر حساس انسان کو اپنی جانب متوجہ کر رہا
تھا جو جس جگہ تھا وہیں سے اس تغیر کو دیکھ رہا تھا اور
ہندوستان کو ذہنی اور مادی ارتقا کی جانب لیجانے
کے لئے بےچین نظر آتا تھا چکبست عوام سے زیادہ صاف
طریقہ پر اس کا اندازہ لگاتے تھے جیسے ان کے سینے
میں کوئی شعلہ مقید تھا جو پوری طرح نکل سکتا تھا لیکن
دیکھنے والے اسے پہچان سکتے تھے۔ چکبست نے خود
اشارہ کیا ہے ۔

ہمارے شوق میں تم بے بس ہو نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

وطن پرستی، آزادی خیال، قومیت کا ایک مبہم تصور اور
معاشرتی اصلاح، یہی چکبست کی شاعری کا پیام تھا۔

اب ہمیں اسی میں دیکھنا ہے کہ وہ کس حد تک ہندستانیوں میں وہ ذہنی بیداری پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے جو ہر انقلاب کے پہلے ضروری ہے کوئی نئی چیز، کوئی نئی بات ایک بدلتی ہوئی دنیا اس پر بار بار ان کی نگاہیں جاتی تھیں، اور ان تغیرات کے آثار کا دیکھ لینا اور اس شاہراہ کی جانب اشارہ کر دینا ہی خود ایک مستقل پیام ہے جسے ہم فراموش نہیں کر سکتے، یہ اور بات ہے کہ آج ہمارا نصب العین کہیں اور پہونچ گیا ہے آج ہمارے خیالات میں عالمگیر انسانیت کا درد پیدا ہو گیا ہے اور ہمارا نعرہ انقلاب نئی قوت پیدا کر چکا ہے لیکن ۱۹۱۷ء سے پہلے کا ہندوستان اپنے حدود میں صرف اسی روشنی کو دیکھ سکتا تھا جو کہیں دور جگمگا رہی تھی۔

چکبست اس نئی چیز کو دیکھ رہے ہیں۔

وطن کے عشق کا بت سے نقاب نکلا ہے
نئے افق پہ نیا آفتاب نکلا ہے

نگاہ شوق کو ہے دور نو کی مشتاقی
نئی شراب نیا دور ہو نیا ساقی

"نئے افق" پر "نئے آفتاب" کا جلوہ دیکھنا اور "دور نو" کا مشتاق بن کر "نئی شراب" اور "نئے ساقی" کی جستجو کرنا اسی میں بہت سے نیم بیدار سیاسی اشارات چھپے ہوئے ہیں۔ ان کے ذہن میں ایک نئی دنیا صورت پذیر ہو رہی تھی جس میں "پرانی روشوں کے لیے جگہ نہ تھی"

جو پرانی روشوں کیلئے رہتے ہیں خراب
ان کی صورت سے اب آتا ہے زمانہ کو حجاب

اس نئے دور کو پہچان کر چکبست اس وقت کے سیاسی تقاضے کو پورا کر رہے تھے وہ سیاسی تقاضا تھا زر سار پر طانیہ ہوم رول حاصل کرنے کی جد و جہد کرنا برطانیہ کو وفاداری کا برابر یقین دلاتے رہنا اور کبھی دبی زبان میں شکایت کے چند الفاظ کہہ جانا۔ خوشحال متوسط طبقہ عوام کی ضروریات سے بے خبر تھا۔ اسے اپنی ملازمتوں کی فکر تھی، کونسلوں میں اپنی نشستوں کا تعین کرانا تھا۔ چکبست کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا لیکن ان کا ذہن (غالباً شاعرانہ ذہن) کبھی کبھی ملک کے افلاس اور اقتصادی تاراج کی جانب بھی جاتا تھا۔ جنہیں غیر ملکی حکومت کا عطیہ کہا جا سکتا ہے یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزی شہنشاہیت غیر آباد جزیروں اور نیم تہذیب یافتہ قوموں کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھر رہی تھی۔ اسکے جہاز سمندروں کے سینوں پر ہر طرف رواں دواں تھے کہ کہیں کوئی جگہ مل جائے جس کی وہ مالک اور آقا بن سکے ؎

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ سے
نکلے ہیں لوٹنے چمنِ روزگار کو

وطن میں بے وطن کیا ہے مجکو اس تنگ نے
نہ میں ہندوستان کا ہوں نہ ہے ہندوستاں ہمارا

ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

لیکن یہ خیال، معاشی بیچارگی کا یہ بنیادی تصور

جو حب وطن کو بڑھا سکتا تھا جو قومی شیرازہ بندی ر
یں کام آسکتا تھا، جیسا سے سیاسی بیداری اچھی طرح
پیدا ہو سکتی تھی، بہت کم ہے یہ باتیں ڈرتے ڈرتے
ہی گئی ہیں کیوں کہ زبان پر بھی تو بڑی پابندیاں عاید
تھیں جس کا ذکر غالباً چکبست سے زیادہ کسی اور نے
نہیں کیا ہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

مجھ کو مل جائے چہکنے کیلئے شاخ مری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیاد رہے

زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز
ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز
چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہوم رول کا لفظ ایک اور بات یاد دلاتا ہے جب ہم کسی
انقلاب کے متعلق سوچنے لگتے ہیں تو ہمیں اس کی فکر بھی
لگ جاتی ہے کہ کن قوتوں کے اکٹھا کرنے سے ہمارا
محاذ مضبوط ہو سکتا ہے، جب ہم سامراج سے ٹکر لینے
کا خیال کرتے ہیں تو تمام سیاسی جماعتوں میں کوئی مرکزی
اور بنیادی تصور تلاش کرکے ایک مضبوط متحد محاذ
قائم کرنا چاہتے ہیں، یہ سوال اس وقت بھی سب کے
سامنے آتا ہے، ہوم رول منزل مقصود بن چکا تھا۔ آئینی
تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہو رہی تھیں اور حکومت برطانیہ
ایک حکومت خود اختیاری کا وعدہ کر چکی تھیں لیکن
دقت یہ تھی کہ ہندوستان میں خود مختلف جماعتیں مختلف
جھنڈوں کے نیچے جمع تھیں، انھیں ایک ہو جانا چاہیے
اور کسی بڑے تصور پر ایک ہونا چاہیے تھا چکبست نے
شاعرانہ انداز میں اسے پیش کیا ہے

رقیب کہتے ہیں رنگ وطن نہیں یکساں
بنا ہے قوس قزح خاک ہند کا داماں
جدھر نگاہ اٹھے اس طرف نیا ہے سماں
نہ ایک رنگ طبیعت نہ ایک رنگ زباں
جو ہوم رول پہ ہر چشم شوق شیدا ہو
تمام رنگ میں ایک نور پیدا ہو

اس بند میں اس حکیمانہ نقطہ سے قطع نظر کرکے جس میں
"رنگ" اور "نور" کی حقیقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے
بڑی بات یہی ہے کہ ان کے خیال میں قومیت کے لیے
ایک رنگ طبیعت ایک زبان اور ایک مذہب ضروری
نہیں بلکہ کسی بڑے سیاسی تصور کی ضرورت ہے، کسی
نصب العین کی ضرورت ہے اور پھر دوسرے سوالات،
خود بخود حل ہو جائیں گے اسی ہوم رول کو انھوں نے اپنا
نعرہ بنالیا تھا اور اسی پر ہندوستان کے سیاسی شعور کی
بنیاد رکھنا چاہتے تھے

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کے لئے درد دکھ اٹھائیں گے
یہی پیام وفا قوم کو سنائیں گے

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

ہمارے واسطے زنجیر و طوق گہنا ہے
وفا کے شوق میں گاندھی نے جسکو پہنا ہے
سمجھ لیا ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری در زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

آج یہ ذکر کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت کے سیاسی مدبروں کی طرح چکبست بھی بار بار برطانیہ کی خوشنودی کا راگ ہمیں سناتے ہیں وہ ہندوستان کے نوجوانوں کو جرمنی کی توپوں کا نشانہ بنانے کے لیے بھیجتے وقت ہندوستان کی شہرت صرف اسی میں چاہتے ہیں کہ دنیا برطانیہ کے ان غلاموں کا ولولہ جنگ دیکھے اور حیران ہو جائے ؎

جاں نثار آج تمھارا سا زمانے میں نہیں
ہاں دکھا دو کہ ہو تاج شہ لندن کے نگیں
دوست کیا چیز ہیں دشمن ہوں فدائے تمھیں
آسماں وجد کرے بول اٹھے رن کی زمیں

یوں تو لٹنے کو بہشت کے ٹکڑے نکلے
اور ہی شان سے لیکن یہ وفادار لٹے

گوکھلے کا مرثیہ بھی ان جذبات کے اظہار سے نہ بچ سکا ؎

پیام شہ نے دیا رسم تعزیت کے لئے
کہ تو ستون تھا ایوان سلطنت کے لئے

مگر کیا کیا جائے جنہیں موجودہ سیاسی فضا آج ایسے خیالات رکھنے کیلئے قومی رجعت پسندی کا مجرم ٹھہراتی ہے وہی اس وقت کے انقلاب پسند رہنما تھے۔

ایسے مواقع بھی آتے تھے کہ چکبست حکومت کے لئے سخت الفاظ استعمال کر جاتے تھے۔ "ملک کی موت" پر غیر ملکی حکومت کو "رقیب" اور "بندہ رسم جفا" کے نام سے یاد کیا ہے اور جلیانوالہ باغ کے حادثہ کا ذکر کر دیا ہے ؎

تر ہوا ہے جو شہیدوں کے لہو سے دامن
دیں اسی کا تجھے سحاب کے مظلوم کفن

برطانیہ کے ساتھ ساتھ آج ہم عیش کا تصور بھی نہیں کرسکتے لیکن ۱۹۱۷ء میں یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی ؎

برطانیہ کا سایہ سر پہ قبول ہوگا
ہم ہوں گے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا

سر پہ شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہے چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

اور پھر ٹرانسوال کے ہندوستانی مظلوموں کو یاد کرکے ؎

جو اپنے حال پہ بے کسی برستی ہے
یہ نائباں حکومت کی خود پرستی ہے

یہاں سے دور جو برطانیہ کی بستی ہے
وہاں سنا ہے محبت کی جنس سستی ہے
جو اس حال وطن آشکار ہو جائے
یہ دیکھتے رہیں بیڑا یہ پار ہو جائے

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شاعرانہ سادہ لوحی کی توجیہہ کس طرح کی جائے کہ برطانیہ کے عمال حکومت یہاں کے حکام سے زیادہ رحمدل اور درد مند ہیں انھیں ترانسول کے، مظلوموں کی حالت معلوم نہیں ورنہ سب کچھ آسان ہو جائے چکبست تو خیر شاعر تھے، کوئی سیاسی مفکر نہ تھے، اس وقت کے سیاسی رہنما اس غلطی کے مبتلا دکھائی دیتے ہیں، جیسے انھیں دفتری نظام کے اس جال کی خبر تھی جس کے گوشے ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

شاید مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے لیکن اتنا اور عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ میں اپنے اس خیال کو دہرا دوں جو مقالہ لکھتے وقت میرے سامنے تھا دور جدید جس کے پیامبر چکبست ہیں، وہ آج کا دور جدید نہیں ہے جس میں سیاسی اور معاشی نظریات بالکل تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر وہ آج ہوتے تو ان تغیرات کو کس نظر سے دیکھتے، ان کے ذہن میں بڑی وسعت تھی ان کے سامنے وطن کی محبت پر مذہب کی قربانی بھی کوئی بڑی چیز نہیں تھی۔ وطن، وطن، وطن اور اس کی محبت یہی ان کا پیغام تھا۔

دل کے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

ہم پوچھتے ہیں پیارے وطن کی بہار کو
آنکھوں میں اپنی پھول سمجھتے ہیں خار کو

روشن دل ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اجڑے ہوئے گھر میں

اسی لئے وہ سبحہ و زنار کے پھندے کو توڑ دینا چاہتے تھے، کیوں کہ ان دونوں میں اسیری کی شان ہے اور قومیت کے بنیاد حب وطن اور انسانی ہمدردی پر رکھنا چاہتے تھے۔

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے
طرز ہندو دیکھ کر رنگ مسلماں دیکھ کر

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں
بلائے جان ہیں یہ تسبیح اور زنار کے جھگڑے
دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شان مومن سے
حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا
اسیری لازم ہے مذہب شیخ و برہمن میں

مختصر یہ کہ چکبست نے اس دور جدید کے احساس کر لیا تھا اور اس کی اہم خصوصیتیں جو ہندوستان کو ترقی کی راہ پر لگا سکتی تھیں، ان کی شاعری کا پیام بن گئیں۔ حقیقتاً پیام میں کوئی اہمیت نہیں ہے کیوں کہ اس وقت کی فضا کا یہی مطالبہ تھا کہ حب وطن کا نعرہ لگایا جائے، اور قومیت کا شیرازہ آئینی جد و جہد سے منظم کیا جائے۔ اہمیت اس میں ہے کہ چکبست نے اس پیام کو کس طرح پیش کیا۔ اس کے لیے آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ قومی

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۱۷ پر پڑھئے)

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

پنڈت برج نرائن چکبست

عہد جدید کے جن شاعروں نے اردو شاعری پر مستقل نقش چھوڑا ہے اور اردو شاعری کے جدید طرز کو مقبول عام بنایا ہے اُن میں حضرت چکبست لکھنوی کا خاص امتیاز حاصل ہے اس عہد کے بعض ممتاز شاعروں نے اپنی شاعری کے موضوع کے ساتھ اپنا اسلوب بھی بدل دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی جماعت ان کے کلام سے کچھ متوحش سی رہی۔ مگر چکبست نے نئے خیالات کو اسی اسلوب سے ادا کیا جس سے لوگوں کی طبیعتیں مانوس تھیں یہی سبب تھا کہ اُن کا کلام ہر طبقے میں مقبول ہوا۔

ہماری قدیم شاعری میں داخلیت کا غلبہ تھا جدید شاعری میں خارجیت کا پہلو نمایاں ہے۔ قدیم شاعری میں جو مرتبہ مطالعۂ نفس کا تھا جدید شاعری میں وہی درجہ مشاہدۂ حیات کو حاصل ہے۔ چکبست کے یہاں بھی خارجی عنصر کی زیادتی ہے مگر داخلیت کی آمیزش کے ساتھ۔ مشاہدے اور مراقبے کے اسی دلکش امتزاج کا نتیجہ ہے کہ چکبست کا کلام اُن لوگوں کو بھی اجنبی نہیں معلوم ہوتا جو شاعری کو قدیم معیار سے جانچتے ہیں۔

ہمارے قدیم شاعروں کا کلام ہم کو ایک دوسرے عالم میں پہونچا دیتا ہے جہاں ہم اس دنیا کے شور و شر سے کچھ دیر کے لئے نجات پا جاتے ہیں لیکن اس دور کے جدید شاعروں کے دل میں یہ سما گئی ہے کہ ہماری شاعری اور ہماری زندگی میں پوری مطابقت ہونی چاہیئے۔ اس لئے انھوں نے اپنی شاعری سے رومانیت کا عنصر خارج کر کے اس کی جگہ اصلیت کو دے دی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو بے اطمینانی، بے چینی، بدنظمی ہم اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ وہی دورِ جدید کے شاعروں کے یہاں بھی نظر آتی ہے اور ہم کو اس سے نجات پانے اور اپنا دماغی توازن درست کرنے کے لیے کوئی امن اور سکون کی جگہ اِن کے یہاں نہیں ملتی۔ چکبست بھی جدید طرز کے شاعر ہیں۔ انھوں نے بھی روحانی محبت کو اپنی شاعری

میں بہت کم جگہ دی ہے۔ لیکن وطن سے متعلق ... کے گیت اس
جوش اور خلوص سے گائے ہیں کہ ان کے کلام میں ایک
روحانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جس سے اس کا اثر بہت
بڑھ گیا ہے۔

ہمارے قدیم شاعر کسی مقصد کیلئے شعر نہیں کہتے تھے
جو خیال ان کے دماغ میں آتا تھا، جو اثر ان کے دل پر پڑتا
تھا اس کی سچی تصویر لفظوں میں کھینچ دیتے تھے۔ آج
کل بہت لوگ شاعری کو افادی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔
پرانے معیاروں کے اعتبار سے شاعری اور خطابت دو
مختلف چیزیں تھیں مگر اس زمانہ کے نئے معیار نے،
شاعری اور خطابت کا فرق نظر انداز کر دیا ہے۔ لوگ
خطابت ہی کو شاعری سمجھنے لگے ہیں۔ یہاں تک کہ اس
زمانہ کی بہت سی نظموں کے عنوانوں ہی میں خطابت کا
لفظ شامل ہے مثلاً ذاکر سے خطاب، نقاد سے خطاب،
کسان سے خطاب، مزدور سے خطاب یعنی شاعری اب
ایک طرح کی منظوم خطابت کا نام ہو گیا ہے بہر حال
افادی نقطہ نظر سے قدیم رنگ کی جذباتی شاعری اور
جدید طرز کی خطابی شاعری میں صرف ارادے اور مقدار
کا فرق ہے۔ جذباتی شاعری کی افادیت غیر ارادی
اور خطابی شاعری کی ارادی ہوتی ہے۔ جذباتی شاعری
میں رومانیت زیادہ ہوتی ہے اور خطابی شاعری میں
افادیت چکبست کے کلام میں جذباتی شاعری کی
رومانیت اور خطابی شاعری کی افادیت کا ایک معتدل
امتزاج نظر آتا ہے۔

چکبست نے مختلف موضوعوں پر نظمیں کہی ہیں مگر
اُن کی بنیاد جس جذبہ پر قائم ہے وہ وطن کی محبت
اور اہل وطن کی بہبود کی خواہش ہے چکبست نے اپنی
نظموں کے مجموعہ کا نام "صبح وطن" رکھا ہے اس سے
بھی اسی بنیادی جذبہ کا اظہار ہو رہا ہے چکبست
حقیقی وطنیت اور صحیح قومیت کے علمبردار تھے۔ ہمارے
ملک میں جس پر شور، تنگ نظر اور تعصب پرور،
قومیت کا آج کل دور دورہ ہے چکبست کی شاعری گویا
اس کا ردعمل ہے۔ وہ ہندوستان کو ہندو مسلمان دونوں
کا ملک اور وطن سمجھتے ہیں اور اس کی بہتری اور آزادی
کے لیے تمام اہل ملک سے یکساں طور پر اپیل کرتے ہیں
انھوں نے اپنی نظموں میں کسی خاص جماعت یا فرقے کو
مخصوص طور پر مخاطب نہیں کیا ہے، چکبست ہندو تھے
اس لئے اگر وہ ہندوؤں کی طرف زیادہ مائل نظر آتے
تو کوئی تعجب نہ تھا مگر انھوں نے جب کبھی خصوصیت
کے ساتھ ہندوؤں کو مخاطب کیا تو اسی وقت مسلمانوں
سے بھی مخصوص طور پر ضرور خطاب کیا ہے۔ مثلاً جنوبی
افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو تشدد ہو رہے تھے اُن
کے خلاف اہل ملک کو برانگیختہ کرنا چاہتے ہیں اور اس
مقصد کے لئے "فریاد قوم" کے نام سے ایک نظم شائع
کرتے ہیں اس نظم میں ایک جگہ ہندوؤں کو خاص طور پر
یوں مخاطب کیا ہے۔

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندو ہشیار
اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار
اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار
تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار

مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبے گا

اس کے بعد ہی مسلمانوں سے یوں خطاب کرتے ہیں۔

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو
وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو
جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیت کے یادگار ہو تم

اس نظم کا ایک بند اور ملاحظہ ہو۔

کہاں ہیں ملک کے سرتاج قوم کے سردار
پکارتے ہیں مدد کے لیے در و دیوار
وطن کی خاک سے پیدا ہیں جو فرض کے آثار
زمیں ہلتی ہے اڑتا ہے خون بن کے غبار
جگر سے اٹھتا ہے چتوڑ کی زمیں تھرکی
لرز رہی ہے کوئی دن سے قبر اکبر کی

رانائے چتوڑ اور شہنشاہ اکبر میں مذہبی اختلاف کے علاوہ شدید مخالفت بھی تھی ہندوستان کی عظمت قائم رکھنے میں دونوں شریک ہیں اس طرح اس بند کے ذریعے شاعر ہندوؤں اور مسلمانوں سے نہایت پرزور طریقے پر اپیل کرتا ہے کہ مذہبی اور سیاسی اختلافات کے باوجود ملک کی عزت قائم رکھنے میں ایک دوسرے سے کم نہ رہیں۔ آپس میں لڑائی جھگڑا جو کچھ بھی ہو مگر دشمنانِ ملک کے مقابلے میں دونوں متحد نظر آئیں۔ اسی نظم میں کہتے ہیں:

جو بس چلا تو اجنتا سکروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

اپنی نظم "خاک ہند" میں ہندوستان کی عظمت بیا[ن]
کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

چکبست کی بے تعصبی کا ایک زبردست ثبوت ا[ن]
کی وہ نظم ہے جس کا عنوان ہے "آصف الدولہ کا امام با[ڑہ]"
اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ چکبست اسلامی تمدن کی قا[بل]
قدر یادگاروں کو عظمت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھ[ے]
چکبست ناقوس کے ساتھ اذان اور شوالے کے
ساتھ مسجد کو بھی یاد رکھتے ہیں۔ گوکھلے کے مرثیے میں کہ[تے]
ہیں:

حدیث قوم بنی تھی تری زباں کیلئے
زباں ملی تھی محبت کی داستاں کیلئے
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے ل[یے]
کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں ک[ے]
وطن کی خاک تری بارگاہ اعلیٰ ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالا ہے

مساوات اور رواداری کی یہ کیفیت بہت کم شاعروں [کے]
یہاں نظر آتی ہے ایک جگہ کہتے ہیں:-

اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے

مجھے تو چکبست کے سوا کوئی دوسرا شاعر نہیں ملتا جو ناق[وس]
کی فغاں سے بھی متاثر ہوا اور کیفیت اذاں سے بھی لطف

اٹھائے۔

چکبست فطری شاعر ہیں وہ جب کسی واقعے سے متاثر ہوتے ہیں تو اُن کے دلی تاثرات شعر کے لباس میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی جنوبی افریقہ کے ہندوستانیو کی حالت زار پر کڑھتے ہیں۔ کبھی ہندوستانی سپاہیوں کو پُرجوش الفاظ میں رخصت کرتے ہیں کبھی ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ کبھی بزرگان قوم کی وفات کا غم کرتے ہیں۔

چکبست کی نظموں میں ان کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اُن کو متعدد لوگوں کی وفات پر دلی صدمہ ہوا لیکن نہ یہ سب ایک طرح کے تھے۔ نہ اُن کے انتقال کا غم ایک طرح کا ہو سکتا۔ ان مختلف طرح کے غموں کو اس طرح ظاہر کرنا کہ ان کا فرق نوعیت یا فرق مراتب ظاہر ہو بڑا مشکل کام ہے۔ چکبست نے اس مشکل کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ چکبست کے مرثیے شاعری کے وہ کارنامے ہیں کہ اگر حالی کے مرثیۂ غالب کو الگ رکھ دیں تو ان کا جواب کہیں نہ ملے گا۔ چکبست کی شاعری کے محرکات میں سب سے قوی محرک وطن کی محبت ہے اس لئے انھوں نے اپنے مرثیوں میں زیادہ تر انھیں بزرگوں کا ماتم کیا ہے جو وطن کی محبت میں سرشار اور وطن کی خدمت کے لئے وقف تھے۔ انسانی اور انفرادی محبت سے بھی کوئی دل خالی نہیں اس لیے چکبست کے بعض مرثیے ایسے بھی ہیں جن میں انھوں نے اپنے عزیزوں کی موت پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ یہ مرثیے اسقدر دردناک ہیں کہ پڑھنے والے کو چکبست کے غم میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ ایک صاحب نے جو مصنف بھی ہیں اور مضمون نگار بھی، اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ چکبست کے سب مرثیے ایک سے ہیں اگر مرثیوں کے عنوان چھپا دیئے جائیں تو جس مرثیے کو جس کا مرثیہ چاہو سمجھ لو۔ مجھے ان کی اس بے امتیازی پر حیرت ہے میں گوکھلے اور تلک کے مرثیوں میں سے چند شعر پیش کر کے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی صاحب امتیاز گوکھلے کے مرثیے کو تلک کا اور تلک کے مرثیے کو گوکھلے کا قرار دے سکتا ہے؟

گوکھلے کا مرثیہ

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں
چراغ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں
اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
افق پہ قوم کے وہ ایک ہی ستارا تھا
تجھی کو ملک میں روشن دماغ سمجھے تھے
تجھے غریب کے گھر کا چراغ سمجھے تھے
خدا کے حکم سے جب آب و گل بنا تیرا
کسی شہید کی مٹی سے دل بنا تیرا
خدا نے تجھ کو پیمبر کیا یہاں کے لئے
کہ تیرے ہاتھ میں ناقوس تھا اذاں کیلئے

تلک کا مرثیہ

معرکہ سرد ہے سویا ہے وطن کا سردار
طنطنہ شیر کا باقی نہیں سونی ہے کچھار

بیکسی چھائی ہے تقدیر پھری جاتی ہے
قوم کے ہاتھ سے تلوار گری جاتی ہے

اٹھ گیا دولت ناموس وطن کا وارث
پیشواؤں کے گرجتے ہوئے رن کا وارث

تھا نگہبان وطن دبدبۂ عام ترا
نیند سے چونک پڑے سن جو لیا نام ترا

یاد کر کے تجھے مظلوم وطن روئیں گے
بندۂ رسم جفا چین سے اب سوئیں گے

گوکھلے اور تلک ان دونوں بزرگوں کی جو وقعت چکبست کے دل میں تھی وہ ان کی پبلک زندگی اور قومی خدمات کی بنا پر تھی۔ ان دونوں کے مرثیوں سے بھی یہی ظاہر ہو رہا ہے ان کے برخلاف لکھنؤ کے نامور بیرسٹر پنڈت بشن نرائن در آبر کی پرائیوٹ زندگی سے چکبست بخوبی واقف تھے۔ حضرت ابر عالم، فاضل، شاعر، انشار پرداز، ادیب، نقاد، وطن پرست اور ماہر سیاست تھے مگر چکبست ان کے ان کمالات سے کہیں زیادہ ان کے اخلاق اور انسانیت کے گرویدہ تھے ان کے مرثیے سے بھی یہی بات ظاہر ہو رہی ہے۔ چند بند سنئے :-

صدمۂ عام یہ ہے قوم کا پیارا نہ رہا
بے زبانوں کی زباں، دل کا سہارا نہ رہا
گلشن علم و ادب کا چمن آرا نہ رہا
مطلع دانش و بینش کا ستارا نہ رہا
سب پہ غم ایک طرف ایک طرف غم اپنا
جس سے دنیا نہیں واقف وہ ہے ماتم اپنا

ہم نے دیکھے ہیں ترے اشک محبت اکثر
جن پہ صدقے ہیں زبان اور قلم کے جوہر
دو نگینے تھے محبت کے ترے قلب و جگر
ہوئی غیروں کو نہ اس پاک خزانے کی خبر
ظاہری حسن لیاقت کے یہ دیوانے ہیں
شمع دیکھی نہیں، فانوس کے پروانے ہیں

ہے نظر میں تری ہستی کے ستارے کا زوال
وہ شب غم کی سیاہی وہ مرض کا بھونچال
تب بھی سودائے وطن تھا ترے جینے کا مآل
خوف کہتے ہیں کسے موت کا آیا نہ خیال
کاہش تن سے طبیعت کی جلا کم نہ ہوئی
روشنی شمع کی گھلنے سے ذرا کم نہ ہوئی

رونق عام سے تجھ کو نہ سروکار رہا
جوہر خاص کا ہستی سے طلبگار رہا
گو کہ جنجال میں دنیا کے گرفتار رہا
اپنے دامن کو سمیٹے ہوئے ہشیار رہا
رنگ دنیا سے رہا عالم فانی میں جدا
جیسے لہروں سے کنول رہتا ہے پانی میں جدا

شہرۂ عام کو سمجھا نہ لیاقت کا صلا
نکتہ چینوں سے شکایت نہ رقیبوں سے گلا
دیدۂ غیر میں کھٹکی نہ طبیعت کی جلا
تو زمانے سے مروت کی طرح جھک کے ملا
عاجزی دل کی جھلکتی رہی پیشانی سے
تو وہ دریا تھا جو واقف نہیں طغیانی سے

دل محبت پہ فدا آنکھ مروت سے غنی
تجھ کو دشمن کی بھی منظور نہ تھی دلشکنی

مگر انصاف کے حق میں ہوا گر نیش زنی
پھر نہ تھا تجھ سے زیادہ کوئی جرأت کا دھنی

غیرتِ معرکہ شام کی سرگرمی میں
طفلِ معصوم سے ملتا ہوا دل نرمی میں

جن مرثیوں کے اقتباسات اُوپر پیش کیے گئے ہیں وہ قوم کے بزرگوں کی وفات پر کہے گئے تھے۔ چکبست نے اپنے نوجوان عزیزوں کے انتقال پر بھی مرثیے کہے ہیں۔ اُن مرثیوں میں عظمت کا اعتراف تھا ان میں محبت کا اظہار ہے ایک مرثیے کے تین بند سنیے۔

اے جوانی کے مسافر اے اجل کے مہماں
سو گیا تو سنتے سنتے زندگی کی داستاں
تھک کے نیند آئی ہے ہوتا ہے یہ چتون سے عیاں
نیم باز آنکھوں میں ہے کیفیتِ خوابِ گراں
کارِ دنیا سے کوئی یوں بے خبر ہوتا نہیں
رات بھر جاگا ہوا دولہا بھی یوں سوتا نہیں

ہم محفلِ احباب میں ماتم ہے تو ہے مست خواب
کچھ خبر ہے آج کس کس کی ہوئی مٹی خراب
آخری تسلیم کے مشتاق ہیں کچھ دے جواب
پھر نظر آئے گی کا ہے کو یہ تصویرِ شباب

ہنس کے ہر اک بات پر وہ جنبشِ ابرو کہاں
اک نظر پھر دیکھ لے، اب ہم کہاں اور تو کہاں

اس دلِ ناشاد میں کچھ حسرتوں کے ہیں مزار
اور اک چھوٹی سی تربت ہوگی تیری یادگار
پھول جب گلزار میں لائیں گے پیغامِ بہار
یاد کر کے تجھ کو یوں روئے گا تیرا سوگوار

کھل کے گل کچھ تو بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ان مرثیوں کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسمی چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک حقیقی شاعر کے دلی جذبات کے صحیح ترجمان ہیں۔

چکبست دورِ جدید کے آدمی تھے۔ زندگی کی ہر روش میں سیاسیات کے ہر شعبے میں مناسب تغیر کے خواہش مند تھے۔ مگر کسی قدیم چیز سے صرف اس کی قدامت کی بنا پر بیزار نہ تھے۔ اس لیے ان کے مجموعہ کلام میں بہت سی غزلیں بھی شامل ہیں۔ مگر ان کی غزل کا انداز سب سے الگ ہے وہ زیادہ تر اخلاقی مضامین باندھتے ہیں۔ عشق و محبت کا بیان بھی ہوتا ہے، مگر محبت کس کی؟ ملک کی، قوم کی، بنی نوع کی، حسنِ فطرت کی، یہی سبب ہے کہ اُن کی غزلوں میں رقیب سے رشک و رقابت اور معشوق کے ظلم و ستم کا ذکر مطلق نہیں ہے یاس و حرماں، بے ثباتی دنیا، قناعت و توکل کا بیان بھی انکی غزلوں میں بہت کم ہے۔ اُن کی غزلیں بھی اُن کی نظموں کی طرح قومیت اور وطنیت کے جذبات سے مملو ہیں۔ مختصر یہ کہ جو مضامین بالعموم غزلوں میں ہوتے ہیں بلکہ غزل کی جان سمجھے جاتے ہیں وہ چکبست کے یہاں بہت کم ہیں۔

اور جو مضامین قدیم غزلوں میں نہیں ملتے اُن کی اُن کے یہاں کثرت ہے اُس صورت میں یہ صرف چکبست کے انداز بیان کا اعجاز ہے کہ اُن کی غزل۔ غزل معلوم ہوتی ہے چکبست کی غزلوں کے چند شعر سنئے۔

مٹی ہیں گل جو درکسی بوستاں کے ہیں
کانٹے عزیز گلشن ہندوستاں کے ہیں

دل کئے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حب قومی بن گیا نقش سلیمانی مجھے

روشن دلِ ویراں ہے محبت سے وطن کی
یا جلوۂ مہتاب ہے اُجڑے ہوئے گھر میں

جنون حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کے لیے
یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

جذبۂ قوم سے خالی نہ ہو سودائے شباب
وہ جوانی ہے جو اس شوق میں برباد رہے

چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

خدمت انساں سے دل کو آشنا کرتے رہے
دل لگے آئینے پہ اُلفت کی جلا کرتے رہے

خاک وطن میں دامنِ مادر کا چین ہے
تنگی کنار کی ہے لحد کا فشار کیا

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر
ہزاروں پیرہن پیدا کریںگی دھجیاں میری

اگر دم بھر بھی مٹ جاتی خلش خار تمنا کی
دل حسرت طلب کو اپنی ہستی سے گلا ہوتا

مصیبت میں بشر کے جوہر مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردش قسمت سے ڈر جانا

دل ہے مایوس کہ نیت نہیں ساقی کی درست
آنکھ کہتی ہے یہ شیشہ ہے وہ پیمانہ ہے

دفتر حسن پہ مہر ید قدرت سمجھو
پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

رفتہ رفتہ یہ بڑھا جلوۂ تاثیر بہار
سبزہ پوشانِ چمن بن گئے تصویر بہار

زندگی نام تھا جس کا ہے کھو بیٹھے ہم
اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

درد الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی سے بھرے انساں ہوگئے

خود پرستی مٹ گئی قدر محبت بڑھ گئی
ماتم احباب ہے تعلیم روحانی مجھے

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

نظر آتا ہے فقیری میں تماشائے جہاں
ٹھیکرا بھیک کا جمشید کا پیمانہ ہے

یاد احباب گذشتہ پہ فدا رہتا ہے
دل ناشاد بھی شمع کا پروانہ ہے

ایسے شعروں کو دیکھنے کے بعد غزل سے بیزاری کی کیا وجہ ہو سکتی ہے آج کل غزل پر بحیثیت غزل جو اعتراض کیے جاتے ہیں چکبست کی غزلیں گویا ان سب کا جواب ہیں۔

چکبست نے منظر نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ اُن کے مجموعۂ کلام میں صرف ایک نظم سیر دہرہ دون، ایسی ہے جس میں قدرتی مناظر کی تصویر کھینچی گئی ہے مگر اس نظم میں حسن فطرت سے شاعر کے متاثر ہونے کی جو کیفیت نظر آتی ہے وہ اردو شاعروں کے یہاں نایاب ہے— انسانی حسن اور اس کے تاثرات کو تو بہت سے شاعروں نے خوب خوب بیان کیا ہے لیکن حسن فطرت کی دلکشیوں کا بیان چکبست کی اس نظم سے بہتر ملنا مشکل ہے صرف یہی ایک نظم چکبست کے اس شعر کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے۔

یہ ماتم ہے مصور اٹھ گیا گلزار قدرت کا
ہر اک طائر ہر اک برگِ چمن ہے نوحہ خواں میرا

سر تیج بہادر صاحب سپرو نے "صبح وطن" کے دیباچے میں بالکل درست فرمایا ہے کہ "چکبست کا ادبی مذاق خالص لکھنوی ہے۔ لفظوں کی سبکی اور گرانی، سختی اور نرمی، موسیقیت اور ثقالت، ان کی صوتی اور معنوی صحت، محاوروں کی درستی اور ان کا برمحل استعمال، مترادفات کا نازک فرق، عروضی اور صرفی و نحوی قواعد کی پابندی، ان سب چیزوں کا لحاظ رکھنا لکھنؤ شاعری کی خاص خصوصیت ہے۔ یہ خصوصیت چکبست کے یہاں پورے طور پر موجود ہے اور کیوں نہ ہوتی! خود اہل زبان تھے۔ اہل زبان اور اہل ادب کے ہم نشیں تھے انھوں نے آتش اور انیس کے سے ماہر صناعوں

کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے اسلوب بیان کے دلدادہ تھے۔ اس موقع پر ایک غلط فہمی کو دور کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ جب چکبست کے کلام میں انیس کا اسلوب بیان دیکھتے ہیں اُن کی نظم رامائن کا ایک سین میں انیس کے مرثیوں کی رخصت کا انداز پاتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ انیس کی طرح چکبست نے بھی اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ زیادہ تر مسدس کو بنایا ہے تو وہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ چکبست میں ذاتی کمال نہ تھا بلکہ وہ انیس کے نقال تھے ان کم فہموں کو کون سمجھائے کہ کسی کامل الفن کی اس کے فن میں نقل کر لینا خود کمال کی دلیل ہے۔ تاج محل کی سنگ تراشی کو دیکھ کر کوئی پتھر کے ویسے ہی بیل بوٹے بنانے لگے تو کیا وہ ماہر سنگ تراش نہ ٹھہرے گا؟

شکسپیر کے ڈرامے پڑھ کر کوئی ویسے ہی ڈرامے لکھنے لگے تو کیا وہ کامل تمثیل نگار نہ قرار پائے گا۔ فنون لطیفہ میں کامل کی نقل کے لیے بھی کمال کی ضرورت ہوتی ہے پھر چکبست انیس کی نقل کرتے بھی ہیں تو صرف انداز بیان میں۔ خیالات و جذبات ہمیشہ اپنے رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی ہر نظم سے ملتا ہے۔

اردو کی قدیم شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں الفاظ کی صناعی کا کمال موجود ہے مگر نفس مضمون کچھ بھی نہیں۔ جدید شاعری میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں جن میں نفس مضمون تو بہت اچھا ہے مگر شاعری کی روح جو الفاظ کی صناعی کا نتیجہ ہوتی ہے، معدوم ہے۔ لیکن چکبست کا کلام قدیم اور جدید دونوں طرح کی شاعری کے محاسن کا مجموعہ ہے اُن کی زبان فصیح، بیان دلکش، مضامین بلند اور خیالات عالی ہیں۔ چکبست کے تمام کلام میں متانت، وقار اور بلند اخلاق موجود ہے کہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو سنجیدگی سے دور ہو، جس میں رکاکت اور ابتذال کا شائبہ بھی ہو۔ ایک مبصر نے سچ کہا ہے کہ

جو شعراء اردو شاعری کو ارتقائے قوم اور تہذیب اخلاق کا آلہ بنانا چاہتے ہیں ان میں چکبست سب سے آگے ہیں۔

(بشکریہ آکاش وانی)

از پنڈت آنند نرائن ملّا

میں چکبست مرحوم کو جاننے کی طرح نہیں جانتا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بیس سال عمر میں بڑے تھے اور میں ان کے حلقہ احباب میں نہ تھا۔ لیکن ان کو جاننے کا سبب محض عمر کا یہ فرق نہ تھا۔ چکبست سے زیادہ میں ان کے بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست کو جانتا تھا۔ جو لکھنؤ میونسپلٹی کے اگزیکٹیو افسر تھے اور چکبست سے کوئی سات آٹھ سال عمر میں بڑے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ چکبست انتہا درجہ کے نیک انسان تھے اور ان کی خوش اخلاقی اور خوش اطواری ان کو اس طرح گھیرے ہوئے تھی کہ کسی کا ان کے پاس تک پہونچنا مشکل تھا۔ نیک انسان تنگ نظر نہ ہونے پر بھی دوسرے کو تنگ نظر معلوم ہوتا ہے اور عام خطا کرنے والے انسان اس سے دور ہی دور رہتے ہیں۔ دو دلوں کو قریب لانے کیلئے عیب مشترک سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اور چکبست قریب قریب بے عیب تھے۔

یوں تو میں چکبست کو ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء سے جانتا تھا جس وقت میری عمر نو یا دس دل کی تھی اور چکبست کوئی تیس سال کے تھے اپنی زندگی کے آخری دس یا بارہ سال تو وہ میرے محلے ہی میں رہے اور چھ سات سال تک ان کی سکونت ایک ایسے مکان میں تھی جو میرے مکان سے ملحق تھی۔ صرف دیوار بیچ میں تھی وہ ہر دوسرے تیسرے روز شام کو میرے والد کے پاس ضرور آتے تھے۔ اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سیاسی امور پر گفتگو رہتی تھی اور چکبست میرے والد کو محض ایک بزرگ ہی نہ سمجھتے تھے بلکہ ایک حد تک سیاسی رہنما بھی مانتے تھے۔

چکبست نے زندگی بھر نہ کبھی جوا کھیلا نہ شراب پی نہ مجرا سنا اور نہ کسی سے محبت کی انھوں نے تھیٹر یا سینما بھی شاید کبھی نہیں دیکھا۔ کوئی ناستنزروائی بھی ان کے کسی معاشقے کی داستان بیان نہیں کر سکتا جس کی انتہائی عیاشی پان کھانا اور اپنے مخصوص حلقہ احباب میں بیٹھ کر مہذب بذلہ سنجی کرنا ہو اس کی زندگی میں کوئی رنگینیوں

کو کس طرح تلاش کرے۔ احباب میں بیٹھ کر بھی وہ خندہ دندان نما کے مقابلہ میں تبسم زیر لب کے زیادہ قائل تھے یہ درویشانہ ضبط و یقیناً ان کو زاہد خشک بنا دیتی اگر ان کے دل میں قومی خدمت کے جذبے کا شعلہ زار دہک نہ رہا ہوتا۔ یہی جذبہ تھا جس نے ان کو دوسروں کے دکھ درد کو اپنانا سکھایا۔ جس نے انھیں انسانی عظمت عطا کی۔ اور جس نے انھیں محفل شعر و سخن کے خاصان خاص میں جگہ دے کر زندگی دوام بخشی۔ چکبست خود کہتے ہیں ؎

قوم کا سودا وفا کا شوق خدمت کی امنگ
بس انھیں دو تین کے صدقے دل آباد ہے

یہ شعر ان کی زندگی کی کنجی اور مکمل تفسیر ہے

مجھے یاد نہیں کہ میں نے چکبست کو سب سے پہلے کب دیکھا۔ لیکن یہ یقین ہے کہ یہ سعادت مجھے لکھنؤ کشمیری کلب کے کسی سالانہ جلسے میں پہلے پہل نصیب ہوئی۔ اردو ادب کے نقادوں کے لئے یہ اتفاق قابل غور ہے کہ اس دور کی تین نمایاں شخصیتیں کسی نہ کسی انجمن سے وابستگی رکھتی تھیں اور ان کی نظمیں ان انجمنوں جلسوں کیلئے کہی گئیں اور سب سے پہلے وہیں پڑھی گئیں اقبال کی نظمیں انجمن حمایت اسلام میں صفی کی نظمیں شیعہ کانفرنس میں اور چکبست کی نظمیں کشمیری کلب میں۔ کشمیری کلب کے یہ جلسے کشمیری محلے میں ہوتے تھے اور کشمیری برہمنوں کی کافی تعداد ان جلسوں میں شریک ہوتی تھیں۔ درد دل، پھول مالا، نالہ یاس اور کچھ اور نظمیں میں نے چکبست کی زبان سے انھیں جلسوں میں سنیں۔ چکبست کے پڑھنے میں ایک ہلکا سا خطابت کا رنگ تھا جو ان کے جوش دل کی ترجمانی کرتا تھا۔ نہ اس میں ان کے معاصرین صفی، عزیز اور محشر کا حسن ادا اور نہ شعرائے خیال کا ترنم۔ پھر بھی وہ کچھ اس طرح اثر لے کر پڑھتے تھے کہ سننے والے بے چین ہو جاتے تھے اور ان کے دل کی دھڑکن اور خون کا رفتار تیز ہو جاتی تھی۔

چکبست نے اپنی پہلی نظم ۱۸۹۴ء کے جلسے میں پڑھی تھی اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ یہ نظم انھوں نے صبح وطن میں شامل نہیں کی ہے کیوں کہ اس میں غالباً شاعرانہ اعتبار سے کوئی خوبی نہیں۔ پھر بھی، چکبست کی شخصیت کا اندازہ کرنے کیلئے یہ نظم بہت اہم ہے۔ میں اس کے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

حب قومی کا زباں پر ان دنوں افسانہ ہے
بادہ الفت سے پر دل کا مرے پیمانہ ہے

ہے جو روشن بزم میں قومی ترقی کا چراغ
دل فدا ہر اک کا اس پر صورت پروانہ ہے

ہے گل مقصود سے پر گلشن کشمیر آج
دشمنی، نا اتفاقی سبزہ بیگانہ ہے

درفشاں ہے ہر زباں حب وطن کے وصف میں
جوش زن ہر سمت بحر ہمت مردانہ ہے

جمع ہیں قومی ترقی کے لئے ارباب قوم
رشک فردوس ان کے قدموں سے یہ شادی خانہ ہے

آخری شعر "شادی خانہ" کا اشارہ پنڈت دیا نند صاحب گنجو کے شادی خانہ کی طرف ہے جہاں کشمیری محلے میں یہ جلسے اکثر ہوا کرتے تھے۔ اب یہ شادی خانہ منہدم ہو چکا ہے اور اس کا کوئی نشان باقی نہیں۔ یہ نظم چکبست نے خود کہی تھی۔ کسی نے کہہ کر ان کو نہیں دی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں ان،

خیالات کا اظہار پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ چکبست،
پڑھے پہلے ہوگئے اور بالغ بعد کو وہ ان لوگوں میں سے
تھے جو داڑھی لیکر پیدا ہوئے تھے۔ بعد کو نکلنے والی داڑھی
تو مونڈی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ پیدائشی داڑھی تو ناک
کان کی حیثیت رکھتی ہے جس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں
ان کی زندگی حدود صغرسنی ہی میں متعین ہو چکے تھے اور
ان کے دل و دماغ نے بھی ان حدود سے باہر نکلنے کی بھی
کوشش نہیں کی۔ وہ جن عقیدوں اور نظریوں پر جوانی
میں ایمان لاچکے تھے ان کو آخر عمر تک کلیجے سے لگائے رہے
یہی ان کا آئین وفا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے کلام میں
کوئی ارتقار نظر نہیں آتا۔ ان کی شاعری جس مقام پر ۱۹۰۵
یا ۱۹۰۶ء میں پہونچ گئی تھی ۱۹۲۶ء تک وہیں رہی اور
انھوں نے کوئی نئی قدریں نہ زندگی میں قبول کیں اور نہ
شاعری میں

شعر و سخن کی محفلوں میں شریک ہونے کا شوق
مجھے بچپنے ہی سے تھا۔ شاید ۱۹۱۱ء یا ۱۹۱۲ء میں میں نے
چکبست کو مشاعرہ میں پہلے پہل غزل پڑھتے سنا یہ مشاعرہ
کشمیری محلے میں پنڈت سورج نرائن بہادر مرحوم کے مکان
پر منعقد ہوا تھا۔ بانی مشاعرہ شاید چکبست خود تھے۔ مصرع
اس طرح تھا۔

بہار لالہ گل سے لگی ہے آگ گلشن میں

لکھنؤ کے اکثر اساتذہ اس مشاعرہ میں شریک تھے۔ اور
پنڈت بشن نرائن در مرحوم بھی موجود تھے۔ "شیخ و برہمن"
کا قافیہ کس طرح کہتا ہے۔ چکبست نے دو شعر اس قافیے
میں کہے تھے ایک مجھے یاد ہے اور ایک میں بھول گیا.....

چکبست کا شعر ہے ؎

پرانی کاوشیں دیر و حرم کی مٹتی جاتی ہیں
نئی تہذیب کے جھگڑے ہیں اب شیخ و برہمن میں

مشاعرہ میں بہت مقبول تھا۔ اور مرحوم کا شعر بھی مجھے یاد
ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا۔

تماشا دیکھتے ہو دور سے لڑوا کے دونوں کو
یہ اچھا فیصلہ تم نے کیا شیخ و برہمن میں

اس پر بھی مشاعرے کی چھتیں اڑ گئیں تھیں لیکن اس قافیے
میں جو شعر سب سے زیادہ مقبول ہوا تھا وہ لکھنو کے کسی
استاد کا تھا۔ شاعر کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن شعر یاد ہے۔

ادھر ہے سنگ کعبہ اور ادھر ہے سنگ بتخانہ
عجب کیا ہے کہ اب پتھر چلیں شیخ و برہمن میں

آخری شعر میں جو پیشین گوئی کی گئی تھی وہ ۱۹۴۷ میں کس
طرح پوری ہوئی اس پر کوئی روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں
جب سے چکبست میرے محلے میں آکر مقیم ہوئے تھے
ان کا دستور تھا کہ سال میں ایک مشاعرہ ضرور کرتے تھے
جس میں وہ منتخب شعرا مدعو کرتے تھے وہ ایک بار یہ
مشاعرہ میرے ہی مکان پر ہوا۔ کیوں چکبست کے مکان
میں کوئی اتنا بڑا کمرہ نہ تھا جس میں مشاعرہ ہو سکے چکبست
کی دو غزلیں جن کے مطلع حسب ذیل ہیں انھیں مشاعروں
کی یادگار ہیں ؎

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے
بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا
آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا

فکر مینا کیا ہے ساقی کیوں تلاش جام ہے
خم لگا دے منہ سے تو پینا ہمارا کام ہے

آخری مطلع والا مشاعرہ مجھے کچھ کچھ یاد ہے یہ مرزا سمیع اللہ بیگ کی کوٹھی میں ہوا تھا۔ کیونکہ چکبست اس زمانہ میں رہتے تھے مصرع اس طرح تھا۔

سرخ ہے دستار رنگیں جامہ احرام ہے

چکبست کی غزل اس مشاعرے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئی تھی۔ کسی شاعر کا یہ شعر مجھے ابھی تک یاد ہے

دوڑتی پھرتی ہے ہر رگ رگ میں برق اضطراب
اصطلاح عشق میں جینا اسی کا نام ہے

چکبست مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے اور ہمیشہ بچ نکلنے ہی کی فکر میں رہتے تھے لیکن پھر بھی اکثر تعلیمی دارے انھیں زبردستی گرفتار کر ہی لیتے تھے۔ کیننگ کالج ... اور حسین آباد کالج کے کچھ مشاعروں میں میں نے انھیں پڑھتے سنا۔ ان کی غزل جس کا مطلع ہے

اڑ کر صحن گلشن سے مٹا کر آشیاں میرا
میرے سایہ کے پیچھے پھر رہا ہے باغباں میرا

حسین آباد کالج کے طرحی مشاعرے میں ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں نے سنی۔ "صبح وطن" میں اس غزل کی تصنیف ۱۹۱۱ء درج ہے اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مشاعرہ کی طرح غالباً انھیں کی غزل سے لی گئی تھی اور شاید بانیان مشاعرہ کی یہ حکمت عملی اس واسطے تھی کہ چکبست شریک ہونے میں کوئی عذر نہ کر سکیں۔ یہ مشاعرہ حسین آباد کے اس ہال میں ہوا تھا، جس میں شاہان اودھ کی قد آدم تصویریں ہیں۔ مجھے یہ بخوبی اس واسطے یاد ہے کہ گو میں مشاعرے میں بحیثیت شاعر شریک نہ تھا پھر بھی میں نے اس طرح پر دو ایک بلے سیدھے مصرع جوڑے تھے میں اس وقت تک نہ شعر کہتا تھا اور نہ یہ سمجھتا تھا کہ مجھ میں بھی شعر کہنے کی کوئی صلاحیت ہے مجھے اپنا ایک شعر یاد آتا ہے

مرے آنسو کے ہر قطرے میں اک تربت ہے ارماں کی
یونہی اک ایک کر کے لٹ گیا سب کارواں میرا

اس مشاعرہ میں محشر لکھنوی بھی شریک تھے۔ اور انھوں نے ایک شعر پڑھا تھا جس کا مفہوم قریب قریب وہی تھا جو میرے شعر کا تھا۔ ان کے شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں لیکن دوسرا مصرع یاد ہے

چلا تھا کتنے یوسف ساتھ لیکر کارواں میرا

پہلے مصرع میں اشکوں کے ذائع ہونے کا ذکر تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ محشر مرحوم کا شعر سن کر جب پر انھیں کافی داد ملی تھی مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی ایک استاد وقت سے مضمون لڑ جانا واقعی فخر کی بات تھی۔

چکبست نے ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں ایک ناٹک بھی لکھا تھا۔ اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں۔ یہ ایک ٹریجڈی Tragedy تھی اور اس کا نام "کملا" تھا۔ چکبست نے اسکی ایک کاپی میرے والد کو نذر کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد نے جو منہ پھٹ مشہور تھے چکبست کی کس طرح لے دے کی اور کئی دن بلکہ ہفتوں وہ چکبست کو اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں چھیڑتے رہے۔ چکبست ایسے وضع دار اور شریف النفس تھے کہ وہ سب ہنس کر سنتے تھے اور کبھی پلٹ کر کوئی جواب نہ دیتے۔ چکبست کی یہ ادبی کوشش ان کے مخصوص حلقہ احباب میں بھی مقبول نہ ہوئی شاید اب یہ ناٹک کہیں

دستیاب نہیں۔

۱۹۱۸ء میں چکبست نے ایک ماہنامہ رسالہ "صبح اُمید" جاری کیا۔ یہ رسالہ ادبی تھا اور سیاسی بھی۔ اپریل ۱۹۲۰ء کے نمبر میں ایک مضمون مولانا عبدالرزاق ندوی کا شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "مسئلہ مصر" اس مضمون میں کافی صاف گوئی سے کام لیا گیا تھا اور حکومت برطانیہ کی بد دیانتی اور جبر کی طرف کھلے اشارے کئے گئے تھے۔ اس زمانہ کے اعتبار سے اس کا لب و لہجہ بھی کافی تلخ تھا۔ اور مضمون شائع ہو جانے کے بعد یہ اندیشہ تھا کہ حکومت پریس ایکٹ کے تحت کوئی کارروائی، صبح امید کے خلاف نہ کرے۔ چکبست کئی معاملات میں میرے والد سے مشورہ کرتے تھے۔ میرے پاس 'صبح اُمید' کا وہ نمبر موجود ہے جس میں مولانا عبدالرزاق کے مضمون پر میرے والد کے ہاتھ کے سرخ اور نیلی پنسلوں کے نشان جا بجا لگے ہوئے ہیں۔ میرے والد نے شاید مشورہ دیا تھا کہ اگلی اشاعت میں کچھ معذرت پیش کر دیں۔ لیکن چکبست اس پر راضی نہ ہوئے۔ میرے والد نے ان سے کہا آپ تو خود وکیل ہیں اور معاملہ کی نزاکت سمجھ سکتے ہیں۔ چکبست نے کہا "وکیل تو ضرور ہوں لیکن اس ملک کا باشندہ بھی تو ہوں" میرے والد لاجواب ہو گئے یہ واقعہ چکبست کے کردار کو پورے طور پر نمایاں کرتا ہے وہ بزگام نہیں تھے بلکہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے تھے لیکن ایک دفعہ قدم اٹھا کر پیچھے ہٹنا نہیں جانتے تھے وہ اسے اپنا آئینِ وفا کے خلاف سمجھتے تھے اور اس کیلئے سختیاں اٹھانے کو تیار رہتے۔

شاعری اور زندگی کا جو گہرا تعلق چکبست کے یہاں ملتا ہے وہ اس دور کے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ اِن کی شاعری میں بیسویں صدی کے آغاز سے لیکر پہلی جنگ عظیم تک کی وطن کی تاریخ پورے طور پر سامنے آجاتی ہے۔ روحِ عصر کی ایسی سچی تا اور پر خلوص ترجمانی کسی اور شاعر کے یہاں مشکل ہی سے مل سکے گی۔ چکبست آتش اور انیس کے اسکول کے شاعر تھے اور یہ رنگ شاعری بھی انھیں کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اِن کے آئینِ وفا کا بھی یہی تقاضا تھا۔ ۱۹۱۹ء سے ہندوستانی سیاست میں مہاتما گاندھی کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے اور چکبست کا آئینِ وفا یہ اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ نئی قدروں کو آسانی سے تسلیم کریں۔ زندگی کا دھارا انھیں چھوڑ کے آگے نکل جاتا ہے۔ پھر بھی وہ ایک دور کی سب سے بڑی یادگار ہیں اور یہ مقام ان سے کبھی چھینا نہیں جا سکتا۔

●●

بسلسلہ مضمون ۲۲۲

جوش و خروش، حب الوطنی، اظہارِ خیال کی آزادی کا مطالبہ اور معاشرتی اصلاح کے پیش کرنے کا بہترین، سامانچہ چکبست کی شاعری تھی جس میں بیک وقت جوش، تڑپ، گداز، خلوص اور حقیقت موجود ہے، اور جن سے مل کر چکبست کی قادر الکلامی نے بیجان لفظوں اور بے روح محاوروں میں روح پیدا کر دی، ان کی شاعری ہمارے گزشتہ قومی تصور کا ایک حسین مرقع ہے اور ایک پر اثر پیام۔

آل احمد سرور صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ)

چکبست لکھنوی

اُردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ باں کی محنت کا ثمرہ نہیں، اس کی آبیاری مختلف جماعتوں، مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے۔ اس کی تعمیر میں بہتوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ فقیروں اور درویشوں نے اس پر برکت کا ہاتھ رکھا ہے، بادشاہوں نے اسے منہ لگایا ہے سپاہیوں نے زبان تیغ اور تیغ زبان دونوں کے جوہر دکھائے ہیں پھر بھی یہ جمہور کی زبان اور جمہور کا ادب ہے۔ جمہور نے اسے گویائی بخشی اور جمہور نے اسے پروان چڑھایا اُردو، ادب کی تاریخ میں مسلمانوں کے دوش بدوش صدہا نام ہندوؤں کے ملیں گے جنھوں نے اپنی گرانقدر کوششوں سے ادب کی مختلف اصناف کو مالا مال کیا، اور ہمارا جدید ادب جو انیسویں صدی کے آخر نصف کی پیداوار ہے اس زمرۂ خاص میں اور بھی ممتاز ہے

مگر ہندوؤں میں کشمیر کے پنڈت جو تاریخ ہند میں اپنی ذہانت اور طباعی کے لئے مشہور ہیں۔ اردو ادب کی خدمت کے لئے کم مشہور نہیں۔ یہ خادم نہیں مخدوم ہیں۔ شعر و سخن کا جو مذاق مسلمانوں کے عہد حکومت میں عام تھا ان بزرگوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ جب تک اردو زبان عہد طفولیت میں تھی اور فارسی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اس قوم میں بھی فارسی کا مذاق یہ ہوا تھا، مگر جب فارسی کا چراغ جھلملایا ہوا تھا اور اردو نے پر و بال نکالے تو ان حضرات نے بھی اُردو کی طرف توجہ کی اس ممتاز فہرست میں دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، تربھون ناتھ ہجر، کشن پرشاد کول، برج نرائن چکبست اور تیج بہادر سپرو، جیسے ادیب شاعر اور صاحب ذوق ملتے ہیں۔ آج صحبت میں ہمیں چکبست کے کمالات پر ایک نظر ڈالنی ہے۔

چکبست ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا اس لئے وہیں حاصل کی۔ شعر و ادب کا شوق گھٹی میں پڑا تھا۔ اور لکھنؤ کی مذاق رگ رگ میں رچا ہوا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی اے کرنے کے بعد

...نے وکالت شروع کی اور اس پیشہ میں آپ کو کام
یابی حاصل ہوئی ۱۹۲۶ء میں جب آپ کی عمر تقریباً
۴۴ سال کی تھی اچانک انتقال کیا اور کاظم حسین محشر
نے مصرع سے تاریخ نکالی۔

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ سرعت سے
بدل رہا تھا ایک طرف قدامت کا رنگ تھا جو ابھی سماج
پر چھایا ہوا تھا اور دوسری طرف نئی تہذیب کی بڑھتی
اور چڑھتی ہوئی روشنی تھی جو آہستہ آہستہ اپنا اثر جمارہی
تھی اس ماحول میں طبائع زیادہ مشتعل اور معیار زیادہ
سخت تھے۔ کچھ لوگ قدامت پرست تھے کچھ ایک نئی
دنیا کے خواب دیکھ رہے تھے، کچھ ایسے بھی تھے جو تھوڑی
اصلاح تھوڑی سی تبدیلی۔ تھوڑی سی رفو گری کے
قائل تھے۔ چکبست اس آخری طبقہ سے تعلق رکھتے تھے
اقبال کی زبان میں ان کا قلب مومن اور دماغ کافر تھا
وہ لکھنؤ کی تہذیب، تمدن، معاشرت اور اخلاق کے
دلدادہ تھے، مگر اس کے ساتھ زمانہ کا رخ دیکھ کر اور
روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اصلاح و
ترمیم کے بھی حامی تھے، ان کا اصول وہی پرانا "خذ ما صفا
دع ما کدر" والا اصول تھا۔ اس اصول میں کوئی خرابی
نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اچھائی اور برائی کا معیار بھی
انسان خود ہی متعین کر لیتا ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے
شاعر، اچھے نقاد اور اچھے اہل قلم تھے بلکہ اچھے انسان،
بھی تھے وہ اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو صرف عزت

آرام کی زندگی گذارنے پر قانع نہیں ہوتا بلکہ قوم کی بہبود
اور بہتری کے لیے نہایت نیک خیالات بھی دل میں رکھتا
ہے یہ نیک خیالات قدرتی طور پر معتدل اور صلح پسند
خیالات ہوتے ہیں۔

چکبست جدید دور کے شعراء میں نہایت ممتاز درجہ
رکھتے ہیں ان کا مجموعہ کلام "صبح وطن" کے نام سے شائع
ہو چکا ہے۔ ہمارے شعراء اپنے دواوین کے نام تاریخی نام
رکھنے میں اس قدر محو رہتے ہیں کہ کلام کی خصوصیت سے
اسے کوئی علاقہ نہیں رہتا۔ ایک صاحب اپنے دیوان کو
بیاض فطرت کہتے ہیں۔ حالاں کہ صحیح نام شیاما سے دو باتیں
ہونا چاہیے تھا۔ اس میں بسم اللہ سے تمت تک شیاما
جلوہ گر ہیں۔ خیر تو صبح وطن چکبست کے رجحان کا ایک
صحیح پتہ دیتا ہے کیوں کہ وطن کی محبت چکبست کے کلام
کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کتاب کے پہلے حصہ
میں جو نظمیں ہیں وہ تمام تر وطن اور حب وطن سے متعلق
ہیں ان میں سے بعض نظمیں سیدھی، صاف اور سہل زبان
میں لکھی گئیں ہیں۔ نہایت پر اثر ہیں اور کافی مشہور ہو چکی
ہیں۔ ہمارا وطن دل سے پیارا وطن، اور، وطن کو ہم وطن
ہم کو مبارک، شاید ہی کوئی شخص نا آشنا ہو، ایک دوسری
نظم "خاک ہند" میں ہندوستان کی قدیم عظمت اور اس کے
مشاہیر کا ذکر کس محبت سے کرتے ہیں ؎

دیوار و در سے ابتک اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں ابتک ان کا لہو رواں ہے

ابتک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش ابتک کیفیت اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

قوم کی آزادی کے متعلق چکبست کا نظریہ ہمارے اہل سیاست دانوں کے تصور سے ملتا جلتا ہے "آوازۂ قوم" میں فرماتے ہیں ۔

یہ آرزو ہے کہ مہر و وفا سے کام رہے
وطن کے باغ میں اپنا ہی انتظام رہے
گلوں کی فکر میں گلچیں نہ صبح و شام رہے
نہ کوئی مرغ خوش الحان اسیر دام رہے

سر پہ شاہ کا اقبال ہو بہار چمن
رہیں چمن کا محافظ یہ تاجدار چمن

ہندوستانی سپاہیوں کی فوج دولت برطانیہ کی جانب سے یورپ کی جنگ میں شرکت کے لیے جاتی ہے ۔ چکبست انھیں یوں بڑھاوا دیتے ہیں ۔ خدا انھیں وو تدبیر کی تربیت کو عزیز رکھے ۔ انکے بعد ان کے رنگ کے نام لیوا باقی رہے سے

ساحل ہند سے جرار وطن جاتے ہیں
کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
رن میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں
تیغ زن، برق فگن، قلعہ شکن جاتے ہیں

سامنے ان کے ظفر برہنہ پا چلتی ہے
ان کی تلوار کے سائے میں قضا چلتی ہے

"صبح وطن" کے دوسرے حصے میں زیادہ تر اصلاحی و مذہبی نظمیں ہیں اس میں زیادہ تر مسدس لکھے گئے ہیں ۔ اور چکبست نے اس صنف سخن کو خاص کامیابی سے نبھایا ہے ۔

ایک جگہ نوجوانوں سے خطاب ہوتا ہے ۔

چمن عمر ہمیشہ نہ رہے گا شاداب
خم میں باقی نہ رہے گی یہ جوانی کی شراب
نشۂ علم میں ہر وقت رہو تم غرقاب
شان تعلیم یہی ہے یہی تہذیب شباب

ملے آزادی دل کو طبیعت کی روانی دم ہے
بے پئے نشہ رہے جس میں جوانی وہ ہے

"گائے" پر ایک اچھی نظم لکھی ہے ۔ اپنی عقیدت کی وجہ بیان کرتے ہیں "دودھ سے تیرے لڑکپن میں زباں دھوئی ہے ۔" ایک بند ملاحظہ ہو ۔

صاحب دل تجھے تصویر وفا کہتے ہیں
چشمہ فیض خدا مرد خدا کہتے ہیں
دردمندوں کی مسیحا شعرا کہتے ہیں
ماں تجھے کہتے ہیں ہندو تو بجا کہتے ہیں

کون ہے جس نے ترے دودھ سے منہ پھیرا ہے
آج اس قوم کی رگ رگ میں لہو تیرا ہے

سب سے دلچسپ نظم "لڑکیوں سے خطاب" لکھی ہے ۔ چکبست عورتوں کی آزادی کے بارے میں "حد ادب" کے قائل تھے ۔ بچپن میں جو کہانیاں سنتے تھے ان سب میں ایک چیز مشترک ہوتی تھی، ہیرو کو اس کی بہن یا بیوی یا ماں تین طرف جانے کی اجازت دیتی تھی اور چوتھی طرف کیلئے منع کر دیتی تھی ۔ نتیجہ ہمیشہ یکساں نکلتا تھا ۔ ہر شخص چوتھی سمت کو دوڑتا تھا ۔ کہیں ہماری لڑکیوں اور عورتوں کا بھی یہی حشر نہ ہو ۔ بہر حال نظم کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز

رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز

رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا
پردہ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز

دل تمہارا ہے وفاؤں کی پرستش کیلئے
اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز

اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں
یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز

ہم تمہیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں
تم ذرا اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

کسی زبان کی شاعری صرف غنائیات (گیتوں اور غزلوں) سے مالا مال نہیں ہوتی، اس میں قدیم مذہبی اور نیم مذہبی داستانوں کی بھی ضرورت ہے بڑے افسوس کی بات ہے کہ رامائن اور مہابھارت کی داستانیں ابھی اردو میں صرف تبرک کے طور پر ملتی ہیں چکبست نے رامائن کا ایک سین "کھینچا ہے جس کو پڑھ کر ان کی اس صنف میں قادرالکلامی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس کام کے لیے نہایت موزوں تھے، ماں کے اضطراب اور رام چندر جی کے بن باس پریشانی کا حال یوں بیان ہوتا ہے۔

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر
گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر

رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر
یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

رام چندر جی کا جواب بھی ان کی بلند سیرت اور اولوالعزمی کے شایان شان ہے۔

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر

جنگل ہو یا پہاڑ، سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

تیسرے حصہ میں بیشتر مراثی ہیں، یہ مرثیے صرف غم کی داستان نہیں ہیں، ان میں چکبست نے سیرت نگاری کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے ہیں، گو کچھ اور تلک کے گرد صرف آنسوؤں کا سیلاب ہی نہیں یہ زندہ اور تابندہ بھی نظر آتے ہیں اس طرح یہ نظمیں صرف وقتی نہیں رہتیں بلکہ لازوال ہو جاتی ہیں، ایک رہنمائے قوم کے ماتم میں لکھتے ہیں ؎

وطن کو تو نے سنوارا کس آب و تاب کیساتھ
سحر کا نور بڑھے جیسے آفتاب کے ساتھ

بچھے رفاہ کے گل حسن انتخاب کے ساتھ
شباب قوم کا چمکا ترے شباب کے ساتھ

جو آج نشو و نما کا نیا زمانہ ہے
یہ انقلاب تری عمر کا فسانہ ہے

چکبست کی غزلوں میں بھی ان کا سیاسی رنگ جھلکتا ہے بعض تنگ نظر ممکن ہے انھیں غزل کے حدود سے خارج

کا بھی دنیا میں گنہ گار بنتا تھا، ہاں ان میں شاعری کا فطری
ذوق تھا ایک حساس طبیعت تھی اور اس کے انداز بیان
میں ایک رعنائی و رنگینی تھی ہمارا جدید اردو ادب اسی
رنگینی سے باغ و بہار بنا ہوا ہے۔

چکبست کی شاعری کئی پہلوؤں سے جدید شاعری
ہے، اس میں اچھے اچھے تجربے بھی ہیں اور یہ تجربے موضوع
اور اسلوب دونوں کے ہیں مگر زیادہ تر چکبست کا اسلوب
قدیم رنگ کی ایک نکھری ہوئی شکل ہے چکبست کے معیار
میں وطن قدر اعلیٰ تھا اور خاک وطن کا ہر ذرہ دیوتا۔
وطن کی یہ محبت محض اس کے خوبصورت مناظر تک محدود
نہیں چکبست مناظر فطرت کے شیدائی ضرور ہیں۔ مگر
اوپری دل سے، انھیں انسانوں کی محفل میں زیادہ حظ
ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ
دہرہ دون سے آگے نہیں بڑھے اور یہیں سے بہت جلد
معرفت کردگار کے مظاہر دیکھنے لگے، ہاں تو وطن کی
محبت محض اس سے مناظر کی وجہ سے نہیں؟ اس کی مخصوص
ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کی وجہ سے ہے جسکی
تعمیر میں بقول ایک بزرگ ویدک دھرم اور خلافت راشدہ
دونوں نے حصہ لیا ہے"۔ وطن کی آزادی کی جدوجہد جنگ
عظیم سے قبل ہو رہی تھی اس سے چکبست دل و جان سے
شریک تھے مگر وہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جسے آج ہم
لبرل اور ریفارمسٹ کہتے ہیں،

چکبست انیس و آتش کے صرف قائل ہی نہیں مقلد
بھی تھے ان کی نظموں اور غزلوں میں ہر دو اساتذہ کا
رنگ جھلکتا ہے انکے کلام میں رنگینی و درد ہے صدق جذبات
اور سوز و گداز نے کلام میں تاثیر پیدا کی ہے اور روانی
و صفائی نے اسے دلنشین بنایا ہے۔ اس میں گہرائی ضرور
کم ہے اور چونکہ وقتی مسائل سے زیادہ بحث ہے اسلئے
اس کی ابدیت کو صدمہ پہونچتا ہے۔

چکبست کے مضامین کا ایک مجموعہ، مضامین چکبست
کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس میں زیادہ تر ادبی مقالات
ہیں اور ان میں سے بعض مثلاً دیباچہ گلزار نسیم داغ،
اودھ پنچ، رتن ناتھ سرشار مستقل حیثیت رکھتے ہیں،
سرسید اور ان کے رفقائے جہاں جدید شاعری کی داغ
بیل ڈالی وہاں تنقید میں بھی نئی راہیں نکالیں، ان سے
پہلے ہماری تنقید کا معیار شخصی اور صنعتی تھا شاعر کو اپنے
ماحول سے بیگانہ عالم بالا میں پرواز کرتے ہوئے دکھایا
جاتا تھا اور اس کے کلام کی اچھائی یا برائی کی اساتذہ
کے اسناد متعین کی جاتی تھی۔ ان بزرگوں نے تنقید کا دوسرا
رنگ نکالا جس میں شاعر کے خیالات کا ماخذ اسکے ماحول
میں تلاش کیا جاتا ہے، اس کی سیرت کو پرکھا جاتا ہے اور
کلام سے مطابقت کی کوشش کیجاتی ہے، اس کے خیالات
کی بلندی اور گہرائی پر نظر ڈالی جاتی ہے پھر کہیں ان کا
درجہ متعین کیا جاتا ہے، چکبست اس میدان میں قدامت
پسندی کی حیثیت سے رونق افروز ہیں، اُن کا لکھنوی مذاق
انھیں صنعتی اور شخصی معیار سے نکلنے نہیں دیتا مگر وہ
اس پر قناعت نہیں کرتے چونکہ وہ انگریزی،
فارسی کے فاضل تھے اور اپنی زبان پر انھیں پوری
قدرت تھی، اس لئے ان کے طرز تحریر میں بھی
شستگی و روانی ہوتی ہے اور وہ مجتہد

پر قناعت نہیں کرتے۔ مثلاً داغ پر اُن کا مضمون بہت دلوں تک دوسرے نقادوں کا مشعل راہ بنا رہا۔ اگرچہ وہ اپنے تندرست، جاندار اور تھوڑے سے محدود تصور کی وجہ سے بعض بڑی قطعی باتیں کہہ دیتے تھے، وہ بالکل غیرجانبدار بھی نہ رہ سکتے تھے مگر اکثر کام کی باتیں اور اچھی باتیں بتا سکتے تھے، ان کی رائے کے ماننے پر ہم مجبور نہیں مگر اس کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

افسوس ہے کہ وہ نسل جس سے چکبست تعلق رکھتے تھے شمال ہند سے اُٹھتی جاتی ہے اور اب اس کی جگہ لینے والے نظر نہیں آتے۔ یہ وہ نسل تھی جو اپنی تہذیب و معاشرت اور اردو ادب سے قلبی محبت رکھتے ہوئے ترقی پسند اور آزاد خیال بھی تھی، آپ حضرات اس کے یہ معنی نہ سمجھیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی سند ہیں، یہ لوگ قدیم اور جدید سلسلہ کی درمیانی کڑی تھے، اور دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کرتے تھے۔، بہت زیادہ سوچ نہ سکتے تھے بہت اُونچا اڑ نہ سکتے تھے بہت دور دیکھنا اس کے بس کا نہ تھا کیوں کہ تاریکی سے ابھی ابھی نکلے تھے۔ مگر ان کا دل فراخ، ان کی طبیعت زیادہ سلجھی ہوئی اور ان کی محبت کے قانون زیادہ وسیع اور بعض لوگ جب ان کی نارسائی پر اعتراض کرتے بھول جاتے ہیں کہ کیسی کیسی مشکلات اُنھیں دامنگیر

(۱۹۳۶)

چکبست لکھنوی

تحریر اور پیش کش ـــــــ شفاعت علی صدیقی

ترے خامے کی جنبش سے وہ تحریریں ہوئیں پیدا
کہ ہر ہر لفظ سے معنی کی تصویریں ہوئیں پیدا

حقیقت کھل گئی صبحِ وطن سے دین و دنیا کی
ترے افکار سے گیتا کی تفسیریں ہوئیں پیدا

رگوں میں خون دوڑا قلب کو طاقت بہم پہنچی
سروں میں حکمتیں سینوں میں تنویریں ہوئیں پیدا

دلِ دشمن کو بھی مسحور کرنے سے نہیں چھوڑا
ترے طرزِ تکلم میں وہ تسخیریں ہوئیں پیدا

ترے حبِ وطن میں دیکھ کر رنگِ حقیقت کو
زمینِ ہند کی ہر دل میں توقیریں ہوئیں پیدا

یہ خراجِ عقیدت اس دیدہ اور صاحب نظر کے لیے ہے جو لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ تھا۔ جس کے یہاں ہندو مسلم اور اپنے پرائے کا چلن ہی نہ تھا۔ جو باکمال شاعر بھی تھا اور بہت بڑا انسان بھی۔ جس کے قومی آدرشوں، اور اخلاقی نظریوں نے اہلِ وطن کی زندگی میں حرکت و حیات کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ جس نے اپنی فکری صلاحیتوں سے اُردو شعر و ادب کو خیال و بیان کے نئے سانچے عطا کیے تھے۔ جس کی تحریروں نے نوجوان نسل کو فکر و عمل کے راستوں پر لگا دیا تھا اور دنیا جسے پنڈت برج نرائن چکبست کے نام سے اس وقت تک یاد کرتی رہے گی جب تک حق گوئی بے باکی، مروت اور محبت کا چلن رہے گا۔

جو تھا غم خوردۂ آزارِ وطن وہ چکبست
جو تھا آما جگہ رنج و محن وہ چکبست
جس کو حق بات کے کہنے میں کبھی باک نہ تھا
جو تھا وارفتۂ زنجیر و رسن وہ چکبست
جس کی رگ رگ میں محبت کی بھری تھی بجلی
جو تھا ایثار و مروت ہمہ تن وہ چکبست
جس کی تحقیقِ معانی کا زمانہ تھا گواہ
جس کا مداح تھا ہر مارفی سے
۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ہندوستا

فرنگی سامراج کو فریب کاریوں اور دغابازیوں کا جال پھیلانے کی کھلی چھوٹ مل گئی۔ اُنھوں نے ظلم و زیادتی کی پالیسیوں کو اپنانے کے ساتھ ساتھ، اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کیلئے یہ بھی بہتر سمجھا کہ ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے جس سے ہندوستانی عوام اپنے بہادری اور جاںنثاری کے کارناموں کو بھول کر، انگریزوں کو ہی اپنا آقا سمجھیں ان کی غلامی پر فخر کریں اور ان کی تابعداری کو ہی اپنا دھرم و ایمان جانیں۔ ان کی اس پالیسی سے پوری قوم کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ ارادوں میں کمزوری اور ہمتوں میں پستی آگئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے عزم و ہمت اور حوصلے سے ہندوستانی قوم کو کبھی واسطہ ہی نہ رہا تھا۔ معاشرے میں بگاڑ آتا گیا۔ میلے ٹھیلے، کھیل کود اور تفریح کے نئے نئے طریقوں نے بہادری کے ساتھ جینے کا تصور ہی ختم کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ غیر ملکی حکومت نے یہ بھی کیا کہ غریبی، جہالت، فرقہ پرستی اور اونچ نیچ کی نحوستوں کو پنپنے اور پھلنے پھولنے کے راستے نکالے تاکہ عوام ان میں پھنسے رہیں اور آزادی کا تصور ہی نہ کر سکیں۔

لیکن زبانوں پر پہرے اور تحریروں پر پابندیوں کے باوجود، فرنگی حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ اُبھرتا ہی رہا اور چوتھائی صدی کے بعد ہی جس نئی نسل نے آنکھ کھولی اس نے غیر ملکی طاقت اور ہیبت سے ڈرنے کے بجائے اس سے چھٹکارا پانے کی خواہشوں

چکبست ایسے ہی زمانے میں ۱۹ جنوری ۱۸۸۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی پانچ ہی سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے ان کی اپنے بھائی کے گھر لکھنؤ آگئیں جن کا مکان کشمیری محلے میں تھا۔ ان دنوں لکھنؤ تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ شرافت محبت اور خلوص کو جلا بخشنے والی صحبتیں ابھی باقی تھیں روشنی بھی آہستہ آہستہ اپنا اجالا پھیلا رہی تھی۔ چکبست نے اسی ماحول میں ہوش سنبھالا۔ پرانی تہذیب کی اچھائیوں کی رہبری اور نئی تعلیم نے ان کے دل و دماغ میں وسعت عطا کی، اسی لیے انھوں نے اصلاحِ قوم اور آزادیٔ وطن کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا۔

رواج کے مطابق پنڈت برج نرائن چکبست کی تعلیم پہلے ہی گھر پر شروع ہوئی۔ اُردو اور فارسی میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ وہ اسکول بھی جانے لگے۔ والد کی تربیت اور بڑے بھائی پنڈت مہاراج نرائن چکبست کی سرپرستی نے ان کی ذہانت کو رنگ دکھانے اور ان کی صلاحیتوں کو کام میں لانے کے بہترین موقع فراہم کئے۔ ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد جب انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا تو عزت اور شہرت نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ شاعری شروع کی تو اس کا محور اخلاقیات، انسانیت، وطنی جذبہ اور روحانی تعلیم رکھا۔ چنانچہ بہت جلد دنیائے شاعری کی نامور اور باعزت شخصیت بن گئے۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے لفظوں میں۔

"شہرت کی دیوی جس کی ایک نظر کے کتنے ہی شاعر متمنی رہتے ہیں اور وہ گھڑی دو گھڑی سبز باغ دکھا کر انکو اپنے ایوان سے نکال باہر کرتی اور قعرِ گمنامی میں ڈھکیل دیتی ہے۔ چکبست سے کچھ دن برنائے

معشوقانہ روٹھی رہی کہ لو صاحب منتہا تھا ایک طرف ۔ جو سے امید رکھتے ہیں کہ انکی تلاش میں ماری ماری پھروں ۔ بندی ایسی کہاں کی گئی گزری ہو مگر شاعر نے اپنی وضع نہیں چھوڑی اور اپنی ضد پر اڑا رہا ۔ بہت جز بز ہوئی ، بکی جھکی ، آخر کار اپنی ہمجولی صداقت اور پڑوسی انصاف کے سمجھانے بجھانے سے مان گئی ۔ اور تر یا ہٹ چھوڑ کر نفس نفیس چکبست کی خواب گاہ میں داخل ہوئی ۔ کچھ دیر سے پیار سے تکتی اور مسکراتی رہی ۔ پھر گدگدا کر بیدار کیا ۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں گلے شکوے ہوئے اس کے بعد اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھی اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھدیا ۔

شہرت اور ناموری کی دیوی کے ہاتھوں بقائے دوام کا تاج پہننے والے پنڈت برج نرائن چکبست ۔ اپنا وقت زیادہ تر پڑھنے لکھنے اور اُردو ، فارسی و انگریزی کی معیاری کتابوں کے مطالعے میں گذارا کرتے ۔ فضول باتوں سے وہ ہمیشہ کتراتے رہتے اور بیکار کی صحبتوں سے کبھی واسطہ نہ رکھتے ۔ ان کی طبیعت شروع سے ہی شعر و شاعری کی طرف مائل تھی ۔ مطالعہ کی گہرائی اور خیالات میں وسعت کی وجہ سے ان کا ابتدائی کلام بھی اتنا معیاری ہے کہ اگر اسی کو سامنے رکھا جائے تو انکے قادر الکلام ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی ۔ ۱۸۹۸ء میں چکبست نے انجمن نوجوانان کشمیر کے سالانہ جلسہ میں ایک نظم پڑھی تھی ۔ اس نظم کی سلاست روانی ، زبان و بیان پر قدرت اور ناصحانہ انداز کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ شاعری کی عمر صرف پندرہ سال کی ہے کس شان سے کہتے ہیں ۔

عالم سے جدا ہے مری تقریر کا عالم
بد بینوں پہ حیرت سے ہے تصویر کا عالم
رنگین سخنی سے ہے یہ تحریر کا عالم
ہر صفحہ پہ ہے گلشن کشمیر کا عالم
کیفیت گلزار اسمائی ہے نظر میں
اس خطۂ دلکش کا ہے سودا مرے سر میں

نظم میں کشمیر کی خوبصورتی اور اس کے دلکش مناظر کا ذکر کرنے کے بعد کشمیریوں کی حالت خصوصاً نوجوانانِ کشمیر کو ان کی بے حسی اور لاپرواہی کی طرف توجہ دلائی ہے ۔

موجود ہے جن بازؤں میں زورِ جوانی
طوفاں سے انھیں کشتی قومی ہے بچانی
پر ہے مئے غفلت سے سروں میں یہ گرانی
آرام پسندی میں یہ رکھتے نہیں ثانی
پہلو میں کسی کے دل دیوانہ نہیں ہے
ہیں مرد مگر ہمت مردانہ نہیں ہے

اس طویل نظم کے آخر میں نوعمر چکبست بڑے پرجوش انداز میں قوم کو تنبیہ کرتے ہیں اور انھیں بتاتے ہیں کہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اگر تم نے تبدیلی اختیار نہ کی تو تباہیوں کے غار منہ کھولے ہوئے تمھارا انتظار کر رہے ہیں اس کم سنی میں بھی قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے جو درد اور تڑپ تھی اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایئے ۔

ہشیار ہو اے قوم یہ غفلت نہیں اچھی
یہ خیرگیٔ تشنۂ دولت نہیں اچھی
معزولیٔ آئین شرافت نہیں اچھی
یہ دشمن اخلاق ...

مانا شبِ ادبار کا ہر سمت اثر ہے
گر خواب سے بیدار ہوا اب بھی تو سحر ہے
واجب نہیں مذہب کے مسائل پہ بھی حجت۔
بازیچۂ اطفال ہے ہفتاد و دو ملت
بس قابلِ تسلیم اسی کی ہے شریعت
جس دل میں ہو انساں کے لیے دردِ محبت
تہذیب پسندیدۂ آفاق یہی ہے
مذہب یہی، ملت یہی، اخلاق یہی ہے

چکبست کو قدرت نے بڑا حساس اور دردمند دل عطا کیا تھا قوم کی ترقی اور اس کی اصلاح کے لیے خدمت و عمل کا انہیں بڑا جذبہ تھا۔ نوجوانوں میں اخلاقی پستی اور بری عادتوں کی زیادتی کو دیکھ کر وہ ان کو صحیح راستوں پر لگانے کی ترکیبیں سوچا کرتے۔ اصلاحی کاموں کے لیے ہمت افزائی کرنے والوں میں ان کی ماں اور بڑے بھائی کے ساتھ ساتھ پنڈت بشن نرائن در کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ در صاحب بڑے پڑھے لکھے، صلح پسند اور سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ انگریزی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں پر انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اردو کے اچھے شاعر تھے اور آبر تخلص کرتے بشن نرائن در کی زندگی، ان کے اصول اور ان کے کو نمونہ بنانے والے نوجوانوں میں پنڈت برج ہت بھی تھے۔ انھیں بشن نرائن در سے جو عقیدت معنا انھوں نے بار بار کیا ہے۔ اپنی تصنیف ، میں ان کی کس احترام سے یاد کرتے ہیں۔
کی زندگی در کی زندگی ایک ایسے مرد قانع
نے علم کو دولت اور ملک و

قوم کی خدمت کو ذریعہ نجات سمجھا اور آزاد خیالی و بلند نظری کو انسانی شرافت کا معیار خیال کیا۔ پنڈت صاحب موصوف اپنے صفائے قلب و نیک نیتی اور صبر و استقلال کے لحاظ سے انسانی عظمت کی تصویر ہیں۔ میں ہمیشہ سے آپ کو اپنا محسن اور فرشتۂ رحمت خیال کرتا ہوں۔"

خیالات کی پاکیزگی اور خدمت و عمل کے جذبے نے انھیں سچائی، ایثار، بلند خیالی اور وطن پرستی کا مجسمہ بنا دیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور اپنے طرزِ عمل کے ذریعہ اہل وطن کو اصلاحی ترقی کی طرف مائل کرنے اور ان میں حب الوطنی کے جذبات بیدار کرنے کیلئے مضامین اور نظمیں لکھیں۔ محبت، رواداری اور خدمتِ خلق کو اپنی زندگی کا مسلک بنایا۔ ان کے مجموعے صبح وطن میں ایسے اشعار بہت سے ملتے ہیں جن میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا یہ شعر تو ضرب المثل بن گیا ہے۔

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

قوم کا سودا، وفا کا شوق خدمت کی امنگ
بس انھیں دو تین کے صدقے میں دل آباد تھا

چکبست زندگی بھر محبت، شرافت اور انسان دوستی کی راہوں کو روشن کرتے رہے۔ دوسروں کے کام آنے اور ان کی تکلیفوں میں ہاتھ بٹانے کو ہی انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فریضہ سمجھا۔ وہ ایسی محبتوں کو اپناتے

اور ایسی ہستیوں سے عقیدت رکھتے جنھیں انسانیت و
محبت پر یقین ہوتا۔ خود کہتے ہیں۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں
بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُسکا بندہ بنوں گا جس کو
خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

اپنے اس مسلک سے وہ کبھی الگ نہیں ہوئے۔ خدمت
خلق، نیک طبیعتی حسن اخلاق اور اصلاح وطن کے کاموں
کی وجہ سے ہر چھوٹا بڑا دل سے ان کی عزت کرتا تھا
نوعمری ہی سے انھوں نے معاشرے کی اصلاح کیلئے
اپنی نظم و نثر کے ذریعہ لوگوں میں بیداری کی لہر دوڑانا
شروع کر دی تھی اور سماجی برائیوں کے خلاف بڑی بے
باکی سے لکھنے لگے تھے ان دنوں محفلوں میں شراب کا
اتنا چلن تھا کہ اس سے پرہیز کرنے والے کو ہنسی اور طنز
ومذاق کا نشانہ بنا لیا جاتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو
لوگ ایسی محفلوں میں پھنس کر مجبوراً اور بد دلی کیساتھ
شراب استعمال کرتے تھے وہ بھی بعد میں اس کے
عادی ہو جاتے اور تباہیوں کے اندھیروں میں گم ہوتے
چلے جاتے۔ چکبست نے اپنی نظم "آب انگور" میں بڑی
جسارت کے ساتھ شراب کی خرابیوں کا ذکر کیا ہے۔
یہ نظم انھوں نے ۱۷ سال کی عمر میں لکھی تھی لیکن انداز
بیان کی پختگی دیکھیئے۔

رفیق اس کی ہے مستی عدو شعور اسکا
وداع ہوش کا سامان ہے ظہور اسکا
خمار مرگ جو لائے وہ ہے سرور اسکا
سیاہ قلب کو کر دے جو ہے وہ نور اسکا
لگائے آگ کلیجے میں جو وہ آب ہے یہ
کرے جو طرفہ قیامت وہ آفتاب ہے یہ
عدو بشر کی یہ ہے اس پہ ہے خدا کا عتاب
کسی کے دل میں کرے گھر نہ بس یہ خانہ خراب
نہ اس کے شوق میں ہو برباد کسی کا شباب
کسی کے دل میں الٰہی نہ ہو ہوائے شراب
تباہ سیکڑوں روشن دماغ اس نے کئے
بجھا کے داغ ہزاروں چراغ اس نے کئے

چکبست نے اپنی نظموں اور تحریروں کے ذریعہ لوگوں کی
ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا اور ان باتوں کی داغ بیل
ڈالی جن سے ایک نئے اور بیدار دور کا آغاز ہوا۔ انھوں
نے ان تہذیبی قدروں سے پیار کرنا سکھایا جن سے محبت،
مروت، حسن اخلاق حق گوئی اور بے باکی روائتیں زندہ ہیں
قوم کی لڑکیوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

روش خام پہ مردوں کی نہ جانا ہرگز
داغ تعلیم پہ اپنی نہ لگانا ہرگز
رنگ ہے جنکی مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں
ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے
خاک میں غیرت قومی نہ ملانا ہرگز
رنگ و روغن تمہیں یورپ کا مبارک لیکن
قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز
پوجنے کے لیے مندر جو ہے آزادی کا
اس کو تفریح کا مرکز نہ بنانا ہرگز

چکبست نے ۱۹۰۳ میں کشمیری ینگ مین ایسوسی ایشن کے نام

سے ایک کلب قائم کیا اور اپنی اصلاحی سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن جب وکالت نے انھیں بے حد مصروف کر دیا اور کلب کے ساتھیوں نے بھی کاموں میں ڈھیل ڈالنی شروع کر دی تو چکبست نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں آزادی کی تحریک زور پکڑ تی جا رہی تھی اور غلامی سے نجات حاصل کرنے کی آوازیں تیز ہو رہی تھیں۔ چکبست بھی اپنے پرجوش نغموں کے ساتھ اس مہم میں شریک ہو گئے۔

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے

مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

چکبست کے دل میں وطن سے پیار اس کے ذرے ذرے سے محبت و عقیدت بسی ہوئی تھی۔ کتنے سادہ اور سلیس الفاظ میں وہ وطن کا ترانہ سناتے ہیں۔

وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک
یہ الفت کا چمن ہم کو مبارک   وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک
ماں کی خاک ہم کو کیمیا ہے
یہ سونے سے بھی قیمت میں سوا ہے   وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک
و چڑیاں صبح کو گاتی ہیں اکثر
سی کا راگ ہے انکی زبان پر   وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک
سی کی خاک سے لیتے ہیں پھول
ہمیں دیتا ہے غذا اور پھل پھول   وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک
وطن کا جن بزرگوں سے ہوا نام
اس مٹی میں وہ کرتے ہیں آرام   وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک

وطن سے محبت کا یہی جذبہ ان کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے حالی نے غزل کو جو نئے طور طریقے بخشے تھے چکبست نے ان میں اور اضافہ کر دیا۔ پرانی تشبیہوں، گھسے پٹے استعاروں اور حسن و عشق کے محدود دائرے سے نکال کر انھوں نے غزل کو نئے ادبی و قومی رجحانات اور زمانے کے تقاضوں کا موضوع بنایا۔

دل کئے تسخیر بخشا فیض روحانی مجھے
حب قومی ہو گیا نقش سلیمانی مجھے

قوم کا غم مول لے کر دل کا یہ عالم ہوا
یاد بھی آتی نہیں اپنی پریشانی مجھے

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

چکبست کی شاعری اپنے سماج، ماحول اور اس زمانے کے سیاسی حالات کی آئینہ دار ہے۔ ویسے تو ان دنوں سیاسی بیداری کی لہر بہت زوروں پر تھی لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ اسے اور بھی تیز کیا جائے اور لوگوں کے دلوں میں حب وطن اس طرح گھر کر جائے کہ وہ اس کے لیے ہم قربانی دینے کو تیار رہیں۔ چکبست نے اپنے نغموں کے ذریعہ وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کیا اور وطن سے اپنی محبت کے جذبات کو بہت صاف، سادہ اور سلیس الفاظ میں ظاہر کر کے مقبولیت کے انتہائی درجے تک پہونچا دیا۔ آسان زبان اور رچی ہوئی موسیقیت سے بھرپور ان کے ترانوں کو سن کر دلوں میں وطن کی محبت جوش مارنے لگتی ہے —

اہل وطن کو خدمت وطن کے لیے اکسانے اور ان کے حوصلوں کو بلند کرنے کے لیے کس انداز سے مخاطب کرتے ہیں۔

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دلیں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غیرت سے وہ لہو کیا ہے

فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

چکبست کی شاعری میں ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات، سماجی اور اصلاحی تبدیلیوں کے آثار اور زندگی کی قدروں کو حسن کارانہ انداز سے سمونے کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اپنے وطن سے محبت کے ساتھ ساتھ وہ ایسے رہبروں سے بھی عقیدت رکھتے تھے جو شمع آزادی کے پروانے تھے۔ انھوں نے اپنی نثر اور نظم کے ذریعہ مسز بسنٹ، تلک، گوکھلے اور گاندھی جی کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان بزرگوں کے قدموں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا اپنے لیے باعث فخر سمجھا ہے۔

"مسٹر گاندھی کے ایسے فدائیان قوم نے ملک کی نگاہوں کے سامنے جو وطن پرستی کا بلند معیار قائم کیا ہے اس پر ہندوستان کا ذرہ ذرہ ناز کر سکتا ہے۔ .... قومی خدمت کی راہ کی پہلی منزل یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی کو قومی ہستی پر نثار کرنے کیلئے تیار ہو اور اپنے دل و دماغ کو تسلیم و تجربہ کے جو ہروں سے آراستہ کر کے وطن پرستی کیلئے وقف کر دے۔ جو مرد خود اس دشوار گذار راستے پر چلتے ہیں وہ وطن کے نام پر فقیری لیے ہیں۔ انھیں برسوں کی خدمات و ریاضت کے بعد یہ صلہ نصیب ہوتا ہے کہ زمانہ ان کے سر پر ملک و قوم کی سرغناگی کا تاج رکھتا ہے اور دنیا ان کی پرستش کرتی ہے۔ تلک، گوکھلے، سر سید احمد، سر سیندر ناتھ، مالوی وغیرہ ایسے نام ہیں جن کی روشنی سے وطن کی محبت کا نام روشن ہے۔"

چکبست ہوم رول کی تحریک سے بہت متاثر تھے ـــ اور ہوم رول کو بہشت سے بھی بہتر سمجھتے تھے۔ ہوم رول تحریک کی بانی مسز بسنٹ سے انھیں جو عقیدت تھی اس کا اندازہ ان کے جذبات سے لگایا جا سکتا ہے۔

لہلہاتا ہے محبت کا تری دل میں چمن
ماں کے دامن سے ہے بڑھکر کہیں تیرا دامن
تیری تصویر سے ہیں قوم کی آنکھیں روشن
تیرے بالوں کی سفیدی ہے کہ ہے صبح وطن
دل پر درد کی تصویر ہے صورت تیری
تاج کانٹوں کا ہے پہنے ہوئے مورت تیری
داستان دین کی دنیا کو سنائی تو نے
مذہبی بیر کی بنیاد مٹائی تو نے
آگ بھڑکی ہوئی صدیوں کی بجھائی تو نے
راہ انصاف کی اندھوں کو سجھائی تو نے
کس نے گرتی ہوئی قوموں کو سنبھالا ہوتا
تو نہ ہوتی تو نہ دنیا میں اجالا ہوتا

چکبست صرف باکمال شاعر ہی نہ تھے بلکہ بہت اچھے نثر نگار

بھی تھے اور اس زمانے کو دیکھتے ہوئے نڈر اور بیباک صحافی بھی۔ وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی۔ قدرتی مناظر کی عکاسی، دلی جذبات کی ترجمانی اور اخلاقی تعلیم کا پرچار ہی ان کی تحریروں کا خاص موضوع تھا۔ ان کی غزلوں میں بھی ان کے اسی پیغام کی جھلک ملتی ہے۔

باغباں نے یہ انوکھا ستم ایجاد کیا
آشیاں پھونک کے پانی کو بہت یاد کیا

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

عقل کیا چیز ہے اک وضع کی پابندی ہے
دل کو مدت ہوئی اس قید سے آزاد کیا

اس کو ناقدری عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر چکے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

چکبست کی نظم ہو یا نثر اس میں حب وطن کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ انھوں نے رہبرانِ قوم کی وفات پر مرثیے لکھے ہوں یا اپنے عزیزوں کے نوحے، سبھی میں ان کے فلسفیانہ انداز بیان کی عکاسی ہے۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق کی داستانوں اور ہجر و وصال کی کہانیوں کے بجائے قومیت اور اخلاص و مروت کا درس ہے اور یہی ان کی غزلوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔

دردِ دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک
ہے اسے طرۂ دستار غریباں ہونا

ہے مرا ضبط جنوں جوش جنوں سے بڑھ کر
تنگ ہے میرے لیے چاک گریباں ہونا

چکبست کی نظم رامائن کا ایک سین ان کی صاف ستھری اور نکھری ہوئی زبان کی بہترین مثال ہے اس میں انسان کی عظمت، درد و غم کی کسک اور زندگی سے پیار کو چکبست نے بڑے پر اثر ڈھنگ سے بیان کیا ہے یہ نظم نامکمل ہے۔ اگر زندگی چکبست کا ساتھ دیتی اور ۴۴ سال کے مختصر سے عرصہ میں ہی انھیں دغا نہ دے جاتی تو چکبست یہ نظم مکمل کر لیتے اور حسن خیال و لطف بیان کا ایک ایسا مرقع چھوڑ جاتے جو ان کی شہرت اور بقائے دوام کیلئے کافی تھا۔ سر تیج بہادر سپرو نے صحیح لکھا ہے کہ

"اگر شعر گوئی میں برج نرائن چکبست نے ایسا کمال حاصل کیا ہے جو ہمارے لیے مایہ ناز ہے تو اُن کی زندگی بھی ایسی جیتی جاگتی مثال، راست بازی، بلند خیال، وطن پرستی، وفا شعاری اور نیکی، چلن کی تھی کہ جس کا اندازہ صرف انھیں کو ہو سکتا ہے جو ان کے زیر اثر تھے۔ ایسی ہستیاں زمانے میں بہت کم ہوتی ہیں اور جو لوگ ان کے ہمعصر رہ چکے ہیں اور اس وقت بقید حیات ہیں ان کے لیے یہی خیال کرنا ہی کہ وہ ایک زمانے میں ان کے ہمعصر تھے اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے۔ باعث فخر ہے۔

(باقی مضمون صفحہ ۱۶۷ پر)

مطبوعات ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

(بہ ترتیب حروف تہجی مع جدید قیمت، فروری ۱۹۷۷ء)

(۲)

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱	امیر خسرو نمبر	فروغ اردو	۱۲/-
۲	ادبی جائزے	سعادت علی صدیقی	۸/-
۳	ایکتا کا چمن بہاروں کے پھول	ثمر بسوانی	۳/-
۴	احتشام حسین نمبر (فروغ اردو)	سید انصار حسین ماہلی	۲۵/-
۵	اردو کا ماضی حال اور مستقبل	احمد ابراہیم علوی	۴/-
۶	آئینہ نظم اردو	ثمر بسوانی	۴/-
۷	انتخاب کلام چکبست لکھنوی	روپ نرائن شیو پوری ساگر	۱/-
۸	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر محمود الحسن رضوی	۱۴/-
۹	اردو نمبر، فروغ اردو	اقبال صدیقی	۳/۵۰
۱۰	انوار اللغات اردو المعروف بہ خمس اللغات (پاکٹ سائز)	پروفیسر احتشام حسین	۶/-
۱۱	ادبی تاثرات	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۶/-
۱۲	آئینۂ عقل	پروفیسر نکہت شاہجہانپوری	۴/۵۰
۱۳	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶/۵۰
۱۴	امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۱۵	انارکلی امتیاز علی تاج (جدید ایڈیشن)		۳/۵۰
۱۶	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۵/۵۰
۱۷	اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۰/-
۱۸	اردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶/-
۱۹	انتخاب قصائد اردو	مغیث الدین فریدی	۱/۵۰
۲۰	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	۸/-
۲۱	اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم	عبد الشکور	۴/-
۲۲	ادبی نقوش	شاہ معین الدین ندوی	۴/-
۲۳	اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	عبد الماجد دریابادی	۴/-
۲۴	انتخاب جدید نثر اردو	سید احتشام حسین	۲/۵۰
۲۵	اقبال مرثیہ، فروغ اردو		-/۵۰
۲۶	البرامکہ اور ان کا عروج و زوال	ڈاکٹر حبیب حسین [illegible]	۳/-
۲۷	انتخاب کلام غالب	بشیر احمد علوی	۱/۵۰
۲۸	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	۲/۵۰
۲۹	انتخاب قصائد غزلیات فروغ اردو جدید ایڈیشن		۴/-
۳۰	ادب کیا ہے	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۴/-
۳۱	ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	۴/-
۳۲	آئینۂ نثر اردو	سعادت علی صدیقی	۴/۵۰
۳۳	ایک نادر روزنامچہ	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	[illegible]
۳۴	[illegible]	مجنوں گورکھپوری	-/۵۰
۳۵	اردو کی کہانی	سید احتشام حسین	۲/۵۰
۳۶	ادب پارے حصہ نظم و نثر		۵/۲۵
۳۷	ابو الکلام آزاد (نظم)	جگن ناتھ آزاد	-/۲۵
۳۸	ارمغان نثر و نظم	عبد الاحد خاں خلیل	۲/۲۵
۳۹	افسانہ نمبر	مرتبہ فروغ اردو	۱/۵۰
۴۰	اچھی نظمیں	اختر مشتاق	-/۷۵
۴۱	اردو ادب میں طنز و مزاح، تیسرا ایڈیشن	کامل دو جلد، غلام احمد فرقت	۲۵/-
۴۲	اردو شاعری	امیر احمد علوی	۲/-
۴۳	غزلیات حافظ و صائب	غالب فارسی	۱/-
۴۴	آخری یادگار نادر شاہ	معہ ترجمہ	۲/-
۴۵	اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب	اعجاز احمد فاروقی	۱/۵۰
۴۶	اللہ کے پیارے	امیر حسن نورانی	-/۵۰

جلد (۲۴) شمارہ (۱۳) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو/این۔ پی ۹۳
لائسنس نمبر: ۶۴۔۲۰۰۸/۲۰۶۴۱۲
دفتر فون: ۲۶۱۳۵
فون رہائش گاہ: ۲۶۶۵۶

ادارۂ فروغ اردو ہندوستان کا ترجمان
بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۱۳) جون ۱۹۷۶ء جلد (۲۴)

ترتیب

رسالہ اعزازی: دس روپے
عوام سے: آٹھ روپے
فی پرچہ: ۷۰ پیسے

پتہ:
ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس نادان محل روڈ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

ڈاکٹر شجاعت علی (سندیلوی)

اپنی باتیں

فروغ اردو کے چکبست نمبر کا ادبی دنیا، نے جس کشادہ قلبی کے ساتھ خیر مقدم کیا، ادارہ کے لیے بڑا حوصلہ افزا ہے اگرچہ بعض ناگزیر اسباب کی وجہ سے چکبست نمبر حسب دلخواہ شائع نہیں ہوسکا، اس میں خامیاں اور غلطیاں بھی رہ گئیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ چکبست کی شاعری، اور ان کی نثری خدمات اور خصوصیات کے سلسلے میں، پہلی مرتبہ، یہ یادگار نمبر شائع ہوا، مشاہیر ادب کے ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین اور کلام نے اس کی اہمیت، ومقبولیت میں اضافہ کیا۔ ادارہ ان سب حضرات کا بے حد شکر گزار ہے۔

چکبست نمبر کے بعد ادارہ انتہائی مسرت کے ساتھ "پریم چند نمبر" شائع کرنے کا اعلان کر رہا ہے اور اپنے تمام کرم فرماؤں سے استدعا کر رہا ہے کہ وہ پریم چند کی شخصیت، اور ان کے فن پر اپنے گرانقدر مقالات روانہ فرمائیں،

اردو زبان ہو یا اقلیتوں کے مسائل ہوں یا علی گڈھ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مسئلہ ہو، ابھی تک حکومت کا روّیہ صرف زبانی وعدوں اور بہلاووں تک محدود رہا ہے ستم ظریفی یہ ہے کہ "احسانات" و مراعات، کا اتنا پروپیگنڈہ کیا جا رہا

دیا حکومت سے زیادہ اُردو اور اقلیتوں کے مسائل کا کوئی بھی خواہ اور ہمدرد نہیں
ہے ۔ انجمن ترقی اُردو ہند ، اور اس کی ریاستی مقامی شاخیں ادارۂ فروغ اردو ہند
ور دوسرے تمام اَدبی ادارے ۱۹۴۷ء کے بعد سے مسلسل اُردو کے حق کے لئے کوشش
رتے رہے ہیں لیکن ابھی تک مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اُردو کے حق کو تسلیم نہیں کیا
ہے وہ صرف 'رعایتیں اور سہولتیں' دینا ہی کافی سمجھتی ہیں ۔ اُردو والے رعایت اور
سہولت نہیں چاہتے آئینی طور پر اپنا حق چاہتے ہیں جب تک یہ حق نہیں ملے گا
جب تک اُتر پردیش ، بہار ، دہلی اور دوسری ہندی ریاستوں میں اُردو کو
دوسری سرکاری زبان قانونی طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا ، ہمدردانِ اردو کی جدوجہد
جاری رہے گی انھیں یقین ہے کہ باشعور جمہوریت ، ان کا مطالبہ ضرور تسلیم کرے گی ۔ یہ
حقیقت ہے کہ اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس نے ملک کو آزادی ، قومی یکجہتی اور
جمہوریت کا احساس دلایا ۔ متحدہ قومیت مشترکہ تہذیب اور ملک کی سالمیت کا تصور دیا
س لیے جب تک اس زبان کو کچلا جاتا رہے گا ۔ اس کی سالمیت اور قومی یک جہتی اور
جمہوریت کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا رہے گا ۔

جولائی ۱۹۷۷ء سے تعلیمی اداروں میں طلبہ کے داخلے اور اردو کی تعلیم کے سلسلے میں انجمن
رقی اُردو اُردو ٹیچرس ایسوسی ایشن اور دوسری انجمنوں نے اہم عملی قدم اُٹھایا ہے حلقہ وار جلسے کرکے
طلبہ ، اور ان کے سرپرستوں کو مادری زبان کی تعلیم کی اہمیت و افادیت ، بتائی جارہی ہے لکھنؤ
میں انجمن ترقی اُردو کے اُردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے تعاون سے ، حلقوں کی تقسیم کرکے ذمہ دار مقرر
کر دیئے ہیں جو اپنے اپنے حلقوں میں ہمدردانِ اُردو کی ایک کمیٹی بناکر ، تمام اسکولوں میں اُردو کی تعلیم رائج کرنے کی مہم چلائے گی
ہمدردانِ اُردو کا فرض ہے کہ وہ ریاست اُتر پردیش کے ہر شہر ہر قصبے اور ہر گاؤں کے اسکولوں میں اُردو
کے طلبہ کے داخلے کی مہم کا ابھی سے آغاز کردیں تاکہ آئندہ جولائی ۱۹۷۸ء سے ہر اسکول میں اُردو تعلیم رائج ہو سکے ۔

سنبھل کے نوجوان شاعر ، اور ادیب جناب صابر سنبھلی نے ، مولانا عبدالماجد دریابادی ، رشید احمد
صدیقی ، مختار ہاشمی ، بسمل صدیقی اور صدر جمہوریہ ہند ، فخرالدین علی احمد اور کرشن چندر کی وفات حسرت
آیات پر متعدد قطعات تاریخ لکھے ، افسوس ہے کہ چکبست نمبر میں جگہ نہ رہنے کی وجہ سے شائع
نہیں کئے جاسکے اس شمارہ میں ان کا انتخاب شائع کیا جارہا ہے ۔

قطعات تاریخ

حسب فرمائش ادیب دقیقہ فہم جناب سعادت علی صدیقی

۱۹۷۷ء

از

غمزدہ و افسردہ جان صابر سنبھلی ایم، اے

۱۹۷۷ء

(۱)

قطعہ تاریخ بر رنج وصال — عزت ایوان فخرالدین علی احمد

۱۹۷۷ء ۱۹۷۷ء

ہے ساتھ دلدوز یہ جسکے سبب
خورد و کلاں رنجور ہیں غمگین ہیں

صابر کہو سال وفات اس طرح
خلد ارم میں آج فخرالدین ہیں

۱۳۹۷ھ

(۲)

تاریخ مرگ بندۂ محبوب عبدالماجد دریا بادی

۱۹۷۷ء

چوں شنیدم کہ عبد ماجد مرد
قلب غمگیں مزید شد غم نوش

مرجع تشنگان علم نماند
علم و حکمت شدند خانہ بدوش

فکر تاریخ فوت می کردم
یک بیک آمد ایں ندائے سروش

صابرا! بہر سال مرگ بگو
شمع علم و یقین شد خاموش

۱۹۷۷ء

(۳)

آہ ادیب بیباک پروفیسر رشید احمد صدیقی

۱۳۹۷ھ

مرد اکبر کو لے لیا او چرخ
یہ ستم، ظلم، حرب، کمر وحمد

۱۳۸۴ فصلی ۲۰۳۳ بکرمی

بہر تاریخ مرگ صابر آہ
ہیں کہو خلد میں رشید احمد

۱۹۷۷ء ۱۳۹۷ھ

(۴)

پاک بیان مختار ہاشمی مرحوم

۱۹۷۷ء

عالم آب و گل میں تھے کل تک
آج رہنے کو مل گئی فردوس

سال رحلت کہا یہ صابر نے
گئے مختار ہاشمی فردوس

۱۹۷۷ء

(۵)

آہ اے رفیع المراتب بسمل صدیقی

۱۳۹۷ھ

لکھنؤ کا وہ شاعر کامل
مضطرب جس کے غم میں ہے بزل

فکر تاریخ کی تھی صابر کو
حل ہوئی فضل رب سے یہ مشکل

بولے روح الامی نہ کچھ غم کر
اب ہیں قصر بہشت میں بسمل

۱۳۹۷ھ

(۶)

وقار اردو کرشن چندر ایم، اے

۱۳۹۷ھ

داغ پر داغ اہل اردو کو
وائے آغاز سن ستتر کا

ہاشمی اور رشید کی فرقت
دریا بادی کی موت کا چرکا

پھر بصورت وفات فخرالدین
گر گیا تاج ہند کے سر کا

چل دیئے اب کرشن چندر بھی
کیا مداوا ہے قلب مضطر کا

بہر تاریخ کہدیا صابر
غم ہے اب ہم کو کرشن چندر کا

۱۹۷۷ء

(صابر سنبھلی)

صفدر جنگ

از :- ڈاکٹر عبدالغفار انصاری (صدر شعبہ فارسی بھاگلپور یونیورسٹی)

ہندوستان اور ایران زمانۂ قدیم سے ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان ہر زمانے میں گہرے، تعلقات رہے ہندوستانیوں اور ایرانیوں میں پرانا خاندانی رشتہ بھی ہے۔ دونوں ملکوں کے باشندے آریائی زبان بولتے تھے۔ اس لئے سنسکرت اور فارسی میں گہرا رشتہ ہے مغل بادشاہوں کے زمانہ میں ہندوستان بہت خوشحال تھا اور لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے خصوصاً جہانگیر اور شاہجہاں کو شاعر و شاعری سے بہت رغبت تھی۔ اُن کے زمانے میں بہت سارے ایرانی لوگ ہندوستان آئے اور حکومت کے بلند عہدوں پر فائز ہوئے جہانگیر کے دربار کے ملک الشعراء طالب آملی اور شاہجہاں کے دربار کے ملک الشعراء مرزا صائب اور ابو طالب کلیم ایرانی ہی تھے اور ہمایوں جب شیر شاہ سے شکست کھاکر ایران بھاگا تو شہنشاہ ایران نے اُن کی بڑی خاطر مدارات کی اور شہنشاہ ایران ہی کی مدد سے ہمایوں کو پھر تخت و تاج ملا آج بھی ہمایوں کی تصویر اصفہان میں "چہل ستون" میں موجود ہے۔

ایران کے شہر نیشاپور کا ایک تباہ اور خستہ حال انسان محمد مقیم بھی اپریل ۲۳ ۱۷۰۸ء میں سورت پہنچا۔[1] اسوقت کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ اودھ کا "دوسرا نواب" (صوبہ دار) اور ہندوستان کا وزیر اعظم بنے گا — یہی محمد مقیم تاریخ میں "صفدر جنگ" کے نام سے مشہور ہے اور شہر دہلی میں صفدر جنگ کا مقبرہ، صفدر جنگ ہوائی اڈہ اور صفدر جنگ ہسپتال اس بات پر شاہد ہیں کہ ایران اور ہندوستان میں گہرے تعلقات رکھتے تھے اور رکھتے ہیں ابو طالب کلیم کاشانی کا دو شعر ذیل نقل کیا جاتا ہے۔

سواد اعظم اقلیم عافیت ہند است[1]
سراب اینجا سیراب زآب حیوانست

1. The First two Nawabs of Oudh

چرا نگویم دار الامان حادثہ اسش
کہ ہند کشتی نوح و زمانہ طوفان است

ڈاکٹر آشیربادی لال اور ٹامس ولیم بیل متفق ہیں کہ صفدر جنگ کا نام محمد مقیم تھا۔ اُس کے والد کا نام جعفر بیگ خان تھا جس کی شادی برہان الملک سعادت خاں کی بڑی بہن سے ہوئی تھی۔ صفدر جنگ برہان الملک، سعادت خاں "پہلا نواب اودھ" کا بھانجا تھا۔ چھ ماہ کی عمر میں اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ برہان الملک کی دوسری بہن نے صفدر جنگ اور اُس کے بڑے بھائی کی پرورش کی۔ ڈاکٹر آشیربادی لال نے لکھا ہے کہ صفدر جنگ کی پیدائش ۱۷۰۸ء میں ہوئی ہوگی۔ اُس کو برہان الملک سعادت خاں نے نیشاپور سے ہندوستان بلایا تھا۔ اُس کے ساتھ سعادت خاں کے بڑے بھائی میر محمد باقر بھی ہندوستان آئے تھے۔ یہ دونوں سورت سے فیض آباد آئے۔ برہان الملک نے اپنی بیٹی صدر النساء عرف نواب بیگم کی شادی صفدر جنگ سے کر دی۔ اُس کے بعد صفدر جنگ اودھ کا نائب صوبہ دار بنایا گیا اور محمد شاہ نے اُس کو ابوالمنصور خان کا خطاب دیا۔ ۱۱۴۴ھ میں صدر النساء کے بطن سے جلال الدین حیدر پیدا ہوا جو تاریخ میں شجاع الدولہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور اودھ کا تیسرا نواب تھا۔

صفدر جنگ تعلیم یافتہ اور مہذب تھا۔ اُس کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کو فارسی زبان میں مہارت حاصل تھی۔ اُس نے برہان الملک کی تربیت میں رہ کر حکمرانی کے تجربہ حاصل کیے جس کا فائدہ اُس کو بعد میں ہوا۔ برہان الملک اُس کو اپنے بیٹا کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ ۱۷۲۴ء کے بعد برہان الملک نے جتنی لڑائیاں لڑیں سب میں صفدر جنگ بھی ساتھ تھا۔ بھگونت سنگھ کیچی کے خلاف نومبر ۱۷۳۵ء کی لڑائی میں بھی برہان الملک کے ساتھ صفدر جنگ تھا۔

۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء میں برہان الملک کی وفات پر اودھ کی صوبیداری کے لیے کچھ جھگڑا پیدا ہوا۔ برہان الملک کا بھتیجا نثار محمد خاں شیر جنگ بھی اودھ کی صوبہ داری کا دعویدار تھا۔ لیکن صفدر جنگ ہی کو اُس کی صلاحیتوں کی وجہ سے صوبہ دار بنایا گیا۔ اُس نے دو کروڑ روپے نادر شاہ کو بھی اودھ کے خزانہ سے دیا۔ نادر شاہ کے ایران واپس جانے کے فوراً بعد محمد شاہ نے اُس کو صفدر جنگ کا خطاب بخشا۔ برہان الملک کے انتقال کے بعد شیخ نصر اللہ، فرحت اللہ اور راجپوتوں نے آزادی کے لیے سر اٹھایا لیکن کچل دیے گئے۔ ۱۷ دسمبر ۱۷۴۲ء میں صفدر جنگ پٹنہ آیا اور بانکی پور میں قیام کیا۔ ۲۱ مارچ ۱۷۴۴ء میں صفدر جنگ کو "میر آتش" اور کشمیر کی صوبہ داری کا عہدہ ملا۔ سید کمال الدین حیدر[1] کا بیان ہے کہ صفدر جنگ نے ۱۱۵۸ھ مطابق ۱۷۴۵ء میں اپنے بیٹا شجاع الدولہ کی شادی دہلی میں کی جو یادگار زمانہ ہوئی۔ محمد شاہ اور ارکان دولت شریک ہوئے۔ اس شادی میں ۴۶ لاکھ

[1] تواریخ اودھ ص ۷۹

روپے خرچ ہوئے ۔

۲۶ جون ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ نے صفدر جنگ کو وزیر اعظم بنایا اور آٹھ ہزاری منصب بھی بخشا۔ ۱۶ جولائی ۱۷۵۲ء میں اجمیر کی صوبہ داری اور نرنول کی فوجداری بھی اس کو ملی۔ ہیلم بیل[۱] نے لکھا ہے کہ ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں ... صدر جنگ کو وزارت سے الگ کر دیا۔

ڈاکٹر آشیر بادی لال کا بیان ہے کہ صفدر جنگ کی پیشانی کشادہ، ناک لمبی، آنکھیں چمکیلی، رنگ سفید اور داڑھی گھنی تھی۔ وہ مجرموں کو سزا دینے میں بہت سخت تھا لیکن اس کی گفتگو میں نرمی تھی۔ وہ برہان الملک کی طرح علم و ادب کا سرپرست تھا۔ اس نے اہل علم کو وظیفے اور انعامات دئے۔ شیخ محمد حسن، سید زین العابدین طباطبائی، سید محمد علی اورنگ آبادی، میر غلام نبی بلگرامی ملک العلما، مولوی فضل اللہ خاں، مولوی حمد اللہ خاں اور مرزا علی نقی وغیرہم کی صفدر جنگ نے سرپرستی کی بھگوان داس ہندی[۲] نے لکھا ہے کہ صفدر جنگ اس دور کے نامور شاعر مرزا عظیما اکسیر کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک دن اس نے پرچۂ حریر پر اپنا ایک نقش بنا کر صفدر جنگ کو پیش کیا۔ اس نقش میں وہ ایک لاغر گھوڑے پر سوار تھا صفدر جنگ نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ اس کی شبیہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ گھوڑا بھی اسی کا ہے۔ چونکہ مرزا عظیما اکسیر جسیم تھا اور نقش میں اس کا گھوڑا ساز طلائی اور پانچ ہزار روپے کے ساتھ اس کو بخشا۔ عبد الرضا متین پر بھی صفدر جنگ کی مہربانیاں تھیں۔

صفدر جنگ غریبوں اور ضرورت مند لوگوں کی مدد کرتا تھا کسی سائل کو وہ پچاس اشرفی سے کم نہیں دیتا تھا[۱]۔ اس نے اپنے خاندانی دشمن عماد الملک کی بھی مدد کی تھی۔ اس نے صرف ایک شادی کی لیکن شان و شوکت اور چمک دمک کا قائل تھا۔ اسی لئے شجاع الدولہ کی شادی میں اس نے چھیالیس لاکھ روپے خرچ کئے۔ یہ بات مشہور ہے کہ کسی شہزادے کی شادی میں بھی اتنا خرچ نہ ہوا۔ اس کے پاس بیس ہزار فوج ہمیشہ تیار رہتی تھی اور اپنی فوجوں پر نہایت فراخدلی سے خرچ کرتا تھا۔ مہاراج نول رائے، راجہ رام نرائن موزوں، راجہ لچھمی نرائن، راجہ ناگر لال اور جوگل کشور کو بھی اس نے اعلیٰ عہدے دیئے تھے۔ وہ کاہل اور سست نہیں تھا۔

نامور تذکرہ نگار اور شاعر علی قلی خاں والہ داغستانی سے صفدر جنگ کے گہرے تعلقات تھے۔ آزاد بلگرامی[۲] نے لکھا ہے کہ ۱۱۶۷ھ میں والہ داغستانی صفدر جنگ کے ساتھ دہلی سے اودھ گیا۔ اور صفدر جنگ نے ۱۱۶۷ھ ہی میں انتقال کیا۔ شجاع الدولہ اودھ کی صوبہ داری کا حقدار تھا لیکن کچھ رکاوٹیں اس راہ میں پیدا ہو گئی تھیں اس لیے والہ داغستانی، شجاع الدولہ کی صوبہ داری کے امور کی اصلاح کے لیے اودھ سے دہلی گیا اور شجاع الدولہ کے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کیا ایک قصیدہ والہ داغستانی نے صفدر جنگ کے اوصاف کا ذکر کیا ہے چند اشعار ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

---

[۱] خزانۂ عامرہ ورق ۴۴۲

[۲] کلیات والہ داغستانی خطی رامپور

ای دلیت پاک تراز دُر خوشاب
در جہان مثل و عدیلت نایاب

ای کرم ہای تو افزون زشمار
وی عطا ہائی تو بیرون زحساب

دگران راچہ غم از شورش ملک
ہمہ در فکر شراب اند و کباب

سعی کن سعی در اصلاح جہاں
کہ فتادہ اند خلائق بعذاب

شہ تراگفتہ برادر تو مرا
من تراخواندہ پدر از آداب

صفدر جنگ کے پاؤں میں ایک پھوڑا نکل آیا تھا جو تیزی کے ساتھ کینسر میں تبدیل ہوگیا۔ پاپر گھاٹ میں ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ مطابق ۵ اکتوبر ۱۷۵۴ء میں اس نے انتقال کیا۔ ولیم بیل نے لکھا ہے کہ اُسکو پہلے گلاب باڑی فیض آباد میں دفن کیا گیا لیکن تھوڑے دنوں کے بعد اُس کی لاش دہلی میں "شاہ مردان" کے روضہ کے نزدیک دفن کی گئی۔ اُس کے بیٹا شجاع الدولہ نے تین لاکھ روپے خرچ کر کے اُس کا روضہ بنوایا جو نہایت خوبصورت ہے۔ روضہ کے دروازہ پر ذیل کے اشعار کندہ ہیں جن سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

چوں آں صفدر عرصہ مردی ز دار فنا گشت رحلت گزیں
تنیں سال تاریخ او خسہ رقم کہ بادا مقیم بہشت بریں

۱۱ ۶۷

آج بھی صفدر جنگ کا مقبرہ دہلی میں ایک تماشا گاہ ہے۔

Oreintal Biographied dictionary P. 341

اردو کے چند یورپی شعرا — ایک تعارف

انت رام گوڑ مترجم، ڈاکٹر م۔ م حسن (دیودھرپور، نگاری گیا)

۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ رائٹر پروڈیوسر فلم ساز یادر عباس کے چچا اپنے بھتیجے کو لکھنؤ کے انگریز کمشنر سے ملانے گئے تھے، یادر عباس کی کچھ ہی دنوں قبل انڈین نیوی میں افسر کی حیثیت سے تقرری ہوئی تھی، غالباً انگریزی حکومت سے اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر یادر عباس کے چچا یادر کو لے کر کمشنر موصوف کے پاس گئے

یادر عباس کو یہ حیرانی تھی کہ ان کے چچا جو انگریزی سے نابلد ہیں انگریز کمشنر سے گفتگو کیسے کریں گے بہر کیف دونوں حضرات گنج کمشنر صاحب کی کوٹھی پر پہونچ گئے، چچا لکھنوی لباس میں تھے اور بھتیجا نے سکنڈ لفٹنٹ کی وردی پہن رکھی تھی،

جب کمشنر نے اپنے دوست کا نفیس اردو الفاظ میں استقبال کیا تو یادر عباس نے سمجھا کہ دیگر افسران کی طرح کمشنر نے بھی یہ جملے رٹ رکھے ہیں۔ چچا نے تعارف کرایا ۔۔۔ آپ کا فرمانبردار غلام اور میرا پیارا بھتیجا، یادر عباس کو، جو الہ آباد یونیورسٹی کے گریجویٹ اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھے یہ جملے گراں گزرے چنانچہ بڑے دلکش انداز میں انھوں نے جواب دیا "بیشک میں آپ کا فرمانبردار بھتیجہ ضرور ہوں لیکن غلام کسی کا نہیں"

یادر عباس نے یہ سوچ کر کہا تھا کہ کمشنر اتنی اردو نہیں جانتا ہوگا لیکن یادر عباس کے جواب میں کمشنر نے جو باتیں کہیں وہ عباس کے لیے بے حد متحیر کن تھیں، صاحبزادے، آپکے چچا نے جو کچھ کہا وہ لکھنوی تہذیب اور تمدن کے مطابق ہے انھوں نے آپ کیلئے غلام لفظ کا جو استعمال کیا ہے اسکا وہ مطلب نہیں ہے آپ کے چچا ایک شائستگی کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ میں نے بھی اپنے دونوں بیٹوں کو انکے سامنے غلام کی حیثیت سے پیش کیا، ہندوستانی زبان پر اس طرح کا عبور رکھنے کے سلسلے میں، انگریز کمشنر مستثنیات میں تھے، اگرچہ بہتیرے انگریز ہندی اور سنسکرت پر عبور رکھتے تھے پھر بھی عام طور پر ہندوستانی زبانوں سے مکمل واقفیت اور ان کا مکمل علم کم ہی انگریز افسروں کو تھا

قادر اسٹونس تنہا یورپی تھے جنھوں نے کسی مشرقی زبان میں تصنیف و تالیف کا انجام دیا۔

منشی رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ اردو کے درجہ اول کے شعرا خلاً میر، غالب، مومن، ذوق، آتش اور انیس، جیسے شعرا سے تو ان یورپی شاعروں کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا لیکن انھیں رند، صبا اور نسیم دہلوی کے ہم پلہ یقیناً قرار دیا جاسکتا ہے، اردو ادب میں ہیڈرلی آزاد، بملی، فنا، فراسو، شور، مطلب، فطرت، گارڈنر، فنا، جوزف، ولیم، ذرہ اور مفتوں کو نظرانداز نہیں جاسکتا، ان شعرا کی تخلیقات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا ادبی ۔ ۔ ۔ ی جگنو کی چمک نہیں تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں پوری پوری مہارت حاصل کرلی تھی۔

منشی رام بابو سکسینہ کو مختلف خاندان سے مواد کے حصول میں بڑی پریشانی لاحق ہوئی، مذکورہ بالا یورپی شعرا کے خاندان کے بچے کھچے افراد میں سے کچھ تو اس قدر مایوس اور دل برداشتہ ہوگئے تھے کہ انھوں نے کسی بھی قسم کی سودمند معلومات فراہم کرنے سے انکار کردیا کچھ تو یہ بھی ماننے کو تیار نہ ہوتے کہ ان کے اجداد کا کبھی کوئی تعلق یورپی افراد سے رہا ہے، خود کو خالص یورپی ثابت کرنے کی دھن میں بہتوں نے موجود تمام دستاویزات کو جان بوجھ کر برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

بہرحال یہ ایک بے حد دشوار کام تھا، لیکن منشی رام بابو سکسینہ نے اردو کے تقریباً ۹۰ یورپی شعراء کے قلمی نسخے، مطبوعہ تخلیقات، دیوان، بیاض، سوانح حیات اور شجرہ نسب جمع کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ان یورپی شعرا نے اس یقین اور اعتماد کے ساتھ اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ ان میں پیش کردہ کوئی خیال یا مضمون اردو شاعری میں اجنبی نہیں معلوم ہوتا، انھوں نے ان ہی تشبیہات، استعارات، علائم، اور صنائع و بدائع کا استعمال کیا جو اردو شاعری میں مروج تھے۔ ان یورپی شاعروں میں گارڈنر خاندان خاص طور سے قابل ذکر ہے جس میں کئی کہنہ مشق شاعر پیدا ہوئے۔

گارڈنر خاندان کے جد اعلیٰ کرنل ولیم لینیس گارڈنر تھے، ان کی پیدائش ۱۷۷۰ء میں ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اور پرورش پرداخت فرانس میں۔ ہندوستان واپس آکر ۱۷۹۸ء کے بعد انھوں نے جسونت راؤ ہولکر کے دربار میں ایک پولس افسر کی حیثیت سے نوکری کرلی، اور مہاراجہ کے لیے ایک انفینٹری تیار کی، کرنل گارڈنر نے کھمبات (گجرات) کے مسلمان نواب کی بیٹی سے شادی کی تھی، اس شادی کی کہانی بھی بے حد دلچسپ ہے۔

جسونت راؤ ہولکر نے کھمبات کے نواب سے دوستی کے معاہدے کے لئے گارڈنر کو بھی بھیجا تھا، اس سے آگے کا حال کرنل گارڈنر کے لفظوں میں ہی سن لیجئے "وہاں بات چیت بڑی چل رہی تھی، اور دربار ہوتے رہتے تھے، ایسے ہی ایک دربار میں جہاں میں بھی موجود تھا، میرے نزدیک کا پردہ بڑی آہستگی سے سرکا جس سے جھانکتی ہوئی دنیا کی دو خوبصورت ترین سرمگیں آنکھیں دکھائی دیں، اب اس معاہدے کے بارے میں سوچنا ناممکن ہے۔ ان سیاہ اور دل کو گھائل کر

والی نظروں، ان خوبصورت خالی آنکھوں نے مجھے مدہوش کر دیا۔ یہ سوچ کر میں نے خود کو بے حد خوش نصیب پایا کہ وہ گہری کالی پیاری آنکھیں مجھ ہی کو گھور رہی ہیں، دربار میں بیٹھے لوگوں کی موجودگی میں پردہ ہٹا کر اس حسینہ نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا! دربار سے باہر آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ سیاہ آنکھوں والی حسینہ نواب زادی تھی اگلے دربار میں دوبارہ جب میں ان آنکھوں کو دیکھنے کو بے تاب تھا کہ پردہ پھر آہستگی سے ہٹا اور میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا، میں نے شہزادی کا ہاتھ مانگا، پہلے تو اس کے رشتہ دار بے حد غصہ ہوئے اور میری تجویز کو ٹھکرا دیا لیکن بعد میں شاید سوچا کہ سفیر کو ناراض کرنا اچھا نہیں ہے اس لیے شہزادی کی شادی مجھ سے کرنے کا وعدہ کر لیا گیا شادی کے دن دلہن کے چہرے سے جب میں نے گھونگھٹ اٹھایا اور مسلمانوں کی رسم کے مطابق ہمارے درمیان رکھے ہوئے آئینے میں جب میں نے ان دو کالی آنکھوں کو دیکھا تو جیسے بجلی کوند گئی، جن آنکھوں نے مجھے مدہوش کیا یہ وہی تھیں، میں نے خوشی سے مسکرا دیا، دلہن بھی متبسم ہو گئی۔"

کرنل سے شادی کے وقت شہزادی کی عمر محض تیرہ سال تھی، کہا جاتا ہے کہ بعد میں اسے اکبر شاہ نے جو شاہ عالم کے بعد تخت نشیں ہوا تھا، اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ گارڈنر جوڑے نے چالیس سال تک متاہلانہ زندگی بسر کی اور اگست ۱۸۳۵ء میں اپنے شوہر کرنل گارڈنر کی موت کے چھ مہینے کے بعد عالم فانی سے دار بقا کو چلی گئی گارڈنر خاندان نے پوری طرح سے ہندوستان سے اپنا ناطہ جوڑ لیا تھا، اس خاندان کے لوگوں نے مغل حکمرانوں کے درباری خاندانوں کے اپنے ازدواجی رشتے منسلک کئے اور خوب خوب دھن دولت کمائی، نوابوں اور رئیسوں کی طرح زندگی بسر کی اور آرٹ و ادب کے مربی کی حیثیت سے اپنے لئے باعزت جگہ بنالی

گارڈنر خاندان کے جن لوگوں کی تخلیقات منظر عام پر آچکی ہیں ان کے نام ہیں، ڈینیل شعراطر تخلص گارڈنر شکر ریورنڈ بارتھلومیو گارڈنر صبر۔ ریورنڈ رابرٹ گارڈنر اختیار پیٹرک۔ رس۔ گارڈنر شوق، ولیم گارڈنر ادرکیس، ریلن کرسٹینا گارڈنر عرف رقیہ بیگم اور ان سب سے بڑھ کر سلیمان شکوہ گارڈنر فنا، جنھوں نے اپنے خاندان میں اردو شاعری کی روایت کی ابتدا کی۔

(پیدائش ۱۸۳۱ وفات ۱۹۰۲) اترپردیش میں ۱۸۳۱ء میں کاس گنج کے نزدیک چھاؤنی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے وہ شہزادی قمر چہرہ عرف ملکہ ہمانی بیگم کے بطن سے پیدا جیمس ویلنٹائن گارڈنر کے سب سے بڑے بیٹے تھے شہزادی قمر چہرہ کو شہنشاہ شاہ عالم کے بیٹے شہزادہ سلیمان شکوہ نے گود لیا تھا، اس لیے سلیمان شکوہ گارڈنر کا نام ان کے نانا کے نام پر ہی رکھا گیا تھا، سلیمان شکوہ گارڈنر کو اپنے یورپی باپ اور ہندوستانی ماں کا دلکش رنگ و روپ قدرت نے عطا کر دیا تھا، وہ بے حد شوقین مزاج اور شاہ خرچ تھے، ان کا طرز رہائش خالص ہندوستانی ڈھنگ کا تھا، اور ہمیشہ ہندوستانی لباس زیب تن کئے رہتے تھے، عورت اور موسیقی کے بے حد دلدادہ تھے، مشہور ہے کہ اپنے پسند کی رقاصاؤں کو زمینداریاں تک دے ڈالی تھیں،

لیکن سلیمان شکوہ گارڈنر کو شہرت ان کی اردو
شاعری سے دل چسپی کی وجہ سے حاصل ہوئی، انھیں عربی
فارسی، انگریزی، اردو اور ہندی زبانوں پر مہارت
حاصل تھی، وہ پشتو بھی بخوبی بول لیتے تھے، خوش نویسی
کا فن بھی جانتے تھے، منشی رام بابو سکسینہ کے پاس سلیمان
شکوہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی میرامن کی چہار درویش اور سحرالبیان
کے قلمی نسخے موجود تھے، جسے فنا نے اپنی بہن رقیہ بیگم کے لئے
لکھے تھے۔

سلیمان شکوہ گارڈنر فنا کا دیوان جسے خود الفون
نے ترتیب دیا تھا نہیں مل سکا لیکن ان کی بیاض ملی ہے
جن میں اردو کے اشعار، ہندی کے گیت اور بھجن ملتے
ہیں، ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر تصوف کا گہرا
اثر تھا، بھجنوں اور گیتوں کے چند نمونہ ملاحظہ ہوں۔

گیان دھیان میں رہو ہمیشہ ہر سے دھیان لگاؤ جی
آپ بھی آرام تجو تک من کو تم سمجھاؤ جی
کھانے کو تو غم ہے کانی پینے کو ہے خون جگر
یہی مزہ ہے عشق میں پیارے جیو یا مرجاؤ جی
آپ مرے جگ پر سو سادھو من کو تم سمجھا لو اب
کوئی کسی کا سنگ نہ ساتھی آپ اکیلے جاؤ جی
وہاں سے جو کچھ لائے تھے سب تم نے یہاں برباد کیا
اب جاتے ہو تو سنگ بھلا کچھ یہاں سے بھی لیجاؤ جی
مرنے کا جو کھٹکا ہے کچھ اس کو دل سے دور کرو
مرنے سے پہلے ہی یہاں تم "فنا شاہ" بن جاؤ جی
سکھ ہی سے دکھ ہوتا ہے کیوں سکھ چاہے کوئی
ایسے سکھ کو تیاگیے جو سکھ سے دکھ ہوئے

من گیان، من مدر کھا من بہکے بہکائے
من بھٹکاوے باتیں اور من ہی بات کاٹے
من بچھڑے تو نہ ملے ٹک بچھڑے مل جائے
من کو مت بچھڑائے پھر ملیں گے آئے

اکڑ اینٹھ سب دھری رہیگی سیدھے ہو کر جاؤ گے
اپنی کرنی پار اترنی جیسا کرو گے پاؤ گے

تصوف سے گہرے طور پر متاثر ہونے کے باوجود فنا کے
یہاں واردات قلب کی کہانی کم نہیں۔ ملاحظہ ہوں

ادھر تو دیکھو ہمیں نہ چھیڑو ذرا تو ٹھہرو یہ سب سنا کر
ہمارے پہلو سے اٹھ گیا وہ یہ تازہ فقرے سنا سنا کر
جو مجھ کو دیکھا لگا یہ کہنے کہ شاہ جی تم کدھر سے آئے
سوال بوسہ کیا جو میں نے تو ہنس کے بولا خدا خدا کر

فنا کی تمام تر تخلیقات ہندی اردو گنگا جمنی زبان میں ہے
ان کا شمار اپنے زمانے کے ان نفاست پسند لوگوں میں
ہوتا تھا جن کو شعر و سخن کے ساتھ ساتھ عورتوں سے
بھی محبت تھی۔ ایسے ہی ایک ماحول میں انھوں نے لکھا
تھا۔

جب سے ہند پر تیرے نقاب نہیں
تب سے اک لمحہ دل کو تاب نہیں
سارے عالم میں میں تو دیکھ پھرا
اس کا لیکن کوئی جواب نہیں
مجھ کو اس سے خودی کا ہے پردہ
بیخودی ہے تو کچھ حجاب نہیں

پوچھنا کیا ہے اے فنا تیرے
کون سے شعر انتخاب نہیں!

میرے کون سامنے آگیا مجھے چہرہ کس نے دکھا دیا
مرے دل کو کس نے بجھا لیا مرا ہوش کس نے اڑا دیا
کبھی ہجر کا ہمیں غم دیا کبھی وصل سے کیا خوش ہمیں
کبھی چٹکی لے کے رلا دیا کبھی گدگدا کے ہنسا دیا

مجھے نیستی ہی پسند تھی نہ تھی فکر کچھ بھی جہاں کی
تو نے زندگی دے کے اے خدا مجھے آفتوں میں پھنسا دیا

سمجھ کے کیا ہے بھیجا خدا نے دنیا میں
میں اس خراب جگہ میں بہت خراب ہوا

وہ میرے دل ہی میں آخر کو مل گیا مجھ کو
میں اک جہاں میں جس کے لیے خراب ہوا

وہ امیر خسرو سے بھی متاثر نظر آئے ہیں، خسرو ہی کی طرح انھوں نے بھی پہیلیاں لکھی ہیں۔

خواہش اسکی سب کو لوگو، محفل میں وہ آتا ہے
پیٹ پھلائے جاتا ہے اور سب کا اگلا کھاتا ہے

(اگالدان)

گورا گورا دیکھو لوگو چون نہ کرو اور کھاؤ
آگ لگے پانی میں اس میں پاکی بوجھ بتاؤ

(چونا)

ظاہری رنگ اس کالا ہے
بدن میں اس کے خون ڈالا ہے
کھالے جو اس کو کر نہ سکے وہ چون
اک لیلے کے ہیں بہت مجنوں

(ریٹھا)

اک نار منھ کالا رکھے ہیں بولے سب کہتی ہے
پاؤں نہیں ہے پر ہاتھوں میں سبکے چلتی رہتی ہے

(قلم)

۱۸۵۷ء کے غدر میں اپنا جان بچانے کے لیے سلیمان گارڈنر بھاگ کر علی گڈھ چلے آئے بعد میں وہ پھر کا چھاؤنی واپس چلے گئے اور بہت دنوں تک زندہ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران ان کی اد مردہ ہوگئی تھی، ۱۹۲۷ء میں اکہتر سال کی عمر میں ان کی واقع ہوئی

ڈینیل سقراطس

گارڈنر خاندان کے دوسرے مشہور شاعر کا نا ڈینیل سقراطس گارڈنر شکر۔ (۱۹۰۷ - ۱۸۵۲) یہ شکوہ کے بیٹے تھے اُن کی ماں کا نام کھیٹرین جیار عرف آغائی بیگم تھا۔ اپنے باپ ہی کی طرح شعر متین شاہ خرچ تھے اپنے آبائی گاؤں چھاؤنی میں ر تھے۔

ابتدا میں اپنے باپ سے اصلاح لیتے تھے لیکہ میں مرزا عباس ہوش لکھنوی سے رجوع کیا، شکر اور فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ انھوں نے ای دیوان بھی مرتب کیا تھا لیکن اس کا کیا ہوا پتہ نہ سکا۔ ۵۶-۱۸۸۵ء میں گلدستہ ناز نامی رسالے

کرتے تھے۔

شکر ظریف تھے اور ظریفانہ شاعری بھی کیا
رتے تھے ان کی ایک ظریفانہ تخلیق ایک لالہ کی بھینس کا
یہ اور تاریخ گھوڑیا راجہ دلسکھ رائے پٹواری کا پیتہ
بلا ملاحظہ ہو ـــ

مرثیہ بھینس

رہے دل کی کیونکر نہ اب بے قراری
وہ مرجائے یوں بھینس لالہ تمہاری
وہ غم اپنی اتنی تھی لائی پچھاری
ستم کر گئی جو عدم کو سدھاری

ہوں کیا جو مجھ کو ہوا رنج و غم ہے
یہ سچ ہے کہ تم سے زیادہ الم ہے
تعجب ہے کس واسطے مر گئی وہ
یہی سوچتا ہوں کہ کیا کر گئی وہ

خفا ہو گئی دل میں یا ڈر گئی وہ
جو اس طرح سر پھوڑ کر مر گئی وہ
میرے تن پہ دہشت سے آیا پسینہ
سنا جبکہ ٹکڑے سے توڑا ہے زینہ

تاریخ گھوڑیا راجہ دلسکھ رائے پٹواری

آکے دجال نے اک روز یہ لالہ سے کہا
کیوں جی خچر کو مرے گھاس نہ کیوں تم نے دی
پیر کے پڑنے کو ہے خچر مرا مجھ کو دیدو
اپنی گھوڑیا وہ منگالو اجی بڑھیا جا بھئی
آزماؤں گا میں ایمان ہر اک کا جب کر
تیرھویں ختم ہوئی چودھویں صدی یہ بھئی
سن کے تقریر یہ لالہ نے کہا مالک سے
راجہ دجال سے اور مجھ سے بڑی بحث چلی
کہا مالک نے کہ سچ ہے نہ مرا مانو تم
کوئی ٹٹوانی خریدو اجی خچر نہ سہی
کہا جب تک کہ سواری مرے گھر سے اڑے
تم سواری مجھے دو کوئی سستی سی نئی
میری تحصیل سے اطراف کی طلبی آئی
لاد کر کس پہ میں لیجاؤں یہ خسرہ وہی
میں سواری تو منگالوں پہ تردد یہ ہے
کھیت بتلا دو کوئی جس میں لوا ڈالوں جئی
واں یہ تقریر تھی یاں کرگری گھوڑی کو ہوئی
دبلی تھی پتلی تھی اس صدمہ سے وہ اینٹھ گئی
روح جب نکلی تو مالک نے کہی یہ تاریخ
یارو پٹواری کی گھوڑیا بھی وہ دوزخ میں گئی

گارڈنر خاندان میں ایک شاعرہ بھی ہوئی ہیں، جنکا انگریزی
نام ایلین کرسٹینا گارڈنر اور ہندوستانی نام رقیہ بیگم تھا۔
یہ مسلمان شکوہ گارڈنر کی بہن تھیں انھوں نے اشعار کے
علاوہ پہیلیاں بھی لکھی ہیں جو اس زمانہ میں کافی پسند کیجاتی
تھیں چند پہیلیاں ملاحظہ ہوں ــ

ایک نار مرے من بھاوے نا وہ پہنے نا وہ کھاوے
بوڑھوں کو وہ راہ بتاوے جوانوں کے وہ ہاتھ نہ آوے
(لاٹھی)

ایک نار بھنورا جس کا مالی، بنا کان وہ پہنے بالی۔ بناناک
وہ سونگھے پھول، جتنا عرض ہے اتنا طول۔ (ڈھال)

آپ اندھی اور دکھاوے سب کو
ایسی پہیلی بوجھے کب کو (آئینہ)

زردوشش کو دوش لگا دے
پاپی پاکی بوجھ بتا دے
(پپیہا)

یہ زمانہ جس کی گفتگو یہاں ہو رہی ہے مغلیہ حکومت کی شام کا ہے، لال قلعہ کا وہ مشاعرہ جسے دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ کہا جاتا ہے اس میں ذوق، مومن، غالب داغ وغیرہ سبھی شریک تھے، شہنشاہ ہند بہادر شاہ ظفر خود اس مشاعرہ میں شریک نہیں ہو سکے تھے اس مشاعرہ میں شمع جب ایک نوجوان شاعر کے سامنے رکھی گئی تو تو لوگ دیکھتے رہ گئے، اس لئے نہیں کہ وہ اعلی پایہ کا شاعر تھا بلکہ اس لئے کہ اگر لباس کی وجہ سے نہیں تو اپنی شکل وصورت اور رنگ کی وجہ سے اجنبی معلوم ہو رہا تھا، جب اس کے نام کا اعلان ہوا تو سامعین اس کی طرف سے حیرت سے دیکھنے لگے کہ ان معروف شعرا کی مجلس میں یہ کیا سنائے گا؟ لیکن جب اس نے غزل پڑھی تو واہ واہ اور مکرر مکرر، کی آوازیں سنائی دینے لگیں، غالب نے بھی اس نوجوان شاعر کی ہمت افزائی کی انھیں یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ یہ نوجوان شاعر، ان کے شاگرد نواب زین العابدین خاں عارف کا شاگرد الکزنڈر ہیڈرلی آزاد ہے۔

ہند یورپی شعرا میں الکزنڈر ہیڈرلی آزاد صف اول کے تھے، اگر ان کی عمر نے وفا کی ہوتی تو ممکن ہے ان کا شمار اردو کے بڑے شعرا میں ہوتا۔ ١٨٦١ء میں محض ٣٢ سال کی عمر میں ان کی وفات ہو گئی۔

آزاد کا دیوان ان کی موت کے بعد شائع ہوا تھا، اس میں قصیدے، سہرے، عیسی مسیح کی شان میں کہی گئی، نظمیں مرثیے، غالب اور ناسخ کی غزلوں کی پیروڈیاں۔ شامل الور اور دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے حکمرانوں کی شان میں کہے گئے قصیدے اقتصادی نقطہ نظر سے ان کے برے دنوں کی نشاندہی کرتے ہیں، مہاراجہ جیاجی راؤ سندھیا کی شان میں کہے گئے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اپنا عرض حال بھی لازم ہوا تیرے حضور
میری آنکھوں میں خزاں ہے روزگار فصل گل

ایک ادھر بھی ہو نگاہ لطف اے بندہ نواز
داغہائے غم سے ہے مجھ پر بہار فصل گل

یہ قصیدہ سن کے مجھ کو یاد کر اتنا شباب
دہر میں جتنی کہے منہ سے بار فصل گل

اور ایک وقت وہ بھی آیا جب شعر وسخن کی شانہ آرائی سے انھیں روک دیا گیا، کیوں کہ انگریز حکمراں نہیں چاہتے تھے کہ ان کی نسل کا کوئی فرد غلاموں کی زبان میں طبع آزمائی کرے۔ ان کا دیوان ان کے بڑے بھائی ٹامس ہیڈرلی نے آزاد کی موت کے بعد شائع کیا۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار جس میں آزاد کے دل کی کسک ہے ؎

دیوان ایروں کے ہوا کرتے ہیں پر یہ
آزاد کا تکیہ ہے ہما بان سخن میں

نام لیتا ہوں ترا کب میں کسی کے آگے
منہ سے بیساختہ باتوں میں نکل جاتا ہے

خاک ہو کر بھی ہوا کے رہے گھوڑے پہ سوار
سچ ہے ملنے سے کہیں اس کا بل جاتا ہے

میری شامت تھی جو زلفوں میں کسی کے پھنستا
آ پڑی ہیں یہ بلائیں مرے سر آپ سے آپ

سوکھنا تم سے میرے حق میں ہوا ہے مرہم
ہو گئے خشک مرے زخم جگر آپ سے آپ

وہ نہ آوے تو موت آ جاوے
ہم کو دونوں کا انتظار ہے آج

کل کی باتیں یاد نہیں کہ نہیں
ہم سے صاحب کو تنگ دعا ہے آج

رنج و راحت کے ساتھ ہے آزاد
تھا اگر لشہ کل تو خمار ہے آج

جارج پیش شور۔ (۱۸۲۳ — ۱۸۹۴) کا اس زمانہ کی اردو شاعری میں بڑا شور تھا۔ یورپی شاعروں میں شور کے مقابلے کے شاعر نہیں ملتے۔ یہ فرانسیسی ماں باپ کی اولاد تھے اور اٹھارہ بھائی بہنوں میں تیسرے تھے۔ ان کی پیدائش علیگڑھ کے قصبہ کول میں جہاں ان کے والد کی جاگیر تھی۔ ایک دسمبر ۱۸۲۳ء کو ہوئی تھی۔ انھوں نے علیگڑھ — آگرہ، گوالیار اور میرٹھ میں سرکاری ملازمت کی تھی۔ شور پر ہندی اثر گہرا تھا۔ ہمیشہ ہندوستانی طرز میں رہتے تھے پالکی یا گھوڑے کے علاوہ کسی دوسری سواری کا استعمال کبھی نہیں کیا، اپنے زمانہ کے رئیسوں کی طرح وہ بھی ناچ رنگ کی محفلوں کے دلدادہ تھے۔

شور نے دو شادیاں کی تھیں، لیکن شادی گرجے میں ہوئی تھی، شور کی تخلیقات میں، سفرنامے، سہرے اور نظموں کے علاوہ دیگر نثری تصنیفات بھی ملتی ہیں۔ اپنی شادی کا سہرا انھوں نے خود لکھا تھا ملاحظہ ہو۔

شور صاحب کے بندھا دھوم سے سر پہ سہرا
ہو مبارک یہ انھیں آج منور سہرا

باندھتا یوں تو ہر اک نوشاہ ہے سر پر سہرا
پر عجب شان کا ہے آپ کے رخ پر سہرا

فوج انجم تری گھر آئی براتی بن کر
ہو فلک تخت رواں ماہ منور سہرا

ذرہ مجبور ہے یوں دور ہے محفل سے تیرے
ورنہ وہ شوق سے خود باندھتا آکر سہرا

بسلسلہ مضمون صفحہ (۲۴)

اداروں میں موجود ہیں۔

تاریخ دکن کی یہ نشاندہی مکمل یا حروف آخر ہونے کی حیثیت کی دعویدار نہیں ہے خصوصاً اب جب کہ دکنی تاریخ پر بہت کچھ کام ہو چکا ہے اور نصف مضمون پر کتابیات کا سلسلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے تاہم جس قدر جدید مضامین تحریر میں آئے ہیں ان سب کا ماخذ وہی ہیں جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ ان ماخذ میں سے ہر ایک ماخذ اور ہر ایک صاحب ماخذ تحقیق و تنقید کے شیدائیوں سے میزبان حال یہی کہہ رہا ہے ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اسلام عشرت بی۔ اے۔ آنرز

آتش۔ شاعرِ تصوف

خواجہ حیدر علی آتش کو تمام ناقدینِ ادب نے لکھنؤ اسکول کا ایک نمائندہ شاعر تسلیم کیا ہے۔ لکھنؤ اسکول کی جو خصوصیات ہیں اور عام شعرا کی جو صفات وکمالات ہیں۔ ہم لوگ ان سے بخوبی واقف ہیں۔ اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آتش بھی لکھنؤ کے عام شعراء کی طرح دبستان لکھنؤ کی شاعری کے عام ماحول سے دامن کشاں نہ تھے گویا لکھنؤ اسکول کے عہد اور ماحول کی عکاسی ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے یعنی رند، صبا اور اسی قسم کے دوسرے شعراء کی طرح عامیانہ، سوقیانہ، ابتذال اور اخلاق سے گرے ہوئے خیالات کو بھی آتش نے اپنی شاعری کے حسین پیرائے میں پرو دیا ہے۔ لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود آتش اپنے عہد کے ایک ممتاز اور منفرد کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ چنانچہ آتش نے اپنی شاعری کے متعلق جو دعویٰ کیا ہے، میں ان کے اس قول اور اس دعویٰ سے سو فی صدی متفق ہوں۔ ان کا دعویٰ ہے

؎ فکرِ سنجیدہ نے دکھلائے ہیں کیا کیا آب ورنگ
اس ترازو میں تلے ہیں لعل و گہر سینکڑوں

آتش کی شاعری کے یوں تو مختلف پہلو ہیں۔ لیکن موضوع کی مناسبت سے لحاظ سے مجھے فی الوقت تصوف کے آئینہ میں آتش کی شاعری کا جائزہ لینا مقصود ہے

تصوف کی ایک۔ خالص اسلامی اصطلاح کا نام ہے البتہ ہم یہ کہنے سے قاصر ہیں کہ یہ کب اور کیسے عالمِ وجود میں آیا؟ میں اس علم سے قطعی طور پر بے بہرہ اور ناواقف ہوں، بہر کیف، میں اتنا پورے وثوق کے ساتھ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ زبان اور ادب میں تصوف کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے تصوف کے ماہرین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے صفِ اول کے لوگوں میں ابو سعید ابوالخیر، عطار صاحب اور مولانا روم وغیرہ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اور دوسرے درجہ کی فہرست میں شیخ سعدی، حافظ، امیر خسرو، اور اقبال وغیرہ

حضرات شامل نظر آتے ہیں۔ اور یہاں آتش کو بھی ان لوگوں کے بعد میں اسی زمرے میں شامل کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ آتش کی شاعری کا جب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے کلام میں تصوف کی گہری چاشنی عیاں اور موجود ہے۔ حالاں کہ آتش سے پہلے بھی اردو کے بعض مستند شعرا نے تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ لیکن ان لوگوں کے یہاں تصوف کا ذکر ضمنی طور پر آ گیا ہے۔ یعنی انھوں نے تصوف کو شعوری طور پر برتنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

دبستان لکھنؤ کے صحاف دو ہی شعرا نے تصوف اور درویش کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے، ایک تو مصحفی تھے اور دوسرے آتش ــــ قیاس یہی کہتا ہے کہ آتش کا رجحان تصوف کی جانب دو اسباب کی بنا پر ہوا ہوگا پہلی وجہ تو یہ ہے کہ وہ مصحفی کے شاگرد رشید تھے۔ اور انھوں نے اپنے استاد سے متاثر ہوکر، ان کی تقلید کی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کا خاندان درویشانہ تھا ــــ گویا درویشی ان کی میراث تھی۔ ان کی قسمت تھی ان کا مقدر تھی۔ ان کے خاندان میں پیری و مریدی ایک زمانہ سے تھا۔ ان کی پوری زندگی قلندرانہ طور پر بسر ہوئی، آتش کے دور کا یہ رواج عام تھا کہ اس عہد کے تمام شعرا بھی درباروں میں جاکر بادشاہان وقت کے آگے سر تسلیم خم کرتے تھے اور ان کی مدح سرائی میں ہمیشہ مصروف رہا کرتے تھے لیکن برخلاف اس کے آتش "آئینہ شاعری" میں درویش کی حیثیت سے ابھر کر بالکل واضح اور صاف نظر آتے ہیں، ان کو خوشامد پسندی سے بیحد نفرت تھی اور ان کا پختہ ایمان اس بات پر تھا کہ فقیری بہر صورت بادشاہت کی نسبت قابل فخر اور رشک ہے۔ خیال ہے گویا اس معاملہ میں آتش اپنے ہم عصروں سے جہاد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اس طرح ہم آتش کو ایک "مجتہد شاعر" بھی کہہ سکتے ہیں۔ آتش کے اس خیال کی حمایت میں چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

ہمت مردانہ نے آتش کیا ہے بے نیاز
جانتا ہوں میں گدا سلطان ہفت اقلیم کو

نہیں رکھتے ہیں امیری کی ہوس مرد فقیر
شیر کی کھال ہی ہے قاقم و سنجاب میرا

فارسی کی اعلیٰ صوفیانہ شاعری کے معیار پر جب ہم آتش کی صوفیانہ شاعری کا موازنہ کرتے ہیں تو ہمیں آتش کی شاعری اثر، تاثیر، شعریت اور مغلوبیت کے لحاظ سے محروم نظر آتی ہے، یعنی کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تصوف کا پہلو بڑا کمزور اور ناتواں معلوم ہوتا ہے کیوں کہ تصوف کی چاشنی برقرار رکھنے کیلئے سوز و گداز محویت اور سپردگی کی اشد ضرورت ہے۔ جو آتش کے یہاں مفقود ہے۔ لیکن جب ہم لکھنوی شاعری کو مدنظر رکھتے ہیں۔ اور اسی کے پس منظر میں آتش کی صوفیانہ

شاعری کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں، تو یہ پاتے ہیں کہ وہ کافی بلند و بالا مرتبے پر فائز ہیں۔

اردو شاعری پر جب ہم اپنی نگاہ مرکوز کرتے ہیں تو ہم کو اُردو کے تمام اساتذہ اور شعرائے کرام کے یہاں ایک آواز سنائی دیتی ہے اور یہ آواز ہے "آسمان" اور "قسمت" کو کوسنے کی، برا بھلا کہنے کی اور گلہ و شکوہ کرنے کی۔ اگر آتش کے ذیل کے اشعار پڑھیئے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کون کافر ہوگا جو ان اشعار کو پڑھ کر آتش کے انداز سرکشی کی داد نہیں دیگا۔ ملاحظہ ہو۔

حذر کر میرے گریہ سے نہ رُلوا آسماں مجھکو
یہ وہ سیلاب ہے جو خانہ ویرانی کا بانی ہے

اے فلک مرہون احساں تو نہ میں تیرا ہوا
شکر ہے مجھ کو خدا نے بے سروساماں کیا

آج تک آہ کے کوڑوں سے بدن نیلا ہے
آسماں کو مجھے رسوائے جہاں کرنے دو

اس دنیائے بے ثبات کا ذکر جتنے حسین انداز میں آتش کرتے ہیں۔ یہ انھیں کا خاصہ ہے۔ آتش اس عالم فانی کی مسرت، شادمانی اور خوشی کو مٹ جانے والی شئے تصور کرتے ہیں۔ یعنی ان کا یہ کہنا ہے کہ اس دنیا کی خوشی کی حیثیت عارضی ہے دائمی نہیں اور بلاشبہ ان کا یہ قول سراسر حقیقت پر مشتمل ہے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

دو روزہ ہے یہ لطفِ عیش و نشاطِ دنیا
بوئے شب عروسی مہمان ہے پیرہن میں

بے اعتبار نقش و نگار زمانہ ہے
اک رنگ پر ہوا نہیں رہتی ہے باغ کی

دنیا میں بہت ایسے انسان ہیں جو انسان کو مذہب کے نام پر آپس میں نااتفاقی پیدا کر کے جنگ و جدل برپا کروانا چاہتے ہیں۔ یعنی مذہبی رہنما اور پیشوا مذہبی منافرت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آتش ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ اس لئے وہ ایسے لوگوں سے اپنے آپ کو علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے اپنے ذیل کے اشعار میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ یوں پیش کیا ہے۔

کفر و اسلام سے آزاد ہوں بے قید ہوں میں
مجھ سے کافر ہی نہ جھگڑے نہ تو دیندار اُلجھے

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا
مذہب نہیں ہے کوئی ملت نہیں ہے کوئی

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں اے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو، پر انساں ہووے

بھلا کوئی ایسا بھی انسان ہوگا جس کو موت کا کوئی خو

نہیں ہے شاید نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکثر و بیشتر موت
کی یاد آتی ہے تو گھبراتے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا حوصلہ اور
بڑھ جاتا ہے، اور وہ اس طرح کے اشعار کہہ دیتے ہیں
ملاحظہ ہو۔

شعر ڈھلتے ہیں مری فکر سے آج اے آتش
مر کے کل گور کے سانچے میں ہیں ڈھل جاؤں گا

لاش پہ لاش نکلتی ہے ترے کوچے سے
کیا تماشہ ہے کہ پھر بھیڑ نہیں چھٹتی ہے

انسان کی عظمت، شان، رعب اور دبدبہ سے
متعلق جو اشعار آتش کے یہاں دکھائی دیتے ہیں میرے
خیال میں اس قبیل کے تمام اشعار تصوف کے رہین منت
ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

سمجھے آتش نہ کوئی آدم خاکی کو حقیر
نہیں اسرار سے یہ خاک کا پتلا خالی

گنج پنہاں ہیں تصرف میں بنی آدم کے
کان سے لعل یہ دریا سے گہر لیتا ہے

بار عشق اس نے اٹھایا اور میلی کی نہ آنکھ
حوصلہ تو دیکھو مشت خاک بے بنیاد کا

اب اواخر میں آتش کے دیوان سے چند ایسے اشعار
نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے تصوف کی بھینی بھینی خوشبو
آتی رہتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

خیال تن پرستی چھوڑ کر حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں نام رہ جاتا ہے انساں کا

دور حاضرہ کے نمائندہ شاعر حضرت فراق گورکھپوری
نے آتش کو اخلاقی شاعر کا بادشاہ قرار دیا ہے، اور
ایک موقع پر فراق صاحب آتش پر اظہار خیال کرتے
ہوئے یوں رقم طراز ہیں:۔
"آتش کی اکڑ، بانکپن اور فقر و مستی ایران کے کسی
شاعر میں بھی نہیں ملتی۔"

بلاشبہ مذکورہ بالا اشعار اور حوالوں کی روشنی میں
ہم یہ کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں کہ آتش نے اپنی شاعری
میں تصوف اور اخلاق کے وہ گل بوٹے کھلائے ہیں اور وہ
کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں جن کے باعث آتش ایک
صوفی شاعر کہلانے کے مستحق اور حقدار ہیں۔

(از قلم محمد عرفان بی۔ اے (آنرز) ایم۔ اے (انگلش)
لکچرر شعبہ انگریزی اسلامیہ کالج بریلی

دکن کی معلومات کے تاریخی مآخذ

دکن: دکن کا لفظ ہندوستان میں ریاستوں کے خاتمہ تک ایک عرف عام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے مراد وہ علاقہ تھا جو محروسہ سرکار نظام الدکن' تھا اور وہ بھی جو ہندوستان کی قدیم تاریخ میں اور بھارت کے قدیم نقشوں میں آندھرا کا علاقہ رکھا گیا ہے اور جو آزاد ہندوستان میں ریاستوں کی دوبارہ تشکیل کے بعد پھر سے آندھرا کہلانے لگا ہے

دکن کے سیاح: سیاحوں میں سب سے پہلے میگا ستھنیز نے اس کا ذکر کیا ہے جسکی معلومات کی بنیاد پر پہلی صدی عیسوی کے مشہور مغربی مورخ پلاٹمی نے "ہیون سانگ" خیالیہ، خاندان کے عظیم حکمراں پالکیشن کے زمانہ میں دکن پہونچا اس نے آندھرا کی سلطنت کے انتظام اور اجنتا کی بے مثال فنکاری کے تذکروں کو اپنی سرگزشت میں جگہ دی۔ ۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے دیوگری کو دولت آباد کے تبدیل کیا اس اہم واقعہ کے کچھ عرصہ کے بعد معروف عرب سیاح ابن بطوطہ دکن آیا۔ جب اس نے اپنا تفصیلی سیاحت نامہ مرتب کیا ـــ اور دولت آباد کے تذکرہ پر پہونچا تو اس نے وہاں دکن کے واقعات وحالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ فرانسیسی سیاح تھیونو نے بھی انگریزی اور دیگر یوربین تجارتی کوٹھیوں کی تجارت کے سلسلہ میں دکن کا حال قلمبند کیا ہے

ہندوستانی حکمراں اور دکن

شہنشاہ اشوک کے ایک فرمان میں اندھیرے کے حکمرانوں کا بڑی تعریف کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے۔ ان حکمرانوں کے پاس بدھ مت کے مبلغین بھیجے گئے تھے اور انھوں نے ان روحانی سفیروں کے ساتھ نہایت روادارانہ سلوک کیا تھا۔ والئ ایران خسرو ثانی نے بھی چالکیہ خاندان کے ممتاز حکمراں پالکیشن کے دربار میں کچھ سفیر بھیجے تھے ان کی تصاویر بھی اجنتا کے آرٹ کے خزانہ میں محفوظ

بتائی جاتی تھی۔ ۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے تاریخ میں پہلی
بار "ارض دکن" کو تخت دہلی کے ماتحت بنایا اور دیوگری
کو اپنا دارالسلطنت پاکر اس کا نام دولت آباد رکھا۔
حسن گنگو (جس کا لقب ابو المظفر علاؤ الدین بہمن شاہ)
اس نے اپنے دور عروج میں دکن کا تعلق دہلی سے توڑ لیا۔
جو ساڑھے تین سو سال تک منقطع رہا۔ اتنے لمبے عرصہ
کے بعد شہنشاہ اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر فتح پاکر
دکن کو دوبارہ دہلی کے پایۂ تخت کا ماتحت بنا دیا۔

یوروپین کمپنیاں اور دکن

دکن کے ساتھ یوروپین تعلقات کافی پیشتر قائم
ہوگئے تھے فرانسیسی سیاح تھیو تونے گول کنڈہ اور مشرقی
ساحل کی انگریزی اور یورپی تجارتی کوٹھیوں کے مابین
کثیر تجارت کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱۵۸۳ء میں ریلف فچ اپنے
کچھ ساتھیوں کے سمیت گولکنڈہ پہونچا اور اس نے تجارتی
فرمان حاصل کر لیا۔ جو انگریز تاجر چینا پٹنم یعنی موجودہ
مدراس میں تجارت میں مشغول تھے وہ بھی اصل میں گولکنڈہ
کی سلطنت کی حفاظت کے سایہ میں ہی رہتے تھے۔
ابو الحسن تاناشاہ نے تو مغلوں کے خلاف ان یوروپین
تجاروں سے مدد بھی مانگی تھی۔ فرانسیسیوں کے ساتھ
نظام الملک کی خط و کتابت بھی تھی ۱۷۴۲ء میں انگریزوں
نے نواب نظام الملک کی خدمت میں ایک وفد بھی روانہ
کیا تھا اس کی سرگذشت مدراس اور دکن کی تاریخی
دستاویزات میں محفوظ ہے۔ جب نظام الملک آصف
جاہ کا انتقال ہوگیا تو ان کے بعد جانشینی کے جھگڑے
بھی شروع ہوگئے جن سے یوروپ والوں نے خوب فائدہ
اٹھایا۔ چنانچہ سیلی کی تو یہ رائے کہ ہندوستان پر برطانوی
سامراج کی تاریخ کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب کہ
یوروپینوں نے دکن کے جانشینی کے جھگڑوں میں مداخلت
کی۔ اس کے پچاس برس بعد جان میلکم نے بالآخر فرانسیسی
اثرات کا خاتمہ کر دیا اور انگریزی افراد کی برتری ثابت
کر دی۔

دکن اور عرب

دکن میں اہل عرب بغرض تجارت قدیم سے آباد تھے
آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں یہ عرب اہل تجارت
دکن میں نمایاں طور پر تذکرۃ تاریخ کے صفحات میں ملتے
ہیں۔ راشٹر کوٹ کے حکمراں ان عرب تاجروں کی زبردست
حفاظت کرتے تھے اسکا حال سلیمان اور مسعودی کے تاریخی
تذکروں میں ملتا ہے

آندھرا کے آندھرائی حکمراں

آندھرائی حکمرانوں کی ابتدار برابر کے ایک خاندان
سے منسلک کی جاتی ہے، جو برابر میں ایک آریائی نو آبادی
کی جنوبی سرحد پر آباد تھا۔ ان کے بعد راشٹر کوٹوں نے اور
پھر چالکیہ خاندان کے حکمرانوں نے آندھرا پر حکومت کی
چالکیہ حکومت کا پایۂ تخت کلیانی تھا۔ دراس خاندان کا
سب سے بڑا حکمراں پلکیس دوئم تھا۔ ۱۳۲۷ء میں دکن میں
خلجی خاندان کا اثر ہوا۔ اور محمد تغلق نے دکن پر قبضہ جمایا۔
اور دیوگری کو دولت آباد نام دیکر اپنا دارالسلطنت

بنا دیا۔ لیکن جب حسن گنگو یعنی علاؤ الدین بہمن شاہ کا جب عروج ہوا تو ساڑھے تین سو سال کے لیے دکن دہلی کے اثر سے آزاد ہوگیا۔ حسن گنگو سے بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ حسن گنگو کے جانشینوں نے حکومت کی لیکن بہمنی سلطنت کے کمزور ہو جانے کے بعد دکن میں پانچ مختلف حکومتوں کا قیام ہوگیا جو محمد علی قطب شاہ تک پہونچیں۔ یہ محمد قلی قطب شاہی جدید شہر حیدرآباد کا بانی مبانی تھا۔ لیکن یہ آندھرائی حکومت کا سلسلہ اس وقت پھر ختم ہوگیا جب شہنشاہ اورنگ زیب نے گول کنڈہ پر قبضہ کر کے دکن کو دوبارہ دہلی کے زیر اثر بنا دیا

نظام شاہی حکومت کی داغ بیل

نظام شاہی خاندان کی کہانی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن کا محاصرہ کیا تھا۔ اس وقت اورنگ زیب کے ساتھ ایک عظیم ترک النسل سردار تھا۔ جو فیروز جنگ کے خطاب سے ملقب تھا۔ اسی فیروز جنگ کا ایک نامور فرزند تھا جس کا نام تھا چین قلیج خاں نظام الملک ان کو ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر نے دکن کا صوبہ دار مقرر کیا۔ کچھ عرصہ تک نظام الملک کا دکن دہلی کے درمیان آنا جانا جاری تھا لیکن آخر نظام الملک کے دکن پر اثر قائم ہوا اور اس طرح اس خاندان کی بنیاد پڑی جو نظام الملک کے آصف جاہ سے مخاطب ہونے کی وجہ آصف جاہی کہلایا۔

تذکرے اور تواریخ: دکن کی تاریخ ہندوستان میں زبردست اہمیت کی حامل ہے اسی لیے اکثر وقیع تواریخ نگاری نے اس کی طرف اعتنا کیا ہے علاوہ ان ماخذ کے جن کے تذکرہ اوپر گزر چکا ہے، خود دکن کے عظیم الشان عہد نے نامور، مورخ پیدا کئے۔ مثلاً فرشتہ کی معرکتہ لآرا تصنیف اسی عہد کی یادگار ہے جس میں دکن کی تاریخ کا زبردست خزانہ موجود ہے اس کے علاوہ رفیع الدین شیرازی کے تذکرۃ الملوک میں تالی کوٹ کی ۱۵۶۵ء کی جنگ کے آنکھوں دیکھا حال قلمبند ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کے "نورس نامہ" سے سولہویں صدی کے دکنی معاشرہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ نواب نظام الملک کا روزنامچہ جو تال بوائز ویلر کی جلدوں میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ ایک زبردست تاریخی دستاویز ہے جو دکن کے یورپین تعلقات پر معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ ۱۸۰۰ء کا وہ معاہدہ بھی اہمیت رکھتا ہے جو دکن اور حکومت برطانیہ کے درمیان طے پایا تھا۔ شاہنواز خاں کی تصنیف ناثر الامراء، منعم خاں کی سوانح دکن، یوسف محمد خان کی "تاریخ فتحیہ، عیسارام کی تاثر نظامی محمد امین کی "مجموعۃ الانشار" رام سنگھ کی گلشن عجائب" اور ولی محمد کی بہار گلشن دکن کے لیے نہایت مفید تاریخی ماخذ ہیں

یہ تو تھا دکن کے اوراولین کا تاریخی خزانہ۔ دکن کے آخری دور کے لیے محمد ابوتراب کی حدنعتہ العالم، غلام علی آزاد بلگرامی کی ناثر الاکرام، تجلی علی شاہ کی تزک آصفیہ اور تاریخ رشید الدین فائق دکن کے مستند تاریخی تذکرے ہیں۔ اس کے علاوہ فرانسیسی اور انگریزی دستاویزات اور ان کے ساتھ ہی ساتھ دفرامیں اور اسناد بھی نہایت اہم ہیں جو نواب سالار جنگ میوزیم جیسے نیم سرکاری

(باقی مضمون صفحہ ۷۱ پر)

نجم الحسن انجم ادیب ایم، اے

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی سید احمد کے

دو غیر مطبوعہ خط....

عبدالقادر مینار کرناٹک کی ایک گرانقدر علمی ادبی اور سیاسی ہستی ہیں۔ جنھوں نے ملک و ملت کی خاطر اپنی آبائی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا۔ جن کی پرکشش شخصیت نے گاندھی جی اور شوکت علی کو چھوٹی چھوٹی بستیوں میں کھینچ لائی۔ جن کی شعلہ فشار تقاریر ہزار لوگوں کے دل کی دھڑکن بنی رہیں۔

آپ ۱۸۹۵ء میں بہ مقام ہلسال ضلع گاروار میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بڑے زمیندار تھے۔ آپ کے تعلقات مولوی غلام رسول مہر۔ مولانا محمد علی، شوکت علی — سلیمان ندوی، مولانا آزاد اور حسرت موہانی سے گہرے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا آزاد سے مرید ہونے کی درخواست کی تھی تو مولانا نے انھیں یوں لکھا تھا۔

"آپ نہیں جانتے کہ میں ظاہراً کیا ہوں اور باطنی طور پر کیا ہوں اور آپ کے تعلق سے بھی میں بےخبر ہوں کہ آپ کس عقائد کے آدمی ہیں"

مولانا سلیمان ندوی کے خط مینار صاحب کے نام سو سے زیادہ ہیں اس میں اُن کی ذاتی زندگی اور ان کے تعلقات کی جھلکیاں مل پاتی ہیں۔ جب مولانا سلیمان ندوی ۱۹۱۹ء کے ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ کے سلسلہ میں بلگام آئے تھے تو مولانا کے یہاں ہی قیام فرمایا تھا۔ ان کے اس سفر کی روداد "تاریخی مقامات کی سیر" کے عنوان سے شاید "رہبر دکن" کے کسی سالنامہ میں شائع ہوا ہے۔

میں اب ذیل میں مولانا آزاد اور مولوی سید احمد مولف "فرہنگ آصفیہ" کے خط درج کر رہا ہوں۔

بسم اللہ

رانچی

۱۹۱۷ء السلام علیکم رحمت اللہ برکاتہ

خط پہونچا اپنے جن موثر الفاظ میں اپنے پرجوش اسلامی جذبات کا اظہار کیا ہے یقین کیجئے کہ اس سے فقیر کا دل کمال متاثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس

اخلاص و محبت کے لیے آپ کو جزائے خیر دے اور آپ کے جوشِ اسلامی و ایمان پرستی کو مزید استقامت عطا فرمائے۔

نیز ہم سب کو توفیق دے کہ اس دورِ ظلمت میں اس کے کلمۂ حق کے لیے اپنے جان و مال کو وقف کر دیں۔

ابو الکلام

اب مولوی سید احمد مولف " فرہنگِ آصفیہ " کا خط درج ذیل ہے۔ جو ۱۹۱۷ء میں لکھا گیا ہے۔

بسم اللہ

یاد فرمائے من تسلیم!

۹ نومبر کا مکرمت نامہ ۱۴ تاریخ کو ارد و فرمائی یاد آوری نے مرہونِ منت کیا کتب مطلوبہ جلد اول و دوم " فرہنگِ آصفیہ " کل تیرھویں تاریخ کو معہ نمونہ لغات النساء ارسال خدمت ہوچکی ہیں اس وجہ سے طبیعی تعلیم نہ جا سکی۔ کیونکہ اگر اسی روز تعمیل نہ ہوئی تو تعطیل کے سبب دو تین روز کا وقفہ پڑ جاتا بیس روپے کا منی آرڈر پہونچا اس کا شکریہ قبول فرمائیں معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحب نے آپ کو کتاب یا دفتر " فرہنگِ آصفیہ " کا پتہ بتایا انھوں نے صرف دو جلدوں کی اطلاع دی ورنہ یہ کتاب چار جلدوں میں چھپی ہے اور عدم موجودگی کے سبب مکمل۔ " فرہنگِ آصفیہ " کی قیمت پچاس روپیہ ہوگئی ہے اگر آپ اسے پسند فرمائیں گے اور جلد جواب دیں گے تو میں تیسری چوتھی جلد آپ کے لیے روک لوں گا کیونکہ جو شخص پیشگی قیمت بھیج دیتا ہے ہم سب سے پہلے اُسے دینا فرض سمجھتے ہیں اب مکمل تین چار جلدوں سے زیادہ سستی رہی۔ کیوں کہ سارا کتب خانہ اور سارا ذخیرہ مع اسباب جل کر خاکستر ہوگیا بلکہ ایک ہفت سالہ لڑکی بھی نذرِ آتش ہوئی یہی وجہ کتاب کی عدم موجودگی کا باعث ہے۔

دفتر قائم رکھنے کی وجہ سے جس قدر کتابیں ایجنٹوں کے پاس موجود پائیں واپس لے لیں اور ہاتھوں ہاتھ زیادہ قیمت پر بھی فروخت ہوگئیں کتاب بذریعہ ڈاک پہلے ہی خیال کر کے بھیجی گئی ریلوے پارسل کی بہ نسبت آپکا خیال بالکل درست ہے۔

فرہنگ کی رسید آنے پر بقیہ کتابیں ارسال خدمت ہوں گی تاکہ معلوم ہو جائے کہ شاید آپ لغات النساء بھی طلب فرمائیں جس کا پروف پرچہ فرہنگ میں رکھ دیا ہے۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے اور کار و بار لائق سے ممتاز فرماتے رہیں گے۔

فقط

آپ کا دلی نیاز مند، سید نیاز احمد دہلوی

از۔ دہلی۔

دفتر فرہنگ آصفیہ کل شاہ تارا

۱۴ نومبر ۱۷ء

ذکی کاکوروی

نئی کتابیں نئے رسالے

تبصرہ کیلئے ہر کتاب کے ۲ دو نسخے آنا ضروری ہیں

زیر نظر کتاب نادر شاگرد آتش و ناسخ کی ایک مختصر مگر اہم تصنیف ہے۔ اس کا تاریخی نام تلخیص معلّٰی ہے، جس سے سال تصنیف وطباعت ۱۲۸۰ھ نکلتا ہے۔ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں پہلی بار مطبع منشی رام سروپ فتح گڈھ سے شائع ہوئی تھی۔ بہت دنوں سے نایاب تھی۔ ڈاکٹر انصار اللہ صاحب نے اسے دوسری بار ضروری حواشی اور مقدمہ کے اضافہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے۔

نادر اپنے زمانہ کے کہنہ مشق شاعر اور متعدد اہم کتب کے مصنف ہیں۔ انھوں نے آتش و ناسخ کے تبحر علمی سے بڑا فیض پایا۔ اس وقت کی اصلاح زبان کی پوری تحریک اور اس کی علمی ادبی اہمیت کا انھیں بڑا خیال تھا۔ اس سلسلے میں ان کی نظر بڑی گہری تھی۔ تلخیص معلّٰی میں انھوں نے زبان وبیان کے بہت اہم مسائل اور قواعد وضوابط سے بحث کی ہے، اس کتاب میں جن چیزوں کا بیان ہے وہ متروکات ومستعملات، محاورے، تذکیر وتانیث جمع بنانے کے قاعدہ، روزمرہ، علم صرف وعروض اور اصول شاعری ہیں۔ کتاب کا مطالعہ موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر مفید اور کارآمد ہے۔ کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط درجے کا ہے۔

کتاب کا نام: تلخیص معلّا
مولف: کلب حسین خاں نادر
مرتب: ڈاکٹر محمد انصار اللہ سائز $\frac{20\times30}{16}$ صفحات ۱۳۲
قیمت ۹/ روپے
پتہ: بیت الابصار ۴/۵۸۵ سرسید روڈ علی گڈھ

زیر نظر تصنیف مآنی جائسی کی حیات و شاعری کا ایک خصوصی مطالعہ ہے جو ایم۔ اے کے امتحان کے لیے مصنف نے قلم بند کیا تھا۔
مآنی کا انتقال کم و بیش ۸۷ سال کی عمر میں ۶ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ہوا۔ وہ اپنے زمانے کے لکھنؤ کے بزرگ شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔
مآنی قدیم رنگ سخن کے شاعر ہیں جن کے یہاں شاعری تفنن طبع کا ایک ذریعہ ہے۔ پروفیسر سید سبط الحسن لوتھروی تعارف کے ذیل میں مآنی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"انھوں نے ادب کی کلاسیکل قدروں کی ترویج ایک ایسے عہد میں کی جو نسبتاً زیادہ موافق نہیں تھا مگر اپنے دلنشیں جمالیاتی شعور کی مدد سے انھوں نے اس مشکل منصب کو بڑی کامیابی کے ساتھ نبھایا ...... مآنی جائسی ادب کے کلاسیکی اقدار کے نمو و اظہار کے نئے امکانات کو بروئے کار لانیوالے فنکار تھے۔ انھوں نے ایک ہمہ گیر شاعرانہ شخصیت پائی تھی۔ مختلف اصناف سخن میں ان کے دلنشیں کارنامے اس شہرت اور قبول عام کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں جو انھیں اپنی زندگی میں حاصل ہوا۔"

مآنی نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کی خصوصی توجہ غزل، قصیدہ اور نظم کی جانب رہی۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

کیا کہیئے، کس سے کہیئے، کہیئے تو کون سمجھے ۔۔۔ بس میں ہوں اور رونا حال دل حزیں پر
جہد کراز بقا، سعی ہے تقدیر حیات ۔۔۔ زندگی کیا جو کوئی مطلب مشکل نہ رہا

اب تو شاید ہی مرے نغمے کسی کو یاد ہوں
کچھ نہ پوچھو مدتیں گذریں چمن چھوٹے ہوئے

کتاب کا نام: مآنی جائسی ۔ حیات و شاعری
مصنف: سید صفدر حسین عابدی

ضخامت: ۲۰×۳۰ ۱۶۸ صفحات
قیمت: ۱۶ ساتٗ رُوپے پتہ: دانش محل لکھنؤ

یہ کالی داس گپتا رضا صاحب کی مذہبی شاعری کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ جس میں نعت و منقبت و مراثی شامل ہیں۔ رضا صاحب کے کئی شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں جس طرح اُنھوں نے ایک

ایک ہندو مذہب کے پیرو ہونے کے باوجود مسلمانوں کے پیغمبرؐ اور بزرگان دین کے بارے میں اپنے جذبہ احترام وعقیدت کا اظہار کیا ہے وہ خاص طور پر قابل قدر ہے۔
کتابت، طباعت اور کاغذ اعلیٰ درجہ کا ہے۔

کتاب : اجالے　　شاعر : کالیداس گپتا رضا
سائز ۔ $\frac{20\times30}{16}$ صفحات ۸۰ قیمت : دس روپے
پتہ : وِمل پبلکیشنز ۔ بمبئی

اُردو زبان نے فارسی، عربی، انگریزی اور دوسری دنیا کی بڑی زبانوں کے علمی، ادبی اور سائنسی سرمایہ سے غیر معمولی استفادہ کیا ہے۔ لیکن ہندوستان کی مختلف زبانوں کے تخلیقی، فکری، تہذیبی اور دیگر علوم کے سرمایے سے خاطر خواہ صورت میں اکتساب فیض کی مناسب کوشش نہیں کی، جب کہ ہمارے ملک کی کئی زبانوں میں بہت سا ایسا مواد موجود ہے جس سے اُردو زبان کو کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔
نوجوان مصنف یونس اگاسکر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مراٹھی ادب کو اردو میں روشناس کرانے کی پہلی کامیاب کوشش کی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں مراٹھی ادب کے قدیم وجدید رنگوں اور خصوصیات کا بڑی حد تک اندازہ ہوسکتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ فاضل مصنف اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے مستقبل قریب میں مراٹھی ادب کے مختلف جواہر پاروں سے اردو داں لوگوں کو متعارف کرانے میں اہم رول ادا ..... کریں گے۔
کتاب کی کتابت طباعت اور گٹ اپ بھی عمدہ ہے۔

نام کتاب : مراٹھی ادب کا مطالعہ
مصنف　　یونس اگاسکر
سائز : $\frac{18\times22}{8}$ صفحات ۱۵۲　　قیمت : دس روپے
پتہ : مکتبۂ جامعہ، پرنسیس بلڈنگ ۔ جے جے اسپتال ۔ بمبئی ۳

سید نجم الدین نقوی

پروفیسر ضامن علی مرحوم — ایک دور — ایک ادارہ

(بہ سلسلہ جنوری ۱۹۷۷ء دوسری قسط)

ضامن صاحب کے شاگرد

جس بزرگ نے ایک چوتھائی سے زیادہ الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھایا ہو، ظاہر ہے اس کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہوگی اور اس کا تمام وکمال ذکر ممکن نہیں لیکن ضامن صاحب کے شاگردوں میں، جنھوں نے آگے بڑھ کر نام پیدا کیا' کچھ یہ ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر رفیق حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں، پروفیسر احتشام حسین مرحوم، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر ابو محمد سحر، پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر حامد بگرامی، ابو طالب نقوی مرحوم، آئی، سی۔ ایس، عفران احمد فاروقی، آئی۔ سی۔ ایس، فضل احمد کلیم، تاج نقوی، آئی۔ سی۔ ایس وغیرہ۔

ضامن صاحب کی اقرباپروری

میں مرحوم کے ساتھ چھ برس تک رہا۔ اس دوران آنکھوں دیکھا اور اس سے پہلے کانوں سنا کہ اُن کا گھر عزیزوں کے لیے مامن تھا، ماں، بھائی، بہن، بھتیجے، بھتیجیاں، بھانجے، بھتیجوں کی بیویاں، ان کے بچے، بھانجوں کی بیویاں، اُن کے بچے، ان کے علاوہ قریب اور دور کے عزیز۔ لگ بھگ ۳۰ آدمیوں کا رزق ضامن صاحب کے ذریعے سے قدرت نے مقرر کیا تھا۔ گویا مرحوم یہ سمجھتے تھے کہ قدرت نے اُن کو جو کچھ دے رکھا ہے وہ اسی لیے ہے کہ وہ دوسروں پر تقسیم کرتے رہیں۔ اپنے چھ سالہ دوران قیام میں اُنھیں میں نے چھ بار بھی گھر کے اندر کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ صبح کی چائے سے لیکر رات کے کھانے تک وہ دوسروں کو شریک کرکے کھانے پینے کے عادی تھے۔ وہ خود دوسروں کے کھانے پر انتظار کرتے تھے۔ البتہ دوسرے بے نیازی برتتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ کسی ضروری کام کے باعث کھانے کے وقت گھر نہ پہنچے تو "Con muse" کے لوگ کھا پی کر اپنی اپنی راہ لیتے

اور انھیں تنہا کھانا پڑتا۔ ایسے اوقات کو وہ بادل ناخواستہ گزار کرتے تھے۔ صبح ۶ بجے سے جو چولہا روشن ہوتا تھا تو رات کے ۱۲ بجے تک "آتش پرستی جاری رہتی تھی۔

اسی اقربا پرستی نے انھیں بڑی دیر میں شادی کرنے کا موقع دیا۔ دسمبر ۳۳ء میں شادی کی۔ چار بچیاں اور دو بچے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑی بچی چودہ برس کے سن میں غالباً ۱۹۴۷ء میں اللہ کو پیاری ہوئی، عمر کا بیشتر حصہ دوسروں کے مکانوں میں گذارا۔ مدتوں نمبر ۵۶ چک الہ آباد میں رہتے۔ جو اُن کے ایک عزیز ڈپٹی کلکٹر محمد حسن صاحب کا تھا۔ وہ مرحوم سے کرایہ نہیں لیتے تھے اور ضامن صاحب اس کچے اور پرانے مکان کی بقا کے ضامن تھے۔ حساب دوستاں در دل والی بات تھی جب محمد حسن صاحب کے ریٹائرمنٹ کا زمانہ قریب آنے والا ہوا تو ضامن صاحب مرحوم لیاقت منزل، بتھر گل میں منتقل ہو گئے جو نہایت وسیع و عریض عمارت ہے، محل سرا، دیوان خانہ اور مہمان خانہ، تینوں الگ الگ۔ شعرا اور طلباء مہمان خانہ میں بیگم ضامن علی اور دیگر مستورات محل سرا میں اور خود بہ نفس نفیس لیاقت منزل کے زیریں حصے میں۔ صبح سے شام تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ عزیز، دوست، شاگرد، مومن، منافق، ....، شاکر نعمت کافر نعمت، غرض کہ ہر طرح کے نمونہ مرحوم کے یہاں دیکھنے کو ملے اور ملتے رہے، جوش صاحب جو پاکستان جانے کے بعد اپنے کو مرحوم لکھنے لگے ہیں جب بھی الہ آباد آتے ضامن صاحب ہی کے یہاں "طلوع" ہوتے۔ ادھر شام ہوئی، ادھر کاگ اڑا۔ ضامن صاحب مرحوم اگر لاحول نہ سہی تو استغفر اللہ کی تسبیح ضرور پڑھتے تھے لیاقت منزل میں آنے کے بعد انھیں خود اپنا مکان بنانے کا خیال آیا تو ۵۶ چک کے بالکل سامنے، سڑک کے اُس پار.... Improvement Trust سے زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر مکان کی تعمیر شروع کی سڑک کی جانب دو دکانیں نکالیں اس کے بعد زنانہ حصہ اور سڑک کے عقب میں مردانہ نشست۔ نقشہ ایسا بنوایا جس میں اُوپر بھی flat تعمیر کیے جا سکیں۔ ان کی زندگی میں یہ کام نہ ہو سکا۔ مرنے کے بعد اُن کے خطیر Provident Fund سے جو چھبیس ہزار تھا، مکان کا بالائی حصہ بھی مکمل ہوا۔ اور اب جب کہ اُن کی اہلیہ اور دو لڑکے برادران عزیز سید محمد حیدر، بی۔ اے بی۔ ایڈ اور سید محمد مظہر، بی، اے۔ جرنلسٹ نار درن پیترکا (الہ آباد) اس میں رہ رہے ہیں۔ مکان کے مختلف حصوں کا کرایہ غالباً پانچ سو روپیہ مہینہ آتا ہے۔ چاہتے تو سول لائنس میں بنگلہ خرید سکتے تھے۔ یا زمین خرید کر بنگلہ بنوا سکتے تھے۔ لیکن "اگلے زمانے والے" زندہ ہیں یا نہیں، اس سے بھی بے خبر رہتے۔ دور اندیش تھے۔ اسی دور اندیشی کے باعث مدتوں کنبہ پروری کرتے رہے اور شادی نہ کی۔ اور بعد میں جب اس طرف رجوع ہوئے تو بچوں کے لیے ایک ایسا انتظام کر گئے جس کے باعث وہ آج مطمئن زندگی گذار رہے ہیں۔ فرماتے تھے اگر میں نے اپنے بچوں کو سول لائنس کی زندگی کا عادی بنا دیا تو پھر ان کے دل میں مشرقیت یکسر ختم ہو جائے گی، مرے اعزا کا احترام کرنا بھول جائیں گے۔ ہوٹلوں اور اسپتالوں کے کلچر سے مرحوم کو سخت نفرت تھی۔ اسی لیے ساری عمر اپنے گرد ایک

ایک زبردست حلقہ بنا رکھا تھا۔ ایک بھیڑ جس میں چھوٹے بڑے
سبھی شامل تھے۔ جانتے سب کو تھے، پہچانتے سب کو تھے،
پھر بھی عملاً امتیاز نہیں کرتے تھے عزیز ہو کر غیر کسی کو دکھی
نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آخر عمر میں جب مسلسل بیمار رہتے تھے
ایک دن جب رام پور سے الہ آباد پہنچا تو لکھنؤ کے ایک مشہور
شاعر کو سو روپیہ کا منی آرڈر لکھ رکھا تھا۔ مجھے غصہ آیا میں
نے کسی قدر ترش ہو کر اس منی آرڈر کے روانہ کیے جانے پر
اعتراض کیا۔ کہنے لگے ابھی چند دن ہوئے جب میں لکھنؤ گیا
تھا تو یہ رقم میں نے قرض لی تھی۔ اسے واپس کر رہا ہوں۔
میں نے کہا میں جانتا ہوں یہ کیسا قرض ہے۔ وہ نہ مانے۔
منی آرڈر ڈاک خانے بھیج دیا۔ خود چھڑی ٹیکے، تسبیح لیے،
اندر گئے۔ سفر کے تکان نے مجھے ڈرائنگ روم کے ایک
صوفے پر دراز کر دیا۔ نیند نہ آئی تو سامنے پڑے ہوئے
خطوط پر نظر گئی۔ انھیں میں ایک ایس۔ او۔ ایس بھی تھا
ان شاعر صاحب کا جنھیں یہ منی آرڈر روانہ کیا گیا تھا۔

ضامن صاحب مرحوم کے کم نظر نکتہ چین ان کی زندگی
میں اور ان کے مرنے کے بعد بھی مرحوم پر الزام لگاتے رہے
کہ انھوں نے اپنا وقت علمی کاموں میں نہیں صرف کیا۔ بلکہ
یونی ورسٹی کی سیاست میں منہمک رہے۔ ان لوگوں نے
ان کی جان بے تاب کو نہیں دیکھا۔ ان کے صرف "آشکار"
کو دیکھتے رہے۔ اور ان سے بے حد قریب ہونے کے "جو
ان کے پنہاں" سے ناواقف۔ یہ ناواقفیت غیر ارادی بھی ہو
سکتی ہے اور ارادی بھی۔ ان سے کون کہے اور انھیں
کون بتائے کہ اگر یونی ورسٹی میں شعبہ اردو قائم نہ ہوتا
اور اس میں یکے بعد دیگرے جگہیں نہ ہوئی رہتیں،
ریسرچ اسکالر اور ریسرچ فیلو زیا مشاہرہ مقرر نہ کیے
گئے ہوتے تو مولفین، مصنفین، مرتبین کیسے پیدا ہوتے
کتابیں لکھنا اپنی جگہ پر یقیناً ایک اہم کام ہے لیکن ایسے
افراد پیدا کر دینا جو بعد میں مصنف بن سکیں، شاید
یہ اس سے اہم تر کام ہے۔ اولادِ معنوی کی بہت
سی قسمیں ہیں۔ لائق شاگرد بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔
ڈاکٹر حامد بلگرامی، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین
ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر رفیق حسین وغیرہ
اسی استاد کے شاگرد ہیں۔ جس پر یہ الزام تھا کہ اسے پڑھنے
لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ضامن صاحب مرحوم کا انتقال ۵ اپریل ۱۹۵۵ء
کو ہوا۔ ان کا وطن مصطفیٰ آباد ضلع رائے بریلی تھا۔ اگر وہ
چاہتے تو وصیت کرتے کہ انھیں اسی خاک پاک کے سپرد
کیا جائے لیکن انھیں الہ آباد سے محبت تھی جو ان کا وطن
ثانی تھا۔ اسی لئے لوکر گنج کے قریب الہ آباد کی کربلا میں
انھیں دفن کیا گیا۔ احتشام صاحب کو بھی اسی کربلا میں
جگہ ملی۔ استاد شاگرد ہمیشہ کے لیے مل گئے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عاشق کا جنازہ بڑی دھوم
سے اٹھتا، اور سنتا ہوں کہ جہاں تک اہالیانِ شہر اور
ان کے عزیزوں کا تعلق ہے، ضامن صاحب قبلہ مرحوم
کو بڑی شان کے ساتھ وداع کیا گیا لیکن شعبۂ اردو
کی جانب سے کسی رسالے کا "خاص نمبر" بھی نہ نکالا گیا۔
حالانکہ شعبۂ اردو، الہ آباد یونی ورسٹی پر اور اس
کے اساتذہ پر ضامن صاحب کے وہی حقوق تھے جو کسی
باپ کے اپنی اولاد پر ہوتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

جلد (۲۴) شمارہ (۴) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو/این، پی ۹۳

لائسنس نمبر : ۲۰۰۰۰۴۴/۱۲

دفتر فون : ۲۶۱۳۵

فون رہائش گاہ : ۲۶۶۵۶

فروغ اردو ہند کا ترجمان

یادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ایڈیٹر : محمد حسین شمس علوی قاسمی کاکوروی

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

جلد (۲۴) شمارہ (۳) جولائی ۱۹۷۶ء

مجلس ادارت :

۱۔ عبدالقوی دریابادی بی، اے

۲۔ سعادت علی صدیقی

ترتیب

رسالہ کا زر اشتراک :

دس روپیہ

عوام سے : آٹھ روپیہ

فی پرچہ : ۷۰ پیسہ

پتہ :

ادارہ فروغ اردو ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ مستادان محل روڈ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ (امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا)

ڈاکٹر شجاعت علی (سندیلوی)

اپنی باتیں

اُردو زبان کے متعلق وزیر اعظم کا یہ اعلان کہ اسے دوسری سرکاری زبان نہیں بنایا جاسکتا، نہ تو حیرت خیز ہے اور نہ خلاف توقع، آخر وزیر اعظم اور انکی جماعت کے بیشتر اراکین وہی تو ہیں، جو ۱۹۶۹ء سے قبل تک کانگریس میں شریک غالب کی حیثیت رکھتے تھے اور مرکزی نیز ریاستی وزارت میں شامل تھے انھیں بزرگوں کی اکثریت کا تو یہ اثر تھا، کہ ۱۹۴۷ء میں جب آزادی کا پرچم لہرایا گیا تو لسانی آمریت کا مظاہرہ اس طرح کیا گیا کہ قومی پرچم کے متعلق اردو میں لکھی ہوئی عبارت مٹا دی گئی۔ اور صرف ہندی عبارت رہنے دی گئی آخر اُردو کا کیا جرم تھا، یہی نا کہ ۱۸۵۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک اسی زبان کے شیدائیوں اور فرزندوں نے مادر وطن کی آزادی کے لئے۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں مرنے کی تڑپ کا جذبہ پیدا کیا، اسی کے شاعر، اور ادیب، بغاوت کے جرم میں گرفتار کئے گئے، جیلوں میں بند کئے گئے، کالے پانی بھیجے گئے، تختۂ دار پر لٹکائے گئے مگر وہ باز نہیں آئے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں ہر چند اسمیں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

انھوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن اس لیے جاری رکھی کہ ان کی حریت و آزادی کی آواز مادر ہند کے ہر سپوت کے کانوں تک پہونچ جائے اور مادر وطن کا ہر دل آزادی کے لیے بیقرار ہو جائے، حکومت وقت نے ان کی متاع لوح و قلم چھین لی، لیکن انھوں نے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر حریت کی تاریخ مرتب کی۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں ہم نے

یہ اسی کے ایک جیالے فرزند کا دل گردہ تھا جس نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے مغرور اور جابر حکمرانوں سے کہا تھا کہ

وقت لکھے گا کہانی اک نئے مضمون کی جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی

اس کو یہ یقین کامل تھا کہ ظلم و بربریت کے خاتمہ کا اعلان ہو چکا ہے۔ اور

موت ٹل سکتی ہے یہ فرمان ٹل سکتا نہیں۔

فرمان نہیں ٹلا وہ عظیم سلطنت جس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا پارہ پارہ ہو گئی، پھر ہندوستان اور اس کے نام لیواؤں نے، اتنی زبردست مضبوط اور مستحکم طاقت سے ٹکر لی، کیا وہ اتنی کمزور، بزدل اور پست ہمت ہو جائیگی کہ اپنے حقوق کے لیے، لسانی سامراجیت کے آگے سر تسلیم خم کر دے گی؟ جس کی فطرت مصائب سے الجھ کر مسکراتا رہا ہو، جو ناکامیوں اور محرومیوں پر اشک برسانے کے بجائے شاداں و فرحاں رہ کر عزم و استقلال کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ہو وہ کیا اپنے ہی وطن میں چند باقتدار اور لسانی تعصب کے شکار حضرات کے جبر سے دب جائے گی یہ ناممکن ہے۔

آج جو اردو کو اسکا حق دینا نہیں چاہتے، اس کو دوسری زبان نہیں بنانا چاہتے وہ وہی تو ہیں حق کے عہد حکومت میں "اردو کوئی زبان نہیں ہے"؟ "اردو والے غدار ہیں، پھانسی کے حقدار ہیں" "اردو ہندی کی ایک شیلی ہے"؟ "اردو کا رسم خط غیر سائنٹفک اور بدیسی ہے" "اردو فرقہ پرستی کو ہوا دیتی ہے"۔ اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنا چاہیئے، وغیرہ وغیرہ اعلانات کئے گئے لیکن اُردو اور اس کے نام لیوا آزادی کے بعد مسلسل آئینی اور جمہوری جدوجہد کرتے رہے بیس یا بائیس برس کے بعد حکومت کو عقل آئی تھی اور اس کو یہ تسلیم کرنا پڑا تھا کہ اردو کے ساتھ زیادتی ہوئی اس کی حق تلفی کی گئی، رفتہ رفتہ کچھ رعایتیں دینے کا اعلان ہوتا رہا۔ لیکن اس کا حق دستوری اور قانونی حیثیت سے تسلیم کرنے میں پس و پیش کیا جاتا رہا، خیال تھا کہ موجودہ سرکار پچھلے تجربات سے سبق لے گی، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ذہنیت نہیں بدلی وہ اب بھی لسانی جبر کی قائل ہے، صحیح اور باشعور جمہوریت میں کسی کا حق نہیں مارا جاتا، اگر اُردو کو اس ملک میں پھلنے پھولنے اور زندہ رہنے کا حق ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ حکومت اس کے حق کو آئینی طور پر تسلیم نہ کرے۔ اور یہ بہانہ کرے کہ عوام نہیں چاہتے۔ اکثریت اگر یہ چاہے کہ اقلیت کو ختم کر دیا جائے اسکو زندگی سے محروم کر دیا جائے، اس پر معاش کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں تو کیا ایک منصفانہ اور باشعور حکومت یہ مطالبہ مان لے گی۔ پھر زبان کا رشتہ تو ان سب سے زیادہ گہرا ہوتا ہے کسی کو اس کی مادری زبان کا حق نہ دینا، اس پر معاش کے دروازے بند کر دینا کس دستور میں جائز ہے؟ کیا یہ نسل کشی کے مرادف نہیں ہے یا باقتدار حضرات آشنا ہی نہیں جانتے کہ مادری زبان کو ختم کرنیوالی بڑی سے بڑی حکومتیں ختم ہو گئیں، لیکن وہ زبان نہیں ختم کر سکے۔

رسم خط کی تبدیلی اور ناگری رسم خط اپنانے پر پھر زور دیا جانے لگا ہے۔ میں اس کو بھی سیاسی بصیرت کی کمی، لسانی تعصب و تنگ نظری، اور ذہنی کجی سمجھتا ہوں ہندوستان میں اُردو رسم خط ہی ایسا ہے جو پوری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ وسط ایشیا کے ممالک، عرب ممالک اور وہ تمام ممالک جہاں عربی فارسی رسم خط جاننے والے رہتے ہیں، اردو رسم خط ان کے لیے اجنبی نہیں ہے اگر وسعت نظر سے دیکھا جائے تو اس رسم خط کی بدولت دنیا کے بہت

بڑے حصے سے ہمارے تعلقات استوار ہوسکتے ہیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ اُردو کے متعلق حکومت نے صاف صاف کہہ دیا، اب ہمارا فرض یہ ہے کہ اپنی مادری زبان کی حفاظت، ترقی اور بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کریں حکومت کے کاسہ لیسوں سے کوئی اُمید نہ رکھیں، اور خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر جدوجہد کرتے رہیں۔

ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ جولائی سے اسکول میں زیادہ سے زیادہ طلبہ داخل کرائیں، کوئی اسکول ایسا نہ چھوڑیں جس میں اُردو کے طلبہ نہ ہوں، ہر اسکول میں اُردو پڑھانے والے اساتذہ کا تقرر کرائیں اور یہ عہد کرلیں کہ اپنی مادری زبان کے سلسلے میں ہر ممکن قربانی دیں گے۔

غزل

ڈاکٹر سلام سندیلوی

جب ان کی یاد آئی، چند اشکِ غم نکل آئے
سحر ہونے لگی، کچھ قطرۂ شبنم نکل آئے

وہ سمجھے تھے بہت آسان ہے زلفوں کا سلجھانا
مگر ہنگامِ آرائش ہزاروں خم نکل آئے

غمِ اہلِ جہاں ہر پیکری پہ صاف کندہ ہے
جنھیں ہم گل سمجھتے تھے، وہ جامِ جم نکل آئے

اسیرِ زلف ہوکر جانے کتنے رنج و غم سہتے
بہت اچھا ہوا پیچیدگی سے ہم نکل آئے

چھپانا چاہتا تھا یا عیاں حالِ چمن لیکن
گلِ تر خود ہی لے کر دیدۂ پرنم نکل آئے

معاذ اللہ! کتنی دلنشیں یہ شامِ ہجراں ہے
افق سے کیا انھیں کے گیسوئے برہم نکل آئے

قیامت خیز ہے کس درجہ صبح و شام کا ملنا
اُدھر سے تم نکل آئے اِدھر سے ہم نکل آئے

سلام آخر کہاں تک عمر قید و بند میں کٹتی
بہت اچھا ہے جو خلد سے آدم نکل آئے

ڈاکٹر محمد اختر الحسن

پروفیسر شہباز کی رباعیاں

پروفیسر سید محمد عبدالغفور شہباز ایک مسلم الثبوت شاعر گزرے ہیں۔ ان کے ایک مایۂ ناز فنکار ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ زبان و الفاظ پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ فطرت نے انھیں شاعرانہ طبیعت اور ادیبانہ مزاج عطا کیا تھا۔ ابتدائے عمر سے لے کر زندگی آخری سانس تک وہ خدمتِ شعر و سخن میں مشغول رہے۔ انھوں نے لکھنے پڑھنے اور شعر و شاعری کو اپنا مقصد حیات بنا رکھا تھا۔ ان کی ذات گرامی سے اردو زبان و ادب میں بہت ترقی او قابلِ تعریف اضافے ہوئے۔ شہباز نے گیسوئے اردو سنوارنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے — چمنستان اردو ان کی منت پذیر ہے کہ انھوں نے اس کے حسن کو دوبالا اور دو چند کرنے میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ اردو زبان و ادب اور شعر و سخن پر ان کے احسانات عظیم ہیں۔

بہر طور آیئے اس مضمون میں ہم شہباز کی رباعیوں کا مطالعہ کریں۔

رباعی ایک مشہور صنف سخن ہے اس میں کل چار مصرعے ہوتے ہیں۔ قطعہ سے یہ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس کی بحر مخصوص ہے۔ اس کے اول ثانی اور رابع مصرعے ہم قافیے ہوتے ہیں، البتہ صرف مصرعۂ ثالث قافیہ سے معرا ہوتا ہے اس کے چوتھے مصرع میں سارے مضمون کا لب لباب ہوتا ہے۔ اس طرح چوتھے مصرعے میں جامعیت پیدا کرنا رباعی گو کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ رباعی میں سخن گو کوئی نصیحت کرتا ہے۔ پند و نصائح، دنیا کی بے حقیقی و بے ثباتی، خدمتِ خلق، بڑوں کا ادب، والدین کی اطاعت و فرمانبرداری یہ سب چیزیں بہت خوبصورتی کے ساتھ رباعیوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ شعرا جب غزل گوئی سے تھک جاتے تھے تو دل بہلانے یا دل لگی کے لیے رباعی کہا کرتے تھے۔

مشہور رباعی گو شیخ محمد ابراہیم ذوق، میر ببر علی انیس، مرزا سلامت علی دبیر، خواجہ الطاف حسین حالی، سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی اور سید علی محمد شاد عظیم آبادی ہوئے ہیں۔ لیکن ان حضرات نے بھی رباعی کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جتنی شہباز نے کی ہے۔

پروفیسر شہباز کے کلام کے تین مجموعے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ رباعیات شہباز .... سن اشاعت ۱۸۹۱ء
۲۔ خیالات شہباز .... " " ۱۹۱۴
۳۔ تفریح القلوب ...... " " ۱۹۴۲

"رباعیات شہباز" شہباز کے زور طبع کا پہلا کارنامہ ہے۔ جو طباعت و اشاعت کے مرحلوں سے کامیابی سے گذرا۔ اس میں کل تین سو سینتالیس (۳۴۷) رباعیاں ہیں۔ اس پر سیر حاصل مقدمہ نواب سید محمود آزاد نے ۲۴ مئی ۱۸۹۰ء کو بہ مقام بانکی پور پٹنہ تحریر فرمایا ہے۔ یہ دیباچہ گیارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ "رباعیات شہباز" کی رباعیاں مختلف موضوعات کے تحت ہیں۔ اس کے موضوعات مذہب، قدرت، اخلاق، تعلیم، تمدن اور تفنن ہیں۔

مذہب

مذہب کے زیر عنوان بارہ رباعیاں ہیں۔ انہیں مذہب، روحانیت اور اس کے ذیلی امور پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسرار خداوندی اور کائنات کے رازہائے سربستہ کا بہت حسن و خوبی سے ذکر کیا ہے۔ ان سے انسان کی لاعلمی کا بیان ہے۔ کوئی رباعی مضمون اور خیال انگیزی کے لحاظ سے نظر سے کم نہیں ہے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ خدا کے رازہائے سربستہ اور اس کی قدرت کاملہ کے آگے انسان کی بے بسی و مجبوری دکھائی گئی ہے۔ قدرت کی فیاضیوں اور بخششوں کا ذکر ہے۔ انسان دوستی و ہمدردی کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ فصاحت اور بلاغت حد درجہ موجود ہے۔ اسلوب بیان میں بڑی سنجیدگی اور متانت ہے۔ الغرض دین و مذہب پر یہ نہایت، کامیاب رباعیاں ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

کیونکر کوئی اسرار الٰہی جانے
کیا تاب کہ انسان کا ہی جانے
آنکھوں سے حجاب وہم اٹھنا معلوم
باتیں یہ خدا کی ہیں خدا ہی جانے

ہیں اہل صفا جو قید مذہب رکھتے
عادات و فضائل میں ہیں مذہب رکھتے
ہوتے نہیں وہ حسن عمل سے غافل
ہر دم ہیں خیال فرض مذہب رکھتے

قدرت

"قدرت" کے عنوان سے کل تراسی (۸۳) رباعیاں ہیں۔ ان میں گوناگوں معلومات خوبصورتی کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ قدرت اور اس کی طاقتوں اور کرشموں کو کھول کھول کر پیش کیا ہے۔ مغربی اصطلاحات اور

تشبیہات و استعارات کو بہت حسن و خوبی سے استعمال کیا ہے۔ ہر رباعی شعر کے شعر علمی اور ذہانت و ذکاوت کی شاہد ہے۔ پوری کتاب میں تمام عنوانات میں سے زیادہ رباعیوں کی تعداد اسی موضوع یعنی "قدرت" کے تحت ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ قادر الکلامی اور زور بیان کا کامل ثبوت شہباز نے انھیں رباعیوں میں دیا ہے۔ روانی بیان اور سلاست خیال ہر جگہ جاری و ساری ہے بعض رباعیوں میں مناظر فطرت کی بڑی دلکش تصویر کشی کی ہے۔ قدرت کی کرشمہ سازیوں کو نہایت حسن و خوبی سے پیش کیا ہے۔ دو رباعیوں سے آپ بھی محظوظ ہوں۔

(۲۸)

رخصت ہوئی طفل کی وہ صبح گلفام
لاتی تھی نسیم جب کہ عشرت کے پیام
پھولی ہوئی ہے خضاب کے منہ پر شفق
پیری کی، خبردار! کہ آ پہونچی شام

(۴۸)

قدرت کی بہار جب دکھاتے ہیں درخت
گلشن میں عجیب گل کھلاتے ہیں درخت
معلوم نہیں شاخوں پہ گاتے ہیں طیور
یا آپ خوشی میں آکے گاتے ہیں درخت

اخلاق

(۴۲)

اس موضوع کے تحت کل بہتر رباعیاں ہیں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے۔ ان میں اخلاق، پند و نصائح اور روحانیت سے متعلق مفید اور کارآمد نکات بیان کئے گئے ہیں۔ لوگوں کو اخلاق اور راہ راست پر چلنے کی تلقین بھی کی ہے دنیاوی جاہ و ثروت پر بے جا غرور اور گھمنڈ کرنے سے منع کیا ہے۔ دل شکنی اور دل آزاری شہباز کے مسلک میں بہت بڑا گناہ ہے۔ انکساری عجز اور خاکساری کا سبق ان کے یہاں ملتا ہے۔ الغرض شہباز نے اخلاق اور اس کے جملہ اوصاف حمیدہ کو کمال لطافت و فصاحت سے بیان کیا ہے ہر رباعی میں پند و نصائح کی ایک دنیا پنہاں ہے۔

(۱۴۶)

کہتے ہو کہ کرلیں گے ہم اس کام کو کل
ایسا نہ ہو کل بھی ہاتھ سے جائے نکل
جس کل سے بنے آج ہی فرصت کرلو
کل چاہے چلے یا نہ چلے کام کی کل

(۱۵۲)

لازم نہیں اس دولت فانی پہ دماغ
کر شکر جو حاصل ہے ترے دل کو فراغ
مت تیغ زباں سے کر دلوں کو گھائل
بھر جاتا ہے زخم کے بھی رہ جاتا ہے داغ

تعلیم

اس کے بعد تعلیم کا موضوع ہے۔ اس میں کل تینتیس سو رباعیاں ہیں شہباز نے ان رباعیوں میں علوم و فنون اور ان کے فیضان و برکات کو پیش کیا ہے جہالت و گمراہی پر اظہار نفرین کیا ہے۔ تعلیم و تربیت کے فوائد

بیان کیے ہیں۔ گویا یہ رباعیاں علوم و فنون کے دفتر اور معلومات عامہ کی کان ہیں۔ ان رباعیوں میں شہباز صحیح معنوں میں معلم اور پروفیسر بن جاتے ہیں۔ اپنی قوم اور اہل وطن کو تعلیم و تعلم کی تلقین اور نصیحت کرتے ہیں۔

شہباز کا تو یہ کہنا ہے کہ دولت بھی علم ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ لوگوں میں آدمیت اور انسانیت معقول تعلیم و تربیت سے آتی ہے۔ شہباز کے مطابق کتب بینی کرنے سے انسان ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ اور گھر میں بیٹھ کر ساری دنیا میں سیر بھی کرتا ہے علماء و فضلاء کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے۔

بہر حال آیئے اس موضوع کی دو رباعیاں آپ بھی ملاحظہ کریں۔

(۱۷۳)

جس دم کہ ہے تربیت کا فیضاں ہونا
ناداں بھی ہے ہوشمند دوراں ہونا
وہ چیز ہے تربیت کہ کچھ مدت میں
ایک قطرہ ناچیز ہے انساں ہونا

(۱۷۴)

مردانہ ہیں معرکوں میں پڑھنے والے
زینوں پہ ترقی کے ہیں چڑھنے والے
پاتے ہیں تمام قابلوں کی صحبت
دنیا میں جو ہیں کتاب پڑھنے والے

تمدن

اب ہم "تمدن" کے تحت رباعیوں پر نظر ڈالیں

اس عنوان میں رباعیوں کی مجموعی تعداد بائیس ۲۴۴ ہے انسانی تمدن و معاشرت پہ فوائد بخش اور نصیحت آموز رباعیاں ہیں قوموں کی تہذیب و تمدن اور عراقیات کا جائزہ لیا ہے عشق و عاشق اور حب الوطنی کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ ہمت و جرأت پر زور دیا ہے۔ محکمہ ڈاک کی خوبیاں اجاگر کی ہیں۔ دو رباعیوں سے آپ بھی لطف اندوز ہوں۔

(۲۰۳)

اس عشق سے ظاہر ہے الٰہی حکمت
اس عشق میں مضمر ہیں رموز رحمت
ہے موجب جلب نفع و دفع زحمت
واجب ہے یہ قدر واجب اسکی فرحت

(۲۰۸)

وہ ڈاک کے سر بمہر اترے تھیلے
مضبوط، بھیک، وسیع گو میلے
غم، حوصلہ، شوق، امید، ڈر، شکر، گلہ
تھیلوں جو کھولدیں تو گھر گھر پھیلے

تفنن

اخیر میں تفنن کا عنوان درج ہے اس سلسلہ میں انیس ۱۹ رباعیاں ہیں۔ ان میں مزاح و ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ رباعیاں بہت دلچسپ اور مزیدار ہیں۔ تفنن طبع اور دل بستگی کے سارے سامان یکجا کر دیئے ہیں۔ شہباز کی ظرافت نگاری کی جھلک ان میں صاف طور پر عیاں ہے۔

مزاح و ظرافت انسان کی سرشت میں ودیعت کی گئی ہے۔ انسان ہر وقت سنجیدگی اور متانت کا لبادہ اوڑھے نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے لیے اپنی دل بستگی اور دل چسپی کی خاطر ہنسنا ہنسانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا شہباز نے بھی غالب کی طرح "حیوان ظریف" ہیں انھوں نے تفنن کے زیر عنوان رباعیوں میں دل بستگی اور دلچسپی کا اچھا خاصا سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ بات سے بات پیدا کی ہے۔ غرض کیا ہے جو ان رباعیوں میں نہیں ہے مایوسیوں اور غم زدوں کے لیے سامان خوش دلی اور خوش مزاجی بہم پہنچایا ہے۔ ان رباعیوں میں قہقہے مسکراہٹیں اور زیر لب تبسم سب کچھ موجود ہیں۔ دو رباعیوں سے آپ بھی دل بہلائیں۔

(۳۱۱)

پنہاریاں ہیں سر پہ لیے گنگا جل
جاتی ہیں چل کرتی ہوئی سب چھل بل
جنبش ہے گھڑوں میں اور نہ پانی میں ہلچل
ہر چند کہ بجلی کی طرح ہیں چنچل

(۳۱۷)

کب قاصد خوش خرام یار آیا ہے
کب پاس میرے پیام یار آیا ہے
ناصح تیرے لب پہ کروں جاں نثار
زیبا ہے کہ اس پہ نام یار آیا ہے

بہرکیف، رباعیات شہباز" شہباز کا معرکہ آرا شعری کارنامہ ہے۔ ان رباعیوں میں بے شمار موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ پند و نصائح اور اخلاقی تعلیم کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اردو شاعری میں اتنی رباعیاں کسی شاعر نے نہیں لکھی ہیں۔ شہباز پہلے شاعر ہیں جنھوں نے باضابطہ اس صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اور ایک مجموعۂ رباعیات اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

شہباز کی کچھ رباعیاں اتنی اعلیٰ درجہ کی ہیں کہ وہ شہباز کو عمر خیام کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں اور ہم ان کو صحیح معنوں میں عمر خیام ہند کہہ سکتے ہیں یہ رباعیاں شہباز کے نام نامی کو قائم و دائم رکھیں گی اور جب تک اردو زبان و ادب باقی ہے لوگ انھیں ذوق و شوق سے پڑھتے رہیں گے۔ اگر شہباز کچھ نہ لکھتے تو بھی ایک رباعی گو کی حیثیت سے وہ تاریخ ادب اردو میں زندہ جاوید رہنے کے مستحق تھے۔

مجموعۂ رباعیات شہباز" شہباز کی غیر فانی تصنیف ہے۔ اس لحاظ سے بھی شہباز اردو شاعری میں زندہ جاوید رہیں گے!

از اقبال بیگرامی ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر اردو)
... مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد (مہاراشٹر)

م۔ ع۔ باسط
فن اور شخصیت

جناب م، ع۔ باسط صاحب اُردو کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ آپ ۱؍ مارچ ۱۹۳۷ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ مرہٹواڑہ یونیورسٹی سے آپ نے بی۔ اے کیا۔ نیز جالنہ ملٹی پرپز ہائی اسکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں جناب م، ع باسط صاحب سے مجھے اکثر بات چیت کا موقع ملا۔ موصوف کا نقطۂ نظر اُردو کے عام ادیبوں سے ذرا ہٹ کر ہے آپ یہ چاہتے ہیں کہ اردو زبان نہ صرف ادبی زبان بنے بلکہ یہ ایک علمی زبان کی حیثیت سے بھی اُبھرے۔ ادب کے تعلق سے اردو زبان میں کافی اچھا مواد موجود ہے۔ نیز اس میں آگے دن ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن آج کل علمی میدان میں ذرا بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ باسط صاحب چاہتے ہیں کہ اردو زبان بھی ان سائنسی موضوعات سے مالا مال ہو جن سے آج کل علمی دنیا واقف ہے اس ضمن میں موصوف کے بہت ہی کارہائے نمایاں ہیں۔ آپ نے کئی سائنسی مضامین میں اردو کا ترجمہ کیا ہے اور یہ مضامین ملک کے مختلف کثیر الاشاعت اخبارات، ماہناموں وغیرہ میں شائع ہوتے رہے ہیں م۔ ع۔ باسط صاحب نے حال ہی میں ایک کتاب اُردو کی ترقی میں ہمارا حصہ" نامی شائع کی ہے۔ یہ کتاب ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی قیمت ۴ روپیہ ہے اس میں تیرہ مضامین ہیں جو حسب ذیل عنوانات پر مشتمل ہیں۔

۱۔ اُردو تعلیم کا مسئلہ ۲۔ کالجوں میں اُردو میڈیم (۳)۔ ہمارے تعلیمی تہذیبی اور لسانی حقوق (۴)۔ اردو تمام فرقوں کی زبان (۵)۔ ترجموں کی اہمیت اور ضرورت (۶)۔ نیا دور نئے تقاضے (۷)۔ سائنٹیفک نقطۂ (۸) یہ سائنس ہمارا آرٹ کی مسیحا۔ (۹) سائنس ماضی کی کھا

ہیں۔ (۱۰) سائنس آبِ حیات کی تلاش میں۔۔۔
(۱۱) سائنس کا ہمدرد ہماری معاون (۱۲)۔ سائنس مجرموں کی کھوج ۔ (۱۳) اُردو کی ترقی و بقا کے لیے ہم کیا کریں۔

اس کتاب کا انتساب م، ع۔ باسط صاحب نے اُردو کے نام حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

بھارت کی سب سے زیادہ بولی جانے والی لیکن سب سے بدنصیب اور مظلوم ترین زبان اُردو کے نام"

اردو تعلیم کا مسئلہ اس عنوان کے تحت م۔ ع۔ باسط نے ٹھوس اور مدلل بحث کی ہے اور اردو کے قدردانوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو ذریعہ تعلیم کی جماعتیں ایسے مقامات پر کھول جائیں جہاں ایک خاص تعداد اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والوں کی موجود ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان اردو دشمن عناصر پر بھی کڑی نظر رکھی جائے جو اردو کلاس کھلتے ہی اسکو بند کرانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی موصوف نے ٹھوس بحث کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو میں تعلیم پانے کے بعد معاشی مسائل کس طرح سے حل ہو سکتے ہیں اس کے جواز میں موصوف نے یہ لکھا ہے کہ اُردو میڈیم کے طلباء کو ریاست کی سرکاری زبان بھی دوم کمپلسری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور پھر جب طالب علم زبان دوم کی حیثیت سے ریاست کی سرکاری زبان پڑھتا ہے تو اسے ملازمت نہ ملنا کوئی معنی ہی نہیں۔ اس طرح مصنف نے اس خوف و ہراس کو سرپرستوں کے دلوں سے ہٹانے کی کوشش کی ہے جس سے سرپرست آئے دن دوچار رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ موصوف نے چند ٹھوس اقدامات کی طرف بھی محبان اُردو کو متوجہ کیا ہے۔ مثلاً محاؤں تعلقہ اور ضلع کی سطح پر اُردو تعلیمی کمیٹیاں بنانا اور جہاں جہاں اُردو مادری زبان والے افراد مناسب تعداد میں ہیں وہاں اردو میڈیم کی کلاسیں قائم کروانا اور اس بات کی نگرانی کرنا کہ اُردو دشمن عناصر کلاسوں کو بند کروانے کی چالوں میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔

دوسرے مضمون کالجوں میں اُردو میڈیم کے عنوان کے تحت مصنف نے بہت ہی پر زور طریقہ سے اپیل کی ہے کہ ان محبان اُردو اور ارباب حل و عقد کو جو اُردو زبان کے بہی خواہ ہیں چاہیئے کہ اپنی متعلقہ یونیورسٹیوں سے، درخواست کریں کہ ان کو کالج کی سطح پر بھی اردو میڈیم میں تعلیم دینے کا حق دیا جائے اس کے جواز میں باسط صاحب نے ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جو پنجاب یونی ورسٹی اور ڈی۔ اے۔ او کالج بھٹنڈہ کے درمیان سپریم کورٹ میں چلا تھا اور جس میں بھٹنڈہ کالج کو جوار ساجیوں کی طرف سے چلایا جاتا ہے کامیابی حاصل ہوئی اور انھیں یہ حق ملا کہ وہ ریاستی سرکاری زبان میں پنجابی کے بجائے اپنی مادری زبان میں کالجوں کی سطح پر بھی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اگر اُردو کے بہی خواہ بھی اس طرح اپنی متعلقہ یونیورسٹیوں سے یہ مانگ کریں تو کالجوں میں اُردو میڈیم مل سکتا ہے

تیسرے مضمون " ہمارے تعلیمی مذہبی اور لسانی حقوق " میں م۔ ع۔ باسط صاحب نے دستور ہند کی دفعہ ۲۹،

پیش نظر رکھتے ہوئے بڑی مدلل بحث کی ہے۔ موصوف
نے اپنی اس بحث کا نچوڑ مضمون کے آخری پیراگراف
میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

اگر اردو داں اقلیت بے علمی اور احساس
کمتری کے جال سے (جسے اس نے اپنے اطراف بن لیا
ہے) خود کو آزاد کرے اور دستور میں عطا کردہ حقوق
سے پورا پورا استفادہ حاصل کرنے کیلئے میدان عمل میں
قدم رکھے تو وہ پھر امن طریقہ سے اپنی زبان رسم الخط اور
تہذیب کی نہ صرف حفاظت کر سکے گی بلکہ انھیں ترقی بھی
دے سکے گی اس سلسلہ میں ہماری جمہوری اور سیکولر ...
حکومت اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے گی۔"

چوتھا مضمون "اردو تمام فرقوں کی زبان ہے" اس
عنوان کے تحت مصنف نے اس تاریخی حقیقت کا اظہار
کیا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ غیر مسلموں
کی بھی زبان ہے۔ اس تعلق سے مصنف نے کئی مثالیں
دی ہیں۔ اور اردو کے ان غیر مسلم ادیبوں کے نام گنوائے
ہیں جنھوں نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا ہے اور سینچ
رہے ہیں اس ضمن میں باسط صاحب ایک مشورہ یہ بھی دیتے
ہیں کہ اردو کے متعلق جو غلط فہمیاں چند شر پسند اور
متعصب ذہنوں نے پھیلائی ہیں ان کا تدارک کیا جائے
اس کے لیے اس زبان وادب کے کارہائے نمایاں کا
ذکر جو اس زبان نے ہندوستان کی آزادی کے قبل
سے لیکر آج تک انجام دیئے ہیں دوسری زبانوں میں
مضامین لکھ کر کیا جانا چاہیے تاکہ دوسری زبانوں کے
صاحب نظر لوگ بھی سمجھ سکیں کہ اردو نے بھی ملک کی
تعمیر میں اہم رول ادا کیا ہے۔ موصوف اس بات
کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ دوسری زبانوں کے
رسائل و جرائد کے ایڈیٹر صاحبان کی کانفرنس بلائی
جائے اسمیں ان کے سامنے اردو کے صحیح موقف کو رکھا
جائے اور ان سے پرزور اپیل کی جائے کہ اردو کے
تعلق سے ملک میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں انھیں
وہ اپنے رسائل و جرائد میں مضامین اور اداریے وغیرہ
لکھ کر دور کریں۔ اس سے اردو کے متعلق کئے گئے بے بنیاد
پروپیگنڈہ کا ازالہ ہوگا اور غیر اردو داں حضرات کو بھی
اردو سے ہمدردی ہوگی۔

پانچواں مضمون ترجموں کی اہمیت اور ضرورت عنوان
کے تحت لکھا گیا ہے اس مضمون کے شروع میں ہی باسط
صاحب لکھتے ہیں "دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ
زبان انگریزی کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ
اس کے ارتقا میں ترجموں کا بہت بڑا دخل ہے اگر یہ
کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یورپ کی مختلف زبانوں
سے کئے گئے شاہکاروں کے تراجم نے ہی انگریزی زبان
وادب کے قصر عظیم کی بنیاد رکھی"۔ اس مضمون میں باسط صاحب
نے اردو میں ترجمے کے کام کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس
ضمن میں انھوں نے ملک کی دو نامور یونیورسٹیوں ۔۔
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد میں انجام دیئے گئے ہیں کام کا ذکر کیا ہے۔
اگر یہ کہا جائے کہ تو بیجا نہ ہوگا کہ جامعہ عثمانیہ کے
دارالترجمہ کا کام اردو زبان پر ایک احسان عظیم ہے۔
اس ادارے نے اردو زبان میں مختلف علوم پر ایسی ایسی

نایاب کتابوں کا ترجمہ کر کے شائع کیا ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انہی ادارہ کی وجہ سے عثمانیہ یونیورسٹی اس قابل ہوئی کہ نہ صرف آرٹس بلکہ سائنس میں بھی کالج اور یونیورسٹی سطح پر تعلیم کا انتظام اُردو زبان میں کر سکے۔ فنی علوم جیسے میڈیشن (ایم بی بی ایس) اور انجینیرنگ (بی۔ ای) وغیرہ کی تعلیم کا انتظام بھی اُردو میں کیا گیا اور یہ تجربہ انتہائی کامیاب رہا ہے اس کامیاب رہا ہے اس کامیابی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اُردو میں معیاری کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ فراہم کی گئیں۔ یہ کتابیں نہ ہوتیں تو یہ تجربہ ناکام ہو جاتا لیکن یہ کام اب مفقود ہو گیا ہے اس کام کو پھر سے فروغ حاصل ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں م۔ ع۔ باسط صاحب قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے اس کام کا بیڑہ اُٹھایا ہے اور ترجموں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے آپ نے کئی مضامین انگریزی سے ترجمہ کئے ہیں۔ موصوف نے ترجمہ کی اہمیت پر بھی بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اور اپنے مضمون میں یہ صراحت کی ہے کہ ایک اچھے ترجمہ نگار کے لیے دو زبانوں کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ دونوں زبانوں پر مساوی قدرت رکھنا بھی لازمی ہے ترجمہ نگار کے کام کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں" ایسے اظہار خیالات کے نئے اسالیب وضع کرنے پڑتے ہیں اس طرح ترجمہ نگار اپنی زبان میں نئے خیالات اور نئے مواد کا اضافہ اور نئی تراکیب اور نئی اصطلاحات وضع کرنے کی گرانقدر خدمات انجام دیتا ہے اور اپنی زبان کے خزانوں کو مالا مال کرتا ہے"۔ اس کے ساتھ ہی موصوف نے ایڈیٹر حضرات کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کی ہے کہ وہ ترجمہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی اپیل کی ہے کہ ایڈیٹر حضرات مختلف علمی موضوعات پر ترجمہ کردہ مضامین کو اپنے رسائل و جرائد میں نمایاں جگہ دیں اور ترجمہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کریں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو کچھ دنوں کے بعد اُردو صرف ادبی زبان رہ جائے گی اس سے لفظ علم خارج ہو جائے گا کسی زبان کے زندہ رہنے کے لیے اس زبان میں علمی سرمایہ بھی وافر مقدار میں ہونا چاہیے۔ ترجمہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے اُردو زبان میں نئی نئی اصطلاحات اور نئی نئی ترکیبیں وضع ہوں گی جس سے اُردو زبان کے سرمایہ میں اضافہ ہوگا۔ چھٹے مضمون نیا دور نئے تقاضے اور ساتویں مضمون سائنٹیفک نقطۂ نظر میں م۔ ع۔ باسط صاحب نے اردو میں علمی اور سائنسی مضامین کی ضرورت اور افادیت سے بحث کی ہے انھوں نے یہ بات کھل کر واضح کر دی ہے کہ ان مضامین کی اہمیت اور ضرورت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا — انھوں نے ایڈیٹر حضرات سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے رسائل و جرائد میں ایسے مضامین کے لیے صفحات محفوظ کریں اور ایسے مضمون نگاروں کو اور ترجمہ نگاروں کو بھی وہی مقام دیں جو ایک ادیب اور شاعر کو دیا جاتا ہے باقی چھ مضامین سائنسی موضوعات پر ہیں جو بہت ہی خوب ہیں اور بڑی عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں ان مضامین میں

م ۔ ع ۔ باسط صاحب نے ترجمے کی اعلیٰ قدروں کا لحاظ رکھا ہے یہ مضامین صرف لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ زبان کی روح اور مترادفات Sense and Spirit کے ساتھ ترجمہ کئے گئے ہیں میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نے وہ انگریزی مضامین بھی دیکھے ہیں جن سے باسط صاحب نے یہ مضامین ترجمہ کئے ہیں موصوف نے بہت ہی دقیق مضامین کا انتہائی کامیابی سے ترجمہ کیا ہے ان ترجموں میں روز مرہ محاورہ اصطلاحات اور زبان و بیان کی شیرینی ہر جگہ رواں دواں ہے۔ انھوں نے مضمون سائنس بیمار آرٹ کی مسیحا میں یہ بتایا ہے کہ فنون لطیفہ پر سائنس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ سائنس ماضی کی کھوج میں یہ بتایا ہے کہ تاریخی تحقیقات سائنس سے کس طرح متاثر ہو رہی ہیں اور سائنس ان تحقیقات میں کس طرح مدد و معاون ثابت ہو رہا ہے سائنس کا مداری معاون میں یہ بتایا ہے کہ عام انسانی زندگی اور روزمرہ کے کاروبار پر سائنس کس طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ اور سائنس مجرموں کی کھوج میں یہ بتایا ہے کہ تفتیش جرائم میں سائنس کتنا اہم رول ادا کر رہی ہے غرض کہ ان تمام سائنسی مضامین کو شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین انسانی زندگی پر سائنس کے اثرات سے کما حقہ واقف ہو جائیں اور اس حقیقت کا بخوبی ادراک کرلیں کہ اردو کی بقا اور ترقی کے لیے اس میں سائنسی موضوعات پر مضامین کا اضافہ کس قدر ناگزیر ہے۔ مجموعی اعتبار سے کتاب انتہائی خلوص دل اور اردو سے والہانہ محبت کے جذبہ کے تحت لکھی گئی ہے

اس کتاب کے لکھنے میں م ۔ ع ۔ باسط صاحب نے اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کی ہیں اور انتہائی عرق ریزی سے اردو کے مختلف مسائل پر اظہار خیال کرکے ان کے سلسلہ میں مفید اور قابل عمل تجاویز پیش کی ہیں جس کے لیے م ۔ ع ۔ باسط قابل مبارکباد ہیں انہیں قابل تعریف بھی ہیں۔

فکری سلطانپوری

طرحی غزل اور یک قافیہ نظم

اقبال لائبریری میں علامہ اقبال کے سہ روزہ صد سالہ جشن کی ایک غزل ملاحظہ ہو بیشتر غزلوں میں ایک یا دو شعر ہوتے ہیں لیکن اس ستہ غزلہ میں برابر کے اشعار ۸۸ ہیں جنمیں چودہ مطلعے ہیں مثنوی یا قصیدے کے پچاس ساٹھ اشعار کہہ لینا آسان ہے لیکن یک قافیہ اس قدر طویل و ہم پلہ غزل از روئے مثال نہ پیش کی جا سکے گی۔

ایک رنگ کا مضمون بصد رنگ نظر ہے

اس کے علاوہ "سحر یہ دو غزلے" میں بھارت کے چہرے کی ہمہ تغزل نقاب کشائی ہے "گیسو و رخ" سے طلعت بنارس و زلف بنگال کے ابر آلود چاند کی منظر کشی دیکھئے اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی زاویہ نظر سے "مومن* کی اذان" کا عالم بھی کیا ہے جو اس غزل میں نہیں ہے؟ رجائی فلسفہ بھی پیش نظر ہے۔

جمیل اختر نعمانی

(رکن ادارۂ سیاست جدید کانپور)

"مدعائے شاعر"

مجدد ثانی الف رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں لہ

گسستن (یعنی ہجر) عین اسلام عین اسلام اور پیوستن (یعنی وصل) رہبانیت ہے اس لئے میں ہجر کے مضامین "یوں نہیں لکھتا ؎

وصل سے شاد کیا، ہجر سے ناشاد کیا"

میں غزل گو نہیں ایک قطعہ نگار شاعر ہوں مگر آج دریائے تغزل میں بھی ٹھہراؤ آئے گا۔　قطعہ

"شاداب نگاہی"

ٹھہر جا اے کیفِ [illegible] تغزل ٹھہر جا
تجھ میں دو ٹھاد میں ذرا موج نگاہ یا ہم

یوں تو فکری! ہم غزل کہنے لگے عادی نہیں
جب کہیئے تو کھلا دیئے گل و گلزار" ہم

خونِ دل، بزنگ بیدل ہے اس لیے یہ حقیر ہدیۂ ناچیز
فارسی کے قدیم شاعر عبدالقادر بیدل پٹنہ (بہار)
سے معنون و منسوب کرتا ہوں قطعہ

"عرش فکری فرش بیدل ہے"

اُٹھی تو سرِ عرش بریں جھوم کے اُٹھی
ہستی کی فنا سے بھی، بقا گھوم کے اُٹھی
بندش وہ اچھوتی ہے کہ بلبے قید ہے پرواز
بیدل کا قدم، میری غزل چوم کے اُٹھی

فکری سلطانپوری کان اللہ لہ

غزل بیک قافیۂ نظر

شکوہ ہے عبث جلوہ گہ شعبدہ گر سے
ہم اپنے کو دیتے ہیں فریب اپنی نظر سے

کمتر نہیں جلوہ جو ترا برق و شرر سے
وہ بچ کے کہاں جائیگا آغوش نظر سے

میں راہ محبت میں گزرتا ہوں جدھر سے
اُٹھتی ہے تو جلتے ہیں چراغ آج نظر سے

جلوہ ہے عیاں پردۂ محمل برق و شرر سے
آتے ہیں نظر اور حجابات نظر سے

آج اُن کے بھی دامن میں لگی اور اُدھر سے
کچھ ایسی اُٹھی آگ، مرے سوزِ نظر سے

فکری! شب انجم ہے مرے دیدۂ تر سے
خورشید جہاں تاب ہے رحمت کی نظر سے

ناگن ہے غضب زلف مسلسل ہے کمر سے
آئے تو اٹھائے ہوئے شمشیرِ نظر سے

نالاں ہیں وہ اس بے اثری پر بھی اثر سے
ملتی نہیں اب اُن کی نظر، میری نظر سے

کہتے ہیں وہی جسکو وہ خود کہہ نہیں سکتے
انکار زباں سے ہے تو اقرار نظر سے

پھونکا تھا جہاں حسن نے کل طورِ محبت
ہم برق وہاں آج گرا دیں گے نظر سے

صد شکر کہ تیرِ غضب پر ہیں دل و جاں
کیا حال ہو دیکھیں جو محبت کی نظر سے

آنکھوں میں سماتے ہی انہیں حسن کے جلوے
شرمندہ ہوں کوتاہیٔ داماں نظر سے

اظہار محبت کا عجب حسن بیاں ہے
الفاظ زباں سے تو معانی ہیں نظر سے

محفل میں سُنا سب نے اُسے آنکھ سے دیکھا
خاموش وہ چرچا جو ہوا آج نظر سے

کانوں سے فرشتہ بھی جسے سن نہیں سکتے
وہ نغمۂ الہام میں سنتا ہوں نظر سے

کچھ حسن کا انداز قیامت بھی لئے تھا
وہ فتنۂ محشر جو اٹھا حسنِ نظر سے

رنگین نظر آتا ہے ہر اک جلوۂ سادہ
فتنہ ہے ہر اک حسن مرے رنگِ نظر سے

ہے چہرۂ جاناں پہ وہی موجِ تجلی
طوفانِ تمنا جو اُٹھا میری نظر سے

خلوت میں زباں سے بھی جو کچھ کہہ نہیں سکتے
محفل میں وہ دیتے ہیں جوابات نظر سے

تڑپا گئی آج اک نگہِ یاس اُنھیں بھی
دب کر نہ رہی میری نظر اُن کی نظر سے ۰

اب میری طرف بزم میں دیکھا نہیں جاتا
سو بار جھکی اُن کی نظر، میری نظر سے

کیا رازِ محبت سے چھپاؤ تو عیاں ہے
اُٹھ جاتا ہے پردہ تری جھکتی سی نظر سے

دلمیں ہے خیال اُن کا، رگِ جاں میں خود ہیں
ہم صرف نظر آتے ہیں پابند نظر سے"

وہ اُن کا تصور جو مرے دلمیں نہاں ہے
کیا اُسکو بھی باندھیگی خرد تارِ نظر سے

محشر میں قیامت سرِ محشر نظر آئی
فتنہ وہ اٹھا میری ندامت کی نظر سے

الفاظ، زباں زد تو معانی ہیں "نظر زد"
پابند مشیت کی شریعت ہے نظر سے

پیمانہ فروزاں ہے تو میخانہ چراغاں
لو ایسی اٹھی تندیٔ صہبائے نظر سے

ہے حسنِ دو عالم بھی ہیں تشنہ نگاہی
جلوہ سے نظر ہے کہ ہے خود جلوہ نظر سے

دیکھا ہے ترے حسن کا ہر جلوہ پنہاں
اور عشق دکھائی نہیں ہے نظر سے

ہے عشق مرا حسن، ترا حسن نہیں عشق
آئینہ نگر! حسن ہے جلوے کا نظر سے

یہ حسن "نظر افروز" نہیں عشق کا احساس
ہے حسن کا احساس "اُٹھیں میری نظر سے

احساس نظر سے ہے ترے حسن کا جلوہ
اور اک نظر ہے میری بردازِ نظر سے

یہ فلسفہ عشق ہے احساس بہ ادراک
آغازِ محبت تو ہے انجام نظر سے

وہ اصل حقیقت ہے تو یہ حسن حقیقت
آئینہ پسِ جلوہ ہے آئینہ نظر سے

دیکھا نہیں جاتا تھا وہ منظرِ دمِ رخصت
پہنچا کے بھی پلٹی ہے نظر، حدِ نظر سے

ہے "جنبش یا" جبکی مرے قتل کا ساماں[1]
شمشیر اُٹھالے تو جھکا دینگے نظر سے

جلوے[2] کی ترے پشت ہے آئینہ کہاں اب
رخ میری طرف ہے مرے زنگارِ نظر سے

وہ جذبِ دروں ہے کہ نظر بنگئی جلوہ
اب تو نظر آتے ہیں مجھے خود وہ نظر سے"

حائل[3] نہیں ہوتی ہے یہ تفریقِ دو عالم
ملتی ہے جواب اُن کی نظر، میری نظر سے

جلوہ تو بصد ذوقِ نگہ دل میں نہاں ہے
جلوہ پہ جو پردہ ہے تو پردہ ہے نظر سے

ٹکرا کے تو اصل نظری دیکھ لے تو بھی
پیمانہ چھلک جائیگا "ظرفِ نظر" سے

---

[1] دخترِ قصاب سے یہ جلادی عشق نہیں۔ (فکری)

[2] آئینے میں پشت دکھائی نہیں دیتی اور آئینہ وجودِ ہر دو عالم میں خالق رو نمائے خلق نہیں۔

[3] دونوں جہاں کے علاوہ جو میری نظر کا عالم ہوتا ہے وہ بھی از کہ نظر کا بھی تفریقِ "دو عالم" نہیں ہوتی۔

یہ گوشۂ پنہاں مگر دل کے لیے ہے
ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں حسن نظر سے

دیکھا نہ گیا حسن کے جلوہ کا تماشہ
دیکھا ہے تماشائے دو عالم بھی نظر سے

دیکھا نہیں جاتا ہے جو دیکھوں بھی تجھے میں
آتا ہے مجھے رشک خود اپنی ہی نظر سے

جلوہ سر آئینہ تو جلوے پہ نظر ہے
ہے حسن "تہہ ذوق نظر" رونما نظر ہے

وہ ذوق نظر پست، فراز نظری ہے
بالا ہے مری "حد نظر" اوج نظر ہے

مطلق بھی ہو ہستی تو مقید نظر آئے
ہے حسن تہہ ذوق نظر" اوج نظر سے

یہ دیکھ لیا ہے کہ دکھائی نہیں دیتے
اک بام نظر اور بھی بالا ہے نظر سے

وہ جلوہ نگاہی ہیں کہ جلوہ بہ جلوہ
دیکھا بھی نہیں ہم نے کبھی ان کو نظر سے

تم نے سر جلوہ نہیں دیکھا ہے نظر کو [۱]
ہم نے پس پردہ تمھیں دیکھا ہے نظر سے

لیلائے شب ہجر مری، صبح ازل ہے
صورت ہی بدل جاتی ہے تصویر نظر سے

ہے چاند سی صورت کا تصور جو نظر میں
شرمندہ شب ہجر ہے انوار نظر سے

وہ آگ ہے تن میں کہ مرا من بھی جلے گا
ہے معجزۂ سوز نفس، ساز نظر سے

سادہ ہے اگر آئینہ حسن و محبت
رنگیں ہے مرا خون جگر رنگ نظر سے

جھپکے بھی تو اک جنبش بیجا کا ہے شکوہ
نظارے کو مژگاں سے تو مژگاں کو نظر سے

ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا زمانہ سر مرکز
دنیا یہ پلٹ جاتی ہے آہنگ نظر سے

اسلام حیات اور حیات عین عمل" ہے
تقدیر ٹھہرتی نہیں تدبیر نظر" سے

اسلام ہے "فطرت" تو محبت دل سوزاں
یہ رشتۂ تسبیح ہے زنار نظر سے

ہر شے میں مجھے جلوہ وحدت نظر آتا
دنیا ہے کہ اک آئینہ خانہ ہے نظر سے

یہ جلوہ وحدت ہے یہ توحید نظر دیکھ
طوفاں یہ "نظر بند" ہے "طوفان نظر سے

میں اپنی زباں سے تو انا الحق نہ کہوں گا
"فطرت" جو ہے پابند مرے "بند نظر" سے

جو دل میں ہے کہہ دوں تو لگے آگ زباں میں
کرتا ہوں اگر ضبط تو لگتی ہے نظر سے

یہ جانب قبلہ جو گھٹا آج اٹھی ہے [۲]
اٹھا ہے مرا دور نظر، سوز نظر سے

[۱] انھیں بھی پس پردہ اور خود بھی پس پردہ نظر دیکھا ہے میں نے "میں نے جلوہ" دیکھا ہے تو کسی نے "پردہ" نہیں دیکھا ہے (فکر تی)

[۲] شعرائے عجم، قرمطیت کا الحادی جام اسی وقت اٹھاتے ہیں جب "قبلے کی طرف سے" گھٹا اٹھتی ہے جہاں عمل اسلام کے برخلاف، قرابت قرملی تحریک کا "ترک عمل" اگر قطب نما نہیں تو بقیہ سمت رخی گھٹائیں بادہ نوشی کی محرک کیوں نہیں ہوتیں؟

م نگۂ غور سے آئینہ نہ دیکھو
ب جائے نظر تم کو نہ اپنی ہی نظر سے
آئینہ چھپا لیتا ہے سب حسن کے انداز
تم اپنے کو تو دیکھو تو کبھی میری نظر سے

ہ کو بھی سنا دو یہ غزل میری غزل ہے
ئینہ دکھا دو مجھے تم اپنی نظر سے
آئینہ دکھا آئی ہے تاروں کو میری فکر
ذرّوں کو بھی دیکھا ہے تو خورشید نظر سے

ہبائے "نظر خیز" ہے یہ "فکر غزل خیز"
یانہ بعد برق ہے امواج نظر سے
تنقید بعد فکر ہے تنقیص زبانی
تحسین نقط ترم و معانی ہے نظر سے
م دست دعا اٹھا اٹھائیں ترے آگے
م "باب اجابت" ہی اٹھا لینگے نظر سے
اٹھے تو نہ کہیں سنگ در یا سے اُٹھے
سجدے میں جھکا سر کہ گری برق نظر سے
"فکری مری سند" ہے کہ ہے تکیہ گہہ عرش
طرہ بہ سر فرق ہے "دستار نظر" سے

بیک قافیہ سحر (یعنی ۲ دو غزلہ)

رُخ ہند کا وابستہ ہے گیسو بہ کمر سے
ہنگامۂ شب دیکھ بنارس کی سحر سے

فطرت لبِ گویا میں "سنتا ہوں نظر سے"
مومن نے اذاں دی کہ ملا آئی سحر سے
روشن جو شبِ ہجر ہے انوارِ نظر سے
اب شام بھی ہوتی ہے تو ہوتی ہے سحر سے
ہے پردہ دری اور لیپا پردۂ در سے
جلوہ نظر آتا ہے ترا "روئے سحر" سے
یہ اشک جو ہیں جاذب خورشید محبت
شام شب فرقت بھی فزوں تر ہے سحر سے
آنکھوں کے ستاروں سے شب ہجر کے تارے
دامن کو ملا دیتے ہیں' داماں سحر سے
وہ مشرق خورشید تصور ہے نظر میں
کمتر نہیں شام شب فرقت بھی سحر سے

بہ قوافیِ دگر (یعنی ۳ سہ غزلہ)

یوں بھی ہو کبھی گردش گردوں کے اثر سے
میں جاؤں ادھر سے تو وہ آتے ہوں ادھر سے
نسبت نہیں داغوں کو مرے دل سے جگر سے
گل نخل محبت میں زیادہ ہیں ثمر سے
ہے سوزِ غم عشق بھی اک اُن کی ودیعت
یہ آگ لگی' نام خدا' اور اُدھر سے
تاروں کی جگمگ کا یہ عالم ہے کہ جیسے
یہ نقش قدم ہیں کوئی گذرا ہے ادھر سے
باتوں میں بھی دیکھا ہے سر راہِ تغزل
آئے ہیں کہاں سے ہمیں جانا ہے کدھر سے

نہ شعر انتہائی بلند معیارِ نظر ہے (فکری)

جاؤنگا میں اک موجِ تمنا کے سہارے
لے جائیگا سیلاب غمِ عشق جدھر ہے
وہ موجِ نسیمِ سحری میں ہے لطافت
جیسے کوئی گزرا ابھی اسی راہگذر سے

اسلام بہ تعمیرِ جہاں سازِ عمل ہے
تقدیر پلٹ جاتی ہے تدبیرِ بشر سے
فکری! مجھے بڑا اس آئیگا خاموش ہی رہنا
شرمندہ ہوں میں اپنے ہی اعجازِ ہنر سے

ذکی کاکوروی

تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

نام کتاب : چند تحقیقی مقالے — سائز : ۲۲ × ۱۸ — صفحات ۹۶
مصنف : پروفیسر سید حسن — پتہ : کتاب خانہ ، بانکی پور ۔ پٹنہ

یہ مختصر کتابچہ پروفیسر سید حسن صاحب کے سات عدد تحقیقی مقالوں کا مجموعہ ہے۔ ان مقالوں کے عنوانات ہیں۔ لکھنؤ سوا سو برس پہلے، لکھنؤ کے چند نامور شعرا، آتش سے نجات حسین کی ملاقات ، نالۂ عشاق ، بہار کا ایک گمنام مصنف کرشن کھگتی کی روایت ۔ الیغ بانکی پور کا پہلا سال ۔

یہ مضامین مختصر ہونے کے باوجود تحقیق و تلاش سے لکھے گئے ہیں اور مطالعہ کی چیزیں ہیں۔

غیر مجلد ، کتابت ، طباعت اور کاغذ اوسط درجہ کا ہے ۔

نام : روزمرہ و محاورہ غالب — مولف : پریم پال اشک
سائز : ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۲۰ — قیمت : چھ روپے
پتہ :۔ قصر اُردو ، اُردو بازار ، دہلی ۶

مولف نے اس تالیف میں دیوان غالب ، قادر نامہ ، اُردوئے معلیٰ ، عودِ ہندی وغیرہ سے غالب کے استعمال کردہ مختلف محاورات اور روزمرہ کو تلاش کرکے غالب کے کلام اور معنی کے ساتھ درج کیا ہے ترتیب میں حروف تہجی کے بجائے ماخذ کتاب کا رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے کسی محاورہ یا روزمرہ کو ڈھونڈنے میں بیشتر اوراق پلٹنے پڑتے ہیں ۔ اس میں شک نہیں کہ مولف نے تلاش و جستجو میں محنت سے کام لیا ہے مگر بہت سے محاورات اور روزمرہ کا انتخاب اور ان کے معنی محل نظر ہیں نیز یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انتخاب و ترتیب میں دقت نظر سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کی وجہ سے غالب کے استعمال کردہ بہت سے محاورے اور روزمرہ جن کا استعمال غالب کے کلام میں ایک خاص لطف رکھتا ہے اس تالیف میں نظر نہیں آتے ۔ زیادہ اچھا ہوتا اگر فاضل مولف غالب کے کلام میں ان تراکیب و الفاظ کو تلاش کرتے جنکو غالب نے پہلی بار کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے ۔

کتابت ، طباعت اور کاغذ اوسط درجے کا ہے ۔

سید شہاب الدین دیسنوی
سے ایک ملاقات

(جلیل بازید پوری بی اے آنرز)

آج کے طالب علم تہذیب سے کوسوں دُور کیوں ہیں ؟ یہ سوال میرے ذہن کے ایک گوشہ میں برسوں سے دھیمی دھیمی آنچ پر پک رہا تھا اور اُس کی تپش میں شدت سے محسوس کر رہا تھا اچانک میری نظروں کے سامنے ایک ایسی پیاری اور نکھری ہوئی شخصیت کی تصویر ابھری جنھوں نے اپنے آپ کو غوطہ زن کر دیا ہے .... انسانی چلتے پھرتے پتھروں کو تراشنے میں منہمک ہیں وہ بذات خود ایک بہترین اسکول ہیں جن کی صلاحیتوں سے دلیپ کمار جیسی شہرہ آفاق ہستی کے ذہنی سوتے چھلک پڑے شاید سکندر اعظم نے ان کے بارے میں کہا تھا "میرا باپ میرا استاد ہے باپ نے تو مجھے پیدا کیا ہے لیکن استاد نے مجھے آدمی بنایا ہے؟

آج ملک کو قوم کو اور انسانیت کو ایسے روحانی باپ کی ضرورت ہے جو بچوں کو قوم کا معمار بنا سکیں اسی دلچسپی نے مجھے قوم کے معمار بنانے والے سے انٹر ویو لینے پر مجبور کر دیا انھوں نے فوراً حامی بھر دی اور میں نے رنگا رنگ علمی سوالات کے پھول اُن کے سامنے بکھیر دیئے اور اُن سے کہا کہ "بتایئے یہ پھول کیسے ہیں ؟"

س : کیا ادبی رجحان آپ کو ورثہ میں ملا ہے ؟

جواب : میں نے ورثہ سے زیادہ اپنے وطن کے ماحول سے ادب کا شوق پایا جہاں میں نے ہوش سنبھالا وہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا دیسنہ جو ضلع پٹنہ میں ہے اور صوبہ بہار میں لیکن تعلیم اور ادبی ذوق کی روایت کے لحاظ سے اس کا مقام بلند تھا۔

س : کیا ادیب کے لیے سند ضروری ہے ؟

جواب : ادیب کے لیے سند ضروری تو نہیں لیکن زبان اور ادب کے مطالعہ کے لیے زبان کو جو ڈسپلن درکار ہوتا ہے اس کے لیے باقاعدہ خاص ضابطے کے ماتحت

تعلیم کا حاصل کرنا بیحد مفید ہے کام بہ طور خود بھی
کیا جا سکتا ہے مگر مشکل حالتوں میں
س: آپ نے پہلی تخلیق کس طرح جنم دی اور اُس
کا عنوان کیا تھا اُس تخلیق کے جنم دینے کی تحریک
آپ کے ذہن میں کیسے پیدا ہوئی ہے۔
جواب: میری اولین تخلیق تو وہ مضمون تھا جو بچوں
کے رسالہ "پھول" لاہور میں شامل ہوا تھا اس کا
محرک مقابلے کا وہ جذبہ تھا جو اس عمر کے بچوں
میں ہوا کرتا ہے (اُس وقت شاید میں تیرہ برس کا
تھا) اس کے بعد کی تخلیقات کے محرکات مختلف اوقات
میں بدلتے رہے لیکن ان سب میں جو قدر مشترک تھی
اسے میں بہتر الفاظ نہ ملنے پر "خود نمائی" کہہ سکتا
ہوں۔
س: آپ کی معرکہ آرا تخلیقات کیا ہیں اور اُن تخلیقات
کے نفسیاتی پس منظر کیا ہیں؟۔
جواب: میں اپنی بہت کم تخلیقات سے مطمئن رہا
ہوں اور اُن میں سے کوئی بھی معرکہ آلارا کہلانے کے
لائق ہرگز نہیں۔
س: آپ نے خود کو تعلیمی شعبہ ہی میں کیوں غرق کر
دیا جب کہ ہر ادیب کی آنکھیں فلمی دنیا کی چمک دمک
سے چندھیائی ہوئی ہیں؟
جواب: تعلیمی شعبہ میں ہوا داخل ہونا نہ تو اتفاقی
امر تھا نہ غالب کے اس شعر کا مصداق ؎

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

میں نے اس پیشہ میں عزت اور شرافت سے زندگی
گزارنے کا طریقہ دیکھا ادبی اور ثقافتی زندگی کے
مواقع دیکھے تخلیقی صلاحیتوں کے اُبھرنے کے خیالات
پائے اور قوم اور ملک کی خدمت میں مجھے اپنی فلاح
اور نجات کی صورت نظر آئی۔ میں نے اپنے بچپن میں
لوگوں کو قوم اور ملت کی خاطر قربانیاں دیتے ہوئے
دیکھا تھا اور اُن سے اثر قبول کیا تھا۔
س: آپ کے خیال میں ادیب کون ہے؟۔
جواب: ادیب وہ ہے جو اپنے دماغ اور قلم کی
ساری قوتوں سے کام لیکر سماج کی بیماریوں کی
تشخیص بھی کرے اور اپنے خیال اور فکر کے مطابق
ان کا علاج بھی پیش کرے۔
س: آج سماج ملک قوم کو کیسے ادب کی ضرورت
ہے اور کیوں؟
جواب: آج سے اگر مُراد صرف ہمارے پیش نظر حال
کا ہے تو اس وقت سب سے اہم خدمت جو ادیب
انجام دے سکتا ہے یہ ہے کہ ایک طرف وہ ریاکاری
فریب مکر کا پردہ چاک کرے چاہے وہ سیاست
میں سماج میں ہو یا مذہب کے کسی معاملہ دوسری
طرف وہ انسان کے دم توڑتے ہوئے اخلاق کو سنبھالا
دے اُسے دوبارہ زندگی بخشے۔
س: آپ کس ادیب سے متاثر ہیں اور کیوں؟
جواب: چوں کہ میں نے کسی ادیب کو اپنا امام نہیں
بنایا اس لیے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔
مختلف صنف میں مختلف مصنفین متاثر کرتے رہے

کوئی زبان سے کوئی اپنے مواد سے۔

س: دورِ حاضرہ کے آپ کن ادیبوں کو پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

جواب: اس دور میں بڑے اچھے اچھے ادیب ہیں جن کی انفرادی خوبیاں ہیں ان سبھوں کی فہرست طویل بھی ہو جائے گی اور شاید نامکمل بھی رہ جائے اس لیے گریز کرتا ہوں۔

س: جدید افسانوں اور جدید شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔؟

جواب: ہمارے یہاں ابھی تک جدیدیت کے علم برداروں نے اپنے مسلک کو پوری طرح واضح نہیں کیا ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اب تک غیر ملکی حالات اور غیر ملکی تصورات کا سہارا لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک شخص جو بھوکا ہو بھی رہ سکتا ہے کہ اس کے سامنے کھانے کو کچھ نہ ہو اور دوسرا شخص اس طرح بھی بھوکا اٹھ سکتا ہے کہ اُس کے سامنے دسترخوان پر انواع و اقسام کے اتنے کھانے تھے کہ وہ فیصلہ ہی نہ کر پایا کہ کیا کھائے دونوں آدمیوں کی گرسنگی میں جس طرح فرق ہے اسی طرح ہمارے ملک کے انسان کی تنہائی اور مغرب کی تنہائی میں فرق ہے۔.....

س: آپ کی نظر میں ہندوستان کا سب سے بہترین نقاد کون ہے اور کیوں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ جس طرح غالب اور اقبال کی حیات میں بھی اس کا جواب دینا دشوار ہوتا کہ اس وقت کا بہترین شاعر کون تھا اور کیوں؟ اس طرح آپ کے سوال کا جواب دینا ممکن نہیں تنقید کی اتنی قسمیں ہو گئی ہیں کہ اب کسی ایک شخص کے لیے یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ہر قسم کی تنقید کا ماہر ہے ممکن ہی نہیں ہے اس لیے کسی نقاد کو جامع حیثیت سے بہترین نقاد کا قلب کیسے دیا جا سکتا ہے۔؟

س: کیا آج کی تعلیم بچوں کو مخلص، خلیق، محبِ وطن اور انسان بنا رہی اور نہیں تو کیوں؟

ج:۔ اگر تعلیم سے مراد ہمارے ملک کی تعلیم ہے تو آپ کے سوال کا جواب نفی میں ہے اس کے کئی اسباب ہیں تعلیم کے غیر معمولی پھیلاؤ سے مدرسوں کی بہت بھاری تعداد کی ضرورت ہے مگر مدرسین کی تنخواہ کی اسکیل دیکھتے ہوئے باصلاحیت لوگ بہت کم اس پیشہ کی طرف ملتفت ہوتے ہیں پھر کلاسوں میں طلباً کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے استاد اور طالب علم کا رشتہ جس طرح براہ راست قائم ہونا چاہیے وہ ہو ہی نہیں سکتا۔

س: آج طلبا روحانی باپ کو بھی ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں اس کا نفسیاتی پس منظر کیا ہے؟۔

ج: استاد کا درجہ اب روحانی باپ کا نہیں رہا نہ تو اُسے طلباء تسلیم کرتے ہیں نہ اُستاد اپنے آپ کو اس ذمہ داری کا اہل سمجھتا ہے اور نہ سماج اسے مانتا ہے

س: آپ کے خیال میں کیسی تعلیم بچوں کو بیدار مغز اور انسانیت نواز بنا سکتی ہے؟

ج:۔ اس سے پہلے کہ ہم تعلیمی سانچے کو سنوارنے کی

کوشش کریں یہ طے کرنا ضروری ہے کہ ہم بچّوں کی تعلیم کو سماج میں کیا جگہ دینا چاہتے ہیں جب تک ہمارے ملک میں انگلش میڈیم اور کانونٹ قسم کے اسکول قائم رہیں گے متمول طبقے اور تعلیم یافتہ طبقہ کے بچے ان میں پڑھتے رہیں گے اور ان طبقوں کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوگی کہ ملک باقی کروڑوں بچوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔؟ ابھی تک ہم لوگ سرکاری اور نیم سرکاری اسکولوں کی وقعت یتیم خانوں سے زیادہ نہیں سمجھتے ہیں جن میں کسی چیز کا بھی معیاری ہونا غیر ضروری سمجھا جاتا ہے یہ ایک تلخ حقیقت ہے جسے لوگ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے ہیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک تعلیم کو ہمارے قومی پروگرام میں اوّلیت کا مرتبہ حاصل نہ ہوگا ہمارے مقصد بر آری نہیں ہوگی۔

س:۔ شریر اور ضدی بچّوں کے لیے کون سا نفسیاتی حربہ استعمال کرنے کے بعد ان کی شرارت اور ضد کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے؟

ج:۔ یہ نفسیاتی سوال ہے اور نفسیاتی اصول کے مطابق ہر بچہ انفرادی شخصیت کا مالک ہوتا ہے اس کی شرارت ہو یا ضد اس کا علاج اس کی شخصیت کی انفرادیت کو سامنے رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

س:۔ کیا بچوں کو جنسی تعلیم دینے کے بعد انھیں امراض خبیثہ سے بچایا جا سکتا ہے؟

ج:۔ امراض جنیشہ کی روک تھام کتاب یا لٹریچر سے نہیں ہو سکتی ہے۔ ہر زمانہ ہوا ایک فلم آئی تھی "ڈیم پلا لگز" مجھے یقین ہے (ایسی فلم جس میں ان امراض کے مکروہ کن نتائج دکھائے گئے تھے) آج بھی دکھائی جائے تو بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے اُن نقصانات کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا ہے جو جنسی بے راہ روی سے پیدا ہوتے ہیں۔

س:۔ مخلوط تعلیم سے بھی جنسی بے راہ روی جنم لے رہا ہے جب دو متضاد جنس قریب ہوتے ہیں تو گل کھلانا عین فطری بات ہے آپ کا کیا خیال ہے۔؟

ج:۔ یہ بات ایک حد تک اُن طبقوں پر صادق آتی ہے جن کی گھریلو زندگی میں رواج کچھ اور ہے اور کالج مدرسوں میں کچھ اور قسم کی زندگی پائی جاتی ہے

س، مخلوط تعلیم دو متضاد جنس بن کر شہوانیت کی بھٹی میں سلگتے ہیں جب یہ لوگ اسکول کے احاطے میں کوئی غلط قدم اُٹھاتے ہیں تو انھیں سزا دی جاتی ہے لیکن یہی لوگ دوستی کی آڑ میں مخصوص ہوٹلوں میں جا کر مخصوص کمروں میں گل چھرے اڑاتے ہیں اُس وقت کون سزا دے گا۔

کیا ایسی تعلیم دو سیزگی اور گنوارپن کو برقرار رکھے گی۔؟

ج:۔ سماج کی کسی برائی کا صرف ایک ہی سبب ہوتا ہے اور اگر ایسا ہوتا تو اس بُرائی کو دُور کر دینا نسبتاً آسان ہوتا جب جداگانہ تعلیم کا رواج تھا اُس زمانہ میں بھی جنسی معصیت ہوتے تھے حضرت عیسٰی کے زمانہ میں تو سماج کے مقابلے میں زیادہ معصوم تھا پھر جب زانیہ کو سنگسار کرتے وقت حضرت عیسٰی نے للکار کر کہا

کہ "پہلا پتھر وہ مارے جس نے گناہ نہ کیا ہو" تو مجمع میں سے کوئی ہاتھ نہ اٹھا۔ عہد حاضر کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم مغرب کی برائیوں کی اندھا دھند تقلید کرتے چلے ہیں اور جب وہ عام ہو جاتی ہے تب پتہ چلتا ہے کہ اس فلاں فلاں پہلوؤں کا سد باب تو کیا ہی نہیں گیا۔ ٹی، وی فلم رقص سرود رسالے اخبار سب اسی لپیٹ میں آتے ہیں مختصر یہ کہ ان سماجی محرکات پر فتوی صادر کرنے کی بجائے ان کی ماہیت پر قبول کرنا اور ان کا معقول اور مناسب حل تلاش کرنا چاہیئے۔

س: آج طالبہ ہیروئن زیادہ طالبہ کم ہے اور جب وہ کسی غنڈے کا شکار ہو جاتی ہے تو قصور وار غنڈہ کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ کیا اس برائی کی جڑ ناقص تعلیم ڈسپلن ہے یا وہ غنڈہ ـــ؟

ج: یوں تو دنیا میں شہر اور دیہات کی سماجی تہذیبی بنیادیں الگ الگ اقدار پر کچھ نہ کچھ ہوتی ہیں مگر ہمارے ملک میں یہ فرق نمایاں ہو گیا ہے۔

س: آج کی بعض یونیورسٹیاں اور کالج فحاشی کا اڈہ بنا ہوا ہے اس میں قصور کس کا ہے سماج کا والدین کا اساتذہ کا یا تعلیم کا۔؟

ج: فرض کیجئے کہ صرف ایک گھر میں کسی غلطی کیوجہ سے آگ لگ جاتی ہے لیکن ہوا کے جھونکوں کیساتھ دوسرے ایسے بھی گھر میں آگ پکڑ لیتے ہیں جن میں وہ غلطی نہیں ہوئی تھی موجودہ رسل و رسائل کے ذرائع اتنے تیز ہیں کہ صبح لندن میں جو فیشن شروع ہوتا ہے وہ شام تک بمبئی پہونچ جاتا ہے اتنی ہی تیزی کے ساتھ مغربی ممالک کی برائیاں بھی ہم تک اور خصوصاً بڑے بڑے شہروں تک پہونچنے لگی ہیں لفظ "آزادی" کے مفہوم کو اب اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ کل تک جو باتیں خلاف فطرت تصور کی جاتی تھیں انھیں صرف گوارا نہیں کیا بلکہ جائز کر دیا جاتا ہے اس عالمی انداز فکر کو سامنے رکھ کر قصور وار ٹھہرایا جائے۔

س: کیا سیاسی رہنما کا یہ خیال صحیح ہے کہ طلباء کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے جب کہ طلباء بھی اس ملک کے شہری ہیں

ج: سیاست میں حصہ لینے سے مراد اگر عملی طور پر حصہ لینا ہے یا انتخابات میں اُمیدوار یا اُمیدوار کی حمایت میں کام کرنا یا کسی جماعت سے وابستہ ہو کر صرف اُسی کا ہو کر رہ جانا اور دوسروں کو غلط سمجھنا تو یقیناً ایسی سرگرمیاں طالب علم کی توجہ تعلیم کی طرف سے ہٹا دیگی

س: طلبا کی بڑھتی ہوئی بے چینی منتقمانہ ذہنیت، نشہ کی لت، جنسی آوارگی، مال سے بے نیازی، بد تہذیبی اور فیشن میں گم کا کیا علاج ہے ـــ اور اس کا ذمہ دار ماحول، سماج، حکومت والدین، کالج ہیں۔ یا اساتذہ ـ؟

ج: یہ ساری باتیں عارضی ہیں جن پر ناک بھوں، چڑھانے کی بجائے طلباء کو ان کے دیر پا نقصانات کیطرف متوجہ کرنا چاہیے ہمارے افسانے نویس آج جس طرح کھلے بندوں جنس اور جنسی لذتوں کی تفصیلات بیان کرگئے (جن میں کبھی پھیلاؤ کو بھی دخل ہوتا ہے)۔

حقیقت کو ننگی صورت میں پیش کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں کاش یہ فرض بھی انجام دیتے کہ اس کے بعد ہر دو سو میں ایک ہندوستانی جس مرض کا شکار ہو کر اپنی اور آگے آنے والی نسل کی زندگی کا باعث ہوتا جا رہا ہے اس کی تفصیل سے بھی آگاہ کر دیتے۔

س: آج کے طلباء کو کیسی تعلیم کی ضرورت ہے تاکہ ان کا ذہن درخشاں تاباں ہو

ج: تعلیم تو بنیادی طور پر وہی رہے گی البتہ طریقہ تعلیم کو اس طرح بدلنے کی ضرورت ہے کہ (الف) طلباء اور اساتذہ کے درمیان صرف ایک طرفہ درسی رشتہ ہونے کے بجائے مکالماتی ربط قائم ہو سکے (ب) مواد تعلیم فرسودہ حد تک قدیم ہونے کے بجائے جدید معلومات پر مبنی ہو (ج) طلباء کو احساس دلایا جائے کہ تعلیم اور تربیت جسے ٹریننگ کہتے ہیں ان دونوں کے مقاصد میں فرق ہے جو طلباء صرف روٹی کمانے کی خاطر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ لیتے ہیں انھیں اس کے بجائے ایسے کورس لینے چاہئیں جن میں ان کی تربیت ہو سکے۔

س: کیا ہماری حکومت اساتذہ کی زندگی کی صحیح قیمت دے رہی ہے؟۔

ج:۔ ہماری حکومت ہی پر منحصر نہیں دنیا میں کہیں بھی مدرسین کی تنخواہ میں دفتروں اور صنعتوں کے مقابلے میں نہیں ہمارے ملک میں چونکہ تعلیمی سہولتیں وسیع پیمانہ کا پھیلانے کا کام ہنوز بہت کچھ باقی ہے اس لیے مدرسین کی اجرتوں کی طرف توجہ کم ہے۔

س: کیا مسلمان کی شکایت حق بجانب ہے کہ ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے میرے خیال میں، مسلمان سائنس فن آرٹ اور تکنیک میں دلچسپی کم لے رہے ہیں۔

ج: اگر مراد ان کے میڈیکل اور انجینیرنگ کالجوں میں داخلہ سے ہے تو بہت شاذو نادر مثالیں تعصب کی ملیں گی کیوں کہ ہر ریاست میں ان کے بارے میں داخلہ کے ایسے قوانین نافذ ہیں جن سے تعصب برتنے کی گنجائش نہیں یہ درست ہے کہ عام طور سے مسلمان طلباء سائنس فنی اور تکنیکی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں گو اس صورت حال میں اکثر مقامات پر خوش گوار تبدیلی ہو رہی ہے

س: کیا دور حاضر میں سائنسی فنی اور تکنیکی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟

ج: ہر دور میں اس کی ضرورت رہی ہے اور آئندہ رہے گی۔

س: جنسی پوسٹروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔ ان کے اثرات کس طرح ظہور میں آتے ہیں۔

ج:۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ جب میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کا ممبر تھا تو جولائی ۱۹۸۱ء میں ایک تجویز کے ذریعہ میں نے حکومت کی توجہ ان عریاں اور جنسی پوسٹروں کی طرف مبذول کرائی تھی جو ہماری نوجوان نسل کے دماغ کو پراگندہ کر کے ان کے اخلاق میں گراوٹ پیدا کر رہے تھے کارپوریشن کے ایوان کے علاوہ میری تجویز کا اخباروں میں بڑا چرچا ہوا نوٹ اور اداریے

ہے گئے۔ نیشنل اسٹینڈرڈ اخبار نے اپنے ۱۴ اگست
ے سنڈے ایڈیشن میں اس تجویز کو عنوان بنا کر پورے
فحے کا ایک فیچر شائع کیا جس میں مختلف لوگوں کی
ئے معلوم کر کے چھاپی گئی۔ فلم انڈسٹری کے بعض
لقوں نے اس کی بڑی شدومد کے ساتھ مخالفت
بھی کی اور شاید اس اثر کے ماتحت میری تجویز پر
ل درآمد نہ ہو سکا اب سنتا ہوں کہ وہی بات حکومت
ی طرف سے کہی جا رہی ہے میرا خیال ہے کہ پوسٹروں
پر بھی اسی طرح سنسر ہونا چاہیے جیسے فلموں پر کیا جاتا
ہے۔

س :۔ اردو زبان کی خدمت کا دم بھرنے والے ادیب کیا اپنے گھروں میں اردو کے ساتھ مادری زبان یا ادبی زبان کا سا برتاؤ کر رہے ہیں اپنے بچوں کو اردو اسکول میں داخل کراتے ہیں یا اردو کی حمایت کا دعویٰ محض ایک فیشن بن کر رہ گیا ہے؟

ج :۔ یہ سوال تو فرداً فرداً آپ ادیبوں یا شاعروں سے کسی سوالنامے کے ذریعہ پوچھ لیجئے کہ ان کا طرز عمل کیا ہے؟ مگر جس بات کی طرف آپ کا اشارہ ہے بدقسمتی سے وہ حقیقت ہے خواہ اس کی تاویل کچھ بھی ہو اور کسی طرح بھی کی جائے۔

"کونسل میں فقط سید مسجد میں فقط حجن" کا

اطلاق اردو پر بھی ہوتا ہے

س :۔ یوسف خاں (دلیپ کمار) کی طالب علمی کے زمانے میں کوئی بات آپ نے ایسی دیکھی تھی جس سے اس کے ایک دن شہرہ آفاق آرٹسٹ بننے کا اندازہ لگتا ہو۔؟

ج :۔ بالکل نہیں۔ یوسف خاں نہایت متین اور سنجیدہ قسم کے طالب علم تھے ان میں ایک خاص قسم کی معصومیت تھی جواب بھی ہے (اور غالباً ان کی کامیابی کا بڑا راز بنی ہوئی ہے) جب میں نے سنا کہ انھوں نے فلم میں کام کرنا شروع کیا ہے تو مجھے یقین نہیں آیا اور میں بہ طور خاص اپنے رفیق کار خلیفہ ضیاء الدین کے ساتھ وہ فلم "جوار بھاٹا" دیکھنے گیا فلم دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ مستقبل قریب میں یہ نوجوان بہت نامور آرٹسٹ بن جائے گا اور یہ بات میں نے اپنے دوست ضیاء الدین سے بھی کہہ دی تھی۔

س : آرٹ فلم کیا چیز ہے نفسیاتی اور اصلاحی فلموں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج : میں نے اب فلمیں دیکھنا تقریباً چھوڑ دیا ہے۔ ستیہ جیت رائے کی فلم آ جائے تو دیکھتا ہوں۔ میرے نزدیک ان کی فلمیں آرٹ فلمیں ہوتی ہیں مجھے اس کا احساس ہے کہ فلم سازی ایک صنعت ہے جو "مارکیٹنگ" کے "ڈیمانڈ اور سپلائی" کے بنیادی اصول سے بالکل انحراف نہیں کر سکتی ہے پھر بھی اس میں بڑی گنجائش ہے کہ ہماری فلمیں کچھ مقصدی رول بھی ادا کریں۔

س : میرے خیال میں سماج میں ایک ایسے ادارے کی سخت ضرورت ہے جہاں اخلاقی تعلیم دی جا سکے تاکہ طلاق ازدواجی تلخیوں اور فرقہ وارانہ ذہن پر قابو پایا جا سکے اس قسم کے ادارے کو عملی صورت دینے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

ج: آپ کی تجویز بہت معقول اور مفید ہے خصوصاً
اب جبکہ روزمرہ کی زندگی میں مختلف اسباب کی بنیاد
تناؤ بڑھتا جا رہا ہے ایسے ادارے جو خاندانی اور
سماجی زندگی کے چھوٹے چھوٹے لیکن بڑی اہمیت
رکھنے والے مسائل کے حل کے لیے گاؤں گاؤں اور محلہ
محلہ میں ہونے چاہییں لیکن اس کے لیے پہلے کاموں
کا ڈھانچا (جس میں تنظیم بھی شامل ہے) اور طریقہ کار
کا نقشہ تیار کر لینا چاہیے یہ کام ان اداروں کے کرنے کا
ہے جو بہت اونچی سطح سے اخلاقی قدروں اور سماجی ...
خدمت کی آواز بلند کرتے ہیں صرف کانفرنس کی تجویز
اور جلسے منعقد کرنے سے یہ کام پورا نہیں ہوگا اس کے
لیے مختلف نوعیت کا لٹریچر مقامی زبانوں میں تیار کر کے
انھیں سماج کے ہر طبقہ میں گوشہ گوشہ میں پھیلانا
ضروری ہے۔

س: کیا آج ایک ایسے ادارے کی ضرورت نہیں ہے
جو شادی بیاہ کے صحیح رشتہ طے کر سکے اس منصوبہ
پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے؟

ج: وقت کے لحاظ سے یہ مسئلہ بڑا اہم بھی ہے اور
نازک بھی خصوصاً بڑے شہروں میں جہاں مختلف
علاقوں سے لوگ آ کر بستے ہیں شادی بیاہ کا مسئلہ
والدین کے لیے پیچیدہ بن جاتا ہے کیونکہ معروفیت
مانع ہوتی ہے اس لیے اگر ایسے ادارے یا ایسی ایجنسیاں
قائم ہوں جن میں ہمدرد اور اعتماد کے قابل کارکن
ہوں تو ان کی مدد سے متعلقین ایک دوسرے سے ربط
قائم کر سکتے ہیں اور اس طرح ان کے مسائل کا حل بھی
نکل سکتا ہے اور ان اداروں میں تربیت یافتہ سماجی
کارکن اور ماہر نفسیات کی ضرورت ہے جو ہر پہلو سے
فریقین کو صحیح مشورہ سے نواز سکیں۔

س: قومی یکجہتی کے لیے کس قسم کا نظریہ اور کون
سے لائحہ عمل کی ضرورت ہے تاکہ انسانیت کو فروغ
ملے؟

ج: نظریہ تو صرف ایک ہی ہو سکتا ہے قومی یکجہتی پر
سچے دل اور پوری دیانت داری سے یقین اب تک ہم
صرف ضرورت یا مصلحت کی خاطر وقتاً فوقتاً نعرے
کی صورت میں اسے استعمال کرتے چلے آئے ہیں قومی
یکجہتی کے معنی میں بھی ہم صاف اور واضح نہیں ہیں۔
کوئی اس سے مطلب یکسانیت لیتا ہے اور کوئی ہم
آہنگی سمجھتا ہے ان دونوں کے مفہوم میں فرق ہے
ایک دوسرے کو سمجھنے اور نفرت کی دیواریں گرانے
ہی سے انسانیت کو فروغ مل سکتا ہے۔

انٹرویو ختم ہو چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا جب
تک ایسے روحانی باپ ہمارے ملک میں موجود رہیں گے
علمی چٹیل میدان ہمیشہ سبزہ زار بنتا رہے گا علمی سوتے
چھلکتے رہیں گے۔
علمی بنجر زمین زرخیز ہوتی رہے گی اور علم کی فصل
لہلہائے گی اور جھومے گی۔

ذکی کاکوروی

نئی کتابیں نئے رسالے

نام کتاب : نوح ناروی ۔ حیات وشاعری سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۲۷۸
مصنف : ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر قیمت : ۱۶/۱ روپے
ناشر : نیشنل بکڈپو ۔ تھانہ روڈ ، بھیونڈی (مہاراشٹر)

نوح ناروی ۔ حیات وشاعری ، ظفر الاسلام صاحب کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر ان کو ۱۹۷۲ء میں بمبئی یونیورسٹی کے پی ، ایچ ، ڈی کی ڈگری ملی ۔

نوح ، داغ دہلوی کے شاگردوں میں اہم مقام رکھتے تھے اور قدیم طرز سخن کے اچھے شاعر تھے ان کے کلام میں فن اور زبان کے حسن وخوبی کے خاص اہتمام ملتا ہے اور کلاسکی انداز بھی غالب ہے غزل کی محبوب سخن صنف تھی ، اس صنف میں انھوں نے خوب خوب اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے ۔ نوح ناروی کی شاعری میں داخلیت اور عمیق فکر کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے ۔ لیکن اس کمی کو ان کی استادانہ صفات شاعری کے پیش نظر کسی حد تک نظر انداز کیا جاسکتا ہے ۔

فاضل مصنف نے پہلی بار نوح ناروی کی حیات وشاعری پر تفصیل اور تحقیقی روشنی ڈالی ہے اور ان کے بارے میں بہت سی اہم معلومات کا اضافہ کیا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ لیکن جہاں تک نوح ناروی کے شاعرانہ مرتبہ کے تعین اور ان کی ادبی خدمات کے تنقیدی جائزے کا تعلق ہے' زیر نظر مقالہ بہت حد تک تشنۂ تنقید نظر آتا ہے ، مصنف اس سلسلہ میں زیادہ کدوکاوش اور دقت نظر سے کام لیتے تو اچھا تھا

ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے نوح ناروی کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

ان دنوں عیش و مسرت میں بسر ہوتی ہے
جام اپنا ہے، سبو اپنا ہے، ساغر اپنا

غیر کا عشق ہے کہ میرا ہے
صاف کہدو ابھی سویرا ہے

وہ یہ کہتے ہیں سویرا ہوگیا
میں یہ کہتا ہوں کہ آدھی رات ہے

نہ ملو کھل کے تو چوری کی ملاقات رہے
ہم بلائیں گے تمہیں رات گئے، رات رہے

ملتا رہا سکوں کا مزہ اضطراب میں
یاد بخیر وقت جو گزرا شباب میں

ہر بات کا ہے دار و مدار اپنی ذات پر
گر ہم خراب ہیں تو زمانہ خراب ہے

کہہ رہا ہے یہ تری تصویر بھی
میں کسی سے بولنے والی نہیں

ایک کافر سے عشق ہے مجھ کو
میرے ایمان کا خدا حافظ

آؤ مل جاؤ کہ آپس میں صفائی ہوجائے
بیچ والوں نے یہ تکرار بڑھا رکھی ہے

پھر گل کھلے، پھر ابر اٹھا، پھر ہوا چلی
اے بارش کرم کوئی چھینٹا شراب کا

کیا وادیٔ عرفاں میں اک رہرو پر بستہ
ادراک کڑی منزل احساس کٹھن رستہ

مولانا ضیاء احمد بدایونی (مرحوم) کے ۲ دو خط..

واحد پریمی کے نام

اردو ڈپارٹمنٹ، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

۲۶-۳-۶۸

کرم فرمائے من تسلیم۔

"گلِ نو"[1] کا تحفہ ملا، یادآوری کا سپاس گذار ہوں۔

میں نے آپ کا کلام پڑھا اور اس نتیجے پر پہونچا کہ اس میں کافی جان ہے اور زندہ رہنے کی صلاحیت خیالات پاکیزہ ــ طرزِ بیاں دلکش۔ بندشیں چست اور فنی ضوابط کا پورا خیال ــ آپ کے اشعار صدقِ جذبات کی تفسیر اور عزمِ بلند کی تعبیر ہیں۔ کہیں کہیں آلام و مصائب کا بیان بھی ملتا ہے کیوں کہ یہ بھی زندگی کے حقائق ہیں۔ مگر مجموعی طور پر کلام عزت و ہمت کی دعوت ہے اور لطف یہ ہے کہ شعریت میں کمی نہیں آنے پائی۔ بہرحال زندگی اور آج کل کی زندگی کی دھڑکنیں اس میں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ کھوپال نے علم وادب کی بڑی خدمات کی ہیں اور مجھے توقع ہے کہ آگے چل کر آپ کا نام بھی غیر اہم نہ ہوگا۔

حرم و دیر سے بےتعلقی فارسی و اردو شعراء کے یہاں عامۃ الورود ہے۔ میرے نزدیک یہ چیز تو ایک طرف روایتی ہوکر رہ گئی ہے۔ دوسرے یوں بھی درست نہیں آپ کے یہاں بھی یہ مضمون موجود ہے اگر اس سے وحدت اطرپایاں مراد ہے تو ہدایت کے خلاف ہے اور اگر دونوں سے بے رغبتی مقصود ہے تو بھی لائق اجتناب ــ رہی یک جہتی، اور رواداری اس کے لیے دوسرے پیرائے اختیار کئے جاسکتے ہیں ــ

---

[1] "گلِ نو" پہلا مجموعۂ غزلیات ہے جو جولائی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا (واحد پریمی)

اسی طرح "محسن" کو غزدہ وطن کہنے کی توجیہ بھی کچھ زیادہ برمحل نہیں معلوم ہوتی۔

آپ کی شاعری میں خلوص کے ساتھ پختگی، اور روانی کے ساتھ صحت فن قابل قدر ہے البتہ دو ایک جگہ ردیف کا بے کار ہو جانا ذرا کھٹکتا ہے۔ خلاً۔

جانِ غنچہ ولالہ روحِ رنگ و بو ہم نے — آپ کو بنایا ہے کتنا خوبرو ہم نے

کس شان کس وقار سے کس بانکپن سے ہم — گزرے ہیں آزمائشِ دار و رسن سے ہم

اُمید ہے کہ آپ اُوپر کے جملوں سے آزردہ خاطر نہ ہوں گے۔ اور رسید خط سے مطلع فرمائیں گے والسلام۔

خیر اندیش

ضیاء احمد بدایونی

۷۸۹

اُردو ڈپارٹمنٹ۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

۸ - ۸ - ۶۹

مکرمی۔ تسلیم۔

آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا تھا۔ نادم ہوں کہ جواب میں اس قدر تاخیر ہوئی۔

جناب شفا گوالیاری کا کلام میں نے پڑھا ہے۔ اور ایک بار ان سے نیاز بھی حاصل ہوا ہے میں جانتا ہوں کہ مرحوم ملک کے ممتاز اور واقف فن اساتذہ میں تھے اور ان کی وفات سے اُردو شعر و ادب کو بہت نقصان پہنچا ہے آپ نے بزم مقالات[1] کیلئے پیام طلب کیا تھا۔ مگر افسوس کہ مرحوم کا کلام یہاں دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود نہیں ہے۔ "آیاتِ شفا"[2] میرے پاس ہے۔ مگر وہ یہاں نہیں۔ علی گڑھ میں ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مرحوم کی شاعری پر کچھ لکھوں مگر اسی وجہ سے مجبور رہا۔ کیا میں توقع کروں کہ آپ میری معذرت قبول کریں گے۔

اُمید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ زیادہ نیاز۔

نیاز مند

ضیاء احمد بدایونی

---

[1] میں نے ۲۳ جولائی ۱۹۶۹ء کو جامعِ سخن ڈاکٹر شفا گوالیاری (مرحوم) کی برسی شاندار پیمانہ پر منائی تھی جس کے لیے مولانا ضیاء احمد بدایونی صاحب سے پیغام طلب کیا تھا۔ (واحد)

[2] استاذی حضرت شفا گوالیاری کا پہلا مجموعہ کلام (واحد)

شمارہ (۷)
رجسٹرڈ نمبر این ڈبلیو/این پی ۹۳
لائسنس نمبر: ۲۰۸۰۶۴/۲۱۷/۲۴۲
دفتر فون: ۶۱۳۵
فون رہائش گاہ: ۲۶۶۵۶

ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۷) ماہ نومبر ۱۹۷۷ء جلد ۱۴

ایڈیٹر: محمد حسین شمس علوی (قاسمی کاکوروی)

مجلس ادارت:
۱۔ عبدالقوی دریابادی
۲۔ سعادت علی صدیقی
۳۔ محمد حسنین علوی ایم، اے

ترتیب

سالانہ اعزازی:
عوام سے دس روپیہ / آٹھ روپیہ
فی پرچہ ۷۰ پیسے

پتہ: ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ (۲۳/۷ امین آباد)

سید انصار حسین نے رفیق قومی پریس لکھنؤ اور اس روڈ پر چھپوا کر دفتر فروغ لکھنؤ ۲۷/۳۲ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

ڈاکٹر شجاعت علی (سندیلوی)

اُردو کی باتیں

مرکز کا وزیر جناب ہیم وتی نندن بہوگنا کو چھوڑ کر، اب تک جتنے بیانات مرکزی یا ریاستی وزرا نے اُردو
سلسلہ میں دیئے ہیں، وہ اردو دنیا کے لیے نہ تو حیرت انگیز ہیں، نہ نئے۔ آزادی کے بعد، اس قسم کے "اُردو کُشی"
سے اُردو والوں کے کان خوب آشنا ہیں۔ لسانی آمریت نے، جمہوریت کے نام پر اُردو کو ختم کرنے کی جس طرح منظم و موثر
کی، اور ستیہ اور اہنسا کے نام نہاد پجاریوں نے، "استیہ اور ہنسا" کو اُردو کے لیے جائز سمجھا، اس سے، کون واقف ہے!
معمولی اندازے کے مطابق اب تک کروڑوں بچے مادری زبان اُردو کی تعلیم سے محروم کر دیئے گئے، لاکھوں اساتذہ پر ملا
کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ کروڑوں کتابوں کی طباعت و اشاعت ختم ہو گئی۔ کتب فروش، چھاپے خانے، لکھنے پڑھنے والے
زیادہ تر اقتصادی بدحالی کا شکار ہو گئے۔ اُردو جاننے والوں کے لیے، ملازمت میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ تعلیم گا
اور تمام دوسرے سرکاری، غیر سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں اُردو کا چلن دیش بھگتی کے خلاف اور غداری کے مترادف
گیا۔ اُردو استعمال، عملی طور پر، سب سے بڑا پاپ قرار دے دیا گیا اور یہ سب کچھ حق و انصاف اور جمہوریت کے نام پر کیا
اقبال کا یہ قول — دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو سمجھتا ہے اسے آزادی کی نیلم پری
اُردو کے لیے حرف بحرف ثابت ہوا۔

ناحق شناسی، اور احسان فراموشی کی اس سے بڑھ کر مثال، مشکل سے ملے گی کہ اپنے ہی ملک کی اُس زبان کو —
نے آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کے جیالے فرزندوں، شاعروں، ادیبوں، مدیروں اور دانشوروں
مادر وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے میں سبقت کی جس نے ملک کو سالمیت عطا کی، قومی یک جہتی مشتر
تہذیب اور متحدہ قومیت کا تصور دیکر مستقبل کو روشن اور تابناک بنایا۔ جس کے رسم خط کی بدولت بین الاقوامی رشتوں
استحکام پیدا ہوا، جس نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو نفاست اور ترقی عطا کی، جس نے یا مسلمان اللہ اللہ، یا برہما

بق پڑھایا، جس نے دیر و حرم، مندر و مسجد، کنشت و کلیسا شیر و شکر کی طرح ایک کیا، آزادی ملتے ہی، موت کے
اتار دینے کی پوری قوت کے ساتھ کوشش کی گئی۔ آج تک اس اُردو روشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اقتدار کی
اور کرسی کی طمع، اُردو کشی پر مجبور کرتی ہے۔ دستورِ ہند لاکھ اُردو کے حق کو تسلیم کرے ہے جمہوریت کی قدروں کی کتنی ہی
د ؟ حق و انصاف کا کتنا ہی خون ہو؟ لیکن آزاد ملک کی آزاد اور ترقی یافتہ زبان اردو کا حق اس لیے نہیں دیا جاسکتا
سے ہندی کو نقصان پہونچ جائے گا۔ وہ ترقی نہیں کر پائے گی۔ اگر اُردو کے لیے عملی طور پر ذرا بھی سہولت دیدی گئی
لے بڑھ جائے گی۔ اتنی سختی اور پابندی کے باوجود، اب تک وہ عوام کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہے یہ اور
کے بہت سے خیالات و خدشات ہیں، جو با اقتدار حضرات کے دل و دماغ پر مسلط ہیں۔ اسی لیے ہر ممکن اُردو کو
نے کی منظم و موثر مہم جاری ہے۔ لیکن زندہ اور ترقی یافتہ زبان، حکومت کے جبر و استبداد سے ختم نہیں ہوسکتی۔

تم یونہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے   پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

کایتوں، یادداشتوں، سپاغر ضداشتوں کا زمانہ ختم ہوگیا۔ آزمودہ را آزمودن جہل است، کو پیش نظر رکھ کر اُردو دنیا
، پیروں پر کھڑا ہو جانا چاہیئے۔ انجمن ترقی اُردو، اور اُردو کی تمام دوسری انجمنیں اپنے مسلسل عمل سے حکومت کو مجبور
کر وہ اُردو کے حق کو آئینی طور پر تسلیم کرے۔ اُتر پردیش، بہار، دہلی اور دوسری تمام ریاستوں میں اُردو کو دوسری
ی زبان بنائے۔ اس سے کم پر کسی قسم کی مصلحت نہ ہونا چاہیے۔ اُردو والوں کو غیرت و حمیت اور ان کے ایثار و قربانی
ن ہے۔ اس امتحان میں انھیں بہر صورت کامیابی حاصل کرنا ہے۔

فروغ اُردو کا پریم چند نمبر، اُردو کے شگفتہ نگار ادیب، اپنی مادری زبان اُردو کے مذاقی،
سعادت علی صدیقی ترتیب دے رہے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ نمبر پریم چند پر یادگار نمبر ہوگا —
مشاہیر ادب سے درخواست ہے کہ وہ اپنے گرانقدر مقالات جلد سے جلد روانہ فرمائیں۔

لکھنؤ کے حالیہ افسوسناک فسادات نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ فروغ اُردو بھی اس کا شکار ہوگیا
اگست ستمبر کا پرچہ تیار ہوگیا تھا لیکن کرفیو کی وجہ سے روانہ نہ کیا جاسکا۔ اسی طرح اکتوبر کا پرچہ بھی کرفیو
کی زد میں آگیا، بڑی کوشش کے بعد کسی نہ کسی طرح دونوں پرچے ایک ساتھ روانہ کیے جاسکے۔ اکتوبر کا پرچہ
جس پر کاتب صاحب کی مہربانی سے نومبر لکھ گیا حالانکہ وہ ماہ اکتوبر کا پرچہ تھا بغیر کور ہی کے بھیجنا پڑا —
اُمید ہے اس مجبوری کے پیش نظر قارئین معاف فرمائیں گے۔

۷۸۶

بیادِ مولانا عبدالماجد دریا بادی

پاک دل مردِ باصفا نہ رہا　　ماجد عالی مرتبہ نہ رہا
جو اٹھا تھا زِ خاکِ دریاباد　　وہ دُرِ روشنی افزا نہ رہا
ہے بجا جس قدر لہو روئیں　　عاشقِ دینِ مصطفےٰ نہ رہا
کیوں نہ نظروں میں ہو جہاں تاریک　　علم کا شمسِ بازغہ نہ رہا
سابقہ برگزیدہ لوگوں میں　　تھا یہی ایک مابقا نہ رہا
اس کی فکر و نظر انوکھی تھی　　راہ حق کا یہ رہنما نہ رہا
صاحبِ صدق چل بسا ہیہات　　سچی باتوں کا سلسلہ نہ رہا
جس نے کھولے رموزِ قرآنی　　ہائے وہ صاحبِ ذکا نہ رہا
دین کا فلسفہ کا دانش کا　　اس پہ نکتہ کوئی چھپا نہ رہا
کون سمجھائے گا نکاتِ حیات　　نکتہ آموز و نکتہ زا نہ رہا
ذات تھی جسکی مخزنِ اوصاف　　ایسا بے مثل نابغہ نہ رہا
جس نے بخشا وقار اُردو کو　　ادیبِ حق آشنا نہ رہا
اصل میں تھا جو نازشِ انشا　　وہ قلم کارِ خوش ادا نہ رہا
جو صحافت کا مردِ میداں تھا　　وہ صحافیٔ باوفا نہ رہا
جسکو بندوں کی بہتری تھی عزیز　　حیف وہ بندۂ خدا نہ رہا
مرثیہ گو ہے آج نقدِ سخن　　ناقدِ قدر آشنا نہ رہا
سونی سونی ہے بزم علم و ادب　　موجدِ طرزِ دل ربا نہ رہا
موت عالم ہی موتِ عالَم ہے　　خشک ہیں آنسو اب ذرا نہ رہا
جب سے دیکھی ہے نثرِ ماجد کی　　نظم انشا میں بھی مزا نہ رہا
شوقِ قربِ حبیب کے صدقے　　موت سے یہ کبھی خفا نہ رہا

اے غفور الرحیم ربِّ علیٰ
اسپہ رکھ اپنے فضل کا سایہ

دعا گو
ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا
صدر شعبہ اُردو
ناگپور یونیورسٹی ناگپور

از: ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی، صدر شعبۂ اُردو فارسی۔
(ایم، ڈی کالج بمبئی ۱۲)

"ڈاکٹر گیان چند جین بحیثیت انشا پرداز"

——— تجزیے کی روشنی میں ———

شخصیتوں کا مطالعہ دلچسپ بھی ہوتا ہے اور پریشان کن بھی۔ دلچسپ اس لیے کہ اس عمل میں نفسیات انسانی کے بہت سے اسرار کھلتے ہیں اور پریشان کن یوں کہ اکثر شخصیتیں پیچیدہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں اور ان میں اتنی تہیں پائی جاتی ہیں کہ مطالعہ کرنیوالا تحیرات میں "ڈوب جاتا" مختلف پہلوؤں سے تجزیے کر کر کے تھک جاتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش میں مجھ پر بھی یہی کچھ بیتی۔ وہ مجھے بڑی متضاد اور پیچ در پیچ اوصاف کی حامل نظر آئی۔ اگر میرے بیان کو مبالغہ نہ سمجھا جائے، اور انتہائے عقیدت پر محمول نہ کیا جائے تو عرض کردوں کہ موصوف کی شخصیت میں پوشیدہ آب رنگ نے آج سے تقریباً بیس سال پہلے (جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا) مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مطالعہ کر کے میں نے اسی وقت اندازہ لگا لیا تھا کہ موصوف کو زبان اُردو کی تاریخ، لسانیات، علم عروض اور قدیم داستانوں سے دلی لگاؤ ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے اسی زمانے سے مجھے اس بات کا چسکا پڑ چکا تھا کہ ایک سچے طالب علم کو کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہیے۔ مطالعہ کے دوران جو مقامات مبہم سے آئیں۔ انھیں اپنے اساتذہ سے سمجھنا چاہیے اور اگر اس سے بھی تشفی نہ ہو تو پھر مصنفین تک سے رجوع کرنا چاہیے۔ خاص طور پر اُن ادیبوں سے جن کی کتاب ہمارے زیر مطالعہ ہو۔ یہ ایک بڑا علمی اور مخلصانہ طریقہ ہے — مجھے خوشی ہے کہ اسی طریقہ کار کی وجہ سے بہت سی علمی گتھیاں بھی سلجھیں اور کئی مشہور زمانہ ادبا و شعرا سے رشتہ اخوت و دوستی بھی استوار ہوا۔ جین صاحب سے بھی اسی تقریب سے غائبانہ تعارف کی سبیل پیدا ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ اوائل ستمبر ۱۹۵۸ء میں، میں نے ڈاکٹر جین کو خط لکھ کر یہ پوچھا تھا کہ محمد حسین آزاد "فسانہ آزاد" کو "ڈراما" کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ موصوف نے تفصیل جواب عنایت

رہا یا تھا۔ جس کا ایک اقتباس حسب ذیل ہے

فسانۂ آزاد کو ڈرامہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا
• ڈرامہ کی پہچان یہ ہے کہ اس میں محض مکالمہ
ہوتا ہے۔ راوی یعنی مصنف کی زبان سے کوئی
لفظ نہیں کہلا یا جاتا۔ فسانۂ آزاد میں راوی کی
زبان سے واقعہ نگاری کی گئی ہے"۔ لہ

ہں اسی زمانہ سے ڈاکٹر جبین صاحب کا آن دیکھا طالبعلم
برعقیدتمند بن گیا ہوں اگرچہ کبھی مل نہ سکا لیکن ان کی نجی
تحریروں، علمی مضامین اور کتابوں میں ان کی شخصیت،
و بہت سے خط وخال دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان کی نثر
اری پر سر دست کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس کا طرۂ
نیاز معروضیت (SUBJECTIVTIY) ہے .. ان کی
شاء پردازی میں قاری انھیں ہر جگہ پا سکتا ہے۔ یوں
ڈاکٹر جبین صاحب کے بہت سے علمی وادبی مضامین
سائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور انھوں نے اعلیٰ
پہ کی مستقل تصانیف مثلاً اُردو کی نثری داستانیں
بی شمالی ہند میں، لسانی مطالعہ اور تجزیئے بھی پیش
ہیں لیکن سر دست میں آخر الذکر تصنیف "تجزیئے" کی
ضمن میں موصوف کی انشاء پردازی کا جائزہ لوں گا۔
تاب، جبین صاحب کی اُنیس [19] مقالات کا مجموعہ ہے
ے پہلی بار، اپریل ۱۹۷۳ء میں اپنے روایتی حسن طباعت
ساتھ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔ یہ
ب ڈیمائی سائز کے ۲۵۲ صفحات پر محیط ہے۔

لہ مکتوب ڈاکٹر جبین بنام راقم محررہ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۸ء از بھوپال

کتاب میں شامل مضامین کو "تحقیقی" اور "ادبی وتنقیدی"
کے زیر عنوان دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عجیب اتفاق
ہے کہ موصوف نے تحقیقی حصہ میں ادبی و تنقیدی حصے
کہیں زیادہ انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔
وہ اُردو میں تحقیق کے مسائل سے بحث کرتے ہوئے
اُردو کے بے لاگ محقق رشید حسن خاں صاحب کا ایک
اقتباس نقل کرتے ہیں اور جب وہ خاں صاحب کی اس
عبارت تک پہونچتے ہیں کہ۔

"اصل مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ (آج کا استاد)
تصنیف وتالیف سے قطع تعلق بھی نہیں کرسکتا
کیوں کہ انھیں اوراق جمشیدی کی مدد سے تو وہ
اپنا طلسم ہوش ربا سجائے ہوئے ہے۔ تہ

تو جبین صاحب اسے پڑھ کر جھوم اُٹھتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

"خوب لکھا ہے۔ پوری طرح لطف اور روشنی
لینے کے لیے پورا مضمون پڑھیے، میں کہ داستانوں
کا حشیش خوردہ ہوں مجھ پر تو اوراق جمشیدی کے
ذکر نے وجد کی کیفیت طاری کر دی ہے" سلہ

جبین صاحب کی معروضیت وہاں کچھ اور بھی نکھر جاتی
ہے جہاں وہ اپنے سوانحی حالات، معتقدات یا افتادِ مزاج
کا ذکر کرنے لگتے ہیں مثلاً،

"اپنے بارے میں لکھنے میں آدمی کی انا آسودہ
ہوتی ہے، اپنی ذات کا (وہ کتنی بھی مریل اور نکمی کیوں
نہ ہو) بردبیگنڈہ ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ قباحت

لہ تجزیئے صفحہ ۲۱-۲۰

ہے کہ اپنے بارے میں غیر جانب داری نہیں برتی
جا سکتی۔[1]

"دنیا کے کسی مذہب میں خود کو لذتوں اور آسائشوں
سے محروم رکھنے اور جسم کو تکلیف دینے پر اتنا زور نہیں دیا
گیا جتنا جین دھرم میں ہے۔"[2]

جین صاحب صرف اردو کے استاد اور مصنف
ہی نہیں بلکہ وہ ایک مفکر اور فلسفی بھی ہیں انھوں نے زندگی
کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کر کے کچھ رائیں قائم کی ہیں
اور یہ رائیں بڑی حد تک "صائب" بھی ہیں۔ مجھے تو ان کے
بعض خیال افروز جملوں میں خلیل جبران کی سی تازگی، نشتریت
آفاقیت اور بلاغت محسوس ہوئی۔ چند مختصر اقتباسات
ملاحظہ فرمائیے:-

"مسلسل کام نہ کرتے رہنا اسکالرشپ کی موت
ہے۔"[3]

"کسی کے پاس حساس دل اور زندہ ضمیر ہو تو
ان کے احساس ذات کو پیس کر رکھ دینے
کے لیے کم نہیں۔"[4]

"ریسرچ دراصل پی، ایچ، ڈی کرنے کے بعد شروع
ہوتی ہے پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنا گویا
ریسرچ کا ریہرسل ہے۔"[5]

[1] تجزیئے صفحہ ۳۳۹
[2] ایضاً صفحہ ۳۴۰
[3] تجزیئے صفحہ ۲۲
[4] ایضاً صفحہ ۴۲
[5] ایضاً صفحہ ۴۷

"دوسروں کی تحقیق کی لغزشیں آشکارا کرنے
کے لیے بڑی معلومات، بڑی چھان بین، بڑی
اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے"[6]

"قدیم ادب کے بیشتر مطبوعات نا تجربہ کار
ناشروں کے ذریعہ ہم تک پہونچی ہیں۔ ناشروں
کا مطمحِ نظر صحت نہیں، ارزانی تھا۔"[7]

"بے عیبی انسان کے لیے سب سے بڑا عیب
ہے۔"[8]

ڈاکٹر جین کی انشا پردازی کا ایک جوہر یہ بھی ہے
کہ وہ منصف مزاجی کے ساتھ ہر بات کا تجزیہ کرتے ہیں،
اور بے کم و کاست انتہائی مہذب پیرائے میں بیان کر دیتے
ہیں۔ مثلاً اپنے استاد محترم یعنی مرحوم ڈاکٹر سید اعجاز حسین
صاحب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اعجاز صاحب کی شخصیت کا خاکہ پیش کیا جائے
تو ان کی متعدد خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایسی
کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کرنا ہوگا، اگر
انھیں چھپا لیا گیا تو جو شخصیت ابھر کر سامنے
آئے گی وہ ڈاکٹر اعجاز حسین کی نہیں کسی تقدس
مآب مدظلہ العالی کی ہوگی۔"[9]

اُن کی انصاف پسندی کا عالم یہ ہے کہ وہ خود اپنی ذات کو
بھی نہیں بخشتے۔ اپنے سوانحی حالات بیان کرتے ہوئے

[6] ایضاً صفحہ ۶۶
[7] ایضاً صفحہ ۷۰
[8] ایضاً صفحہ ۲۸۹
[9] تجزیئے صفحہ ۲۹۰

ایک مقام پر لکھتے ہیں :-

لکھنے کے لیے صرف متعلقہ کتابیں پڑھ پاتا ہوں
جس کی وجہ سے میں اُردو ادب کے علاوہ دوسری
زبانوں کے ادب سے کافی حد تک ناواقف رہ
گیا ہوں ۔۔ سو دو سو سال کی زندگی ہو تو آدمی
جی بھر کر لکھ پڑھ سکتا ہے ورنہ اگر کچھ لکھ کر چھوڑ
جانا ہے تو صرف اسی پر مرکوز رہنا ہوگا۔ تصنیف
کے کلام کی یہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے کہ بہت پڑھا
لکھا جاہل رہ گیا ہوں ۔[1]

"ڈاکٹر جین کو اُردو زبان سے عشق ہے ۔ انھوں نے محض اضطراری طور پر یہ زبان نہیں پڑھی بلکہ بہت سوچ سمجھ کر "امتحاں گاہ وفا" میں قدم رکھا ہے ۔ وہ اس زبان کی لطافت و شیرینی، اس کی ہر دلعزیزی، اس کے جاہ و جلال اور حسن و جمال کے شیدائی ہیں ۔ اسی لیے اپنے مضامین میں بار بار اس زبان سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

اُردو ادب بھی اسی طرح ایک بہت بڑا
ادب ہے، ترقی پذیر ادب ہے ۔[2]

میرے لیے اُمید افزا بات یہ ہے کہ اردو
کے نا مساعد حالات کے باوجود ریسرچ اسکالروں
میں کام کرنے کا شوق اور لگن ہے ۔ کاش ہم
اساتذہ کو بھی اس شوق فضول سے کسی قدر
فرصت مل سکتی ۔[3]

کیا اُردو پڑھنے والوں کی سب سے بڑی خدمت
یہ نہ ہوگی کہ ملک میں اُردو کے پوسٹ گریجویٹ
شعبے ہیں اُن میں سے بہترین پانسات کو چھوڑ کر
باقی سب کی تالابندی کر دی جائے ۔[1]

تو اے اُردو ادب کے اُستادو! آپ کو ہرگز اپنے
مضمون، اپنے شعبے، اپنے پیشہ پر شرمانے کی ضرورت
نہیں ۔ آپ یقیناً ہندوستانی سماج کی خدمت
انجام دے رہے ہیں۔[2]

اُردو میں ایم۔ اے۔ کرنے کی قیمت آپ کو ادا کرنی
ہوئی۔ بھوپال میں اُردو کی کوئی مزید جگہ نہیں
خود ہمارے یہاں کئی ایم۔ اے۔ اردو بے کار
بیٹھے ہیں ۔[3]

"ڈاکٹر جین کی انشاء پردازی میں ہمیں ایک ایسے طالب علم کی شان ملتی ہے جو ہر لمحہ جویائے علم رہتا ہے اور جس کا مشاہدہ بہت گہرا ہے ۔ اگرچہ وہ خود اُردو کے استاد ہیں اور ایم اے ڈی فل کی ڈگریاں لے چکے ہیں لیکن ان کی علمی تشنگی کا اندازہ درج ذیل عبارتوں سے لگائیے ۔

ریسرچ کے طریق کار کی اور بہتر تفہیم کے لیے میری
تجویز ہے کہ ہر سال اردو تحقیق کا ایک سمر اسکول
[illegible] summer school منعقد کیا جائے جس میں

---

[1] تجزیئے صفحہ ۳۰ ۔ [2] تجزیئے صفحہ ۳۵،
[3] ایضاً صفحہ ۳۲

[1] تجزیئے صفحہ ۲۸ [2] تجزیئے صفحہ ۲۴
[3] مکتوب بنام راقم الحروف از بھوپال مورخہ یکم جولائی ۱۹۵۹ء

منجملہ دوسروں کے چوٹی کے محققین مثلاً پروفیسر مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مالک رام صاحب بھی درس دیں ... کہا جاتا ہے کہ مخطوطات کی روش املا، کاغذ روشنائی اور جلد بندی وغیرہ سے ان کے عہد کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں اس قسم کی شناخت سے نابلد ہوں، سیکھنا چاہتا ہوں اگر تحقیق کا ایسا سمر اسکول منعقد کیا جائے تو میں بھی بطور طالب علم اس میں شرکت کرنا .. چاہوں گا۔" [۱]

کیا اچھا ہو کہ کوئی سر پھرا، بستر بدوش جہاں گرد محقق چھوٹے چھوٹے کتب خانوں کی نیز نجی کتب خانوں کے مخطوط کی چھان بین کے لیے بھارت درشن پر نکل پڑے اور ایک فہرست مخطوطات تیار کر دے۔" [۲]

گویا ان چند صاحب کی تحریروں سے اُن کی نیک نفسی کا پتہ چلتا ہے اور اُن کے خلوص سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، لیکن بعض اوقات وہ قدرے طنزیہ اور تلخ لب و لہجہ، اختیار کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے وہ یہ جتانا چاہتے ہوں کہ

کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاکی

ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:-

"تحقیق کے لیے ایک خاص قسم کے مزاج اور ایک خاص قسم کے علمی پس منظر اور تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ مزاج اور یہ تیاری عام نہیں اس لیے یہ آواز اٹھائی جا رہی ہے کہ تحقیق کی اجازت عام نہیں ہونی چاہیے ...... ریسرچ میں صرف ان طلبہ کو لینا چاہیے جنھوں نے اس کی صلاحیت کا کوئی ثبوت دیا ہے۔ جس شخص نے کبھی ایک مضمون بھی لکھا وہ ایک کتاب کیوں کر لکھ سکتا ہے؟" [۵]

ایک اور مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

تحقیق سے عناد رکھنے والے اساتذہ اپنی تحریر و تقریر میں خالص تحقیق پر طنز کرتے ہوئے کہا کرتے ہیں۔

"میں کھتونی مرتب کرنے کا قائل نہیں۔ میں باریک تحقیق پر عقیدہ نہیں رکھتا۔ میرے نزدیک کسی ادیب کے سال ولادت یا سنہ وفات کا تعین کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

میرا جواب ہے: کہ حضرت کھتونی مرتب کرنے کے لئے متعدد کتب خانے کھنگالنے پڑتے ہیں۔ بڑی دیدہ ریزی کرنی پڑتی ہے۔ یہ آپ کے بس کا روگ نہیں۔ آپ کھتونی مرتب کرنیوالے پٹواریوں کو انکے حال زار پر چھوڑ دیجئے اور کسی کا

---

[۱] تجزیئے صفحہ ۱۹

[۲] تجزیئے صفحہ ۱۸

[۵] تجزیئے صفحہ ۱۲ - ۱۳

[۶] ایضاً صفحہ ۵۲

انتخاب کلام اٹھا کر اس پر تنقید لکھ دیجیے یا اپنی
نئی شاعری کیجیے" [1]

ڈاکٹر جین کا انداز تحریر بہت رواں، دلنشیں، مفید اور عالمانہ ہوتا ہے اور بیک نظر قاری کو ان کی باوقار و متوازن شخصیت نیز ان کے علمی سے روشناس کرا دیتا ہے۔ ان کی نثر سنجیدہ ہونے کے باوصف خشکی و یبوست سے مبرّا ہے دو اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور ان کے قلم کی سحرکاری کی داد دیجیے۔

"ہندی عروض میرے نزدیک ناقص سہی منتشر
نہیں لیکن ان میں جو تھوڑی بہت باضابطگی تھی
عظمت اللہ خاں نے اسے بھی دور کر کے عروض
کو شتر بے مہار کر دیا۔" [2]

"میکالے، تاریخ کو ناول کی طرح دلچسپ
بنا دیتا ہے اُردو کے دونوں آزاد اس سے بھی
بڑے ساحر ہیں۔ محمد حسین آزاد اور ابو الکلام جس
موضوع کو نوک خامہ سے چھو دیتے ہیں وہ ادب
کا جزو ہو جاتا ہے۔" [3]

بعض اوقات ڈاکٹر جین کا قلم نثر میں شاعری کرنے پر اتر آتا ہے اور وہاں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ موصوف میں قدرت نے شعر گوئی کا ملکہ بھی ودیعت فرمایا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"الہلال کیا ہے، اک آگ کا دریا ہے جس میں انگارے
یا آتش سیال نہیں بلکہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کا
سمندر ہے۔" [1]

"شاد، دور حاضر کی سیاست سے بیزار ہیں،
یہی دورِ حاضر تھا جس میں ہر ہاتھ یا تو بھیک مانگنے
کے لیے دراز ہے یا لبادے کے اندر خنجر چھپائے
ہوئے ہے۔ یہ روشنی کا دور نہیں اس میں تو تاروں
کی چھاؤں بھی غائب ہے۔" [2]

"جس طرح شوخی کی برات میں بھوت پریت
راکشس اپنے ڈراؤنے اعمال و اصوات کے ساتھ
شریک تھے اسی طرح جوش کی "یادوں کی برات"
میں بھی علمائے کرام بیشتر شاہد باز، امرد پرست
شرابی، کبابی، گلہندرے یا بھرم راتی، جنونی
سنکے ہوئے افراد ہیں۔" [3]

جین صاحب کی انشا پردازی پر اس وقت تک کوئی رائے مکمل نہ ہوگی جب تک کہ ہم ان کی زندہ دلی، بذلہ سنجی اور ظریف طبعی کا تذکرہ نہ کریں۔ ان بعض نثری تحریریں بلاشبہ پطرس اور شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، رشید احمد صدیقی اور شفیق الرحمان کی یاد دلاتی ہیں۔ صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

"لکھنؤ کی کھیل والیاں جو ککڑی کی توصیف میں
ہانک لگاتی ہیں۔ لیلیٰ کی انگلیاں ہیں مجنوں کی پسلیاں"

---

[1] ایضاً صفحہ ۵۲
[2] تجزیے صفحہ ۱۰۹
[3] تجزیے صفحہ ۲۱۵ - ۲۱۶

[1] تجزیے صفحہ ۲۱۶
[2] تجزیے صفحہ ۲۲۵
[3] تجزیے صفحہ ۲۶۹
[4] تجزیے صفحہ ۳۲۸

ہیں کیا خوب گگڑیاں ہیں، بھوپال کی فرید گگڑیوں
(یعنی یو، پی کے کھیروں) کا ڈیل ڈول دیکھیں تو
سر پیٹ لیں یا غش کر جائیں " ۱؎

جب ایم۔ اے میں داخلہ لینے والوں کی اکثریت
تھرڈ ڈویژن میں بی، اے پاس کر کے آئی ہو
یا ادر ترقی کیجئے تو کسی مضمون میں سپلیمنٹری آیا ہو
یا پھر براہ بھنڈا بی، اے کیا ہو۔ جہاں کوئی
سیکنڈ کلاس بی، اے ہمارے کلاس میں
داخلہ لے تو معلوم ہو جیسے رادھا کرشنن ہیں
ممنون کرنے چلے آئے تو ان حضرت قدسی صفات
کو تاریخ فلسفہ تو درکنار، تاریخ ادب بھی ایک
طومار معلوم ہوتی ہے " ۲؎

اب آپ ہی بتائیے کہ جس انسان کی انشاء پردازی اپنے اندر بیک وقت اتنے گوناگوں محاسن رکھتی ہو اور فنی خوبیوں کے ساتھ جس کی تحریروں میں اسکی شخصیت کے اتنے رنگ جھلکتے ہوں آخر اس مختصر سے مضمون میں اُس کی انشاء پردازی اور شخصیت کا خاطر خواہ جائزہ کیوں کر لیا جائے۔ ؟ —— میرے خیال میں زیادہ بہتر صورت یہ ہوگی کہ ہم موصوف کی کتابوں اور مضامین سے براہ راست استفادہ کریں اور ان کے زریں خیالات سے اپنی جھولی بھر لیں۔

شرط اسما کیلئے ہے تشنہ کامی !

۱؎ تجزیئے صفحہ ۳۲۸ ۲؎ تجزیئے ۳۶ - ۳۷

انشائیہ امیر حسن نورانی

آپ سے ملیئے (قاضی صاحب)

پھریرا بدن، حیرت زدہ چہرہ، ناک نقشہ کسی قدر ہموار، چال مستانہ، گہرا فالسئی رنگ، تقریباً پختہ، چھوٹی چھوٹی ویران سی نیم باز آنکھیں، خشخشی داڑھی، بال جیسے خشخاس اور رائی کی کچی کھچڑی۔ دانت صاف اور مضبوط مگر ناہموار۔ اُبھرے ہوئے کان مگر قوت سماعت، دوسروں کی بات سننے میں کسی قدر ضعیف اور اپنے مطلب کی بات کے لیے خرگوش سے بھی زیادہ تیز آنکھوں پر عینک لٹکی نظر آتی ہے، جسم کبھی شیروانی سے ڈھکا ہوا اور کبھی ملائم کرتے سے، ہاتھ میں کوئی کتابچہ یا اخبار ہر وقت دبا ہوا۔ منہ سے عموماً بیڑی کا دھواں برآمد ہوتا نظر آئے گا۔ یہ ہیں ہمارے مہربان دوست "قاضی صاحب" ایم، اے، سکریٹری شعبۂ اُردو، پورا نام بحر طویل میں ہے اس لیے زیادہ جگہ گھیر لیتا ہے۔ پہلی بار آپ ان سے مل کر کس قدر خوش ہوں گے۔ اکثر اوقات حالت مستی غنودگی میں ملیں گے۔ لیکن ہوش کی حالت محاسنِ اخلاق یا سیاسیات حاضرہ پر مسلسل تقریر کرتے نظر آئیں گے، یہ اور بات ہے کہ الفاظ اور جملے عموماً بے ربط ہوں گے لیکن موضوع میں یکسانیت باقی رہتی ہے۔ گفتگو میں واحد و جمع اور مذکر مونث کا خیال رکھنا کسر شان خیال فرماتے ہیں آپ ٹوک دیں تو جواب ملے گا۔ ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا
قاضی صاحب موصوف عربی زبان کے ایم، اے ہیں۔ اور اُردو ٹائپ میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں حلقہ شام و سحر کی گردش نے شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی میں پہونچا دیا۔ آپ صدر شعبہ کی میزان قدر پر ناپ تول میں پورے اُترے، دیانت و امانت میں قابل قدر لیکن سودی کاروبار سے متعلق ہر سوسائٹی اور انجمن کے رکن بنجانا آپ کا طرہ امتیاز ہے۔ شعبہ کی ڈاک کے سینئر آفیسر کا عہدہ بھی آپ نے خود حاصل کر لیا ہے۔

قاضی صاحب عرصہ تک بھوپال میں رہے۔ جب وہاں کی آب و ہوا نے ناسازگاری کا رخ اختیار کیا تو وہاں سے

رام پور پہونچے جہاں اخلاقیات کا درس بھی لیتے رہے اور بچوں کو درس دیتے رہے۔ مگر زیادہ عرصہ اس ہنگامہ خیز بستی میں جی نہ لگا۔ پٹھانوں سے نپٹنا ایک سید اور پھر قاضی کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس لیے رام پور کو خیرباد کہہ کر .. آخری پناہ گاہ کی تلاش میں سرگرداں ہوئے قسمت نے یاوری کی اور بھارت کی راجدھانی دلی پہونچ گئے، جہاں کی آب و ہوا اور ماحول قاضی صاحب کو بہت راس آیا۔ کچھ دنوں سیر و تفریح میں گذارے اُنھوں نے پرانی دلی کے گلی کوچوں کے طواف میں کافی وقت صرف کیا۔ عام معلومات و مشاہدات میں اضافہ ہوا۔ کوئی گلی کوچہ نہیں بچا جس کو اُنھوں نے اپنے قدموں سے پائمال نہ کیا ہوا۔ البتہ نئی دلی کا جغرافیہ قاضی صاحب ابتک سمجھنے سے معذور ہیں یہی سبب ہے کہ حسب عادت بس کی نرم و گداز گدی پر نیند آگئی اور وہ منزلِ مقصود پر اُتر نہ سکے تو بس نے اُن کو نئی دلی پہونچا دیا اب وہاں سے پرانی دلی واپسی ان کے لیے بڑی زحمت بن جاتی ہے۔ اس لیے ادھر کا رخ بالقصد کبھی نہیں کرتے۔

قاضی صاحب کرشن کنہیا کے وطن متھرا کے رہنے والے ہیں اور اپنے علاقہ کے خاندانی قاضی ہیں۔ وہ اپنے آبائی پیشہ کو عملاً ترک کر چکے ہیں۔ کیوں کہ ضرورت مند ان کی طرف رجوع نہیں کرتے ممکن ہے ان کے حلیہ کو غیر شرعی سمجھتے ہوں۔ کیونکہ آپ کا حلیہ شرعی اور غیر شرعی کے درمیان معلق سا ہو کر رہ گیا ہے۔ تاہم عہدہ قضاۃ پر وہ بزعم خود ابتک فائز ہیں اور اس سلسلہ میں اپنے ان حقوق کو حکومت سے حاصل کرنے پر کمر بستہ ہیں جو ان کے اجداد کو عہد جہانبانی میں حاصل ہوئے تھے اُنھوں نے مسلسل جد و جہد سے یہ فرمان شاہی کی نقل بھی حاصل کر لی ہے جس کے ذریعہ سے ان کے مورث اعلیٰ کو دو سو ایکڑ آراضی بطور معافی عطا ہوئی تھی۔ اب قاضی صاحب اس جائداد کی بازیافت کیلئے سرگرم عمل ہیں۔

قاضی صاحب بارہ بجے دن کے بعد عموماً دو گھنٹہ مراقبہ کی حالت میں رہتے ہیں۔ اس وقت ان سے کسی کام کے سلسلہ میں رجوع کرنا زیادتی ہے ہاں اگر آپ کو اُن کی ضرورت ہے تو پھر ایک پیالی گرم چائے کا بار اٹھایئے جس کا نام سنتے ہی قاضی صاحب جہاں تک بھی پہونچ چکے ہوں گے فوراً واپس آ جائیں گے۔ چائے ان کی روحانی اور جسمانی غذا بھی ہے اور ایسا تازیانہ بھی ہے جس کی حرکت پر وہ مسائل آگے بڑھ سکتے ہیں۔

قاضی صاحب طبعاً بہت نیک اور مرنجان مرنج مسلک کے آدمی ہیں۔ اسی کے ساتھ ... وہ کم کام اور زیادہ دام کے قائل نہیں۔ اور ... پر عامل بھی ہیں۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ... مساویانہ برتاؤ کرتے ہیں لیکن عملی کاموں کے سلسلہ میں جہاں کچھ لینے دینے کا معاملہ ہو وہ مساوات کے قائل نہیں رہتے۔ قاضی صاحب اپنی ذات کے لیے نہایت خوش تدبیر اور باعمل انسان ہیں۔ بے سرو سامانی میں ایسے اقدامات کر گزرتے ہیں جو دوسروں کے لیے ممکن نہیں یہ سب کا وہ نیک نفسی اور قاضیت کے زیر سایہ انجام دیتے ہیں مثلاً اچانک وہ وسط شہر میں ایک مکان کے مالک بن گئے جس میں پہلے کرایہ پر رہتے تھے۔ جبکہ دہلی میں ملازمت ملنا شادی کرنا .. آسان ہے مگر مکان ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

قاضی صاحب اپنے احباب کے علاوہ معمولی شناسا لوگوں کے سامان خورد و نوش پر دست درازی کرنا اپنا فطری حق سمجھتے ہیں، ان کا حملہ اشیاء خوردنی پر اتنا شدید ہوتا ہے کہ صاحب سامان منہ دیکھ کر رہ جاتا ہے۔ دوسروں کو کھلانے پلانے میں عموماً ان کی کوتاہ دستی ضرب المثل بن چکی ہے دن میں کئی درجن چائے کی پیالیاں ان کے کام و دہن کی نذر ہو جاتی ہیں مگر ایک دو سے زیادہ کی قیمت ان کو خود نہیں ادا کرنی پڑتی ہے عموماً ساتھیوں سے ہر اس شخص کے ساتھ رستوران جانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جس پر شبہ ہو جائے کہ وہ چائے پینے جا رہا ہے خواہ وہ استاد ہو طالب علم ہو یا کلرک یا چپڑاسی قاضی صاحب کو کچھ دنوں سے تصنیف و تالیف کا شوق بھی ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے سب سے پہلے اُردو زبان سکھانے کیلئے ایک قاعدہ مرتب فرمایا۔ اس میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے اگر یہ قاعدہ شائع ہو گیا تو بقول قاضی صاحب اردو دنیا میں انقلاب آ جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ایسا عجیب و غریب قاعدہ مبتدیوں کے لیے پہلی بار لکھا گیا ہے۔ جس میں الف بے سکھانے کے لیے بچوں اور بالغوں کو فصیح و بلیغ اُردو میں ہدایتیں دی گئی ہیں تاکہ ہدایات پڑھ کر وہ الف، بے کو پہچان سکیں۔ دوسری معرکتہ الآرا کتاب قاضی صاحب کی خود نوشت سوانح حیات ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ اس میں قاضی صاحب نے اپنا شجرہ نسب بڑی کاوش سے مرتب کر کے شامل کیا ہے اور تاریخی کتب کی چھان بین کر کے اپنا نسب حضرت آدم تک پورا کر لیا ہے درمیان کی ساری اُلجھی کڑیاں کو بڑی جانفشانی اور جابکدستی سے ملایا ہے

قاضی صاحب اپنی اہلیہ محترمہ کا بہت احترام و لحاظ کرتے ہیں۔ ان کے آرام و آسائش میں خلل انداز ہونا پسند نہیں کرتے۔ اسی لیے صبح سویرے چاء ناشتہ کے بعد خانہ بدوشوں کا طریقہ اختیار کر لیتے ہیں اور گھر سے نکل جاتے ہیں۔ بقول میر حسن

نہ سدھ بدھ کی لی اور نہ جنگل کی لی
نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی

دلی میں سچ مچ کے جنگل تو نہیں البتہ انسانوں کا بہت بڑا جنگل ہے جس میں گھومتا پھرتا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کبھی کبھی کوئی شکار بھی ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس لیے کھانے کا خرچ بہرحال بچ رہتا ہے۔ ان کی گھر واپسی عموماً رات میں اس وقت ہوتی ہے کہ جب کھانے اور سونے میں گھنٹہ یا نصف گھنٹہ کا وقفہ رہ جاتا ہے اس طرح نہ وہ گھر والی کیلئے زحمت بنتے ہیں نہ وہ قاضی صاحب کو کسی زحمت میں مبتلا ہونے کا موقع دیتی ہیں۔ یہ ان کی بڑی خوش قسمتی ہے۔ قاضی صاحب کے اوصاف حمیدہ پر تفصیلی روشنی مختصر خاکہ میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ نہ دریا کو کوزے میں بند کرنا ایسا آسان کام ہے اس کے لیے دوسری قسط پیش کرنا ہوگی۔

معذرت

افسوس ہے کہ کاتب صاحب کی غلطی کے باعث ماہ اکتوبر کے پرچہ میں ماہ نومبر ۱۹۶۶ء شائع ہو گیا اصل میں گذشتہ پرچہ ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء کا تھا — قارئین نوٹ فرمائیں۔

— منیجر

۔ ڈاکٹر عبد الغفار (صدر شعبہ فارسی بھاگلپور یونیورسٹی)

شاہ فقیر اللہ آفرین لاہوری

کسی تذکرہ میں آفرین کے مفصل حالات نہیں ملتے۔
لاہوری؎۱ نے لکھا ہے کہ آفرین لاہوری الاصل تھے،
عالمگیر بادشاہ کے عہد کے شعرا میں تھے۔ بلاشبہ
رین ایک بڑے صوفی بزرگ اور مرد کامل تھے ۔
ن آرزو نے لکھا ہے کہ اُن کا اصلی وطن معلوم نہیں ۔
ادبلگرامی نے اُن کی جائے پیدائش لاہور اور خاندانی
ت قبیلۂ جوہیا سے بتایا ہے۔ مصحفی؎۴ نے بھی اُن کی جائے
ائش لاہور لکھا ہے۔

خان آرزو؎۵ کا بیان ہے کہ آفرین خوش مشرب
اداور متوکل تھے۔ صوبہ داران لاہور خصوصاً عبد الصمد خاں
دراور زکریا خاں بہادر اُن کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے

وہ اہل دنیا سے بہت کم ملتے تھے اور اکثر اوقات اذکار و
اوراد میں مشغول رہتے تھے۔ بہت شیریں زبان تھے اور
ناصر علی کے طرز بیان کو پسند کرتے تھے۔ آفرین فارسی
کے ایک بڑے شاعر بھی تھے لیکن اُنھوں نے شیخ سعدی
اور مولانا روم کی طرح کسی کی مدح نہیں کی۔ لیکن اپنے
ایک عزیز شاگرد حاکم لاہوری کی شادی کے موقعہ
پر مبارک باد میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع اور مقطع
ذیل میں نقل کیا جاتا ہے؎۶۔

بگو بحاکم ما ای صبا مبارکباد
زما وز ارض و سما مبارکباد
چنیں کہ صورت و معنی زتست ای حاکم
ز آفرین و ہم از اولیا مبارک باد

حاکم؎۷ کا بیان ہے کہ آفرین اکثر بطرز میرزا صائب اور

مردم دیدہ مطبوعہ ص ۱۸ ؎۲ ؎۵ مجمع النفائس خطی
؎۳ خزانہ عامرہ مطبوعہ ص ۲۸
؎۴ عقد ثریا مطبوعہ ص ۸

؎۶ و ؎۷ مردم دیدہ ص ۱۸ و ۲۲

کبھی بجثل ناصر علی مشق سخن کرتے تھے۔ عنفوان شباب میں تحصیل علم کی اور جید عالم ہوگئے۔ علم رمل اور علوم عربیہ میں فارغ التحصیل تھے اور شعر و شاعری سے پوری رغبت تھی۔ وہ کتاب دانی میں ماہر اور بیتطیر اور افادہ مثنوی معنوی میں یگانہ اور بے ہمتا تھے۔ استادوں کے منتخب اشعار بہت پڑھتے تھے۔ ان تمام کمالات کے باوجود وہ خود کو کمتر سمجھتے تھے اور فقرار اور غربار سے تواضع اور انکساری سے ملتے تھے۔ لیکن امرار کے ساتھ استغنا اور کبر سے پیش آتے تھے وہ کسی کے شعر پر اعتراض نہیں کرتے تھے شعرائے سلف کو بھی عزت کے ساتھ یاد کرتے تھے قناعت اور توکل میں بے نظیر تھے۔ قائم لاہوری کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"از اکثر مردم شنیده می شد که در گوشهٔ اتر وا فاقه‌ها می کشید"[1] والہ داغستانی[2] کا بیان ہے کہ آفرین لاہوری سخن سرائی میں مشہور تھے اور سراپا درد تھے۔ ایسی دردمندی کم لوگوں میں پائی گئی ہے۔ عشق حقیقی کی وجہ سے اُن کے کلام میں بلا کا درد اور جوش پیدا ہوگیا ہے اگر وہ ایران میں نشو و نما پاتے تو سخنوران زماں کے ہم پایہ سمجھے جاتے۔

آزاد بلگرامی[3] کا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"در شاعری بود معنی آفرین و شائستهٔ صد ہزار آفرین از مردم فناجبہ است"

مصحفی[1] نے لکھا ہے:

"در معاصرین خویش شاعر شیریں زبان و قائل فصاحت بیان گذشته[2]"

خوشگو نے لکھا ہے کہ لاہور میں اُس کو آفرین سے ملاقات کا اشتیاق ہوا لیکن وہاں کم رہنے کی وجہ سے وہ اُن سے ملاقات نہیں کر سکا۔ خوشگو نے ایک غزل آفرین کی مدح میں لکھی تھی جسے آفرین کی خدمت میں بھیجد یا۔ آفرین اس غزل کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُس غزل کے چند اشعار ذیل میں لکھے جاتے ہیں جن سے آفرین کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے:

بالکمال آفرین باداز دو عالم آفرین
آفرین صد آفرین بل ہزاران آفرین

شاہ لاہور سخن مالک رکاب ملک نظم
کز سپاہ لفظ و معنی کوس زد در روم و چین

ای ز شاگردان درگاہ تو استادان وقت
کہ ز استاد جہان شاگرد رب العالمین

والہ داغستانی[3] کا بیان ہے کہ آفرین نے بعض جگہ غلط لغات اور اصطلاحات استعمال کئے ہیں۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ مولانا رومؒ کی طرح آفرین نے مطالب کو لغات، اصطلاحات، الفاظ اور اصول شاعری پر فوقیت دی ہے۔ شاعری کو انھوں نے اپنی شہرت اور نیکنامی کا ذریعہ نہیں بنایا کیوں کہ وہ مرد فقیر تھے خوشگو[4] نے

---

[1] مردم دیدہ ص ۲۲　[2] ریاض الشعرار ورق ۴۸
[3] خزانہ عامرہ ص ۲۸

[1] عقد ثریا ص ۸　[2] سفینہ خوشگو ص ۲۳۹ و ۲۴۰
[3] ریاض الشعراء ورق ۴۸　[4] سفینہ خوشگو ص ۲۳۹

لکھا ہے کہ لوگ کہتے تھے کہ نوے سال کی عمر میں بھی آفرین خضاب لگاتے تھے۔ کسی نے اُن سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے فی البدیہہ کہا۔

دشمن زندگی ست موی سفید
روی دشمن سیاہ باید کرد

آزاد بلگرامی[1] کا بیان ہے کہ ۱۱۴۳ھ اور ۱۱۴۷ھ میں اُسنے لاہور میں شاہ آفرین سے شرف ملاقات حاصل کی۔ والہ داغستانی[2] نے لکھا ہے کہ ۱۱۴۷ھ میں اُس نے لاہور میں آفرین سے ملاقات کرنا چاہا لیکن انھوں نے اُس سے ملاقات نہیں کی کیوں کہ وہ اہل دنیا سے اور خصوصاً متمول لوگوں سے ملنا ترک کرکے گوشہ نشین ہو گئے تھے اس لیے والہ داغستانی نے ایک رقعہ، ایک قصیدہ، چند غزلیں اور ذیل کا شعر لکھ کر بہت معذرت کے ساتھ اُن کی خدمت میں بھیجا۔

دیدن من وحشت افزاید بیا دمن بساز
نکتہ تسمع معیدی خیر دان من ان یراہ

جب آفرین، والہ داغستانی کی خستہ حالی سے واقف ہوئے تو آئے، معذرت چاہی اور چند دن والہ داغستانی کے یہاں رہے۔ چونکہ آفرین سراپا مبتلائے دردِ عشقِ الٰہی تھے اس لیے اُن کی ملاقات اور باتوں سے والہ داغستانی کی عجیب کیفیت ہوئی۔ اُس نے ایسا دردمند کم ہی لوگوں کو پایا تھا جب تک وہ لاہور میں رہا اکثر آفرین سے ملتا رہا۔ اُن کی صحبت نے اُس کے دلولہ اور شورِ عشق کو بڑھا دیا تھا۔ (جس طرح حضرت شمس تبریزؒ کی صحبت نے مولانا رومؒ کے شورِ عشق کو بڑھایا تھا) غالباً شاہ آفرین ہی کی صحبت کا اثر تھا کہ والہ داغستانی کو دوست سے کوئی محبت نہیں تھی اور عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک پہونچا۔ حاکم لاہوری[3] نے لکھا ہے کہ نواب عبدالصمد خاں سیف الدولہ نے دوبار آفرین سے ملاقات کرنا چاہا لیکن انھوں نے ملاقات نہیں کی۔ آخر اپنے ایک مخلص کی تحریک سے انھوں نے (آفرین نے) نواب عبدالصمد خاں سے ملاقات کی نواب مذکور نے اُن کی بڑی تعظیم کی اور اپنے مسند کے پاس بٹھایا اور ایک روپیہ یومیہ کا وظیفہ بھی اُن کے لیے مقرر کیا۔

حاکم لاہوری سے آفرین کے گہرے تعلقات تھے گرچہ وہ اُن کا شاگرد تھا لیکن وہ اُس کو بہت عزیز رکھتے تھے ایک بار حاکم نے مثنوی ناصر علی اور قصائد عرفی بطور نذرانہ آفرین کو پیش کیا تھا۔ جب آفرین قریب المرگ تھے تو حاکم نے حضرت سید الشہدا کی منقبت میں ایک قصیدہ کہا جس کے دو بیت ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:

چوں سجدہ کہ بگسلد و برزمین فتد
طی گشت عمرِ ماند بدل جا بجا گرہ

خوش آن زمانہ می کہ پی یاد دیدہ ام
می زد بلطف یار بہ بند قبا گرہ

آفرین نے اس قصیدہ کو بہت پسند کیا اور رو رو کر کہا کہ وہ جا رہے ہیں اُن کے بعد حاکم اُن کی جگہ لے گا۔ اُس کے لا

---

[1] سروِ آزاد مطبوعہ ص ۲۰۵
[2] ریاض الشعرا، ورق ۴۸
[3] مردم دیدہ، ص ۲۰، ۲۲

ذیل کا شعر پڑھا ۔

جہاں را سانسنہ بی کد خدا
یکی می رود دیگر آمد بجا

حاکم کا بیان ہے کہ آفرین نے اسّی سال سے زیادہ کی عمر میں ۱۱۵۴ھ میں لاہور میں وفات پائی اور اپنے گھر میں مدفون ہوئے ۔ حاکم نے اُن کی وفات پر ایک قطعہ کہا جس کا مصرع تاریخ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے ۔

"رفت نقاد معنی از عالم"

قدرت اللہ[1] اور آزاد بلگرامی[2] نے بھی سال وفات ۱۱۵۴ھ لکھا ہے معصفی[3] نے سال وفات ۱۱۵۰ھ لکھا ہے جو غلط ہے ۔ اس سلسلہ میں آفرین نے عزیز شاگرد حاکم لاہوری اور آزاد بلگرامی کا بیان زیادہ مستند ہے ۔

شاگردان آفرین لاہوری

۱۔ شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری[4] (۲) عنقا : عہد عالم گیری میں وفات پائی

(۳) ملا نتھو فصاحت : اُس کا ذیل کا شعر مشہور ہے

کردم فرامش از دل شعر اسیر و صائب
تا خوانده ام فصاحت دیوان آفرین را[5]

تصنیفات آفرین لاہوری

۱۔ مثنوی ابجد فکر :۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد میں لکھی گئی

(۲) مثنوی انبان معرفت :۔ بہادر شاہ کے عہد میں لکھی گئی

(۳) " ہیر رانجھا :۔ فرخ سیر " " "

(۴) دیوان غزلیات وقصائد :۔ حاکم لاہوری کے بیان کے مطابق تقریباً چھ ہزار شعر اور والہ داغستانی کے مطابق تقریباً دس بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ راقم الحروف کو رضا لائبریری رامپور اور خدا بخش لائبریری جیسے نامور کتاب خانہ میں دیوان یا کلیات آفرین کا کوئی نسخہ نہیں ملا ۔

---

[1] نتائج الافکار ص ۵۹ [2] خزانہ عامرہ ص ۲۸
[3] عقد ثریا ص ۸ [4] مردم دیدہ
[5] ریاض الشعراء ورق ۴۸

سحابِ سخن مولانا ابر احسنی گنوری کے

خطوط، واحد پریمی کے نام

5-9-66

عزیزمن دعا

لفافہ ملے کئی دن ہوگئے اس دوران میں کئی سفر کرنے پڑے اور مصروفیتوں نے بیچھا نہ چھوڑا بہر حال آج کچھ خلعہ فرسائی[1] کا موقع ملا اور یہ چند لفظ حاضر کردیئے۔ اگر پسند آئیں شامل کرلینا۔

وہ "آذر"[2] تو بند ہو ہی گیا ہوگا اس لئے میں نے رسمی اور خوشامدانہ رائے نہیں لکھی تھی جس پر منھ سکوڑا گیا تھا۔ بجا و بے جا جن کو میں نے خریدار بنایا اور جنھیں زائد رقم دلوائی انکے طعنوں کا کیا جواب دوں۔

ابر احسنی

3-12-66

عزیزم دعا

تم بڑے ضدی ہو۔ میں نے جس چیز کو قصداً ترک کیا تھا جو برائے "ملت" تھا وہ تم نے کرالیا تاکہ تم خوش رہو۔

---

[1] میری گزارش اور خواہش پر مولانا نے صاحب نے میرے پہلے مجموعۂ غزلیات "گلِ نو" میں شریک کرنے کے لئے رائے عنایت فرمائی تھی لیکن کیونکہ اس رائے میں اشعار پر تبصرہ نہیں تھا اس لئے میں نے پھر گذارش کی کہ کچھ اشعار پر بھی اظہارِ خیال کر دیجئے۔ تاکہ رائے طویل اور مکمل ہو جائے۔ اس پر مولانا نے یہ خط لکھا تھا اور اشعار پر تبصرہ کیا تھا۔ (واحد پریمی)

[2] ماہنامہ "آذر" بھوپال سے میری ادارت میں شائع ہوتا تھا جو چھ سات شماروں کے بعد بند ہوگیا تھا۔ (واحد)

مضمون کو مربوط کرتے ہوئے جن اشعار پر میں نے کچھ کہا ہے انکو لکھ کر انکی تفسیر نیچے لکھدو مجھے الگ الگ شعر لکھنے میں
دقت ہوتی تمھیں میری مصروفیات کا علم نہیں۔
تمھارے خط کے جواب میں صبح ہی ایک خط لکھ کر روانہ کر چکا ہوں آج ہی کی ڈاک سے تمھارا یہ لفافہ ملا گیا اور دیگر
کام چھوڑ کر اسے ہی لے بیٹھا اب یہ دونوں خط تمھیں ساتھ ساتھ ملیں گے۔

دعاگو

ابراحسنی

23-12-66

عزیزگرامی! دعائے ترقی درجات

تمھارا خط ملا ہر شخص اپنی تعریف سنکر خوش ہوا کرتا ہے۔ مجھے بھی خوشی ہوئی۔ کیونکہ تم نے دل کھولکر میری تعریف کی ہے۔[1]
مگر میرے عزیز میں اس تعریف سے اس وقت خوش ہوسکونگا جب اس کی باتوں کو ذہن نشین کرکے کلام میں استعمال کروگے
اور دنیا تمھاری استادی و فن دانی تسلیم کریگی۔ اور وہ خوشی حقیقی خوشی ہوگی ویسے رسمی طور پر میں تمھارے خط سے
کافی خوش ہو چکا ہوں۔

مجھے برادرم تحفا صاحب تلامذہ کا عرفان نہیں۔ تمھارا کلام اور تحریریں نظر نواز ہوتی رہتی ہیں اسلئے میں نے یہ اندازہ
صحیح کیا ہے کہ تمھیں معائب کلام سے کافی دلچسپی ہے اور علم ہے اور ایک شاعر کو اسکی ہی ضرورت ہے یہی اس کے
وقار کو بڑھانے کا ذمہ دار ہے تم کٹک کے رسالے "شاخسار" میں لوگوں کی غلطیوں کی گرفت کرتے رہتے ہو میں
اسے کچھ اچھی بات نہیں سمجھتا۔ اس سے ایک وقت ایسا آجائے گا۔ کہ جب ایڈیٹر سے یہ مجروح لوگ خفا ہونگے تو ایڈیٹر
بھی تم سے دامن بچائیگا۔ اور یہ لوگ تو تمھارے دشمن ہو ہی جائیں گے۔ اور دشمنی، عداوت، دل شکنی اس دور میں
قطعی حرام ہو چکی ہے۔ اس دور میں محبت یگانگی ہمدردی کرنے والے ہی سرسبز ہونگے یہی فرمان الٰہی ہے۔

میری خواہش ہے کہ ان سب لوگوں کو اس کتاب[2] کے ازبر کرنے کی خدا توفیق دیئے جو داغ کے گھر کے چشم و چراغ
ہیں مگر مصیبت یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے نفع و نقصان کا نہ عرفان ہے نہ پروا۔ جیسے کوئی نشہ کا عالم ہو اُردو کے لئے یہ دور
بڑا اروح فرسا ہے۔ اُردو کا ذوق ہی ختم ہو گیا تو اسکے رموز و نکات کی کسے پروا ہو حالانکہ ہر شاعر اپنا وقار
چاہتا ہے۔ مگر یہ نہیں سوچتا کہ وقار علم سے ہوتا ہے کھوکھلے لوگوں کا کوئی وقار نہیں کرتا اور علم کے لئے مستقل مفید مطالعہ
کی ضرورت ہوتی ہے۔

---

[1] از راہِ شفقت آبر صاحب نے اپنی کتاب "میری اصلاحیں حصہ دوم" عنایت فرمائی تھی جس پر میں نے پسندگی کا خط لکھا تھا (واحد)
[2] "میری اصلاحیں حصہ دوم" مولفہ مولانا ابر حسنی گنوری (واحد پریمی)

برادرم شفا صاحب[1] سے سلام کہو انکو میں نے ایک معاملۂ خاص کے سلسلے میں مفصل خط لکھا تھا مجھے اس کے تسلی بخش جواب کا انتظار ہے۔

خدا کرے "گل نو" سدا بہار رہنکر مشام جاں کو معطر کرنے کیلئے مجلہ مسود شہبو دیہ آجائے آخر وہ کس منزل میں ہے۔

شفا صاحب سے کہو آپ کہ ایک شاگرد کا خط کتاب کی خریداری کے سلسلے میں ملا ہے لوٹ رہے۔

ہاں میاں بحمداللہ میں مع الخیر ہوں تائیدات الٰہی سایہ فگن ہیں ایک بہت اہم اور دلچسپ سوال کرتا ہوں - اس کا جواب دو۔ دیکھوں تمہارا دماغ کہاں تک رسائی کرتا ہے وہ سوال یہ ہے۔

شاعر کس سبب سے ترقی و شہرت کی منزلیں طے کرتا ہے؟ اور کیوں اور کب تنزلی کی طرف تیزی سے دوڑنے لگتا ہے۔

بہی خواہ ، ابرار حسنی گنوری

15-2-67

عزیز گرامی سلمہ اللہ تعالیٰ

"گل نو" کی خوشبو سے مشام جاں معطر ہوا۔ خدا کرے یہ گل نو [illegible] جاذبِ نظر بنا رہے بڑی اچھی آرا شامل ہیں اور معتبر حضرات کی۔ کئی جگہ[2] سقوط نظر [illegible] نہ ہوتا اللہ مبارک کرے۔

شفا صاحب کے حالات خدا کرے [illegible] اُن سے [illegible] نے بری طرح واقعات کو مسخ کرکے آپ کے سامنے پیش کیا اصل بات [illegible] انتقامی جذبہ تھا اور کچھ نہیں اور میں اس [illegible] پر مجبور ہوا کہ آپ کے شاگرد کا معاملہ تھا اور میں موقع نہیں دینا چاہتا تھا [illegible] بات مجھ پر آئے ورنہ اُن کی نیت سے پہلے سے آگاہ تھا کل شیٔ یرجع الیٰ اصلہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ یہی کرسکتے تھے

بحمداللہ بعافیت و مطمئن ہوں۔ والسلام

شہیر طلب ، ابرار حسنی

27-7-68

عزیزم دعا

تمھارے شفیق اُستاد اور میرے عزیز بھائی شفا صاحب ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ اس جدائی کا دل پر

---

[1] استاذی نباض سخن حضرت شفا گوالیاری (مرحوم)　　(واحد پریمی)

[2] "گل نو" میں کچھ جگہ ہی کا سقوط میں نے دانستہ روا رکھا تھا جس کی نشاندہی ابر صاحب نے کی ہے (واحد)

کتنا بڑا اثر ہے اس کا اظہار الفاظ و بیان کی حدود سے باہر ہے۔ ابھی مرحوم کے مرنے کے دن نہیں تھے یہ بے وقت کی موت بہت سی اُمیدوں کی موت ہے، بہت سی تمناؤں کی موت ہے۔ مگر موت نہ کسی کی اُمید کو دیکھے نہ تمناؤں کی پرواکرے ایسے تو اپنے کام سے کام رہتا ہے تم پر کس قدر یاسیت کا عالم طاری ہوگا میں اس کا اندازہ کرتا ہوں مگر عزیزمن اب یاسیت کچھ تمھارا نقصان ہی کرسکتی ہے فائدہ نہیں پہنچا سکتی اب تو جرأت مردانہ دکھانے کا وقت ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ تم پر برادر مرحوم نے مخصوص ریاض کیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ تم شاد مرحوم آخر ان کے وفادار رہے ہو اگرچہ مجھے بیوفائی کرنے والوں کا بھی حال معلوم ہے اب تمھارا فرض ہے کہ خود استادی کو مستحکم کرو اور جس طرح مرحوم نے اپنے استاد کے مشن کو آگے بڑھایا اسی طرح تم مرحوم کے مشن کو آگے بڑھاؤ تم بہت کچھ جانتے ہو تم میں کافی طاقت ہے اور ایسا دنیا میں طاقتور ہی زندہ رہ سکتے ہیں اگرچہ کوئی انسان ہمہ دانی کا دعوی نہیں کرسکتا؟ انسان سے غلطیاں انسان ہونے کے ناطے آخر دم تک ہوتی رہتی ہیں اس طرح جو خامیاں فارغ الاصلاح ہونے کے بعد رہ جاتی ہیں ان کو معترضین کے اعتراضات پورا کر دیتے ہیں۔ اعتراضات سے کبھی نہ گھبراؤ۔ معترض دشمن کے روپ میں بڑا دوست ہوتا ہے جو بے صنت استاد ہماری کمزوریوں سے آگاہ کرتا ہے۔ تم ہوشمند ہو، ہوشمندی کا ثبوت دیتے رہو، خدا تمھاری مدد کرے۔

اس موقع پر یہ کہنا ہے کہ جو کام میرے لائق ہو بے تکلف کہو۔ میری طبیعت کے لوگ غلط معنی بھی لے لیتے ہیں لیکن بحمداللہ دل صاف قدرت نے عطا کیا ہے۔ یہ کہنا فرض ہی جانتا ہوں اب یہ تمھاری اہلیت وصلاحیت پر منحصر ہے کہ جو معنی چاہو نکالو۔ میری دعائیں اور ہمدردیاں تمھارے ساتھ ہیں۔

میرا پلاسٹر کٹ گیا ہے ہڈی جڑ گئی ہے لیکن درد اور ورم باقی ہے مٹھی نہیں بندھتی۔ دعا کرو

تمھارا بہی خواہ وخیر طلب

ابر احسنی

گنور ضلع بدایوں
۶-۱۱-۶۹

عزیز مکرم سلام ورحمتہ

خط ملا۔ دیا۔ لیا کے قافیے میں ریا لکھنے میں میرے نزدیک کوئی خرابی نہیں قافیے کی سب شرطیں پوری ہورہی ہیں

۱؎ میں نے ۱۹۶۰ء میں شفا صاحب کا تلمذ اختیار کیا تھا اور ۱۹۶۲ء میں فارغ الاصلاح بھی (تحریری طور پر) ہوگیا تھا ابر صاحب کو اس کا علم تھا بلکہ ماہنامہ رہنمائے تعلیم دہلی میں آبر صاحب نے سند فارغ الاصلاح بھی شائع کی تھی (واحد)

۲؎ مولانا کے گر جانے کی وجہ سے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ ہوگئی تھی (واحد)

۳؎ اپنی غزل جس کا مطلع تھا۔ ہم کہ خواہش بیجا ساقیا نہیں کرتے جو ملے حقارت سے وہ پیار نہیں کرتے

ساقیا۔ کے معنی ہوئے اے ساقی۔ الف اسمیں ندا کا ہے اور یہ لفظ ساقی کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے
بحمداللہ بعافیت ہوں۔ آپ یہ سب قافیے استعمال کر سکتے ہیں کوئی جاننے والا تو اعتراض کرے گا ہی
نہیں ناواقف لوگ البتہ اپنا رعب جمالیتے کو اُلٹے سیدھے اعتراضات کیا کرنے ہیں اگر کوئی اعتراض کرے تو اس
سے کہنا اپنا اعتراض لکھ کر اپنے دستخط کے ساتھ دیدو اور وہ مجھے بھیج دینا۔

دعاگو ابراحسنی

ہاں ایک بات ذہن میں آئی آپ ساقی کو ساقیا اس وقت استعمال کر سکتے ہیں جب ساقی کو مخاطب کرنا ہو ایسا
پوزیشن میں استعمال نکریں جیسے مجھے آواز دی ہے ساقیا نے

محفل میں جلوہ ریز مرا ساقیا نہیں

کیونکہ جیسا میں نے لکھا ساقیا کا الف آخر ندا کا ہے جب بلانا یا مخاطب کرنا ہو اسی وقت ساقیا استعمال
کیا جا سکتا ہے اگر مصرع طرح لکھدیتے تو میں وضاحت سے لکھتا کہ ساقیا لکھنا روا ہے یا نہیں کبھی کبھی اپنی
خیریت سے اطلاع دے دیا کیجئے

کنور ضلع بدایوں یو، پی

8-5-70 . مجی دعائیں

خط پاکر مسرت ہوئی مصرع ہذا میں عجز کا ز اسی قاعدہ سے گرتا ہے جس قاعدہ سے " دل ہی تو
ہے نہ سنگ وخشت" کی ت گرتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایسی مثمن بحریں جو ڈبل ارکان سے بنتی ہیں جیسے مفعلن مفاعلن × ۲۔ اس کے ایک ہی
حصہ کو ایک مصرع فرض کر لیا جاتا ہے اور چونکہ مصرع کا آخر حرف گرانا جائز تسلیم کر لیا گیا ہے وہ عمل یہاں
کر لیا جاتا ہے یہی حال فاعلن مفاعلن میں ایک مصرع مان کر کیا گیا ہے۔

عروض میں اس کے جواز کا کوئی بین ثبوت تو نہیں مگر بات چل پڑی ہے چل رہی ہے ہم اسے غلط نہیں
کہہ سکتے

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں دعاگو ابراحسنی

لہ وہ مصرع جس کے بارے میں میں نے استفسار کیا تھا ذہن میں نہیں بہرحال یہ ایک عروضی استفسار تھا جس کا جواب
ابرصاحب نے مرحمت فرمایا تھا (واحد)

23-0-71

عزیزم واحد صاحب دعا

ابھی دعوت نامہ[لہ] ملا ہے خوشخبریاں قابل داد ہیں وفاداری ہی کا یہی تقاضہ ہے وفا کا اظہار منہ پر نہیں پیچھے ہی کیا جانا چاہیے جزاکم اللہ خیراکم اللہ خیرالجزا۔

مصارف کی اطلاع دینا میرا کام نہیں تمھارے سمجھنے اور طے کرنی کی بات ہے سودا بازی کرنے کو تمہیں کافی شعور [illegible] چاہیے۔ [illegible] خصوصاً اس موقع پر نکراؤ اور خود ہی اپنی کمیٹی میں طے کر کے لکھدو اُمید ہے تم خود ایسا عمل نہ کرو گے جس سے [illegible] عدم امتیاز کا احساس ہو خصوصیت اور عدم خصوصیت کا ماحول بیدار ہو تاریخ سے جلد مطلع کرو۔ مجھے ۲۰ دن پہلے تاریخ معلوم ہو جانی چاہیے تاکہ رزرولیشن کرا سکوں دعا ہے خدا تمھارے عزائم میں کامیاب [illegible]۔ اگر یہ بتادو کہ اور کون کون آرہا ہے تو اچھا ہو

خیر طلب ابراحسنی

جولائی کا مہینہ بارش کا ہوتا ہے اس پر غور کر ہی لیا ہوگا

---

7 - [illegible] - 71

عزیزم واحد صاحب دعائیں

۲۲ جون کو تمھارا یادر شفا کے مشاعرہ کا دعوت نامہ ملا تھا مشاعرہ کی کوئی تاریخ نہ تھی۔ آخر جولائی میں ہونا تحریر تھا مجھ سے مصارف سفر کی بابت پوچھی تھی۔

میں نے تمہیں تمہارے گھر کے پتے (ٹولوائی مسجد کے قریب) سے جواب لکھا تھا اور یہ بھی کہ مصارف سفر کا مسئلہ اپنی کمیٹی میں طے کر لو مجھ سے تجارت نہ کراؤ تم خود مناسب فیصلہ کرو گے جو مجھے منظور ہوگا اور چونکہ مجھے ریزولیوشن دہلی سے کرانا ہوگا وہیں سے بیٹھنا ہوگا اس لیے ۲۰ دن پہلے مطلع کر دینا مگر آج تک اس کا جواب نہیں آیا۔ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں اول میرا خط تمھیں نہ ملا ہو اور تم نے مکان بدل دیا ہو دوم برسات کی وجہ سے مشاعرہ ملتوی کر دیا ہو اور پہلی وجہ کے شبہ پر یہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں تاکہ تم مفصل کیفیت سے مطلع کرو۔

دعاگو ابرار احسنی

لہ میں اپنے استاد بھائیوں کے اشتراک سے جولائی ۱۹۷۱ء میں شفا صاحب کی برسی کے موقع پر ایک کل ہند مشاعرہ کرنا چاہتا تھا جس کی کل آمدنی بیگم شفا کو پیش کرنے کا خیال تھا لیکن افسوس کہ اپنے بھائیوں کے عدم توازن کی وجہ سے یہ مشاعرہ نہ ہو سکا۔ (واحد بریلی)

نبی احمد اطہر
ادیب کامل، بی۔ اے
آنرز، ایم۔ اے (اردو)
بہار یونی ورسٹی،
(مظفر پور)

یادِ عبدالماجد دریابادیؒ (مرحوم)

کسے تاب ہے کہ جو کر سکے تیرے علم و فضل کو آشکار
تیری ذات ذاتِ عظیم تھی تیرا فن بھی تھا فن شاہکار

تیری ہر نظر تھی سراغِ رہ، تیرا ہر قدم تھا چراغِ رہ
تیری منزلیں بھی ہیں مضطرب ترا کارواں بھی ہے بیقرار

تو اصولِ فن سے تھا باخبر تری طرز نقد تھی خوب تر
کہیں لہجہ نازک و نرم تھا کہیں جوش و جذبہ سے ہمکنار

وہ مزے مزے کی روایتیں، وہ جلی خفی سی حکایتیں
سرِ بزم کس سے سنیں گے ہم تو نے کیوں کیا ہمیں سوگوار

تو ادب کا ایسا تھا فلسفی کہ عیاں تھی علم کی برتری
ترے فن میں تھی بڑی پختگی، تیرے دم سے بزم تھی پر بہار

تری زندگی میں تھی نغمگی، تیرے لے سے مست تھی زندگی
نہ چمن میں وہ رہی دلکشی، نہ کلی کا لب، رہا نغمہ بار

ترے دم سے فن میں تھا بانکپن تجھے روتے ہیں سبھی اہل فن
تری یاد ہی میں تو ماجدی ترا اطہر آج ہے اشکبار

مترجم: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن
(دیودھر پور نگاری گیا)

بہادر شاہ ظفرؔ

دو گز زمین کی تلاش میں . . .

(گذشتہ سے پیوستہ)

۷ راکتوبر ۱۸۵۸ء کو ایک برٹش بٹالین بہادر شاہ ظفر کو اپنی محافظت میں دلّی کے باہر لے گئی، یہ شاہی جماعت ۳۶-۱ فراد پر مشتمل تھی، جس میں دو شہزادے مرزا جواں بخت مرزا عباس، ملکہ زینت محل، نواب شاہ زمانی بیگم، رقیہ سلطان بیگم ممتاز دلہن بیگم، طہارت بیگم اور مبارک النسا بیگم بھی شامل تھیں، پانچ غلام اور دس خادمائیں بھی تھیں۔ بہادر شاہ ظفر اور انکے قریبی رشتہ دار بگھی میں سوار ہوئے اور بقیہ افراد نے بیل گاڑی سے سفر کیا، تمام بیل گاڑیاں اور بگھیاں پورے طور پر ڈھکی ہوئی تھیں تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس میں کون سفر کر رہا ہے۔ ۱۳ ر نومبر ۱۸۵۸ء کو یہ جماعت الہ آباد پہونچی، جہاں ۱۴ افراد (غلاموں اور خادماؤں سمیت) نے جماعت سے الگ ہو گئے۔ الہ آباد سے یہ جماعت مرزاپور پہونچی اور "ٹیمس" نامی اسٹیمر پر سوار ہو کر ۲۲ ر نومبر کو بکسر پہونچی، ۲۵ ر نومبر کو مونگیر اور

پہلی دسمبر کو یہ جماعت کلکتہ پہونچی۔ جہاں خیموں در فوجی رکھوں میں انھیں ٹھہرایا گیا۔ چار کمروں پر مشتمل ایک قید خانہ بنایا گیا۔ اور کپتان، ایچ۔ ال۔ ڈیوس کو اس شاہی قید خانے کا انچارج مقرر کیا گیا۔

۱۳ ر اگست ۱۸۵۹ء کو حکومت ہند کو بھیجی گئی ایک رپورٹ میں کیپٹن ڈیوس لکھتا ہے۔

" شاہی قیدیوں کی تعداد ۱۶ (سولہ) ہے گیارہ روپے روزآنہ ان کے کھانے پر صرف ہوتا ہے اتوار کو یہ رقم بڑھا کر ۱۲ روپیہ کر دی جاتی ہے۔ اسکے علاوہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دو روپے انھیں تیل صابن کے لئے دیا جاتا ہے۔ انھیں قلم روشنائی اور کاغذ نہیں دیا جاتا۔ کسی کو ان سے ملنے نہیں دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے ملازمین بھی میری اجازت کے بغیر ان سے نہیں مل سکتے۔"

کپتان ڈلوس کی یہ رپورٹ اسبات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ۸۴ سالہ ضعیف العمر مغل شہنشاہ رنگون جیل میں کھانا اور پانی کے بغیر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگیا۔ اس کا واحد قصور یہ تھا کہ اس نے غیر ملکوں کو اپنے ملک پر حکمرانی کی اجازت نہیں دی تھی، وہ پہلا اور اولین شخص تھا جو ہندوستان کی آزادی کے لئے شہید ہوا۔ اسکی یہ شہادت ہمیں ہندوستان کی آزادی کی محافظت کا سبق دیتی ہے۔ خدا کرے اسکی یہ قربانی آزادی کو مضبوط اور مستحکم بنائے۔

مسعود حسن نمبر — تبصرہ

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن
دیو دھر پور، ٹکاری
گیا

نیا دور، مسعود حسن نمبر — مارچ اپریل ۱۹۷۷ء ایڈیٹر - خورشید احمد
قیمت :- ایک روپیہ ۱/-

طویل اور شدید انتظار کے بعد مسعود حسن رضوی نمبر (نیا دور) باصرہ نواز ہوا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ نمبر مسعود حسن رضوی کا شایانِ شان ہرگز نہیں، آل احمد سرور، ڈاکٹر خورشید الاسلام، شبیہ الحسن، اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر محمد حسن، مالک رام، گوپی چند نارنگ، خواجہ احمد فاروقی، شمس الرحمن فاروقی، کی کمی بے حد کھٹکتی ہے۔ مضامین میں ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کا ادبستان، در قمر جہاں کا مسعود حسن رضوی کا اپنے گھر میں بے حد معلوماتی ہے۔ مسعود صاحب کی روزمرہ زندگی، رہن سہن، طرزِ گفتگو، پسند و ناپسند، پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے پروفیسر سید حسن کا مضمون یوں ہی سا ہے۔ گیان چند میں کا مضمون ان کی علمیت، اور ادبی بصیرت کا غماز ہے موصوف نے بڑی محنت عرق ریزی اور کاوش سے مسعود صاحب کی ناقدانہ بصیرت پر بھرپور اور حقیقت افروز روشنی ڈالی ہے۔ آصف زمانی کا مقالہ ہماری شاعری ایک مکالمہ ... کوئی نقش مرتسم نہیں کر پاتا۔ ممکن ہے اسکی وجہ ڈاکٹر گیان چند میں کا مضمون ہو۔ علی جواد زیدی، مرزا جعفر حسین اور منتی رضا انصاری کے مضامین اہم اور معلوماتی ہیں۔ مسعود صاحب کی علمیت ان کے وقار، انکی سنجیدگی، انکی علم اور دوستی، ادب نوازی وادب پروری پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے، اُن کی شخصیت، کی ہمہ گیری اور ہمہ جہتی سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ امیر حسن نورانی کا مضمون بھی مسعود صاحب کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی کا مضمون مبالغہ آمیز ہے۔ مسعود صاحب کیلئے عقیدت و احترام کے تمام تر جذبات کے باوجود اور ان کی عظمت کے تمام تر اعتراف کے باوجود مجھے اس سے انکار ہے کہ مسعود صاحب آخری محقق اور آخری نقاد تھے اور ان سے بڑا محقق اب شاید پیدا نہ ہوگا۔ کہنے اور لکھنے کو سلام صاحب لکھ گئے ہیں لیکن میرے خیال میں ان کی مراد بھی یہ نہیں ہوگا میرا یہ خیال ہے کہ میر انیس، مراثی اور واجد علی شاہ پر اس عرق ریزی، محنت خرچ اور نئے نئے مواد فراہم کرنے والا اور ان کی عظمت منوانے والا اب شاید پیدا ہی نہیں ہوگا۔ تحقیق کو مسعود صاحب پر ختم مان لینا جیسا کہ سلام صاحب کا خیال ہے میرے خیال میں اردو ادب پر ہی نہیں خود مسعود صاحب پر ظلم ہوگا۔ سلام صاحب اور نورانی صاحب کے متضاد بیانات بھی قاری کو الجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کی شخصیت باوقار، رعب دار (تھی)، میانہ قد، دوہرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ " (نورانی) رنگ گندمی، بدن قدرے فربہ۔ لمبا قد، سینہ چوڑا، چہرے پر سنجیدگی، (سندیلوی)۔ افاق حسین صاحب کا مضمون بے حد مفید اور کارآمد ہے اور مسعود صاحب محقق کام کرنے والوں کے لیے رہنما۔

اس نمبر میں خاص اہمیت کے مالک مسعود مالک کے خطوط، ان کا افسانہ اور ڈرامہ ہے، مسعود صاحب کی شخصیت کا یہ پہلو ابتک پوشیدہ تھا، کسی مقالہ نگار نے ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی ہے اگر مسعود صاحب کے تمام افسانہ، ادارے اور خطوط جو سیکڑوں کی تعداد میں ہیں شائع کر دیئے جائیں۔ تو جہاں ان کی شخصیت کے اہم گوشہ واضح ہوں گے وہیں بیشتر رہروانِ راہ ادب کو تلاشِ منزل میں آسانی ہوگی۔

حیث مجموعی مسعود حسن نمبر قابل مطالعہ اور تلاش پیری (خواہ ذاتی ہو یا عوامی) کے لیے ناگزیر ہے قیمت کی مناسبت سے مواد بہت زیادہ ہے اس نمبر کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ کتابت و طباعت اچھی ہے۔ سرورق خوشگوار۔

افسانہ:

تعاقب

جلیل بازید پوری

میں نے ایک خواب بنا تھا آج اُس کی تعبیر میرے سامنے ہے لیکن وہ مالی نہ رہا جس نے میرے خواب کے حسین باغ کی آبیاری کی تھی اور نوک پلک درست کی تھی آج پھر مجھے ابو یاد آ رہے ہیں اُن کی بھولی بھالی صورت اور اُن کا ہیولے میرے سامنے تھا جی چاہتا تھا کہ میں اُن کی پیاری اور میٹھی یادوں سے لپٹ کر خوب روؤں اور کہوں " ابو آج تم زندہ ہوتے تو خوشی سے پاگل ہو جاتے تمھارا بیٹا اپنی منزل پا چکا ہے بڑی کوششوں کے بعد گاؤں میں ایک چھوٹا سا ہسپتال کھل گیا ہے اپنا ایک چھوٹا سا بنگلہ ہے لیکن اُس بنگلہ کے چاروں طرف ویرانوں کا ایک عجیب سا گھیرا ہے کیوں کہ اب تم جو نہیں ہو" شام کے سائے سورج کی تھکی تھکی کرنوں سے ہاتھا پائی کر رہے تھے مجھے ابو کا چہرہ اور اُن کی باتیں شدت سے یاد آ رہی تھیں .... " بیٹا میرا ایک دن بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور شہر سے واپس اپنے پہاڑی گاؤں میں دکھی انسانوں کی خدمت کریگا " اُس وقت اُن کے کندھوں پر ہل ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے بیلوں کی دم ہلاتے ہوئے اور پسینہ سے شرابور آج ابو کے خواب تو پورے ہو گئے لیکن اس خواب کے پورا کرنے میں مجھے کئی بار اپنے ضمیر اپنی روح اور اپنے دل سے لڑائی کرنا پڑی ہے اپنے ابو کی صورت دیکھنے کے لیے ترس ترس کر رہ گیا اور ایک دن جب ڈاکٹر بنا تو وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔

مجھے بچپن سے علم نفسیات سے دلچسپی تھی اور میں نفسیاتی مریضوں کا علاج بڑے چاؤ سے کرتا ہوں لیکن آج تک اپنا علاج نہ کر سکا اور نہ اپنے آپ سے پیار کر سکا شام کے سائے بڑھنے لگے تاڑ اور ناریل کے لمبے لمبے پیڑ اور کیلوں کے ہرے ہرے پتے ہواؤں کی باہوں میں جھول رہے تھے میں اپنے چھوٹے سے بنگلے کے پائیں باغ میں کرسی پر بیٹھا تھا سامنے ایک چھوٹا سا پوکھرا تھا دور دُور تک ہری بھری گھانسوں کے سلسلہ تھا اور پہاڑی کے سوا کچھ بھی نہیں۔
میں اٹھ کر اندر چلا آیا اور ٹیبل لیمپ جلایا الماری سے

ایک ادبی رسالہ نکالا اور ڈوب گیا افسانے کی ہیروئن
ریحانہ تھی مرکزی خیال ریحانہ کے ساتھ دکھ درد کے
سنگریزے چھٹے ہوئے تھے وہ گاؤں کی پڑھی لکھی لڑکی
تھی لیکن اُس کی سوتیلی ماں نے اُس کی شادی اپنے رشتہ
کے بلوائے سے رچائی تھی جو بوڑھا کم اور لٹھ باز زیادہ تھا،
اور بات بات پر ریحانہ کو نوچے اور بیلوں کی مانند پٹائی
کر بیٹھتا اور ریحانہ کو ایک ایسے ساتھی کی تلاش تھی جو اُسے
بھرپور پیار دے سکے اُس آنچل میں مسرت کے ستارے
بکھیر دے لیکن سب کچھ صرف افسانوں کی دنیا تک محدود
ہے حقیقی دنیا تو بڑی تلخ ہوتی ہے افسانہ پڑھتے پڑھتے
میں بالکل کھو سا گیا کاش! میری زندگی میں بھی ایسی ریحانہ
آتی جو میرے لڑھکتے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے میں جذب
کر لیتی۔ اتنے میں سامنے سے ایک بیل گاڑی آتی ہوئی نظر
آئی اُس بیل گاڑی سے ایک بڑی ہی سلیقہ شعار لڑکی
اور ادھیڑ عمر کا بڑا ہی اُداس چہرے کا شخص اُترا ساتھ
میں ایک گاڑی بان بھی تھا اور کچھ اناج کی بوریاں تھیں۔
میں اُنھیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا "کیا آپ ہی ڈاکٹر
انوار صاحب ہیں۔ میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے"۔ لڑکی
نے اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا

"جی ہاں! وہ بدنام ڈاکٹر میں ہوں آپ لوگ تشریف
رکھئے۔"

میں نے کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ ہمارے بھائی ہیں ان کی عجیب عجیب سی حرکتوں
سے گھر میں طوفان سا آگیا ہے زلزلہ آگیا ہے، ڈاکٹر صاحب!
کبھی کبھی تو یہ بڑی سوجھ بوجھ کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی
کبھی بے سروپا باتیں کرتے ہیں" لڑکی نے التجا بھری نگاہ
ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ اپنے بھائی کا علاج کہیں اور بھی کرایا ہے"

"جی ہاں! درجنوں ڈاکٹروں نے ان کا علاج کیا مگر صحیح تشخیص
کہیں بھی نہ ہو سکی حتیٰ کہ بجلی کے جھٹکے تک لگائے گئے"

"کیا کہا بجلی کے جھٹکے ___؟" میں نے حیرت سے پوچھا

"جی ہاں! دسیوں بار"

"آپ پیار کرنا جانتی ہیں"

"جی..." وہ چونک گئی۔

"نفسیاتی مریضوں کا علاج بجلی کے جھٹکوں سے نہیں
پیار کے جھٹکوں سے اور اعتماد کے جھٹکوں سے کیا جاتا ہے
آپ اپنے بھائی کی تفصیلی رپورٹ مجھے دیجئے میں گاؤں
کے ہسپتال میں نہیں ان کا علاج اپنے گھر پر کروں گا بس
آپ دیکھتی رہئے دو تین ماہ میں کایا کلپ ہو جائے گی۔
میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا

پچھلے آٹھ برسوں سے میرے بھیا اس مرض کے شکار
ہیں اُن کی شادی ایک شریف لڑکی سے رچائی گئی تھی
شادی کے فوراً بعد وہ بھابھی کو عجیب و غریب باتوں
سے چھیڑا کرتے تھے کسی مرد کا نام بھی لیتے اور بھابھی سمجھ کر
ٹالتی رہیں بھائی جان کو اس بات کا بھی شک تھا کہ بھابھی
کے پاس ایک پستول ہے اور وہ پستول ان کے عاشق نے
دی تھی اور وہ ایک دن پستول سے انھیں ختم کر لے گی اس
سازش میں بھابھی کے عاشق کے علاوہ بھابھی کی ماں بھی
شامل ہیں اور نوزائیدہ بچہ ان کا نہیں بلکہ اُن کے عاشق
کی نشانی ہے۔ جب کبھی بھابھی چائے بنانے باورچی خانے

جاتی وہ شک کی نظر سے دیکھتے ان کا خیال تھا کہ
ے میں زہر ملا کر اُنھیں ختم کر دینے کا منصوبہ بنایا گیا ہے
وہ جب بھی گھر آتے گھبرائے گھبرائے سے ہوتے بستر
لیٹتے ہی ان کے دل میں درد شروع ہو جاتا ہے اور ہاتھ
ؤں بالکل ٹھنڈا ہو جاتا ہوش آنے کے بعد اول فول
ے لگتے کچھ دنوں کے بعد میرے ابو پر کبھی شک کرنے
ے کہ وہ مجھے جان سے مروا ڈالیں گے۔"

اسی شک نے ابو کی بھی جان لے لی شادی سے قبل
ے بار یہ دوستوں کے چکر میں جیل بھی جا چکے تھے ان کے
ک دوست نے محلّہ کی ایک لڑکی کا اغوا کیا تھا لیکن بعد
ں بھیا بے گناہ ثابت ہوئے لیکن اس توہین کا اثر ان کے
ہن پر گہرا ہوا تھا اور دوکانداری بھی چوپٹ ہو گئی تھی
شادی کے بعد ایک بار انھیں ٹائیفائڈ ہو گیا تھا رات کو
ثر خاموش رہنے لگے تھے رات رات بھر نیند ان سے
تراتی رہتی اچانک گھر سے بھاگنے لگتے اور گھر والوں سے
خاطب ہو کر کہتے۔

"میری بیوی کے عاشق نے مجھے بلایا ہے۔" بھابھی
درائیدہ بچے کے ساتھ روٹھ کر میکے چلی گئیں۔" یہ کہتے
ہتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"دیکھئے ویسے تو یہ بیماری بالکل لا علاج ہے اس
ا علاج نہ تو بجلی کے جھٹکے سے کیا جا سکتا ہے نہ گولیوں
ور انجکشنوں سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے اس کا صرف
ایک نفسیاتی علاج ہے اُنھیں بھرپور پیار چاہئے اُنھیں
بھرپور اعتماد چاہئے اُن کا دل کوئی جیت لے اور وہم نکال
دے دراصل یہ شک کا روگ ہے" اس بیماری کو
انگریزی میں "پیرانایا" کہتے ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو
دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

اس لڑکی کو میں نے آنگن کے پاس والے کمرے میں
سونے رہنے سہنے اور کھانے پکانے کا انتظام کر دیا اور
برآمدہ کے قریب والے کمرے میں اس کے بھائی کا علاج
شروع کیا۔ صبح اُٹھ کر سب سے پہلے تازہ پانی سے غسل
دینے کی ہدایت کی تاکہ تازگی شگفتگی اُس کے ذہن میں
عود کر آئے کیونکہ اس مرض میں انسان کمہلا کر رہ جاتا ہے
ناشتہ کے بعد میں ایک گھنٹہ روزانہ اُن کے سامنے ہنسی اور
زندگی کے فلسفہ پر ایک مختصر سی تقریر بھی کرتا "دیکھئے
زندگی صرف ایک بار ملتی ہے جس زندگی کو آپ بوجھ سمجھ
رہے ہیں دراصل یہ بوجھ نہیں یہ تو ہنستا ہوا کنول ہے
ہمیں کنول کے پھول کی طرح زندگی گزارنے کا عادی ہونا
چاہیے خواہ آمنے سامنے کیچڑ ہی کیچڑ کیوں نہ ہو۔" اس
تقریر کا اثر مہینوں بعد بڑا خوشگوار ہُوا حالانکہ تقریر
سنتے وقت وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا تھا اور آنکھیں
جھپکاتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اب اُس کے سوکھے
ہونٹوں میں تازگی سی آ گئی تھی اور اُس کی بہن کے مرجھائے
ہوئے چہرے بھی کھل اٹھے تھے۔

ایک صبح جب سورج کی کرنیں سونے کے تار گرد و غبار
میں بکھیر رہی تھیں اور کبھی کبھی کیلوں کے پتوں پر کانپتی اور
لرزتی تھیں میں اُس کی کپکپاہٹ اور سرزنش ٹک ٹک
دیکھے جا رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ ان کرنوں میں کیا تلاش کر رہے
ہیں۔؟" ایک نسوانی آواز اُبھری

"میں ان کرنوں میں اپنی زندگی تلاش کر رہا ہوں
میری زندگی میں کپکپاہٹ، لرزش بالکل ان ہی کرنوں کی
مانند ہیں لیکن چمک سے زندگی بالکل خالی ہے۔"

"آپ ایسا کیوں محسوس کرتے ہیں۔؟"

"اس لیے اکیلا اور ویران جو ہوں۔"

"آپ نہ تو اکیلے ہیں نہ ویران! جو دوسروں کی
ویرانیاں دور کرتا ہے اُسے کون اکیلا اور ویران کہے گا۔"

"یہ تو اپنا اپنا خیال ہے ویسے میرے دل سے پوچھئے
کہ اس ہرے بھرے پائیں باغ کی صحبت میں برسوں رہنے
کے بعد بھی ویران کھنڈر بن کر رہ گیا ہوں"

"میں بھی تو ویران ہوں باپ روٹھ گیا بھی بس چلی
گئیں اور بھائی وہ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔" اُس نے
اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا ہم لوگ باتیں کر
ہی رہے تھے کہ اُس کا بھائی آ کھڑا ہو گیا اور کہا

"دماغ پر منوں بوجھ تھا آج ہلکا پھلکا محسوس کر رہا
ہوں۔"

میں نے کہا "ابھی! آپ بہت جلد گھر جانے کے قابل ہو
جائیں گے۔"

"مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی میٹھی میٹھی مسکراہٹ کے
لیے اب ترستا رہوں گا۔"

اُس نے اداس بھرے لہجے میں کہا۔

یہ سنتے ہی اُس کی بہن کچھ اداس سی ہو گئی وہ خاموش
خاموش نظر نیچی کئے کمرے کی جانب جانے لگی۔ میں نے کہا کیا
آپ خوش نہیں ہیں آپ کے بھائی اب بالکل صحت یاب
ہونے کے قریب ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ اُس کی بہن کی آنکھوں سے آنسوؤں
کے قطرے نکل کر بہنے لگے اور وہ روکنے کی کوشش کر رہی
تھی بغیر کچھ کہے وہ کمرے میں چلی گئی۔

اور ایک دن وہ آ ہی گیا۔ وہ لوگ جانے کی تیاری
کرنے لگے میں نے بھی اُنھیں جانے کی اجازت دے دی
بیل گاڑی سامنے کھڑی تھی اُس کے بھائی نے مجھ سے
مصافحہ کیا اور پھر تیز تیز قدموں کے ساتھ بیل گاڑی پر
سوار ہو گیا۔ اُس کی بہن میرے قریب آ کر کہنے لگی "ڈاکٹر
صاحب! آپ کا احسان صدیوں نہیں چکا سکوں گی۔" اُس
کی آنکھوں کے دونوں کنارے بھیگ گئے میری آنکھیں
بھی نم تھیں وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ نے میرے بھیا کو نئی زندگی
بخشی ہے فیس کتنی دوں۔" میں بھی جذبات پر قابو نہ رکھ
سکا اُس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کے تنے
ہوئے جالوں کو انگلیوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ان آنسوؤں
سے بڑھ کر اور کیا فیس ہو سکتی ہے۔؟ تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ
تم چلی گئیں تو ویرانیاں زندگی بھر میرا تعاقب کرتی رہیں گی

اُس کا بھائی بیل گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ "ڈاکٹر!
تم میری روح میں رچ بس گئے ہو۔ میری بہن رکیا بھی
ایک سگھڑ اور پڑھی لکھی لڑکی ہے لیکن میرے ڈیڈی نے
اپنے ایک دوست کے لڑکے سے اس کی شادی رچا دی ہے
میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کا ساتھی تم جیسا کوئی
فرشتہ صورت ڈاکٹر ہو لیکن کیا کروں۔؟ دیر ہو گئی۔
رسم و رواج آڑے آئے اور سماج کی دیوار میں ہم لانگھ
تو نہیں سکتے حالانکہ میری بہن زہر کے لقمے کھا رہی۔
وہ نگینہ کبھی کبھار تو اپنے ہیئوں کے ڈنڈوں سے اسکی
بھی پٹائی کرتا ہے۔"

گاڑی جا چکی تھی اور میں کھڑا خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ
رہا تھا۔

جلد (۲۴) شمارہ (۸) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو/این پی ۹۳

لائسنس نمبر: ۲۰۲۴/۱۷/۲۰۰۸-۶۴

دفتر فون: ۲۶۱۳۵

فون رہائش گاہ: ۲۶۶۵۶

زرِ سالانہ اعزازی دس روپیہ
عوام سے آٹھ روپیہ
فی پرچہ ۷۰ پیسہ

پتہ:
ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۲۷/۳ امین آباد پارک

ادارۂ فروغ اردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۸) دسمبر ۱۹۷۷ء جلد (۲۴)

ترتیب

صفحہ

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ نادان محل روڈ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۲۷/۳ امین آباد لکھنؤ سے شائع کیا۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

خدا نہ کرے کسی کو اکثریت کا غرور، اقتدار کا نشہ ہو جائے۔ ظلم و ستم کی راہیں یہی دکھاتا ہے، حیوانیت و بربریت پر یہی آمادہ کرتا ہے، مکر و فریب، یہی سکھاتا ہے عدل و انصاف کا خون یہی کرتا ہے۔ دوسروں کے جائز حقوق کی پامالی کرنا اپنا حق و اختیار سمجھتا ہے، جمہوریت کے پردے پر آمریت کا کھیل کھیلتا ہے۔ اور دنیا کو تباہی و بربادی کے سمندر میں غرق کر دیتا ہے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس کا یہ "غرور و نشہ" سب سے زیادہ اسی کیلئے ہلاکت و تباہی کا باعث ہوا۔ ان کا نام و نشان تک صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

آزادی کے بعد، اردو اور اردو والوں کو بھی اسی غرور اور نشہ کا شکار ہونا پڑا۔ کسی نے کہا اردو کوئی زبان نہیں۔ کسی نے کہا، اردو فرقہ پرستوں کی زبان ہے، کسی نے کہا یہ تعصب و تنگ نظری سکھاتی ہے، کوئی بولا کہ یہ جاگیردارانہ نظام کی یادگار ہے۔ کسی کی زبان مبارک سے نکلا کہ یہ غیر ملکی زبان ہے، کسی نے احسان دکھاتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہندی کی ایک شیلی ہے وغیرہ وغیرہ" یہ فرمودات عامیوں یا جاہلوں کے نہیں تھے، بلکہ زیادہ تر ایسے نیتاؤں اور وزیروں کے تھے جن کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور تھی۔ انھوں نے مسلسل و منظم طریقے سے اردو کو ختم کرنے کے لئے، جس لسانی سامراجیت، ظلم زیادتی سے کام لیا، اس کو سب جانتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جمہوری قبا پہنے ہوئے استبداد کے ان دیودں میں کچھ ایسے بھی تھے، جو لسانی مساوات کے قائل تھے ان کو یہ "غرور اور نشہ" بہکا نہیں سکا۔ وہ اکثر و بیشتر اردو کے حق میں آواز اٹھاتے رہے۔ لیکن غلبہ تھا اردو مخالفوں کا جو اردو کی مخالفت میں آواز اٹھاتے رہے لیکن غلبہ تھا اردو مخالفوں کا جو اردو کی مخالفت میں شد و مد کے ساتھ پروپیگنڈہ اور عمل کر رہے تھے۔ کم و بیش یہ صورت

۱۹۶۷ء تک رہی ۱۹۶۷ء کے بعد، اردو کے لیے، کسی قدر راہیں ہموار ہوئیں، ۶، ۷ سال کے عرصہ میں تھوڑا بہت ...ل بھی ہوا، لیکن وہ بساط پلٹ گئی نئی حکومت آئی تو اُردو کے متعلق ان کا رویہ ماضی سے بھی زیادہ سخت ہو گیا۔

فروغ اُردو کے سابقہ شماروں میں اس کی طرف ہلکے ہلکے اشارے کئے جا چکے ہیں اب ایک "مردِ آہن" نے اُردو، ...ے سلسلہ میں بلٹز کے ایڈیٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے آہنی خیالات کا اظہار کیا ہے، جو ۱۲ نومبر ۱۹۷۷ء کے بلٹز میں شائع ہوا ہے اُردو کے بارے میں آپ کے آٹھ اقوال زریں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) "اُردو نے ملک کی تقسیم کرائی" (۲) "اُردو مستقل بٹوارے کی زبان ہے"

(۳) "۸۵ فیصد ہندو، اُردو کو دوسری سرکاری زبان نہیں بننے دیں گے" (۴) "اُردو کا ناتہ ایک مذہب سے جڑا ہوا ہے"

(۵) "اُردو منگولوں اور ترکوں نے ہندوستان پر مسلط کی" (۶) "اُردو نے بنگلہ دیش بنوایا"

(۷) "نظام نے تلنگانہ پر اُردو کو اسی طرح مسلط کیا، جس طرح انگریزوں نے ہندوستان پر انگریزی"

(۸) "مجھے اکثریت حاصل کرنے کے لیے اکثریت کی رضا بھی درکار ہے" (بلٹز صفحہ ۱، ۱۲ نومبر ۱۹۷۷ء)

ان ارشادات کا تجزیہ کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ

(ا) نمبر ایک، دو اور چھ سے اردو کو "مسلسل تقسیم کی زبان" ثابت کیا گیا ہے (ب) نمبر تین اور آٹھ سے ہندوؤں (اکثریت) کو اس کا مخالف قرار دیا گیا ہے۔ (ج) نمبر چار سے اس کو ایک مذہب (اسلام؟) کی زبان ثابت کیا گیا ہے۔ (د) نمبر پانچ اور ...سات سے اُردو کو زبردستی مسلط کرنا بتایا گیا ہے۔

یہ ارشادات اس ذات گرامی منزلت کے ہیں "جس نے اقتدار سے پہلے مع اپنی جماعت کے مہاتما گاندھی کی سمادھی پر حاضر ہو کر گیان دھیان کے ساتھ ستیہ اور اہنسا کو اپنا کر گاندھی جی کے راستہ پر چلنے کا عہد کیا تھا۔ اگر سچائی اور مہاتما گاندھی کے راستہ پر چلنے کا نام یہی ہے تو جمہوریت میں اکثریت کے لئے اقلیت کتنی ہی حق و انصاف ہے تو ستیہ اور اہنسا کس کو کہنگے؟

لسانی اور تاریخی اعتبار سے یہ اقوال، انتہائی غلط اور سفید جھوٹ ہیں اردو زبان نے نہ ملک کو تقسیم کرایا، نہ وہ صرف ایک مذہب سے وابستہ رہی، بلکہ اس زبان نے ہر مذہب اور ہر دھرم کا پرچار کیا۔ موصوف تو جانتے ہی ہونگے کہ آریہ سماج کا تمام لٹریچر اردو میں ہے، برہمو سماج، سناتن دھرم، بدھ مذہب غریب وغیرہ سب کا مذہبی لٹریچر اُردو میں ہے۔ زحمت نہ ہو تو "وہ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی ترویج میں اُردو کا حصہ" از ڈاکٹر محمد عزیز ملاحظہ فرمائیں۔

اُردو کے مخالف ایسے ہندو ضرور ہیں جو دروغ آمیز سیاسی لسانی تعصب کے شکار ہیں موصوف نے "۸۵ فیصدی ہندو مخالف ہیں" فرما کر، غلط بیانی کی ہے اور نہ صرف ہندوؤں کی اہانت فرمائی ہے بلکہ دوسری زبانوں کے وجود سے بھی انکار کیا ہے۔ بنگالی، مرہٹی، پنجابی، دراوڑ زبانیں، کیا یہ سب بھی ہندوستان سے ختم ہو گئیں۔ اردو کو اگر منگولوں اور ترکوں نے ہندوستان پر مسلط کیا جو غیر ملکی تھے تو دراوڑ زبانوں کو کس نے آکر ختم کیا؟ کیا وہ غیر ملکی نہیں تھے؟ اگر منگول اور ترک غیر ملکی ہیں تو ہندوستان کے قدیم باشندوں کے علاوہ کوئی شخص بھی ہندوستانی نہیں ہے؟۔ ان کے لیے کیا ارشاد ہے؟

ان ارشادات سے اردو والوں کو تعجب نہیں ہے وہ اپنی زبان کو زندہ رکھیں گے، اسکا حق منوا کے دم لینگے "وہ حق قوت ہے، قوت حق نہیں" پر یقین رکھتے ہیں اور جمہوریت، یکجہتی، اسلامیت اور انسانیت پر ایمان۔ وہ اپنی زبان کیلئے جدوجہد مسلسل کرتے رہیں گے اور اسوقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جبتک اُردو کو اپنے حقوق حاصل نہیں ہو جاتے۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے — پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے

۷۸۹

غزل

اسلم عادل

کسی موج نے ڈبویا کسی موج نے ابھارا
اسی کشمکش میں آخر مجھے مل گیا کنارا

ابھی بڑھ کے جان دے دوں تو کرے اگر اشارا
تری اک خوشی کی خاطر مجھے ہر ستم گوارا

تجھے کون جانتا تھا یہ جہانِ آب و گِل میں
کیا میں نے اس جہاں میں ترا نام آشکارا

اسے منتشر نہ کرنا کسی انجمن میں جاکر
بڑی مشکل سے میں نے تری زلف کو سنوارا

تری انجمن میں کیسے ابھی ہو مری رسائی
ابھی گردشوں میں گم ہے مرے بخت کا ستارا

ہمیں چشمِ باغباں میں کھٹک رہے ہیں عادل
کہ بساطِ گل پہ جیسے کوئی حق نہیں ہمارا

ڈاکٹر ایس چند شرما جبل پور

کرشن چندر
بہ حیثیت افسانہ نگار

دنیا کا یہ عموماً اصول ہے کہ وہ استخوان پرستی کے قائل ہے۔ وہ زندگی میں ادیبوں کو دم نہیں لینے دیتی اور اُن کی تخلیقات کو ناقدر شناسی کے ترازو پر تولتی ہے بالعموم ہمارے شعراء اور ادبا نے نامساعد حالات اور زمانے کی بے رُخی کی بنا پر اپنی بدنصیبی کا شکوہ کیا ہے۔ اس لیے اُن کی تصنیفات یاس و حرماں کا دفتر بن کر رہ گئی ہیں۔ وہ اپنے ارمانوں کو اپنے ہمراہ مزار کے گوشے میں لے جاتے اور ابدی نیند کے مزے لوٹتے ہیں۔ یہ ظالم دنیا اُن کی خواہشات کا خوف کرکے اُن کو تاریکی کے غار میں دھکیل دیتی ہے اور اُن کی زندگی، اجیرن بن جاتی ہے لہٰذا ہمارے مصنفین اپنا غم غلط کرنے کی خاطر ساقی و مینا کا سہارا تلاش کرتے ہیں اور اصنام خیالی سے محبت کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ یا یاسیات کے عالم میں موت کا انتظار کرتے ہیں۔ جب انکی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو جملہ دنیاوی جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں اُن کی تربت پر دُنیا کے لوگ پھول برساتے ہیں اور ان کی قصیدہ گوئی میں رطب اللسان ہوتے ہیں

بھلا اب پاک ... داح کے متعلق تعریفوں کے پل باندھنا چہ معنی دارد؟

زہے نصیب وہ مصنف کتنا خوش قسمت ہے جس کو اس عالم میں شہرت دوامی حاصل ہو جاتی ہے۔ اِن چند ادبا میں کرشن چندر کا شمار ہے۔

"..... ہم لوگ سبھی جانتے ہیں، ایک ادیب اور معمولی آدمی کے درمیان بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ مُصنف یا ادیب نگارش میں کڑوا، تلخ اور روحشتی ہوتا ہے، اور معمولی آدمی مُلائم، نرم اور اس قدر سادہ ہوتا ہے کہ ایک "جوں" کو "ہنس" نہیں کہتا" (ڈبلو سمرسیٹ مام)

مجھے اس مقالے میں کرشن چندر کی افسانہ نویسی کا جائزہ لینا ہے۔

"گھونگرٹ میں گوری جلے" کے دیباچے میں کرشن چندر

لکھتے ہیں۔

"افسانے میں مصنف اپنے جذبات سے جس طرح
چاہے کھیل سکتا ہے۔ جس طرح چاہے وہ واقعات
کو توڑ مروڑ کر اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا
ہے اگر ہیرو سے ناراض ہو جائے تو اُسے خودکشی
پر مجبور کر سکتا ہے اُسے زہر دے سکتا ہے ——
پہاڑوں کی چوٹی سے نیچے ٹپک سکتا ہے۔"

کرشن چندر اِس گر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

"ہم وحشی ہیں" کے افسانوں کے دیباچہ میں علی سردار
جعفری اعتراف کرتے ہیں۔ "ہندو مسلم فسادات کے فنکار
کروڑوں بے زبانوں کو زبان عطا کرنیوالوں میں کرشن چندر
آگے نکل گئے ہیں۔ وہ اپیندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی
احمد عباس، کیفی اعظمی، یوسف ظفر اور فکر تونسوی کی
جماعت کے میر کارواں ہیں" پروفیسر سید احتشام حسین
لکھتے ہیں "بات یہ ہے کہ کرشن چندر عقیدتاً ادب برائے
ادب سے متنفر ہیں۔۔۔ اس لیے اُن کے وہ افسانے بھی
سماجی حقیقت کا کوئی نہ کوئی شائبہ رکھتے ہیں جن پر
بظاہر رُومانی ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ،
آہستہ آہستہ اُن کے یہاں حقیقت کے شعور میں پختہ کاری
اور وقت کے تجربوں کی گھلاوٹ شامل ہوتی چلی گئی اور وہ
قلم جو پہلے ایک حسین خاکہ تیار کر کے اُسے مٹاتے ہوئے
ہچکچاتا تھا، اب حقیقت کے تلخ اظہار کے لیے سب کچھ
توڑ پھوڑ دینے میں نہیں ہچکچاتا۔۔۔۔ کرشن چندر کے افسانوں
کے کردار جو حقیقت کو عملی زندگی میں پیش کرتے ہیں۔ اسی دنیا
کے کردار ہیں۔ وہ جس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اُس طبقے کی
روح اُن میں بسی ہوئی ہے۔ اُن کی خوبیاں اور بُرائیاں اپنے
طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں" (روایت اور بغاوت ص ۱۹۵-۱۹۴)

کرشن چندر کا طویل افسانہ "زندگی کے موڑ پر" کامیاب
ترین افسانہ ہے۔ کرشن چندر پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"زندگی کے ہر موڑ پر میرا پہلا طویل مختصر افسانہ ہے
اور شاید اب بھی مجھے یہ اپنے تمام افسانوں
میں سب سے زیادہ پسند ہے اس میں وسطی پنجاب
کے ایک قصبہ کا مُرقع پیش کیا گیا ہے، اور اس
قصباتی پس منظر کو لیکر شادی بیاہ، برہمنی نظام زندگی
عشق کی خودکشی اور اُن سے متعلق مسائل سے پیدا
ہونے والی فکری اور جذباتی ماحول کی آئینہ داری
کی گئی ہے۔ جہاں تک ان مسائل سے پیدا ہونے
والی فکری اور ذہنی اُلجھنوں کا تعلق ہے، آپ
اُن کی نفسیاتی تشریح ایک واضح صورت میں اس
کہانی میں دیکھیں گے لیکن راہِ نجات ابھی بہت
دُور ہے"۔

"زندگی کے موڑ پر" تین مفروضہ منزلوں سے گزرتا ہوا طویل
مختصر افسانہ کا خاکہ بناتا ہے:

افسانہ کا آغاز شاعرانہ ہے۔ اور اس حاشیہ میں دو
ابھرتی دوشیزائیں رنگ بھر رہی ہیں۔ وہ اٹکھیلیاں کرتی،
کھلکھلاتی۔ خرمن ہوش پر بجلیاں گراتی۔ خرد فرزانگی کو
لوٹتی۔ سیٹیوں۔ آوازوں اور نئے ڈیزائن کے عریاں ملبوس
سے ساز بیداری اٹھاتی ہوئی متعارف کرائی گئی ہیں۔ لیلا
اور سوشیلا!

افسانہ کا آغاز جاذب نظر ہے۔ آغاز افسانہ ہی سے

زندگی کی قدریں اجاگر ہوتی ہیں۔ اُن میں لوچ اور بڑی گیرائی ہے انواع واقسام کی صورتیں اور مختلف نقش و نگار ذہن قاری پر طاری ہوتے ہیں اور پھر فرو ہو جاتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں میں غربت اور بے روزگاری کا پسندیدہ موضوع ہے۔

ہمارا تمدن اپنے دیہاتوں کا خون پی پی کر عالم شباب کو پہونچا ہے۔ ہمارا ملک عالم و جاہل۔ صوفی۔ درویش، پنڈت۔ مولوی۔ ملّا۔ سادھو۔ سنیاسی رہزنوں اور ناخواندہ عوام کا ملک ہے۔

اپنی کہانی "صرف ایک آنہ" میں سروش بی۔ اے کی ناداری کی وجہ بتاتے ہوئے کرشن چندر لکھتے ہیں۔

"... اُسے نوکری کیوں نہ ملتی تھی؟ کیوں لوگ اُس کے غربت زدہ چہرے کو دیکھ چڑ جاتے تھے؟.... پھر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اندر داخل ہو کر اُس کے جسم کی ہڈیوں کو توڑ رہا ہے۔ اُس کے معدے کو مٹھی میں دبا کر زور سے بھینچ رہا ہے۔ اُس کے ماتھے پر تیز تیز سوئیاں چبھو رہا ہے۔ آہ.... اُسے اگر کہیں سے تھوڑی سی روٹی مل جاتی بس ایک دو ٹکڑے!... بیوقوف... اُس نے اپنا بسکٹ کتے کو کیوں دے ڈالا ــــــ بیوقوف.... " (کتاب۔ ہمارے افسانہ (مجموعہ) "صرف ایک آنہ" صفحہ ۱۵۹)

"زندگی کے موڑ پر" ــــــ جب اپنے عروج کو مَس کرلیتا ہے تو اُن کا قلم خوبصورت سے زیادہ خوبصورت نقوش اجاگر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ذہن کی اُلجھنیں اور تفکرات کی جملہ پیچیدگیاں وا ہو جاتی ہیں مثلاً یہ اقتباس۔

"یہ آخری رتجگا تھا... بیچاری عورتوں کو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ اُن کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں لیکن ایسے موقع تو بہت کم آتے ہیں" (افسانہ۔ زندگی کے موڑ پر ص ۷۷)

پرکاش چندر اس سین کو دیکھ کر بے تاب ہو اُٹھا۔ کچھ سوچنے لگا اور بڑبڑانے لگا.... کیونکہ وہ ایک عاشق تھا۔ اُس کے دل میں پرکاش وتی کے لیے پیار تھا اور اُس جیسی تمام عورتوں کے لیے ہمدردی تھی۔ اُس کے باغی ذہن میں یہ بات گھوم رہی تھی کہ" ایک معصوم شاعرہ جلد ہی کہ ایک گانٹھ کے عیوض بیچ دی گئی تھی.... زندگی غیر محدود تھی۔ عشق تازہ اور شباب زندہ تھا۔ لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا... " (زندگی کے موڑ پر ص ۷۷)

ایسے فن کار دنیا میں ایک قرن کے بعد پیدا ہوتے ہیں جنھیں قلیل عرصہ میں اپنی حیات میں شہرتِ دوام و بقائے دوام دستیاب ہو جاتی ہے۔ ایشیا کے چوٹی کے فنکار اور اُردو کے یگانہ روزگار افسانہ نگار، کرشن چندر انھیں چند خوش بخت فن کاروں میں سے ایک ہیں۔ اُردو افسانہ نگاری میں جہاں حقیقت اور واقعہ نگاری کا سنگِ بنیاد

کرشن چندر نے رکھا ہے وہاں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اس بنیاد پر ایک عظیم الشان محل تعمیر کرنے کا سہرا کرشن چندر کے سر ہے۔

کرشن چندر اپنے افسانوں میں ببانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ امیر طبقہ کا نوجوان محبت کرنے سے قاصر ہے اس کی روح اور ذہنیت میں بلندی مفقود ہے۔ اس کے معیار صرف دو ہیں۔ روپیہ اور شرافت۔ اور جس چیز کو یہ نوجوان محبت اور رومانیت سے موسوم کرتا ہے وہ محض ایک حسین دھوکہ ہے جس میں خود بھی مبتلا ہے اور دوسروں کو بھی مبتلا کرنا چاہتا ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں کی دوسری اہم خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔ زندگی کی حقیقت کو جس طرح انھوں نے سمجھا ہے ویسا ہی بیان کر دیا جائے۔ لیکن یہاں بھی کرشن چندر منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

حقیقت نگاری فرانس کے اثر سے یورپ میں داخل ہوئی اور ہمارے ملک میں بھی اس کا اثر ہوا چنانچہ کرشن چندر بھی اس سے متاثر ہوئے اور بقول ممتاز شیریں "ان میں یہ صلاحیت تھی کہ مختلف طرز کے مغربی افسانوں سے بیک وقت اثر قبول کریں اور فوری طور پر انھیں دوبارہ تخلیق کریں۔ اور یہی وجہ تھی کہ شروع شروع ہی میں ہر افسانہ ایک نئے طرز کا لکھ کر انھوں نے فوراً پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔"

کرشن چندر زندگی کے معمولی واقعات کی آڑ میں سماج پر بھرپور وار کرتے ہیں اور سماجی برائیوں کو طشت از بام کرنے میں ماہر ہیں۔ لہذا ان کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر سماجی ہیں

افسانوں کا جائزہ لیتے وقت اُن کے کرداروں کی نوعیت کا پرکھنا لازمی ہے۔ ہر کردار کی انفرادی حیثیت ہونا لازمی ہے۔ کرشن چندر بھی اپنے کرداروں کو انفرادیت دیتے ہیں۔ وہ کردار کے ذریعہ سماج کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے ہیں اُن کے کردار اسی دنیا کے باشندے ہیں جو ہماری طرح گوشت پوست کے پتلے ہیں۔ کرشن چندر کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت نفسیاتی تجزیہ ہے۔ وہ لوگوں کے دماغوں سے زیادہ اُن کے دلوں کو ٹٹولنے اور سمجھنے کے عادی ہیں۔ وہ ان کی نفسیات کو سمجھنے میں، ان کے خیالات و احساسات اور اعمال کو دکھانے کے لیے مختلف علامتوں اور استعاروں کو مستعمل کرتے ہیں۔ نفسیاتی کیفیت افسانوں کی فضا اور مناظر ان کے یہاں اس طرح دست و گریباں ہوتے ہیں کہ اگر ایک لفظ بھی حذف کر دیا جائے تو سارا ڈھانچہ بگڑ جائے گا۔ اُن کے افسانوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے احساس اور وجود کو پلاٹ سے زیادہ اہم تصور کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے تازہ افسانوں میں پلاٹ کو تقریباً نظر انداز ہی کر دیا ہے۔ اُن کا واحد مقصد اپنے افسانوں میں زندگی کے احساس کو پیدا کرنا ہے

یہ کہنا حقیقت سے بعید ہوگا کہ اُن کے افسانوں میں فلسفیانہ گہرائی و گیرائی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی وہ اپنے افسانوں کا انجام فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ "زندگی کے موڑ پر" کا جو خاتمہ ہے وہ آج تک کسی دیگر افسانے کو نصیب نہیں ہوا۔ کرشن چندر کے افسانوں میں طنز و مزاح کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کا وار ذاتیات کے بجائے پورے سماج پر

ہوتا ہے۔

"زندگی کے موڑ پر" جیسے چھوٹے سے افسانے میں انھوں نے مکمل انسانی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ جو ہر مصنف یا داستان نگار کی بساط نہیں۔ یہی کرشن چندر کے لازوال اور بے مثل فن کی دلیل ہے۔ اُن کی صناعی کو دیکھ کر ناظرین انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

دنیا کے ظلم و ستم کے خلاف برسرِ پیکار ہونا چاہیے اس انسانیت کشی سے اُن کا دل جلتا ہے لہذا انھوں نے اپنے افسانوں میں جملہ انسانی دشمنوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا ہے۔ اِن افراد میں مہاجن، ساہوکار، مذہب کے نام نہاد لیڈر، مُلک و قوم کے غدار رہنما، دفتروں کے کلرک اور ملازمین شامل ہیں جن پر وہ کبھی مزاح کے پیرایے میں اور کبھی طنز کے نشتروں سے اپنے افسانوں میں حملے کرتے ہیں۔ ان کے بہت کامیاب اور عمدہ افسانوں میں "ان داتا" "گرجن کی ایک شام" "دو فرلانگ لمبی سڑک" "حسن اور حیوان" "بالکونی" "زندگی کے موڑ پر" اور "پورب دیس ہے دلی" بے مثال ہیں۔

کرشن چندر ایک سادہ دل، روشن دماغ، دُور رس نگاہ، حساس ذہن، دردمند فطرت، ہمدرد اور صالح نظریات کے حامل ہیں۔ اُنھوں نے انہی خوبیوں سے اپنے افسانوں کو بھی مالا مال کیا ہے۔ وہ ایشیا کے عظیم المرتبت فن کار اور قابلِ تقلید افسانہ نگار ہیں ان کی زبان آب کوثر میں ڈھلی ہوئی اور اسلوب دلنشین ہے۔

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:۔ "وہ بذاتِ خود اُردو افسانہ نگاری کا ایک اسکول ہے۔ جس کی بنیاد اُس نے خود ڈالی اور جس کو وہ خود ہی پروان چڑھا رہا ہے۔"

جناب عزیز احمد کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

"کرشن چندر کا طرزِ تحریر اردو افسانوی ادب میں، ایک نئی اور بڑی ہی لطیف اور انوکھی چیز ہے۔ اس میں کہیں لفاظی نہیں۔ اس طرزِ تحریر کی کامیابی کی بنیاد انسان کی داخلی ضروریات اور فطرت کے خارجی اظہارات کی ہم آہنگی پر ہے۔ اس ہم آہنگی سے کرشن چندر کے اسلوب میں وہ انقلابی رمزیت پیدا ہو گئی ہے جو اُن کی تحریر کی جان ہے فطرت کا احساس جو انسان کے شعور انسانی کی حدود میں اچھی طرح جذب ہو کے نمایاں ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے اظہار کے لیے نت نئی تشبیہیں، نت نئے خطوط متوازی تلاش کرتا ہے۔

رومانیت اور انسان پرستی نے اس طرزِ تحریر کو لطیف اور جاذب بنا دیا ہے اس میں سختی اور کہیں خشکی کم ہے اور اگر اس کی ضرورت ہو تو طنز یہ خدمت انجام دیتا ہے۔"

(ترقی پسند ادب۔ صفحہ ۱۰۵)

بقول آل احمد سرور۔

"کرشن چندر دراصل شاعر ہے جو اس رنگ و بو کی دنیا میں لاکر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اُس نے ہندوستان کی بدصورتی اور حسن دونوں کو گلے سے لگایا ہے"۔ (تنقیدی اشارے صفحہ ۱۱۲)

کرشن چندر کا مزاج عاشقانہ ہے، اُن کے سینے میں عشق کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ ان کی طبیعت کے خمیر میں محبت کی خوشبو ملتی ہے۔ اُن کے ہونٹوں کی تشنگی صرف

عورت کی ذات سمجھا سکتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کرشن چندر
عورت کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ ان کا عورت کا انتخاب
قابلِ داد ہے کیونکہ ارض و سما کے درمیان عورت سے
زیادہ حسین شے کوئی نہیں ہے کیوں کہ عورت فطرت کے
حسن کی ترقی یافتہ اور لطیف ترین شکل ہے۔

کرشن چندر اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوئے
ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے اور فطرت
کے عارض و گیسو کا ملاحظہ کیا ہے اس لیے صنفِ نازک
کے علاوہ فطرت سے بھی کرشن چندر کو [illegible] دلچسپی
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت کے بعد اگر کوئی چیز
مقناطیسی کشش کی حامل ہے تو وہ فطرت ہی ہے خصوصاً
زمین پر گلاب اور آسمان پر چاند قدرت کے عظیم شاہکار
ہیں ....

انگریزی شعراء میں جان کلیر (JOHN CLARE)
نے عورت کی محبت کو فطرت کی محبت میں منتقل کر دیا ہے
لیکن کرشن چندر نے عورت اور فطرت کو چشمِ دل کی ضیا
کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ کیونکہ کرشن چندر عورت کے حسن
سے لطف اندوز ہوئے ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں عورت
کے حسن کی چمک دمک اپنے پورے شباب پر ہے۔ اسی لیے
وہ شیریں، حسین، دلکش اور دلآویز زبان استعمال کرتے
ہیں۔

جمیلہ نورانی کا حسن ملاحظہ فرمایئے۔

"جب وہ پہلے دن بال کلب کے دروازہ میں داخل
ہوئی تو اُسے دیکھتے ہی کلب کے ممبروں کی سانس
ایک لمحہ کے لیے رک گئی۔ رخسار گلابی۔ ہونٹ
شہابی۔ آنکھیں شرابی۔ چال جیسے جھیل کی لہر
تبسم جیسے تابناک سحر۔ سینہ طوفانی۔ کمر
ہیجانی۔ اس پر باتیں ایسی میٹھی جیسے چھتے سے
شہد ٹپکتا ہو" (مجموعہ سپنوں کا قیدی افسانہ
بکری کے کھوکھلے ص ۱۲۶)

عورت اور فطرت کی چھاؤں میں کرشن چندر کا فن
تقویت حاصل کرتا ہے۔

کرشن چندر عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ
گریز کرتے ہیں ان کے بجائے ہندی کے رسیلے اور رنگین
الفاظ مستعمل کرنے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں

کرشن چندر کے دل و دماغ میں انقلاب برپا کرنے
کی خواہش تو عام شباب ہی میں پرورش پا چکی تھی۔ پر
جب وہ ایف۔ اے میں تھے تو کالج سے بھاگ کر ایک
گروہ میں شریک ہو گئے تھے جب گھر واپس آئے
پولیس نے انھیں گرفتار کر کے لاہور کے قلعہ میں بند کر
دیا دو ماہ کے بعد نجات ملی۔ اس کے بعد جب وہ کسی پارٹی
ساتھ اپنے آپ کو منسلک نہ کر سکے تو یہی انقلاب کا
اُن کے افسانوں اور ناولوں میں اُبلنے لگا۔

کرشن چندر کے بالغ نظر کا تجزیہ کیا جائے تو وہ
دو واضح شکل میں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف کشمیر کی حسین
وادی دلپذیر کا سدا بہار موسم اور اُن کی تمام
دلفریب مناظر سے والہانہ پیار۔ فی الجملہ ان دو [illegible]
نشان مقامات کی گہری چھاپ اور دوسری اہم بات
جو اُن کے ذہن میں کارفرما تھی وہ انگریزوں کی غلامی سے
رہائی کی تمنا اور ہندوستان میں سوشلسٹ نظام کی ترویج

جب اُنھوں نے افسانہ نگاری کی طرف رجحان کیا تو شعوری
اور غیر شعوری طور پر رومان اور انقلاب زبردست محرک ثابت ہوئے
یہاں سے ابتدائی افسانوں میں ان دونوں رجحانوں کا امتزاج
بنا دلفریب ہے کہ ہر افسانہ اپنی جگہ ایک شاہکار کی
حیثیت رکھتا ہے۔ کرشن چندر پر ایک مرتبہ یرقان کا
حملہ ہوا۔ اس کے بعد ہی اُنھوں نے اپنا پہلا افسانہ "یرقان"
تحریر کیا۔ پھر اُنھوں نے ایک مضمون "ہوائی قلعے" لکھا جو
ماہنامہ ہمایوں میں پورے آراستہ ہو کر ہمایوں کے ایڈیٹر نے اس انشائیہ
کی تعریف کی اور لکھا کہ اس مضمون کا مصنف ایک دن ہندوستان
کا ایک بہت بڑا ادیب ثابت ہوگا۔ ان کے ....
افسانوں کا پہلا مجموعہ "طلسم خیال" تھا۔ اس کتاب کے
مطبوعہ ہونے کے بعد کرشن چندر کی شہرت میں چار چاند
لگ گئے اور دیگر ادیبوں سے ان کے مراسم بڑھے۔ ان کی
شہرت بحیثیت افسانہ نگار سارے ہندوستان میں
پھیل چکی تھی۔ اب انھیں افسانہ نگاروں کا میر کارواں
سمجھا جاتا تھا۔ ان کے افسانوں کی مابہ الامتیاز خصوصیت
ان کا منفرد نقطۂ نظر ہے۔ قدرت نے ان کو درد آشنا دل
اور حقیقت شناس نظر ودیعت کی تھی اور اُن کے سامنے
زندگی کی بے پناہ وسعتیں نمودار ہوئیں لہٰذا یہی درد و کرب
ان کے افسانوں کے روپ میں پھوٹ پڑا۔ ان کے افسانے
انسانوں کی پکار، محبت، درد مندی، فکر اور تجسس
کی دل سوز چیخیں ہیں۔ ان کی آواز پوری دنیا کے انسانیت
کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کے افسانوں میں رومانیت صحت
مندانہ اور حقیقی ہے یہی حقیقت پسندانہ رومانیت کرشن
چندر کے افسانوں کی رگ رگ میں روح کے مانند جاری
و ساری ہے۔

کرشن چندر کا اسلوب بیان اتنا شگفتہ، بے ساختہ
اور حسین ہے کہ اس پر زبان داں بھی رشک کرتے ہیں۔
اس زمانہ کے بہت بڑے افسانہ نگار بھی ان کا مقابلہ کرنے
سے قاصر ہیں۔ لفظوں کی تراش خراش، بندشوں کی
نزاکت، حسین الفاظ کا مجموعہ۔ مطالب کی گہرائی۔ طنز
اور مزاح کا اتنا حسین امتزاج۔ موضوعات کی رنگا رنگی
فطرت کی دلکشی اور انسان کی بہیمیت اور شقاوت۔
حسن اور حیوانیت کی مکمل داستان ان کے افسانوں کی
جان ہے۔

اتنی عالمگیر شہرت کے باوجود اُن میں تکبر و نخوت
نام کو نہیں تھا۔ اُنھوں نے نامساعد حالات کا کبھی گلہ
نہیں کیا۔ اتنی شہرت اور مقبولیت حاصل ہونے کے
باوجود انھوں نے اپنے قلم کو زنگ نہ لگنے دیا۔ مغربی
ادیب ساری عمر اپنا پسینہ بہاتے ہیں اور اپنے قلم سے
لاکھوں روپیہ کماتے ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں محنت
کو مستحسن نہیں سمجھتے۔ کاہلی اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کو
اپنی عادت ثانیہ میں شمار ہے۔ شاعروں اور ادیبوں
کو پیغمبر بنا کر اُنھیں ہمت کے ناقابل بنا دیا جاتا ہے،
اور پھر اُنھیں غیر فانی ادیبوں کی صف میں شامل کر کے
عمل کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

عام رائے یہ ہے کہ پریم چند کے بعد کرشن چندر
ہی حقیقی معنوں میں قلم کا دھنی ہے۔ اردو افسانہ کی تاریخ
میں کسی افسانہ نگار کی گرفت کرشن چندر کے مانند اس فن
پر اتنی مضبوط اور بھرپور نہیں ہے۔ سوشلزم پر عقیدہ ہونے

باوجود انھوں نے اس ملک کے مالدار طبقے کی بہیت سقاوت کا پردہ بڑی بے رحمی سے فاش کیا ہے۔
وہ ہندوستان اور پاکستان کے عظیم ترین افسانہ
۔ مانے جاتے ہیں جن کے زور قلم نے وہ جادو جگائے
نہ باید و شاید
کرشن چندر بے حد رجائیت کے دلدادہ ہیں۔۔۔۔
رکیت پر اُن کا یقین واثق ہے ان کی عالم گیر شہرت
بولیت پر یہ امر دال ہے کہ ہندوستان کی چودہ زبانوں
اُن کی کہانیوں اور ناولوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس
علاوہ روسی۔ چینی۔ چیک۔ جاپانی۔ جرمن۔
بین۔ انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں
ان کی تصنیفات کے تراجم ہو چکے ہیں۔ صرف روس میں
شن چندر کی تیرہ لاکھ کتابیں فروخت ہو چکی ہیں۔
ہمعصروں میں شاید ہی کسی ادیب کو بین الاقوامی
شہرت و مقبولیت ملی ہو۔ شریمتی اندرا گاندھی سابقہ
یراعظم نے ان کو ۱۹۶۶ء میں نہرو ایوارڈ عطا کیا تھا۔
کرشن چندر دنیاوی ظلم و استبداد کے خلاف صدائے
احتجاج بلند کرتے ہیں۔ بڑا ادیب وہی ہے جو امن پسند ہو
و ستم کے خلاف جہاد۔ انسانیت اور اخوت کا جھنڈا
بلند کرے۔ عوام کے مصائب میں شرکت کرے اس سرزمین
درد کا ادیب ترجمان ہے۔ کرشن چندر کا قلم مدام اس
کی ترجمانی کرتا ہے عظیم المرتبت ادیب وہی ہوتا ہے
اپنے لوح و قلم سے انسان اور انسانیت کی بقا اور شانتی
خاطر مساعی جمیلہ کرے اور کرشن چندر آج بھی انھیں قدروں کی
شنائی سے اپنے افسانوں میں رنگ بھرتے ہیں۔
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مناظر عاشق ھرگانوی
ہرگانواں، بربگھہ، مونگیر (بہار)

"اقبالؔ کا فلسفۂ عقل و عشق"

عقل و عشق کی کش مکش، عقل و عشق کے مراتب اور
ن کے مقام کے تعین کا مسئلہ دنیائے حکماء اور شعراء کا
یک پُرانا موضوع رہا ہے۔ اردو اور فارسی کے شعر و ادب
ں بھی ان سے کافی بحث کی گئی ہے اور ہر شخص نے اپنے
ہم و ادراک کے بموجب ان پر روشنی ڈالنے کی کوشش
ں ہے۔

مولانا روم سے لیکر ابتک ہر زمانہ کے فارسی گو
شعراء نے اور اُردو شاعری کے ابتدائی دور سے ہر خوش
سنج نے ان سے بحث کی ہے۔ لیکن اقبالؔ نے اس پر نئے
نداز سے قلم اٹھایا ہے۔ اگرچہ یہ اقبالؔ کا پیدا کردہ مضمون
نہیں ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اقبالؔ نے اسے بہت
زیادہ وسعت دی ہے۔ صاف اور کھلے انداز بیان میں
ن کی حقیقتوں کو آشکار کیا ہے ان کے مقام متعین کیے
یں اور دونوں کی خوبیوں اور خامیوں کی وضاحت کی ہے
عقل کی کوتاہی اور عشق کی کرشمہ سازی سے کون

انکار کر سکتا ہے۔ لیکن ابتدائی اُردو شاعری میں کم حوصلگی
کی وجہ سے سطحی اور عامیانہ نگاہوں کے سبب عشق
کی حقیقی روح مسخ ہو چکی تھی۔ حریفوں کے لیے اس لفظ
میں اور بازاری دشنام بازیوں میں تھوڑا سا بھی فرق
ہو تو ہو، عشق و محبت کے الفاظ بازاری بن چکے تھے۔
اور اُس طرح یہ الفاظ جن میں صحیح معنوں میں کائنات
کی حقیقت پوشیدہ ہے، رسوائے زمانہ ہو کر رہ گئے ہیں
اقبالؔ نے ان تمام بازاری خیالات سے قطع نظر کرتے
ہوئے عشق کو اس کا صحیح جامہ پہنایا۔ اپنے کلام میں اس کا
کھویا ہوا مقام عطا کیا۔ عشق کی وسعتوں کو سمجھایا۔ اس
کی قوت تسخیر سے ہمیں آگاہ کیا۔ اس کے کارہائے نمایاں
ہمارے سامنے پیش کیے۔ غرض اس کی تمام [illegible] بلا واسطہ
خوبیوں کو ہمارے سامنے اس طرح [illegible] دیدہ و بینا پیدا کرتا ہے
ہمیں عشق میں حسن کا جلوہ [illegible] کی آنکھ بغیر کسی جھجھک کے تمام
احساس ہوا [illegible] پردوں کو چاک کرتی ہوئی حقیقت تک

ں طرح برگساں دنیا میں ایک قوت حیاتیہ کا قائل ہے
ی طرح اقبال عشق میں وہی کیفیت و حرکت اور تموج
تے ہیں، جس سے زندگی عبارت ہے۔

برگساں کے قول کے مطابق دنیا کی حقیقت اولیٰ
ت حیاتیہ ہے غالب نے بھی نہایت شریف اور شاعرا
ز میں عشق کی اس اہمیت اور ہمہ گیر صفت کی طرف،
شارہ کیا ہے۔ گویا انسانی حیات کے تمام لذائذ کو الف
مشترک عشق ہی ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

موضوع پر مولانا روم کے اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

دور گردوں باز موج عشق داں
چوں نبودے عشق بفسردے جہاں

کے جمادی محو گشتے در نبات
کے فدائے روح گشتے نامیات

سی خیال کو اقبال یوں تعبیر کرتے ہیں ؎

ہستی از ہائے و ہُو میخانہ بودست
گل ما از شرر بیگانہ بودے

نبودے عشق و ایں ہنگامۂ عشق
اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

عشق از فریاد ما ہنگامہ ہا تعمیر کرد
ورنہ ایں بزم خموشاں ہیچ غوغائے نداشت

ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید با ایں ہمہ بے تابی

وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انھیں بے سوزن و تار رفو

اقبال کے نزدیک عشق کی بڑی فضیلت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ عالم ہنگامہ ہائے شوق سے بے نیاز ہوتا۔ یہاں کسی قسم کی رونق نہیں پائی جاتی، اگر انسان کا دل بھی عقل کی طرح دانشمند ہوتا۔ لیکن وہ عشق کی برتری اور فضیلت کو مانتے ہوئے عقل کی خوبیوں کے مداح ہیں اور انھیں عقل کی ضرورت کا بھی احساس ہے۔ کیوں کہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیائے اندر پر ہر ہر قوم پر انسان کو عقل و دانش تدبیر اور فراست سے کام لینا پڑتا ہے بغیر فہم و ذکا کے انسان عملی دنیا میں آگے نہیں بڑھ سکتا۔ عالم کی تقسیم بندی اس سے کی جاتی ہے، انسان کے خفتہ اوصاف اسی سے بیدار ہوتے ہیں۔ اس مادی دنیا میں اور بالخصوص سائنس کے اس جوہری اور طلسمی دور میں عقل کو بجا طور پر ناز ہونا چاہیئے۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود عقل سب کچھ نہیں ہے خوبیوں کے ساتھ بے شمار خامیاں اور کوتاہیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ عقل کی سب سے بڑی خامی تذبذب، حیص بیص کیوں اور کس طرح اور اندیشہ افروز و فرداہے۔ اس میں جرأت رندانہ کی کمی ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ انفرادی یا اجتماعی کارنامے بغیر کسی جرأت کے عالم شہود پر جلوہ گر نہیں ہو سکتے۔ عقل وہی کام کرنا چاہتی ہے جس میں اسے منفعت کی ضرورت نظر آتی ہے۔ نقصان اور گھاٹے سے یہ کوسوں دور بھاگتی ہے۔

یہ آرام طلب اور عیش پسند ہے۔ جفاجو اور جفاطلب نہیں
اسی لیے اگرچہ اقبال عشق کے ساتھ عقل کا تعاون بھی حاصل
کرنا چاہتے ہیں لیکن ہر وقت انھیں عقل کی دوراندیشی پسند
نہیں آتی وہ کہتے ہیں ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

عقل رہبری تو کرسکتی ہے لیکن چونکہ یہ دانش مند رہبر
نہیں ہے اس لیے یہ اندیشہ ہے کہ غلط رہبری نہ کر دے
جو خود واقف راہ نہیں وہ دوسروں کی رہبری کیا کرسکتا ہے
جب کہ حقیقت یہ ہے کہ عقل عشق کے مقابلہ میں ایک پُر
پیچ راہ ہے۔ یہ ایک ایسی گتھی ہے جسے خود عقل نہیں سلجھا
سکتی اس لیے ہم اگر مسائل حیات کے کسی ایک پیچیدہ
عقدے کو عقل کے ناخن سے کھولنا چاہیں تو شاید ہمارے
لیے یہ ناممکن ہوگا، کیونکہ عقل منطقی استدلال اور بیشمار
اصطلاحات کے بندھنوں میں بندھی رہتی ہے اور ہر اصطلاح
تشریح طلب ہوتی ہے۔ عقل اگر کسی تصور کی تشریح کا محتاج
ہوتا ہے اس طرح ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہونے پاتا کہ ہزاروں
مسائل پیدا ہو جاتے ایک عقدہ بھی نہیں کھلتا کہ سیکڑوں
عقدے اور بھی زیادہ پیچیدگی اختیار کرلیتے ہیں۔ اور اس
طرح اس کا لامتناہی سلسلہ جاری وساری رہتا ہے اکبرالہ
آبادی نے دانشمندی کے متعلق کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

عقل کی تمام کوششوں کا ماحصل علم ہے لیکن علم حاصل
کرلینے کے باوجود انسان حقیقت کی معرفت حاصل نہیں
کرسکتا اور نہ ہی اس کا رو کوشش کی دنیا میں کامیاب ہو
سکتا ہے۔ حقیقت کی معرفت حاصل کرنے کے لیے حسن نظر
کی ضرورت ہوتی ہے وہ عقل سے حاصل نہیں ہوتی۔ عقل سے
دماغ تو روشن ہوجاتا ہے لیکن دل منور نہیں ہوتا۔ میں پہلے
عرض کرچکا ہوں کہ عقل آرام طلب اور عیش پسند ہے ؎

جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

لہذا اس کی آرام طلبی اسے صاحب نظر بننے نہیں دیتی اور
یہ منزلِ مقصود سے ہمیشہ دور رہ جاتی ہے اور اس کے سہارے
منزل مقصود تک پہونچنے والا بھی مایوس اور محروم رہ جاتا
ہے ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

دوسری طرف عشق کی جرأت رندانہ ایسے ایسے کارہائے
نمایاں انجام دے دیتی ہے جنھیں عقل کبھی سوچ بھی نہیں
سکتی۔

علم خبر دیتا ہے
عقل پتہ دیتی ہے

اور عشق صاحب نظر بناتا ہے۔ حقیقت کی بلا واسطہ
معرفت حاصل کرنے کے لیے دل میں دیدہ و بینا پیدا کرتا ہے
اور اس طرح ہمارے دل کی آنکھ بغیر کسی جھجھک کے تمام
تعینات کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی حقیقت تک

پہونچ جاتی ہے۔ عقل اور عشق کے اس فرق کو اقبال نے
اس شعر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے ؎

نقر مقام نظر علم مقام خبر!
فقر میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ

عشق کی یہی مجذوبانہ مستی انسان کو ملائک سے افضل اور
اشرف بنا دیتی ہے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ عشق کی مدد
سے قوموں نے اپنی بگڑی ہوئی قسمت بنائی ہے۔ عشق
کے کارنامے دیکھ کر عقل عش عش کرنے لگتی ہے عشق کی
عجوبہ کاریوں، کرشمہ سازیوں اور حیرت زائیوں کو
عقل کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ عقل بھی بہت
مفید اور کارآمد شے ہے۔ انسانی حیات پر اس کے
بہت سارے احسانات ہیں تاہم اس کی کوتاہیاں بھی،
اپنی جگہ پر مسلم ہیں اور نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ عقل بغیر
عشق کی [illegible] پرخطر منزلیں نہیں طے کر سکتی یہاں تک
[illegible] عشق [illegible]
[illegible]
[illegible] نظر رکھتے ہوئے اقبال نے [illegible] کہا ہے ؎

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

اور یہ کہ ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

صرف یہی نہیں بلکہ مومن کے ایمان کے لیے جزو لاینفک
قرار دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

تاریخ کے اوراق اگر الٹے جائیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ
عشق نے کون کون سے کارنامے ایسے پیش کیے ہیں جن
پہ عقل کو انگشت بدنداں رہنا پڑا ہے۔ مثلاً ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عشق
ہی تھا جس کی وجہ سے بلا خوف و خطر اپنے جذبۂ صادق
کی بدولت وہ آتشکدہ میں کود پڑے اور عشق کی مدد
سے اسے گلزار ابراہیمی بنا دینے میں کامیاب ہوئے۔ یہ
حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے دل کا جذبۂ صادق ہی تھا کہ
اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل کی گردن پر چھری رکھ دی۔
اور یہ حضرت امام حسینؑ کا جذبۂ عشق ہی تھا جس نے
انھیں صرف ۷۲ نفوس کے ساتھ میدان کربلا میں سینکڑوں
کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا اور بہ رضا و رغبت جام شہادت
پی کر حیات ابدی حاصل کر لی۔ ان کی شہادت سے
صحیح معنوں میں یزید کی طاغوتی طاقت کی کمر ٹوٹ گئی،
اور باطل کی دائمی شکست ہوگئی۔

مولانا محمد علی جوہر نے بالکل صحیح کہا ہے ؎

قتل حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اقبال ان ہی حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے
ہیں ؎

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

بات دراصل یہ ہے کہ عقل ہمیشہ مصلحت اندیش کے چکر میں پھنسی رہتی ہے اسے فکر امروز فردا سے نجات ہی نہیں ملتی۔ وہ ہر وقت اپنے سامنے نفع و نقصان کو پیش نظر رکھتی ہے اس لیے کسی کام کو کرنے سے قبل ہزار بار اس کو پرکھ لینا چاہتی ہے اور پرکھنے کے بعد اسے اپنے نتیجہ پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اور جب تک کام کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے جو عقل کے چکر میں پھنس جاتے ہیں اس وادئ پر خار میں الجھ جاتے ہیں وہ زندگی بھر حیران و پریشان رہتے ہیں۔ منزل کی طرف جانا چاہتے ہیں مگر منزل سے کوسوں دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور غالب کی طرح زندگی دشواریوں کے آگے سپر ڈال کر یہ کہنے لگتے ہیں کہ ؎

قید حیات بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

گویا غالب کے خیال کی مطابق موت کے بعد زندگی نہیں اور اگر ہے بھی تو نہایت مطمئن، پُرسکون اور بغیر ہنگامے کی ہے۔ حالانکہ اقبال کے خیال کے مطابق انسان کا دل عشق کی شمع سے روشن ہو یہی کافی ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ موت ہرگز پُرسکون نہ ہو گی۔ اور اگر ہو گی بھی تو جنوں اسے ایسا نہ رہنے دیگا۔ مولانا روم جنھیں اقبال اپنا معنوی استاد تصور کرتے ہیں، وہ بھی عقل و عشق کے اس فرق کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

لا ابالی عشق باشد نے خرد
عقل آں جوید کزاں سودے برد

اس لیے اقبال ببانگ دہل اپنے متعلق اور تمام آزاد انسانوں کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ ؎

من بندہ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من
ہنگامہ ایں محفل از گردش جام من
ایں کوکب شام من ایں ماہ تمام من
جاں در عدم آسودہ بے ذوق تمنا بود
مستانہ نوا باز در حلقۂ دام من

اقبال کا یہ عقیدہ ہے کہ عقل دنیا کی مختلف چیزوں کی طرح انسان اور انسانی حیات کے لیے ایک خادم کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا اگرچہ عام طور سے عقل ہی کی رہبری سے کام لینا چاہتی ہے لیکن اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ عقل سے زیادہ عشق بہتر، ذی ہوش اور صاحب ادراک ہے ؎

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر ہے کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال عقل و عشق کے نفاق کو ختم کر دینا چاہتے ہیں اور دونوں کو کسی خاص نقطہ پر لا کر ایک بنیاد بنانا چاہتے ہیں۔ بات بھی کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے کہ عقل اپنی بگڑی ہوئی شکل میں عشق ہو جاتی ہے اور اس میں عقل کی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ عشق و جنون تخلیق و عمل پر بھی عقل کی پابندی کا لگایا جانا اس عالم اسباب کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے ورنہ عشق کی عجوبہ کاریاں نظام عالم کو درہم برہم کر دینے والی ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

انسانی عقل و تجربہ کو عشق نے باطل ثابت کر دیا اور یہ بتایا کہ زمان و مکان عشق کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اگر عشق کی جست ہر قدم پر ہوتی چلی جائے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کا کیا حال ہو جائے گا جنون میں گریباں چاک کر لینا بہت آسان ہے لیکن عشق و جنوں برقرار رکھنا اور ساتھ ہی ساتھ گریبان کو بھی سلامت رکھنا ہر صاحب جنوں کے بس میں نہیں ہے۔ دونوں چیزیں اسی وقت ساتھ ساتھ مل سکتی ہیں جب دل اور دماغ دونوں پر انسان یکساں طور پر حاوی ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، جب عشق کے سیلاب کے آگے عقل کی باڑھ باندھی جائے۔ اقبال اسی خیال کو یوں ظاہر کرتے ہیں اور فخریہ انداز میں شاید اپنی ہی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ؎

باچنیں ذوقِ جنوں پاسِ گریباں داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کارِ ہر دیوانہ نیست

عقل ہم عشق است و از ذوقِ نظر بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ را آں جراتِ رندانہ نیست

اقبال کے نزدیک عشق ہی وہ جوہر ہے جو زمانہ کے دست برد سے محفوظ ہے اس لیے کہ اس کی حقیقت ہمہ گیر اور آفاقی ہے اس کی فطرت کو زوال نہیں۔ جس شئے میں اس کی جلوہ گری ہے وہ غیر فانی ہے۔ وقت کا خونخوار ہر چیز کو نیست و نابود کر سکتا ہے لیکن وہ شئے جس پر عشق کا پرتو ہے اس کا تباہ کاریاں سے بالکل بری ہے۔

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

دنیا کا ہر شئے فانی ہے لیکن وہ چیز جسے بندہ مومن نے بنایا ہے زوال سے بے نیاز ہے اس لیے کہ بندہ مومن کا سینہ عشق کا مرکز ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق کا مقام بے حد بلند ہے اس لیے کہ ؎

عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود!
عشق ہے ابن السبیل، اسکے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق ہے نورِ حیات عشق ہے نارِ حیات

عقل و عشق کے نفاق کو ختم کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں دونوں میں کافی گہرا تعلق ہے۔ دل کی حقیقت میں اسی وقت دل کی ہے جب تک اس کے اندر سوز تپش موجود ہے۔ اور جب عقل اپنے اندر یہ صفت پیدا کر لیتی ہے تو وہ بھی دل ہو جاتی ہے ؎

چہ می پرسی میانِ سینہ دل چیست
خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد

دل از ذوقِ تپش دل بود لیکن
چو یکدم از تپش افتاد گِل شد

یہی وہ نکتہ مفاہمت ہے جسے ہم عقل کا عروج اور دونوں

حریفوں کا سنگم کہہ سکتے ہیں اقبال کی عارفانہ بصیرت ان دونوں کے تضاد کو بآسانی ختم کر دیتی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کا رفیق بنا دینا چاہتی ہے تاکہ انسانی بقا اور ارتقا میں کارآمد اور معاون ثابت ہو اور بقول خلیل جبران:

اگر تمھارے بادبانوں یا پتواروں میں سے ایک بھی ٹوٹ جائے یا ٹوٹ جائے تو پھر تم موجوں کے سینہ پر بے اختیار اور لاچار ہو کر بہا کر دیئے جاؤ گے یا سمندر کی سطح پر بے سہارا موجوں کے طمانچے کھایا کرو گے اسی لیے تنہا عقل ایک ایسی قوت ... جو حرکت عمل و ردِ ... !

محمد محفوظ الحسن
سینیر ریسرچ فیلو شعبۂ اُردو
مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا۔

اُردو شاعری میں نیند۔ ایک جائزہ

اُردو شاعری میں خواب کے مناظر کی کمی نہیں، مثنویاں اس کے بیان سے بھری پڑی ہیں، شعرا نے اپنی تخلیقات میں، خواب کے مناظر کی تصویر کشی تو کی ہے لیکن ان کی شاعری میں نیند کی ساحرانہ کیفیتوں اور لذتوں کی ترجمانی نہیں ملتی۔۔

اردو شاعری میں صنف غزل کو معراجِ شاعری تسلیم کیا جاتا رہا ہے اور اس صنف میں اردو کی [illegible] رہی ہیں، مختلف غزل گو شعرا کے دواوین کی چھان پھٹک کے بعد ایسے بے شمار اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں نیند کا ذکر کیا گیا ہو، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہجر میں رفتار معشوقانہ دکھلاتی ہے نیند
چھوڑ کر بیخواب ہم کو آپ سو جاتی ہے نیند

جب وہ سننے بیٹھتے ہیں آنکھوں میں آتی ہے نیند
کیا اثر رکھتا ہے افسانہ مری تقدیر کا

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

تھا خواب میں خیال کو دل سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جسکے بازو پر پریشاں ہو گئیں

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

لیکن یہ اشعار کی نیند کی اہمیت اس کے نفسیاتی اثرات وجدانی کیفیات اور اس کی لذتوں کا میٹھا میٹھا احساس عطا نہیں کرتے۔ اور نہ ہی وجدانی شعور نیند کی ساحرانہ دلفریبی کے لطف اندوز ہوتا ہے، غالب کی سی عبقری شخصیت جسے

اپنے عن لیپ گلشن نا آفریدہ سونے پر فخر تھا اور جس نیند کی پری کو شیشے میں ڈھالنے میں ناکام رہا۔ وہ لذتِ خواب سے نا آشنا نہ تھا لیکن اس کی اہمیت کا اسے بھی اندازہ نہ ہو سکا اور جب رات کروٹیں بدلتے بدلتے گزرنے لگتی ہے تو وہ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا کہ ع نیند کیوں رات بھر نہیں آتی، غزل کے تنگ پیمانہ میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں [illegible] تو تھا غزل گو شعرا کا معاملہ نظم کا [illegible] نے اس وادی پرخار میں کم ہی قدم رکھا ہے جہاں تک [illegible] ناقص معلومات کا تعلق ہے میں اپنے علم و یقین اور [illegible] مطالعہ کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو میں چار نظمیں ایسی ملتی ہیں جو نیند کی کیفیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ۔ ۔

ایسے شعرا جنھوں نے اس کوچہ میں قدم رکھا ہے وہ ہیں اسمٰعیل میرٹھی، تنہا تھاپوری، مخدوم محی الدین، عظیم الدین احمد

اسمٰعیل میرٹھی کی نظم ایک طویل نظم ہے جس کا عنوان تو نیند نہیں لیکن موضوعِ نظم نیند ہے

ان کا خیال ہے کہ نیند انھیں اپنی آنکھوں سے نمونہ قیامت دکھاتی ہے، خوابِ راحت میں انسان ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور سر و پا کی خبر نہیں رہتی۔ نیند کی آغوش میں جانے کے بعد سارے شعلے بجھ جاتے ہیں نہ کوئی اپنا ہوتا نہ پرایا نہ ذہن کی خبر ہوتی ہے نہ دل کی وہ ہوش [illegible] نیند ایسا ہی ساغرِ بے خودی پلاتی ہے اسمٰعیل میرٹھی خدا [illegible] قدرت بے بہا پر نذرانہ پیش کرتے ہیں

تو نے کیا نیند کو مسلط   قدرت ہے تیری بڑی خدایا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ محض نیند کے اثرات ہیں، نیند کی حقیقت و اہمیت کی صحیح عکاسی و ترجمانی نہیں

دوسرے [illegible] کی [illegible] شاعری [illegible] روانی پیدا کی اور لطافت و نزاکت کا خون کر دیا ہے۔

اور تنہا تھاپوری کی نیند ملاحظہ ہو۔

مری آنکھوں میں جاگنے کا سہرا
تیری آنکھوں میں نیند کے بادل

خواب کی محفلیں [illegible]
کس کو آواز دیں [illegible] میں

جسم سے دور [illegible]
آکے آنکھیں [illegible] سو رہی ہیں
[illegible] ایک [illegible] کھو رہی ہیں

اس نظم کا عنوان ہی محض نیند ہے۔ بقیہ نیند کے کوائف لذائذ یہاں بھی نہیں مخدوم محی الدین کی نیند ملاحظہ ہو

یہ کس پیکر کی رنگینی سمٹ کر دل میں آ لی ہے
میری بے کیف تنہائی کو یوں [illegible] بناتی ہے
یہ کس کی جنبشِ مژگاں [illegible] جگاتی ہے
یہ [illegible] کی سرسراہٹ گنگناتی ہے
مری آنکھوں میں کس کے شوخیٔ لب کا تصور ہے
کہ جس کے کیف سے آنکھوں میں میری نیند آتی ہے
سکوتِ شانتی کے ہر قدم پر پھول برساتی ہے
اسکی گل شب گوں بنا کر مسکراتی ہے
مری آنکھیں کھل جاتی ہے وہ کیف نظر بن کر
مجھے قوس قزح کی چھاؤں میں پہروں سلاتی ہے
سحر تک وہ مجھے چمٹائے رکھتی ہے کلیجہ میں
دبے پاؤں کرن خورشید کی آکر جگاتی ہے

مخدوم محی الدین کی اس نیند سے کوئی خاص بات نہیں

معلوم ہوتی اور نہ ہی کوئی خاص اثر اس کا ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ رومان اور نرم و شیریں الفاظ کے استعمال سے مخدوم نے اس میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مخدوم اتنے ہی معلوم ہوتے ... نیند صبح تک سینے سے چمٹائے رکھتی ہے اس وقت تک جب تک خورشید کی کرن آکر جگا نہیں دیتی۔ انداز بیان میں دلکشی نہیں ... پیشکش میں حسن ضرور ہے

نیند ہر فرد بشر کا فطری تقاضہ ہے اور ہر ذی شعور اس کا مرہون منت ... عظیم نے نیند کا جو تصور پیش کیا ہے اور جس انداز میں پیش نہیں کیا ہے وہ اردو شاعری میں بالکل منفرد ہے عظیم سے پہلے اور عظیم کے بعد بھی کسی شاعر نے نیند کی دلکشی کو اتنے حسن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ عظیم کی نیند پیکر دلکش اور نادر ہے آج کا انسان جس نے چاند کو روند ڈالا ... مریخ و عطارد پر کمند میں پھینکتا ہے اپنی مہتم بالشان کامرانیوں کے باوجود بے خوابی کے مرض کا شکار ہے سائنس ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے لوگ نیند کی دیوی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ آج کے منتشر معاشرے میں نیند کی گراں قدری کا احساس روز افزوں ہے عظیم الدین نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا تھا۔ نیند سے متعلق چند نظمیں آپ کے ذوق کی تسکین کے لیے پیش کی جا چکی ہیں ان نظموں نے آپ کی تشنگی بجھائی یا پیاس بڑھائی یہ نہیں کہہ سکتے۔ پر یقین ہے کہ مندرجہ ذیل نظم یقیناً آپ کی تشنگی کو سیراب کرے گی۔ ملاحظہ ہو عظیم کی نیند

اے طبیب الم محرومان
چارہ فرمائے ہجوم و افکار

تجھ سے آشفتہ سری کا درماں
ہیں شفایاب تجھی سے بیمار

ہے مدبر تو ہی نیچر شفا خانے کی
تو ہی لاریب ہے مئے زیست پیمانے کی

باعث خرمی و خوشحالی
خستہ حالوں کے لیے اک اکسیر

کایا نیچر کی پلٹنے والی
آپ بے شبہ ہے تو اپنی نظیر

ستم جو ظاہر ہے باطن ہے تو روح فزا
موت ظاہر میں ہے باطن میں سبب جینے کا

دہر نے جن کو ستا رکھا ہے
جن کو ہے زیست کا ہر لحظہ وبال

جن کو ناکامیوں نے گھیرا ہے
جن کو دنیا میں نہ ثروت ہے نہ مال

ایسوں کا غم غلط اک دو گھڑی کرتی ہے تو
دست شفقت دل پژمردہ پہ دھرتی ہے تو

جو ہیں مست مئے عشرت ان کی
زندگی بے ترے ہوتی ہے حرام

ہے غرض سب کو ضرورت تیری
چین تجھ سے ہے تجھی سے آرام

چاندنی شب نم شبنم میں مزا تیرے سبب
پیاری پیاری نظر آتی ہے صبا تیرے سبب...

ہے مدبر تو ہی نیچر کے شفا خانے کی
تو ہی لاریب ہے مئے زیست کے پیمانے کی

ان دو مصرعوں میں شاعر نے نیند کے کوائف و فوائد کو یوں سمیٹ لیا ہے جیسے کوزے میں سمندر کو سمو دیا گیا ہو۔

(باقی مضمون صفحہ ۲۵ پر)

ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی ۔ پی ، ایچ ، ڈی

مرثیۂ غالبؔ پر ایک نظر

شعر و ادب کے سلسلہ میں جہاں اور بہت سے مسئلے پیدا ہوئے وہاں ایک مسئلہ یہ بھی قابل بحث بنا کہ کیا شعر و ادب میں شاعر و ادیب کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے اور کیا شاعر و ادیب اپنے دل و دماغ کو الگ رکھ کر شعر کی وادی میں اترتے ہیں یا ان کا شعور اور ان کی شخصیت تخلیق کی قوت ان کی رفیق سفر ہوتی ہے ۔ یہ مانا کہ ارادی اور شعوری طور پر شاعر اور ادیب تخلیق کے پردے میں بے حجابانہ نہ آتے ہوں لیکن ان کے الفاظ کا انتخاب ان کا پیرایہ بیان ان کی تشبیہیں اور استعارے غیر شعوری طور پر ان کے دل و دماغ کی عکاسی کرتے ہیں ۔ بادل میں چھپتی ہوئی دھوپ جس طرح آفتاب کے وجود اور اس کی زر ریز اور حرارت انگیز کرنوں کی چغلی کھاتی ہے اسی طرح مختلف ادب پاروں میں شاعر کی شخصیت کے مختلف رخ اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں اس نقطۂ نظر کے ماتحت اگر ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو شعر و شاعر دونوں سمجھ میں آجاتے ہیں اور قاری صرف شاعر کے الفاظ تک اپنی توجہ نہیں رکھتا بلکہ شاعر کے دل میں قریب جا بیٹھتا ہے ۔

غالبؔ کی وفات پر حالیؔ نے جو نظم لکھی ہے اور جس کو غم انگیز جذبات کی بنا پر مرثیہ کہا گیا ہے وہ اردو ادب کا ایک شہ پارہ ہے چونکہ ایک شاعر اعظم کی وفات پر اظہار تاسف ہے اس لئے حالیؔ نے نظم کا اٹھان دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری سے کیا ہے ۔ اس کے بعد غالبؔ کا کردار انکی نظم و نثر اور اپنے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے جہاں تک غالبؔ کے کردار کا تعلق ہے وہ تو حالیؔ نے خود ہی کھل کر بیان کر دیا ہے ۔ غالبؔ بہ حیثیت شاعر کے حالیؔ کی نگاہ میں رشک عرفی و فخر طالب اور بلبل ہند تھا مقدم الذکر دونوں ترکیبیں غالبؔ کے فارسی کلام کی داد ہیں جس میں بقول غالبؔ ..... "نقش ہائے رنگا رنگ" نظر آتے ہیں اور موخر الذکر ترکیب اردو شاعری میں غالبؔ کے مقام کو متعین کرتی ہے ۔ جسکی توجیہ اگلے اشعار کرتے ہیں اور جس کی تہہ میں غالبؔ کی شوخ

[illegible] ذات پر چوٹ نظر آتی ہے ؎

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

حالی نے ایک ہی شعر میں غالب کو تنقید ادب اور تنقید حیات دونوں کا مرجع قرار دیا ہے غالب اول شاعر ہے بعد کو اسد اللہ خاں۔ اس لیے نکتہ دانی، نکتہ سنجی اور نکتہ شناسی کو پہلا مصرع میں [illegible] کر کے غالب کی ادب و شعر [illegible] پر نگاہ کو [illegible] اور [illegible] پاکیزگی دل اور ذات و صفات کی پاکی کو دوسرے مصرع میں رکھ کر جہاں ایمان نظر [illegible] کردار [illegible] دیا۔ یہ بات بھی صاف [illegible] کہ غالب [illegible] شاعر ہے اور بعد کو کچھ اور۔ آگے چل کر حالی نے [illegible] نثر و نظم دونوں کو سراہا ہے۔ غالب کی نثر [illegible] کا آئینہ ہے تو نظم [illegible] حالی کی شاعرانہ [illegible] غالب کی شاعری میں اثر انگیزی کا [illegible] سبب ہے۔

غالب کی شاعرانہ حیثیت کو چھوڑ کر بہ حیثیت انسان حالی نے غالب کو ایک اچھی اور پسندیدہ شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ پاک دل ـ پاک ذات اور پاک صفات کی تصویر پیش کر [illegible] گئے جیں کر ملتی ہے جس میں ان کی عالی ہمتی، اور بلند ظرفی کو پیش کیا کہ

ندر سائل تھی جان تک لیکن
درخور ہمت اقتدار نہ تھا

خودداری [illegible] ایک نمایاں رخ تھا۔ خاکساروں کے ساتھ خاکساری تھی لیکن اس کے برعکس سربلندوں کے مقابلہ میں انکسار نہ اختیار کرتے تھے۔ دل کی پاکیزگی کا یہ حال تھا کہ دوستوں کے مقابلے میں صرف شکایت زبان پر نہ لاتے تھے اور دشمنوں سے دل میں کینہ نہ رکھتے تھے غالب تضاد کا مجموعہ تھے۔ انسان بڑھاپے میں روکھا سنجیدہ بن جاتا ہے لیکن غالب کی ظرافت مرتے دم تک نہ گئی ــــ وہ بڑھاپے میں بھی بذلہ سنج اور شوخ مزاج رہے۔ زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ اسی تضاد کا نتیجہ تھا کہ وہ آزاد مشرب اور رند ہونے کے باوجود علمار کا مرجع تھے۔ مفتی صدرالدین جیسا عالم بھی اسی سوسائٹی کا ایک ممبر تھا۔

غالب کا کردار جو حالی نے لکھا ہے اس کردار نگاری سے خود حالی کا کردار بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ حالی کو جو عقیدت اور محبت غالب سے تھی اس نظم کے ہر ہر لفظ سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ تمام شعرار کے مقابلے میں غالب کو فضیلت دی ہے۔ اس عقیدت مندی کا تقاضہ یہ تھا کہ حالی غالب کے عیبوں پر پردہ ڈال دیتے اور مولانا شبلی کی طرح اگر وہ بھی ہیرو پرستی پر اتر آتے تو غالب کے صرف محاسن ہی محاسن بیان کرتے۔ لیکن حالی کی طبیعت میں ایمانداری راستی اور انصاف پسندی کے جوجوہر تھے ـ ان کا اظہار ان دو شعروں سے ہو سکتا ہے ؎

بے ریائی تھی زہد کے بدلے
زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

حالی نے صاف طور سے ظاہر کر دیا ہے کہ غالب میں زہد نہ پایا جاتا تھا اور رندو مستی ان کا مشرب تھا۔ اس بیان نے خود حالی کے کردار کو اُجاگر کر دیا ہے

حالی نے جہاں غالب کی انکساری کی مدح کی ہے وہاں خود حالی کی انکساری بھی اس نظم سے ظاہر ہوتی ہے۔ غالب کی وفات کے وقت حالی بچے نہ تھے۔ خاصی عمر ہو چکی تھی۔ شعر گوئی کی منزلیں پوری کر چکے تھے لیکن استاد کی موت پر کہتے یہی ہیں کہ ؎

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

اس طرح تشنۂ مذاق کلام کے الفاظ میں اپنی سخن گوئی کی خوبی کو بالکل دبا دیا ہے اور غالب کی سخن فہمی اور شعر نوازی کو ابھارا ہے۔

سرسید احمد خاں نے خوشامد کے مضمون میں لکھا ہے کہ اچھی صفات اور سیرت سے متصف ہونا خوبی کی بات ہے لیکن جو شخص ان صفات کو غور سے دیکھتا ہے وہ بھی لائق تعریف ہے اس لیے غالب کا مقام اپنی جگہ مسلم ہے لیکن غالب کو اچھالنے والے بھی حالی ہیں جو غالب سے کم قابل مدح نہیں ہیں۔ دوسروں کے کردار کی خوبیاں دیکھنا اور پرکھنا بھی قابل تعریف ہے۔

وتنعم کے سہارے سامان ہی صرف چارہ فرمائے ہموم وافکار کی کمی نے نڈھال کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی ساری رنگینیاں و رعنائیاں، دل فریبیاں اسی چارہ فرمائے ہموم وافکار کے کیف و کرشمہ کی رہین منت ہیں ؎

چاندنی شب، نم شبنم میں مزہ تیرے سبب
پیاری پیاری نظر آتی ہے صبا تیرے سبب

نیند کی رومان پرور لذتوں اس کی سحرانہ کیفیات، وجدانی حسن کا اس قدر حسین اور موزوں، دلکش و دل فریب حقیقت بلاماں بیان اور شاعری میں خاصے کی چیز ہے۔

بسلسلہ صفحہ (۲۲)

ایسی بات نہیں کہ نیند محض غریبوں، بے کسوں اور دکھیوں کو ہے زیست کا ہر لحظہ وبال، ان کے لیے ہی دست شفقت رکھتی ہے بلکہ وہ لوگ بھی جو مست مے عشرت ہیں ان کی زندگی بھی بغیر اس کے حرام ہوتی ہے آج دنیا اس سے زیست کے بچانے کے لیے مضطرب اور پریشان ہے علیش

ستون کعبۂ اسلام، عرش اعظم علم
گل بہشت کمالات، خضر راہ صواب

امام [illegible] مد ظلہ العالی
کہ مہر برج شریعت ہے جن کی مہر خطاب
یہ سن کے مدحت اقدس کی ہو گئی شرح فکر
کہا یہ مطلع نو، رشک مہر عالمتاب

منیر مرحوم کا عزائی کلام، خلوص وصداقت کا مرقع ہے۔ جذبات ونفسیات کے اظہار پر یہ جہاں پر اتر آتے ہیں۔ لفظوں میں واقعات کی بڑی درد آمیز اور رقت انگیز تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں، ایک مرثیہ میں [illegible] حظہ ہو جہاں حضرت حسین علیہ السلام اپنے [illegible] فرزند علی اصغر کو جنھیں تین شب وروز سے پانی [illegible] نہیں ملا تھا، لشکر مخالف کے قریب لائے ہیں۔ اس خیال سے کہ شاید یہ معصوم بچے پر رحم کھا کر کچھ پانی دیدیں۔ حضرت حسین علیہ السلام فرما رہے ہیں

اس وقت نہ پیاسا کرو معصوم کو پانی
پھر دوگے تو اترے گا نہ حلقوم سے پانی
دم رکنے سے معصوم کے گھبرانے کو دیکھو
اور شانے پہ گردن کے ڈھلک جانے کو دیکھو
ان مٹھی بندھے ہاتھوں کے تھرانے کو دیکھو
مجبوری سے میرے یہاں آنے کو دیکھو
پانی کا صلہ حشر میں اصغر تمہیں دیں گے
قطرے جو انھیں دوگے یہ کوثر تمہیں دینگے

حضرت صغریٰ نے مدینہ سے دشت کربلا میں اپنے چھوٹے بھائی علی اصغر کے لیے کچھ کرتے ٹوپیاں بھیجی ہیں۔ لیکن اس شتر سوار کے آنے سے قبل ہی علی اصغر دشمن کے ایک تیر سے شہید ہو چکے ہیں۔ حضرت صغریٰ کا خط پڑھا جا رہا ہے۔ سیدہ ذیجاہ (حضرت حسین علیہ السلام) خط پڑھ رہے ہیں۔ حضرت صغریٰ نے لکھا ہے

تسکین نہ دل کو ہے نہ آرام جگر کو
دیدار تو ایک سمت ترستی ہوں خبر کو

جب دھوپ بہت پڑتی ہے اے حیدر ثانی
کہتی ہوں کہاں گئے یہ اللہ کے جانی
سنتی ہوں کہ آساں ہے غلہ کی گرانی
گرمی کے سبب خشک ہے نہروں کا پانی
کیا جانے حضرت دن [illegible] کیسے ہیں کہ پیاسے
نفرت ہے کچھ اس روز دن مجھے آب غذا سے

کیا ارتباط روحانی ہے۔ آگے ملاحظہ ہو

مرجاؤں کہ روتی رہوں میں تشنہ رو مضطر
اس دھوپ میں آئیں نہ مرے بیٹے کو اکبر
ان بستیوں کے لوگ دغا باز ہیں اکثر
حضرت سے جدا ہوئیں نہ عباس دلاور
ناموس شہنشاہ مدینہ کی خبر لیں
بھولیں نہیں مجھ کو وہ سکینہ کی خبر لیں

حضرت اکبر کو اس لیے مدینہ آکر انھیں خود کو کربلا میں لے جانے سے روک دیا ہے کہ ان دنوں دھوپ زیادہ پڑتی

ہے۔ حضرت عباس کو لکھا ہے کہ ان بستیوں کے لوگ دغا بازی کے خوگر ہیں۔ اس لیے وہ شہنشاہ مدینہ حضرت حسین علیہ السلام سے علیحدہ نہ ہوں۔ مجھے بھول جائیں سکینہ کا خیال رکھیں۔ اپنی پھوپھی کو لکھا ہے

ہیں آپ کے صدقے گئی حضرت سے خبردار
پردیس میں دادی کی امانت سے خبردار

پھوپھی کو "دادی کی امانت" سے باخبر رہنے کی التجا کرتی نفسیاتی ہے۔ اب اپنی اماں سے مخاطب ہیں ۔

اماں کو بھی اصغر کی حفاظت کا رہے دھیان
اس دھوپ سے اس لو سے بچائیں اسے ہر آن
کچھ ٹوپیاں کچھ کرتے پہنچتے ہیں یہاں قربان
پہنیں گے جو بھیا تو مرے نکلیں گے ارمان
کہنا کہ مجھے یاد کھلاتی تھی اصغر
ہدیہ میرا مقبول ہو بھائی علی اصغر

بڑی بہن اپنے ننھے معصوم بھائی سے تصور میں کس محبت سے محوِ گفتگو ہے!!!

یہ سنتے ہی سعادت نے اک حشر مچایا
وہ ٹوپیاں وہ کرتے کوئی خیمے میں لایا
بانو کو مقدر نے یہ ہدیہ جو دکھایا
منھ کر کے سوئے مرقد اصغر یہ سنایا
پوشاک بدلنے کیلئے آئے ہیں دن سے
بیٹا علی اصغر کفن آیا ہے وطن سے

کس قدر رقت انگیز جذبات ہیں ؎

پھر فضہ کو وہ ٹوپیاں کرتے دیے اس آن
رو کر کہا صغریٰ پہ اور اصغر پہ کر احسان
جا گور پر اس ہدیہ کو دکھلا کے تو ہے قربان
پھر قبر پہ رکھنا کہ رہے دونوں پر ارمان
اے زائرو! اس غم کا نہ پایاں ہے نہ حد ہے
صغریٰ کا یہ ہدیہ ہے یہ اصغر کی لحد ہے

ایک موقع پر حضرت سکینہ کی پاسداری و خودداری کتنے بہترین انداز سے دکھائی گئی ہے عزت اظہار پر تین دن سے دانہ پانی بند کر دیا گیا تھا۔ حضرت عباس مشکیزہ لیکر پانی لینے کے لیے نہر پر گئے بھی لیکن وہ پانی نہ لا سکے اور خیموں میں بدستور تشنگی و پریشانی چھائی رہی۔ اس عالم میں شتر سوار آتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

اس نے کہا یہ بچی جو روتی ہے بلا دو
پانی مرے ہمراہ ہے چھاگل ہیں پلا دو
چلائی سکینہ کہ یہ بات [illegible]
پانی کا نہ لے نام خدا کے لیے جلاد
منھ حشر کے دن کیا میں دکھاؤں گی خدا کو
فریاد ہے پانی میں پیوں کھو کے چچا کو

مرثیہ کے اس بند میں جناب منیر کی عقیدت بھی دیکھیے اور رعایت لفظی و مہارت بیانی بھی۔ ؎

تھا فرد بلندی میں وہ شہ کا قد بالا
اور سایہ تھا قد آیۂ [illegible]
کی سایہ [illegible] دو عالم نے تمنا
تا زیر [illegible] ہو نہ دم [illegible]
کونین تہ ظلِ ہمایوں جو در آئے
سایہ کے تلے صاف دو نقطہ نظر آئے

یہی کمال اس بند میں بھی ہے ؎

شہرت الف نیزہ کی تھی تا ف سے تا قاف
انگلی سے گرہ کھولتا تھا ناف کی وہ صاف
کیا بیچ میں تھا ناف کے مثل الف ناف
قائم کبھی مابین جگر تھا صفت کاف
پھل نیزے کا جس وقت میان کمر آیا
پھر کاف کمر کا یہی مرکز نظر آیا!

اس بند میں بھی رعایت لفظی کی بھرمار ہے ؎

اس تیغ سے سب تیر و کماں چھوڑ کے بھاگے
راکب، فرس عمر سعد چھوڑ کے بھاگے
سینوں کے قفس طائر جاں چھوڑ کے بھاگے
کینہ قفس تن؟ کہ جہاں چھوڑ کے بھاگے
تھی تو خدا جنگ شہ تشنہ دہاں کی
خود مرگ طلبگار ہوئی امن و اماں کی

ان کے کلام سے اظہار پاک کی منقبت بڑی خوش عقیدتوں کے ساتھ واضح ہے چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے ؎

تاج سر کونین ہے احسان علیؓ
دل صدقہ ہزار جاں قربان علیؓ
کیا صدمہ قہر و خوف محشر ہو منیر
ہر حال ہیں دست من و دامان علیؓ

حیدر ہے رسول ایزدی کا بازو
ایسا ممکن نہیں کسی کا بازو
معنی ید اللہ سے ظاہر ہے منیر
اللہ کا ہاتھ ہے نبی کا بازو

جس دن سے ہوں خاک پائے عشاق حسنؑ
ہے خضر رہ نجات اشفاق حسنؑ
ہوں گا مسرور نکہت جنت سے
سونگھا ہے میں نے عطر اخلاق حسنؑ

ہے مہر امامت رخ گلگون حسینؑ
ہے حبل متین زلف ہمایوں حسینؑ
صورت بخشش کی دیکھے ہیں مومن
ہے سرخی مصحف، کرم خون حسینؑ

اسی طرح ان کی خوش عقیدتی کی جلوہ گریاں جا بجا آئیں گی۔ کچھ رباعیاں اور ملاحظہ فرمائیے ؎

مطلوب جناب حق ابوطالب ہیں
یعنی پدر غالب پہ غالب ہیں
پاک و طاہر ہیں والدین حیدر
ایمان کی جان، نور کے قالب ہیں

بزم ایماں میں زینت مسند ہیں
اعمام نبی میں اکرم و امجد ہیں
اعلیٰ ہے وقار حضرت حمزہؓ
کوہ احد سے فضائل بے حد ہیں

داماد پیغمبر کے برادر ہیں یہ
رتبہ میں ملائکہ سے بہتر ہیں یہ
کیا مرتبہ جعفر طیار کہوں
بازو کے بازو کے پیغمبر ہیں

نزہت دل بضعۂ پیمبر ہو تم — مانند بتول پاک و اطہر ہو تم
یا حضرت زینب میری امداد کرو — جلال و ہمات کی دختر ہو تم

ہے سیف خدا۔ خطاب عباس علی
محراب حرم رکاب عباس علی

بیدست ہیں پر مثل ید اللہ منیر
کرتے ہیں مدد جناب عباس علی

اپنی غزلوں کے اکثر مقطعوں میں بھی انھوں نے اپنی خوش عقیدگی کا اظہار کیا ہے ۔

مرتضیٰ کے عشق سے تکمیل ایماں کر منیر
رشتۂ عمر رواں حبل المتین ہو جائے گا

لے جائیں گے جنت میں منیر اس کو
جو عاشق صادق ہے حسینؑ اور حسنؑ کا

سایہ دامن منیر خستہ پر ہو یا علی
آفتاب حشر کی فدوی نہ کھانے پائے دھوپ

یا علی آئے منیر آپ کے روضہ تک کیا
دیکھیے پاؤں کی بیڑی ہائے تقدیر کے پیچ

حصن غم میں ایک مدت سے مقید ہے منیر
فکر دنیا کا حصار اے حیدر کرار توڑ

گوہر دریائے بخشش کا ہوں جویا اے منیر
ہے غم شبیر میں آنسو بہانے کی ہوس

اے خدا عشق علی میں رکھ منیر خستہ کو
بس یہ ہے بندہ تیرا ساری خدائی کی غرض

حل ہو منیر خستہ کی مشکل کبھی یا علی
ماں باپ میرے اور میں قربان آپ کے

ایسے کئی مقطعے اور بھی ہیں انھوں نے حضرت علی اور حضرت حسین کی تاریخ وفات بڑی بے نظیر نکالی ہے ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت علی ابن ابی طالب کی تاریخ شہادت ۔

چوں گشت شہید نور خالق — حبیب خود قدسیاں دریدند
تاریخ بتخرجہ نوشتم — افسوس سر علی بریدند

سنہ ہجری

تاریخ سال شہادت شاہ کربلا حسین کل گون قبا علیہ السلام

رفت چوں شاہ شہیدان در بہشت
گشت از تیغ الم بسمل نبیؐ
گفتہ ام سال شہادت اے منیر
بے سر و پا شد حسن۔ بیدل نبیؐ

ان کی عوامی ادب کے استاد مرزا دبیر مرحوم تھے ان کے ارشاد کی تعمیل میں یہ غزل گوئی کے قیود سے غزل کے علاوہ دیگر اصناف میں پوری آزادی برتتے ہیں قصیدہ لے (؟) شعر میں اخفائے نون ہے ۔

ہر سمت بول بالا ہوا سلام کا ہوا
عجب وقت اس کے گوش مبارک میں دی اذاں

میر اخلاق مرحوم (منیر کے غزل کے استاد) کے خیال کے مطابق اس شعر میں ایطا ہے۔ لیکن منیر مرحوم نے اسے اپنی مثنوی میں لکھا ہے ۔

دیکھ کر میر نے پہلے سر پیٹا پھر اس نظم کو صحیح کیا

جہاں رتبہ شاگردی میں نسبت استاد مرا... کا کیا ذکر منیر مرحوم اپنے استاد ... تمام استادانہ کمال کے ... بسر کے لیے آگے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

کیا اب ہے کیا احترام ہے

دہاں معنی و سرمایہ ... دانش و علم

حریم ورع و ارتقا جناب دبیر

... علم بدیع و بیان، دمعنی و نظم

... جہاں سند اجناب دبیر

شہ سریر فصاحت، مہ سپہر کمال

سروج طالع طبع ... جناب دبیر

محیط ہمت و در یگانۂ ایثار

سفینہ یم خلق رعطا جناب دبیر

سید منیر مرحوم کو مرزا دبیر مغفور کی شاگردی پر بعید ناز ہے۔۔

عطا کی مرثیہ میں اس کی اصلاح

کہ جس کا بزم ہے خورشید مصباح

مسیحائے سخن اعجاز گستر

دبیر پاک ایسا مقبول داور

چلے جب تک نسیم صبح گاہی

سلامت ان کو رکھنا ... الٰہی

جیسا کہ از سر عمر میں کہا جا چکا ہے ۸ ... ۱۹۰۰ء

مطابق ۶ ر اگست ۱۸۸۰ء میں ہیضے کی بیماری میں مبتلا ہوکر ۶۸ سال کی عمر میں انھوں نے بہ مقام رامپور داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور وہیں مقبرہ نواب مہدی علی خاں میں سپرد خاک ہوئے تھے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

ان کے نواسہ اور شاگرد جناب عاشق حسین بزم اکبرآبادی کا قطعۂ تاریخ اس سلسلہ میں ملاحظہ فرمایئے:

منیر ماہ اوج نظم روشن

سخنور ذی ہنر، زاہد مہذب

گئے دنیا سے رہ خلد بریں کر

مجھے دے صبر اس ماتم میں یارب

دل محزوں کو ہے صدمہ نہایت

جگر ٹکڑے ہے غم سے نالہ برلب

مہینہ، وقت، دن رحلت کا اُن کی

چہارم ماہ سوم اور جمعہ کی شب

کہی یہ عیسوی تاریخ اے بزم

چراغ شاعری گل ہوگیا اب

۱۸۸۰ عیسوی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مطبوعات ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ

بہ ترتیب حروف تہجی معہ جدید قیمت، فروری ۱۹۷۷ء

(ا)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	امیر خسرو نمبر	فروغ اردو	۱۲/-
۲	ادبی جائزے	سعادت علی صدیقی	۸/-
۳	ایشیا کا چین تہواروں کے پھول	ثمر لسوانی	۳/-
۴	احتشام حسین نمبر فروغ اردو	سید انصار حسین ہالی	۲۵/-
۵	اردو کا ماضی حال اور مستقبل	احمد ابراہیم علوی	۴/-
۶	آئینہ نظم اردو	ثمر لسوانی	۴/-
۷	انتخاب کلام چکبست لکھنوی	روپ نرائن شیو پوری شاکر	۱/-
۸	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر محمود الحسن رضوی	۱۶/-
۹	اردو مہم نمبر فروغ اردو	اقبال صدیقی	۳/۵۰
۱۰	نوار اللغات اردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز)	پروفیسر احتشام حسین	۶/-
۱۱	ادبی تاثرات	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۷/-
۱۲	آئینہ عقل	پروفیسر نکہت ستا سمبھانپوری	۵/۴
۱۳	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶/۵۰
۱۴	امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۱۵	انارکلی امتیاز علی تاج (جدید اڈیشن)		۳/۵۰
۱۶	مراۃ جان ادا	مرزا سودا	۵/۵۰
۱۷	اردو تنقید پر ایک نظر معہ اضافہ جدیدہ	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۰/-
۱۸	اردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶/-
۱۹	انتخاب قصائد اردو	مغیث الدین فریدی	۱/۵۰
۲۰	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	۸/-
۲۱	اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم	عبد الشکور	۸/-
۲۲	ادبی نقوش	شاہ معین الدین ندوی	۸/-
۲۳	اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	عبد الماجد دریابادی	۸/-
۲۴	انتخاب جدید نثر اردو	سید احتشام حسین	۵/-
۲۵	اقبال مرتبہ فروغ اردو		۰/۵۰
۲۶	البرامکہ اور ان کا عروج و زوال	ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے	۳/-
۲۷	انتخاب کلام غالب	بشیر احمد علوی	۱/۵۰
۲۸	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	۸/-
۲۹	انتخاب قصائد غزلیات فروغ اردو جدید اڈیشن		۶/-
۳۰	ادب کیا ہے	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۴/-
۳۱	ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	۸/-
۳۲	آئینہ نثر اردو	سعادت علی صدیقی	۴/۵۰
۳۳	ایک نادر روزنامچہ	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۴/۵۰
۳۴	ابوالنجم	مجنوں گورکھپوری	۰/۵۰
۳۵	اردو کی کہانی	سید احتشام حسین	۲/۵۰
۳۶	ادب پارے حصہ نظم و نثر	"	۵/۷۵
۳۷	ابوالکلام آزاد (نظم)	جگن ناتھ آزاد	۰/۲۵
۳۸	ارمغان نثر و نظم	عبد الاحد خلیل	۴/۷۵
۳۹	افسانہ نمبر (مرتبہ فروغ اردو)		۲/۵۰
۴۰	اچھی نظمیں	افکر مشتاق	۰/۷۰
۴۱	اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید اڈیشن	غلام احمد فرقت	۲۵/-
۴۲	اردو شاعری	امیر احمد علوی	۳/۵۰
۴۳	غزلیات حافظ صاحب	غالب فارسی	۳/۵۰
۴۴	آخری یادگار نادر شاہ معہ ترجمہ		۲/-
۴۵	اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنیوالی کتاب	اعجاز احمد فاروقی	۱/۲۵
۴۶	اللہ کے پیارے	امیر حسن نورانی	-/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۴۷-	اسپین کی شہزادی	صادق سردھنوی	۲/۵۰
۴۸-	ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اردو		۲/۵۰
۴۹-	اپنی موج میں	ادارہ	۲/۵۰
۵۰-	انوار حیدیہ خط و کتابت	خلیق احمد علوی	-/۴۵
۵۱-	ایک جان تین قالب	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۵۲-	الفت	" "	۵/۵۰
۵۳-	آغاز سحر	" "	۴/-
۵۴-	اسین آباد	" "	۴/-
۵۵-	انشائے خطوط نویسی حصہ اول	مشیر احمد علوی	۴/-
۵۶-	اچھی کہانیاں	شمس الدین نوری	-/۵۰
۵۷-	انشائے خطوط نویسی حصہ دوم		-/۷۵
۵۸-	انجادوں کی باتیں	مصطفےٰ حسن رضوی	۳/-
۵۹-	اچھی کہانیاں حصہ اول	شمس الدین نوری	-/۵۰
۶۰-	" " حصہ دوم	" "	-/۵۵
۶۱-	" " حصہ چہارم	" "	-/۷۵
۶۲-	ادب کا مقصد	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۵/۵۰
۶۳-	اسلامی نظمیں	محمد حسین شمس علوی	۴/-
۶۴-	اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں	عبدالماجد دریابادی	۳/۵۰
۶۵-	اوراق گل	اخگر مشتاق	۱/-
۶۶-	ارض القرآن	عبدالماجد دریابادی	۳/۵۰

(ب)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	بابائے اردو عبدالحق	عبداللطیف اعظمی	۷/-
۲-	بستان حرم (جدید نعتیہ کلام)	زائر حرم حمید صدیقی	۳/-
۳-	شہید محبت لوٹا سنگھ	خان محبوب طرزی	۴/-
۴-	بزم بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	۴/۵۰
۵-	بجٹ کہانی	ڈاکٹر نورالحسن، ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۵/-
۶-	بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی کاکوروی	۸/-
۷-	بلال	علامہ اقبال	-/۵۰
۸	بہشتی ثمر (حصہ اول و دوم) خلاصہ بہشتی زیور	مولانا تھانوی	۳/۸۰
۹-	بانی اسلام علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ		۲/-
۱۰	پیغمبر بعثت انبیاء	عبدالماجد دریابادی	۴/-

(پ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۳/-
۲-	پیاری باتیں	محسن کاکوروی	۴/-
۳-	پھولوں کے انبار (ناول)	منظر سلیم	۴/۷۵
۴-	پلسیہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ	ڈاکٹر محمد حسن	۶/-
۵-	پاگل خانہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۳/۲۵
۶-	پیغام	طاہر دیالپوری	۳/-
۷-	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی	۸/-
۸-	پردیسی کے خطوط (حصہ اول)	مجنوں گورکھپوری	۵/-

(ت)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	تذکرہ فانی، فانی کی شخصیت پر جامع تبصرہ و کلام فانی	مختارالدین سبزواری	۲/-
۲-	مختصر تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن)	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۱۲/-
۳-	تصویر درد معہ تشریحات و ترجمہ	فرید احمد علوی	۱/-
۴-	تحریریں مجموعہ مضامین	ڈاکٹر گیان چندر	۸/-
۵	تاریخی جائزے	ڈاکٹر محمد یاسین	۳/-
۶-	تصدیق تجزیے	کاظم علیخاں	۵/-
۷-	آثار سے تاریخ اردو ترمیم شدہ جدید ایڈیشن	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۸/-
۸-	تاجدار مدینہ	اقبال صدیقی	۱/۳۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۹-	تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر	۷/۵۰
۱۰-	تنقید و تحلیل	ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی	۷/۵۰
۱۱-	تنقیدی جائزے جدید اڈیشن	سید احتشام حسین	۸/-
۱۲-	تنقیدی نظریات جلد اول	" "	۳/-
۱۳-	" جلد دوم	" "	۱۰/-
۱۴-	تنقیدی اشارے (جدید اڈیشن) ۱۹۷۷ء	آل احمد سرور	۵/-
۱۵-	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	۸/-
۱۶-	ترانہائے خیام	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۱۷-	تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص	محمد حسین شمس	۳/-
۱۸-	تصویر درد معہ ترجمہ	علامہ اقبال	۱/-

(ٹ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ٹیگور	نادم سیتاپوری	۳/-
۲-	ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۱۰/-

(ث)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ثنائے حبیب و نعتیہ کلام	بہزاد لکھنوی	۲/۲۵

(ج)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	جہان غالب	محمد حسین شمس علوی	۳/-
۲-	جائزے	انور سدیدی	۳/-
۳-	جواہرات المعیل	ڈاکٹر [illegible]	[illegible]
۴-	جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء)	[illegible]	[illegible]
۵-	" " نمبر ۲	"	۴/-
۶-	جوئے رواں مجموعہ کلام	حامد اللہ افسر	۳/۵۰
۷-	جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بلگرامی	۳/۵۰
۸-	جنگ ہنسائی مجموعہ افسانہ	قیصر تمکین	۲/۵۰
۹-	جلوے	معین الدین ... کی	۲/-
۱۰-	جمیلہ پوائری (ناول)	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۱۱-	جگر نمبر اول	سید احتشام حسین	۸/-

(چ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	چوتھی بہن مجموعہ افسانہ	مسیح الحسن رضوی	۳/-

(ح)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	حیات فضل الحق	خیرآبادی	۱/۵۰
۲-	حالی بحیثیت شاعر جدید اڈیشن معہ ضمیمہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱۷/-
۳-	حسرت موہانی	عبدالشکور	۶/-
۴-	حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	۲/۵۰
۵-	حکیم نباتات	وزیر خاں لنکاوی	۲/-
۶-	حبیبہ غالب	سعادت علی صدیقی	۲/۵۰

(خ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	خطوط بگو د	سید زائر حسین	۴/-
۲-	خضر راہ مع ترجمہ	علامہ اقبال	۱/-
۳-	خطبات ماجدی یا سیرت نبوی	عبدالماجد دریابادی	۲/۵۰
۴-	خضر راہ معہ ترجمہ	علامہ اقبال	۱/-
۵-	خلاصہ شریف زادہ	مرزا رسوا	/۲۵
۶-	خلاصہ روح تنقید		۱/-
۷-	خلاصہ [illegible]		/-
۸-	خطبات مزاحیہ علی واحدی معہ مقدمہ	شوکت تھانوی	۵۰
۹-	خوش سنجی کی تلاش	احسن الظفر بی اے	[illegible]
۱۰-	خلاصہ شعر الہند حصہ دوم		/-
۱۱-	خلاصہ المیزان		/۷۵

(د)

۱	دیوان آبرو	ڈاکٹر محمد حسن	۴/-
۲	دلچسپ کہانیاں	مسعود عالم	۴/۵۰
۳	دیوان فغانی		۲/-
۴	داستان سہراب و رستم معہ مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۴/۵۰
۵	دہلی کا یادگار مشاعرہ		۱/۵۰
۶	دستہ گل		۰/۶۰
۷	دوشیزہ قاتلہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۵/-
۸	دلربا	" "	۳/-
۹	دلی کا دبستان شاعری (معہ اضافہ جدید اڈیشن)	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۱۸/-
۱۰	دھڑکنیں	ذکی کاکوروی	۳/۵۰

(ڈ)

۱	ڈاکٹر نذیر احمد صاحب	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۴/-

(ذ)

۱	ذوق و جستجو	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی	۱۲/-
۲	ذوق ادب و شعور	سید احتشام حسین	۶/۵۰
۳	ذوق جنون مجموعہ کلام	آل احمد سرور	۱۰/-

(ر)

۱	روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین	۸/-
۲	رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ	سید آسی نورانی	۳/۵۰
۳	رہبر مضمون نویسی	شجاعت علی صدیقی	۳/-
۴	راکھی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۰/۵۰
۵	رخسار سحر	انصر کریم قدوائی	۱/۵۰
۶	رفتار	وحشی محمود آبادی	۳/۵۰
۷	رموز حکمت معہ مقدمہ اردو	محمد شریف	۳/۵۰
۸	ریاض فارسی	منتخب کلام فارسی	۳/-
۹	ریختہ ولی جدید اڈیشن	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۳/-

(ز)

۱	زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ	مولانا تھانوی	۰/۵۰
۲	زنبٹو کا بادشاہ حکیم بانا مزاحیہ ناول	سید علی عباس حسینی	۳/-
۳	زینب ساحرہ	وحشی محمود آبادی	۳/-

(س)

۱	سلور کنگ	آغا حشر کاشمیری	۵/-
۲	سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۴/-
۳	سرور جہاں آبادی	ڈاکٹر حکم چند نیر	۸/-
۴	سرود نو (مجموعہ کلام)	پروفیسر اختر قادری	۵/۵۰
۵	سنگ گہر	سید احتشام حسین	۴/-
۶	سر سید احمد یا کوہ کاف کی پری	سید علی عباس حسینی	۱/۵۰
۷	سرمایہ زبان اردو	جلال لکھنوی	۹
۸	سفر (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/-
۹	سیاحت زمین "	محمود اعظم فہمی	۵۰
۱۰	ستاروں سے آگے	ناظر کاکوروی	۳/۵۰
۱۱	سنہرا حلقہ		۰/۷۵
۱۲	سر سید احمد خاں	انوارالحسن صدیقی	۴/-
	سوشل اسٹڈی	احمد حسن کاکوروی	۵/-

۱	شعر نو تنقیدی مجموعہ	ڈاکٹر محمد حسن	۷/-

۲۔ شرح دیوان غالب (مزاحیہ) — غلام احمد فرقت — ۸/۵۰
۳۔ شرح سلک گہر — عبدالقوی دریابادی — ۵/-
۴۔ ساغر نگین حضرت جی — پروفیسر عبدالشکور — ۳/-
۵۔ شرح ادب پارے نثر — سعادت علی صدیقی — ۴/-
۶۔ شرح ادب پارے نظم — ڈاکٹر محمود الحسن — ۴/-
۷۔ شرح منتخبات فارسی — عبدالقوی دریابادی — ۵/-
۸۔ شبلی نعمانی — انوار الحسن نورانی — ۱۰/-
۹۔ شرح دیوان غالب جدید اڈیشن — نظم طباطبائی — ۸/-
۱۰۔ شہری اور سماجی زندگی — عبدالعلی قدوائی — ۸۰/-
۱۱۔ 〃 〃 اول 〃 〃 — ۹۸/-
۱۲۔ 〃 〃 دوم 〃 〃 — ۱/-
۱۳۔ 〃 〃 سوم 〃 〃 — ۱/-
۱۴۔ شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ — امیر احمد علوی — ۲/۵۰
۱۵۔ شعر العجم، حصہ اول، دوم، سوم، چہارم۔ پنجم۔ — شبلی نعمانی — ۴۵/-
۱۶۔ شرح نثر امروز ایران — احسن الظفر بی اے — ۳/-
۱۷۔ شرح نظم امروز ایران — 〃 — ۳/۵۰
۱۸۔ شرح رموز شاعر — علامہ اقبال — ۵/-
۱۹۔ شرح حکیم نباتات وزیر خان — نیر مسعود — ۱/۷۵
۲۰۔ شرح انتخاب قصائد وغزلیات — مطابق نصاب بی اے — ۷/-
۲۱۔ شرح شعر باستان حصہ اول — ڈاکٹر انوار الحسن — ۳/-
۲۲۔ شرح ترانہائے خیام — حکیم عبدالقوی — ۲/-
۲۳۔ شرح مفتاح العربیہ — عبدالقوی دریابادی — ۱/۵۰
۲۴۔ شرح نصاب فارسی — ۶/-
۲۵۔ شرح شعر باستانہ دوم — احسن الظفر — ۳/-
۲۶۔ شرح گلہائے ادب — ۳/-
۲۷۔ شرح آئینہ نظم اردو — ۳/-
۲۸۔ شرح نثر فارسی (امروزہ) — ۳/-
۲۹۔ شرح آئینہ نثر اردو — خلیل قدوائی — ۴/-
۳۰۔ شرح غنچۂ گل — ۵/-
۳۱۔ شرح شعر فارسی کلاسیک — احسن الظفر — ۳/-
۳۲۔ شرح ہماری زبان اردو درجہ ۶، ۷، ۸ درجے سے — خلیل قدوائی — ۳/-

(ص)

۱۔ صید و ہدف (مزاحیہ مضامین) — غلام احمد فرقت — ۵/-
۲۔ صحیفۂ محبت مہدی افادی کے خطوط — ڈاکٹر محمود الٰہی — ۶/-

(ط)

۱۔ طرزی نمبر (خان محبوب طرزی) — مرتبہ فروغ اردو — ۳/-
۲۔ طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے — غلام الثقلین — ۴۵/-
۳۔ طلسم اسرار (ڈرامہ) — مرزا رسوا لکھنوی — ۱/۵۰

(ع)

۱۔ عذرا (ناول) — صالحہ عابد حسین — ۶/-
۲۔ عکس اور آئینے تنقیدی مضامین کا مجموعہ — سید احتشام حسین — ۸/-
۳۔ عبدالماجد دریابادی نمبر — ۲/-

(غ)

۱۔ غالب کا تنقیدی شعور — اخلاق حسین عارف — ۴/-
۲۔ غالب نام آورم — نادم سیتاپوری — ۶/-
۳۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر — سید احتشام حسین نورانی — ۶/-
۴۔ غالب کی تخلیقی تحریک — شمیم حنفی لکھنوی — ۸/-
۵۔ غنچۂ دگل — سید محمود الحسن رضوی — ۴/۵۰
۶۔ غالب کے کلام میں الحاقی عناصر — نادم سیتاپوری — ۴/-

۸۔ قرانی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۲/۵۰
۹۔ غزلیات نظیری ۱/۵۰
۱۰۔ غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید اڈیشن) ذکی کاکوروی ۲۵/-

(ف)

۱۔ فرقت کاکوروی نمبر ۲/-
۲۔ فروغ لغت طاہر محسن علوی ۴/۵۰
۳۔ فن خطابت یعنی اُستاد تقریر کلب مصطفےٰ ایڈوکیٹ ۱۵/-
۴۔ فریدہ خان محبوب طرزی ۳/-
۵۔ فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادم سیتاپوری ۷/-
۶۔ فلسفہ اقبال عبد القوی دریابادی ۵/-
۷۔ فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰
۸۔ فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۴/-
۹۔ فغان محسن محسن کاکوروی ۴/-
۱۰۔ فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/-
۱۱۔ فن داستان گوئی جدید اڈیشن پروفیسر کلیم الدین احمد ۸/-
۱۲۔ فریاد امت علامہ اقبال ۷۵/-

(ق)

۱۔ قدحِ جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں غلام احمد فرقت ۲/
۲۔ قصائد ظہیر فاریابی ۲/-
۳۔ قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۲/۵۰
۴۔ قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۲/-
۵۔ قصص و مسائل عبد الماجد دریابادی ۳/-
۶۔ قصائد قاآنی (فارسی) ۱/-
۷۔ قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر ۴/-
۸۔ قیامت صغریٰ، سائنس ناول خان محبوب طرزی ۳/-

(ک)

۱۔ کلیات اقبال علامہ اقبال ۱۰/-
۲۔ کیسر اور کاہی بدر الدین طیب جی ۳/-
۳۔ کف گلفروش مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت ۵/۵۰

(گ)

۱۔ گاندھی نمبر ۲/-
۲۔ گلدستہ فارسی اول و دوم محمد غوث بیگ سیفی ۲/۲۵
۳۔ گلزار فارسی یعنی آمد نامہ جدیدہ ۷۰/-
۴۔ گلہائے ادب عبد الاحد خان خلیل ۲/-
۵۔ گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر ۱/۵۰

(ل)

۱۔ لوائح جامی مع مقدمہ عبد الاحد خان خلیل ۱/۵۰
۲۔ لال قلعہ مائل ملیح آبادی ۲/-
۳۔ لب بام عادل رشید ۲/-
۴۔ لسانیات اور اُردو سید محمود الحسن رضوی ۲/۵۰

(م)

۱۔ مرقع اقبال علامہ فاطمہ علویہ ۱۲/-
۲۔ مزاحیہ شرح دیوان غالب اُردو ۱/۵۰
۳۔ محسن کاکوروی نمبر ۵۰/-
۴۔ مسلمان اور کانگریس ابو الکلام آزاد ۲/۵۰
۵۔ مرثیہ نگاری اور میر انیس ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/-
۶۔ مضامین فرحت حصہ اول مرزا فرحت اللہ بیگ ۵/-
۷۔ 〃 〃 حصہ دوم 〃 ۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	-/۳
۱۰-	میرے اسٹیج ڈرامہ	ڈاکٹر محمد حسن	-/۷
۱۰-	موسم گل ناول	عادل رشید	-/۷
۱-	مجبور	خان محبوب طرزی	۲/۵۰
۱۱-	مضامین جدیدہ	محمد حادی	۲/۵۰
۱۳-	مثنوی سحر حلال فارسی معہ مقدمہ		
۱۴-		قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۱۵-	مطالعہ	ذکی کاکوروی	-/۵
۱۶-	مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۱۷-	معرکہ روم دیوان	صادق سردھنوی	-/۶
۱۷-	مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۱۸-	مطالعہ حالی	" "	-/۸
۱۹-	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
۲۰-	میٹھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	-/۲
۲۱-	مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	-/۴
۲۲-	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصاب [illegible]	۲/۵۰
۲۳-	مرثیہ غالب	حالی	۲۵/-
۲۴-	محبوبہ کربلا	جرجی زیدان	۲/۵۰
۲۵-	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۶-	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	-/۴
۲۷-	انتخاب فسانہ آزاد یعنی مہاراج بلی	سرشار لکھنوی	
۲۸-		ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵
۲۹-	مسٹر ملا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز حسن مجذوب	۷۵
۳۰-	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا [illegible]	۱/۵۰
۳۱-	مصباح بلاغت معہ مقدمہ	محمد شریف	۴
۳۲-	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۵/
۳۳-	مقدمات و مقالات	عبدالماجد خاں	۵/۵۰
۳۴-	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	-/۲
۳۵-	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دار العلوم کے نام	عبدالماجد دریابادی	-/۸۰
۲-	نثر امروز ایران	ڈاکٹر نذیر حسین	۳/۵۰
۳-	نشاۃ غالب	وجاہت علی سندیلوی	-/۶
۴-	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۵-	نقش حالی اول دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
۶-	شجاعت علی سندیلوی		-/۳
۷-	نغمہ کوہسار	خان محبوب طرزی	-/۴
۸-	نفحات الہند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	-/۳
۹-	نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	-/۱۲
۱۰-	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۱۱-	نشتر پن نشتر	ذکی کاکوروی	۵/
۱۲-	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	-/۴
۱۳-	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۱۴-	ندوۃ العلما کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبدالماجد دریابادی	-/۸۰
۱۵-	نوائے سرور جہاں آبادی دیوان	ڈاکٹر حکیم چند نیر	۷/۵۰
۱۶-	سیارہ ستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۱۷-	نوروز	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۱۸-	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ	آل احمد سرور	-/۱۰
۲۹-	نیلم	انتصار حسین	۳/۰۰
۳۰-	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	-/۱
۳۱-	نقوش افکار	مجنوں گورکھپوری	۶/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۰-	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۶/-
۲۱-	منشی نولکشور نمبر		۳/-

(و)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	وعدۂ فردا	اخگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-

(ہ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانہ	علی عباس حسینی	۵/-
۲-	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۱/۲۵
۳-	ہمارا جھنڈا -	حامد اللہ افسر	۱/-
۴-	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	مظفر سلیم	۱/۵۰
۵-	ہندوستان کا تیسرا منصوبہ		۱/۵۰
۶-	ہمارا سماج ۱	ڈاکٹر مصطفیٰ احسن علوی فرنگی محلی	۴/-
۷-	" " ۲	" "	-/۹۵
۸-	" " ۳	" "	۱/-
۹-	" " ۴	" "	۱/-
۱۰-	یادگار غالب	مولانا حالی	۶/
۱۱-	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۱۲-	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۵/۵۰

ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو - نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

۱. پرچہ ہر ماہ کی دو تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

۲. جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں

۳. اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

۴. جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے

۵. ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لیے ٹکٹ لگانا ضروری ہیں

جلد (۲۴) شمارہ (۹) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو/ این، پی ۹۳
لائسنس نمبر. ۶۴، ۲۰۰۸/۲۰۲۴۱۷
دفتر فون: ۲۶۱۳۵
فون رہائش گاہ ۲۶۶۵۶

زر سالانہ اعزازی دس روپیہ
عوام سے آٹھ روپیہ
فی پرچہ ۷۰ پیسہ
پتہ :- ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

ادارۂ فروغ اردو ھند ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماھنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۹) جنوری ۱۹۷۸ء جلد (۲۴)

ترتیب

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ ناداں محل روڈ میں چھپواکر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک سے شائع کیا

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

قارئین فروغ اردو کو نیا سال ۱۹۷۸ء مبارک ہو۔ خدا کرے یہ سال بنی نوع انسان اور اُردو زبان کے لیے ہمہ جہت خوشحالی اور ترقی کا سال ثابت ہو۔

مرکزی حکومت کے مرد آہن نے اُردو کے متعلق ایک انٹرویو میں جو بیان دیا تھا اس پر گذشتہ شمارہ میں لکھا جا چکا ہے۔ ان کے اس بیان سے نہ صرف اُردو دنیا بلکہ جمہوریت پسند اور منصف مزاج حضرات میں بےچینی پیدا ہونا فطری اور انسانی تقاضہ تھا پُورے ملک میں اس کے خلاف احتجاج کیا گیا، غالباً اُنھیں باتوں سے متاثر ہوکر، اب بیان دینے والے کو، توضیح و تاویل کرنے کی ضرورت پڑی، لیکن اس وضاحت اور تاویل پر اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر　　پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اردو زبان کی شیرینی اور مقبولیت کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کا رسم خط بدیسی یعنی ایرانی ہے اس کا مطلب صاف اور واضح ہے کہ اس بدیسی رسم خط کو بدل دو، اُردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے لگو، پھر زبان کا کوئی جھگڑا نہیں رہے گا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ جب اُردو کا رسم خط ختم ہو جائے گا تو اُردو زبان ختم ہو جائے گی۔ اور جب اُردو زبان ختم ہو جائے گی تو اُردو بولنے والے ختم ہو جائیں گے انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ اگر کسی قوم کو ختم کرنا ہے تو اس کی زبان ختم کردو اور اگر کسی زبان کو ختم کرنا ہے تو اسکا رسم خط ختم کردو

اُردو زبان کا وجود، اس کی انفرادیت و اہمیت، اس کی دلکشی و مقبولیت اس کے رسم خط کے بغیر ناممکن ہے پھر ذرا وسعت نظر سے دیکھا جائے تو یہ رسم خط کسی ایک ملک یا علاقہ تک محدود نہیں ہے،

عربی و فارسی کے مماثلت ہونے کی وجہ سے پوری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ دنیا کا کون ایسا ملک ہے جہاں اس رسم خط کے جاننے اور پہچاننے والے موجود نہیں ہیں۔ اس رسم خط کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے اور ناگری رسم خط؟ اپنے ہی دیس میں، نامقبول ہے، لے دے کے شمال ہند کی چند ہندی ریاستوں میں تو ضرور اس کا چلن ہے لیکن ان کو چھوڑ کر دوسری تمام ریاستوں اور جنوبی ہندوستان میں ناگری رسم خط کا چلن کتنا ہے؟ یہ ہماری حکومت خوب جانتی ہے رسم خط بدلنے کی رائے کچھ ایسے لوگ بھی دیتے ہیں جن کے ادب پر سیاست کا غلبہ ہے اور جو لسانی آمریت کی خوشی کے لیے مختلف قسم کے فوائد حاصل کرتے رہتے ہیں۔

اُردو زبان کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے اور آئینی حیثیت دیئے جانے کا مطالبہ برابر بڑھتا جا رہا ہے، آزادی کے بعد اُردو والوں کو جس طرح زبانی وعدوں، گشتی تعلیموں، کمیٹیوں اور رعایتوں سے بہلایا جاتا رہا ہے، اُردو کے سلسلے میں جس طرح سرکاری مشوروں اور احکامات کو ردی کی ٹوکری میں پھینکا جاتا رہا ہے۔ اُردو دنیا ان سے خوب واقف ہے۔ اب وہ "آزمودہ را آزمودن جہل است" کے مصداق کسی وعدے کا اعتبار ہرگز نہیں کر سکتی اب اُردو کے بیٹے کو جب تک آئینی اور جائز حق نہیں مل جاتا چین سے نہیں بیٹھیں گے وہ مسلسل آئینی اور جمہوری جدوجہد کرتے رہیں گے اس میں شبہ کا سوال ہے کہ جب تک ہندوستان میں جمہوریت کا صحیح شعور پیدا ہوگا، اُردو کو پہلے سے زیادہ ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے وہ پہلے سے زیادہ وسیع، ہر دلعزیز اور مستحکم ہوگی۔ یہ تو لسانی تعصب اور اکثریت کی خود غرضانہ یا اختیارات کی تنگ نظری تھی، جو اُردو کو ختم کر دیا گیا ورنہ جس زبان پر غلامی کے دور میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی جس کو ہر شخص پڑھ سکتا تھا، جس پر اقتصادی و معاشی دروازے کھلے ہوئے تھے وہ آزادی کے بعد اس زبان پر تمام دروازے بند کر دیئے گئے اس کو زندہ رہنے سے بھی محروم کر دیا گیا، وہ اگر یہ کہے تو کیا بےجا ہے۔

ع اے وائے طلوع آزادی آزاد ہوئے اسیر کیلئے

"پریم چند" نمبر کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔ بہت سے مشاہیر ادب کے گرانقدر مضامین اور مقالے آچکے ہیں۔ ابھی چند حضرات کے مضامین کا انتظار ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس نمبر کو ہر لحاظ سے معیاری اور مثالی بنایا جائے۔ اُمید ہے بقیہ مضامیں ہمارے کرمفرما جلد روانہ فرمائیں گے۔

اُردو

از ظفر سنبھلی

حسین و دلکش و جادہ بیان ہے اُردو — ہے عام فہم ، عوامی زبان ہے اُردو
ہزار جسم ہیں اور ایک جان ہے اُردو — ہماری ایک جہتی کا نشان ہے اُردو
وطن کی پاک ہواؤں نے اس کو پالا ہے
اسی چراغ سے چاروں طرف اجالا ہے

ولی و میر نے خونِ جگر دیا اس کو — سراج و درد نے حسن نظر دیا اِس کو
بلند مومن و غالب نے کر دیا اس کو — انیس و اوج نے دردو اثر دیا اس کو
کبیر و سور کی بھکتی کی ترجمان ہے یہ
نسیم و شفتہ و چکبست کی زبان ہے یہ

بہن ہے ہندی کی ، پنجابی کی سہیلی ہے — امیر خسرو کی دلچسپ یہ پہیلی ہے
یہ ماتا اور زبانوں کے ساتھ کھیلی ہے — مگر یہ طرز بیان کے سبب اکیلی ہے
اسی کے رنگ سے کھیلی کرشن نے ہولی
یہی فراق کی آنکھوں میں رات دن ڈولی

بہت بلند ہے ہندوستان میں اسکا وقار — کیا شاہوں نے زر اسکی عظمتوں پہ نثار
محل اودھ کے ہوں یا کہ ہوں مغلیہ دربار — اسی کے نام کی رہتی تھی ہر گھڑی گنجبار
یہ ہے وہ شمع کہ آندھی بجھا نہیں سکتی
ظفر اسے کوئی سازش مٹا نہیں سکتی

صابر سنبھلی ایم، اے

بہاری اور مومن کا تغزل

خوشبو آئے مجھ کو صبا کب گلوں کی باغ میں بو　　لبسی ہوئی ہے یہاں اور ہی دماغ میں بو (مومن)

سنسکرت اور ہندی شاعری کو بلحاظ موضوعات و بیانات نو خانوں میں اُلٹ دیا گیا ہے۔ اور اس تقسیم کو رسوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اردو میں اس قسم کی موضوعاتی اور منطقی تقسیم نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہر جذبے کا کچھ نہ کچھ نام ضرور ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت پڑنے پر اسی نام سے ہی کام چلا لیا جاتا ہے۔ شاعری میں عشق و محبت کے مضامین ہر زبان میں بیان ہوئے ہیں اور ہوتے رہے ہیں بلکہ ہر زبان کی شاعری کا نسبتاً بڑا حصہ، عشق و محبت کے مضامین پر ہی مبنی ہے اُردو میں اس جذبے کو عشق یا محبت اس قسم کے شاعرانہ خیالات کو تغزل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندی میں اس جذبہ کو پریم اس شاعری کو شرنگار کی شاعری اور اس کے پڑھنے سننے سے پیدا ہونے والی کیفیت اور حاصل ہونے والے حظ کو شرنگار رس کہا جاتا ہے۔ ہندی اور سنسکرت میں شرنگار رس کو رس راج کہا گیا ہے اور بالکل درست ہی کہا گیا ہے۔ فطرت کی جانب سے بنی نوع انسان کے دل کو محبت کا جذبہ اس طرح ودیعت ہوا ہے کہ وہ اس کے وجود میں خمیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے دیگر زبانوں کے ادب میں بھی اس کی اہمیت کم نہیں ہے۔ انگریزی شاعر بیلی (Baily) نے محبت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ poets are all who love, who feel great Truths And tell them and the truth of truths is love

یہاں یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ ہر قسم کی محبت میں کہے گئے اشعار کو تغزل یا شرنگار نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس میں محبت کو صرف وہی قسم شامل ہے جس میں اکثر محبوب یا محبوبہ کے حسن سے متاثر ہو کر اس کی چاہت کی جاتی ہے

اور اس چاہت میں اکثر جنسی اور شہوانی جذبات کی تسکین کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ۔ بزرگان دین ـــــ اساتذہ۔ بھائی بہن۔ والدین یا اولاد کی محبت کے اظہار و بیان کو اس کیفیت (شرنگار یا تغزل) سے کوئی علاقہ نہیں۔

شاید دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسا شاعر نہ ہوا ہوگا جس نے زندگی میں کبھی محبت کے جذبات کو نظم نہ کیا ہو۔ شاعر تو پھر بھی ایک حساس دل لیکر دنیا میں آتا ہے بڑے بڑے سخت اور سنگ دل، بے رحم، ظالم، جابر اور قاہر اشخاص کے دل بھی اس جذبے سے یکسر عاری نہیں تھے۔ انتہائی ضبط کے باوجود بھی وقت آنے پر اُن کے دلوں سے محبت کا جذبہ اس طرح ابل پڑا ہے جس طرح سنگلاخ چٹانوں نے درمیان سے صاف و شفاف پانی کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔

بہادری بڑے شاعر تھے قادالکلام اور تجربہ کار تھے دربار سے وابستہ تھے۔ وہ اُس عہد کے ممتاز شاعر تھے، جس میں شرنگار تھے جس میں شرنگار اس کی شاعری کا بول بالا تھا۔ اور دربار میں تو اس کے بغیر چارہ کار ہی نہ تھا اس لیے اُن کی ستسئی اس کی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔

مومن بھی بڑے شاعر تھے۔ مگر اُن کے اور بہاری کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے پھر بھی اُن کی طبیعت ایسے وقت میں بھی تغزل اور صرف تغزل کی طرف ہی مائل رہی جب کہ اساتذہ غزل، غزل کے اصل اور بجنل مضامین سے انحراف کرکے فلسفہ و تصوف اور دیگر مضامین غزل میں شامل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایسے وقت میں مومن کا اپنے ماحول اور ہمعصر شعراء کے انداز غزلگوئی سے متاثر نہ ہونا کسی خارجی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ یہ اُن کی طبیعت کا اقتضا تھا بلکہ یہ انکی طبیعت میں تغزل اس طرح رچا بسا ہوا تھا کہ وہ ہر کیفیت پر غالب آجاتا تھا۔ مومن کچھ بھی نظم کرتے اسمیں بہرحال شان تغزل ہی جلوہ نما ہو جاتی اس لیے اُن کا دیوان تغزل کا بہترین نمونہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی تخلیق سے فطرت کا منشاء اردو غزل گوئی اور تغزل کا فروغ تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ امر بھی عجیب تر ہے کہ مومن کی محبت جس قدر فطری ہے اُن کے جذبات اُس حد تک غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ اور ایسا ہی کہیں کہیں بہاری کی شاعری پر بھی محسوس ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں شاعروں میں یہ اثر اُس مبالغہ آمیزی کا نتیجہ رہا ہو جو کبھی کبھی فارسی شاعری میں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ دنیا کا ہر شاعر کسی نہ کسی وقت محبت کے راگ ضرور الاپتا ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کی شاعری میں جذبات عشق نے ضرورت سے زیادہ مقام حاصل کیا ہے۔ اس لئے تغزل کو لیکر ان دونوں استادوں کی شاعری کا موازنہ نامناسب نہیں کہا سکتا۔

اس موازنے میں اتنا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ موضوعات و بیانات کی یکساں دونوں میں محض اتفاقی ہے وہ اس لیے کہ یکسانیت ہوتے ہوئے بھی دونوں کی شاعری کے داخلی اور خارجی محرکات میں اُسی حد تک بعد اور اختلاف ہے جس حد تک ان کے موضوعات و بیانات میں یکسانیت ہے ایک کی طبیعت میں درباداری اور مصاحبت گھر کئے ہوئے تھی تو دوسرے کو خوشامد سے نفرت اور گریز تھی۔

دونوں کے زمانے مختلف، سیاسی، معاشی، اقتصادی اور سماجی ماحول الگ الگ، انداز فکر متضاد۔ اصناف سخن اور میدان شاعری میں دونوں ایک دوسرے سے غیر متعلق۔ مگر ان سب کے باوجود موضوعاتی اور بیانی یکسانیت کا یہ عالم گویا دونوں ایک ہی فضا کے پروردہ تھے۔ اور دونوں کے داخلی اور خارجی محرکات یکساں تھے۔ یہ بات شاید اور بھی زیادہ عجیب ہے۔

بہاری اور مومن کے تقابلی مطالعے میں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ مضامین کی یکسانیت کا یہ مطلب سمجھنا قطعئی غلط ہوگا کہ دونوں کے یہاں بالکل ایک ہی قسم کے مضامین ایک ہی انداز سے بیان کئے گئے ہوں گے محرکات کے اختلاف کی وجہ سے یکسانیت کا یہ مطلب سمجھنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ دونوں کے بعینہ مضامین میں ہر جگہ سرقہ جیسی یا بھر پور توارد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہوگی۔ محرکات کے اختلاف کیوجہ سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ بہاری نے جس چیز کو کئی دوہوں میں تھوڑا تھوڑا کہا ہے تو اسکو مومن نے ایک شعر میں ادا کر دیا ہے یا مومن نے جس کو کئی شعروں میں بیان کیا ہے۔ بہاری نے اس کو ایک ہی دوہے یا سورٹھے میں بخوبی ادا کر گئے ہیں۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ دونوں میں سے ایک نے جو کچھ کہا اس کا ایک جز دوسرے نے بیان کر دیا اور باقی کہیں بیان نہیں ہوا۔ مومن بہاری سے بہت بعد کے شاعر تھے اور ایسا سمجھنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ یا سند نہیں کہ ان کی ستسی مومن کے سامنے رہی ہے یا اُن کی نظر سے گذری ہے۔ بلکہ اغلب یہ ہے کہ مومن بہاری کی زبان سے ہی قطعی طور پر نابلد تھے۔ پھر بھی ایسا متعدد مقامات پر ہوا ہے کہ دونوں کی افکار بہت قریب سے گذر گئی ہے حتیٰ کہ کہیں کہیں بھر پور توارد کی کیفیت بھی پیدا ہوگئی ہے۔

سنسکرت کے ماہرین نے شرنگار اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اول سنجوگ اور دوسرے ویوگ یا ویر سنبھ ([illegible]) ان ہم علی الترتیب وصلی اور ہجر کہہ سکتے ہیں سنجوگ شرنگار میں اتنا اور اضافہ ہے کہ اُس میں محبوب کے حسن اُس کی اداؤں اور حرکات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ بہاری نے دونوں موضوعات کو لیکر سیر حاصل داد سخن دی ہے۔ جب کہ مومن کا زور طبیعت زیادہ تر اور تمام تر مضامین ہجر کے بیان پر صرف ہوا ہے۔ جس کو ہندی والے سنجوگ شرنگار کہتے ہیں وہ مومن کے یہاں خالی خالی ہی نظر آتا ہے۔ مومن کی شاعری میں وصل محبوب کا بیان بہت ہی کم ہوا ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ میر کا سوز و درد اپنی جگہ پر مُسلم لیکن اردو کی غزلیہ شاعری کے دفتر کے دفتر اور دیوان کے دیوان کھنگال ڈالیے مومن جیسا محروم شاعر دوسرا مشکل ہی ملے گا اُن کی ساری شاعری میں وصل محبوب سے محرومی اور رقیب روسیاہ کی کامیابی کا ہی گلہ ہے۔

آیئے اب نفس مضمون کی طرف متوجہ ہو جائیں دونوں کے فن پارے پیش کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ بہاری کے دوہوں یا سورٹھوں کے مطالب پر ہی اکتفا کیا جائے۔ اور مومن کے اشعار جوں کے توں نقل کر دیے جائیں واضح رہے کہ مومن کے صرف وہی اشعار پیش کیے جائیں گے جن کا بہاری سے تقابل میں پیش کرنا ضروری ہے ورنہ اُنکا سارا دیوان ہی تغزل میں مستقل اضافہ ہے پہلے وصل محبوب حسن محبوب، محبوب کی اداؤں اور اُس کے ناز حسن سے

ملو مضامین کو پیش کیا جاتا ہے —

محبوب کے جسم میں سب سے زیادہ حسین اُس کا چہرہ سمجھا جاتا ہے اور جسم کی آدھی سے زیادہ خوب صورتی چہرہ پر ہی منحصر ہے اگر چہرہ خوبصورت نہ ہو تو جسم کا سڈول اور خوش رنگ ہونا کسی کو حسین نہیں بنا سکتا۔ اور جس طرح جسم کی خوبصورتی کا دار و مدار چہرے پر ہے اسی طرح چہرے کی خوبصورتی کا انحصار اگر دوسری چیزیں درست ہوں تو بہت کچھ آنکھوں پر ہے۔ شاعر کا عشق زیادہ تر آنکھ دیکھ کر ہی شروع ہوتا ہے اور آنکھوں کی یاد ہی اُن کو زیادہ تر بےچین رکھتی ہے۔ بہاری آنکھوں کی خوبصورتی کو بڑے اچھے ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں۔

ترجمہ ۱ شرنگار رس سے دھلی ہوئی اُس کی آنکھیں کمل کے پھولوں کو شرمندہ کرنیوالی ہیں۔ اور بغیر کاجل کے ہی وہ آنکھیں کھنجن پرندوں (مولوں) کو بھی خجل کرتی ہیں

ترجمہ ۲ اے خدا! یہ آنکھیں تو ہرن کی آنکھوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں انھوں نے * پِدّ کے تیروں کو بردر فتح کر لیا ہے

ترجمہ ۳ اے رفیقہ! شکاری سنا کیو بڈ تیری جنگل میں گھومنے والی (یا گوش رسا) ہرن سا آنکھوں کو اچھی طرح شہر کے لوگوں کا شکار کرنا سکھا دیا ہے۔

ترجمہ ۴ اب تیری آنکھیں جوگی سنا کیو بڈ سے جوگ کے تمام طریقے (یا محبوب سے ملنے کی تدبیریں) سیکھ کر وصال محبوب کی خواہش کے زیر اثر گوش رسا (یا صحرا نورد) ہو گئی ہیں۔ عصاء

محبوب کی آنکھوں اور اُن سے پیدا ہونے والے اثر کو مومن کی زبان سے سنئے:-

اگر گردش یہی ہے مغبچوں کی چشم میگوں کی
کف ساقی میں جام بادہ گلگوں نہ ٹھہرے گا

ناوکِ انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بیجان ہوں گے

وہ ہے گرم نظارہ کہاں تک زخم دل ٹانکوں
کہ ہے ہر نگہ کے ساتھ اک برچھی سی آلگتی

میں مر گیا وہ چشم یاد آئی اور یار
حیران ہیں کہ مے تھی پیالے میں سم نہ تھا

زہر ٹپکے ہے نگاہ یار سے
موت سوجھی نرگس بیمار سے

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں!

وحشت، چشم پری رو دیکھنا
پھر گیا جی سرمۂ تسخیر سے

زلف کے مضمون کو دونوں نے اس طرح باندھا ہے پہلے بہاری کے دوہوں کے مطالب بعد میں مومن کے اشعار

ترجمہ ۱ رخ پر خمیدہ زلف لٹک جانے سے چہرے کی ظلمت اتنی بڑھ گئی ہے جیسے خم لگا دینے سے ہندسہ روپیہ بن جاتا ہے

واضح ہو کہ ہندی رقوم میں روپیہ کی علامت ٹیڑھی لکیر [ر] ہے جس کو بکاری کہتے ہیں۔

---

* بعد کے دو دو ہوں میں کچھ ایسے لفظ آئے ہیں جن سے قطعی غیر متعلق دو دو مطالب کا اظہار ہوتا ہے ایسے مطالب میں سے ایک کو قوسین میں لے لیا گیا ہے اس فن میں مومن بھی مہارت نامہ رکھتے ہیں۔ اسکا بیان انشاء اللہ زبان کا موازنہ کرتے وقت آئے گا۔ (ص۔ س)

۲۔ محبوبہ کی بکھری ہوئی زلفیں اس کی پیشانی کے سرخ ٹیکے کو چھپاتے وقت ایسا حسن پیدا کر رہی ہیں گویا راس (برج) نے کمال دلبری کے ساتھ قمر (رخ) کو مع شمس (سرخ ٹیکا) کے نگل لیا ہو۔

آتا ہے خواب میں بھی تری زلف کا خیال
بے طور گھر گئے ہیں پریشانیوں میں ہم

زلفیں اٹھاؤ رخ سے کہ دل کی جلن مٹے
بجھ جاتے ہیں جہاں کے وقت سحر چراغ

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

میں تو اس زلف کی بو پر غش ہوں
چارہ گر مشک سنگھاتے ہیں مجھے

کسی کے زلف پیچیدہ کے کیا سودے میں لکھتے ہیں
کیا کرتے ہیں کیا کیا پیچ کی تقریر اثر ہم

کیا بلا اس زلف خوشبو کا تصور بندھ گیا
سانپ سے ہر سمت آتے ہی نظر ہر سو ہمیں

دریا میں محبوب کے غسل کا بیان اس طرح ہوا ہے ۔

پانی سے کھیلتی ہوئی مضطرب محبوبہ جس جگہ غوطہ لگاتی ہے اس جگہ دریا کا پانی زعفران ہو جاتا ہے (بہاری)

ڈوب مریے کیوں نہ غیرت سے کہ جب مومن نہائے
غیر کے ہمراہ وہ طفل برہمن آب میں (مومن)

دونوں نمونوں میں تخیل کا فرق اس لیے ہے کہ بہاری نے محبوبہ کا حال سنجوگ کی حالت میں لکھا ہے اور مومن ہجر میں تڑپتے ہوئے شعر کہہ رہے ہیں۔ گر ان کا محبوب بھی رقیب کے بجائے ان کے ساتھ ہی غسل میں شریک ہوتو بہت ممکن تھا کہ ان کو بھی دریا کا پانی زعفران زار ہی نظر آتا ہے دونوں کے محبوب کے نظارے کا حال باندھا ہے۔

"وہ ماہ رو گھبرائی ہوئی سی چہرے کو گھونگھٹ (نقاب) سے ڈھک کر آگ کے شعلے کی مانند ایک جھلک دکھاتی ہوئی دریچے سے جھانک کر روپوش ہو گئی۔"

آن بیٹھا کون کوٹھے پر جو یوں حیراں سے
خاک چپکے پڑے تکتے ہیں سوئے بام ہم (مومن)

دونوں شعروں کے بیان میں محبوب کی ادا کا جو فرق نظر آتا ہے وہ ہندی اور اردو ادب کی روایتوں کی وجہ سے ہے چہرے اور آنکھوں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اک دوسری چیز جو عاشق کو سب سے زیادہ پسند ہوتی ہے وہ محبوب کا سراپا اور خوبصورت جسم ہے۔ جسم کی خوبصورتی میں اس کا دلکش رنگ، سڈول اعضا، قد موزوں حسن کی طلعت لباس اور زیورات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ حسین سراپا ہر شخص کو بھاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ غیر شاعر اس کا بیان شاعرانہ انداز میں نہیں کر سکتا۔ جبکہ شاعر اپنے شاعرانہ بیان سے اس میں ایک کشش اور حسن پیدا کر دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسے دلآویز بیان سے حسن مجسم کو سامع یا قاری کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے اسلئے نوک قلم کی تصویریں مو قلم کی تصویر دل سے بھی زیادہ حقیقی، سچی اور تابناک ہوتی ہیں۔ عاشق جتنا اپنے دل کا ماجرا بیان کرتا ہے اتنا ہی وہ محبوب کے سراپا کے بیان میں بھی دلچسپی لیتا ہے۔ بہاری اور مومن دونوں نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے دونوں استادوں کے زور طبع کو ملاحظہ فرمایئے۔ متعدد نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے بہاری کے محبوبہ کا سراپا ملاحظہ فرمایئے

۱۔ جوانی کے نکھار کے سبب محبوبہ کے اعضا زریں یا سیمیں کے پھولوں کے مثل جگمگا رہے ہیں۔ اس لیے اس کا سرخ دوپٹہ سنہری چمک پڑنے کی وجہ سے سرخ اور سنہری دو رنگ کی کرنوں سے مزین ہو گیا ہے۔

۲۔ سنہری رنگ کے جسم والی وہ محبوبہ سفید ساڑھی میں ایسی خوبصورت نظر آ رہی ہے کہ اس کے بے مثل حسن کے روبرو موسم سرما کے سفید بادل کی بجلی کی چمک بھی ماند ہے۔

۳۔ محبوب کے اعضاء میں زیورات کے نگینے چمکتے ہیں۔ چونکہ اس کا جسم ہی چراغ کی لو کی طرح ہے۔ اسلئے اگر اس کے گھر میں چراغ گل بھی کر دیا جائے تب بھی کافی روشنی رہتی ہے۔

۴۔ سنہری چمپلی کے جنگل میں چھپی ہوئی اس محبوبہ کو کون تلاش کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کے جسم کی فطری خوشبو اس کا سراغ نہ دیدے گویا اس کا رنگ سنہری چمپلی کے مثل اور خوشبو اس سے زیادہ دلکش ہے۔

۵۔ اس کے زریں رنگ والے جسم میں سونے کے زیورات دکھائی نہیں دیتے کیوں کہ دونوں کی چمک ایک جیسی ہے چھونے پر جب وہ ہاتھ کو سخت لگتے ہیں تب ہی ان کی پہچان ہوتی ہے۔

۶۔ اس سونے جیسے جسم والی محبوبہ کے رنگ میں زعفران کا رنگ غلط ہو گیا ہے، اس لیے اس کے جسم پر لگی زعفران کی پہچان اس کی خوشبو سے ہی ممکن ہے۔

۷۔ اے محبوبہ تو اس نازک جسم پر زیورات کا بوجھ کس طرح برداشت کر سکے گی۔ جب کہ بار حسن کے سبب ہی تیرے پیر زمین پر سیدھے نہیں پڑتے۔

۸۔ اس محبوبہ کے جسم میں چپکی ہوئی گلاب کی پنکھڑی رنگ نکہت اور لطافت میں سب طرح اس کے جسم سے اس طرح مطابق ہو گئی ہے کہ دکھائی تک نہیں دیتی۔

۹۔ تم اپنے وصل کو پوشیدہ رکھنے کے ارادے سے شب تار یک میں نیلے رنگ کا لباس پہن کر محبوب کے گھر کی طرف چلی ہو۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ چراغ لو کی طرح چمکتا ہوا جسم چھپانے سے کیسے چھپ سکتا ہے۔

۱۰۔ اسی ماہ رو محبوبہ کے گھر کے اردگرد اس کے چہرہ کی چمک دمک سے شب بہ اس طرح چاندنی پھیلی رہتی ہے کہ تاریخ معلوم کرنے کے لیے تقویم کا سہارا لینا پڑتا ہے (وہاں ہر شب شب ماہ ہوتی ہے)

۱۱۔ نظر بد سے حفاظت کا ٹیکہ لگائے ہوئے دیکھ کر شوہر نے اپنی بیوی سے کہا کہ اے ماہ رخ تو نے اپنے قمر جیسے رخ کو کالا ٹیکا لگا کر مکمل طور پر چاند کا ہم مثل بنا لیا ہے۔

ان گیارہ دوہوں کے مطالب کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بہاری نے محبوب کے حسن کو کس طرح مبالغہ کا رنگ دیکر اور بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے بہاری کو محبوبہ کا سراپا بیان کرنے میں کافی سے زیادہ دلچسپی ہے۔ مومن بھی اگرچہ مبالغہ میں کم نہیں لیکن ان کی طبیعت کو بہاری کے بیانات زیادہ مرعوب رہے پھر بھی چونکہ وہ غزل کے حقیقی شاعر تھے اس لیے یہ موضوع بھی ان کے قلم سے اچھوتا نہیں رہا ہے۔ بمونہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سہ تارے آنکھیں سی جھپک رہے تھے
تھا بام پر کون جلوہ گر رات

سہ نہ کیوں کر بس مر جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

سہ جو نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر

سہ نیند میں یارب دوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا
شب زمیں سے روشنی افلاق نور افشاں تلک

سہ کیوں غش ہوئے دیکھ آئینے کو
کہتے تھے کہ تاب لائیں گے ہم

سہ ہوش کیوں جاتے رہے اور دم ہوا کیوں ہو چلا
تجھ سے اے باد صبا آئی یہ کس کی بو ہمیں!

سہ اس لب نازک کو برگ گل سے دیتے ہیں مثال
ہونٹ برگ لالہ تھے اور نیل داغ لالہ تھا

سہ دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے
اے چرخ اپنے تو مہ کامل کو تھامنا

سہ ہٹ گیا ہوگا دوپٹہ منہ سے سوتے میں کہیں
شب یہاں رہنے کا تیرے سب میں چرچا ہو گیا

سہ اس مہروش کے جلوؤں کے قرباں کیوں نہ ہوں
پروانے کو بھی رات نہ آیا نظر چراغ

سہ شد دل کو ناز تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

سہ پری لوٹے ہے انگاروں پہ دوزخ میں پڑی حوریں
تمہارا حسن عالم سوز کس کس کو جلاتا ہے

غزل کی ایمائیت اس کی نسبت دو ہے کی تفصیل کے فرق کے پیش نظر مضامین میں قطعی طور پر تطبیق ناممکن تھی پھر بھی دوہا ۸ اور شعر ۸ کے مضامین کافی حد تک مطابق ہو گئے ہیں اسی طرح دوہا ۱۰ اور شعر ۱۰ و دوہا ۹ اور شعر ۹ کے مضامین کی ادائیگی میں بھی کافی حد تک مماثلت ہے محبوب کی مسکراہٹ دلفریب اور دل خوش کن بھی ہوتی ہے اور عاشق کے لیے تکلیف دہ بھی۔ اس مضمون کی ادا میں دونوں کا انداز دیکھیے۔

تم ذرا ہنستے رہنے کی عادت کو چھوڑ دو۔ اس کی وجہ سے تمہارا چہرہ مشکل سے نظر آتا ہے کیوں کہ تمہارے اگلے چاروں طرف کی چمک سے میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں

(بہاری)

سہ کس کے ہنسنے کا تصور ہے شب روز کہ کیوں
گدگدی دل میں کوئی آ کے پہر کرتا ہے

سہ رو رہا ہوں خندہ دنداں نما کی یاد میں
آب گوہر کے لیے آنکھوں سے دریا جاتے ہے

اس دہن کو غنچہ اے دل کیا کہوں
ڈر لگے ہے مسکرانا چھوڑ دے!

نہ کیوں کر بس مر جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

(مومن)

مومن کا محبوب پردہ نشین ہے بہاری کی ہیروئن بھی دیہاتی ہونے کے سبب روایتی پردے کی پابند ہے وہ ہیرو کی جانب گھونگھٹ کے اندر دیکھتی ہے۔ ہیرو کو اس کا چہرہ گھونگھٹ میں اور بھی دلکش معلوم ہوتا ہے۔

دونوں نے اس مضمون کو ادا کیا ہے

وہ ماہرو گھبرائی ہوئی سی چہرہ کو گھونگھٹ سے
چھپائے ہوئے آگ کے شعلے کی مانند ایک جھلک دکھاتی
ہوئی دریچے سے جھانکتی ہوئی گزر گئی۔

(بہاری)

مومن کہتے ہیں :-

؎ پردہ کی کچھ حد بھی ہے پردہ نشیں
کھل کے مل لیں مسکرانا چھوڑ دے

مضموں قریب قریب مطابق ہو گیا۔ مومن کے پردہ نشین محبوب کے بابت کچھ دیگر اشعار بھی ہیں۔

؎ عشق پردہ نشین میں مرتے ہیں
زندگی پردہ ورنہ ہو جائے!

؎ آفت جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ میرے دل میں آ چھپا ہے عشق

محبت میں آنکھوں سے نیند کا اُجڑ جانا فطری ہے بہاری اپنے مخصوص انداز میں کہتے ہیں ۔

؎ اے محبوب بتاؤ تو سہی کہ تمہارے حسن
کا یہ کون سا انداز ہے کہ جس سے لمحہ بھر
کے لیے بھی کسی کی آنکھیں لگ جاتی ہیں پھر
اُن آنکھوں کی لمحہ بھر کے لیے بھی پلک نہیں
لگتی۔ یعنی نیند نہیں آتی۔

مومن کہتے ہیں :-

؎ تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب
وہ آئے تب بھی نیند نہ آئی تمام شب

؎ آنکھ نہ لگنے سے تمام شب احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

پہلے شعر میں نازک خیالی کی حد ہے کہ "شب وصل میں شام سے ہی سو جانیوالے" شاعر کی آنکھیں اس وجہ سے نیند سے محروم ہیں کہ شب کے خاتمہ پر پھر جدائی سے واسطہ پڑیگا۔ "وہ آئے" اور "نیند نہ آئی" میں جو لطف ہے اس سے اہل ذوق ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دوسرے شعر کا مضمون بہاری کے مضمون سے قطعی طور پر مطابق ہو گیا ہے

معاملہ بندی عاشقانہ شاعری کا خاص جزو ہے اس میدان میں بہاری کے جوہر خوب کھل کر سامنے آئے ہیں۔ بظاہر مومن سے اس کی توقع نہیں کی جانی چاہیے۔ کیونکہ اُن کی شاعری محرومیوں کا مجموعہ ہے۔ معاملہ بندی کے اصل جوہر لکھنوی شاعری میں کھلتے ہیں جب کہ مومن دہلوی اساتذہ کی فہرست میں آتے ہیں۔ پھر بھی یہ انکشاف حیرت کا باعث ہوگا کہ وہ لکھنویت میں یعنی بعض جگہ بعض لکھنوی شعرا سے بھی بازی لے گئے ہیں انشاء اللہ اس پر مفصل بحث اس وقت ہوگی جب مومن اور بہاری کی زبانوں کا تقابل کیا جائیگا۔ یہاں پر صرف اسقدر کہنا ہے کہ اصل محبوب سے محروم ہوتے ہوئے بھی مومن نے معاملہ بندی کے بڑے بڑے اچھے شعر نکالے ہیں دونوں شاعروں کی معاملہ بندی کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے :-

حسب سابق پہلے بہاری کو ہی لیجیے۔ کہتے ہیں

؎ یہ ہیرو اور ہیروئن اہل خانے کے سامنے ہی بھرے ہوئے گھر میں آنکھوں کے اشارے سے ہی ساری باتیں کر لیتے ہیں۔ یہ کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی منع کہتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے

پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ تو کبھی غصہ کرتے ہیں کبھی صلح کر لیتے ہیں کبھی کھل جاتے ہیں (مسکرا پڑتے ہیں) اور کبھی شرما جاتے ہیں۔

۲۔ (ہیروئن ہیرو کے اصرار کو دیکھ کر آمادگی اور شرم کے ساتھ) اس کو آبرو سے خائف کرتی ہے اور منھ سے نہیں نہیں کہتی جاتی ہے لیکن (اندرونی تحریک اور برانگیختگی کے باعث) وہ آنکھوں سے (ہیرو کو) لپٹا لیتی ہے (یعنی خود سپردگی کے ساتھ منظوری دیدیتی ہے) پھر حقہ کا دھواں پوچھتی ہے اور اس کش مکش میں ہیرو کے آگے آجاتی ہے

۳۔ ہیرو کے عقب سے آکر آنکھیں بند کرنے اور ہیروئن کے اس کے ہاتھ کے لمس کی لذت پاکر اس کے پہچان لینے پر بھی وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتی رہتی ہے۔ (تاکہ وہ اس طرح ہاتھوں کے لمس سے محظوظ ہوتی رہے)

۴۔ ہیروئن چوٹی باندھتے ہوئے ہیرو سے کہتی ہے ٹھہرو تم چوٹی باندھ چلے۔ میں نے تمھارے چوٹی باندھنے کا طریقہ دیکھ لیا۔ میں نے جن زلفوں کو بڑی دشواری سے خشک کیا تھا اُن سے پھر پانی ٹپکنے لگا۔

بہاری کی معاملہ بندی مفصل ہے غزل کی ایمائیت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ پھر بھی مومن کے معاملہ بندی کے اشعار دیکھئے۔ غزل ۱۵۲ کے زیادہ تر اشعار معاملہ بندی ہی سے متعلق ہیں۔ چند نمونہ یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

؎ وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

؎ کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلہ ملامت اقربا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

اور

؎ غیروں سے اُس نے ہرگز چھوڑی نہ ہاتھا پائی
جب تک اجل کا صدمہ دو چار تک نہ پہونچا

معاملہ بندی کے جو اشعار بہاری کی بحث میں پیش کئے جا چکے ہیں وہ ان اشعار کے علاوہ ہیں۔

بہاری کے پہلے دوہے میں بڑی تفصیل ہے اور یہ بہاری کا کمال ہی کہا جائے گا کہ انھوں نے دو سطروں میں اتنے خیالات کو نظم کر دیا۔ مگر اس مضمون کو مومن نے بھی بیتیں لیا وہ اشعار میں سے شعر ۳ میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے نیز بہاری کا دوسرا دوہا اور مومن کا پانچواں شعر بھی مضمون کے لحاظ سے کافی حد تک مطابقت رکھتے ہیں

محبت میں رشک و رقابت کے جذبات سے محفوظ رہنا بھی ناگزیر ہے۔ یہ جذبات ہیں بھی محبت کی ہی شکل ہمہ گیر ہیں۔ مگر ناکام عاشقوں کو ہی ان سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے بہاری کے یہاں یہ چیز کم اور مومن کے یہاں بہت زیادہ ہے لیکن محبت کے مضامین اس سے یکسر عاری ہونے دشوار ہیں دونوں شعروں کے بیانات ملاحظہ فرمائیے پہلے بہاری

۱۔ اپنے محبوب کی انگوٹھی پہچان کر ہیروئن نے فریب کے ساتھ سہانی کے ہاتھ سے لے لی اور غصہ و اضطراب کی مسکراہٹ

کے ساتھ محبوب کو دکھائی۔

؎ ہیروئن ہیرو کو ڈانٹتی ہوئی کہتی ہے۔ تم آفتاب کے طلوع ہونے پر میرے پاس آئے ہو لیکن تمھاری آنکھیں غیر عورت کے ساتھ شب باشی میں جاگنے کی وجہ سے شام (کی شفق) کی طرح پھول رہی ہیں۔ اس لیے میرا حیران قلب جو اس سے بے بہرہ ہو کر چاروں طرف حیرت سے تک رہا ہے۔

در اصل بہاری اس میدان کے مرد نہیں ہیں یہ میدان تو مومن ہی کا ہے۔ دیکھیے کیا کیا شعر نکالے ہیں اور کیا کیا مضامین نظم کیے ہیں۔

؎ صبحدم مہتاب کا سا رنگ کیوں ہے گر نہ تھا
بوالہوس کے پاس تو اے ناز پرور رات کو

غور فرمایئے کہ بہاری کے دوسرے دوہے سے اس شعر کا مضمون کتنا ملتا جلتا ہے۔ یہاں آنکھیں سرخ ہونے کے بجائے چہرہ کا پیلا ہونا بیان کیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مومن خوبرویوں کی نفسیات سے بھی خاص واقفیت رکھتے تھے۔ کچھ اور شعر ہیں۔

؎ بے پردہ غیر سے نہ ہوا ہوگا شب کہ صبح
آنکھوں میں شرم تھی نہ نظر میں حجاب تھا

؎ وہ بدگماں ہوا جو کہیں شعر میں مرے
ذکر بتانِ خلخ و نوشاد آ گیا!

؎ غیر سے ہے وہ گرم صحبت مے
کیوں نہ غیرت کرے کباب ہمیں

؎ کہا ہے غیر سے تم نے مرا حال
کہے دیتی ہے بے باکی ادا کی

یہ چند شعر بطور نمونہ ہیں ورنہ دیوان مومن ایسے اشعار سے بھرا ہوا ہے۔

فراق کا ایک لمحہ بھی عاشق کے لیے بہت طویل ہوتا ہے شب ہجر طول میں قیامت سے کم نہیں ہوتی اس مضمون کو بہاری نے اس طرح ادا کیا ہے۔

"ہیروئن کی جان کا مالک یعنی اس کا محبوب دیوار پردہ داری میں ملنے والوں سے ملتا جلتا رہ گیا ہے۔ اور مجبور کر آنے میں جو اس ایک لمحہ کی دیر ہو گئی ہے وہ لمحہ ہیروئن کی برہما کے لمحے کی طرح بہت طویل محسوس ہو رہا ہے۔"

یہ دوہا اگرچہ وصال کا نہیں بلکہ ہجر کا ہے، لیکن مرتبین ستسئی نے اس کو وصال کے دوہوں میں ہی شامل کیا ہے۔ اس لیے ہم کو اس میں دخل دینا کچھ مناسب نہیں ہے۔ بہرکیف مومن کی نغمہ سرائی ملاحظہ ہو۔

؎ عشق میں بھی کبھی جا گئے نہیں تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

؎ عمر دراز کی ہے رقیبوں کی آرزو
دیکھو زمان ہجر کے اُمیدوار ہیں

میرا خیال ہے مومن سے شب ہجر کے طول کی ترجمانی کما حقہ نہیں ہو سکی۔ جب کہ بہاری نے صرف ایک لمحہ کی فرقت کو کافی اچھی طرح بیان کر دیا ہے۔

عاشق کو اگر وصال محبوب کی کچھ امید بندھ جاتی ہے معینہ وقت تک کے لیے اُس کے اضطراب و بےچینی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اُس پر بد حواسی جیسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ اُمید سگون اور فال کی بنا پر بھی قائم ہو جاتی ہے۔ بہاری نے اس کو ایک دوہے میں بیان کیا ہے اور مومن

نے اس مضمون کو دو شعروں میں کہہ دیا ہے ۔
"اُس غزال چشم ہیروئن نے اپنی آنکھوں کی پھڑک
دل کی امنگ اور جسم کے پھولنے سے محبوب کے آنے کی فال لے
لی ۔ اور اُس کی آمد کے بغیر ہی استقبال کے لیے جوش کے
ساتھ لباس بدلنا شروع کر دیا ۔"

(بہآری)

مومن کے دو شعر ہیں ۔

؎ اُف ری کثرتِ اشک و تبسم بل بے ہجوم یاس و اُمید
جی ہے دھڑکتا ملنے کی اُس کے حال تو ہم کھلواتے ہیں

؎ کس کی خبر اب آنے کی ہے کس لیے ہے یہ بے تابی
کس لئے ہیں ہم ہر دم بھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں

محبوبہ کی ابرو کی یاد میں بہآری کا دوہا ہے ۔

" ہیرو کہتا ہے کہ میرے چھیڑے جانے پر ہیروئن
نے ناک کو سکیڑ کر اور آنکھوں کو نچا کر چچا کی قسم کھاتے
ہوئے ابرو کا جو کٹیلا اشارہ میری طرف کیا ہے وہ اب بھی
رہ رہ کر میرے دل میں ٹیسیں پیدا کر رہا ہے ۔"

مومن کہتے ہیں ۔

؎ تیری ابرو کی یاد میں ہم نے
ناخنِ غم سے دل نگاری کی

قاعدہ ہے کہ عاشق محبوب کو ہر وقت پیش نظر رکھنا
چاہتا ہے غیبت میں اُس کی نظریں ہر وقت محبوب کو ہی
تلاش کرتی ہیں ۔ اگر وہ سامنے ہے تو جس سمت کو وہ جاتا ہے
عاشق کی نظریں بھی اُسی طرف کو اُس کے ساتھ ساتھ گھومتی
رہتی ہیں ۔ بہآری کہتے ہیں ۔

"جنگل کی سمت جاتے ہوئے وہ گوالا بہت ہی حسین
لگتا ہے ۔ وہ مسکراہٹ کے ساتھ اس طرف سے گزرتے ہوئے
ترچھی نظر کا ساتھ لگا کر میری مولے نما آنکھوں کو اپنے ساتھ
چپکا کر لے جاتا ہے ۔

"اے ہیروئن تیری آنکھیں میدان جنگ میں مرد شجاع
کی طرح ڈٹ جاتی ہیں ۔ اُنھیں وہاں جانے سے کوئی روک نہیں
سکتا ۔ تیری آنکھیں لاکھوں مردوں کے ہجوم میں بھی اپنے محبوب
تک پہونچ جاتی ہیں

مومن کے شعر ہیں ۔

؎ پھر گئی آنکھ مثل قبلہ نما
جس طرف اُس صنم نے پھیرا منہ

؎ میرا قلق بھی قبلہ نما سے نہیں ہے کم
باور نہیں تجھے تو ذرا منھ کو موڑ دیکھ

ماننا پڑے گا کہ اس مضمون کو مومن نے بہآری سے
بہتر طور پر نظم کیا ہے

محبوب کی تابش حسن کی وجہ سے اُس کی تصویر کشی
محال ہے اُس کو بہآری نے یوں ادا کیا ہے

"دنیا کے بڑے بڑے ہوشیار مصور فخر اور غرور کے
ساتھ اُس کی تصویر بنانے کو بیٹھے ۔ مگر سب ناکام ہوگئے

مومن کہتے ہیں ؛

؎ میں نہ کہتا تھا مصور کہ وہ ہے شعلہ عذار
دیکھ تو صفحہ قرطاس پہ تصویر نہ کھینچ

کیوں نہ کھینچ ؟ اور کھینچنے کی کوشش کا کیا نتیجہ برآمد ہوا ؟ یہ
نامعلوم ہے اور یہی چیز شعر میں لطف پیدا کر رہی ہے ۔

یہاں تک تو دونوں شاعروں کے کلام کے وہ چیدہ چیدہ
نمونے تھے جن میں وصل محبوب اور اُس کی متعلقات کا بیان ہوا

اس موضوع کے بیان میں بہاری کی دلچسپی تو مومن کے مقابلے
میں زیادہ گہری رہی تھی۔ اب ہجر معشوق کے موضوع پر لکھے
گئے اشعار اور دوہوں کا بلحاظ مضمون تقابل پیش کیا جاتا
ہے۔ اس میں بہاری مومن سے پیچھے ہیں۔ مومن کا سارا دیوان
غزلیات ہی شب فراق کا شب نامچہ (ڈائری) ہے لیکن
چونکہ ایک دوسرے شاعر سے موازنہ مقصود ہے۔ اس لیے
مومن کے صرف اتنے ہی شعر اخذ کئے جائیں گے جو بہاری
کے دوہوں کے ہم مضمون ہوں۔ اور اس میں بھی دونوں شعرا
کا انتخاب کلام ہی شامل کیا جائے گا۔ اب تک جو کچھ بھی بیان
ہوا اور جو کچھ اب بیان ہوتا ہے اُس میں انتخاب کلام کو ہی
شامل کرنا اور کنایتاً اُس کا اظہار کر دینا اس واسطے اور
ضروری ہے کہ اگر انتخاب کلام اور چیدہ چیدہ اشعار دوہوں
کو ہی اخذ نہ کیا جائے تو اس موضوع کو ہی لے کر جس پر ہم
دونوں شاعروں کا تقابلی مطالعہ پیش کر رہے ہیں مومن کا
نصف دیوان اور ستسئی کا تقریباً چھٹا حصہ شامل موازنہ
ہو جائے گا۔ دیگر موضوعات پر مباحث الگ رہے۔ اس
لئے یہ بحث لاطائل ہی نہیں بلکہ راقم کی علمی بے مائیگی اور
بے بضاعتی کے سبب تکلیف مالایطاق بھی ہوگی۔

ہجر عشق کی ناکامی ہے اس کا لازمی نتیجہ گریہ ہے
شب فرقت کی روح فرسا گھڑیاں عاشق کبھی انتظار میں تارے
گن کر اور کبھی ناامیدی میں کروٹیں بدل بدل کر گذارتا ہے
جب ناکامی کا احساس اُس کو بے چین کرتا ہے اور اُس
کی ساری اُمید ختم ہو جاتی ہیں تو اس کے پاس (اگر عقل
سلامت ہے تو) رونے کے سوا کوئی مشغلہ نہیں رہتا۔
قلب یا جسم کو اذیت ہو تو آنکھوں میں آنسو آ جانا کوئی تعجب
کی بات نہیں۔ لیکن شعرا نے اس انسانی نفسیات سے وہ
فائدہ اٹھایا ہے کہ الاماں والحفیظ۔ آنکھ سے نکلنے والے
اشکوں کے معمولی اور حقیر قطروں کے سامنے سیلابوں اور
طوفانوں کی کوئی حقیقت نہ رہی۔ ندیوں، نالوں، تالابوں
اور سمندروں کو اشکوں کا بہاؤ اور طغیانی دیکھ کر خجل ہونا
پڑا۔ سیل اشک نے بستیاں اجاڑ دیں۔ شہر ویران کر دیئے
سیکڑوں خانماں تباہ و برباد ہو گئے۔ مگر شاعر نما عاشق
کی آنکھ تھی یا کوئی ایسا ڈیم تھا جس کے سامنے روئے
زمین کے سارے سمندر ہیچ رہے، اُسی طرح نہریں بہاتی
رہی اور اُس کی طغیانی میں ذرہ برابر کمی نہ آئی۔ گویا

؎ نکالیں سیکڑوں نہریں کہ پانی کچھ تو کم ہوگا
مگر پھر بھی مرے دربار کی طغیانی نہیں جاتی

اردو غزل کو یہ ورثہ فارسی شاعری سے ملا۔ عہد مغلیہ
میں برج بھاشا وغیرہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور
کیونکہ رہتیں کہ جب دربار سے لیکر بازار تک فارسی کا سکہ
رائج تھا تو اُس کے ناز و انداز کس کو نہ بھاتے۔ بہاری بھی
ماحول کے اقتضا سے مجبور تھے۔ اُنھوں نے بھی اپنے سمند تخیل
کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ اور یہ توسن صبا رفتار برق رفتار
سے مبالغے کی منزلیں طے کرنے لگا۔ مبالغہ کوئی عیب نہیں
رہ گیا۔ بلکہ لوگ مبالغہ آمیز اشعار سن کر چونکنے کے بجائے
اُن سے محظوظ ہونے لگے۔ اشک گریہ کی طغیانی بہاری کے
الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

۱ے اے کرشن جی برج کی ہر گلی میں ہر گھر کے دروازے
پر گوپیوں کے اشکوں سے پُر اور کبھی خشک نہ ہونے والا
دریائے بیکراں بہہ رہا ہے۔

از ڈاکٹر انوارالحسن صدر شعبہ علوم مشرقیہ عربی و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

جامِ شعور — ایک تنقیدی جائزہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شعر و شاعری کا تعلق جتنا فکر و نظر سے ہے اس سے کہیں زیادہ قلب و جگر سے ہے کیوں کہ شاعری دراصل محسوسات کی تصویر کشی کا دوسرا نام ہے۔ جذبات کے تاثر اور قلبی واردات و کیفیات کا بیان شاعر سے بہتر کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اس کسوٹی پر پورا اترنے والا کلام ہی لافانی حیثیت کا حامل ہوتا ہے سید اطہر حسین صاحب اطہر کی شاعری کی عمر تو زیادہ نہیں لیکن اُس معیار پر پوری اترتی ہے۔ ان کی غزل کی حقیقت یہی ہے کہ وہ "قلب و جگر پر گزرے ہوئے حادثات کی آئینہ دار ہے" یہ "اس خیالات کا لوح و نغمہ ہے جو سکونِ قلب سے دور ہے" اور جیسے "ایک شکستہ ساز کی صدا" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ "وجہ انبساط" بھی ہے اور "سوگوارانہ جذبات" کی عکاسی بھی کرتی ہے گویا کہ "نیرنگ سوز و ساز" ہے۔ اطہر صاحب "سازِ دلِ شکستہ پر وجد آفریں نغمے" سناتے ہیں جس سے ان کے فن میں نکھار پیدا ہو رہا ہے" ان کی نگاہ کیف جنون کی محرم راز دار" ہے، اسی لیے وہ "جنون کی جامہ دری پر نظر ہیں ڈالتے"۔ "وہ چراغ لے کر روشنی کے لیے بھٹکتے ہوئے آدمی کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔ وہ جنونِ شوق، دلِ افسردہ اور دیدہ گریان کے "گرویدہ" نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک عاشقی کے لیے یہی اوصاف ضروری ہیں۔ وہ گیسوئے لیلائے غم کی مشاطہ آرا ہی نہیں کرتے بلکہ زندگی کے فرائض کا بھی انھیں شدت سے احساس ہے وہ نشاط آگیں زندگی سے تسکین نہ پاتے ہوئے اور تلخی زمانے سے شادکام ہوتے ہوئے کبھی بہاروں کا استقبال کرتے اور اپنے افسردہ دل کو ہم آہنگ جشن گل بنانے پر تیار نظر آئے

یں کیوں کہ فرمانِ الٰہی "لاتقنطوا مِن رَّحمَۃِ اللّٰہ" ہمیشہ
ن کے پیشِ نظر رہتا ہے اُن کا چوٹ کھایا ہوا دل کسی طرح
بھی مایوس نہیں نظر آتا ؎

تصویر میں خزاں کی ہے رنگِ بہار بھی
دشت و جبل میں ملتے ہیں کچھ لالہ زار بھی
ظلمت کب تک رہے گی چھائی
پھوٹے گی کرن کبھی روشنی کی

اور جب اُن کی نگاہ اس آیتِ کریمہ پر پہونچتی ہے
اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فادعونی
استجب لکم، تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

صدا عرش سے آ رہی ہے یہ پیہم
کہ مانگے تو کوئی عطا بر ملا ہے

اُن کی اُمیدوں کا چراغ گل ہوگیا، دل پر اندھیرا چھا یا
ہوا ہے جینے کا حوصلہ باقی نہیں۔ سوچتے ہیں" کہ مر کے بھی
چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے" اپنی بے چارگی اور بے بسی
کا شدت سے احساس ہے لیکن مقامِ صبر و رضا تقاضا ہے
کہ چمن کے نگہباں سے چمن کی بربادی اور نشیمن کی تباہی کا
سبب بھی نہ پوچھا جائے۔ یہی نہیں بلکہ ایسے رقت انگیز
حالات میں وہ ایسے عالم میں پہنچ جاتے ہیں جہاں نہ کوئی
گلہ ہے نہ آہ و نالہ کا سوال۔ وہ زندگی کو قرضِ حسنہ
سمجھتے ہیں جس کی ادائیگی کا نام موت ہے ؎

زندگی ایک قرضِ حسنہ تھی
جس کو جا کر اتارنا ہے اب

اور کبھی وہ زندگی کو "زنداں" کے نام سے یاد کرتے ہوئے
موت کو اس زنداں کا ایک روشن باب قرار دیتے ہیں ؎

زندگی کہتے ہیں جس کو نام اک زندان کا ہے
موت اس زنداں کا ٹھہرا ایک روشن باب ہے

موت کے سنگین ہاتھوں نے اِن کی خوشی کو چھین لیا۔ اب
انھیں ڈر ہے کہ خوشی کی طرح کہیں دولتِ غم بھی ناپائیدار نہ
ثابت ہو ؎

تجھے غرور ہے کیوں اتنا دولتِ غم پر
خوشی کی طرح کچھ اس کا بھی اعتبار نہیں

وہ زندگی کے حادثات کو سراسر آزمائش تصور کرتے
ہیں ؎

سراسر زندگی ہے آزمائش
نہ ہمیں یہ حادثے بتلائے گئے ہیں
حقیقت ازلی ہے یہ رازداں کے لیے
ترا وجود ہے دنیا میں امتحاں کے لیے

اُن کا مطالعہ وسیع ہے وہ صرف سائنس اور ریاضی
ہی کے طالب علم نہیں بلکہ اُنھوں نے اسلامی علوم و فلسفہ
اور تاریخ کا بھی غائر مطالعہ کیا ہے جس نے اُن کی نگاہ میں
بصیرت اور دل میں حقیقت شناسی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے
ان کے پیشِ نظر اس ذاتِ گرامی کا اُسوۂ حسنہ ہے جسے دنیا
"خیر البشر" کے نام سے یاد کرتی ہے، اسی لیے ان کے اخلاقی
تصورات پر اسلامی تعلیمات کی چھاپ ہے۔ وہ مریضِ ذہن
کے آدمی نہیں نظر آتے بلکہ ان کی فکر و نظر صالح تصورات
کی حامل ہے۔ ان کا کلام اگرچہ غزل کی روایتی علامات
رکھتا ہے لیکن اُن کے پاکیزہ خیالات اس بات کی غمازی
کرتے ہیں کہ وہ محمد الرسول اللہ صلعم کے مقدس مشن کے سچے
نقیب و ترجمان ہیں۔ وہ تصوف کے دلدادہ ہیں لیکن صوفیا

کی بے علمی سے دور، اُن کے عشق پر تہذیب اور شائستگی کی قدریں نمایاں ہیں۔ ان کے ماورائی تصورات اور مفکرانہ خیالات ان کی علمی گہرائی اور گیرائی کی نشاندہی کرتی ہیں، "جام شعور" کا مطالعہ کرنے والے حضرات بیش نظر اشعار سے یقیناً محفوظ ہوں گے جن میں اطہر صاحب کی نگارشات کا رنگ جھلک رہا ہے ؎

نا داری و مجبوری، لاچاری و حق تلفی
سوچے نہ مداوا کچھ ان کا تو لیڈر کیا ہے

تیرے لب پہ کیسی ہے یہ فغاں، تجھے کیا ہوا ہو بدگماں
تیری بہتری کا سبب اسی میں ہے کہ سمجھ لے اپنا قصور ہے

وجود بحر ہے طوفاں پہ قائم   جمود زندگی خاموش ساحل

کر اپنے تخیل کی حدوں سے کبھی پرواز
کچھ بھی نہ رہے تجھ کو مشیت کے سوا یاد

اپنے دکھ درد کا احساس نہیں ہے کوئی
خیر سے اے غم دوراں ہو تری عمر دراز

جس راہ طریقت کی منزل کانٹوں سے گزر کر ہوتی ہے
اس راہ کا ہر رہرو اک دن خود راہ نما ہو جائے گا

راہ نما کا شکوہ کیا   ہم نے خود ہی راہ نہ پائی

قدم قدم پہ ایک تحیر   منزل منزل آبلہ پائی

بستر گل پہ آج ہیں بے خواب
کبھی کانٹوں پہ نیند آئی ہے

جلوؤں کا اژدھام ہی بین ثبوت ہے
صانع ضرور ہے کوئی نقش و نگار کا

جب یاد آپ کے رخ رنگیں کی آ گئی
پہروں گلوں کی جلوہ گری دیکھتے رہے

دل ہو شاداں تو ہر اک گل سے جھلکتی ہے بہار
باغ تو باغ ہے بازار بھی نکھر جاتا ہے

کس کے روکے رکی گردش دوراں غافل
وقت کا کام گزرنا ہے گزر جاتا ہے

میں نے غم زمانہ کو اپنا بنا لیا نہ
رکھیں گے یاد مدتوں اہل نظر مجھے

عطا ہوئی ہیں جو قدرت کی بخششیں بھی ملیں
نہ کوئی بات ہوئی اس کا حق ادا نہ کرے

زمانہ اچھی روش پر چلا کرے اطہر
ترا چلن ہو کسی کو بھی تو خفا نہ کرے

سن لے کوئی اگر صدائے ضمیر
لرز اُٹھے گناہ سے پہلے

بشر ہے آج زمانے میں مصلحت کا غلام
رخیر و شر میں رہا کوئی امتیاز کہاں

مجھے ڈر ہے نہ ہو تہذیب نو موجب ہلاکت کی
کوئی بنیاد سطح آب پر قائم نہیں ہوتی

ہے جنوں میں اب کہاں احساس صبح و شام کا
راستہ روکے کھڑا ہوں گردش ایّام کا

کسی کی بھی ہو حق تلفی فساد آدمیت ہے
گل پژمردہ پھیکا رنگ کرتا ہے گلستاں کا

ایمان و وفا حمیت و درد
پہچان یہی ہے آدمی کی

غم نے جو بڑھا دیا ہے معیار
قیمت ہی نہ رہ گئی خوشی کی

ابن آدم میں اصولوں کا فقدان کیا
نہیں یک رنگی جو ممکن تو رواداری دے

پیغام دل افروز کھلایا ہے جو تو نے
اخلاق کی پستی ہے نہ غیرت نہ حیا ہے

" افسردہ دل افسردہ کنند انجمنے را " کے بمصداق ان کے بعض اشعار جواں کے ذاتی غم کے ترجمان ہیں۔ دوسروں کے لیے بھی اشک افشانی سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ چند نمونے پیش خدمت ہیں ؎

چلے گئے وہ مری عرض غم سنے ہی بغیر
زمیں کی بات تھی کیا اہل آسماں سنتے۔

جانتا ہوں نہ آئیں گے پھر بھی
خلش انتظار باقی ہے

کچھ سجانے کی اب بھی حسرت ہے
اس لیے زخم دل سنوارے ہیں

کیا بتاؤں مجھے کس بات نے رونے نہ دیا
رونا چاہا کبھی تو حالات نے رونے نہ دیا

کبھی اپنی نہ کچھ مری سنی جو تھی دل کی دل ہی میں رہ گئی
مرے سامنے ہی وہ سب کے لب بڑی خامشی سے ملے گئے

اے سوز جگر اے دیدۂ تر لے پھر وہ اندھیری رات آئی
جس رات نے لوٹا تھا گلشن یادوں کی لیے بارات آئی

" جام شعور " صوری اور معنوی دونوں اعتباروں سے ایک خوبصورت مجموعۂ کلام ہے کتابت و طباعت حسین و دیدہ زیب ہے۔

ترانۂ انسانیت

از

اثر بھارتی

(۱)

دشمن بھی ہو تو اُس سے عداوت روا نہیں
ہرگز کسی کے دل میں رقابت نہ ہو مکیں
جھگڑے سے ملال نہ ہو، دل میں جاگزیں
بس دوستی کا ہاتھ ہی آگے تو اب بڑھا
ہر فرد کو رموز، محبت کے تو سکھا

(۲)

ظلم و ستم کسی بھی بشر پر نہ توڑ تو
ٹوٹے دلوں کو پھر محبت سے جوڑ تو
رخ زندگی کا امن کی جانب ہی موڑ تو
انسانیت نواز کوئی تازہ گیت گا
غیروں کو جیت لے انھیں اپنا تو اب بنا

(۳)

انسانیت کا دھر میں اُونچا مقام ہے
انسانیت کا سوز تو سوزِ دوام ہے
انسانیت کا پی کے بشر شاد کام ہے
انساں ہے ایک عکس خدا کے ظہور کا
لازم ہے احترام اُس کے نور کا

(۴)

ممکن جو ہو تو چاکِ دلِ تار تار سی
دکھ درد میں شریک ہو، غم کی شراب پی
شہرت زمانے میں ہو تیرے نیک نام کی
بھائی سمجھ کے سب سے اخوت کو رکھ روا
نفرت نکال دل سے، محبت کو رکھ روا

(۵)

اعمال نیکو کار سے دھرتی سورگ کر
نفرت کا زہر پھینک، محبت کا جام بھر
بہبودِ خلق کے لیے، جی جان سے گزر
جنت نئی بنا، تو اب ایسی زمین پر
خم آستانِ حرم ہو تیری جبین پر

ابوالفاضل راز چاندپوری کے خطوط

واحد پریمی کے نام

(مکتوب ۱)

۲ دارالعلوم سول لائن علی گڈھ

19-9-66

کرم گستر!

یادآوری کا ممنون ہوں۔ تعمیلِ ارشاد کر رہا ہوں۔ اس مختصر کو حضرت شفائی[1] نظر سے گزار دیجئے۔ اگر وہ اور آپ دونوں پسند کریں، بہتر، ورنہ اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے جو اسی لے جانے والے دوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔　　والسلام

راز چاندپوری

(مکتوب ۲)

۲ دارالسلام سول لائن علیگڈھ

یکم اپریل ۶۷ء

کرم گستر

یہ دریدہ[2] ... بادورہ مشتہر

انیس ادب (دہلی) ملا۔ آپ کی غائبانہ توجہ کا شکریہ!

حسن و صحت[3] (کلکتہ) میں ایک تصویر دیکھی۔

---

[1] راز صاحب نے میرے پہلے مجموعۂ رباعیات "کل نو" میں شائع کرنے کے لیے تفصیلی رائے عنایت فرمائی تھی جو "کل نو" میں شامل ہے (واحد پریمی)

[2] ۶۳ء میں نے ماہنامہ "آذر" بھوپال کے لیے موصول شدہ راز صاحب کی تخلیقات میں سے ایک تخلیق "انیس ادب" کو بھیج دی تھی ماہنامہ انیس ادب دہلی سے محترم بھائی کبیر کو ثر صاحب نکالتے تھے۔ ماہنامہ "آذر" بھوپال سے حیدری ادارت میں شائع ہوتا تھا (واحد)

[3] یہ طبی رسالہ ماہنامہ "حسن و صحت" کلکتہ سے اب بھی نکلتا ہے اس کے سالگرہ نمبر میں میری تصویر شائع ہوئی تھی جس کے نیچے غلطی سے میرے نام کے بعد حکیم محمد احمد صدیقی بھی لکھ گیا تھا واحد پریمی

حکیم محمد احمد صدیقی
یہ آپ ہیں یا کوئی اور بزرگ؟ شفا صاحب سے ملاقات ہو تو سلام کہہ دیجیئے گا۔ اور "گلِ نو" کب تک اپنی بہار دکھائے گا؟

والسلام
نیاز کیش
راز چاندپوری

(مکتوب ۳)

۲ دارالسلام سول لائن علی گڑھ
۷ اپریل ۶۷ء

کرم گستر!
۴ اپریل کا عنایت نامہ ملا۔ شکایت نہیں، آپ کی غائبانہ نوازش کا شکرگزار ہوں۔ افسوس، میں شعرگوئی ترک کر چکا ہوں۔ کچھ عمر کا تقاضا ہے کچھ ماحول کا اثر۔ اب نوجوانوں اور جوانوں کا زمانہ ہے۔ آپ حکیم ہوتے تو میں آپ سے اعادۂ شباب کا نسخہ طلب کرتا۔

والسلام نیاز کیش
راز چاندپوری

خدا جانے یہ "پرمی" کیا ہے؟ اس کی جگہ "بھوپالی" یا جہاں کے آپ رہنے والوں ہوں وہ لکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ راز

مکتوب ۴
۱۴ جولائی ۱۹۶۷ء
علی گڑھ

کرم گستر!
آج "گلِ نو" ملا۔ شکریہ! دلی شکریہ۔ آپ کی توجہ فرمائی کا اور اس خاص عطیہ کا۔ خدا کرے ہر صاحب نظر و ذوق "گلِ نو" کو آنکھوں سے لگائے۔
شفا صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دیجیے گا۔

والسلام نیاز کیش
راز چاندپوری

(مکتوب ۵)
2-9-68

واحد صاحب!
آج "ہماری زبان" (علی گڑھ) میں برادرم حضرت شفا کے انتقال ہو جانے کی خبر پڑھ کر دم بخود رہ گیا پہلے سے بیماری وغیرہ کی کوئی اطلاع نہ تھی۔

---

۱ میں نے راز صاحب سے دیگر رسائل میں بھیجنے کے لیے کچھ تخلیقات طلب کی تھیں (واحد)

براہ کرم آپ مفصل حالات سے مطلع فرمائیے۔ والسلام۔ میں حمید میاں کو شفا میڈیکل ہال کے پتے پر بھی خط لکھ رہا ہوں۔ آپ بھی سب بچوں اور اُن کی ماؤں[2] سے میری طرف سے اظہارِ رنج و غم کر دیجئے گا۔

نیاز کیش

رازؔ چاندپوری

۲ے دار السلام سول لائن علی گڈھ

۲ے دار السلام سول لائنز علی گڈھ (مکتوب ۳)

13-8-69

کرم گستر حضرت واحد،

عنایت نامہ مورخہ ۹ اگست ملا۔ شکریہ! شفا صاحب کی بے وقت موت بہت جلد آزما ہے مگر مجبوری کا دوسرا نام ہے صبر و شکر۔

آپ کی ناسازیٔ طبع کا حال معلوم ہو کر افسوس ہوا۔ خدا آپ کو جلد صحت دے۔ صحتیاب ہونے پر اطلاع دیجئے گا۔

والسلام

نیاز کیش

رازؔ چاندپوری

دریاباد بارہ بنکی

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۷ء

بسم اللہ

حبیب من وعلیکم السلام

"صدق" میں تبصرے[3] درج نہیں چھپتے صرف مختصر دو سطریں تعارف "رسید کتب" کے زیرِ عنوان ہو سکتا ہے

والسلام

اڈیٹر صدق

---

[1] شفا صاحب کی دو بیویاں تھیں پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے دوسری بیوی خدا کے فضل سے بقیدِ حیات ہیں۔ (واحد)

[2] حمید میاں (حمید شفائی) شفا صاحب کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں (واحد)

[3] میں نے اپنا مجموعہ غزلیات "دھنک" تبصرے کے لیے بھیجا تو مولانا نے یہ خط تحریر فرمایا تھا۔ (واحد پریمی)

دریاباد بارہ بنکی

بسم اللہ

۹ر نومبر ۱۹۶۷ء

شفیقی وعلیکم السلام

آپ کے تقریظ نگاروں کی بہتات میرے بڑے کام آئی اس لیے کہ میرا بڑا وقت بچا لیا۔ اس جماعت میں سے میں نے گواہوں کے عدد شرعی کے مطابق میں نے شاہدین، عادلین، کاملین کو چن لیا ایک اپنے عزیز ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (لکھنؤ یونیورسٹی) اور دوسرے اپنے سابق مہربان جناب ماہر القادری (ایڈیٹر فاران) کو۔ اور ایمان بالغیب سے کام لیکر انھیں کی شہادت پر اپنی شہادت مرتب کیے دیتا ہوں۔

"گل نو" کی خوشبو تو سارے گلشن کو مہکا دینے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

والسلام　　دعاگو

عبدالماجد

صدق جدید دریاباد ضلع بارہ بنکی یو۔ پی

مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۶۸ء

مہربان بندہ۔ وعلیکم السلام

خدا معلوم میرے کس عزیز نے آپ کو یہ پیغام کس ذریعہ سے پہونچا دیا ہے۔ بہرحال انھوں نے آپکی خیرخواہی میں پہونچایا ہوگا اور آپ نے اس کو بھی وجہ خطابت بنا لیا۔[2]

صدق کی شاید آپ نے کبھی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اس لیے آپ کو یہ اندازہ بھی نہیں کہ وہ کس قلیل ضخامت کا ہے۔ "رسید کتب" کے تحت اس کی گنجائش کتنی محدود ہوتی ہے۔ اس کے مضامین کی عام نوعیت کیا ہے اور یہ پرچہ روزنامہ نہیں ہفتہ وار ہے آپ نے خطوط کی ڈاک بڑھا کر بیکار اپنا پیسہ ڈاکخانہ کی نظر کر دیا اور میرا بھی اتنا وقت لے لیا۔ کتابوں کا اتنا انبار رہتا ہے کہ مختصر دو سطری تذکرہ بھی تین ماہ سے قبل ممکن نہ ہوگا زیادہ جتنا بھی وقت لگ جائے۔ بعض کتابیں چھ چھ ماہ سے گنجائش کے انتظار میں پڑی ہوئی ہیں۔

والسلام

عبدالماجد

---

[1] میں نے مولانا سے گذارش کی کہ اگر آپ "صدق جدید" میں تبصرہ نہیں کرسکتے تو "گل نو" کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے الگ سے ہی عنایت کر دیں تو مولانا نے یہ خط تحریر کیا تھا۔ (واحد)

[2] لیکن میری تسکین مولانا کے اس دوسرے خط سے بھی نہیں ہوئی کیونکہ میں نے تو مولانا سے تفصیلی رائے چاہتا تھا اس لیے میں نے کچھ دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے مولانا کو لکھا کہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ "رسید کتب" کے عنوان سے بھی تفصیلی تبصرے کرتے ہیں اس لیے آپ میری کتاب پر بھی تفصیلی تبصرہ کر دیں تو مولانا نے ناراض ہو کر یہ خط لکھا تھا۔ لیکن مولانا کی اس ناراضگی میں بھی شفقت پنہاں تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا نے ۹ر فروری ۱۹۶۸ء کے "صدق جدید" میں ہی رسید کتب میں "گل نو" کا تذکرہ کر دیا تھا جو اس طرح تھا۔ ※

پیغام[1]

۱۷ جولائی ۱۹۶۸ء

بسم اللہ

جنوری ۱۹۵۸ء میں مدراس جانا ہوا۔ ایک بار رات کو لکھنؤ ٹرنک کال کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔ معزز میزبان ریڈیو گھر لے آئے کہ یہاں سے ٹیلیفون کرنے میں آسانی ہوگی۔ لائن ملنے میں ابھی دیر تھی خالی وقت میں ریڈیو سننے لگا کسی مقام سے مشاعرہ آرہا تھا۔ کلام کچھ یونہی سا تھا۔ دل نہ لگا لیکن تو بھی سے سنتا رہا۔ اتنے میں اعلان شفاؔ گوالیاری کے نام کا ہوا۔ پہلا ہی شعر جو آیا اُس نے چونکا دیا۔ سب کے رنگ سے الگ، نک سک سے درست، پرانے اور مسلم استادوں کے رنگ کا تھا۔ دوسرا شعر بھی اچھا رہا۔ اور تیسرا بھی۔ غرض جب تک ان کا کلام ہوتا رہا پوری توجہ و دلچسپی سے سنتا رہا اور دل میں کہا۔ ایک لوگ ان کا نام ترقی پسندوں کے ساتھ کیوں لیتے ہیں ان کا کلام تو اچھا خاصا صاف دنچتہ ہوتا ہے۔

شفاؔ مرحوم سے واقفیت بس اسی قدر تھی۔ اب ہر کس و ناکس شاعر ہے اور شعری مجموعے ہیں کہ لا انتہا نکلتے چلے آرہے ہیں۔ کوئی کہاں تک انھیں پڑھ سکتا ہے اور وہ بھی مجھ سا کم ظرف اور ضعیف البصر

شفاؔ مرحوم کا تجربہ گو مختصر رہا لیکن بڑا خوشگوار۔

والسلام

عبدالماجد

۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء

مکرم بندہ۔ وعلیکم السلام

خیریت نامہ ملا۔ میں خود بھی علیل ہوں اور بیماری لمبی ہے۔ بہرحال آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ خدا صحت و عافیت عطا فرمائے۔

والسلام

دعاگو و دعا خواہ

عبدالماجد

---

*۔ گل نو از واحد پریمی ۱۲۴ صفحے مجلد قیمت دو روپے پتا :۔ مکتبہ صبح ادب مسجد ٹولوالی بھوپال ۱
ایک نوعمر ہونہار شاعر کا مجموعہ غزلیات۔ کلام کے علاوہ تعارف، دعائیے، تقریظ تبصرے وغیرہ کے ذیل میں کو ۳۵۔ ۴۰ رائیں درج ہیں۔

[1] میں نے ۲۳ جولائی ۱۹۶۹ء کو استاذی حضرت شفاؔ گوالیاری مرحوم کی پہلی برسی منائی تھی۔ جس پر مولانا نے یہ پیغام عنایت فرمایا تھا۔ (واحد)

انسانِ جمہور

ایک منوّر شعری تخلیق

از اثر بھارتی

دلوں سے ہر برائی کو مٹا کر
مثالِ شمس، انسان کو بنائیں

رہے دل میں نہ اب گردِ کدورت
بہ کامل، بشر کو ہم بنائیں

عطا کر کے رجائی حسن و خوبی
اُمیدوں کا کوئی سورج اگائیں

دلوں کو دے کے استقلال و ہمت
بشر کے حوصلے پھر سے بڑھائیں

حباب آسا ابھر کر ہم بھنور سے
کنارے ڈوبتی کشتی لگائیں

کہیں بن کر چمن کے باغباں ہم
نئے پھل پھول اور بوٹے اگائیں

کہیں دریاؤں کے رُخ موڑ کر ہم
زمینوں کو تباہی سے بچائیں

کہیں ٹوٹے دلوں کو حوصلہ دیں
کہیں سوئی اُمیدوں کو جگائیں

وفا و مہر و شفقت کو جگا کر
دلِ آشفتہ کو تسکیں دلائیں

بھرے ہر اک بشر دم دوستی کا
محبّت کے سلوک ایسے سکھائیں

سمو کر سرمدی انوار یکسر
صفات نور کا انساں بنائیں

غرض، ہر چلتے پھرتے آدمی کو
منور، پاک انساں ہم بتائیں

نمائندے چنیں اور مشورے سے
نظامِ سلطنت اپنا چلائیں

قیامت تک جئیں ہر دم سدا خوش
سدا جمہوریت کے گیت گائیں!

انسان جمہور

اثر بھارتی

دنیا کو ظلمتوں سے اثر ! ہم کرینگے پاک
انسان کو منور و روشن بنائیں گے !

جذبات نفرتوں کے دلوں سے مٹا کے ہم
سورج کی طرح اک نئی دنیا بسائیں گے

ہر آدمی کے عکس سے چمکے گا یہ جہاں
رشک صد آفتاب یہ دھرتی بنائیں گے

ہو صاف گنگا جل کی طرح آدمی کا دل
پاکیزگی کا دہر میں چشمہ بہائیں گے

سورج کی روشنی کی طرح پاک ہوں دماغ
پیکر جو نور کا ہو وہ انساں بنائیں گے

مطلق غلاظتوں کی کثافت سے پاک صاف
آدمی کو زیست کے شایاں بنائیں گے

انسان کے دلوں سے برائی نکال کر
مستقبل حیات کو روشن بنائیں گے

ہو فیض یاب راحت و آرام سے بشر
دنیا میں نیکیوں کا وہ چشمہ بہائیں گے

جمہور کو بنائیں گے اک آفتاب ہم
روشن کچھ اس طرح سے جہاں کو دکھائیں گے

ظلمات سب میں چمکیں گے ہم بن کے ماہتاب
راہیں ترقیات کی سب کو دکھائیں گے

دکھ درد سے نجات دلائیں گے سب کو ہم
کانٹوں سے نو شگفتہ کلی کو بچائیں گے

بس اپنے اپنے کام میں ہی کر کے ہی منہمک
دنیا کے فرد فرد کو غم سے چھڑائیں گے

"انسانیت کے راز" سکھا کر کے فرد کو
جمہوریت کی اک نئی دنیا بسائیں گے

اقبال رُدولوی

غزل

محترمی خمار بارہ بنکوی کی نذر

ایسے بھی انقلاب زمانے میں آگئے
انسان کے دلوں کو جو پتھر بنا گئے

اہل خرد تھے اور تھی تنقید فصلِ گل
دلوانے آئے جشن بہاراں منا گئے

ابتک مہک رہے ہیں وہ گلزار کی طرح
جن راستوں سے کہتے ہیں اہل وفا گئے

اک ہم کہ ہم سے بارِ مسرت نہ اُٹھ سکا
کیا لوگ تھے جو ہجر کے صدمے اُٹھا گئے

اللہ رے اُس نگاہ کی جادو نگاہیاں
سب دل کے راز میری نگاہوں میں آگئے

جب بندشیں لگیں کبھی اظہار حال پر
ہم دل کے سانحات غزل میں سُنا گئے

مدت کے بعد دیر و حرم سے ملی نجات
اقبال میکدے کی حفاظت میں آگئے

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۴۷	اسپین کی شہزادی	صادق سردھنوی	۴/۵۰
۴۸	ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اردو		۲/۵۰
۴۹	اپنی موج میں	آوارہ	۲/۵۰
۵۰	انوار جدید خط و کتابت	خلیق احمد علوی	-/۷۵
۵۱	ایک جان تین قالب	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۵۲	الفت	"	۵/۵۰
۵۳	آغاز سحر	"	۴/-
۵۴	امین آباد	"	۴/-
۵۵	انشائے خطوط نویسی حصہ اول	مشیر احمد علوی	۱/۴
۵۶	اچھی کہانیاں	شمس الدین نوری	-/۵۰
۵۷	انشائے خطوط نویسی حصہ دوم		-/۷۵
۵۸	ایجادوں کی باتیں	مصطفیٰ حسن رضوی	۳/-
۵۹	اچھی کہانیاں حصہ اول	شمس الدین نوری	-/۵۰
۶۰	" حصہ دوم	"	-/۵۰
۶۱	" حصہ چہارم	"	-/۷۵
۶۲	ادب کا مقصد	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۵/۵۰
۶۳	اسلامی لطیفے	محمد حسین شمس علوی	-/۷۵
۶۴	اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں	عبدالماجد دریابادی	۳/۵۰
۶۵	اوراق گل	اخگر مشتاق	۱/-
۶۶	ارض القرآن	عبدالماجد دریابادی	۳/۵۰

(ب)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	بابائے اردو عبدالحق	عبداللطیف اعظمی	۷/-
۲	بستان حرم (جدید نعتیہ کلام)	زائر حرم حمید صدیقی	۳/-
۳	شہید محبت بوٹا سنگھ	خان محبوب طرزی	۱/۴
۴	بزم بے تکلف	ڈاکٹر سید عابد حسین	۴/۵۰
۵	بکٹ کہانی — ڈاکٹر نور الحسن	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۵/-
۶	بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی کاکوروی	۸/-
۷	بلال	علامہ اقبال	-/۵۰
۸	بہشتی ثمر (حصہ اول و دوم) خلاصہ بہشتی زیور	مولانا تھانوی	-/۸۰
۹	بانی اسلام علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ		۲/-
۱۰	بشریت انبیاء	عبدالماجد دریابادی	۱/-

(پ)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	-/۷۵
۲	پیاری باتیں	محسن کاکوروی	-/۴۰
۳	پھولوں کے انبار (ناول)	منظر سلیم	۱/۲۵
۴	پسینہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ	ڈاکٹر محمد حسن	
۵	پاگل خانہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۲/۵۰
۶	پیغام "	طاہر دریاپوری	
۷	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی	۱۰/-
۸	پردیسی کے خطوط (حصہ اول)	مجنوں گورکھپوری	۱/-

(ت)

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۱	تذکرہ فانی — فانی کی شخصیت پر جامع تبصرہ و کلام فانی	مختار الدین سیدواری	۱/-
۲	مختصر تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن)	ڈاکٹر سید اعجاز حسین	۱/-
۳	تصویر درد معہ تشریحات و ترجمہ	فرید احمد علوی	
۴	تحریریں مجموعہ مضامین	ڈاکٹر گیان چند	۱/-
۵	تاریخی جائزے	ڈاکٹر محمد یاسین	
۶	تنقیدی تجزیے	کاظم علی خاں	۵/-
۷	تعارف تاریخ اردو ترمیم شدہ جدید ایڈیشن	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	
۸	تاجدار مدینہ	اقبال صدیقی	

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۹-	تنقیدی اصول اور نظریے	حامد اللہ افسر	۷/۵۰
۱۰-	تنقید و تحلیل	ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی	۵/۵۰
۱۱-	تنقیدی جائزے جدید اڈیشن	سید احتشام حسین	۸/-
۱۲-	تنقیدی نظریات جلد اول	" "	۴/-
۱۳-	" " جلد دوم	" "	۱۰/-
۱۴-	تنقیدی اشارے (جدید اڈیشن) ۱۹۷۷ء	آل احمد سرور	۵/-
۱۵-	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	۸/-
۱۶-	ترانہائے سیام	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۱۷-	تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص	محمد حسین شمس	۳/-
۱۸-	تصویر درد معہ ترجمہ	علامہ اقبال	۱/-

(ٹ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ٹیگور	نادم سیتاپوری	۳/-
۲-	ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۳/-

(ث)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ثنائے حبیب نعتیہ کلام	بہزاد لکھنوی	۲/۲۵

(ج)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	جان غالب	محمد حسین شمس علوی	۳/-
۲-	جائزے	انور سیوانی	۳/-
۳-	جواہرات اسمٰعیل	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۵۰
۴-	جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء)	فروغ اردو	۴/-
۵-	" " نمبر ۲	" "	۴/-
۶-	جولانئے رواں مجموعہ کلام	حامد اللہ افسر	۳/۵۰
۷-	جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بلگرامی	۳/۵۰
۸-	جنگ ہنسائی مجموعہ افسانہ	قیصر تمکین	۲/۵۰
۹-	جلوے	معین الدین نی	۴/-
۱۰-	جمیلہ پاشا (ناول)	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۱۱-	جگر نمبر اول	سید احتشام حسین	۸/-

(چ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	چوتھی بہن مجموعہ افسانہ	مسیح الحسن رضوی	۳/-

(ح)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	حیات فضل الحق	خیرآبادی	۱/۵۰
۲-	حالی بحیثیت شاعر جدید اڈیشن معہ اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱۷/-
۳-	حسرت موہانی	عبدالشکور	۶/-
۴-	حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	۴/۵۰
۵-	حکیم نابینا	وزیر خاں لشکری	۲/-
۶-	حسینہ غالب	سعادت علی صدیقی	۲/۵۰

(خ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	خطوط بیخود	سید زائر حسین	۴/-
۲-	خضر راہ مع ترجمہ	علامہ اقبال	۱/-
۳-	خطبات ماجدی یا سیرت نبوی	عبدالماجد دریابادی	۳/۵۰
۴-	خضر راہ معہ ترجمہ	علامہ اقبال	۱/-
۵-	خلاصہ شریف زادہ	مرزا رسوا	۱/۲۵
۶-	خلاصہ روح تنقید		۱/-
۷-	خلاصہ جواہر العروض		۱/-
۸-	خبطی مزاحیہ محمد علی واحدی معہ مقدمہ	شوکت تھانوی	۱/۵۰
۹-	خوش بختی کی تلاش	احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۰-	خلاصہ شعر الہند حصہ دوم		۱/-
۱۱-	خلاصہ المیزان		-/۷۵

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۸۔	غزنی دروازہ (ناول)	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۹۔	غزلیات نظیری		۱/۵۰
۱۰۔	غزل انسائیکلو پیڈیا (جدید ایڈیشن)	ذکی کاکوروی	۲۵/-

(ف)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	فرقت کاکوروی نمبر		۶/-
۲۔	فروغ لغت	طاہر محسن علوی	۴/۵۰
۳۔	فن خطابت یعنی استاد تقریر	کلب مصطفےٰ ایڈوکیٹ	۱۵/-
۴۔	فریدہ	خان محبوب طرزی	۳/-
۵۔	فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی	نادم سیتاپوری	۷/-
۶	فلسفہ اقبال	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۷۔	فلسفی ابن رشد	مائل ملیح آبادی	۳/۵۰
۸۔	فروغ جام مجموعہ کلام	نشور واحدی	۴/-
۹۔	فغان محسن	محسن کاکوروی	-/۴۰
۱۰	فارسی آموز	مشیر احمد علوی	۱/-
۱۱۔	فن داستان گوئی جدید ایڈیشن	پروفیسر کلیم الدین احمد	۸/-
۱۲۔	فریاد امت	علامہ اقبال	-/۷۵

(ق)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	قدحیہ، جدیدیت پر مزاحیہ نظمیں	غلام احمد فرقت	۶/
۲۔	قصائد ظہیر فاریابی		۲/-
۳۔	قصائد مومن مع شرح	ظہیر احمد صدیقی	۶/۵۰
۴۔	قطرے سے گہر ہونے تک	صالحہ عابد حسین	۷/-
۵۔	قصص و مسائل	عبدالماجد دریابادی	۳/-
۶۔	قصائد قاآنی (فارسی)		۱/-
۷۔	قومی ادب نثر و نظم	حامد اللہ افسر	۴/۷۰
۸	قیامت صغریٰ سائنسی ناول	خان محبوب طرزی	۳/-

(ک)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	کلیات اقبال	علامہ اقبال	۱۰/-
۲۔	کیسر اور کاہی	بدرالدین طیب جی	۳/-
۳۔	کف گلفروش مزاحیہ مضامین	غلام احمد فرقت	۵/۵۰

(گ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	گاندھی نمبر		۲/-
۲۔	گلدستہ فارسی اول و دوم	محمد غوث بیگ سیفی	۲/۲۵
۳۔	گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدیدہ		-/۷۰
۴۔	گلہائے ادب	عبدالاحد خاں خلیل	۴/-
۵۔	گاندھی جی کے ساتھ	حامد اللہ افسر	۱/۵۰

(ل)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	لوائح جامی مع مقدمہ	عبدالاحد خاں خلیل	۱/۵۰
۲۔	لال قلعہ	مائل ملیح آبادی	۶/-
۳۔	لب بام	عادل رشید	۶/-
۴۔	لسانیات اور اردو	سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰

(م)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱۔	مرقع اقبال	عصمت فاطمہ علویہ	۱۲/-
۲۔	مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو		۸/۵۰
۳۔	محسن کاکوروی نمبر		۳/۵۰
۴۔	مسلمان اور کانگریس	ابوالکلام آزاد	۳/۵۰
۵۔	مرثیہ نگاری اور میر انیس	ڈاکٹر احسن فاروقی	۵/-
۶۔	مضامین فرحت حصہ اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	۵/-
۷۔	،، ،، حصہ دوم	،،	۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۸	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۳/-
۹	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۴/-
-	موسم گل ناول	عادل رشید	۷/-
۱۱	مجبور	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۱۲	مضامین جدیدہ	محمد حادی	۲/۵۰
۱۳	مثنوی سحر حلال فارسی معہ مقدمہ		
۱۴		قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۱۵	مطالعہ	ذکی کاکوروی	۵/-
۱۶	مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۱۷	معرکہ روم دیوان	صادق سردھنوی	۶/-
۱۷	مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۱۸	مطالعہ حالی	" "	۸/-
۱۹	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
۲۰	ٹھیٹ بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/-
۲۱	مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۲	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصاب بی۔ اے	۲/۵۰
۲۳	مرثیہ غالب	حالی	۲/۵۰
۲۴	محبوبہ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۵	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۶	مولا حالی	انوار الحسن	۴/-
۲۷	انتخاب فسانہ آزاد یعنی مہاراج بلی	سرشار لکھنوی	
۲۸		ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۲۹	مسٹر ملا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	-/۷۵
۳۰	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا رضائی	۱/۵۰
۳۱	مصباح بلاغت معہ مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۳۲	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۵/-
۳۳	مقدمات و مقالات	عبد الاحد خاں	۵/۵۰
۳۴	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۴/-
۳۵	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دارالعلوم کے نام	عبدالماجد دریابادی	-/۸۰
۲	نثر امروز ایران	ڈاکٹر عندلیب حسین	۳/۵۰
۳	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۶/-
۴	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۵	نقش حالی اول دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
۶		شجاعت علی سندیلوی	۳/-
۷	نغمہ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۸	نفحات الہند مع مقدمہ، اردو	محمد شریف	۳/-
۹	نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۲/-
۱۰	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۱۱	نسرین ستاں	ذکی کاکوروی	۵/-
۱۲	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۱۳	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۱۴	ندوۃ العلما کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبدالماجد دریابادی	-/۸۰
۱۵	نوائے سرور جہاں آبادی دیوان	ڈاکٹر حکیم حیدر نیر	۷/۵۰
۱۶	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۱۷	نوروز	مائل ملیح آبادی	۲/۵۰
۱۸	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ	آل احمد سرور	۱۰/-
۲۹	نیلم	انتصار حسین	۳/۵۰
۳۰	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/-
۳۱	نقوش افکار	مجنوں گورکھپوری	۱/۵۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت	نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۲	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۴/-	۴	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	منظر سلیم	۱/۵۰
۲۳	منشی نولکشور نمبر		۳/-	۵	ہندوستان کا تعمیر اضطراب		۱/۵۰
	(و)			۶	ہمارا سماج ۱	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی	۴/-
				۷	" " ۲	"	۰/۷۵
۱	وعدۂ فردا	اظہر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-	۸	" " ۳	"	[illegible]
	(ہ)			۹	" " ۴	"	[illegible]
				۱۰	یادگار غالب	مولانا حالی	[illegible]
۱	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانہ	علی عباس حسینی	۵/-	۱۱	یادوں کی بارات	خاں محبوب صدیقی	۲/۰۰
۲	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۱/۲۵	۱۲	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۳/۰۰
۳	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-				

ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ فروغ اردو ۔ نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملے شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہ کے پرچہ کے ساتھ روانہ کردیا جائے گا ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمایئے

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

(۴) جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لیے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

(۲۵) شمارہ (۱۰) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو/این پی ۹۳

لائسنس نمبر : ۲۰۲۴۱۷/۲۰۰۸۶۴

دفتر فون : ۲۶۱۳۵

فون رہائش گاہ : ۲۶۶۵۶

ادارہ فروغ اردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

شمارہ (۱۰) فروری ۱۹۷۸ جلد (۲)

ترتیب

زر سالانہ اعزازی :- دس روپیہ

عوام سے : آٹھ روپیہ

فی پرچہ : ۸۰ پیسہ

پتہ : ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ نادان محل روڈ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ سے شائع کیا۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

آزادی کے بعد اُردو زبان کے ساتھ یہ تماشہ کھیلا جاتا رہا ہے کہ اُس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ریاستی اور مرکزی سطح پر حکومت کی جانب سے وقتاً فوقتاً کمیٹیاں قائم کی گئیں اور اُردو والوں کو خوش کرنے کے لئے گواہیاں اور شہادتیں لے کر بظاہر یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ حکومت بہت جلد اُردو کے تمام مسائل حل کردے گی اور آزاد ہند میں اُس کو پھلنے پھولنے کے پورے پورے مواقع فراہم کرے گی لیکن یہ کمیٹیاں محض فریب ثابت ہوئیں اُن کو زیادہ سے زیادہ اختیار یہ تھا کہ وہ حکومت کے نقطۂ نظر کو پیشِ نظر رکھ کر اپنی رپورٹ پیش کردیں اگر اُردو کے حق کے لئے کوئی سفارش بھی کریں تو انتہائی احتیاط کے ساتھ۔ آخری کمیٹی گجرال کمیٹی بنائی گئی جس نے ملک بھر میں دورے کرکے اُردو کے سلسلہ میں شکایتیں اور مشکلات معلوم کیں۔ اُردو کے راہ میں کس طریقہ سے روڑے اٹکائے جاتے ہیں اور ان میں کن کن حضرات کا ہاتھ ہوتا ہے کمیٹی کے سامنے تفصیلات کے ساتھ یہ تمام باتیں بیان کی گئیں۔ اس کمیٹی کے روبرو میں نے یہ کہنے کی جرأت کی تھی کہ

"میں اُس وقت تک کوئی بیان نہ دوں گا جبتک یہ معلوم نہ ہوجائے کہ یہ کمیٹی با اختیار ہے کیونکہ میرا یہ تجربہ ہے کہ جس طرح بچوں کو کھلونے دے کر بہلایا جاتا ہے اُسی طرح اُردو والوں کو کمیٹیوں کے ذریعہ سے بہلایا جاتا رہا ہے"

پروفیسر احتشام حسین مرحوم جو کمیٹی کے ایک مؤثر رکن تھے یقین دلایا تھا کہ یہ کمیٹی کسی حد تک با اختیار ہے اور اُس کی سفارشات پر ضرور عمل کیا جائے"

تب میں نے صرف بیسک ریڈروں اور بیسک ایجوکیشن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا
تھا۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ اس کمیٹی کا حشر کیا ہوا؟ اس کی رپورٹ آج تک منظرِ عام
پر نہیں لائی گئی اور نہ پارلیمنٹ میں پیش کی گئی اب ہماری نئی مرکزی سرکار نے اقلیتوں کے
مسائل حل کرنے کے لئے چند ممبران پر مشتمل ایک اقلیتی کمیشن کی تشکیل کی ہے اس کمیشن کو بھی
صرف اتنا اختیار رہے کہ وہ شکایتیں سن کر حکومت کی بارگاہ میں پیش کرے۔ ایسے بے اختیار
کمیشن سے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کتنا ہو سکتا ہے؟ کہنے
کی ضرورت نہیں۔ اگر حکومت کو واقعی اقلیتوں کے حقوق کا کسی قدر بھی احساس ہے تو اس
کمیشن کو اسے بااختیار کرنا چاہیئے اور اس کی رپورٹ کو بحث و مباحثہ کے لئے [illegible] قانونی حیثیت
دینا چاہیئے ورنہ یہ بھی گزشتہ کمیٹیوں کی طرح بے سود اور بے اثر ثابت ہوگا۔

حیرت تو اس بات پر ہے کہ حکومت عوام کے نمایندوں کی ہے غیر ملکی سیاسات
سمندر پار والوں کی نہیں جو ہندوستان اور اس کے عوام سے واقفیت نہ ہونے کا عذر
کر سکتے ہیں لیکن یہ ہندوستان کے رہنے والے عوام کے نمایندے جب منتخب ہو کر اسمبلی
یا پارلیمنٹ میں جاتے ہیں تو وہ اتنے بے خبر کیوں ہو جاتے ہیں کہ انھیں اقلیتوں کے مسائل
یا اردو زبان کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ کہتے ہیں کہ سونے والے کو تو جگایا جا سکتا
ہے مگر جو جان بوجھ کر سوتا ہوا بن جائے اسے کوئی نہیں جگا سکتا یہی حال ہماری حکومت
اور با اقتدار حضرات کا ہے جبتک اس تجاہلِ عارفانہ سے حکومت کام لیتی رہے گی کوئی
مسئلہ حل نہ ہوگا۔

اتر پردیش کے گورنر نے ایک آرڈیننس کے ذریعہ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن یوپی کو بورڈ آف
ہائی اسکول کو اختیار دے کر ایک اہم مسئلہ کو فی الحال حل کر دیا ہے۔ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن
اور محکمہ تعلیمات کے تمام افسران کو خوب معلوم ہے کہ اردو کے طلباء کو اردو میں جوابات لکھنے
کی اجازت حاصل کرنے میں کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں اگر محکمے کو اردو والوں کی
پریشانیوں کا ذرا بھی خیال ہوتا اور ان کے اندر کچھ بھی انسانی اور تعلیمی شعور ہوتا۔ تو
وہ خود اردو میں جوابات لکھنے کی بلا مشروط اجازت دیدیتے مگر جب اردو کو ختم کرنا ہی
ان کا مقصد ہو تو وہ کیوں کوئی سہولت فراہم کریں۔ اردو والوں کو شدت کے ساتھ یہ
احساس ہی نہیں یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اس نام نہاد آزادی سے وہ غلامی کا دور
بہتر تھا جب ہمارے طالب علم اردو زبان میں آزادی کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے

تھا اور عملی زندگی میں بھی اس کو کسی قسم کی کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اور لسانی سامراجیت کا دیو غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ آزادی کیا آئی کہ یہ دیو بھی آزاد ہوگیا۔ اور اس نے اپنے تعصب آمیز، نفرت انگیز خونی پنجوں سے اردو اور اردو والوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی مسلسل و منظم کوشش کی۔ مگر اردو زبان اور اس کے سپوتوں نے بڑے سے بڑے خونخوار دیووں کا مقابلہ کیا ہے۔ وہ جیل خانے گئے، تختہ دار پر چڑھے، کالے پانی بھیجے گئے مگر اپنی زبان کے ذریعہ سے حق بات کہتے رہے، اور کہتے رہیں گے وہ اپنی مادری زبان کے حقوق کیلئے مسلسل جد و جہد کرتے رہیں گے۔

اردو کے نونہال نئے عزم و حوصلے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، انھوں نے [illegible] کو عام کرنے اور اسکول و کالج میں اردو کو رائج کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ سرپھرے، تن من دھن سے، اپنی مادری [illegible] کی ترویج و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ اُتر پردیش میں سنبھل اور مرادآباد کے نوجوانوں اور ان کے رفقاء نے، اردو تعلیمی جائزہ کمیٹی قائم کرکے اوّلیت کا شرف حاصل کرلیا ہے۔ اس کمیٹی نے مختصر مدت میں بیسک اسکولوں سے لے کر ڈگری کالجوں تک میں اردو تعلیم رائج کرنے کی جدوجہد کی اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے مرادآباد شہر کے ایک بھی ڈگری کالج میں اردو نہیں تھی۔ اب تین کالجوں میں ہوگئی ہے بقیہ کالجوں میں بھی کوشش کی جارہی ہے۔ سنبھل ڈگری کالج اور چندراوتی ڈگری کالج رام پور میں ایم اے اردو کے درجات کھولے جانے کے لئے مسلسل کوشش ہورہی ہے امید ہے کہ عنقریب ان دونوں کالجوں میں ایم اے کے درجات قائم ہوجائیں گے۔

اردو اس وقت تک صحیح مقام حاصل نہیں کرسکتی جب تک کہ آٹھویں درجہ تک اس کی تعلیم لازمی نہ کردی جائے۔ ہائی اسکول تک ذریعہ تعلیم اردو نہ کیا جائے اس کو دوسری سرکاری زبان نہ تسلیم کیا جائے۔ اور سرکاری، نیم سرکاری اداروں میں کام کرنے والوں کے لئے اردو جاننا لازمی نہ قرار دیا جائے۔

پریم چند نمبر تکمیل کی منزل میں ہے۔ مضمون نگار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنے مضامین ۱۵ر فروری تک ضرور روانہ فرمادیں۔

حافظ محمد جیلانی اردو مولوی، گورنمنٹ جونیر کالج۔
ارسیکرے (کرناٹک)

فنِ مرثیہ نگاری اور اس کے امام!

لغت میں مرثیہ کسی مرحوم کی مدح میں قصیدہ کہنے کے ہیں، اس طرح کہ جس کو سن کر رونا آئے اور مرثیہ بیان کرنے والا خود مرنے والے کی زندگی کے حالات کو رنج اور غم کے پیرایے میں بیان کرے۔ اور اصطلاح میں مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جو میدان کرب و بلا کے واقعات اور امام مظلوم کی بے کسی کی داستان کو بطور مسدس بیان کرے۔ پہلے پہل جو مرثیے لکھے گئے ان میں اس صنف کا کوئی خاص اسلوب نہیں تھا۔ ابتدا میں اردو مرثیے کبھی مثلث، کبھی مربع، کبھی مخمس بندوں کی صورت میں اور کبھی غزل اور کبھی مثنوی کی شکل میں پیش کئے جاتے۔ میر اور سودا کے عہد میں اسکی شکل متعین ہوئی اور مسدس کا شعری سانچہ مرثیہ نگاری کے لیے مختص ہوگیا۔ پھر ضمیر نے مرثیۂ ترکیبی یعنی چہرہ، سراپا، رخصت، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین مقرر کئے۔ پھر مرثیہ

میر انیس اور مرزا دبیر جیسے باکمال شاعروں کے ہاتھوں اپنے فن کی معراج کمال کو پہونچ گیا۔ ان ہی کے عہد سے اس فن کو جلا بھی ملی، ان کے گروپ بھی بن گئے تھے انیس کے عقیدت مند انیسیے اور دبیر کے عقیدت مند دبیریے کہلاتے تھے انیس و دبیر کی زور آزمائی سے اردو زبان بہت مالا مال ہوئی۔ کتنے ہی ادیبوں نے ابتک ان کے بلند پایہ مرثیوں کا تجزیہ کیا ہے، دونوں کا موازنہ کیا ہے۔
ان کے پر شکوہ اور پر زور بزم کے ہنگاموں سے بھرپور کلام کی تشریحیں کی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں ان میں علامہ شبلی کی شہرہ آفاق کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" قابل ذکر ہے۔ یہ دونوں بڑے عظیم فنکار اور عظیم شاعر تھے میر انیس مخصوص شاعرانہ تخیل کا وسیلۂ اظہار مرثیہ تھا اور اسی وسیلہ اظہار پر قدرت نے انھیں اس فن کا امام بنا دیا۔

فن مرثیہ نگاری اردو ادب میں اس حیثیت سے
سے اپنے طرز کی اعلیٰ صنف ہے اور اس کا دنیا کی زبانوں
میں بلند درجہ ہو جاتا ہے کہ یہ صرف درد والم کے اظہار پر
ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ ان میں جذبات نگاری، جنگ
وجدل کے مناظر و کردار نگاری سے ایک طرح کا ڈرامائی
تاثر قائم ہوتا ہے اور ان باتوں کا کمال انیس و دبیر کے
کلام میں موجود ہے۔ ان دونوں نے جس باکمال طریقہ سے
استعمال کیا اور معراج بخشی وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی،
مرثیہ میں اگرچہ چہرے بشرے، سراپا، رجز و بین،
جنگ وجدل، گھوڑے و ہتھیار، رخصت اور شہادت
کا ذکر پہلے کے شعراء نے بھی کیا ہے۔ مگر زمین اور آسمان
کے فرق کو قائم رکھ کر یعنی انیس اور دبیر کے زور قلم کی بات
ہی کچھ اور تھی ان لوگوں کا کلام (مرثیئے) اور انکی مقبولیت
صرف مجالس ہائے عزا تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس سے
کہیں زیادہ علمی ادبی حلقوں اور اداروں میں انکو اونچا درجہ ملا

مختصر تعارف انیس و دبیر!!

دبیر دہلی کے محلہ بلی ماراں میں اور میر انیس فیض آباد میں
پیدا ہوئے۔ کم و بیش ایک سال دونوں کی تاریخ ولادت
اور وفات ہے (انیس کا سنہ وفات ۱۲۹۱ھ اور دبیر کا
سنہ وفات ۱۲۹۲ھ ہے) دونوں نے دہلوی الاصل ہونے
پر فخر کیا ہے اور مدفون لکھنؤ میں ہوئے ہیں۔ انیس کے ہاں
رزم کی جھلکیاں خوب ہیں اور دبیر نے رزم کے مقابلے میں
بزم کو ترجیح دی ہے۔ سوز خوان اور مرثیہ خواں حضرات
دبیر ہی کے مرثیے زیادہ حفظ کرتے تھے۔ ذہانت بھی دبیر کی
کم عمری ہی سے تھی زبردست حافظہ کے مالک تھے بارہ
سال کی عمر میں جب میر ضمیر کی خدمت میں حاضری دی اور
ضمیر نے فرمائش کی تو دبیر نے فی البدیہہ یہ قطعہ سنایا۔

کسی کے کندہ نگینہ پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

یہ قطعہ سنایا تھا کہ محفل تحسین آفرین سے پھڑک
اٹھی۔ اسی محفل میں خود میر ضمیر نے مرزا سلامت علی کو دبیر
کا تخلص دیا۔ انیس کا پورا نام میر ببر علی تھا، یہ اخلاق کے
مجسم پیکر تھے اور غصہ و رنج کے موقع پر بھی اپنے حریفوں
کیلئے انھوں نے تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ استعمال نہیں
کیے۔ غرض مرثیہ گوئی کا کمال ان دونوں حضرات کے ساتھ
ہی دفن ہو گیا۔

موازنۂ کلام

ایک ہی واقعہ پر انیس و دبیر کے اشعار کا تاثر معلوم
کرنا ان کالموں میں ناممکن ہے اس لیے دونوں کے ایک
یا دو مرثیوں کا مختصر تاثراتی حصہ یعنی مرثیۂ انیس کا ابتدائی
حصہ اور دبیر کے مرثیئے کا اختتامی حصہ ملاحظہ فرمایئے پہلے
یہ واضح کردوں کہ انیس و دبیر کا ہر مرثیہ سینکڑوں بندوں
پر مشتمل ہے اس میں سے یہ گنتی کے چند منتخب بند ہیں۔
پہلے انیس کے کلام کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

کلام انیس :-

جب ان میں سربلند علی کا علم ہوا
فوج خدا پہ سایۂ ابر کرم ہوا

چہرۂ زبرجدی پئے تسلیم خم ہوا
نیچے پہ سات بار تصدق حشم ہوا

دیکھا نہ تھا علم جو کبھی اس نمود کا
دونوں طرف کی فوج میں غل تھا درود کا

آگے کبھی نہ دیکھی تھی اس حسن کی سپاہ
دنیا بھی خوبیوں کا مرقع ہے واہ وا

دیکھیں کسے کسے کہ ہے ایک ایک رشکِ ماہ
جاتی ہے جس کے رخ پہ تو پھرتی نہیں نگاہ

دیکھو انھیں دموں سے ہے رونق زمین کو
چن کر حسین لائے ہیں کس کس حسین کو

وہ اشتیاق جنگ میں لڑکوں کے ولولے
بیتاب تھے کہ دیکھیے تلوار کب چلے

چہرہ وہ آفتاب سے وہ چاند سے گلے
سب فاطمہ کی بیٹیوں کی گود کے پلے

اک اک رسول حق کی لحد کا چراغ تھا
جس پر علی نے کی تھی ریاضت وہ باغ تھا

بچپن پہ خادمانِ اولوالعزم کے نہ جائیں
جب چاہیں معرکہ میں بلاؤں پہ آزمائیں

تن تن کے روبرو سپر کہ سپہ چھپا میں ہنس ہنس کے زخم کھائیں
بجلی گرے تو منہ پہ جھجک کر سپر نہ لائیں

جھپکے پلک کسی سے تو آنکھیں نکالیے
بڑھ کر ہٹے جو پاؤں تو سر کاٹ ڈالیے

کہتے تھے مسکرا کے یہ زینب کے دونوں لعل
کھلتے ہیں خود دلیروں کے جوہر دمِ جدال

ہر وقت چاہیے مددِ شیرِ ذوالجلال
نعرے ابھی کریں تو ملے عرصۂ قتال

اترے ہے تیغ جن کے لیے وہ دلیر ہیں
سب ہم کو جانتے ہیں کہ شیروں کے شیر ہیں

یہ سن یہ زور و شور یہ عمریں یہ آن بان
یہ بھولے بھالے منہ، یہ جوانمردیاں یہ شان

باتیں رجز سے کم نہیں اللہ رے خوش بیاں
چلتی ہے ذوالفقارِ علی کی طرح زباں

کس دبدبے سے کاندھوں پہ نیزے سنبھالے ہیں
گویا چلن لڑائی کا سب دیکھے بھالے ہیں

اب کلام دبیر کا اختتامی حصہ ملاحظہ فرمائیے :-

شہ بولے تم سمجھتے ہو لاچار ہے حسینؑ
مختار سبطِ احمد مختار ہے حسینؑ

کرار ابن حیدر کرار ہے حسینؑ
قہرِ جلالِ خالق غفار ہے حسینؑ

اچھا بھلا کھڑے رہو اب تم یہاں تا ہے حسینؑ
اک فاقہ کش کے دودھ کی طاقت دکھاتا ہوں

پر آہ آہ!! شمر نے بڑھ کر غضب کیا
سینہ پہ موزہ حلق پہ خنجر کو رکھ دیا

چلّا کے آئے قبر سے محبوبِ کبریا
باہیں گلے میں ڈال دیں خنجر پکڑ لیا

زہرہ پکاری یہ دل حیدر کا چین ہے
میرا حسینؑ ہے ارے میرا حسین ہے

روتی ہوئی وہ تیغ در آئی نیام میں
اور شاہ بے سپاہ گھرے فوج شام میں

آئے ملک فلک سے رکابِ امام میں
ہر اک یہ نوحہ کرتا تھا اس ازدحام میں

روح الامیں پروں میں چھپا لو حسینؑ کو
لے جا کے عرش حق پہ بٹھا دو حسینؑ کو
تھا سنگدلوں کو جو نبی زادے سے کینہ
برساتے تھے پتھر بھی سوئے شاہ مدینہ
سب توڑتے تھے مہر نبوت کا نگینہ
خشکی میں ڈبوتے تھے پیمبر کا سفینہ
وہ دھوپ کی ایذا کسی مجروح سے پوچھو
شبیر سے یا فاطمہ کی روح سے پوچھو

اس بند میں دبیر نے بڑا اچھا خاکہ بارگاہ اقدس میں عرش ملایک کا پیش کیا ہے کہ

پوشاک جسے عید کے دن تو لے عطا کی
پرزے ہے قبا تیروں سے اس شاہ ہدا کی
جو لوٹتا تھا چھاتی پہ محبوب خدا کی
آج اس کا بچھونا ہے زمیں دشت بلا کی
ایسی کسی بسمل کو اذیت نہیں دیتے
جلاد تڑپنے کی بھی مہلت نہیں دیتے

اب آخری بند ملاحظہ فرمایئے۔

مڑ مڑ کے زیر تیغ یہ بولے شہ امم
زینبؑ تجھے یتیمیٔ شبیر کی قسم
بٹھلانا میرے بیمار کو خیمے میں ایک دم
بٹتا ہے دھیان محو جمال خدا ہیں ہم
بچوں کو لیکے ڈیوڑھی سے زینب تو ہٹ گئی
یاں بوسہ گاہ احمد مختار کٹ گئی!

انا للہ وانا الیہ راجعون

شبیر احمد خاں غوری

اقبال اور طوسی

شعر کا سرچشمہ شعور ہے۔ شاعر کا شعور جس قدر شدید ہوتا ہے اُسی تناسب سے اُس کی شاعری جاندار ہوتی ہے شدت شعور کی معراج یہ ہے کہ خارجی حقائق و واقعات بھی اُسے متزلزل نہ کر سکیں۔ اور اس وصف خاص میں اپنے یہاں شاعران تغزل گفتار میں اور اقبال کا شریک سہیم نظر نہیں آتا

اقبال کا صرف ایک نصب العین تھا (نہ صرف اقبال بحیثیت شاعر بلکہ اقبال بحیثیت انسان بھی) اور وہ تھا اعلائے کلمۂ اسلام۔ اسلام کی عظمت و سربلندی پر اُن کا ایمان تھا اور جس جس پہلو سے بھی ممکن ہو، اس بات کے اُجاگر کرنے میں وہ کوتاہی نہیں برتتے تھے، خواہ تاریخی حقائق اس کی مساعدت کریں یا نہ کریں۔

پھر یورپ کی تہذیب حاضر کی عظمت بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اقبال کو بھی اس کا احساس تھا۔ مگر اُن پختگی ایقان اور استواری ایمان نے اُن کے ذہن میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ یورپ کی تہذیب حاضر کی عظمت اسلامی تہذیب و ثقافت کی عظمت و سربلندی ہی کا ایک پرتو ہے اور اس دعوے کے اثبات پر اُنھوں نے اپنی تحقیقی و تفکیری سرگرمیوں کو مرکوز کر دیا۔

اُنھوں نے یورپ کی تہذیب و ثقافت کا بڑی دقت نظر سے تجزیہ کیا اور اس موضوع پر محققین یورپ کے فاضلانہ شاہکاروں کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا۔ ان میں ایک اہم تصنیف اشپنگلر کی "انحلال المغرب" (DECLINE OF THE WEST) ہے جس کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے

کہ یورپ کی تہذیب حاضر کے دو خصوصی ہیں:۔ ایک زمانہ کے حقیقی ہونے کا احساس شدید اور دوسرا اُس کی "یونانیت بیزاری"۔ اول الذکر کے بارے میں اشپنگلر نے لکھا ہے:۔

"اور یہ واقعہ ہے کہ انسان کبھی اتنا بیدار اور مستفیض نہیں رہا، نہ اُسے زمانہ کا کبھی اتنی شدت سے احساس رہا ہے اور نہ کبھی اُسے زمانہ کی جیت مقدر اور حرکت کا اتنا شدید شعور رہا ہے جتنا (عہد حاضر کے) مغرب (یورپ) میں حاصل ہے حتیٰ کہ چو خاندان کے عہد حکومت کے چین میں بھی جب کہ وہاں ادوار و اعصار کا نظام ترقی کی انتہائی منزل پر پہونچ چکا تھا زمانہ کا یہ شعور و احساس ناپید تھا"۔

اقبال بھی اسے قرآن کریم کی دو بنیادی تعلیموں میں سے ایک قرار دیا تھا فرماتے ہیں:۔

"قرآن نے تاریخ سے جو دلچسپی لی ہے ...... (اُس کے سلسلے میں) اساسی تصورات اُصولاً دو ہیں اور دونوں قرآنی تعلیمات کی بنیاد ہیں،

(۱) وحدت انسانی ... (اور)

(۲) زمانہ کے وجود حقیقی کا احساس شدید"

اور اس بات پر انھیں اس درجہ یقین تھا کہ وہ زمانہ کو نہ صرف قاہر و قار سمجھتے تھے، بلکہ آخر میں خلاق کائنات و نقش گر حادثات سمجھنے لگے۔ مگر اس کی تفصیل ایک مستقل پیش کش کی متقاضی ہے۔

ثانی الذکر کے بارے میں اشپنگلر لکھتا ہے:۔

تاریخ کے پورے دور میں تاریخی تعلقات کتنے ہی کثیر التعداد متنوع اور گہرے کیوں نہ رہے ہوں۔ لیکن دنیا میں اور کوئی چیز بنیادی طور پر ایک دوسرے سے اس قدر اجنبی اور متضاد نہیں ہیں جتنا کہ یہ دونوں (یعنی یونانی کلاسیکی ثقافت اور جدید مغربی یا یورپی ثقافت)"۔

اور اقبال بھی اسلام کی بنیاد اولیں یعنی روح قرآن کو اصولی طور پر "کلاسیکیت بیزار" سمجھتے تھے اور اسی حقیقت سے بے اعتنائی کی وجہ سے بقول اُن کے عمل پسند عرب عرصہ تک ترقی نہ کر سکے یہی "کلاسیکیت بیزاری" اقبال کی نظر میں اسلامی ثقافت کی تابانی و درخشانی کا اصل الاصول ہے اور اسی رجحان ذہنی اور انداز فکر کے طفیل میں جملہ علوم اسلامی ظہور میں آئے اور ترقی کی معراج کمال پر پہونچے۔ یونانی فکر سے بغاوت کے نتیجہ میں مسلمانوں نے نہ صرف SPECULATIVE SCIENCES میں ہی کمال حاصل کیا۔ بلکہ EXACT SCIENCES میں بھی وہ اپنے وقت کے منفرد عبقری بن گئے۔

اس سلسلہ میں اقبال نے جن عباقرۂ اسلام کو درخور ذکر سمجھا ہے، اُن میں خواجہ نصیر الدین طوسی سر فہرست ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ وہ بیک وقت منطقی، فلسفی، ریاضی داں و ماہر علم الہیت مدبر و سیاست داں اور فارسی زبان کے عظیم المرتبت ادیب تھے۔ اُن کی "اخلاق ناصری" آج بھی فارسی زبان کی ادبیات عالیہ میں محسوب ہوتی ہے۔ اُن کی سیاست دانی ہی کا کرشمہ تھا کہ ہلاکو نے جسے بغداد پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی، آخر کار اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور سوا پانچ سو سال کی قائم عباسی خلافت حرف غلط کی طرح صفحہ

ہستی سے نابود ہو گئی۔ فلسفہ و حکمت میں حکیما نہ تفکیر کے چاروں سلسلے یعنی مشائیت، اشراقیت، کلام اور تصوف اُن کی ذات میں مجتمع ہو گئے۔ معقولات (کلام و فلسفہ) میں اُن کی .. "تجرید الکلام" کو نہ صرف شیعی حلقوں بلکہ سنی علماء میں بھی جو قبول عام نصیب ہوا، دنیا کی کم کتابوں کے حصہ میں آیا ہوگا۔ اور ریاضی و ہیئت میں تو وہ بجا طور پر اسلام کی علمی تاریخ میں ان علوم کے مجدد کہے جا سکتے ہیں۔ اُنھوں نے ان علوم کے دو شاہکاروں یعنی "اصول اقلیدس" اور "کتاب المجسطی" کی تحریر و ترتیب کی اور بعد میں سات سو سال تک اسلامی مدارس میں ان کتابوں کے وہی ایڈیشن مروج رہے جنھیں انھوں نے مرتب کیا تھا۔ محقق طوسی سے پہلے علمائے ریاضی و ہیئت نے ان علوم کے اندر بہت کچھ لکھا تھا، مگر محقق کی علمی مساعی کے مقابلے میں قدماء کی کاوشیں واقعتاً "نقش و نگار طاق نسیاں کا" مصداق بن گئیں۔ اُن کی قائم کردہ رصدگاہ مراغہ اور مرتب کردہ "زیج ایلخانی" نے بعد کی رصدگاہوں اور زیجوں کے لیے نمونہ عمل کا کام انجام دیا۔

لیکن محقق طوسی سب کچھ تھے، مگر نہیں تھے تو "کلاسیکیت بیزار" اور نہ انھوں نے یونانی فکر کے خلاف بغاوت کی اور نہ کسی سکون و جمود میں تلاطم برپا کیا۔ یونانی۔ ارسطاطالیسی فلسفہ کی تجدید اور تہذیب و تنقیح (مشرق میں بقول امام غزالی اور مغرب میں بقول بیکن) شیخ بوعلی سینا نے کی، اور شیخ کی تعمیر کردہ ارسطاطالیسی فلسفہ کی فلک بوس عمارت جیسے ابوالبرکات بغدادی اور امام فخر الدین رازی کے پے بہ پے حملوں نے مائل بہ انہدام کر دیا تھا محقق طوسی ہی کے نفس گرم کی تاثیر سے دوبارہ زندہ ہوئی اور آج کے دن تک برقرار ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری محقق کے بارے میں لکھتے ہیں :-

> معالم تحقیقات ابو علی را کہ نعیں دم شہادت ابو البرکات یہودی و تشکیکات فخر الدین رازی نزدیک باندراس رسیدہ بود، از غایت علو حکمت و کمال ادراک استدراک نمود (مجالس المومنین صفحہ ۳۳۹)

یہ تاریخی حقائق ہیں۔ مگر ان کے باوجود علامہ محقق طوسی کو یونانیت بیزار عباقرۂ اسلام کی فہرست میں سرعنوان سمجھتے ہیں۔

پھر یورپ کی عبقریت کا ایک ... کارنامہ "غیر اُقلیدسی ہندسہ" کی دریافت، ابتدا اور ترقی ہے۔ اس کی بنیاد اقلیدس کے پیش کردہ "مصادرہ توازی خطوط" سے (PARALLEL POSTULATE) ہے عہد حاضر کے فضلاء کی بے اطمینانی ہے۔ اسی طرح "مقتضائے کثیر الابعاد" (HYPER SPACE) یا مکان کے تین سے زیادہ ابعاد ہو سکنے کا تصور) یورپ کی طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کی قیاس آرائی ہے۔ مگر علامہ اپنے بنیادی لاشعور کی شدت کے نتیجہ میں اس کا بانی و مفتح بھی محقق طوسی ہی کو قرار دیتے ہیں۔ مزید تفصیل حسب ذیل ہے

اقبال نے اپنے خطبات میں لکھا ہے :-

> "جہاں تک ریاضیات کا تعلق ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ بطلیموس (۸۷ - ۱۶۵ء) کے زمانہ سے نصیر طوسی (۱۲۰۱ - ۱۲۷۴) کے زمانہ تک کسی نے بھی اُن دقتوں کی طرف سنجیدگی سے غور نہیں کیا جو اقلیدس نے خطوط متوازی کے

مصادرے کی صحت کو مکان حسی کی بنیاد پر
ثابت کرنے میں مصر ہیں۔ یہ طوسی ہی کی ذات
تھی، جس نے اُس سکون میں جو ہزار سال سے
دنیائے ریاضیات پر طاری تھا تلاطم برپا کیا
محقق طوسی نے اس مصادرے کی اصلاح کی
کوشش میں مکان کے حسی تصور کے ترک کرنے
کی ضرورت کا احساس کیا۔ اس طرح انھوں
نے ہمارے زمانے کی فضائے کثیر الابعاد کی
تحریک کے لیے ہرچند کہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں
نہ ہو، بنیاد فراہم کی۔"

لیکن علامہ کا یہ ارشاد عالی تاریخی حقائق کے ساتھ
دست و گریباں ہے۔ آخر "بطلیموس کے زمانے سے نصیر طوسی
کے وقت تک دنیائے ریاضیات پر سکون طاری رہنے"
کا کیا مطلب ہے اور طوسی کے اس سکون میں تلاطم برپا کرنے
سے کیا مراد ہے؟

(الف) یہ کہ مسلمان فضلا نے طوسی سے پہلے ریاضی و ہندسہ
کے ساتھ اعتنا نہیں کیا، یا اس کی ترقی میں کوئی نمایاں
حصہ نہیں لیا۔

(ب)۔ یا یہ کہ افاضل اسلام نے جیسا کہ اقبال کے خط بنام
ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے مترشح ہوتا ہے۔
(PARALLEL POSTULATE) کے ساتھ کوئی
اعتنا نہیں کیا۔

(ج)۔ یا یہ کہ محقق طوسی نے اپنے پیشرووں کے برخلاف
(NON EUCLIDEAN GEOMETRY) یا
(HYPER-SPACE) کی تحریک کا افتتاح کیا۔

(الف) پہلی شق قطعاً غلط ہے۔ مساحت کے ساتھ
مسلمانوں کا اعتنا ۲۱ھ سے شروع ہو گیا جب کہ حضرت عمرؓ
کے حکم سے عثمان بن حنیفؓ نے سواد عراق کی پیمائش کی
(فتوح البلدان صفحہ)۔ "اصول اقلیدس" کا پہلی مرتبہ ترجمہ
عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ میں ہوا (مقدمہ ابن خلدون)۔
باقاعدہ ترجمہ پہلے ہارون اور پھر مامون کے زمانہ میں ہوا
(کتاب الفہرست ابن الندیم) اور پھر شروح و اصلاحات کا
سلسلہ شروع ہوا جن کی مدد سے محقق طوسی نے "اصول اقلیدس"
کی تحریر و ترتیب کا کام انجام دیا۔ علم ہندسہ کے دوسرے
یونانی شاہکاروں کا ترجمہ بھی تیسری صدی ہجری سے شروع
ہو گیا۔ بنو موسیٰ نے "مخروطات" اپلونیوس" اور دوسری کتابوں
کو ترجمہ کرایا۔ دوسرے فضلا نے "متوسطات" کے مختلف متون
کا ترجمہ کیا اور اُن پر شروح لکھیں نیز اُن کے غوامض کی
تشریح کی۔ انھیں کی مدد سے محقق طوسی نے ان رسائل کی
تحریر و ترتیب کی۔ وہ خود اس ترتیب و تحریر میں اپنے پیشرو
مسلمان فضلا کے استفادے کے معترف ہیں۔

(ج) جہاں تک شق ب کا تعلق ہے، یہ بھی مسلمان فضلا
کی ہندسی کاوشوں کے بارے میں قلت معلومات کا نتیجہ ہے۔
"مصادرہ توازی خطوط" یا (PARALLEL POSTULATE)
کے ثابت کرنے کی کوشش میں محقق طوسی منفرد نہیں
ہیں اور نہ انھیں اس مسئلہ کے ساتھ اعتنا میں شرف اولیت
حاصل ہے۔ اُن سے پہلے نصف درجن سے زیادہ علمائے اسلام میں سے
ان شخصوں کے نام تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں، جنہوں نے
اس مسئلہ سے تعرض کیا اور اس موضوع پر تین فاضلوں
کی کاوشوں کی تفصیل خود محقق طوسی نے اپنے "الرسالۃ الشافیہ"

میں دی ہے۔ یہ ہیں عباس ابن سعید الجوہری (۸۲۹ء کے قریب) ابن الہیثم (۸-۱۰۳۸ھ سے پہلے) اور عمر خیام (۱۱۲۳ء کے قریب)۔ محقق سے کچھ ہی عرصہ پہلے اثیر الدین ابہری (مصنف ایساغوجی و ہدایۃ الحکمۃ) نے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ ابن الہیثم نے اس مسئلہ کے ساتھ اپنی دو کتابوں "شرح مصادرات اقلیدس" اور "حل شکوک اقلیدس" میں تعرض کیا ہے۔ اول الذکر کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ثانی الذکر کا اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں ہے۔ عمر خیام نے اس مسئلہ کو "شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" میں بیان کیا ہے جو چھپ گئی ہے۔ اثیر الدین ابہری نے اس مسئلہ کا جو ثبوت دیا تھا، "المجمع العلمی العراقی" میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

اس تفصیل کے بعد "محقق طوسی کے دنیائے ریاضیات کے سکون میں تلاطم برپا کرنے" کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(ج)۔ ریاشتق "ج" کا سوال تو یہ اس باب میں علامہ کی غیر معمولی عجلت پسندی کا نتیجہ ہے۔ جو بات انھوں نے ٹھان لی، پتھر کی لکیر بن جاتی تھی چنانچہ ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"محمود خضیری سے میں اسپین میں ملا تھا۔ اُن سے کہیے کہ وہ نصیر الدین طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ جس میں طوسی نے اقلیدس کے (PARALLEL POSTULATE) کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، بالخصوص دیکھیں اس تحقیق سے اُن کو معلوم ہوگا کہ مسلمان ریاضی دان قرون وسطیٰ ہی میں اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ ممکن ہے مکان کے ابعاد (DEMENSIONS) تین سے زیادہ ہوں"

(۱) نہ تو محقق طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ جس میں طوسی نے اقلیدس کے PARALLEL POSTULATE کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اعوان نظر سے پڑھا

(۲) نہ اس مسئلہ کے تاریخی ارتقا سے واقف ہونے کی ضرورت سمجھی کہ "مکان کے ابعاد DIMENSIONS تین سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

(۳) اور نہ اس باب میں خود محقق طوسی کے افکار سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ محقق طوسی نے "مصادرہ توازی خطوط کو ثابت کرنے کی کوشش دو مقامات پر کی ہے۔

اول:۔ تحریر اقلیدس، مقالہ اولی شکل ۲۸ کے بعد۔ اس کتاب کے زمانہ تک تقریباً پنجاب کے ہر شہر میں مل سکتے تھے۔

دوم:۔ "الرسالۃ الشافیۃ" میں جو دائرۃ المعارف حیدرآباد سے "رسائل طوسی" (جلد دوم) کے ضمن شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ الرسالۃ الشافیۃ میں محقق طوسی نے پہلے اپنے پیشروؤں (عباس بن سعید الجوہری، ابن الہیثم اور عمر خیام) کی اس باب میں کاوشوں کو نقل کیا ہے، اُن پر تنقید کی ہے اور پھر اپنا ثبوت بیان کیا ہے۔ ابہری کے ثبوت سے شاید وہ واقف نہ تھے ورنہ اُسے بھی بیان کرتے۔ [illegible] کے آخر میں اُن کی اور علم الدین قیصری کی اس مسئلہ پر خط و کتابت

شائع ہوئی ہے۔ لیکن کسی کے یہاں بھی نہ تو فضا کے غیر
اقلیدسی تصور کا ادنیٰ الہام ملتا ہے نہ اس مسئلہ کا کہ "مکان
کے ابعاد تین سے زیادہ ہو سکتے ہیں"۔ دونوں مسئلے عہد
حاضر کی پیداوار ہیں جن کا قدما کے یہاں تصور تک نہ تھا

۳۔ علامہ کا یہ دعوےٰ بھی ادعائے محض ہے کہ "طوسی نے
مکان کے مروجہ تصور کو ترک کرکے فضائے کثیر الابعاد ترک
نظریہ کی بنیاد رکھی"۔ کیونکہ محقق طوسی نے مکان کے تصور میں
جمہور فلاسفہ سے اختلاف ضرور کیا ہے لیکن

اولاً نہ تو انھیں (محقق طوسی کو) اپنے تصور مکان میں
انفرادیت یا اولیت کا شرف ہے۔ خود ان کے مستند اور
قابل اعتماد شارح جلی نے "شرح تجرید" میں لکھا ہے کہ "مکاں
کے بعد مجرد" ہونے کا تصور محقق طوسی سے پہلے افلاطون
کے علاوہ مسلمان فلاسفہ متکلمین میں سے ابو البرکات بغدادی
کا رہ چکا تھا۔

ثانیاً نہ "بعد مجرد" اور "فضائے کثیر الابعاد" کے
تصورات میں کوئی تعلق ہے کہ دونوں کے ڈانڈے ملائے
جا سکیں۔ اور

ثالثاً نہ محقق طوسی نے اقلیدس کے "مصادرہ توازی
خطوط" کا ثبوت دیکر کسی نہج سے بھی فضائے کثیر الابعاد
یا غیر اقلیدسی ہندسہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ وہ مسلمان فضلائے
علم ہندسہ ہی میں اس باب میں منفرد نہیں ہیں تو دنیا کے ان
ماہرین علم ہندسہ میں جنھوں نے اس مصادرہ کو ثابت کرنے
کی کوشش کی (ان حضرات کے ناموں کی تفصیلی فہرست پچھلے
صفحوں میں آ گئی ہے) اُن کی انفرادیت کا کیا مذکور — اپنی
دانست میں مصادرہ توازی خطوط ثابت کرنے سے کسی
فاضل کو "غیر اقلیدسی ہندسہ" یا "فضائے کثیر الابعاد" کے
تصور کا بادی و مفتتح ہونے کا شرف نہیں ملا۔ مزید تفصیل موجب
تطویل ہوگی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ اپنی افتاد طبع سے مجبور تھے
اُن کا شعور بہت زیادہ شدید تھا اور جب ایک مرتبہ
انھوں نے یہ طے کر لیا کہ اسلامی ثقافت کا اصل الاصول
مزعومہ "یونانیت بیزاری" میں مضمر ہے تو پھر دنیا کی کوئی
طاقت انھیں اس نظریہ کی تبسیط و تفصیل سے مانع نہیں
ہو سکتی تھی۔ وہ تاریخی حقائق قدم قدم پر اُن کی پرواز تخیل
کو رد کرنے کی کوشش کیا کرتے رہیں۔

محمد اکمل متعلم شبلی کالج آعظم گڑھ

"میر کا انداز"

؎ نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

یوں تو ہر بڑا استاد شاعر ایک خاص طرز و انداز کا مالک ہوتا ہے مگر انہیں سے کچھ ایسے بھی صاحب کمال شعرا ملتے ہیں جن کے فن و ہنر کے نمایاں خصوصیات نہ صرف اپنے ہی دور میں بلکہ مستقبل میں بھی اپنا اثر برقرار رکھتی ہیں۔ انہیں ایسے باکمال شاعروں میں سے میر تقی میر بھی ایک خاصہ حیثیت کے مالک تھے، اُن کی شاعری کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا بلکہ ہر دور کے بڑے بڑے شاعروں اور استادوں نے اُن کے فن کی داد دی اور سراہا ہے۔ انداز بیاں اور اُن کی خصوصیت کو سراہتے ہوئے غزلوں کے بادشاہ ناسخ فرماتے ہیں:-

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

مرزا اسد اللہ خاں غالب اپنے زمانے کے غزلوں کے استاد سمجھے جاتے تھے لیکن انھوں نے بھی میر کی استادی اور لڑکپن کا اعتراف کیا ہے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

چنانچہ اکبر الہ آبادی سے بھی خاموش نہیں رہا جاتا۔ میر کے لڑکپن اور انداز بیان کو سامنے رکھتے ہوئے خود کو احساس کمتری کا شکار بن جاتے ہیں۔

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر

ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

استادوں کے ان خیالوں سے نہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ سبھوں نے میر کی شاعری کے معیاری ہونے کا اظہار کیا ہے بلکہ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ میر اپنے زمانہ کے ایک مسلم

استادی کی حیثیت کے مالک تھے۔

خلوص و صداقت میر کے انداز کی سب سے بڑی خصوصیت
ہے چونکہ شاعری واردات قلبی کی سچی ترجمانی کرتی ہے اور
زندگی کی صداقتوں کی سچی تصویر ہوتی ہے انھوں نے زندگی
کے واقعات کو جس طرح محسوس کیا ٹھیک اسی طرح عوام
کے سامنے پیش کیا۔ اور حقیقت ہے کہ شاعری یا کوئی
بھی چیز جو دل کی آئینہ دار ہوتی ہے مقبول ہوتی ہے شاعری
کے ذریعہ شاعروں کی زندگی کے اصولوں کا صحیح اندازہ ہو
جاتا ہے کیونکہ یہ صحیح ہے کہ شاعر جیسی طبیعت کا ہوتا ہے
اس کی شاعری سے کوئی بھی چیز چھپی نہیں رہتی میر صاحب
نے اپنی شاعری کو بلند تر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے میر شعر کہنا ہے کیا کمال انساں
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آگیا تھا

میر نے ایسے خوبصورت انداز سے اپنی شاعری کو عوام کے سامنے
پیش کیا ہے جو کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوا فرماتے
ہیں کہ انسان کے لیے شعر کہنا کوئی بڑی اہم بات نہیں ہے
جہاں تک میرا سوال ہے کہ میرے دل میں ایک خیال سا
پیدا ہو گیا تھا لہذا میں نے اسے اپنا لیا۔ گو کہ شاعری میں
اتنا کمال ضرور ہے کہ اگر صداقت و سچائی کے ساتھ عوام
کے سامنے پیش کی جائے تو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔
خصوصاً یہ کرشمہ ہے میر کے کلام میں بے انتہا سوز و اثر
موجود [illegible] میر ایک قسم کی قطعیت [illegible]
[illegible] لفظوں
[illegible] کا صحیح صحیح اظہار
[illegible] ہے۔ پیرایہ سادہ الفاظ ہی میں بے تکلف طور پر اپنے
جذبۂ دل کا اظہار کر جاتے ہیں۔

میر صاحب نے اپنی شاعری کے فارسی کے الفاظوں،
اور ترکیبوں کا جا بجا استعمال کرنا ہے جو آج کے دور میں
مقبول نہیں سمجھا جاتا مگر سچ تو یہ ہے کہ فارسی کے بغیر اردو
شاعری کا میدان کورے پن کی حیثیت رکھتا ہے میر صاحب
اُس زمانہ میں شاعری کرتے تھے کہ سارے جہاں میں فارسیت
کا دور دورہ تھا تو اس سے بالکل الگ ہو کر شاعری کرنا نا
کامیابی کی ہی صورت تھی اگرچہ فارسی سے انھوں نے بہت
کم آگے قدم رکھا ہے لیکن عوام کے رجحان کو مدنظر رکھتے
ہوئے ایسا کرنا ایک جرم تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ فارسیت
کا معمولی سا اثر ہی اُن کی شاعری اور انداز کے کامیاب
بنانے میں سرفہرست کی حیثیت رکھتا ہے۔

انداز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی شاعری کا
لب و لہجہ ایسا ہے جو عام انسانوں کے لیے مرغوب طبع ہے
یعنی جس طرح موضوع عام انسانی جذبات کو متاثر کرنے
والے ہیں اسی طرح طریق اظہار بھی ایسا ہے کہ جس کی وجہ
سے ہر خاص و عام اُن کے اشعار کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں
میر کے یہاں ایسا کوئی اشعار نہیں ملتا جو کسی خاص طبقے کے
لیے لکھا گیا ہو یہی وجہ ہے کہ میر نے ایسے ہی مضامین پیش
کئے ہیں جس کو عام لوگ پسند کرتے ہوں اور یہی انداز ان کی
کامیابی کا ذریعہ بن سکا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو اعلیٰ
علمی طبقے کو مرعوب کرنے کے تکلفاً علمی شان پیدا کرنے کی
کوشش سے قطعی دور رکھا ہے کیونکہ میر کو یہ قطعی پسند
نہیں تھا کہ شاعری صرف کسی خاص طبقے ہی میں رہ جائے
وہ اپنی شاعری کو عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔

گو کہ اُن کی شاعری صناعتی نقطۂ نظر کے اعتبار سے گری سمجھی جاتی ہے مگر ایسا ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کو شاعری سے نظر انداز نہیں کیا۔ اس میدان میں غالب کبھی کبھی میر سے آگے بھی ہو جاتے ہیں کیوں کہ اُن کی شاعری میں یہ نقطہ کافی اثر انداز ہے اور بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔

میر کے کلام میں باتوں کا سا انداز پایا جاتا ہے ایسی بات کو مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں میر صاحب کی زبان سستہ کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں، محاورے کا رنگ دیکر باتوں باتوں میں ادا کر جاتے ہیں۔ اشعار ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی چاہنے والا اپنے چہیتے عزیز سے باتیں کر رہا ہے" کلام میں جا بجا میاں، پیارے ارے اور صاحب کا استعمال نظر آتا ہے اور آپ کی جگہ تم اور تم کی جگہ تو کا بھی استعمال ملتا ہے جس کی وجہ سے رشتہ داروں کو بے تکلف اپنا لے جانا ہوگا۔ اس کے علاوہ اُن کی یہ بھی خاصیت رہی ہے کہ لکھنے سے زیادہ کہنے کے قائل تھے اسی سے انھوں نے گفتگو کا سا رویہ اختیار کیا ہے گفتگو کی زبان کو بھی ایک حد تک محدود رکھتے ہیں یہ نہیں کہ حدود کو پار کر کے پھکڑ زبان میں مبتلا ہو کر خوبصورتی کو ختم کر دے جملے ہلکے پھلکے متحرک اور لچکدار ملتے ہیں جو سامع کو جلد متاثر کر لیتے ہیں۔

میر کو خطابیہ انداز بہت پسند تھا مراد یہ کہ وہ اپنے اشعار میں عموماً کسی نہ کسی سے مخاطب ہونے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے سامع کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ خود میر صاحب سے ہم کلام ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ میر اشعار میں وہ خود کو مخاطب کرتے ہوں بلکہ ہم دم و ہم نشیں یا پردہ دانے سے خطاب کیا کرتے ہیں اُن کا یہ طریقہ اکثر جگہوں پر قاری و سامع دونوں کے لیے باعث لطف ہوتا ہے ایک مثال ملاحظہ ہو:-

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

ندرت ادا کے ساتھ ساتھ میر کے کلام میں طنز بھی جا بجا پایا جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ میر کے طنز بڑے لطیف ہوتے ہیں اور اُن کی سطح اور معنویت عموماً بلند اور غیر معمولی ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ وہ معمولی سے معمولی مضامین میں طرفگی اور تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ شعر [illegible] ملاحظہ ہو۔

آب حیات وہی نا جس پر خضر و سکندر مرتے تھے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی

اس شعر میں خضر اور سکندر کی سادگی پر کتنے اچھے انداز میں چوٹ کیا ہے اسی طرح ایک اور شعر ملاحظہ ہو

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

میر کے کلام میں لطف تضاد (PERSONIFICATIO[illegible]) [illegible] و بیشتر جگہوں پر پایا جاتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کسی بے جان چیز کو جاندار بلکہ ناطق بنا کر پیش کرنا۔ میر کے کلام میں کثرت سے ملتا ہے جیسے

یاقوت کوئی اس کو کہے ہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی نہ یہ بات ٹھہر جائے

اُنھوں نے سادہ تشبیہوں کا استعمال بہت کم کیا ہے اُن کو کائنات کی حقیر اشیاء سے خاص دلچسپی تھی ویسے اُنکو مایوسیت کے شکار ہیں مبتلا کہنا بے جا نہ ہوگا کیونکہ اُن کے اشعار دن ہی سے واضح ہوتا ہے۔

شام ہی سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اُردو زبان کے مصلحین میں میر تقی میر کا نام سر فہرست لیا جاتا ہے کیوں کہ انھوں نے بڑی ذمہ داری سے اس کام کو انجام دیا ہے اُردو زبان کو مہذب، شستہ اور شگفتہ بنانے میں انھوں نے پوری کوشش کی ہے کلام میں فصاحت کا اندازہ پایا جاتا ہے انھوں نے شیرین لفظوں کو تلاش کرکے استعمال کیا ہے چاہے وہ ہندی کے کیوں نہ ہوں ویسے فارسی ترکیبوں سے انھوں نے بہت سا کام لیکر اچھی کامیابی حاصل کی ہے ایسا الفاظ استعمال کیا ہے جس میں شیرینی کے ساتھ ساتھ معنویت بھی ہو یہی وجہ ہے کہ انھوں نے چھوٹے سے چھوٹے اشعار میں ایسا لفظ استعمال کرکے بہت ہی فصیح مطلب لیا ہے ـــ الفاظوں کا استعمال اس انداز سے کرتے ہیں کہ خوبصورتی میں کسی طرح سے کمی نہیں آتی جیسے

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر ایک بے حضور تھا

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے اس طرح سے پیش کیا ہے۔

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منھ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ان دونوں کا اگر چہ موازنہ کیا جائے تو میر کا ہی شعر افضل معلوم ہوگا کیوں کہ اُن کے شعر میں سادگی اور حقیقت نمایاں ہے لفظ بھی ایسا استعمال کیا ہے جس سے خوبصورتی برقرار رہتی ہے لیکن درد کے شعر میں مبالغہ کی خوبی موجود ہے

میر نے اپنے کلام میں موسیقیت کو بہر حال برقرار رکھا ہے، موسیقیت اور ترنم ہی کے ذریعہ میر کے کلام میں ایک خاص لطف پایا جاتا ہے اُن کی بڑی بحر والی غزلیں بڑی پر لطف ہیں اور چھوٹی بحر والی غزلیں جذبے کی شدت کا اظہار کرتی ہیں، ویسے دونوں غزلوں میں مضمون کے اعتبار سے کسی طرح کمی نہیں آنے پاتی ہے جیسے بڑی بحر کی ایک مثال دیکھئے کہیں سے کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ اور کافی پر لطف معلوم ہوتی ہے۔

الٹی ہو گئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

انکی چھوٹی بحر والی غزلوں میں بڑا گہرا مطلب چھپا رہتا ہے بہت بڑے مضمون اور بات کو وہ چھوٹے سے لفظوں میں اس طرح پیش کر جاتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے جیسے یہ شعر ملاحظہ ہو ـــ

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہب عشق اختیار کیا

میر کے یہاں تکرار الفاظ کا بھی پوری طرح سے رواج ہے انھوں نے اس طریقہ کو کافی پسند کیا ہے اور استعمال کر کے لطف پیدا کیا ہے۔ مثلاً ایک شعر ملاحظہ ہو ـــ

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا

بہ حیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر کا انداز بیان کچھ اور ہی تھا جس کی خواہش و تمنا ہر غزل گو شعرا نے اپنے ذہن میں رکھی۔ اس سے اختلاف نہیں کہ کہیں کہیں پر مرزا غالب ان سے اونچا شعر کہہ ڈالے ہیں لیکن جو انداز میر کا تھا کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ میر کا کلام اپنی رنگا رنگینیوں کی وجہ سے بڑی وسعت اور غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میر کو شہنشاہ غزل کا خطاب ملا ہے۔

کی نشاندہی کی ہے۔

اسلامی فن تعمیر اگرچہ اپنی خصوصیات کی وجہ سے مخلوط تھی پھر بھی یہ طرز تعمیر زیادہ دلکش، مزین، منقش، مرصع اور نزاکت اور چمک دمک سے پُر تھی۔ اُن کی تعمیرات زمانہ قبل اسلام کی تعمیرات سے کہیں زیادہ پائیدار اور بلند تھی جس میں اسلامی تہذیب اور مسجدوں کے فن تعمیر کو مرکزی حیثیت دی گئی تھی۔

ہندوستان پر اسلامی فن تعمیر کے اثرات کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہندوستانی تعمیرات کا پس منظر جاننا ضروری ہے۔ ہندوستانی تعمیرات اپنے پرانے فن اور ہندو تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں عربوں کے سامنے سانچی کا اسٹوپ اجنتا ایلورا کے غار۔ امراوتی کا بدھ مندر اور پرانے قلعے قدیم ہندوستان کی قدیم تاریخ کے ثبوت کے طور پر موجود تھیں۔ اس کے علاوہ اڑیسہ میں بھونیشور کے مندر۔ جودھ پور کے چندراوتی اور مدھیہ پردیش کے کھجراہو کے مندر اپنے اندر وہ تمام فنی صلاحیتیں اور اس سے متعلق ہندوستان کی بکھری ہوئی داستان اور واقعات اپنے اندر سموئے ہوئے تھے اُن کی بناوٹ اس وقت کے ذوق و جذبہ، مذہبی تقدس سماجی قدریں، معاشی خوشحالی کی پوری عکاسی ہوتی ہے اس کے بعد آٹھویں صدی میں کچھ مندر ایسے بھی تعمیر ہوئے جن پر مسلمانوں کی چھاپ نہ پڑ سکی تھی ان میں کیلاش مندر فنی نقطہ نظر سے زیادہ اہم ہے۔ یہ مندر کیلاش شیو کے نام سے موسوم ہے پورا مندر ایک پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا مندر کا نچلا حصہ ہاتھیوں اور شیروں کی مورتیوں سے اسقدر گھرا ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی اور شیر پورے مندر کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ پرانے قلعوں میں گوالیار، ارنگل، چتوڑ اور کھڑگاؤں کے قلعے مشہور تھے۔ تاج المعاصر کے مصنف نے جب گوالیار کا قلعہ دیکھا تو وہ خاص طور سے اس کی اونچی کرسی اور اونچائی سے متاثر ہوا۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ اتنا بلند ہے کہ طوفانی ہوائیں بھی اس کو نہیں چھو سکتیں امیر خسرو نے ارنگل کے قلعہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے کہ قلعے کی دیواریں نہایت ہی مضبوط ہیں قلعہ کی دیوار اگرچہ مٹی کی بنی ہے اور باہری دیوار پتھروں کی لیکن دونوں کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں علامہ ابوالفضل نے اسی قلعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اسکی اونچائی آسمان کو چھوتی ہے۔ چتوڑ کا قلعہ بھی پہاڑی پر واقع ہے جو کہ اپنی طرز تعمیر میں خود اپنی آپ مثال ہے۔ اسی طرح آسام میں کھڑگاؤں میں برہم پتر کے کنارے تعمیر کیا گیا تھا جس کے ایک طرف سے دریا بہتا ہے جس سے قلعہ کی حفاظت میں مدد ملتی ہے اُن سب ہی قلعوں میں رہائشی محلات تھے جن کی عمارتیں نہایت ہی خوبصورت نقش و نگار سے مرصع تھیں۔ مندرجہ بالا تفاصیل سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے قبل ہندوستان کا قدیم فن تعمیر نہایت ہی ترقی یافتہ تھا جس میں مزید ترقی کرنے کی تمام تر صلاحیتیں موجود تھیں۔

اسلامی فن تعمیر میں سادگی، کشادگی، صفائی، مضبوطی بڑے بڑے ہال، برآمدے، اونچے مینار، گنبد، محراب، مخروطی گنبد، [illegible] دالانوں میں کھمبوں کا استعمال خاص اہمیت کی حامل تھی ان عمارتوں میں مرکزی حصہ دوسرے حصوں کے مقابلہ میں اونچا ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دونوں طرف کے عمارتی حصہ متوازن اور مماثل ہوتے تھے۔ عمارتوں کی کرسی اونچی ہوتی۔ اگرچہ

عربوں نے شروع شروع میں اُونچی کرسی کا استعمال ریت سے بچنے اور مضبوطی کو قائم رکھنے کے لیے کیا تھا لیکن بعد میں کرسی کا اُونچا ہونا تعمیر کا جز اور پوری عمارت کی شان و شوکت کو دوبالا کرنے کا ذریعہ تصور کیا جانے لگا۔

اسلامی فن تعمیر کی جملہ خصوصیات نے ہندوستانی تعمیری ذوق کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اور یہاں کی فنکارانہ صلاحیتیں اس کی طرف خود بخود کھنچتی چلی گئیں۔

مسلمان بھی ہندوستان کے قدیم فن تعمیر سے کچھ کم متاثر نہ تھے انھوں نے اسے اپنانے کی خاطر اس فن تعمیر کا گہرائی سے مطالعہ کرنا شروع کیا۔ چونکہ مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نگاہ سے مورتیوں کا بنانا ناجائز تھا اور دیواروں پر تصویر استعمال حرام قرار دیا گیا تھا اس لیے مسلمانوں نے اپنی تعمیرات کو زیادہ منقش، دلکش اور جاذب نظر بنانے کے لیے نقاشی اور مصوری کا سہارا لیا۔ دوسری طرف ہندوستانی ماہرین تعمیرات نے اپنی عمارتوں میں سادگی۔ صفائی اور کشادگی کو اپنانا شروع کیا جو کہ عربوں کی طرز تحریر کی خصوصیت تھی کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان کی عمارتوں میں محرابوں، گنبدوں میناروں، اونچی کرسی اور دوہری دیواروں کا استعمال عام طور پر ہونے لگا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے اثرات بڑی تیزی کے ساتھ بارہویں صدی میں رونما ہونے شروع ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ تیرہویں صدی میں جن عمارتوں کی تعمیر ہوئی انہیں ہند و مسلمانوں کے مشترکہ ذوق کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ان عمارتوں میں علاقائی فنی صلاحیتوں کی آمیزش، آب و ہوا کی رعنا [illegible] سماجی قدروں اور مذہبی روایات کی عکاسی۔ پرانے روایات اور تقدس کی جھلک ضرور اثر انداز ہوتی تھی جو کہ علاقائی فن تعمیر کے نام سے تعبیر کی جاتی یہی وجہ ہے کہ پرانی تعمیرات اور ۱۲ ویں صدی کے بعد کے جین مندروں کی تعمیرات میں نمایاں فرق موجود ہے۔ اس سے پہلے ہندو آرٹ میں کشادگی نہ ہوتی تھی۔ خاص طور سے مندروں کی تعمیر میں اس طرح کی گنجائش بالکل نہ تھی۔ مندروں کی تعمیرات میں بہت زیادہ دروازوں۔ کھڑکیوں، اور کھمبوں کا استعمال کیا جاتا تھا جن پر اندر اور باہر کھدائی کر کے یا ابھری شکل میں مورتیاں بنائی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ اور زیادہ دلکش بنانے کے لیے ان مورتیوں کے ساتھ بیل بوٹے اور نقش و نگار کا استعمال کیا جاتا تھا مندر کو دیوی دیوتاؤں سے پُر کر دیا جاتا تھا اور بے چارہ پجاری بمشکل اندر کھڑا ہو کر اپنے سنسکار پورے کر پاتا۔ مسجدوں کو دیکھنے کے بعد ہندو آرٹ میں بھی کشادگی آئی۔ مندر کے باہری حصے اور کھمبے سادے ہونے لگے۔ نقش و نگار کا استعمال کم کر دیا گیا اور زیادہ مورتیاں رکھنے سے بھی پرہیز کیا جانے لگا۔ مندر کا اندرونی حصہ اب پہلے سے زیادہ کشادہ ہوتا اور ایک ساتھ کئی کئی پجاریوں کے بیٹھنے کے کھڑے ہونے کی گنجائش نکالی گئی مسلمانوں کے یہاں مسجد سے متصل حجروں کا قیام تعمیر کا جز بن گیا تھا جس کا اثر ہندوستان میں یہ لیا گیا کہ مندروں کے ساتھ رہائشی عمارتوں کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ پجاری و خدمت گار ہر وقت مندر کے قریب رہ سکیں۔

ہندوستان میں مملوک، خلجی اور تغلق نے اپنے دور حکومت میں بہت سے قلعوں، محلات اور عمارتوں کا اضافہ کیا ـــــ

خاص طور سے ان عمارتوں کا مرکز دہلی تھا۔ مسلمانوں نے
اس دور میں جتنے بھی قلعے تعمیر کرائے اُن میں دوہری دیواروں
کا استعمال کیا گیا تھا اور قلعہ کے چاروں طرف اونچی اونچی
دوہری فصلیں بھی قائم کی گئیں جو کہ مسلمان عربوں کے اثرات
کا نتیجہ تھیں۔

۱۴ ویں صدی میں مسلمان صوفی شمالی ہندوستان
سے دیوگیر (جنوبی ہندوستان) تشریف لائے انھوں نے
یہاں کے پرانے قلعے کے سامنے اپنے رہائشی مکانات ۔
گنبد والی مسجدیں، خانقاہ تعمیر کیں جو کہ جنوبی ہندوستان میں
(مالابار کو چھوڑ کر) مسلم فن تعمیر کی شروعات کی جا سکتی ہے
۱۳۲۷ء میں جب محمد تغلق نے دیوگیر (دولت آباد)
[illegible] نیا دارالسلطنت قرار دیا تو اُس نے اپنے وزراء ۔
[illegible] امراء رؤسا ۔ اور فنکاروں کو حکم دیا کہ دلی
چھوڑ کر دولت آباد جائیں اور وہاں اپنے رہائشی محلات ۔
[illegible] حکومت کے خرچ پر تعمیر کروائیں ۔ محمد تغلق نے
خود اپنا محل تعمیر کروایا اور یہاں کے پرانے قلعہ کی مرمت
کرائی اور اس میں کچھ اضافہ بھی کئے ۔ دھیرے دھیرے
یہ قصبہ سا قطعہ ایک خوش نما شہر میں تبدیل ہو گیا چونکہ
یہاں کی عمارتیں جو دسویں صدی میں تعمیر ہوئیں تھیں اس لیے
ان ہندو مسلم مشترکہ کلچر کی صاف جھلک ۔ نمایاں ہے یہاں
یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم آرٹ ہندوستان میں آنے
سے پہلے تجاری سلجوقی، ایرانی اور وسطی ایشیا ر ممالک
کے فن تعمیر سے متاثر ہو چکا تھا اس لیے اس میں خالص مسلم
کلچر کی جھلک ۔ نہ پائی جاتی تھی ۔ ساتھ ہی ساتھ ہندوستان
کی علاقائی فنی صلاحیتوں نے بھی اسے متاثر کر کے کچھ سے
کچھ بنا دیا۔ جو کہ ہندو مسلمان فنی صلاحیتوں کا مجموعہ کہا جاتا
ہے۔ اس آمیزش سے یہ ضرور ہوا کہ اس آرٹ میں جدیدیت
اور پائیداری خاص طور پر اُجاگر ہوئیں۔ یا یوں کہا جا [illegible]
کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں [illegible] جب دولت [illegible]
اپنی خواہشات کی تکمیل اور سماجی مزدوروں کو [illegible]
[illegible] تعمیر اور ہندوستانی [illegible]
ایک نئے آرٹ کو جنم دیا جس سے آنے والی [illegible]
کی تعمیروں میں مرکزی کردار ادا کیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے جو مذہبی عمارتیں [illegible]
اس اسلامی روایات کو تو ضرور قائم رکھا لیکن غیر مذہبی
عمارتوں میں انھوں نے ہندوستانی آرٹ اور فن تعمیر کو
بہ آسانی قبول کیا یہاں ایک خاص بات قابل تحریر
یہ ہے کہ یہ عمارتوں کو مجموعی شکل عطا کرنے کے لیے باشندے
ہوتے تھے اس سے ان کے فکر و تخیل، ذہانت اور تجربہ کا
دخل فطرتاً ان عمارتوں میں ہوتا تھا چونکہ اسلام میں مورتیوں
یا جاندار کی شکل بنانا حرام قرار دیا گیا تھا اس لیے مسلمانوں
اس کی جگہ قدرتی مناظر، پھول پتی، بیل بوٹے بنا کر اپنی
خواہشات کی تکمیل کی، تو ان آیتوں کو خوبصورت [illegible]
شکل میں عمارتوں پر لکھا گیا جس نے فن تعمیر کو [illegible] زیادہ جلا
دی۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے پہلی بار [illegible] کے ذریعہ
چھتیں بنانے کا فن کا احیاء کیا اور سادے اونچے کھمبے اونچے
اُونچے مینار، بڑے بڑے دالان اور بکر خی گنبدوں سے
عمارتوں کی شان و شوکت میں اضافہ کیا۔ یہ مسلمان ہی تھے
جنھوں نے پہلی بار اُن مقامات پر جہاں تیز بارش ہوتی ۔

توں کھپریلوں کا استعمال کیا۔
مسلمانوں کے دوش بدوش کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ
روؤں نے بھی ان تبدیلیوں کو قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنے
ردوں میں نوکدار اور نیچے گنبدوں کا استعمال کم کر دیا۔
وازے اور کھڑکیوں کے بہت زیادہ استعمال سے پرہیز
یا اور بیل بوٹے اور مورتیوں سے پُر کھمبوں کی جگہ سادے
ر اونچے کھمبے استعمال کئے گئے۔

کسی فن کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ سماج اور سوسائٹی کی ضرورتیں بڑھ چکی ہیں، رہنے سہنے کا معیار بلند ہو۔ اجتماعی و انفرادی ذہن کو دنیاوی نقطۂ نگاہ سے دوسری چیزیں سوچنے دیکھنے کا خاطرخواہ مواقع فراہم ہوں ساتھ ہی ساتھ لوگوں کے اذہان نئی نئی چیزوں کو قبول کرنے کے عادی ہو چکے ہوں۔ اس طرح کا ماحول مسلمانوں کے ہندوستان میں تعمیری شمولیات کی وجہ سے ہندوستان میں پیدا ہو چکا تھا۔ ہندو مسلمان اپنی اپنی تعمیرات میں ایک دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان فنکاروں کی حکومت وقت کی سرپرستی سے اور زیادہ ہمت افزائی ہوئی یہ فن اور زیادہ ترقی یافتہ اور پائیدار ہو کر ابھرا شہنشاہوں اور ۔۔ موں نے یہ صرف رہائشی مکانات بلکہ صحت عامہ کا خیال کرتے ہوئے بازار، سڑکوں۔ پختہ نالایوں اور پارکوں کے قیام پر بھی توجہ دی۔ نتیجہ کے طور پر خوشنما باغوں کے قیام کا خیال سامنے آیا اور بہت سے باغات تنعوں سے مستقل حکومت کے خرچ پر لگائے گئے۔ ایک مشہور سیاح البیرونی نے ہندوستان کے فن تعمیر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب مسلمان عربوں نے ہندوستان میں پختہ تالاب اور اس کے کنارے خوبصورت مندروں کو دیکھا تو وہ اس فن تعمیر سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان عمارتوں کے علاوہ قلعوں کے اندر جو رہائش محلات و عمارتیں قائم کی گئیں تھیں اُن کے ساتھ ساتھ نہروں باغیچوں فواروں کا قیام اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس دور میں ہندوستان کا فن تعمیر انتہائی ترقی یافتہ تھا۔ جس میں ہندو مسلمان کی مشترکہ جدوجہد کی آمیزش تھی اور ان دونوں قوموں نے مل جل کر ایک ایسے تعمیری فن کی بنیاد ڈالی جو کہ آئندہ آنے والے زمانے کے لیے سنگ میل اور نمونہ کا کردار ادا کرتا رہا۔

صابر سنبھلی ایم اے

بہکی اور مومن — تغزل

(گزشتہ سے پیوستہ)

مومن کہتے ہیں:

آگ اشک گرم کو لگے جی کیا ہی جل گیا
آنسو جو اس نے پونچھے شب اور ہاتھ جل گیا

شور کیا نے کیا کیا ہے مزہ جیسلہ دل کو
گرمی خوں نے لب شمشیر پر بتخانہ تھا

سینۂ آتش تفیدہ کو میں کیا روؤں
شعلہ جانب گردوں آپ کے مائل نہ ہوا

اب تک یہ سوز دل ہے کہ میرے مزار پر
مائل ہوا زمین کی جانب دہان شمع

یاد آئی کافروں کو مری آہ سرد کی
کیونکر نہ کانپنے لگے شعلہ جحیم کا

اے پردہ نشیں چلون اٹھا دے کہ نہ جل جائے
کرتا ہوا ہوں میں سوز غم ہجراں کی شکایت

آہ سحر فلک سے ہماری پھری نہ ہو
کیسی ہوا چلی کہ یہ جی سنسنا گیا

آبلے کیونکر نہ نکلیں جائے اشک آنکھوں سے آہ
میرے پہلو میں ابھی وہ آگ کا پرکالہ تھا

صفحہ جبیوں پر جو کبھی ہم سوزش دل لکھواتے ہیں
سارے حباب لب دریا بتخانے بنتے جاتے ہیں

آزار کوئی بھی ہو انسانی جسم کو کمزور و ناتواں تو ضرور کر دیتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ لاغری کو معدوم کا مرادف کہا جا سکے البتہ عشق کا آزار اگر شاعر کو لگ جائے یا دوسری صورت یہ کہ بغیر آزار کے ہی وہ خود کو ہی عشق زدہ ظاہر کرے تو اس کا جسم اتنا نحیف اور لاغر ہو سکتا ہے کہ تنفس کی آمد و شد کے ساتھ ہندوسے پر جھولنے لگے۔ اگر شاعر خود عاشق نہیں ہے بلکہ

وہ کسی دوسرے کے ہجر کے آزار کو بیان کرنے پر اتر آئے تب بھی یہی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ بہاری کی ہیروئن کی حالت دیکھیے :۔

۱۔ کبھی ادھر چلی آتی ہے کبھی اُدھر چلی جاتی ہے غرضکہ سانس کی آمد و شد کے ساتھ ہنڈولے پر جھولتی ہے چھ سات ہاتھ آگے پیچھے ہو جاتی ہے۔

۲۔ دلولہ ہیرو کو خبردار کرتی ہے کہ اے جوان یہ حسین ہیروئن تمہارے ہجر میں لمحہ بہ لمحہ لاغر ہوتی جا رہی ہے کہیں وہ کافور کے صفوف کی طرح ایک روز اُڑ کر غائب ہی نہ ہو جائے

مومنؔ خود عاشق ہیں اور کامل طور پر ہجر زدہ۔ دیکھیے وہ اپنی لاغری کا بیان کس طرح کرتے ہیں۔

تن کا ہیدہ سے اپنے میں خوش ہوں اس موقع پر
کہ اک دن آئے تیرے صرف عشرت خانہ خس میں

مومنؔ تنکے کی طرح لاغر ہو جانے پر بڑی وجہ خوش ہیں کہ ایک روز وہ محبوب کی خس کی ٹٹی میں بند ہو جائیں گے۔ لاغری کے مضمون کے ساتھ محبوب کی قربت کا تصور شعر کے لطف کو دوبالا کر رہا ہے۔ اور دیکھیے :۔

کھا گیا جی غمِ نہاں افسوس
گھل گئی غم کے مارے جاں افسوس

آب و ہوائے ملکِ محبت راس نہیں ہے ہم کو تو
ہو گئے ہیں لاغر اور زیادہ جتنا غم ہم کھاتے ہیں

اس موضوع پر بہاری کے مضمون کی مطابقت بھی ملاحظہ ہو۔

ہم رنگ لاغری سے ہوں گل کی شمیم کا
طوفان یاد ہے مجھے جھونکا شمیم کا

لے اڑی لاشہ ہے ا لاغر بس تن ہو گیا
ذرہ ریگ بیاباں اپنا مدفن ہو گیا

جوں نکہتِ گل جنبش ہے جی کا نکل جانا
اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا

لاغری کے مضمون میں نازک خیالی کی انتہا۔

یہ ناتواں ہوں کہ ہوں اور نظر نہیں آتا
مرا بھی حال ہوا تیری ہی کمر کا سا

ایک شعر اور

پاؤں زنداں سے اُٹھے کیا سر اٹھا سکتے نہیں
حلقۂ زنجیر آخر طوقِ گردن ہو گیا

تپ کی حالت میں عجیب عجیب گل کھلتے ہیں تپ ہجر کی شدت سے عاشق کی جو حالت ہوتی ہے اس پر دونوں استادوں کے تخیل کی پرواز کے چیدہ چیدہ نمونہ پیش کئے جا چکے ہیں۔ تپ ہجر کا ایک نتیجہ اور بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ فرقتِ محبوب کی گرمی کے سبب سینہ تو آگ کی بھٹی بن جاتا ہے۔ لیکن غمِ جاناں میں آنکھوں سے اشکوں کے دریا جاری رہتے ہیں۔ آگ اور پانی کے اتصال میں کبھی اشکوں کا سیلاب (سیل اشک کے زیادہ شدید ہونے پر) سینہ کی آگ کو بجھا دیتا ہے تو کبھی (اگر سینے کی گرمی غالب ہو تو) اشک سینہ پر گر کر بخارات میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس مضمون کو باندھتے وقت بھی دونوں شاعروں نے اپنے سمندِ تخیل کی باگیں اٹھا دیں ہیں حسب سابق پہلے بہاری :۔

۱۔ اے رفیقہ میری آنکھیں آٹھوں پہر (شب و روز) جو جلتی اور بہتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراقِ محبوب نے بجلی کے ساتھ ساتھ بادل کو بھی ان میں سمو دیا ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بجلی کے اثر سے آنکھیں سوزاں ہیں۔ اور بادلوں کے اثر سے اشکوں سے لبریز ہیں۔ گویا آگ اور پانی کا ساتھ ہے۔

نمبر ۲ اے محبوب (تمہارے فراق کی سخت اذیت کے سبب) ہیروئن کے بہتے ہوئے آنسو آنکھوں کے پپوٹوں سے ظاہر ہوکر پلکوں سے آگے بڑھ کر (مسلسل بہاؤ کے سبب) رخساروں پر بھی نہ ٹھہر کر ایک لمحے کے لیے (اس کے تپتے ہوئے) سینے پر چھنا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ یعنی چھلکتے ہوئے سینہ پر گر کر گرمی کے سبب (آنسو) بخارات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

مومن نے اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے۔

دھواں اٹھتا ہے دل سے وقت گریہ
بجھا دی تو نے کیا اے چشم تر آگ

سوز دل کے ہاتھ سے ڈھونڈوں جو امن آگ میں
ہو وے سر بسر قطرہ داغ افزائے گلخن آب میں

پانی کے بدلے برسے گی آج آگ ابر سے
اٹھتے ہماری خاک سے بھی کچھ بخار ہی

حدت کی یہ شدت کبھی کبھی عاشق کے ایک اور شغل میں بھی دخیل ہوتی ہے۔ وہ شغل ہے محبوب کے ساتھ کی گئی خط و کتابت۔ عاشق کے دل کی تپش یہاں بھی اپنا کام کرتی ہے۔ کبھی تو شدت تپش کے سبب خط ہی جل جاتا ہے کبھی یہ ہوتا ہے کہ مکتوب کی تحریر سے ہی مکتوب الیہ عاشق کے دل کی گرمی کا اندازہ کر لیتا ہے

عالم شاعری میں عاشق کی طرف سے محبوب کو نامہ رقم کرنے کی رسم قدیم ہے۔ ہر خط میں عاشق نے دل کی جلن ... ضروری نہیں ... بہت گرم مزاج عشاق کے ساتھ ہی ہوتا ہے ... ہر عاشق تحریر کرتا ہے۔ بہاری اور مومن نے خطوط نویسی کے مضمون میں قابل ذکر ہیں یہاں پر دونوں کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ خط میں حدت قلب کا نمودار ہونے والا اثر بھی بعض فن پاروں میں نظر آئے گا۔ بہاری کہتے ہیں

نمبر ۱ کاغذ پر تو دل کا حال رقم نہیں ہوتا اور قاصد کے ہاتھ پیغام بھیجتے حیا آتی ہے اس لیے (اب تو بس یہی طریقہ ہے کہ) تیرا حال ہی میرے دل کی باتوں کو ظاہر کر دے گا یعنی ہیروئن کے دل کا حال خود بخود ہیرو پر آشکار ہو جائے گا

نمبر ۲ ایک طرف تو ہیروئن نے درد رقت کے زیر اثر بغیر لکھا نامہ ہیرو کو ارسال کر دیا۔ دوسری طرف ہیرو نے خوش طبعی کے ساتھ اُس بغیر لکھے خط کو ہی پڑھ لیا۔

نمبر ۳ ہیرو نے ہجر کے عذاب میں مبتلا ہو کر نیچے سے (آتش ہجر کے سبب) جلے ہوئے اور اوپر سے (سیل اشک کے سبب گلے ہوئے سرمہ آمیز آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہیروئن کے بغیر لکھے مکتوب کو ہی پڑھ لیا۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ بہاری نے جو مضامین کہے ہیں خاص طور سے دوہا نمبر ۲ اور نمبر ۳ میں اُن کا جواب ہونا مشکل ہے۔ مگر مومن نے اس مضمون کو دوسرے انداز سے باندھا ہے جو قاری یا سامع سے داد لیے بغیر نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو:

نامہ بر دے نہیں لکھا تو یہ بھیگا کاغذ
کہ بہتا ہم گہر صفحہ دریا کاغذ

خط میں تو لکھ سکتا نہیں احوال سوز دل سے
پر بھیجوں جی میں ہے پروانے کے پر سے باندھ کر

لگے آگ آتش غم کو زبان قامہ شعلہ ہے
جلا دیتے ہیں سو سو خط دم تحریر اکثر ہم

؎ صفحۂ جیحوں پر جو کبھی ہم سوزشِ دل لکھتے ہیں
سالے حباب لب دریا تک بہتے جاتے ہیں

؎ اُس نے نامہ لکھا نصیب غیر سے
نامہ بر کیا پھرا نصیب پھرے

؎ از بسکہ ثبت نامہ ہے سوز تپِ دردِ دل
قاصد کا ہاتھ ہے ید بیضا کلیم کا

؎ دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہے کاش
وہ ہی خط اُس نے بھیج دیا ہوں جواب میں

؎ راز نہاں زبان اغیار تک نہ پہونچا
کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک پہونچا

؎ کس طرح معلوم ہو حال دل گم گشتہ ہائے
جو کبوتر لے گیا واں نامہ عنقا ہو گیا

؎ کس قدر تیز رو ہے سوئے صنم
نامہ بر میرا جبرئیل ہوا

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے عاشق کی آنکھیں شب فراق انتظارِ محبوب میں نیند سے نا آشنا رہتی ہیں۔ لیکن اگر کبھی اس کو نیند آ جائے تو بھی عشق کی کرشمہ سازیاں اُسکو چین نہیں لینے دیتیں۔ آنکھ لگتے ہی وہ خواب دیکھتا ہے جو شاذ طبیعت کے مطابق اور زیادہ تر طبیعت کے خلاف ناگوار اور ڈراؤنے ہوتے ہیں۔ وہ معشوق کو غیر سے ملتے یا خود پر ستم کرتے دیکھتا ہے۔ اور اگر خواب میں اُسے کسی وقت محبوب کا التفات میسر بھی آئے تو وہ عارضی ہوتا ہے جس سے اضطراب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر خواب میں اُسے محبوب [illegible] وصل نصیب بھی ہو جاتا ہے۔ اور آنکھ بھی جلدی نہ کھلے تو [illegible] [illegible] [illegible] وہ بے چین کرتی ہے۔

غرضکہ عاشق کا [illegible] اور جاگنا [illegible] کلفت کا باعث ہیں۔ شعرا نے اس مضمون کو نوع بنوع انداز سے بیان کیا ہے بہاری اس مضمون کو بیان کرتے ہیں۔

لہ ہیروئن کہتی ہے کہ اے [illegible] جاگنے پر تو میں ویسے ہی کو [illegible] بند اور زنجیر لگی ہوئی دیکھتی ہوں [illegible] سونے سے قبل [illegible] لیلیٰ کون جانے [illegible] (حالت خواب میں) کس طرح سے آتا ہے اور [illegible] [illegible] جاتا ہے

لہ ہیروئن کہتی ہے کہ اے [illegible] وقت خواب میں گھنشیام (کرشن جی) اختلاط سے میری [illegible] تکلیف کو زائل کر رہے تھے کہ اُسی وقت میری نیند [illegible] اور جگہ چلی گئی۔ یعنی میں جاگ گئی۔ اسلیے نیند کی مذمت کرنا درست ہی ہے۔

مومن اس مضمون کو کئی طرح سے باندھا ہے نمونے کے اشعار یہ ہیں۔

؎ دیکھا ہے خواب میں یہ کس آرام جاں کو ہائے
عشق پھروں آپ جاں کے رہتے ہیں ہم پڑے

؎ دی تسلی بھی تو ایسی کہ تسلی نہ ہوئی
خواب میں تو مرے آئے وہ اگر آخر شب

بہاری کے پہلے دوہے اور مومن کے دوسرے شعر کا مفہوم قریب الاتحاد ہے۔ کچھ دیگر اشعار ہیں۔

؎ شب وہ جو سو رہے مرے پاس آئے خواب میں
جاگے تھے بخت خفتہ تمنا کے خواب میں

؎ صورت دکھائیے جو کبھی جا کے خواب میں
دیدہ آنکھ کھول دے جھنجھلا کے خواب میں

ع گر خواب میں آن کر جگایا
سوتے مردے جگائیں گے ہم

تقابلی مطالعہ کے نام پر دونوں شعراء کے مضامین کا موازنہ کرنے کی غرض سے کافی کلام پیش کیا جا چکا ہے۔ اور مضمون بھی کافی طویل ہوگیا۔ ان چیدہ چیدہ نمونوں سے تغزل کے دائرے میں دونوں شعراء کے فن سے دلچسپی اور اہلیت کا اندازہ کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ بہارؔی اور مومنؔ کے کلام کے اتنے ہی نمونے جتنے کہ پیش کیے جا چکے تغزل کے حصار میں آتے [illegible] دونوں کا مابقی کلام تغزل [illegible] سے [illegible] اسے چھوڑ [illegible] حقیقت یہ ہے کہ [illegible] چھپے [illegible] چند نمونے ہی [illegible] ہوتے ہیں حسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ہے، اور مومنؔ کے بارے میں تو میں یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں (اگرچہ اس کی تکرار اچھی نہیں معلوم ہوتی) کہ مقطعوں کو چھوڑ کر دیوان غزلیات کا پچانوے فیصد سے زیادہ حصہ تغزل کے ہی دائرے میں آتا ہے لیکن یہاں پر دونوں استادوں کا صرف وہی کلام اخذ کیا گیا ہے جس میں بعینہ مضامین دونوں کے یہاں مشترک ہیں۔ اگر ان دونوں شعروں کا رنگ طبیعت بھی یکساں ہوتا تو اور بہت سے نمونے پیش کیے جا سکتے تھے مگر طبائع کے تضاد نے یہ مشکل کھڑی کر دی کہ مومنؔ کے یہاں ہجر کے مضامین زیادہ ہیں تو بہارؔی کے یہاں کم، اور مومنؔ کے یہاں [illegible] مضامین کے موازنہ کے لیے [illegible] فراقیہ مضامین پر بہت زیادہ مواد موجود نہیں۔ دوسری طرف بہارؔی کی ستسئی میں وصل کے مضامین خوب ملتے ہیں تو دیوان مومنؔ ان سے خالی نظر آتا ہے جتنا بھی مضمون نکالا منتخب ہو سکا اس پر اس موازنہ کی دیوار اٹھا دی گئی۔

مضمون کے خاتمہ پر چند موضوعات کا تقابل اور ملاحظہ فرما لیجئے جن پر دونوں شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہجر کی اذیت موت سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ بہارؔی کہتے ہیں۔

۱؎ اے زندگی کے مالک کرشن جی میں آپ سے اس بیوگی کی کیا حالت بیان کروں اس کو آتش ہجر میں جلتا ہوا دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اس کا مرنا ہی اس کے لیے دعائے خیر (شگون نیک) ہے۔

۲؎ فرقت سے تو مرنا ہی بہتر ہے یہ بات یقینی طور پر ذہن نشین ہو جانی چاہیے کیونکہ [illegible] ایک کی مصیبت تو ختم [illegible] تو دونوں کو [illegible] پیدا ہوتی ہے۔

مومنؔ کے شعر ہیں ؎

ع زندگی ہجر میں اک موت تھی
مرگ نے کیا کار مسیحا کیا

ع جیوں یا مر چکوں یوں نوع کب تک
ادھر ہو جاؤں یا رب یا ادھر میں

ایک دوسرا مضمون لیجئے بہارؔی کہتے ہیں۔

۱؎ بیوگی کی ہم جلیس بیوہ سے بیوگی کا حال بیان کرتی ہے کہ اس ضائع ہو گئے ہوئے نگینے کی حفاظت کرنے دنیا میں نامور کی حاصل کرو۔ یہ سچا [illegible] بخار میں مبتلا ہے اس کو آ کر [illegible] (دیدار یا ایک دوا) دو۔

۲؎ افسوس وہ بیوگی آتش فراق سے جل جل اٹھتی ہے اور بہر حال بیری" بڑبڑا اٹھتی ہے۔ [illegible] ہم جیسی ہستی ہے نہ

میں تو اس کے علاج سے مایوس ہوگئی ہوں اس لیے اسے دیدہ جی میں آپ کے صدقے اور تو کوئی طریقہ ہے نہیں اُمید ہے کہ آپ کے اصول سے ہی اس کو اس تپ سے نجات مل سکے گی۔

مومن کے شعر ہیں:۔

؎ چلی ہے جان نہیں تو کوئی نکالو واہ
تم اپنے پاس تک اس مبتلا کے آنے کی

؎ دم ہی اُلٹ گیا جو سنا ہے ترا مریض
کیا حضرت مسیح سے درماں خستہ ہو

حالت ... کبھی عاشق کو سودا کا خلل ہو جاتا ہے اور اُس کے خیالات ... ہیں۔ دل، دماغ اور زبان پر اُس کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ کہنا چاہتا ہے اور منھ سے کچھ نکلتا ہے۔ یا بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑاتا ہے۔

اس سرسامی کیفیت کو بہاری اس طرح بیان کرتے ہیں۔ (اُوپر کا آخری دوہا کرا)

"افسوس وہ بیر دکھن آتش فراق سے جل بھن ... ہے اور بہری کہری" بڑبڑانے لگی ہے۔ اُس کی ہم جلیس کہتی ہے کہ اے ویدجی میں تو اس کے علاج سے مایوس ہوگئی۔ اس لیے میں آپ پر صدقے اور تو کوئی طریقہ ہے نہیں۔ اُمید ہے کہ آپ کے حصول سے ہی اس کو اس تپ سے نجات مل جائیگی۔

مومن کے دماغ کا خلل اس طرح ظاہر ہی ہے۔

؎ یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

؎ بیہوش ہو کے سمجھ کے ذرا حال پوچھنا
قابو میں دل نہیں مرے بیہوش زباں کو ہیں

؎ نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کہنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

یہ تھا بہاری اور مومن کا میدان تغزل میں تقابل۔ اگر دور افتادہ مضامین میں جبراً اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تو یہ سلسلہ ابھی طویل ہو سکتا تھا۔ پھر بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں اُستادوں کا وہ تمام کلام ان صفحات میں شامل کر لیا گیا ہے، جو مضمون اور موضوع کے لحاظ سے باہم متحد اور مربوط ہے۔

آگے خدا کو علم ہے کیا جانے کیا ہوا
بس ان کے رخ سے یاد ہے اٹھنا نقاب کا

پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا
ہوتا اگر یہ دل ہی میرے اختیار میں

کہیں واعظ ہے کہیں پیر خمریات عزیز
اس کو ہر رنگ میں دیکھا جہاں دیکھا

صدا یہی جرس کارواں سے آتی ہے
چلو چلو یہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں

اوپر کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ عزیز کی یہ فلسفہ طرازی ان کی تجدید کا ایک نمایاں عنصر ہے۔

عزیز کی تجدید کبھی نیچر کی سحر بیانی کی صورت میں بھی ملتی ہے۔ اُن کی تعلیم میں بھی تجدیدی مناظر کارفرما ہیں اشعار ملاحظہ ہوں جو کہ ایک نیچر سے متعلق نظم سے لیے گئے ہیں۔

دلکشا منظر نسیم صبح نورانی سحر
یہ پرندوں فضا اور انکے وہ رنگین پر
جگمگاتی یہ ستاروں کی پریشاں انجمن
یہ چہکتی بزم پھولوں کی چمن اندر چمن

عزیز نے لکھنؤ کے دبستان کی شاعری کو بالائے طاق رکھ دیا۔

لکھنؤ میں جو رعایت لفظی کا زور تھا اس کو ترک کر دیا۔ لکھنؤ کی شاعری میں جو پہلے خارجی مضامین کی بھرمار تھی اس سے انھوں نے توبہ کر لی اور یہ تمام ... کے دبستان میں داخل ہوتے ہوئے [illegible] ہیں۔

عزیز لکھنوی کی غزل گوئی پر عبدالقادر سروری صاحب کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

"جدید شعری اصلاحات کی تحریکات کے سلسلے میں جن غزل گو شعراء نے شہرت حاصل کی۔ ان میں عزیز کا درجہ ہے۔ ان کی غزل میر اور غالب سے متاثر ... سادگی کو عزیز نے غزل میں پھر زندہ کرنا چاہا۔ لیکن ان کی غزل کی بنیاد غالب کے لیے تغزل پر رکھی گئی۔ عزیز نے ذاتی رجحان اور مذاق سے مل جل کر اردو غزل میں جذبات نگاری اور سادہ بیانی کے اس دبستان کی بنیاد رکھی تھی جس کا نکھار اور فروغ جگر مرادآبادی کے یہاں نظر آتا ہے[1]"

ہم نے دیکھا عزیز نے غزل میں وہ تجدیدی عناصر پیدا کیے جس کی بدولت آج غزل زندگی کی ترجمانی کر رہی ہے یہ صرف ایک تشبیہ و استعارہ سے بھرپور خیالی مرقع نہیں۔ بلکہ آج غزل زندگی کے بہت قریب آ گئی ہے۔ ... نے ایک نیا موڑ اختیار کیا ہے ... اپنے ... کو زمانہ کے احوال کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور ... صنف سخن میں نیچر کیا ... اور ہر نئے پہلو کو جگہ مل رہی ہے۔

---

[1] جدید اردو شاعری۔ عبدالقادر سروری ص ۳۴۰

(د)

۱- دیوان آبرو — ڈاکٹر محمد حسن — ۷/-
۲- دلچسپ کہانیاں — مسعود عالم — ۴/۵۰
۳- دیوان فغانی — ۲/-
۴- داستان سہراب رستم معہ مقدمہ فارسی — عبدالاحد خاں خلیل — ۴/۵۰
۵- دہلی کا یادگار مشاعرہ — ۱/۵۰
۶- دستۂ گل — -/۶۰
۷- دوشیزہ قاف (ناول) — خان محبوب طرزی — ۵/-
۸- دلربا — " — ۳/-
۹- دلی کا دبستان شاعری (مع اضافہ جدید ایڈیشن) — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۱۸/-
۱۰- دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — ۳/۵۰

(ڈ)

۱- ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۲۰/-

(ذ)

۱- ذوق و جستجو — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۱۷/-
۲- ذوق ادب و شعور — سید احتشام حسین — ۶/۵۰
۳- ذوق جنون مجموعہ کلام — آل احمد سرور — ۱۰/-

(ر)

۱- روایت اور بغاوت — سید احتشام حسین — ۸/-
۲- رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ — سید احسن نورانی — ۳/۵۰
۳- رہبر مضمون نویسی — شفاعت علی صدیقی — ۳/-
۴- راکھی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — -/۵۰
۵- رخسار سحر — انصر کریم قدوائی — ۱/۵۰
۶- رفتار — وحشی محمود آبادی — " — ۳/۵۰
۷- رموز حکمت معہ مقدمہ اردو — محمد شریف — ۳/۵۰
۸- ریاض فارسی — منتخب کلام فارسی — ۳/-
۹- ریختہ دلی جدید ایڈیشن — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/-

(ز)

۱- زکوۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوۃ — مولانا تھانوی — -/۵۰
۲- زنیتوں کا بادشاہ حکیم بانا مزاحیہ ناول — سید علی عباس حسینی — ۳/-
۳- زینب ساحرہ — وحشی محمود آبادی — ۳/-

(س)

۱- سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۵/-
۲- سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۴/-
۳- سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکم چند نیر — ۸/-
۴- سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۴/۵۰
۵- سنگ گہر — سید احتشام حسین — ۴/-
۶- سر سید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰
۷- سرمایۂ زبان اردو — جلال لکھنوی — ۹/-
۸- سقر (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/-
۹- سیاحت زمین " — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰
۱۰- ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰
۱۱- سنہرا حلقہ — ۱/۷۵
۱۲- سر سید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — ۱۰/۴۰
سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی — ۱/۷۵

۱- شعر نو تنقیدی مجموعہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۷/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲-	شرح دیوان غالب (مزاحیہ)	غلام احمد فرقت	۸/۵۰
۳-	شرح سنگ گہر	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۴-	شاہ نگیں حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۵-	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۶-	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۴/-
۷-	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۸-	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	۰/۶۰
۹-	شرح دیوان غالب جدید اڈیشن	نظم طباطبائی	۸/-
۱۰-	شہری اور سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	۰/۸۰
۱۱	" " اول	" "	۰/۹۸
۱۲-	" " دوم	" "	۱/-
۱۳-	" " سوم	" "	۱/-
۱۴-	شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ	امیر احمد علوی	۳/۵۰
۱۵-	شعر العجم حصہ اول، دوم، سوم، چہارم، پنجم	شبلی نعمانی	۴۵/-
۱۶-	شرح نثر امروز ایران	احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۷-	شرح شعر امروز ایران	" "	۳/۵۰
۱۸-	شمع و شاعر	علامہ اقبال	۵/-
۱۹-	شرح حکیم نباتات در بہر نمار	نیر مسعود	۱/۲۵
۲۰-	شرح انتخاب قصائد و منظومات	[illegible]	[illegible]
۲۱-	شرح شعر امتحانی حصہ اول	ڈاکٹر انوار الحسن	[illegible]
۲۲-	شرح ترانہائے خیام	حکیم عبدالقوی	۲/-
۲۳-	شرح مفتاح العربیہ	عبدالقوی دریابادی	۱/۵۰
۲۴-	شرح نصاب فارسی		۴/-
۲۵-	شرح شعر باستہ دوم	احسن الظفر	۲/-
۲۶-	شرح گلہائے ادب		۳/-
۲۷-	شرح آئینہ نظم اردو		۳/-
۲۸-	شرح نثر فارسی (امروزہ)		۳/-
۲۹-	شرح آئینہ نثر اردو	خلیل قدوائی	۴/-
۳۰-	شرح غنچہ گل		۵/-
۳۱-	شرح منتخب فارسی مدرسیہ	احسن الظفر	۳/-
۳۲-	شرح ہماری زبان اردو درجہ ۶، ۷، ۸ درجے	خلیل قدوائی	۳/-

(ص)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	صید و برف (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۵/-
۲-	صحیفہ محبت مہدی افادی کے خطوط	ڈاکٹر محمود الٰہی	۶/-

(ط)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	طنزی منبر (خان محبوب طرزی)	مرتبہ فروغ اردو	۳/-
۲-	طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے	غلام الثقلین	۰/۴۵
۳-	طلسم اسرار (ڈرامہ)	فراز سواکھنوی	۱/۵۰

(ع)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	عذرا (ناول)	صالحہ عابد حسین	۶/-
۲-	عکس و آئینہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ	سید احتشام حسین	۸/-
۳-	عبدالماجد دریابادی نمبر		۱/-

(غ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	غالب کا تفسیری شعور	اخلاق حسین عارف	۴/-
۲-	غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۶/-
۳-	غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر	سید احتشام حسن نورانی	۴/-
۴-	غالب کی تخلیقی تشکیل	شہید صفی پوری	۸/-
۵-	غنچہ و گل	سید محمود الحسن رضوی	۴/۵۰
۶-	غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	نادم سیتاپوری	۶/-

۸- غزنی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۴/۵۰
۹- غزلیات نظیری ۱/۵۰
۱۰- غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید ایڈیشن) ذکی کاکوروی ۲۵/-

(ف)

۱- فرقت کاکوروی نمبر ۶/-
۲- فروق لغت طاہر محسن علوی ۴/۵۰
۳- فن خطابت یعنی اُستادِ تقریر کلب مصطفےٰ ایڈوکیٹ ۱۵/-
۴- فریدہ خان محبوب طرزی ۳/-
۵- فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادم سیتاپوری ۲/-
۶- فلسفہ اقبال عبدالقوی دریابادی ۵/-
۷- فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰
۸- فروغ جام مجموعہ کلام لشور واحدی ۴/-
۹- فغان محسن محسن کاکوروی ۴/-
۱۰- فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/-
۱۱- فن داستان گوئی جدید ایڈیشن پروفیسر کلیم الدین احمد ۸/-
۱۲- فریاد امت علامہ اقبال -/۷۵

(ق)

۱- قدح جدید، جدیدیت پر مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت ۶/-
۲- قصائد ظہیر فاریابی ۲/-
۳- قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۶/۵۰
۴- قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۷/-
۵- قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۳/-
۶- قصائد قاآنی (فارسی) ۱/-
۷- قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر ۴/-
۸- قیامت صغریٰ سائنسی ناول خان محبوب طرزی ۳/-

(ک)

۱- کلیات اقبال علامہ اقبال ۱۰/-
۲- کیسر اور کاہی بدرالدین طیب جی ۳/-
۳- کف گلفروش مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت ۶/۵۰

(گ)

۱- گاندھی نمبر ۲/-
۲- گلدستہ فارسی اول و دوم محمد غوث بیگ سیفی ۲/۲۵
۳- گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدیدہ -/۷۰
۴- گلہائے ادب عبدالاحد خان خلیل ۲/-
۵- گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر -/۵۰

(ل)

۱- لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خان خلیل ۱/۵۰
۲- لال قلعہ مائل ملیح آبادی ۶/-
۳- لب بام عادل رشید ۶/-
۴- لسانیات اور اردو سید محمود الحسن رضوی ۴/۵۰

(م)

۱- مرقع اقبال عصمت فاطمہ علویہ ۱۲/-
۲- مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو ۸/۵۰
۳- محسن کاکوروی نمبر ۳/۵۰
۴- مسلمان اور کانگریس ابوالکلام آزاد ۳/۵۰
۵- مرثیہ نگاری اور میر انیس ڈاکٹر احسن فاروقی ۵/-
۶- مضامین فرحت حصہ اول مرزا فرحت اللہ بیگ ۵/-
۷- " " حصہ دوم " " ۵/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۸	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۳/-
۹	سیرے اسٹیج ڈرامہ	ڈاکٹر محمد حسن	۷/-
۱۰	موسم گل ناول	عادل رشید	۷/-
۱۱	مجبور	خان محبوب طرزی	۴/۵۰
۱۲	مضامین جدیدہ	محمد ہادی	۲/۵۰
۱۳	مثنوی سحر حلال فارسی معہ مقدمہ		
۱۴		قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۱۵	مطالعہ..	ذکی کاکوروی	۵/-
۱۶	مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۱۷	معرکہ رزم دیوان	صادق سردھنوی	۶/-
۱۷	مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۱۸	مطالعہ حالی		۴/-
۱۹	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
۲۰	ٹھیٹے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/-
۲۱	مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۲	مقدمہ شعر و شاعری	مطابق نصاب علی گڑھ	۲/۵۰
۲۳	مرثیہ غالب	حالی	۲۵
۲۴	محبوبہ کربلا	جرجی زیدان	۲/۵۰
۲۵	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۶	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	۱/۴
۲۷	انتخاب فسانہ آزاد یعنی بہار آج بلی	سرشار لکھنوی	
۲۸		ڈاکٹر احسن فاروقی	۲/۵۰
۲۹	مسٹر ملا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز حسن مجذوب	۷/۵
۳۰	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا رضا انصاری	۱/۵۰
۳۱	مصباح بلاغت معہ مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۳۲	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۵/-
۳۳	مقدمات و مقالات	عبد الاحد خاں	۵/۵۰
۳۴	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۲/-
۳۵	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دار العلوم کے نام	عبد الماجد دریا بادی	-/۸۰
۲	نثر مردم ایران	ڈاکٹر غریب حسین	۳/۵۰
۳	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۶/-
۴	نقد و تنقید	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۵	نقش حالی اول دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	
۶	شجاعت علی سندیلوی		۳۰/-
۷	نغمہ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۸	نغمات الہند مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۳/-
۹	نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۲/-
۱۰	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۱۱	نسرین ستر	ذکی کاکوروی	۵/-
۱۲	نورس تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۱۳	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۱۴	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبد الماجد دریا بادی	-/۸۰
۱۵	نوائے سرور جہاں آبادی دیوان	ڈاکٹر حکم چند نیر	۷/۵۰
۱۶	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۱۷	نوروز "	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۱۸	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ	آل احمد سرور	۱۰/-
۲۹	نیلم	انتظار حسین	۲/۵۰
۳۰	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۴/-
۳۱	نقوش افکار	مجنوں گورکھپوری	۶/۵۰

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۲۲-	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۴/-
۲۳-	منشی نولکشور نمبر		۳/-
	(و)		
۱-	وعدۂ فردا	انگر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-
	(ہ)		
۱-	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانہ	علی عباس حسینی	۵/-
۲-	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۱/۲۵
۳-	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-

نمبر	نام کتاب	مصنف	قیمت
۴-	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	مظفر سلیم	۵۰
۵-	ہندوستان کا تعمیری منصوبہ		۵۰
۶-	ہمارا سماج ۱	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی	
۷-	" " ۲	"	۹۵
۸-	" " ۳	"	"
۹-	" " ۴	"	"
۱۰-	یادگار غالب	مولانا حالی	
۱۱-	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	۵۰/
۱۲-	یادگار انیس	امیر احمد علوی	۱.۵۰

ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو ـ نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملنے کی شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کردی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کردی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

(۴) جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لیے ٹکٹ لازمی ہیں

جلد (۲۵) شمارہ (۱۱) رجسٹرڈ نمبر ایل ڈبلیو/این پی ۹۳

لائسنس نمبر : ۶۴، ۸، ۲۰/۱۷/۲۰۲۴

دفتر فون : ۲۶۱۳۵

فون رہائش گاہ : ۲۶۶۵۶

ادارہ فروغ اردو ہند کا ترجمان

بیادگار پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم

ایڈیٹر:-

محمد حسین شمس علوی

مجلس ادارت:-

۱۔ عبدالقوی دریابادی

۲۔ سعادت علی صدیقی

۳۔ محمد حسنین علوی ایم، اے

ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ

جلد (۲۵) مارچ ۱۹۷۸ء شمارہ (۱۱)

ترتیب

زر سالانہ اعزازی :- دس روپیہ

عوام سے : آٹھ روپیہ

فی پرچہ : ۷۵ پیسہ

پتہ :- ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۳۷ امین آباد پارک

سید انصار حسین نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ ناداں محل روڈ میں چھپوا کر دفتر فروغ اردو لکھنؤ ۳ امین آباد پارک سے شائع کیا۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

اپنی باتیں

اُردو کے ساتھ با اقتدار حضرات کا روّیہ ہمیشہ معاندانہ ، اور ریاکارانہ رہا اِن کے نزدیک اگر نام نہاد جمہوریت میں اکثریت اقلیت کے جائز حقوق کو غصب کرلینا چاہ ہے۔ تو حکومت وقت اکثریت کے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر، اقلیت کے لیے کچھ نہیں کرسکتی۔ ایک مرد آہن نے یہی عذر لنگ پیش کیا ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوجا اس نظریئے سے ، اگر اکثریت یہ چاہے کہ اقلیت کو جینے اور رہنے کا کوئی حق نہ ہے اس کو ملک بدر کر دیا جائے یا نیست و نابود کر دیا جائے یا اس پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے۔ تو حکومت وقت اُنھیں کی خواہشات کی تکمیل کرنے کی پابند۔ حق و انصاف ، عدل و مساوات ، سب بے معنی چیزیں ہیں۔ اُردو کے سلسلے میں اسی فارمولے پر عمل در آمد کیا جاتا رہا ہے۔ آزادی کیا آئی کہ ظلم وجہالت نفرت و تعصب کا دیو استبداد آزاد ہوگیا۔ اس نے سب سے پہلے ہندوستان کو آزاد کرانے والی زبان کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے نزدیک اگر یہ زبان زندہ اور قائم رہی تو لسانی سامراجیت کو من مانی کرنے کا موقع نہ ملے گا۔ اسی لئے اس کو زندہ درگور کر دینے کے لئے جبر و استبداد سے کام لیا گیا۔ جو زبا

غلامی کے زمانہ میں آزاد تھی وہ آزادی کے زمانے میں غلام بنادی گئی اس کے زندوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تعلیمی اقتصادی اور معاشی حالت بد سے بدتر کر دی گئی۔ ان کو دوسرے یا تیسرے درجہ کا شہری بننے پر مجبور کیا گیا اور اگر اردو زبان اور اُردو والوں میں صلاحیت نہ ہوتی تو ان کا نام و نشان کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔

اردو دنیا اب بھی اگر اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ حکومت ان کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار ہے تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے، ارباب اقتدار سے بے نیاز ہوکر اپنی مادری زبان کی ترقی اور بقا کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔ جب اردو رسم خط کو بدیسی ہے اور اس پر ہر جگہ دروازے بند کر دیئے گئے ہیں تو کسی قسم کی کوئی امید رکھنا عقلمندی نہیں ہے۔ اردو کو ختم کرنا، گناہ یا پاپ نہیں بلکہ ثواب اور پُن کا کام سمجھا جاتا ہے ظاہر ہے اسی ثواب سے ہمارے با اقتدار، حضرات کیوں محروم رہیں۔ وہ اکثریت کی آڑ لے کر یہ ثواب کمانا چاہتے ہیں۔ لیکن انھیں معلوم نہیں کہ اکثریت اتنی بیوقوف نہیں ہے کہ وہ اپنے اوپر اُردو کشی کا الزام لے اکثریت کی اکثریت اُردو زبان کی شیدائی ہے وہ خود اس کی ترقی اور بقار میں برابر کی شریک ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب اکثریت کی آڑ میں شکار کھیلنے والے خود شکار ہو جائیں گے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اُردو دنیا خام و نمود سے بے نیاز ہوکر، خلوص دل سے، اپنی زبان کی خدمت کرتی رہے اور جو لوگ اُردو کے نام پر اپنے لئے ہر قسم کے فائدے اور عہدے حاصل کر رہے ہیں ان کو بے نقاب کرتی رہے۔ اور ان گندم نما جو فروشوں سے ہمیشہ ہوشیار رہے۔

پریم چند نمبر کے لیے مضامین کی آمد کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ادارہ کی کوشش یہی ہے کہ یہ نمبر ہر اعتبار سے مکمل ہو اس لئے وہ ان تمام مضامین کو شکریہ کیساتھ شامل کرے گا جو ۱۵ مارچ تک ادارہ میں پہنچ جائیں گے۔ ادارہ خصوصیت سے،

سید حامد حسین صاحب (بھوپال) کا انتہائی شکر گذار ہے اُنھوں نے پریم چند پر تحقیقی کام کو فراہم کر کے، اردو میں کام کرنے والوں کی رہنمائی کی ہے۔ دوسرے مضمون نگار حضرات نے بھی پریم چند کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان سب کے ادبی تعاون اور رہنمائی پر ادارہ کو فخر ہے۔

افسوس ہے کہ اس سال نے شروع ہوتے ہی، اردو کی مایۂ ناز ہستیوں کو اُردو دنیا سے چھین لیا۔ پاکستان میں ابن انشار اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ہندوستان میں مولانا شفیع الدین نیر، اعجاز صدیقی مدیر شاعر۔ اور محمود احمد ہنر، جیسے منفرد اور باکمال شاعر و ادیب ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ ادارہ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور ان کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن
سینیر ریسرچ فیلو، شعبہ اردو
ملیگڈ یونیورسٹی بودھ گیا

بچوں کا شاعر — اقبال

اقبال ایک آفاقی شاعر ہے، اقبال بین الاقوامی شاعر ہے، اقبال دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہے اقبال اُردو شاعری میں نئی آواز ہے، اقبال وطن پرست ہے اقبال فرقہ پرست ہے، اقبال صرف مسلمانوں کا شاعر ہے، اقبال نے فن اور فکر کو ایک دوسرے میں اسطرح سمو دیا ہے کہ وہ اسی کا حصہ ہے، اقبال ترقی پسند ہے اقبال نے مقصد کو فن پر ترجیح دی ہے، اقبال نے شاعری میں پیمبری کی ہے یہ اور اس قسم کی بہت سے جملے اقبال کی شاعری کے سلسلہ میں لکھے اور کہے گئے ہیں اور ہر ناقد نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں اقبال کے کلام سے سیر حاصل مثالیں فراہم کی ہیں یہ سارے جملے اور ساری باتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اقبال کے کلام میں تضاد ہے اقبال بلاشبہ عظیم فنکار تھے ہر عظیم فنکار کے یہاں یہ تضاد پایا جاتا ہے۔

اقبال کے فن، اقبال کی نثر، اقبال کا فلسفہ اقبال کی نظم نگاری، اقبال کی غزل گوئی، یہانتک کہ اقبال کی شاعری میں ظرافت اور طنز و مزاح کا عنصر بھی ناقدین کی زد میں آچکا ہے۔ لیکن اقبال کی شاعری کی ایک اہم جہت جس میں اقبال نے اپنی بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں سے بھی مصرف لیا ہے اس پر بہت کم ناقدین نے دھیان دیا ہے

میری رائے میں اقبال کی شاعری کا وہ گوشہ جو ناقدین
کی بے توجہی کا شکار رہا ہے، وہ ہے بچوں سے متعلق ان کی
شاعری۔

میرے خیال میں اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں کہی
ہیں وہ جہاں ایک طرف اقبال کی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں
الفاظ کے استعمال پر مکمل عبور کا ثبوت فراہم کرتی ہیں وہیں
اس بات کا بھی واضح اعلان کرتی ہیں کہ اقبال کی نظر میں
ن کی وہ شاعری بھی کافی اہم تھی جو بچوں کے لیے کی گئی،
گر ایسا نہیں تو بانگ درا میں بچوں کے متعلق ان نظموں
ی شمولیت کیا معنی رکھتی ہے ؟ ان نظموں کے ذریعہ اقبال
لے بچوں کو اعلےٰ اخلاقی اقدار کا حامل بنانے کی کوشش
ی ہے۔

آج کے بچے کل کے جوان ہوں گے، ماں باپ اپنے
بچوں کی تہذیب و تربیت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔
ہ چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ بڑا ہو کر گمراہ نہ ہو، اعلےٰ اوصاف
خصائص کا حامل ہو، اخلاق حمیدہ سے متصف ہو کر ملک
ا بہترین دماغ بنے، سچا محب وطن اور مہذب شہری بنے
ا ہر ہے اس خواہش کی تکمیل کے لیے بچپن ہی سے اس کی
زبیت کی ضرورت ہوگی۔ بچے کا ذہن موم کی اس گڑیا
ـ مانند ہوتا ہے۔ جسے جس طرف چاہیں موڑ دیں۔ اگر ابتدا
ی سے اس کے کانوں میں اچھی باتیں ڈالی جائیں اور بری
توں سے اس کے ذہن میں نفرت کا بیج بو دیا جائے
پھر وہ برائی کے قریب نہیں جائے گا اس لئے کہ اس
ے ذہن پر برائی کے انجام کے نقوش کچھ اس طرح
بت ہو چکے ہوتے ہیں کہ ان کو مٹانا یا ان کا مٹنا مشکل

ہی نہیں امر محال ہوتا ہے۔ عظیم فنکار اور بڑا شاعر اس
بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ اس کے کلام سے بچوں کے
ذہن پر جہاں ایک طرف اچھے اثرات مرتسم ہوں وہیں اس
میں اعلیٰ شاعری کی ساری خوبیاں پائی جائیں۔ نیز بچوں
کے لیے دلچسپی کا سامان بھی فراہم ہو، بچوں کا ادب تخلیق
کرنا تلوار کی تیز دھار پر چلنے کے مترادف ہے اس لیے
کہ اس کے فن اور فکر کا تعلق ان لوگوں سے نہیں ہوتا جو
بالغ ذہن و نظر کے حامل اور پختہ فہم۔ و شعور کے مالک
ہوتے ہیں بلکہ اس کا تعلق نیم پختہ ذہن اور ان معصوم ذہنوں
سے ہوتا ہے جو عقل و شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے والے ہوتے
ہیں اس کے ذمہ اس نسل کی ذہنی تربیت اور پرورش
کا کام ہوتا ہے جس سے ملک و قوم کے مستقبل کی امیدیں
وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ ایک عظیم فرض ہے اور اس
ذمہ داری سے وہی فنکار بخوبی عہدہ برآ ہو سکتا ہے،
جس کی فکر مثبت ہو جو عظیم مثبت فکر کی روایات کا
حامل ہو۔ جو صالح معاشرہ کا نیک اور صالح فرد ہو۔

بچوں کے ادب کی تخلیق کی راہ میں بڑی بڑی دشواریاں
اور مشکلات حائل ہوتی ہیں اس میں ہر ہر قدم پر ٹھوکر کھانے
اور منہ کے بل گرنے کا خدشہ رہتا ہے ذرا سی چوک سے
گہری کھائی میں گرنے کا خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ اس
قسم کے ادب کی تخلیق میں فکری اور فنی چابکدستی کی بجید
ضرورت محسوس ہوتی ہے فنکار کو اس بات کا خیال
رکھنا ہوتا ہے کہ الفاظ جہاں خوبصورت اور حسین ہوں
وہیں وہ مترنم اور شیریں و سبک بھی ہوں۔ بھاری بھرکم
بوجھل، ثقیل الفاظ کے بوجھ کو بچے برداشت نہیں کر سکتے

ان کی پیش کش میں فنی حسن فکری صلابت اور شعری حسن
ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری
میں ایسے شاعر جنھیں واقعی بچوں کا شاعر کہا جاسکے، بہت
کم ہیں، یوں بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے کم نہیں۔ اردو
میں بچوں کی ذہنی ترتیب و تطہیر کے لیے شائع ہونے
والے رسالوں کی کمی نہیں لیکن بچوں کے لیے معیاری ادب
کی تخلیق کرنے والوں کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی　　جس نے ہماری گائے بنائی

قسم کی شاعری بچوں میں نیکی، شکر گذاری اور احسان
مندی کے جذبات پیدا کرسکتی ہے اُن کی دلچسپی کا سامان
فراہم کرسکتی ہے لیکن معیاری اور اعلیٰ شاعری کا نمونہ
نہیں پیش کرسکتی۔

بانگ درا کی وہ نظمیں جو بچوں سے متعلق ہیں ان میں
فنی اور صعوری دونوں قسم کا حسن موجود ہے اقبال کے
پاس عظیم مثبت فکری روایات کا ورثہ ہے اور وہ خود
بھی صالح اور مثبت فکری انداز نظر کے حامل، لیکن شاعر
فنکار، مصلح اور مبلغ میں فرق مراتب ہے۔ شاعر اگر واقعی
فنکاری کے درجہ کمال کو پہنچنا چاہتا ہے تو اپنے مقصد
انداز نظر کا بیان اس طرح کرنا ہوگا کہ وہ مبلغ کی طرح
منبر پر کھڑا واعظ و نصیحت کرتا نظر نہ آئے بلکہ اس کے
فن پارے کی زیریں لہریں اس کے مقصد کو واضح کردیں
اقبال کا لہجہ اور آہنگ بیان ان نظموں میں کہیں بھی مبلغانہ
ناصحانہ، یا واعظانہ نہیں بلکہ نہایت حسین انداز میں بڑی
فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ اقبال نے تمثیل اور استعاراتی
پیرائے میں اپنی باتیں کہی ہیں۔ بلاشبہ بچوں سے متعلق
ساری نظمیں اقبال کے اپنے ذہن و خیال کی تخلیق نہیں
بلکہ انگریزی شعرا سے ماخوذ ہیں، لیکن اقبال نے یہ
حقیقت ہے کہ خیالات انگریزی شعرا سے مستعار لئے ہیں۔
لیکن حیرت ہے کہ اقبال کی فنکاری پر کہ انکے خیالات
کو اقبال نے کمال فنی حسن کے ساتھ اپنے شعور و خیال
کے مطابق بنا کر اپنی زبان میں نئے رنگ و آہنگ، جدید
لب و لہجہ اور بے حد شیریں انداز میں پیش کیا ہے ان نظموں
میں اقبال نے جہاں فطرت کے حسین مناظر کے تناظر میں خدا
کی قدرت کے شاہکار کی طرف اشارے کئے ہیں اور اس
کا شکر بجالایا ہے وہیں بچوں کے معصوم اور ملکوتی خصائص
کو مدنظر رکھتے ہوئے ان میں حب الوطنی، بھائی چارگی کے
جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، ظلم، جبر، بربریت سے
نفرت، بغض کینہ و حسد سے دور دور رہنے کی تلقین، محبت
خلوص اور ایثار کے جذبات ابھارنے کی سعی کی ہے۔
بچوں کے صاف شفاف، سادہ، نرمل اور کومل ذہن پر
نیکی کے بہترین انجام کے نقوش مرتسم کرنے کی کوشش
ہے اور بدی کے برے نتائج سے خبردار کیا ہے۔ لیکن
اقبال نے کہیں بھی فن پر فکر کو ترجیح نہیں دی ہے۔ بلکہ ہر
جگہ فن اور فکر کا بہترین اور حسین امتزاج پیش کیا ہے۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے حب الوطنی کے جذبہ
سے سرشار ہوں۔ انھیں ہندوستان کے ہر گوشے، ذرے
ذرے اور ہر چیز سے پیار ہو۔ وہ اس کے کھیتوں اور کھلیانوں
کی اہمیت سے واقف ہوں، یہاں کی ندیوں کے نرمل پانی
گنگا جمنا اور سرسوتی کے پوتر دھاروں، پہاڑوں کی عظمت
اور تقدس، پرندوں کے سریلے بول سے مانوس ہوں۔

یہاں کی جغرافیائی اہمیت، کثرت میں وحدت، تہذیب وتمدن کی گنگا، نیرنگی، ثقافت وکلچر کی تازگی و توانائی سے شناسا ہوں اقبال بھی یہی چاہتے تھے۔ ترانہ ہندی ایک شاہکار ہے جس بچے کے کان بچپن ہی سے اس ترانہ سے آشنا کرائے جائیں گے اس میں نفرت و عداوت کی چنگاری کبھی نہیں سلگ سکتی وہ ہندوستان پر اپنی جان نچھاور کرنے سے کبھی گریز نہیں کر سکتا۔ مذہب کے نام پر خون کی ہولی نہیں کھیل سکتا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جس کے دم سے رشک جہاں ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

ہندوستان کی مختلف اور رنگا رنگ تہذیب مختلف قوموں کا یہاں آنا اور یہیں کا ہو کر رہ جانا ـــ اور پھر ایک مدت بعد بھائی کا بھائی کے ساتھ برسر پیکار ہو جانا اور پھر جانی دشمن ہو جانا۔ تاریخ کا ایک زبردست المیہ ہے۔ اقبال کو معلوم ہے کہ اس نفرت کی وجہ کیا ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے تاریخ کی اس حقیقت کو سمجھیں اور نفرت و عداوت کو راہ دینے کے بجائے صلح، راستی، محبت، واخوت، وسیع القلبی و وسیع النظری پیدا کریں اور غلط فہمی کے نتیجے میں پیدا شدہ خلیج کو پاٹنے کا فرض انجام دیں۔ یہ بڑا اعلیٰ وارفع مقصد ہے۔ "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اسی مقصد کو واضح کرتا ہے۔ یہ محض بچوں کے لیے کہی گئی نظم ہی نہیں ہے بلکہ ایک مربوط فکر اور شعوری کوشش ہے جسے اقبال نے بچپن ہی سے بچوں کے ذہن میں ڈالنے کی کوشش کی ہے تاکہ مستقبل کے بچے زہریلی فضاؤں سے بچ کر سانس لیں اور امن و سلامتی، محبت و اخوت کے سائے میں ہندوستان کے مستقبل کو درخشاں و تابناک بنائیں۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے!

ہر ہوشمند شہری کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے پڑھیں لکھیں، ملک کے باعزت شہری بنیں علم کے زیور سے پیراستہ ہوکر شاخ ثمر بار کی طرح جھکے رہیں، خلوص، نیک نیتی اور ایثار قربانی کے جذبے پیدا ہوں۔ غریبوں کے لیے اُن کے دل میں جذبہ ترحم ہو، بے کسوں بے نواؤں، مفلسوں، کمزوروں اور دکھیوں کی مدد کے جذبے پیدا ہوں۔ ان میں غرور و تکبر کے جراثیم بار نہ پائیں۔ بغض و عناد اور کینہ سے ان کے قلوب پاک رہیں۔ نیک کام کرنے کی، نیکی کے راستہ پر چلتے رہنے، نیکی و بدی، اچھائی و برائی، دوست اور دشمن میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، دشمن کو دوست بنانے کا گُر معلوم ہو اور با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا کے جذبات اُمنڈیں۔

اقبال نے اپنی نظم "بچے کی دعا" میں بچوں کے لیے بچوں کی زبانی نہایت فنکارانہ طور پر شاعرانہ حسن بیان کے ساتھ دعائیہ طرز میں نصیحت کی ہے اور نیکیوں کو اپنانے برائیوں سے بچنے مذکورہ بالا اوصاف حمیدہ اپنانے اور عملی زندگی میں اُن پر گامزن ہونے کی تلقین کی ہے ـــــ

ملاحظہ ہوں ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو

"ایک مکڑا اور مکھی"۔ "ایک گائے اور بکری"۔ "ایک پہاڑ اور گلہری" "ہمدردی"، وغیرہ نظمیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ اقبال نے بچوں میں خوشامد کے نقصانات، دشمن سے ہوشیاری، احسانمندی، دکھ درد اور مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنے کی تلقین اور اللہ کی پیدا کردہ مخلوق میں کسی چیز کو ہیچ نہ سمجھنے کی ترغیب دی ہے لیکن کمال فن اور فنکاری یہ ہے کہ شاعر کہیں بھی واعظ ناصح یا مبلغ، بن کر سامنے نہیں کرتا۔ ملاحظہ ہو چند بند و اشعار۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا　　بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی　　اڑنے چگنے میں دن گزرا
پہونچوں کس طرح آشیاں تک　　ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری　　جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے　　کیڑا ہوں گرچہ میں ذرا سا

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری — میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل — چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ہمدردی

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں جانور غریب کہاں؟

کہا یہ سن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا

قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
مری بڑائی ہے خوبی ہے اور کیا تجھ میں

جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

(ایک پہاڑ اور گلہری)

قدر آدم کی اگر سمجھو — آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
گائے سن کر یہ بات شرمائی — آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا برا اس نے — اور کچھ سوچ کر کہا اس نے

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

(ایک گائے اور بکری)

جہاں تک ان نظموں کی زبان اور ان کے انداز بیان کا تعلق ہے اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے بچوں کے ذہن اور ان کے عقل و فہم کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے سبک، نرم، ملائم، شیریں اور بالکل سادہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ایسے الفاظ جو بچوں کی سمجھ سے بالا ہوں ان کے استعمال سے حتی الامکان پرہیز کیا ہے۔ جا بجا خوبصورت تشبیہوں اور دلکش استعاروں سے اپنے بیان میں دلکشی اور جاذبیت پیدا کی ہے ان محاوروں اور پرندوں سے زیادہ مصرف لیا ہے جن سے روزانہ بچوں کا سابقہ پڑتا ہے۔ گھروں میں، محلوں میں، گاؤں میں، شہروں میں، سڑکوں پر، گلیوں میں۔ غرض یہ ہے کہ اقبال نے فکری و فنی چابکدستی کے ساتھ صوری و معنوی حسن کو بھی برقرار رکھا ہے الفاظ کی بندش، جملوں کی ترکیب میں سادگی اور شگفتگی، روانی اور ترنم کو ملحوظ خاطر رکھا ہے تاکہ بچے آسانی سے اسے گنگنا سکیں۔

مختصر یہ کہ اس قسم کی نظموں میں اقبال نے بچوں میں اعلیٰ اخلاقی صفات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یہ نظمیں بچوں کی کردار سازی میں بیحد معاون و مددگار ثابت ہو سکتی ہیں ان میں جذبہ حب الوطنی، اخوت، محبت کی جڑیں گہری اور مضبوط بنانے میں اہم فریضہ انجام دے سکتی ہیں شرط یہ ہے کہ کھلے دل اور صاف ذہن کے ساتھ بچوں کے نصاب میں ان کو شامل کرایا جائے اور اساتذہ کو سختی کے ساتھ یہ ہدایت کی جائے کہ اقبال کی شاعری کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی بجائے ان کی قوم پرستی، قوم پروری، اور انسانی دوستی کے رجحانات کو بیش از بیش اجاگر کریں۔

ڈاکٹر امین چند شرما (جبل پور)

آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ (تلک)

چکبست حریت کا علمبردار ہے۔ اُس کے نغموں کا پورا زور آزادیٔ وطن کے لیے وقف ہے۔ اُس کی جولانیٔ طبع گزشتہ ہند کی عظمت و شوکت کے تصور اور مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے میں مصروفِ کار ہے۔ ماحول کے حالات سے متاثر ہو کر چکبست نے قومیت کا راگ الاپا ہے۔ اور اردو شاعری میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ ڈاکٹر اقبال اور حسرت موہانی کے مانند چکبست اردو شاعری کے دورِ جدید کے شاعر ہیں۔ اب

گل و بلبل کے قصے دفترِ پارینہ بن چکے معشوق کے جور و جفا افسانہ بن گئے۔ نازک کمر ساقی کا دور دورہ ختم ہو چکا قومی انحطاط اور سیاسی غلامی نے شاعری کے سب بل نکال دیئے۔ شاعری کی حساس اور جدت پسند طبیعت کو شاعری کی پرانی روش سے کیا واسطہ۔ اُسے تو اب قوم کے رگوں سے خون ٹپکتا دکھائی دیتا ہے۔ ساقی کی تغافل شعاری اُس کی توجہ کا مرکز نہیں بلکہ اُس کے جذبات کو ہم وطنوں کی ذلت و خواری، نکبت اور بے حسی متحرک۔

کرتی ہے، جھنجھوڑتی ہے۔ اور وہ قوم کی جہالت اور باہمی
نفاق کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔

کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

غرض چکبست نے اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کیا
اور اپنی ملکی اور قومی نظموں کے ذریعے سے وہ شعلے برسائے
کہ ہندوستانیوں کے خرمنِ غفلت کو پھونک کر رکھ دیا۔

چکبست پہلا شاعر نہیں جس نے اپنے تخیل اور فکر کی
بلندی کو آزادیٔ وطن کی قربان گاہ پر چڑھایا۔ دنیا کے
ہر ایک پسماندہ اور محکوم ملک میں شاعروں نے اپنے
ملک کو غیروں کے پنجہ سے نجات دلانے میں غیر معمولی حصہ
لیا ہے۔ اپنے ہم وطنوں کی غفلت اور بے حسی کی دھجیاں
اڑائی ہیں اور ان کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے میں
مساعیٔ جمیلہ کا بین ثبوت دیا ہے۔ شعراء نے عوام و خاص میں
بیداری۔ جوشِ عمل اور آرزوئے ترقی کے جذبات
پیدا کئے۔

اسکاٹ لینڈ کے قومی شاعر رابرٹ برنس
(Robert Burns) نے اپنے ملک کی عظمت اور
اپنے ہم وطنوں کی بہادری کی داستانیں لکھی ہیں جو آج بھی
طبیعت میں جوش و خروش پیدا کر دیتی ہیں۔ اس نے غیر
ملکی حکمران کے برخلاف جہاد کا وہ جذبہ پیدا کیا، جسے
انگلستان کی پوری طاقت بھی نہ دبا سکی۔ انقلابِ فرانس کے
دنوں میں ایک فوجی افسر کیپٹن رونٹ ڈی لائل کا مشہور ترانہ
"مارسیلز" سامعین کے دلوں میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔
اس نے فرانس کی کایا ہی پلٹ دی۔ یہ ترانہ اب
تک آزادی کے گیتوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ امریکہ
شہرہ آفاق شاعر جان گرین لیف وٹیر نے "باربرا فر
کے عنوان سے ایک ولولہ انگیز نظم لکھی اور ایک بہادر
(John Greenleaf Whittier) ضعیف العمر خاتون (
قابل داد داستان بیان کی جس نے اپنی زندگی خطرے میں
ڈال کر قومی جھنڈے کی عظمت کو برقرار رکھا۔ مائیکل
ڈریٹن اور کئی دیگر انگریز شعراء نے انگلستان کی عظمت
کی داستانیں لکھ کر اپنے ہم وطنوں کو آزادی کا درس دیا۔
قومی ہیجان کے وقت شاعری نمایاں حصہ لیتی ہے اور
بسا اوقات بہت معمولی قسم کی شاعری لوگوں کے دلوں
میں تلاطم برپا کر دیتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انگلستان
کے قوانین کی اصلاح میں اس قسم کی شاعری نے معتد بہ حصہ لیا

ہندوستان کی تاریخ میں ایسے کئی شاعر ہوئے
جنھوں نے قومی عظمت کے گیت گائے اور غیر ملکی
حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کی اور اپنی بے اطمینانی کا
مظاہرہ کیا۔ عہد مغلیہ کی ایک مثال لیجئے۔ اورنگ زیب
نے شمال مغربی سرحد پر رہنے والے قبائل کو مطیع کرنے
کی بڑی کوشش کی۔ لیکن خوشحال خاں خٹک کی پرجوش
قومی پشتو نظموں نے تمام قبائل میں حریت کا وہ جذبہ پیدا
کیا جس کے سامنے اورنگ زیب کا لشکر بے کار رہ گیا۔
موجودہ تحریک آزادی میں بنکم چندر چٹرجی کے مشہور قومی
گیت "بندے ماترم" نے برسوں تک ہزاروں محبان وطن
کے قلب و روح کو گرمایا۔

موجودہ سیاسی بیداری میں چکبست کے علاوہ۔ علامہ
اقبال۔ ساغر۔ عزیز۔ جوش اور قاضی نذر الاسلام

کی قومی نظموں نے بہت حصہ لیا ہے۔ علامہ اقبال کا
قومی ترانہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا۔

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

ہمارے جذبات حریت، آرزوؤں اور امنگوں کا حامل
ہے۔ علامہ اقبال کا تخیل گو بعد میں اسلام اور فلسفہ اسلام
کی ترجمانی میں منتقل ہوگیا۔ لیکن اس آزادی۔ خودداری،
غلامی اور مظلومیت کا جو احساس ملک میں پیدا کیا ہے۔
وہ نہایت ہی قابل قدر ہے۔ ٹیگور کی شاعری نے دنیا کی
نظروں میں ہندوستان کی قدر و منزلت کو بڑھا دیا ہے،
اور وہ ہندوستان کی روح کو بے نقاب کرنے میں بدرجہ
اتم کامیاب ہوئے ہیں۔ ٹیگور بین الاقوامی شاعر ہیں۔ وہ
امن و آشتی کے علمبردار ہیں اس واسطے دنیا کے ہر حصے
کے باشندے اُن کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں لیکن اسکے
باوجود آپ کو گیتانجلی میں کئی ایک ایسے گیت ملیں گے
جن سے حُب وطن کی مہک آتی ہے۔ فردوس بریں کے
نام سے عطاء اللہ کلیم نے ایک گیت کا منظوم ترجمہ کیا ہے

جس سرزمیں میں خوف و خطر گذر نہ ہو
جس سرزمیں میں حاکم جابر کا ڈر نہ ہو

جس زمین میں علم کی پرواز ہو بلند
جس سرزمیں میں فرقہ پرستی کے ہوں نہ بند

جس سرزمیں میں بات ہو آئینۂ خیال
جس سرزمیں میں فکر رہے تشنۂ کمال

جس سرزمین میں عقل نہ گم کردہ راہ ہو
جس سرزمیں میں روح سے اُسکا نباہ ہو

اُس جنت نظر میں بسیں میرے ہم وطن
گہوارۂ طرب میں رہیں میرے ہم وطن

آپ چکبست کے دیوان "صبح وطن" کو پڑھیے۔
ہر ایک نظم میں آپ کو دردِ وطن میں ڈوبے ہوئے جگر
پارے ملیں گے۔ عنوان کوئی ہو لیکن وطن کا تذکرہ کسی
نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوگا۔ چکبست کے دل میں
قومیت کا احساس بہت زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
آپ کا دل قوم اور اپنے وطن کی بہتری کے لیے کوئی نہ کوئی
سبیل سوچتا رہتا ہے۔ آپ آزادی کے خواہاں ہیں۔
آپ کا خیال ہے کہ آزادی ایک عظیم طاقت ہے، جو
ایک نہ ایک دن اپنی رعنائیوں سے سرشار کردے گی
اور پھر اس کی جلوہ گری ہمیں متحیر کر دے گی۔ اس کا
کوئی نہ وار ہوگا نہ پار۔ ہندوستانیوں کو مخاطب کرتے
ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ لازمی نہیں کہ آپ صرف شور
مچائیں یا آزادی کی دیوی کو رجھانے کے لیے نعرے لگائیں،
دل زندہ پیدا کیجیے جو اس قابل ہو کہ اپنے وطن کی محبت
کو اس طرح سے جذب کرلے کہ وہ زخم میں مبتدل ہو جائے
اور جب دل میں وطن کی آزادی اور شخصی حریت کا جذبہ
زخموں کی صورت اختیار کرلے گا تو یہ سیف بیاں کا کام
دے گا۔ آزادی حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے
اس کے لیے زبردست جوش کی اہم ضرورت ہے جو عالم
شباب میں ممکن ہو سکتا ہے لہذا نوجوانوں کا فرض ہے کہ
اس زمانہ میں جوش کو عمل سے جلا دیں۔ جب جوش اور
عمل ہمکنار ہوں گے تو جملہ مشکلات آسان ہو جائیں گی۔
اس احساس کو برقرار رکھنے کے لیے موجودہ طرز حکومت
کی چال سے متنبہ رہنا چاہیے ؎

در زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آزاد کیا

جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے
زبان کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے

جنونِ حب وطن کا مزا شباب میں ہے
لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے

چمنِ زار محبت میں اسی نے باغبانی کی
کہ جس نے اپنی محنت ہی کو محنت کا ثمر جانا
چراغ قوم کا روشن ہے عرش پر دل کے
اسے ہوا کے فرشتے بجھا نہیں سکتے

یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اسیر نہیں
یہ حرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا
ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا

زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا
ابلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

ان کے کلام میں کہیں شان و شوکت پارینہ کا ذکر ہے۔ کہیں موجودہ بے بسی اور سیاسی کشمکش کا تذکرہ ہے اور کہیں زمانہ ماضی کی داستانیں قلمبند ہیں۔ حال کا دکھڑا ہے اور مستقبل کے حسین خواب ہیں۔ غرض اس دیوان کے ایک سیر حاصل مطالعہ کے بعد آپ کو ایک محب وطن کا مکمل خاکہ مہیا ہو جائے گا۔

قومی بزرگی کا نشہ سر میں خمار اور دل میں سرور پیدا کر دیتا ہے اور شاعر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگین طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

لیکن یہ غرور کا جذبہ دیر تک قائم نہیں رہتا جونہی غلامی اور موجودہ پستی کا خیال آتا ہے نشہ ہرن ہو جاتا ہے غلامی میں انسانیت، پستی و انحطاط کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور دل مردہ ہو جاتے ہیں بقول ڈاکٹر اقبال۔

بندگی میں گھٹ کے رہجاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

چکبست کو قدرتی مناظر کا کیا لطف جب آزادی ہی نہیں ــــ

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح
اس کے لئے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

یہ آزادی بھلا کس کام کی؟
فرحت نے کیا خوب لکھا ہے ؎

کتر کر، نوچ کر، پر توڑ کر، پر باندھ کر فرحت
وہ مرغانِ چمن کو قید سے آزاد کرتے ہیں

اس وقت ملک میں قومی یگانگت، آزادی، جمہوریت اور وطن پرستی کے نعرے ہر طرف بلند ہیں اور کون، ایسا بیدرد دل ہوگا جو اس بیدردی کے رنگ کو دیکھ کر خوش نہ ہوتا ہوگا۔ مگر دور اندیش اور جوہر شناس نگاہوں سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ اکثر حالتوں میں یہ

روحانی اُمنگیں محض زبان کی نمائش کے رنگ میں گرفتار رہتی ہیں اور ابھی تک ہمارے خون میں شامل نہیں ہوئی ہیں۔

مثلاً ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ ذات کی پابندی سے عاجز ہے۔ عورتوں کی آزادی کا مسئلہ بھی اس رنگ سے خالی نہیں ہے۔ یہ آزادی و اصلاح کے فرشتے جلسوں اور کانفرنسوں میں معصوم اور بے گناہ عورتوں کی حسرتناک حالت کی تصویر الفاظ کی رنگ آمیزی سے اس طرح کھینچتے ہیں کہ دیکھنے والے اور سننے والے مسکرا مسکرا کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر روزمرہ کا تجربہ بتلاتا ہے کہ ان حامیانِ آزادی کی زبان سے کتنا ہی امرت کیوں نہ ٹپکے مگر ان کے دلوں میں بدگمانی کے زہر میں بجھے ہوئے نشتر موجود ہیں۔ انھیں عورتوں کی ذات پر ابھی تک اعتبار نہیں ہے۔ فارسی شاعر کے مقولہ میں ان کا عقیدہ باقی ہے کہ

سے اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید

پولٹیکل آزادی اور جمہوریت کے جذبات بھی مصنوعی آرائش کے اثر سے پاک نہیں ہیں۔

قومی خدمت کے راستہ کی پہلی منزل یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی کو قومی ہستی پر نثار کرنے کے لیے تیار ہو اور اپنے دل و دماغ کو تعلیم و تجربہ کے جوہروں سے آراستہ کرکے وطن پرستی کے لئے وقف کر دے۔

یہ بے محل نہ ہوگا اگر ہم اس سلسلہ میں چکبست کا غیر مطبوعہ کلام ناظرین کے لیے پیش کریں۔

کلام کیا ہے گویا حزن و یاس کا دفتر ہے۔ ہر شعر حرمان نصیبی و غلامانہ زیست کی منہ بولتی تصویر ہے ناساعد حالات نے شاعر کا دل غم و الم سے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ حکامِ وقت کی سختیوں، فریب کاریوں اور جعل سازیوں کا ایسا جال بچھا ہوا ہے کہ الامان الامان۔ ان کے ظلم و مظالم نے اُس کی روح کو بھی مجروح کر دیا ہے۔ ہمیں دانستہ جابر فرنگیوں نے پستی کے گڑھے میں ڈھکیل کر اپنی سنگدلی پر مہر لگائی ہے۔ قوانین و پابندیوں نے زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ ایک شکست خوردگی و سراسیمگی کا عالم ہے۔ دُنیا کیا ہے کھنڈرات کا رُوح فرسا منظر ہے گلستان نے ریگستان کا بھیس بدل لیا ہے۔ پھول قدرتی لطافت سے محروم ہو کر آبدیدہ نظر آتے ہیں۔ سرکار نے زبانوں پر پہرے لگا دیئے ہیں لہذا جذبات کشی کی کیفیت طاری ہے دم گھٹ رہا ہے القصہ نغمات بھی تشنہ لے اور بے لطف محسوس ہوتے ہیں۔

یہ غلط ہے کہ ہمیں طرزِ فغاں یاد نہیں
اب وہ عالم ہے کہ گنجائشِ فریاد نہیں

زندگی تھی وہی یا اور کوئی عالم تھا
کیا کہیں اس سے زیادہ ہمیں کچھ یاد نہیں

بیڑیاں زیست کی کس طرح سے جلدی کٹ جائیں
کیا کہوں میری طرح روح بھی آزاد نہیں

دل جو ویران ہوا ہو گئی دنیا ویران
کوئی گھر خوش نہیں بستی کوئی آباد نہیں

باغ میں جا کے مجھے اور قلق ہوتا ہے
پھول پتے بھی مرے دل کی طرح شاد نہیں

نغمۂ دردِ محبت ہے صدا سے خالی
کیا سُنے کوئی یہ نالہ نہیں فریاد نہیں

اُسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بیکار کٹ گئی اور

منزل مقصود ابھی کوسوں دُور ہے بسا اوقات یہ بھی شک پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم چٹان سے سر پھوڑ رہے ہیں۔ ناممکن الحصول کے لیے سعی لاحاصل کرتے رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر زندگی کا خط اٹھایا ہوتا یا کسی اور مدعا کو مرکز توجہ بنایا ہوتا۔ بعض اوقات ساری عمر کی جدوجہد کا بہت ہی تھوڑا ثمر دیکھ کر وہ کہہ اٹھتا ہے کہ کاش ہم سے کچھ زیادہ مفید مطلب کام بن پڑتا۔

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے پر
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

قصہ کوتاہ آزادی کی خواہش انسان کی اُن اعلیٰ ترین جذبات میں سے ہے جس کے لیے وہ سخت سے سخت مصیبت برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور جب تک وہ غلامی کے پنجے میں پھنسا رہتا ہے اس کے دل میں رہائی کی اُمنگ آگ کے شعلہ کی مانند بھڑکتی رہتی ہے اسی کی بدولت انسان اپنی ناتوانی اور بے سرو سامانی کے باوجود اپنے سے ہزار گنی طاقت کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ دنیا میں جتنی قومیں آزاد ہوئی ہیں ان کی کامیابی کے پردے میں اخلاقی قوت کا راز پنہاں ہے۔ جب اہل ملک کے دلوں میں عام طور پر یہ جذبہ آگ کے مانند بھڑکنے لگتا ہے تو وہ باوجود دشوار گھاٹیوں اور ناہموار راستوں کے آزادی کی منزل طے کر لیتے ہیں۔

علیم جہانگیر ایم اے، بی ایڈ (عثمانیہ)
"آسرا" ۸۸-۱-۲ قاضی واڑہ، اورنگ آباد

دہلی شاعری کے ادواروں کی

امتیازی خصوصیات

دہلی میں اُردو شاعری کا شوق بہت پُرانا تھا فارسی گو شعراء تفریحاً اُردو میں بھی شعر کہتے تھے دہلی میں اردو شاعری کا آغاز صحیح معنوں میں دلی دورے سے ہوا۔ جب دہلی کے شعراء نے ان کا کلام سنا تو ان کو یہ احساس ہوا کہ اس نئی زبان کی شاعری کا معیار فارسی شاعری سے کم نہیں ہے دہلی میں حاتم، آبرو اور فائز نے باقاعدہ مشق شروع کی۔ حاتم سے پہلے موسیٰ خاں فطرت اور ہزل خاں امیر کے نام بھی ملتے ہیں لیکن ا[illegible] کر اشعار عام نہ ہو سکے۔ ان سے قبل کے شعراء فارسی اور ہندی [illegible] تھے جس کا نام ریختہ تھا۔ اس طرح دلی کے دورے کو خط فاصل (Gobe) دے کر پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

پہلے دور میں فارسی کے وہ شعراء ہیں جو بطورِ فنون اردو میں غزل کہتے تھے۔ ان شعرا[illegible] میں سے کوئی بھی شاعر صاحب دیوان نہ بن سکا۔ اس فہرست میں خان آرزو، شمس الدین فقیر، علی خاں ندیم عبدالغنی قبول، ٹیک چند بہادر، آنند رام مخلص مرتضیٰ قلی خاں فراق اور سلیمان قلی خاں نداو شامل ہیں۔

دوسرے دور میں وہ شعرا ہیں جنھوں نے دلی کا اثر قبول کیا اور اردو زبان میں دیوان مرتب کئے۔ ایہام گوئی اس دور کا طرہ امتیاز تھا حاتم آبرو۔ فائز اور اس عہد کے دوسرے شعراء نے ایہام گوئی کی جو روایت قائم کی تھی اسکو میر تقی میر، سودا، مظہر جانجاناں اور یقین نے اردو ادب سے خارج کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

تیسرے دور میں دلی کا اثر کم ہونا شروع ہوا۔ اردو پر سے دکنی اثرات زائل ہوئے۔ نئے نئے محاورے یا تو بنائے گئے یا پھر فارسی سے ترجمے کئے گئے شعرا کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اکثر شاعر صاحب دیوان تھے۔ اردو شاعری کا دائرہ جو غزل تک محدود تھا وسیع ہوتا چلا گیا اس میں قصیدہ، ہجو، مثنوی۔ اور مرثیہ کو بھی جگہ ملی۔ اس دور میں تذکرے بھی لکھے گئے جیسے میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" قابل ذکر ہے اردو شاعری کا یہ تیسرا دور تقریباً ۷۵ سال پر محیط ہے۔

چوتھا دور مصحفی، جرات، انشا اور رنگین کا ہے اس دور کے شاعر مشاعروں میں معرکہ آرائی کیا کرتے تھے نئے نئے طرب انگیز مضامین پیش کرتے تھے اور زور کلام کے نئے نئے انداز نکالتے تھے یہ دور سودا کی وفات سے مصحفی کی وفات یعنی ۴۵ سال کو احاطہ کرتا ہے۔

پانچواں دور سنہرا دور کہلایا جاتا ہے۔ اس دور کے

غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور ظفرؔ خاص شاعر ہیں اس دور میں شاعروں نے زبان کی صحت اور صفائی کی طرف توجہ دی۔ بعض شعراء نے خیال آفرینی اور معنویت کو اہم سمجھا جو غالبؔ کی وفات تک قائم رہا۔

چھٹا دور ان شعراء کا ہے جن کے پاس زبان کی صفائی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ لیکن ان کا کلام گہرائی سے خالی ہے اور اس دور کے خاص شاعروں میں داغ، حالی اور آزاد شامل ہیں۔ یہ دور غالبؔ کی وفات سے شروع ہے اور چالیس برس تک قائم رہتا ہے۔

ساتویں دور کو ہم داغ کے شاگردوں کا دور کہہ سکتے ہیں۔ سراج الدین خاں سائلؔ، وحید الدین بےخود اور آغا شاعر بہت بڑے زبان داں تھے۔ لیکن ان کے کلام میں کوئی ایسی خوبی نہیں جس پر دہلی ناز کر سکے۔

داغ کو دہلی اسکول کا آخری شاعر ماننے میں کوئی تامل نہیں اس لیے کہ انگریزی دورِ حکومت میں دہلی کی اُردو مرکزیت باقی نہیں رہی۔ لیکن دوسرے شہروں میں اُردو نے کافی ترقی کی جن میں لکھنؤ، رامپور، حیدرآباد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری سی ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کے یہ سات ادوار قیاساً قایم کئے گئے ہیں چونکہ اکثر شاعر ایک سے زیادہ زمانوں میں موجود ہے ہیں پھر بدلتے ہوئے حالات نے شاعروں کو متاثر کیا اور اس طرح ان حالات کا بھی خاکہ اردو شاعری میں نظر آنے لگا۔ ان ادوار کو یقینی سمجھنا یا مستقبل خطِ فاصل (CONSTANT-gape) لگا دینا ایک تاریخی غلطی ہوگی یہ تقسیم صرف سہولت کے پیش کی گئی ہے۔

ہم دہلی میں شاعری کے سات ادوار معلوم کر چکے ہیں اب ہم دیکھیں گے کہ ہر دور میں مضمون، خیال، زبان اور اشعار کی دوسری خصوصیات کس طرح متاثر اور تبدیل ہوتی رہی ہیں۔

اردو زبان اور رنگ زیب کے عہد سے دہلی کی بول چال کی زبان بن چکی تھی۔ اکثر گھرانوں میں اسی زبان کا رواج تھا۔ لیکن دفاتر اور خط و کتابت کی زبان فارسی تھی۔ اس دور میں اُردو کو دوسرے درجہ کی زبان سمجھا جاتا تھا اور فارسی دانی عزت اور مرتبہ کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ اس دور کے اکثر شاعر فارسی میں شاعری کرتے تھے، لیکن چند مزاح نگار حالات حاضرہ پر اُردو نظم میں اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ خواجہ محمد عطا، جعفر زٹلی اور اٹل اس دور کے مشہور مزاح نگار ہیں۔

جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں ولی کی آمد سے دہلی میں اُردو شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ولی نے ۱۷۰۰ء میں پہلی بار ایک مسافر کی حیثیت سے دہلی آئے اور سعد اللہ گلشن کے مرید ہوئے اور شاعروں میں اپنا اُردو کلام سنایا اس طرح دہلی والوں کے اس خیال کی تردید کی کہ اُردو دوسرے درجہ کی زبان ہے۔

ولی کی زبان فصاحت، بلاغت، مضمون آفرینی اور خیال کا فارسی گو شعراء نے گہرا اثر قبول کیا۔ یہاں تک کہ مرزا عبدالقادر بیدل نے بھی جو فارسی کے مشہور استاد تھے۔ یہ سمجھنا ایک تاریخی غلطی ہوگی کہ ولی نے صرف دہلی کے شعراء کو متاثر کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اُنھوں نے دکن کو بھی متاثر کیا۔ ولی سے پہلے کی دکنی شاعری زبان و بیان

الفاظ و محاورات اور بندش کے اعتبار سے دکنی ہے، جب کہ ولی کی زبان اس سے کافی مختلف ہے۔ جس کو آسانی سے اُردو کا نام دے سکتے ہیں۔

جیسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں بھاری لگے

مشغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

دہلی کی تہذیب و تمدن اور معاشرت نے دکن اور گجرات کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ برہان پور، اورنگ آباد اور احمد آباد اس کی مثالیں ہیں۔ جہاں کی زبان، محاورات اور لب و لہجہ بالکل دہلی جیسا ہے — اورنگ زیب کی فوج جب دکن پہونچی تو نتیجے میں دکن کی زبان متاثر ہوئی اور خاص طور پر اورنگ آباد اس لئے بھی زیادہ متاثر ہوا کہ اورنگ زیب نے اپنے تخت نشین ہونے سے پہلے ہی اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں بہت سے شمالی ہند کے شعرا اورنگ آباد آئے اور اس طرح اورنگ آباد اور دہلی کے میل جول سے ایک نئے اسلوب نے فروغ پایا سراج اور ان کے بعد کے تمام شعرا اسی جدید اسلوب کے پیرو ہیں۔ اسلوب کی تعمیر کا یہ سلسلہ آصف جاہ اول کے زمانہ تک جاری رہا۔

شعر میں ذو معنی الفاظ کے استعمال کرنے کو ایہام گوئی کہتے ہیں۔ دہلی کے زوال آمادہ بادشاہوں کے دربار میں اس صنعت نے فروغ پایا۔ ایہام گوئی کے لیے فارسی گو شعرا نے زیادہ دل چسپی دکھائی اور ایہام گوئی کو قادر الکلامی کی سند سمجھا جانے لگا۔ آبرو، حاتم، مضمون، ناجی، یک رنگ، محمد احسن، پاکباز، اشرف، اشتیاق، بے رنگ، پیام حاتم علی خاں اور قبول وغیرہ کا کلام ایہام گوئی اور رعایت لفظی پر منحصر ہے۔ ایہام گوئی کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں ؎

مذہب عشق میں تری صورت
دیکھنا ہم کو فرض عین ہوا
(ولی)

جوہری حکاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں
فیروزہ ہوئے مردہ تو دیوئے ہے یہ جلا
(سودا)

گئے مدار کی جھڑیوں میں ساتھ غیر کے اور
تمام سال یہ دار و مدار ہم سے رہا
(مصحفی)

بوسہ مانگا تو لائے ذکر پتنگ
بیچ سے کاٹ دی ہماری بات
(انشا)

نہیں ہے ہونٹ پان سے ترے سرخ
ہوا ہے خون میرا آکے لبریز
(مضمون)

لیکن جلد ہی الفاظ کی بازی گری کا یہ طلسم ٹوٹ گیا، میر، سودا، میر حسن نے اس صنف کی کافی مذمت کی —

اس دور کی خصوصیات میں پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام فارسی مضامین جو قدیم شاعروں کے پاس پائے

جاتے تھے۔ اس دور کے شاعروں کے پاس بھی موجود تھے۔ مثلاً تصوف، اخلاق، خمریات وغیرہ دوسری خصوصیات زبان کی غیر یقینی کیفیت ہے اس دور کے شروع میں زبان پر ہندی کا اثرات پائے جاتے تھے لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا فارسی کا اثر بڑھتا گیا۔ ترکیبیں محاورے وغیرہ تکمیل کی صورت اختیار کرنے لگے، تیسری خصوصیات ایہام گوئی کی ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے اس دور کے شعرا نے قواعد و عروض اور قافیے کی صحت کا زیادہ خیال رکھا۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ تمام شعرا نے صرف غزل کی طرف توجہ کی۔ دوسری اصناف سخن کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ غرض دوسرا دور ایہام گوئی کا دور کہا جا سکتا ہے۔

دہلی میں اردو شاعری کا تیسرا دور "تاریخ ادب اردو" کا زریں دور ہے۔ اس دور میں زبان کی اصلاح ہوئی نئے نئے مضامین باندھے گئے۔ غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن پر بھی کافی توجہ دی گئی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایہام گوئی کا خاتمہ کیا گیا۔ اس دور کے شعرا کی سنجیدہ خدمات کے نتیجے میں زبان وسیع ہوئی، الفاظ محاورات، تراکیب اور اسلوب میں ایسی تبدیلی ہوئی جس سے اردو زبان کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اگر اس دور کے شاعر قادر الکلام اساتذہ نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ اردو کی ترقی کی رفتار سست ہو جاتی۔

میر، سودا، قائم اور سوز نے غزل گوئی میں نام پیدا کیا۔ سودا نے قصیدے میں وہ نکات پیدا کئے کہ پھر کوئی شاعر برابر نہ کر سکا۔ مثنوی "سحر البیان" میں میر حسن نے منظر نگاری اور سیرت نگاری کے مرقع پیش کرکے ایسی مقبولیت حاصل کی جو بعد کے کسی شاعر کو نصیب نہ ہوئی، غرض ہر صنف سخن کی تکمیل اس دور میں ہوئی۔

میر نے عشق اور محبت کا ایسا بلند نقطۂ نظر پیش کیا جو آج تک کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہوا۔ خواجہ احمد فاروقی نے ان کے بارے میں صحیح لکھا ہے۔

"میر نے شعر نہیں کہے دل اور دلی کے مرثیے لکھے ہیں، محبت اور انسانیت کو جلا بخشی ہے۔ غم عشق اور غم آفاق سے مل کر انکے اشعار میں آگ کی ایسی لپٹ پیدا کر دی ہے اور لفظ و معنی کی دوئی کو مٹا دیا ہے"

اور یہی وجہ ہے کہ میر اردو غزل کے سرتاج تسلیم کئے گئے ہیں ؎

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس طرح جینے کو کہاں سے جگر آوے

درد ایک صوفی منش اور درویش صفت بزرگ تھے ان کا سب سے بڑا نا قابل فراموش کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل میں تصوف کو شامل کرکے غزل کے دامن کو وسعت بخشی ان کے صوفیانہ خیالات اپنی نظیر آپ ہیں ؎

حجاب رخ یار تھے آپ ہم ہی
کھلی آنکھ جب کوئی پردہ نہ تھا

اس نے قصداً بھی مرے نالے کو
نہ سنا ہوگا کہ سنا ہوگا

بہزاد اگر مجھ سے ہو مختار تو بہتر
دل تجھ سے ملے رہنا ملا کیجئے اس سے

اس دور کا ہر شاعر اپنی جگہ اہم اور ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ نیز دہلی شاعری کے اس دور میں جتنے باکمال ایک جا اکٹھا ہو گئے تھے اُردو کی ادبی تاریخ میں ایک ہی دور میں نہ پائے گئے۔

غزل اور دیگر اصناف سخن کے علاوہ اس دور میں سب سے پہلے تذکرہ نگاری کا رواج ہوا۔ میر تقی میر میر حسن، قایم، مصحفی اور قدرت اللہ قاسم اس دور کے اہم تذکرہ نگار ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ اس دور میں چند کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ کہ شاعری کہ ان استادوں کے پاس جہاں اونچے سے اونچے اشعار مل جاتے ہیں وہیں پست شعروں کی بھی کمی نہیں اس کمزوری سے خواجہ میر درد کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ ان شاعروں نے فارسی شعراء کے علاوہ دوسرے دور کے شعراء کے خیالات کو نئے نئے جامے پہنایا۔ اب تک اردو شاعروں کو دہلی کے بادشاہوں کی سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ تیسرے دور کے شاعروں کو ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ کسی نہ کسی رئیس کی پناہ یا امداد لینے پر مجبور ہو گئے۔

تاریخ زمانے کا ایک مسلسل عمل ہے جس کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو شاعری کا چوتھا دور بھی اس اعتبار سے مکمل نہیں ہے۔ بلکہ اس کو تیسرے دور کا تتمہ (Supplement) سمجھنا چاہیئے۔ اس دور کے نوجوان، شاعروں نے تیسرے دور کے شاعروں کی آنکھیں دیکھی تھی۔ اُن کی زبان بھی قدیم زبان کے مقابلے میں زیادہ صاف ستھری تھی۔ انشاء کے زبان کی ترقی اور توسیع کے لیے نئے نئے تجربے ضرور کئے اُن کی ذہانت اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن انھوں نے اپنی ذہانت کا صحیح استعمال نہیں کیا اس لیے وہ غزل کو ترقی نہ دے سکے۔ انشاء کے علاوہ مصحفی، رنگین اور جرأت نے بھی زبان کی خدمت میں محنت کی۔ جرأت نے معاملہ بندی کے نام سے عشق مجازی کے سارے لوازمات کو نظم کرنا اپنا طریق بنا لیا اور غزل رنگیہ، چوٹی اور زلف و گیسو میں اُلجھ کر رہ گئی۔ البتہ مصحفی شعرائے متقدمین کی پاکیزگی کو اپنے سینے سے لگائے رکھا اور اُن کی روایات کو ہاتھ سے جانے نہ دیا یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے نامور شعراء نظر آتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس دور کے تمام دہلوی شعراء کو (سوائے خواجہ میر درد) لکھنؤ آنا پڑا۔

۔ یہاں پر ان شاعروں کو معمولی تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن عزت مرتبہ اور انعام و اکرام کے لحاظ سے لکھنؤ دہلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ شاعری کو دربار میں رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جانے لگا تیسرے دور کے استادوں کے مشہور شاگردوں نے بھی ادب میں کوئی خاص مقام پیدا نہ کر سکے اس دور کا ایک خاص کتاب "دریائے لطافت" ہے جو اُردو قواعد پر مشتمل ہے اور انشا کی لکھی ہوئی ہے۔

دہلی کا پانچواں دور ذوق، مومن، غالب اور ظفر سے عبارت ہے۔ اسی دور میں لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کا طوطی بول رہا تھا۔ شاعری داخلی کیفیات کے اظہار کا نام ہے۔ لیکن مشاعروں میں داخلی پہلو پر خارجی پہلو کو غالب کر دیا۔ چنانچہ وہی اشعار مشاعروں میں پسند کئے جانے لگے جن پر زیادہ سے زیادہ داد ملنے کا امکان ہوتا الفاظ کی بندش، محاوروں اور روزمرہ کا استعمال عام خصوصیات تھیں۔ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا استادی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ذوق کے استاد شاہ نصیر نے بہت سے مشاعروں میں اسطرح کامیابی حاصل کی اور سیکڑوں شاعروں کو اپنا شاگرد بنالیا شاہ نصیر کی وجہ سے دہلوی شاعری پر لکھنوی رنگ غالب ہوگیا اسطرح دہلی کے پانچویں دور میں داخلی اور خارجی دونوں رنگوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے جن شعرا نے کیفیات پر شعر کہے ان میں مومن اور غالب قابل ذکر ہیں

مومن اور غالب نے قصر شاعری کو اس قدر بلند کر دیا جس کی بلندی میں مزید اضافے کا سوال وہاں تک لوگوں کے طائر فکر کی پرواز ہی مشکل ہے ایک طرف مومن نازک خیالی ان کا تغزل، معاملہ بندی، جدت آفرینی اپنی نظیر نہیں رکھتی تو دوسری طرف غالب کی رفعت تخیل حقیقت طرازی، جدت پسندی، ظرافت و شوخی جذبات نگاری، باکمال مصوری، قریب طرز ادا بے مثل و بے عدیل ہیں خارجی پہلو پیش کرنے میں شاہ نصیر ذوق، اور ظفر کا نام لیا جاسکتا ہے چونکہ بادشاہ خارجی پہلو سے دلچسپی رکھتے تھے اس لیے دہلی میں ذوق کا مرتبہ مومن اور غالب سے بلند تھا ساتھ ہی لکھنؤ سے ناسخ آتش اور ان کے شاگردوں کی غزلیں دہلی پہونچ رہی تھیں۔

اس دور کے شعرا نے زبان کو اور بھی زیادہ صاف کیا اور دہلی کے محاوروں کو اس طرح باندھا کہ زبان میں خوشی اور شیرینی پیدا ہوگئی یہی کام لکھنؤ میں ناسخ انجام دے رہے تھے۔ لکھنؤ میں فارسی کے معروف الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ دہلی میں مرکب الفاظ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ دوسرا فرق کہ محاوروں کو جس خوش اسلوبی سے دہلی میں باندھا تھا لکھنؤ میں اس کا معیار کم تر درجہ کا تھا۔ اس دور سب سے بڑی خصوصیت استعاروں اور تشبیہوں کی جدت اور کثرت ہے مومن، غالب اور شیفتہ نے فارسی ترکیب کے گلدستوں سے اپنی شاعری کے چمن کو آراستہ کیا

یہاں یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ دہلی نے تیسرے اور چوتھے دور میں لکھنؤ کو متاثر کیا لیکن پانچ دور میں لکھنؤ سے متاثر ہوا۔ تاہم اس بجھی ہوئی آگ دہلوی شاعری کی چنگاریاں صاف نظر آتی ہیں چونکہ میں انگریزی راج قائم ہوچکا تھا اس لیے انگریزی اور سائنسی طرز فکر بھی آرہی تھی۔ اس انقلاب کے یہ ہوا کہ تصوف اور روحانی عشق کے چرچے ختم ہوگئے

دہلوی شاعری کا چھٹا اور آخری دور داغ کا ہے ۱۸۵۷ء کے غدر میں داغ ۲۵ یا ۲۶ برس کے جوان تھے دور کے بزرگ شاعر جو غالب، مومن اور ذوق کے شاگرد تھے۔ تلاش معاش میں دہلی سے باہر جاچکے تھے ان میں سالک، میر مہدی، مجروح، آزاد اور حالی قابل ہیں۔ داغ ذوق کے شاگرد تھے اور اس طرح انکا سلسلہ شاہ نصیر سے ملتا ہے یہی وہ وجہ ہے کہ داغ اور آزاد کے پاس خارجیت زیادہ ہے داغ کے مزاج میں شوخی چلبلا پن تھا۔ اس لیے ان کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہے

جب داغ رامپور سے حیدرآباد پہونچے تو ان کے کلام میں شوخی
کے بجائے پھیکا پن پیدا ہوگیا تھا۔

داغ کی زبان اس زمانے ہی کی نہیں بلکہ آج تک
مستند مانی جاتی ہے۔ زبان کی خوبی کے ساتھ ساتھ روز
مرہ کی صفائی، فصاحت وسلاست، مضمون کی شوخی، بیان
کی ندرت، تیکھاپن، معاملہ بندی اور سہل ممتنع ان کے
کلام کے جوہر ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کے اشعار سے جذبات
عالیہ پیدا نہیں ہوتے لیکن ان کا کلام اثر انگیز ضرور ہے اور
یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پر خواص و عام دونوں میں
مقبول ہے۔

مختصر یہ کہ پانچویں دور کے تمام شاعروں میں صرف
داغ کو صاحب طرز شاعر سمجھا جاتا ہے حاتم سے لیکر غالب
اور مومن تک تمام شاعروں نے فارسی کے سرمائے کو بنیاد
(BASE) بناکر جو کچھ بھی ان سے ممکن ہو سکا اردو کے
دامن کو بھر دیا۔ اب مشکل ہی سے فارسی کا کوئی ایسا خیال
ہوگا جسے اردو میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ روایتی گہرائی،
واردات قلب، تصوف، عشق حقیقی و عشق مجازی، معاملہ
بندی، مضمون آفرینی، نازک خیالی، نئی تشبیہات۔
غرض ہر چیز اپنے معراج تک پہونچ چکی تھی۔ گل و بلبل
شمع و پروانہ، لیلیٰ مجنوں، جفائے محبوب، رشک اظہار
آرزوئے وصال، غم جدائی، سراپا محبوب اور مذہبی ٹھیکیداروں
پر طنز وغیرہ جیسے مضامین ختم ہو چکے تھے اس لیے اب
اردو کو ایک ایسی زمین کی تلاش تھی جہاں نئے درخت
لگائے جائیں اور نئے شگوفے کھلائے جائیں ٹھیک۔ ایسے
وقت میں جبکہ فارسی کا خزانہ اردو میں منتقل ہو چکا تھا۔

اور اردو شاعری نئے خیالات کے لیے ترس رہی تھی۔
۱۸۵۷ء کا انقلاب نمودار ہوا۔ اس انقلاب نے جدید
تصورات کی بنیاد رکھی، آزاد و حالی اس نئے چمن کے پہلے
باغبان قرار پائے۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے
کہ آزاد اور حالی جو جدید شاعری کے امام ہیں اردو
کے قدیم ورثے سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور وہ یہ
جانتے تھے کہ کاروان ادب کی منزلوں میں ہے اور اردو کے
خزانے میں پہلے سے کیا موجود ہے کیا اور اب کس چیز کی
ضرورت ہے ان بزرگوں کی رہنمائی اردو ادب کے لیے ایک
نیک فال ثابت ہوئی اور اردو دہلی اور لکھنؤ کی اصطلاحوں
سے ماورا ہو کر کل ہند نوعیت کی زبان بن گئی۔

ماہنامہ فروغ اردو ملکیت کے متعلق رجسٹریشن و قواعد ۱۹۵۶ء
کے قاعدہ ۸ کے تحت بیان

۱- مقام اشاعت: لکھنؤ
۲- نوعیت اشاعت: ماہنامہ
۳- نام پرنٹر: سید انصار حسین
قومیت: ہندوستانی
پتہ: اقبال منزل مقبرہ عالیہ (گولہ گنج لکھنؤ)
۴- نام ایڈیٹر: محمد حسین شمس علوی
قومیت: ہندوستانی
پتہ: نعمت اللہ روڈ بلڈنگ نعمت اللہ روڈ لکھنؤ
مالک اخبار: سید انصار حسین

میں سید انصار حسین تصدیق کرتا ہوں کہ جو اطلاعات اوپر دی گئی ہیں وہ
میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

(سید انصار حسین)

افسانہ

محبت کے دشمن

—— روشن جہاں ——

شبینہ دریچہ میں کھڑی دور خلاؤں میں [illegible] بدتی اور دھندلی ہوتی ان تصویروں کو دیکھ رہی تھی جو [illegible] یادا ہو کی زندگی کا حاصل بن گئی تھی۔ اس کی تمام تر امیدیں اسی یاد سے وابستہ تھیں۔ جو لندن جاتے وقت سیف کا یہ کہنا شبی میں جلدی واپس آؤں گا تم میرا انتظار کرنا اور پھر ابی نے پھوپھی امی سے تجھ کو یہ کہہ کر مانگ لیا ہے شبینہ میری ہے وہ صرف میرے سیف کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ کتنا پیارا ہے یہ خیال کہ سیف آتے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنالیں گے۔ چار سال کی مدت اس نے اسی آس کے سہارے گزاری تھی کہ تعلیم سے فارغ ہوکر سیف آجائے گا۔ آج اس کا سیف ہزاروں میل کی مسافت طے کرکے واپس آرہا تھا پھر مجھے سرخ جوڑا پہنا کر اپنے گھر لے جائیگا اس خیال کے آتے ہی اس کے چہرے پر شرم کی سرخی رقص کرنے لگی۔ شرم حجاب کا یہ پیکر اپنی خوشی کو سینہ میں دبائے اس وقت کی منتظر تھی جب اس کا اپنا سیف آکر شبی کہہ کر پکارے گا۔ ابھی وہ اس خیال سے لطف اندوز

بھی پوری طرح نہ ہو پائی تھی کہ سمینہ نے اس کا شانہ ہلا دیا اور تخیل کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

سمینہ..... آسمینہ آپیا! دریچہ سے شاید آسمان پر یہ دیکھ رہی ہیں کہ سیف بھائی کا جہاز ادھر سے گزرے تو میں دوپٹہ کا آنچل لہرا کر یہیں لینڈ کرا لوں۔ کہاں چلوگی نہیں میں تو کب سے تیار ہوں اور آپ ویسی کھڑی ہیں۔

شبینہ..... مسکرا کر! اوں۔ تم بہت باتیں کرنے لگی ہو پہلے یہ بتاؤ کہ امی نے جانے کے لیے کہا ہے یا تم اپنی طرف سے کہہ رہی ہو۔

سمینہ ـــــ بس بہر بات میں امی جب تک نہ کہیں جا نہیں سکیں وہ بہا کے گھر تو جھٹ چلی جائیں گی مگر ان کو لینے نہیں جائے گی۔

شبینہ ـــ ہنس کر! اف کسی بہت شرارت آگئی ہے تم جاؤ میں نہیں جاتی۔ گھر آئیں گے دیکھ لوگی میرا جانا کیا ضروری ہے۔

سمینہ ـــ منہ پھولا کر ـــ میں بھی نہیں جاؤں گی یہ نہیں سوچتیں کہ سیف بھائی جب تم کو وہاں نہیں دیکھیں گے تو بیچارے کیا سوچیں گے۔

شبینہ ـــ تو سمجھتی کیوں نہیں۔ اتنی جلدی روٹھ جاتی ہے سشرما کر تو کیا سمجھے گی پگلی۔ میری بہن ضد نہ کر چلی جا۔ بہت اچھی ہے میری سمی۔ آخر سمینہ کو پھر جانا ہی پڑا۔ شبینہ کے جاتے ہی وہ شام کے دھندلکوں میں اپنے مستقبل کی جگمگاتی قندیلیں دیکھ رہی تھی سیف کو لینے گھر کے سب ہی لوگ ہوائی اڈے جا چکے تھے۔ اور شبینہ انتظار کی گھڑیاں بڑی بے قراری سے گن رہی ـــ کال

کال بیل کی آواز کے منتظر تھے جو اس کے خوابوں کے شاہزادے کی آمد کا اعلان کرنے والی تھی۔

سیف گھر آچکا تھا سب عزیزاقارب اس کو چاروں طرف سے گھیرے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مگر سیف کی بے قرار نگاہیں جس کو تلاش کر رہی تھیں وہ یہاں نہیں تھی۔ پہلو میں بیٹھی سمینہ سے آہستہ سے پوچھتا ہے کہ شبی کیوں نہیں آئی اور سمینہ بھی سرگوشی میں جواب دیتی ہے ان کو شرم آرہی تھی کیسے آتیں۔

سیف ـــ امی! میں ذرا پھوپھی اس سے جاکر مل آؤں ابھی آتا ہوں۔

والدہ سیف ـ اس وقت آرام کرو آتے ہی چل دیے ذرا آرام لو پھر صبح دیکھا جائے گا ایسی جلدی کیا ہے

سیف سمینہ کو لیکر وہاں سے چل دیا۔ یہ راستہ اس کو کاٹنا اتنے لمبے سفر سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا جلدی ٹیکسی پکڑی اور جلد یا ٹیکسی رکتے ہی وہ کر اترا اور دوڑ کر کال بیل پر انگلی رکھی تو اس وقت نہ ہٹائی جب تک دروازہ نہ کھل گیا۔

شبینہ جو اب تک جاگ رہی تھی بستر سے کود کر اتری اور دروازہ کھولا تو سیف نے جھٹ اپنی باہوں میں اس کو یہ کہتے ہوئے جکڑ لیا۔ میں آگیا میری شبی میری شرمیلی گڑیا۔

شبینہ ـــ خدارا مجھے چھوڑ ہے سمینہ آرہی ہے

سمینہ ـــ اُف آپیا! آپ کی شرم نے تو حد کر دی ارے سیف بھائی کو اندر آنے کو بھی نہیں کہتی بیچارے کب سے کھڑے ہیں آئیے سیف بھائی اندر چلیں

شبینہ دوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سیف اپنی
پھوپھی کے پاس پہونچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر شبینہ
کے کمرے میں آگیا۔

سیف :- شبی! تم ابھی تک ویسی نازک شرمیلی
سی گڑیا ہو بالکل کوئی فرق نہیں ہوا۔

شبینہ :- شرما کر! اور آپ؟ آپ بھی تو پہلے
ہی جیسے چنچل شریر ہیں آتے ہی....

سیف :- جانتی ہو کہ میں کیوں آیا ہوں تم کو لینے
ہی آیا ہوں۔ تم بالکل تیار رہنا۔ اتنے میں سمینہ چائے
لیکر آگئی۔

سیف لندن کی آزادی سے لیکر وہاں کی خوبصورت
اور ماحول تک کی تمام باتیں بتاتا رہا۔

سمینہ :- سیف بھائی وہاں کی لڑکیاں تو بہت
خوبصورت ہوتی ہیں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ میم صاحبہ کو
لیکر آئیں گے۔

سیف :- ارے بابا معاف کرو۔ مجھے بالکل وہ
بیباک اور میک اَپ سے لتھڑی لڑکیاں بالکل ناپسند
ہیں ان کی بے حجابی ایک آنکھ نہیں بھاتی میں تو رسیلی آنکھیں
لمبے بال شرمیلی پر حجاب لڑکی پسند کرتا ہوں شبی جیسی۔
جس کا حسن قدرتی ہو بناوٹی حسن بھی کسی کام کا ہوتا ہے
اسی لئے میں اپنی دلہن انڈیا لینے آیا ہوں

سمینہ :- مگر ہے کہاں میری بھابھی بھلا مجھے
بھی تو بتائیں۔

سیف :- ابھی تم شبی سے اجازت لے لو میں ابھی
دیکھ سکتا ہوں۔ اچھا شبی میں چلوں صبح پھر ملیں گے،
خدا حافظ

شبینہ تکیہ میں منہ چھپا کر سیف کی باتوں کے تصور
سے شرما رہی تھی۔ ہائے وہ نیلے سوٹ سرخ ٹائی میں
کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ اب تو پہلے سے زیادہ اچھے ہوگئے
ہیں۔ ممانی جان نے امی سے اگر جاتے وقت یہ بات نہ
کہہ دی ہوتی تو میں بھی سمینہ کی طرح ان سے کھل کر بات
کرتی مگر اب تو نہ جانے کیوں سامنے جاتے شرم آتی ہے
کیا واقعی وہ مجھے لیجانے کیلئے آئے ہیں۔

اتنے میں برابر کے کمرے سے امی اور آصف کی آواز
نے اس کے ذہن میں کھلبلی مچادی۔

آصف :- امی! میں نے سنا ہے کہ صیف انڈیا
شادی کرنے کی غرض سے آیا ہے مگر ماموں جان نے تو
آپ سے تیاری کی کوئی بات نہیں کی معاملہ کچھ اور ہی
نظر آرہا ہے شاید ممانی جان کا ارادہ بدل گیا ادھر
اُدھر لڑکی تلاش کر رہی ہیں فاروق نے بتایا کہ وہ اتنی
حسین بہو تلاش کر رہی ہیں کہ اس کا ثانی دنیا میں نہ ملے۔
اور ماموں جان دولت چاہتے ہیں۔

والدہ آصف :- ہاں بیٹے ہماری غریبی کا مذاق
اڑایا جا رہا ہے۔ مجھے بہت پہلے اللہ رکھی نے آکر بتایا تھا
مگر میں شبینہ کے خیال سے چپ تھی۔ میری بچی کا کیا ہوگا۔
چار سال تک اس نے صیف کو اپنا ہونے والا شریک حیات
سمجھ کر انتظار کیا ہے۔

آصف :- آپ فکر نہ کریں شبینہ کو بھی اچھا لڑکا مل
جائے گا میری اتنی خوبصورت بہن ہے۔

شبینہ ان کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہی تھی

س کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ہائے میرے ابّو پر اس خبر کا
یا اثر ہوگا۔ مگر سیف تو ابھی کہہ گئے ہیں کہ میں تم کو لینے
کے لیے ہی انڈیا آیا ہوں۔ وہ ضرور ممانی جان کو راضی کر
یں گے۔ اس بات کا اطمینان ہوتے ہی جلد نیند کی آغوش
ں پہونچ گئی۔

صبح سب لوگ چائے سے فارغ ہوکر بیٹھے تھے،
شبینہ باورچی خانے میں ناشتہ بنا رہی تھی کہ سیف آگیا۔

آصف :۔ آؤ سیف! کمال ہے تم میں کوئی
تبدیلی نہیں آئی میں تو سمجھ رہا تھا لندن سے انگریز بنکر
آؤگے اپنی میم صاحبہ کے ساتھ۔

سیف :۔ قہقہہ لگاکر۔ آصف بھائی آپ کو
معلوم ہونا چاہیے اپنے وطن کی پوری چھاپ ہوں وہ
بندر ذلیل قسم کے ہوتے ہیں جو اپنی چال بھول کر ان گورے
بندروں کی نقل کرتے ہیں۔ سب اچھائیاں ہیں مگر بے حجابی
بہت ہے اور یہی بات مجھے سب سے زیادہ بری لگتی ہے

آصف :۔ ہنس کر! تعجب کی بات ہے اچھا تم ان
لوگوں سے باتیں کرو میں ابھی آتا ہوں۔

سیف :۔ سمینہ۔ پھوپھا جان کہاں ہیں اور
شبی کیا ابھی تک سو رہی ہے۔

سمینہ :۔ آپیا تو باورچی خانے میں ہیں اور ابّو
صبح ہی چلے گئے

سیف :۔ کیوں حمیدن کہاں ہے جو شبی کام کرتی
ہے۔

سمینہ :۔ وہ تو تین سال ہوئے مر بھی گئی۔

سیف :۔ جاتا ہوں دیکھوں شبی نے کیا بنایا اور

پھر وہ باورچی خانے میں تخت پر جاکر بیٹھ گیا۔

شبینہ :۔ ارے آپ یہاں دھوئیں میں کہاں
پریشان ہو رہے ہیں کالے ہو جائیں گے تو پھر خوبصورت
دلہن کیسے ملے گی۔

سیف :۔ ارے میری دلہن بھی کالی ہوئی جاتی ہے
اسی سے رنگ برابر کرنے آکر بیٹھ گیا ہوں۔ میں تو تمھارا
خاطر اتنی دور سے آیا ہوں اور تم یہاں گھسی ہو۔ گھر کیوں
نہیں آئیں۔

شبینہ :۔ بس یونہی میں جانتی تھی کہ آپ آئیں گے
ضرور اسی لیے تو جاگ رہی تھی۔

سیف :۔ خوش ہوکر اچھا۔ تب تو میں خوش قسمت
ہوں کافی دیر صیف رہا اور بار بار یہی کہتا رہا بس تم تیار
رہو تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔

ادھر گھر میں دونوں ماں باپ اس بات پر تکرار کر
رہے تھے کہ پیسہ میں بڑی طاقت ہے اور ماں کہتی تھی کہ
صورت تو سب دیکھتے ہیں۔

والد سیف :۔ ارے بیگم تم نہیں جانتی ہو جج عامر
کی لڑکی پچاس ہزار نقد لائے گی رہی صورت کی بات
کیا وہ سب ٹھیک ہے اتنا پیسہ ساتھ میں لائے گی۔

والدہ سیف :۔ کلیم صاحب کی لڑکی شبینہ سے زیادہ
خوبصورت ہے میرا تو اس کو دیکھ کر دل لوٹ گیا۔ اس
کا رکھ رکھاؤ لندن کے حساب سے بہت ٹھیک ہے۔
جہیز بھی تو پچاس ہزار کا لا رہی ہے۔ لو وہ آگیا بیٹا اب
اس سے آپ ہی پوچھ لیں کہ دولت چاہیے یا خوبصورت
لڑکی۔

سیف :۔ تعجب اور حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگا دونوں ماں باپ نے اپنی اپنی تجویز سامنے رکھ دی ۔۔

سیف کا سر چکرا گیا خاموشی سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آکر برابر کے کمرے میں ماں باپ کی آپس کی تکرار کو سننے لگا۔ جب تکرار حد کو بڑھ گئی تو پھر وہ وہاں پہونچ گیا۔

سیف :۔ امی ! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب یہ باتیں کیوں ہو رہی ہیں جب آپ چار سال پہلے رشتہ طے کر چکی ہیں۔

والدہ سیف :۔ اب مجھے وہاں کا خیال بھی نہیں کرنا ہے رفیہ کے پاس جہیز میں دینے کو رکھا ہی کیا ہے۔ ایسی شرمیلی لڑکی کے ساتھ شادی کرکے لے جاؤ گے تو پریشان ہو جاؤ گے۔

ٹھیک ہے تو مجھے جلدی واپس جانا پڑے گا۔ یہ کہتے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ دیر تک بستر پر پڑا امی کی کہی ہوئی بات پر غور کرتا رہا بہت خوب بہو کے جہیز سے وہ اپنا گھر سجائیں گی کیونکہ یہ سب جہیز تو میں لے جا نہیں سکتا۔ ابو کو پچاس ہزار کی رقم چاہیئے۔ اور میں شبینہ کی قبر پر امی اور ابو کی خوبصورتی اور دولت کا محل نہیں کھڑا کر سکتا مجھے جانا ہی ہوگا۔

اور پھر وہی ہوا سیف جا رہا تھا آج بھی اسکے لبوں پر وہی پیغام تھا شبی تم میرا انتظار کرنا اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو چلو ہم سویل میریج کر کے چلتے ہیں۔

شبینہ :۔ چھلکتی آنکھوں سے ۔۔ نہیں میں اپنے ارمانوں کے پورا کرنے کے لیے اپنے غریب باپ بھائی کی عزت کا نیلام نہیں کر سکتی جو مجھے اپنی خوشیوں سے زیادہ عزیز ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی سیف۔ ہاں میں آپ کا آخری سانس تک انتظار کر سکتی ہوں مشرقی لڑکی ایک ہی آدمی کو اپنا شریک حیات بناتی ہے اور ان چار سال میں میں نے آپ کو یہی سمجھ کر یاد کیا ہے ۔

سیف :۔ میں جانتا ہوں شبی پر والدین کی ناراضگی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

شبینہ :۔ آپ کو اپنے بارے میں اختیار ہے مگر میں آپ کے سوا کسی شخص کے تصور کو بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ آپ پر میرا حق ہی کیا ہے یہ کہتے ہی وہ سیف کے شانے پر سر ٹیکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ایک تماشہ تھا جو سب نے میرے ساتھ کیا۔

صیف کا جہاز بلندیوں کو چھوڑ رہا تھا اور شبینہ غم کی گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔

ابو محمد شبلی

"ضبط شدہ نظمیں"

تحقیق کے آئینہ میں

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اُردو زبان نے جو کارہائے نمایاں انجام دینے میں اس کی مثال بنگلہ زبان کے سوا ہندی یا ہندوستان کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کرسکتی سیاسی حالات کی بنا پر ہم خود احساس کمتری کے مریض ہوچکے ہیں اس لیے اپنی زبان کی قدر رد قیمت بھی ہماری نظروں سے گرتی جا رہی ہے۔ کبھی کوئی کوشش کی جاتی ہے تو اس کا مقصد نام و نمود کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا ذاتی منفعت اور نام آوری کے لیے بھی کوئی کام سلیقہ سے کیا جائے تو آم کے ساتھ گٹھلی کے دام بھی مل جاتے ہیں مگر یہ زبان اُردو کی بدقسمتی ہے کہ اس کے خدام حصول منفعت کا کاروبار بھی کرتے ہیں تو اس کا براہ راست نقصان اُردو ہی کو پہونچتا ہے۔

جنگ آزادی میں اُردو کی خدمات کے ایک پہلو کو پیش کرنے کیلئے جون ۱۹۷۵ء میں ایک کتاب "ضبط شدہ نظمیں" کے نام سے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے زیر اہتمام چھپی اور "مجلس جشن علی جواد زیدی" کے جناب علی جواد زیدی صاحب کی نذر کی گئی۔

کتاب کو ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُردو کے خادموں نے اُردو کی سیاسی اہمیت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

موضوع اور زبان کی سیاسی اہمیت کے پیش نظر اس کی رسم اجرا محترمہ اندرا گاندھی کے ہاتھوں انجام پائی۔ سابق وزیر اعظم کے ذریعہ رسم اجرا اور ایمرجنسی کا نفاد اس صحیفہ کے مرتبین کے لیے فال نیک ثابت ہوئی۔ کوئی تنقید ممکن نہ تھی۔ جناب عتیق صدیقی صاحب اور جناب عبداللطیف اعظمی صاحب نے کانگریس کے آرگن کو استعمال کرتے ہوئے دبے الفاظ میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ اس مجموعہ کی ساری نظموں "ضبط شدہ" کا اطلاق نہیں ہوسکتا کہ ہفتہ وار "سب ساتھ" پر دباؤ ڈالا گیا اور یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ راقم السطور کا مراسلہ بھی ان لفظوں کے ساتھ واپس آیا۔

> "ضبط شدہ نظموں کی بحث کو اب ختم کیا جاچکا ہے۔ سنبھل کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سلسلہ میں بھی ہم نے کوئی مضمون شائع نہیں کیا ہے۔ اگرچہ متعدد مضامین موصول ہوئے تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا مضمون شائع نہ کرسکیں گے اس لیے واپس ارسال خدمت ہے اس کے لیے ایک بار پھر ہم معذرت خواہ ہیں۔"
>
> (اڈیٹر سب ساتھ۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۵ء)

اس کے بعد میں نے چند نظموں پر مشتمل ایک تبصرہ دہلی کے ایک ماہنامہ کو روانہ کیا جو ان الفاظ کے ساتھ واپس آیا۔

> "آپ کا مضمون مل گیا تھا میں نے اسے شائع کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا لیکن اسے سنسر کی منظوری نہ مل سکی کچھ ایڈٹ کر کے میں نے اسے معتدل بھی بنا لیا لیکن بات نہ بن سکی۔ دلی معذرت کے ساتھ مضمون آپ کو لوٹا رہا ہوں۔"
>
> (اڈیٹر ۔۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۶ء)

اس طرح اُردو کے "خدام" ایمرجنسی کے اندھیرے میں شب خوں مارتے رہے اُردو کا دامن داغدار ہوتا رہا کسی کو اس کے دھبے دھونے کی فرصت تھی نہ اجازت۔

اس نذرانہ کی ادبی حیثیت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تنقیدی یا تاریخی حیثیت سے بھی مایوس کن حد تک گری ہوئی ہے ایک عام قاری یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ "ان نظموں کے انتخاب میں کون سا مقصد اور اصول و معیار (criterion) پیش نظر رہا ہے (عبداللطیف اعظمی)

دوسو اسی صفحے کی کتاب کے تین حصے ہیں۔ تیرہ صفحوں کو چھوڑ کر ۷۵ صفحے قصیدہ منشور کے لیے وقف ہیں۔ ۸۴ صفحوں پر "[illegible] دی کی نظمیں" مرتبہ عتیق صدیقی اور سید سبط حسن سے افز[illegible] ر[illegible] ہوں ۳۹ نظمیں ہیں۔ یہ کتاب رام گڑھ کانگریس کے موقع پر شائع ہوئی اور ضبط ہوگئی تھی اور باقی ۱۸۱ صفحوں پر ۷۸ نا تحقیق نظمیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اُن میں بائیس لا معلوم ہیں سترہ صرف تخلص کے ساتھ ہیں باقی اکتالیس نظموں کے شعرا کے نام اور تخلص بھی ہیں۔ چکبست کی نظم "خاک ہند" کے تین بند (صفحہ ۱۵۴) بھی لا معلوم تھے۔ فہرست کی کتابت کے وقت معلوم ہوئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ صفحہ ۱۹۸ پر یہ نظم نام اور تخلص کے ساتھ چھپی ہوئی ہے۔" ان نظموں کی نہ تو شان نزول ہی بیان کی گئی ہے اور نہ شعرا کا مختصر احوال ہی درج کیا گیا ہے (عتیق صدیقی) دو سال کی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد میں بشمول پچیس

نظموں کے بارے میں کچھ معلوم کر سکا ہوں۔ اشعار اور مصرعوں کی بے ترتیبی اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے شعرا کے نام اور تخلص بھی غلط ہیں۔ حد یہ کہ تلوک چند محروم صاحب اور لال چند فلک صاحب کی نظمیں بھی دوسرے ناموں سے چھاپ لی گئی ہیں۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نظم و نثر کی تخصیص کے بغیر جہاں انگلی رکھ دیجئے ایک سوالیہ نشان ابھرتا ہوا لے گا۔ نظموں میں کہیں عنوان غلط ہے کہیں الفاظ کو بدل کر حسب حال بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ غرضکہ رطب و یابس کا ایک پشتارہ ہے جو عمدہ کاغذ، خوبصورت کتابت و طباعت۔ مضبوط جلد اور نفیس گرد پوش کے ساتھ ڈیمائی سائز کی کشتی میں سجا کر آنے والی نسلوں کو بطور تحفہ پیش کیا گیا ہے۔ تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ صفحہ ۸۲ تا ۸۹ :۔ شہید آزادی،
پنڈت رام پرشاد بسمل سے منسوب چار نظمیں ہیں
جب بسمل کی خود نوشت سوانح کی بنا د پر اُن کا
شاعر ہونا ہی مشتبہ ہے۔ جناب علی جواد زیدی
صاحب بھی اُنھیں شاعر تسلیم نہیں کرتے اُنکی مرتب
کی ہوئی کتاب " اردو میں قومی شاعری کے سو سال"
شائع کردہ یو پی حکومت۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۷ء جو اس موضوع پر ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے (مجتبیٰ حسین)" میں اُن کے نام یا تخلص کی ایک نظم بھی نہیں ہے اس لیے یہ نظمیں رام پرشاد بسمل کی ہو ہی نہیں سکتیں۔

پہلی دو غزل کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کس اور بسمل کی ہوں گی۔ پنڈت رام پرشاد بسمل سے والہانہ عقیدت رکھنے والوں اور اُردو زبان کو مشترکہ قومی میراث قرار دینے والوں نے بہت سے اشعار اور نظمیں صرف لفظ بسمل کے سہارے اُن سے منسوب کر دیئے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال کا مشہور شعر (شمع اور شاعر۔ بانگ درا)

؎ آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

اور حضرت امیر مینائی کی ایک غزل (مراۃ الغیب صفحہ ۲۶۲) کا مطلع ؎

بہے بحر فنا میں جلد یارب لاش بسمل کی
کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہر شمشیر قاتل کی

صرف لفظ بسمل کی وجہ سے رام پرشاد بسمل سے منسوب ہیں
تیسری غزل " سرفروشی کی تمنا" سید شاہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی کی ہے " صباح" ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ (اخبار " صباح" جون یا جولائی ۱۹۲۰ء میں قاضی عبد الغفار صاحب مرحوم کی ادارت میں دہلی سے جاری ہوا تھا)۔ میں اپنے محدود مطالعہ کی بنا پر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پنڈت رام پرشاد بسمل خالق تو درکنار آخیر وقت تک اس غزل سے واقف بھی نہ تھے۔
چوتھی نظم بسمل کی اتم کتھا میں ان لفظوں کے ساتھ چھپی ہوئی بارہ نظموں میں سے ایک ہے۔
"میری یہ خواہش ہو رہی ہے کہ میں ان کو بتاؤں
میں سے بھی چند کو یہاں پیش کروں جو مجھے
پسند ہیں اور جن کو میں نے اس وقت زبانی
یاد کیا تھا"۔ (اتم کتھا طبع ثانی۔ مطبوعہ آتما رام
اینڈ سنز ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۱۸)

ں کے بعد ان نظموں کو رام پرشاد بسمل سے منسوب کر
یا جائے تو مرتبین کے تحقیق کی داد ہی دی جا سکتی ہے
اتم کتھا (جسے انگریزوں نے ضبط کیا تھا) میں اس
س کے پندرہ بند ہیں۔ لیکن مرتبین نے صرف درمیانی
بیچ بند کو "ضبط شدہ" تسلیم کیا ہے۔ کتاب زیر تبصرہ
ں چھپے ہوئے چوتھے بند کے آخری دو مصرعے ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

تش کے شاگرد اور اکبر کے استاد وحید الہ آبادی کی
ل کا ایک شعر ہے۔ میرا خیال ہے یہ نہیں اشفاق اللہ
اں شہید کا کوری کی ہے۔

۲۷ صفحہ ۹۰۔ تا ۔ ۹۳ :۔ بسمل کے ہم سفر شہید آزادی
شفاق اللہ خاں کا ایک شعر اور ایک غزل "شورش
بنون" کے صرف تو بے ترتیب اشعار ہیں جبکہ اصل غزل
کے چودہ اشعار اشفاق اللہ خاں کی عکس تحریر کیسا تھ
"امر شہید اشفاق اللہ خاں" (ہندی) مرتبہ پنڈت بنارسی
داس چترویدی ۱۹۶۷ء صفحہ ۹۳ پر چھپے ہوئے ہیں۔
شفاق اللہ خاں کا تخلص اشفاق نہیں حسرت تھا تعجب
ہے کہ صرف ایک شعر (ص ۹۰) ؎

وطن ہمارا ہے شاد کام اور آزاد
ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے رہے نہ رہے

کس کتاب یا پرچہ میں چھپا تھا۔ جو ضبط ہو گیا۔ کوئی حوالہ
بھی نہیں کہ رہنمائی ہو۔

"شورش جنون" کو شہید کا کوری کی آخری نظم
لکھا گیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے حسرت وارثی کی یہ نظم ستمبر۔ دسمبر ۱۹۲۵ء
میں لکھی گئی تھی۔ اگست ۱۹۲۵ء میں کا کوری ڈکیتی ہوئی
اس کے بعد وہ ڈالی گنج (بہار) میں بحالت روپوشی شعر و
شاعری کی محفلیں سجاتے رہے۔ یہ نظم اسی زمانہ کی ہے۔
دوران مقدمہ رنگ تھیٹر کے ہال میں جہاں کاکوری
سازش کا مقدمہ زیر سماعت تھا سرکاری وکیل پر جو لبرل
پارٹی سے تعلق رکھتے تھے چوٹ کرتے ہوئے برجستہ ایک شعر
موزوں کیا تھا ؎

چلو چلو یارو رنگ تھیٹر دکھائیں تمکو وہاں پہ لبرل
جو چند ٹکڑوں پہ سیم و زر کے نیا تماشہ دکھا رہے ہیں

پھر اسی زمین میں سات شعروں کی غزل مکمل ہوئی جو امر شہید
اشفاق اللہ خاں (ہندی) صفحہ ۹۵ پر چھپی ہے اس کے
علاوہ اور بھی نظمیں کہی گئی تھیں جو ہر پیشی کے دن سارے کے
سارے ملزمین جھوم جھوم کر اور اپنی بیڑیوں کو بجا بجا کر
گایا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک نظم فیصلے کے دن گائی گئی تھی
اس کے بول تھے ؎

ہے ماتر بھومی تیری سیوا کیا کروں گا
پھانسی ملے مجھے یا ہو جنم قیدی مری
بیڑی بجا بجا کر تیرا بھجن کروں گا

(امر شہید اشفاق اللہ خاں صفحہ ۱۳۷)

(باقی آئندہ)

یوتھ پرنٹنگ پریس، چندر شیکھر آزاد مارگ قصائی باڑہ، امین آباد لکھنؤ

مطبوعات ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

بہ ترتیب حروف تہجی مع جدید قیمت، فروری ۱۹۷۷ء

(ا)

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۱	امیر خسرو نمبر	فروغ اردو	۱۲/-
۲	ادبی جائزے	سعادت علی صدیقی	۸/-
۳	ایکتا کا چمن تہواروں کے پھول	نمر لسبوانی	۳/-
۴	احتشام حسین نمبر فروغ اردو	سید انصار حسین ماہلی	۲۵/-
۵	اردو کا ماضی حال اور مستقبل	احمد ابراہیم علوی	۴/-
۶	آئینہ نظم اردو	نمر لسبوانی	۴/-
۷	انتخاب کلام چکبست لکھنوی	روپ نرائن شیو پوری ساگر	۱/-
۸	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر محمود الحسن رضوی	۱۶/-
۹	اردو ہم نمبر فروغ اردو	اقبال صدیقی	۳/۵۰
۱۰	انوار اللغات اردو المعروف بہ شمس اللغات (پاکٹ سائز)	پروفیسر احتشام حسین	۶/-
۱۱	ادبی تاثرات	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۶/-
۱۲	آئینہ عقل	پروفیسر نکہت شاہجہانپوری	۴/-
۱۳	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶/۵۰
۱۴	امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۱۵	انارکلی امتیاز علی تاج (جدید اڈیشن)		۳/۵۰
۱۶	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۵/۵۰
۱۷	اردو تنقید پر ایک نظر مع اضافہ جدیدہ	پروفیسر کلیم الدین احمد	۱۰/-
۱۸	اردو میں تنقید	ڈاکٹر احسن فاروقی	۶/-
۱۹	انتخاب قصائد اردو	مغیث الدین فریدی	۱/۵۰
۲۰	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور	۸/-

نمبر	کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
۲۱	اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حصہ دوم	عبدالشکور	۸/-
۲۲	ادبی نقوش	شاہ معین الدین ندوی	۸/-
۲۳	اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں	عبدالماجد دریابادی	۸/-
۲۴	انتخاب جدید نثر اردو	سید احتشام حسین	۵/-
۲۵	اقبال مرتبہ فروغ اردو		۱/۵۰
۲۶	البرامکہ اور ان کا عروج و زوال	ڈاکٹر حبیب حسین ایم اے	۳/-
۲۷	انتخاب کلام غالب	بشیر احمد علوی	۱/۵۰
۲۸	ادبی تنقید	ڈاکٹر محمد حسن	۸/-
۲۹	انتخاب قصائد غزلیات	فروغ اردو جدید اڈیشن	۴/-
۳۰	ادب کیا ہے	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۴/-
۳۱	ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	۸/-
۳۲	آئینہ نثر اردو	سعادت علی صدیقی	۲/۵۰
۳۳	ایک نادر روزنامچہ	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۴/۵۰
۳۴	ابوالنجم	مجنوں گورکھپوری	۰/۵۰
۳۵	اردو کی کہانی	سید احتشام حسین	۲/۵۰
۳۶	ادب پارے حصہ نظم و نثر		۵/۲۵
۳۷	ابوالکلام آزاد (نظم)	جگن ناتھ آزاد	۰/۲۵
۳۸	ارمغان نثر و نظم	عبدالاحد خلیل	۴/۷۵
۳۹	افسانہ نمبر	(مرتبہ فروغ اردو)	۲/۵۰
۴۰	اچھی نظمیں	اظہر مشتاق	۰/۷۰
۴۱	اردو ادب میں طنز و مزاح کامل دو جلد جدید اڈیشن	غلام احمد فرقت	۲۵/-
۴۲	اردو شاعری	امیر احمد علوی	۲/۵۰
۴۳	غزلیات حافظ صاحب	غالب فارسی	۳/۵۰
۴۴	آخری یادگار نادر شاہ مع ترجمہ		۲/-
۴۵	اپنی پہچان یعنی زندگی کا حال معلوم کرنے والی کتاب	اعجاز احمد فاروقی	۱/۲۵
۴۶	اللہ کے پیارے	احمد حسن توراقی	۰/۵۰

۴۷۔ اسپین کی شہزادی — صادق سردھنوی — ۴/۵۰

۴۸۔ ادبی معرکہ نمبر مرتبہ فروغ اردو — ۲/۵۰

۴۹۔ اپنی موج میں — آوارہ — ۲/۵۰

۵۰۔ انوار جدید خط وکتابت — خلیق احمد علوی — ۰/۴۵

۵۱۔ ایک جان تین قالب — خان محبوب طرزی — ۴/۵۰

۵۲۔ الفت — " — ۵/۵۰

۵۳۔ آغاز سحر — " — ۴/-

۵۴۔ اسین آباد — " — ۴/-

۵۵۔ انشاء کے خطوط نویسی حصہ اول — مشیر احمد علوی — ۴/-

۵۶۔ اچھی کہانیاں — شمس الدین نوری — ۰/۵۰

۵۷۔ انشاء کے خطوط نویسی حصہ دوم — ۰/۷۵

۵۸۔ ایجادوں کی باتیں — مصطفےٰ حسن رضوی — ۳/-

۵۹۔ اچھی کہانیاں حصہ اول — شمس الدین نوری — ۰/۵۰

۶۰۔ " " حصہ دوم — " — ۰/۵۵

۶۱۔ " " حصہ چہارم — " — ۰/۷۵

۶۲۔ ادب کا مقصد — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۵/۵۰

۶۳۔ اسلامی نظمیں — محمد حسین شمس علوی — ۰/۴۵

۶۴۔ اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰

۶۵۔ اوراق گل — اخگر مشتاق — ۱/-

۶۶۔ ارض القرآن — عبدالماجد دریابادی — ۳/۵۰

(ب)

۱۔ بابائے اردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی — ۷/-

۲۔ بستان حرم (حمدیہ نعتیہ کلام) — زائر حرم حمید صدیقی — ۳/-

۳۔ شہید محبت بوٹا سنگھ — خان محبوب طرزی — ۴/-

۴۔ بزم بے تکلف — ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴/۵۰

۵۔ بھٹ کہانی — ڈاکٹر نورالحسن — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۵/-

۶۔ بہادر شاہ ظفر — امیر احمد علوی کاکوروی — ۸/-

۷۔ بلال — علامہ اقبال — ۰/۵۰

۸۔ بہشتی ثمر، (حصہ اول) خلاصہ بہشتی زیور — مولانا تھانوی — ۳/۸۰

۹۔ بانی اسلام علامہ محی الدین خیاط کی تاریخ کا اردو ترجمہ — ۲/-

۱۰۔ بشریت انبیاء — عبدالماجد دریابادی — ۴/-

(پ)

۱۔ پطرس کے مضامین — پطرس بخاری — ۳/-

۲۔ پیاری باتیں — محسن کاکوروی — ۰/۴۰

۳۔ پھولوں کے انبار (ناول) — حفظ سلیم — ۴/۷۵

۴۔ پسینہ اور پرچھائیں مجموعہ ڈرامہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۷/-

۵۔ پاگل خانہ (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۳/۵۰

۶۔ پیغام — طاہر دیالپوری — ۳/-

۷۔ پنجاب میں اردو — حافظ محمود شیرانی — ۸/-

۸۔ پردیسی کے خطوط (حصہ اول) — مجنوں گورکھپوری — ۵/-

(ت)

۱۔ تذکرہ فانی — فانی کی شخصیت پر جامع تبصرہ و کلام فانی — مختار الدین سیدواری — ۲/-

۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو (فروغ اردو ایڈیشن) — ڈاکٹر سید اعجاز حسین — ۲/-

۳۔ تصویر درد مع تشریحات و ترجمہ — فرید احمد علوی — ۱/-

۴۔ تحریریں مجموعہ مضامین — ڈاکٹر گیان چند — ۸/-

۵۔ تاریخی جائزے — ڈاکٹر محمد یاسین — ۳/-

۶۔ تنقیدی تجزیے — کاظم علی خاں — ۵/-

۷۔ تعارف تاریخ اردو ترمیم شدہ جدید ایڈیشن — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۸/-

۸۔ تاجدار مدینہ — اقبال صدیقی — ۰/۳۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۹-	تنقیدی اصول اور نظریہ	حامد اللہ افسر	۱/۵۰
۱۰-	تنقید و تحلیل	ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی	۵/۵۰
۱۱-	تنقیدی جائزے جدید اڈیشن	سید احتشام حسین	۸/-
۱۲-	تنقیدی نظریات جلد اول	" "	۴/-
۱۳-	" " جلد دوم	" "	۱۰/-
۱۴-	تنقیدی اشارے (جدید اڈیشن) ۱۹۷۷ء	آل احمد سرور	۵/-
۱۵-	تنقید اور عملی تنقید	سید احتشام حسین	۸/-
۱۶-	ترانہائے سنہام	ڈاکٹر رغیب حسین	۳/-
۱۷-	تعلیمات اسلامی مکمل چار حصص	محمد حسین شمس	۳/-
۱۸-	تصویر درد معہ ترجمہ	علامہ اقبال	۱/-

(ٹ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ٹیگور	نادم سیتاپوری	۳/-
۲-	ٹھیکرے کی مانگ	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۳/-

(ث)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ثنائے حبیب نعتیہ کلام	بہزاد لکھنوی	۲/۲۵

(ج)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	جان غالب	محمد حسین شمس علوی	۳/-
۲-	جائزے	انور سیوانی	۳/-
۳-	جواہرات اسمٰعیل	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱/۵۰
۴-	جنگ آزادی نمبر ۱ (۱۸۵۷ء)	فروغ اردو	۴/-
۵-	" " نمبر ۲	" "	۴/-
۶-	جوئے رواں مجموعہ کلام	حامد اللہ افسر	۳/۵۰
۷-	جادو کی آنکھ (جاسوسی ناول)	ڈاکٹر اثر بگرامی	۳/۵۰
۸-	جگ ہنسائی مجموعہ افسانہ	قیصر تمکین	۲/۵۰
۹-	جلوے	معین الدین ، کی	۲/-
۱۰-	جمیلہ پوائری (ناول)	خان غیور طبرزی	۴/۵۰
۱۱-	جگر نمبر اول	سید احتشام حسین	۸/-

(چ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	چوتھی بہن مجموعہ افسانہ	منیع الحسن رضوی	۳/-

(ح)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	حیات فضل الحق	خیرآبادی	۱/۵۰
۲-	حالی بحیثیت شاعر جدید اڈیشن معہ اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱۴/-
۳-	حسرت موہانی	عبدالشکور	۹/-
۴-	حجاج بن یوسف	جرجی زیدان	۴/۵۰
۵-	حکیم نباتات	وزیر خاں لنکراں	۲/-
۶-	حبیبہ غالب	سعادت علی صدیقی	۵۰/

(خ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	خطوط بیخود	سید زائر حسین	۱/-
۲-	خضر راہ مع ترجمہ	علامہ اقبال	/-
۳-	خطبات ماجدی یا سیرت نبوی	عبدالماجد دریابادی	۵۰/
۴-	خضر راہ معہ ترجمہ	علامہ اقبال	/-
۵-	خلاصہ شریف زادہ	مرزا رسوا	۲۵/
۶-	خلاصہ روح تنقید		/-
۷-	خلاصہ جواہر العروض		/-
۸-	خطبات مولانا محمد علی واحدی معہ مقدمہ	شوکت تھانوی	۵۰/
۹-	خوش نجتی کی تلاش	احسن الظفر بی اے	۱/-
۱۰-	خلاصہ شعر الہند حصہ دوم		۱/-
۱۱-	خلاصہ المیزان		۷۵/

(د)

- ۱- دیوان آبرو — ڈاکٹر محمد حسن — ۷/-
- ۲- دلچسپ کہانیاں — مسعود عالم — ۴/۵۰
- ۳- دیوان فغانی — ۲/-
- ۴- داستان سہراب رستم معہ مقدمہ فارسی — عبدالاحد خاں خلیل — ۴/۵۰
- ۵- دہلی کا یادگار مشاعرہ — ۱/۵۰
- ۶- دستہ گل — -/۶۰
- ۷- دوشیزہ قاف (ناول) — خان محبوب طرزی — ۵/-
- ۸- دلربا — 〃 — ۳/-
- ۹- دلی کا دبستان شاعری (معہ اضافہ جدید اڈیشن) — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۱۸/-
- ۱۰- دھڑکنیں — ذکی کاکوروی — ۳/۵۰

(ڈ)

- ۱- ڈاکٹر نذیر احمد صاحب — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۴/۵۰

(ذ)

- ۱- ذوق وجستجو — ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی — ۱۲/-
- ۲- ذوق ادب وشعور — سید احتشام حسین — ۶/۵۰
- ۳- ذوق جنون مجموعہ کلام — آل احمد سرور — ۱۰/-

(ر)

- ۱- روایت اور بغاوت — سید احتشام حسین — ۸/-
- ۲- رباعیات غالب فارسی معہ اردو ترجمہ — سید احسن زہرانی — ۳/۵۰
- ۳- رہبر مضمون نویسی — شفاعت علی صدیقی — ۳/-
- ۴- راکھی — ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی — ۶/۵۰
- ۵- رخسار سحر — ڈاکٹر کریم قدوائی — ۱/۵۰
- ۶- رفتار — وحشی محمود آبادی — ۲/۵۰
- ۷- رموز حکمت معہ مقدمہ اردو — محمود شریف — ۳/۵۰
- ۸- ریاض فارسی — منتخب کلام فارسی — ۳/-
- ۹- ریختہ ولی جدید اڈیشن — ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳/-

(ز)

- ۱- زکوٰۃ الحلی یعنی زیورات کی زکوٰۃ — مولانا تھانوی — -/۵۰
- ۲- زنٹیوں کا بادشاہ حکیم بانا مزاحیہ ناول — سید علی عباس حسینی — ۳/-
- ۳- زینب ساحرہ — وحشی محمود آبادی — ۳/-

(س)

- ۱- سلور کنگ — آغا حشر کاشمیری — ۵/-
- ۲- سوانح اور خاکے — نجم الدین نقوی — ۴/-
- ۳- سرور جہاں آبادی — ڈاکٹر حکم چند نیر — ۸/-
- ۴- سرود نو (مجموعہ کلام) — پروفیسر اختر قادری — ۴/۵۰
- ۵- سنگ گہر — سید احتشام حسین — ۴/-
- ۶- سرسید احمد پاشا یا کوہ قاف کی پری — سید علی عباس حسینی — ۱/۵۰
- ۷- سرمایہ زبان اردو — جلال لکھنوی — ۹/-
- ۸- سقر (ناول) — مائل ملیح آبادی — ۴/-
- ۹- سیاحت زمین 〃 — محمود اعظم فہمی — ۱/۵۰
- ۱۰- ستاروں سے آگے — ناظر کاکوروی — ۳/۵۰
- ۱۱- سہرا حلقہ — -/۷۵
- ۱۲- سرسید احمد خاں — انوار الحسن صدیقی — -/۴۰
- سوشل اسٹڈی — احمد محسن کاکوروی — ۱/۷۵

- ۱- شعر نو تنقیدی مجموعہ — ڈاکٹر محمد حسن — ۷/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲-	شرح دیوان غالب (مزاحیہ)	غلام احمد فرقت	۸/۵۰
۳-	شرح سنگ گہر	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۴-	شاہ نگین حضرت جی	پروفیسر عبدالشکور	۳/-
۵-	شرح ادب پارے نثر	سعادت علی صدیقی	۴/-
۶-	شرح ادب پارے نظم	ڈاکٹر محمود الحسن	۴/-
۷-	شرح منتخبات فارسی	عبدالقوی دریابادی	۵/-
۸-	شبلی نعمانی	انوار الحسن نورانی	۴/-
۹-	شرح دیوان غالب جدید ایڈیشن	نظم طباطبائی	۸/-
۱۰-	شہری اور سماجی زندگی	عبدالعلی قدوائی	۸۰/
۱۱-	" " اول	" "	۹۸/-
۱۲-	" " دوم	" "	۱/-
۱۳-	" " سوم	" "	۱/-
۱۴-	شاہان مادہ یعنی گجرات کی تاریخ	امیر احمد علوی	۳/۵۰
۱۵-	شعر العجم، حصہ اول، دوم، سوم، چہارم۔ پنجم۔	شبلی نعمانی	۴۵/-
۱۶-	شرح نثر امروز ایران	احسن الظفر بی اے	۳/-
۱۷-	شرح نظم امروز ایران	"	۳/۵۰
۱۸-	شمع و شاعر	علامہ اقبال	۵۰/-
۱۹-	شرح حکیم نباتات وزیر خاں	نیر مسعود	۱/۷۵
۲۰-	شرح انتخاب قصائد و غزلیات	مطابق نصاب بی اے	۷/-
۲۱-	شرح شعر پاستان حصہ اول	ڈاکٹر انوار الحسن	۳/-
۲۲-	شرح ترانہائے خیام	حکیم عبدالقوی	۲/-
۲۳-	شرح مفتاح العربیہ	عبدالقوی دریابادی	۱/۵۰
۲۴-	شرح نصاب فارسی		۶/-
۲۵-	شرح شعر پاستہ دوم	احسن الظفر	۳/-
۲۶-	شرح گلہائے ادب		۳/-
۲۷-	شرح آئینہ نظم اردو		۳/-
۲۸-	شرح نثر فارسی (امروزہ)		۳/۰۰
۲۹-	شرح آئینہ نثر اردو	خلیل قدوائی	۴/-
۳۰-	شرح غنچہ گل		۵/-
۳۱-	شرح شعر فارسی کلاسیک	احسن الظفر	۳/-
۳۲-	شرح ہماری زبان اردو درجہ ۶، ۷، ۸ درجہ سے	خلیل قدوائی	۳/-

(ص)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	صید و ہدف (مزاحیہ مضامین)	غلام احمد فرقت	۵/-
۲-	صحیفہ محبت مہدی افادی کے خطوط	ڈاکٹر محمود الہی	۶/-

(ط)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	طرزی نمبر (خان محبوب طرزی)	مرتبہ فروغ اردو	۳/-
۲-	طالب علم کی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہیے	غلام الثقلین	۴۵/-
۳-	طلسم اسرار (ڈرامہ)	مرزا رسوا لکھنوی	۱/۵۰

(ع)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	عذرا (ناول)	صالحہ عابد حسین	۶/-
۲-	عکس اور آئینہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ	سید احتشام حسین	۸/-
۳-	عبدالماجد دریابادی نمبر		۱/-

(غ)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	غالب کا تنقیدی شعور	اخلاق حسین عارف	۴/-
۲-	غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۶/-
۳-	غلام احمد فرقت کاکوروی نمبر	سید احتشام حسن نورانی	۶/-
۴-	غالب کی تخلیقی تکنیک	شہید صفی پوری	۸/-
۵-	غنچہ و گل	سید محمود الحسن رضوی	۲/۵۰
۶-	غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	نادم سیتاپوری	۶/-

۸- خونی دروازہ (ناول) مائل ملیح آبادی ۲/۵۰

۹- غزلیات نظیری ۱/۵۰

۱۰- غزل انسائیکلوپیڈیا (جدید اڈیشن) ذکی کاکوروی ۲۵/-

(ف)

۱- فرحت کاکوروی نمبر ۶/-

۲- فروق گفت طاہر محسن علوی ۴/۵۰

۳- فن خطابت یعنی استاد تقریر کلب مصطفیٰ ایڈوکیٹ ۱۵/-

۴- فریدہ خان محبوب طرزی ۳/-

۵- فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی نادر سیتاپوری ۷/-

۶- فلسفہ اقبال عبدالقوی دریابادی ۵/-

۷- فلسفی ابن رشد مائل ملیح آبادی ۳/۵۰

۸- فروغ جام مجموعہ کلام نشور واحدی ۴/-

۹- فغان محسن محسن کاکوروی ۴/-

۱۰- فارسی آموز مشیر احمد علوی ۱/-

۱۱- فن داستان گوئی جدید اڈیشن پروفیسر کلیم الدین احمد ۸/-

۱۲- فریاد امت علامہ اقبال -/۷۵

(ق)

۱- قدحچہ، جدیدیت پر مزاحیہ تخلیقیں غلام احمد فرقت ۶/-

۲- قصائد ظہیر فاریابی ۲/-

۳- قصائد مومن مع شرح ظہیر احمد صدیقی ۶/۵۰

۴- قطرے سے گہر ہونے تک صالحہ عابد حسین ۷/-

۵- قصص و مسائل عبدالماجد دریابادی ۳/-

۶- قصائد قاآنی (فارسی) ۱/-

۷- قومی ادب نثر و نظم حامد اللہ افسر ۴/۷

۸- قیامت صغریٰ سائنسی ناول خان محبوب طرزی ۳/-

(ک)

۱- کلیات اقبال علامہ اقبال -/

۲- کیسر اور کاہی بدرالدین طیب

۳- کف گلفروش مزاحیہ مضامین غلام احمد فرقت ۵۰/

(گ)

۱- گاندھی نمبر ۱/-

۲- گلدستہ فارسی اول و دوم محمد غوث بیگ سیفی ۱/۲۵

۳- گلزار فارسی یعنی آمدنامہ جدیدہ ۷/-

۴- گلہائے ادب عبدالاحد خاں خلیل ۱/-

۵- گاندھی جی کے ساتھ حامد اللہ افسر ۱/۵۰

(ل)

۱- لوائح جامی مع مقدمہ عبدالاحد خاں خلیل ۱/۵۰

۲- لال قلعہ مائل ملیح آبادی ۱/-

۳- لب بام عادل رشید ۱/-

۴- لسانیات اور اردو سید محمود الحسن رضوی ۱/۵۰

(م)

۱- مرقع اقبال عصمت فاطمہ علویہ ۲/-

۲- مزاحیہ شرح دیوان غالب اردو ۱/۵۰

۳- محسن کاکوروی نمبر ۱/۵۰

۴- مسلمان اور کانگریس ابوالکلام آزاد ۱/۵۰

۵- مرثیہ نگاری اور میر انیس ڈاکٹر احسن فاروقی ۱/-

۶- مضامین فرحت حصہ اول مرزا فرحت اللہ بیگ ۱/-

۷- " حصہ دوم " " ۱/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۸-	ماضی کی کہانیاں	آفتاب اختر تلہری	۳/-
۹-	میرے اسٹیج ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن	۷/-
۱۰-	موسم گل ناول	عادل رشید	۷/-
۱۱-	مجبور	خان محبوب طرزی	۱/۵۰
۱۲-	مضامین جدیدہ	محمد ہادی	۲/۵۰
۱۳-	مثنوی سحر حلال فارسی مع مقدمہ		
۱۴-		قدرت اللہ بیگ	۲/۵۰
۱۵-	مطالعہ...	ذکی کاکوروی	۵/-
۱۶-	مولوی نذیر احمد کی کہانی	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱/۵۰
۱۷-	معرکۂ روم دیوان	صادق سردھنوی	۶/-
۱۸-	مثنویات حالی مع اضافہ	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۴/۵۰
۱۸-	مطالعہ حالی	" "	۸/-
۱۹-	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵
۲۰-	تیکھے بول	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۲/-
۲۱-	مصنوعی چاند	خان محبوب طرزی	۴/-
۲۲-	مقدمہ شعر و شاعری	مطالب مقدمہ حالی	۲/۵۰
۲۳-	مرثیہ غالب	حالی	-/۲۵
۲۴-	محبوبۂ کربلا	جرجی زیدان	۳/۵۰
۲۵-	معمار	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۲۶-	مولانا حالی	انوار الحسن صدیقی	۴/-
۲۷-	انتخاب فسانہ آزاد یعنی بہار اج بلی	سرشار لکھنوی	
۲۸-		ڈاکٹر حسن فاروقی	۲/۵۰
۲۹-	مسٹر ملا کی نوک جھونک	خواجہ عزیز حسن مجذوب	۰/۷۵
۳۰-	مجذوب اور ان کا کلام	مولانا ارضاء الانصاری	۱/۵۰
۳۱-	مصباح بلاغت مع مقدمہ	محمد شریف	۴/-
۳۲-	مطالعہ سودا	ڈاکٹر محمد حسن	۵/-
۳۳-	مقدمات و مقالات	عبدالاحد خاں	۵/۵۰
۳۴-	منتخب سوانح اور خاکے	نجم الدین نقوی	۲/-
۳۵-	مفتاح العربیہ	محمد حسین شمس علوی	۱/۲۵

(ن)

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۱-	ندوۃ العلماء کا پیام فرزندان دارالعلوم کے نام	عبدالماجد دریابادی	-/۸۰
۲-	نثر امروز ایران	ڈاکٹر غریب حسین	۳/۵۰
۳-	نشاط غالب	وجاہت علی سندیلوی	۶/-
۴-	نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۵۰
۵-	نقش حالی اول دوم یعنی حالی نمبر	پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	
۶-	شجاعت علی سندیلوی		۳/-
۷-	نغمۂ کوہسار	خان محبوب طرزی	۴/-
۸-	نغمات البسہ مع مقدمہ اردو	محمد شریف	۳/-
۹-	نظم سائیکلو پیڈیا	ذکی کاکوروی	۱۲/-
۱۰-	نقوش فانی یعنی انتخاب کلام فانی	کبیر احمد جائسی	۲/۵۰
۱۱-	نسرین نسترن	ذکی کاکوروی	۵/-
۱۲-	نور سخن تنقیدی مضامین کا مجموعہ	حامد اللہ افسر	۴/-
۱۳-	نیرنگ خیال حصہ اول	محمد حسین آزاد	۱/۲۵
۱۴-	ندوۃ العلما کا پیام فرزندان اسلام کے نام	عبدالماجد دریابادی	-/۸۰
۱۵-	نوائے سرور جہان آبادی دیوان	ڈاکٹر حکم چند نیر	۷/۵۰
۱۶-	نیا راستہ (ناول)	خان محبوب طرزی	۳/۵۰
۱۷-	نوروز "	مائل ملیح آبادی	۴/۵۰
۱۸-	نئے اور پرانے چراغ مع اضافہ جدیدہ	آل احمد سرور	۱۰/-
۲۹-	نیلم	انتصار حسین	۳/۵۰
۳۰-	نذیر احمد کی کہانی	فرحت اللہ بیگ	۱/۷۵
۳۱-	نقوش افکار	مجنوں گورکھپوری	۲/۵۰

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۲۴۲	نصاب فارسی مع مقدمہ فارسی	عبدالاحد خاں خلیل	۴/-
۲۴۳	منشی نولکشور نمبر		۳/-
	(و)		
۱	وعدۂ فردا	اصغر مشتاق رحیم آبادی	۱۵/-
	(ہ)		
۱	ہمارا گاؤں اور دیگر افسانے	علی عباس حسینی	۵/-
۲	ہندی کے مسلمان شعرا	امیر حسن نورانی	۱/۲۵
۳	ہمارا جھنڈا	حامد اللہ افسر	۱/-

نمبر	کتاب	مصنف	قیمت
۴	ہندوستان شاہراہ ترقی پر	ظفر سلیم	/۵۰
۵	ہندوستان کا تغیر اقتصادیہ		۵۰
۶	ہمارا سماج حصہ ۱	ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی	/-
۷	" " ۲	" "	/۹۵
۸	" " ۳	" "	/-
۹	" " ۴	" "	/-
۱۰	یادگار غالب	مولانا حالی	/
۱۱	یاقوتی ناول	خان محبوب طرزی	/۵۰
۱۲	یادگار انیس	امیر احمد علوی	/۵۰

ملنے کا پتہ :- ادارۂ فروغ اردو ۔ نمبر ۳۷ امین آباد پارک لکھنؤ

خریداران کو ضروری اطلاع

(۱) پرچہ ہر ماہ کی دو تین تاریخ کو پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک اگر ماہنامہ نہ ملے تو شکایت بحوالہ خریداری نمبر دفتر کو کر دی جائے تو اگلے ماہ ماہنامہ کی دو کاپیاں اکٹھا روانہ کر دی جائیں گی ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

(۲) جس وقت آپ کا سالانہ چندہ ختم ہو بلا طلب روانہ فرمائیں

(۳) اپنا نام و پتہ صاف لکھیں

(۴) جوابی امور کے لیے جوابی کارڈ روانہ فرمایئے

(۵) ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لیے ٹکٹ نا ضروری ہیں